منازل العرفان

فی تفسیر القرآن الکریم

تالیف

شیخ التفسیر والحدیث

حضرت مولانا سید عبد الستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جلد ہفتم

سورۃ الحجر تا سورۃ الحج

جامعہ اسلامیہ دار العلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ کوئٹہ

منازل العرفان

فی

تفسیر القرآن الکریم

شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا

سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہم العالی

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ

نیلا گنبد سرکی روڈ ◎ کوئٹہ

نام کتاب: منازل العرفان في تفسير القرآن الكريم

تألیف: شیخ التفسیر والحدیث حضرت مولانا سید عبدالستار شاہ صاحب مدظلہ

قیمت:

سن اشاعت: ۱۴۴۴ھ 2023ء

تعداد: 1100

ملنے کے پتے............

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

جامعہ فرقانیہ، سریاب روڈ، کوئٹہ

مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ، کوئٹہ

اور ملک کے تمام بڑے کتب خانے

ضروری گزارش

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے قرآن مجید احادیث اور دیگر دینی کتب میں عمداً غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ سہواً جو غلطیاں ہوگئی ہوں ان کی تصحیح کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاہم انسان، انسان ہے، اگر اس اہتمام کے باوجود کسی قسم کی بھی غلطی پر آپ مطلع ہوجائیں، تو برائے مہربانی ہمیں مطلع فرمائیں، تاکہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی اصلاح ہوسکے۔ اور آپ ''تَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى'' کے مصداق بن جائیں۔ شکریہ

واٹس ایپ نمبر: 03022999778-03128588383

ناشر

جامعہ اسلامیہ دارالعلوم رحیمیہ، نیلا گنبد، سرکی روڈ، کوئٹہ

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست مضامین منازل العرفان جلد ہفتم

سورۃ الحجر

سورۃ النحل

سورۃ الاسراء

سورۃ الکہف

سورۂ مریم

سورۂ طٰہٰ

سورۃ الانبیاء

سورۃ الحج

سُورَةُ الحِجْر

مكية آياتها ۹۹ ركوعاتها ٦

سورۂ حجر مکی ہے، اس میں ننانوے (۹۹) آیتیں، اور چھ (٦) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الحجر ہے، جو اس سورت کی آیت نمبر (۸) کے فقرہ: ﴿كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ سے ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ یہ قرآن کریم کی تلاوت کے اعتبار سے پندرہویں (۱۵) سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں (۵۴) نمبر پر ہے۔ اس کا نزول سورۂ یوسف کے بعد ہے۔

تعداد آیات، وکلمات، وحروف:

اس سورت میں رکوع (٦)، اور آیات (۹۹) ہیں۔ یہ سورت (٦٦٣) کلمات، اور (۲۹۰۷) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

(۱) گزشتہ سورت اور یہ سورت دونوں حروف مقطعات، اور صداقت قرآن وصداقت رسالت، اور توحید کے مسئلہ کے بیان پر متفق ہیں۔ (۲) گزشتہ سورت کے آخر میں هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ اور اس کی ابتداء میں بھی صداقت

قرآن کا ذکر ہے۔﴿تِلْكَ آيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ﴾۔(۳) اس سورت میں بھی میں کفار ومشرکین کا اسی طرح بیان ہے جیسے گزشتہ سورت میں تھا۔(۴) دونوں سورتوں میں مجرمین کی مہلت کا یکساں بیان ہے۔یعنی اِمْهَالُ الْمُجْرِمِيْنَ۔(۵) گزشتہ سورت میں کلمہ خبیثہ کا ذکر تھا، اس سورت میں اس کی نشاندہی ہے۔

مختصر موضوع:

توحید ورسالت، اثبات قیامت، تذکیرات ثلاثہ، حفاظت وصداقت اور عظمت قرآن کا بیان، مکذّبین و مشرکین کے انجامِ بد کا بیان، اسی طرح مؤمنین وصادقین کے انجام خیر کا بیان، آنحضرت سرورعالم ﷺ کی تسلی کا تذکرہ وبیان، اور ابلیس لعین کا تذکرہ، اور اس کے بُرے کارناموں کا بیان، اور اس کے انجام وغیرہ کے مسائل کا بیان ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ①

ترجمہ: الٓرٰ۔(اس کا مطلب ومراد صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے) یہ آیات ہیں کتاب کی، اور قرآن مبین کی ①

﴿الجزء الرابع عشر﴾

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ② ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَ يُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ③ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَ لَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ ④ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ⑤

ترجمہ: جن لوگوں نے کفر کیا وہ بہت سی مرتبہ یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ مسلمان ہوتے ② آپ انہیں چھوڑیئے، وہ کھالیں اور نفع اٹھالیں، اور اُمید انہیں غفلت میں ڈالے رکھے، سو وہ عنقریب جان لیں گے ③ اور ہم نے جتنی بھی بستیوں کو ہلاک کیا ان کے لئے ایک وقت معین لکھا ہوا تھا ④ کوئی اُمت اپنی مقررہ اجل سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے، اور نہ وہ لوگ پیچھے ہٹ سکتے ہیں ⑤

معارف ومنازل

انسان کا نفس ایک ہے، مگر اس کی صفات مختلف ہیں۔سب سے بڑا شریر نفس اَمّارَۃ ہے، جو صرف برائیوں

کی دعوت دیتا ہے، اور حسنات سے کبھی خوش نہیں ہوتا۔ پس اگر نفس نیکیوں سے متنفر نہ ہو، اور گناہوں پر ملامت کرتا ہوتو یہ نفس لَوَّامَة ہے، یعنی خیر وشر دونوں کا معجون مرکب ہے، لیکن یہی نفس اگر معاصی سے بیزار ہو، اور ہر موقع پر ہمہ وقت نیکیوں میں مصروف ہو، تو یہ نفس مُطمَئِنَّة ہے۔ اس کا مقام بہت اونچا ہے۔

پھر اس کے تین مراتب ہیں:

☆ اعلیٰ: یہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے۔ ☆ اوسط: یہ صدیقین وشہداء کے ساتھ مخصوص ہے۔ ☆ ادنیٰ: یہ خواص علماء، صلحاء اور متقین کے ساتھ مخصوص ہے۔ البتہ حضرت ابن عباس اور حسن بصری رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ قیامت کے دن سارے کفار کا نفس امارہ سے نیچے آکر لَوَّامَة بن جائے گا، اور انہیں ملامت کرے گا کہ تم کیوں مسلمان نہیں ہوئے۔ اور بے عمل مسلمان فاجر وفاسق کا نفس اَمّارَة بھی لَوَّامَة بن جائے گا کہ تم نے اعمالِ صالحہ میں کیوں سستی کی، وغیرہ۔ اس مقام پر بھی اسی کا بیان ہے، جو آنے والا ہے۔

﴿الٓرٰ﴾ اس کے معنی اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہیں۔

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ﴾ یہ کتاب کامل کی آیات ہیں وہ کتاب قرآن مبین ہے، جو اصلی کتاب کہلانے کی مستحق ہے، اور دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

﴿الْمُبِیْنِ﴾ ''اَلَّذِی یُبَیِّنُ كُلَّ شَیْءٍ مِنَ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ وَضَرُورِیَاتِ الدِّینِ''۔ جو تمام احکام کی تفصیل کرنے والی ہے، حلال وحرام، اور حق وباطل، بلکہ تمام ضروریات دین کو کھول کر بیان کرنے میں اپنی نظیر آپ ہے۔

﴿رُبَمَا یَوَدُّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِیْنَ﴾ بہت سی مرتبہ کفار یہ آرزو کریں گے کہ ہائے کاش! ہم مسلمان ہوتے، دنیا میں مسلمانوں کو بیوقوف اور خود کو عقلمند کہتے تھے، لیکن جب آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوں گے، اور مسلمانوں کو جنت میں خوشحال دیکھیں گے تو آرزو کریں گے کہ ہائے کاش! ہم بھی مسلمان ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب دوزخی دوزخ میں چلے جائیں گے، تو دوزخ میں انہیں بعض مسلمان بھی نظر آئیں گے، وہ ان سے پوچھیں گے کیا تم مسلمان نہیں تھے جو یہاں آئے ہو؟ وہ کہیں گے ہاں! ہم مسلمان تھے۔ اس پر کافر کہیں گے: پھر تو تمہیں تمہارے اسلام نے کچھ فائدہ نہ دیا، تم تو ہمارے ساتھ دوزخ میں ہو۔

اس پر مسلمان جواب دیں گے کہ ہم لوگوں نے گناہ کیے تھے، ان کی وجہ سے ہمارا مؤاخذہ ہوا ہے۔ اس

کے بعد اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے مسلمانوں کی مغفرت کردی جائے گی، اور حکم ہوگا کہ مسلمانوں میں سے جو بھی کوئی دوزخ میں ہے اُسے نکال دیا جائے، پس انہیں دوزخ سے نکال دیا جائے گا، اور یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور فضل سے ہوگا یہ منظر دیکھ کر سارے کافر آرزو کریں گے کہ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے۔

صاحب روح المعانی نے یہ روایت حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے بھی نقل کی ہے۔ اس کے آخر میں یہ بھی ہے کہ مذکورہ بات بیان کرنے کے بعد شافع محشر صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات بالا: ﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ تلاوت فرمائی۔ اسی مضمون کی حدیث قدرے تفصیل یا اختصار کے ساتھ طبرانی، ابن جریر اور بیہقی میں حضرت ابن عباس، حضرت ابن مسعود اور حضرت انس رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہے، مطلب سب کا یہی ایک ہے۔ [مظهر مختصراً]

﴿رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا﴾ کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کہ کیا اچھا ہوتا اگر وہ دنیا میں مسلمان ہوتے۔ لفظ رُبَّ اظہارِ قلت کے لئے آتا ہے، لیکن اس جگہ مجازاً اظہارِ کثرت کے لئے آیا ہے۔ [مظهري]

﴿ذَرْهُمْ يَأْكُلُوا وَيَتَمَتَّعُوا﴾ معلوم ہوا کہ کھانے پینے کو اصلی اور بنیادی مشغلہ بنالینا، اور دنیاوی عیش و عشرت کے سامان میں موت سے بے فکر ہوکر طویل منصوبوں میں لگے رہنا کفار ہی کا مقصد زندگی ہے، کیونکہ وہ صرف اسی دنیا کے بندے ہیں، اور یہی دنیا ان کی آخری منزل ہے، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے، اور آخرت پر عقیدہ جمایا، اور حساب وکتاب، جنت ودوزخ کو اپنے ایمان کا جزء بنایا، اور آخرت کو آخری منزل کے طور پر قبول کیا، تو ایسے لوگ کبھی دنیا میں عیش وعشرت کی زندگی کو مقصد بنا کر اللہ تعالیٰ اور روز آخرت سے غافل نہیں رہے، ایسے لوگ پیٹ پر پتھر باندھ کر آخرت کے لئے اعمالِ صالحہ جمع کر کے اللہ تعالیٰ کی بندگی میں شب وروز مصروف رہتے ہیں۔ وہ حلال و حرام کی مکمل خیال داری کرتے ہوئے طول امل سے بیگانہ ہوکر ہر قسم کی اطاعت کو شعار بناتے ہیں، اور ہر قسم کی بد نصیبی سے پرہیز کرتے ہیں۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ چار چیزیں بدبختی اور بد نصیبی کی علامات ہیں:

☆ آنکھوں سے آنسو جاری نہ ہونا، یعنی اپنے معاصی اور گناہوں پر نادم ہوکر نہ رونا۔ ☆ اور سخت دلی۔

☆ طول اَمل۔ ☆ اور دنیا کی حرص میں مبتلا رہنا۔ [قرطبي عن مسند البزار عن أنس رضي الله عنه]

دنیا کا حریص دنیا کے مال ومتاع سے سیر نہیں ہوتا، جس کا انجام سوائے ہلاکت کے کچھ نہیں۔ وہ سب کچھ

یہاں چھوڑ جائے گا، خالی ہاتھ قبر کے پاس پہنچ جائے گا، قبر میں عذاب جہنم کے علاوہ بڑے بڑے زہریلے سانپوں کا لقمہ بنے گا، اور آخرت کا حریص اعمالِ صالحہ اور نیکیوں پر حرص کرے گا، دنیا سے جاتے ہوئے پہاڑوں جتنے اعمال کا ذخیرہ لے کر جائے گا، اور اس کی قبر جنت کا باغ بن کر ایسی آرامگاہ ہوگی کہ جس کے مقابلے میں دنیاوی بادشاہت بھی ہیچ ہے۔ لہٰذا لمبی اُمیدوں اور دنیاوی طول امل سے حتی الامکان بچتے رہو اور پرہیز کرو۔ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس اُمت کے پہلے طبقہ کی نجات ایمان کامل، اور دنیا سے اعراض کی وجہ سے ہوگی، اور اُمت کے آخری لوگ بخل اور طویل امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے۔ [قرطبی]

﴿وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ﴾ اور ہم نے جتنی بھی بستیوں کو ہلاک کیا ہے، ان کے لئے ایک اجل معین ہے، جو ہمارے علم میں ہے، جسے ہم نے پہلے سے مقرر کیا ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

﴿مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ﴾ کوئی اُمت اپنی مقررہ اجل سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے، اور نہ وہ لوگ پیچھے ہٹ سکتے ہیں، اور آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ اجتماعی موت وہلاکت ہو، یا انفرادی، یہ قانون سب کے لئے ہے، اور اٹل بھی ہے۔

❁ ❁ ❁

وَقَالُوْا يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝۶ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝۷
مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝۸ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝۹

ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا کہ اے وہ شخص جس پر قرآن نازل کیا گیا ہے! بیشک تو دیوانہ ہے ۝۶ تو فرشتوں کو کیوں نہیں لے آتا؟ اگر تو سچوں میں سے ہے ۝۷ فرشتوں کو ہم فیصلہ کے ساتھ ہی نازل کیا کرتے ہیں، اور اس وقت لوگوں کو مہلت بھی نہیں دی جاتی ۝۸ بلاشبہ ہم نے ذکر کو نازل کیا ہے، اور بلاشبہ ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں ۝۹

معارف ومنازل

مشرکین ومعاندین کا یہ پہلا اعتراض نہیں، وہ یہ صبح وشام کہا کرتے ہیں۔ کبھی آپ ﷺ کو دیوانہ، کبھی ساحر، کبھی کاہن کہنا، یہ ان کا معمول تھا۔ اسی طرح فرمائشی معجزات کا مطالبہ اور فرشتوں کی آمد، اور تصدیق کا مطالبہ، یہ

ان کی کٹ حجتی اور استہزاء و مذاق کا ایک نہ ختم ہونے والا بہانہ تھا۔ تو پہلی آیت میں انہوں نے کہا: اے وہ شخص جس پر ذکر، یعنی قرآن نازل کیا گیا ہے! ہمیں تیرے دیوانہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ ان کا اصل مقصد دیوانہ بتانا تھا۔ آنحضرت سرور عالم ﷺ کا اسم گرامی بتانے کی بجائے انہوں نے تعریض کر کے کہا:

﴿الَّذِیْ نُزِّلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ﴾ ''جس پر ذِکر نازل کیا گیا'' جو کہا، ان کا یہ کہنا بطور تمسخر تھا، کیونکہ وہ اس بات کو مانتے ہی نہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ پر وحی آتی ہے۔

دوسری آیت میں ان منکرین کی کٹ حجتی بیان فرمائی ہے۔ اور تیسری آیت میں ان کی کٹ حجتی کا جواب دیا ہے۔ انہوں نے یوں کہا کہ اگر آپ اپنے دعوائے رسالت میں سچے ہیں تو ہمارے پاس فرشتوں کو لے آئیں، آپ فرشتے کیوں نہیں لاتے؟ جو اس بات کی گواہی دیں کہ آپ اللہ تعالیٰ کے برحق رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے جواب میں فرمایا کہ ہم فرشتوں کو فیصلے کے ساتھ ہی بھیجتے ہیں، یعنی جب لوگوں کی درخواست پر فرشتے آجائیں تو ان کا آنا فیصلہ ہی کے لئے ہوتا ہے۔ فرشتوں کے آنے پر بھی لوگ اگر ایمان نہیں لاتے تو لازمی طور پر عذاب آجاتا ہے، اور اس وقت منکرین کو مہلت بھی نہیں دی جاتی۔

قرآن حکیم کے مخاطب جو یوں کہہ رہے ہیں کہ فرشتے نازل ہو کر آپ ﷺ کی رسالت کی گواہی دے دیں۔ ان کی اس بات کا یہ مطلب نکلتا ہے کہ ان کی ہلاکت کا فیصلہ جلدی ہو جائے، چونکہ انہیں فرشتوں کی آمد پر ایمان لانا پھر بھی نہیں، تو عذاب لازماً آجائے گا۔ چوتھی آیت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے قرآن مجید کی حفاظت کا وعدہ ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ بلاشبہ ہم نے قرآن نازل کیا، اور بلاشبہ ہم اس کی ضرور حفاظت کرنے والے ہیں۔

منکرین رسالت محمدیہ (عَلٰی صَاحِبِهَا السَّلَامُ وَالتَّحِيَّةُ) جو منکرین قرآن بھی تھے، انہوں نے بطور تمسخر انکار کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ ہم نے نازل کیا ذکر کو، تمہارے نہ ماننے سے واقعی اور سچی حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا جو چمکتے دمکتے سورج کا انکار کرے گا، چاہیے کہ اس کے دماغ کا علاج ہو۔ دنیا میں سب سے بڑا پاگل وہی کہلاتا ہے جو حقائقِ واقعیہ واضحہ کا منکر ہو۔ منکرین یہ بھی کہتے تھے: ﴿اَمْ یَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ

الْمَنُوْنِ﴾ [الطور: ۳۰] (وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، ہم اس کے متعلق زمانہ کی گردش کے منتظر ہیں)۔

منکرین آپ ﷺ کے متعلق اور قرآن کریم کے متعلق یہی سوچتے تھے کہ ہم چند وقت انتظار کریں گے، دوسرے شاعروں کی طرح یہ بھی دنیا سے رخصت ہو جائیں گے، اور ان کی کتاب بھی گوشہ گمنامی میں پڑے رہنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ کون اُسے پڑھے گا، اور اس کی حفاظت کا بیڑا اٹھائے گا؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی ناک کٹوا کر اپنے کلام کی مکمل حفاظت کا یوں اعلان فرمایا:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ اور حفاظت کا طریقہ اور ڈھنگ بھی واضح فرمایا: ﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ﴾ [العنکبوت: ۴۹] (بلکہ وہ واضح آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے، اور ہماری آیتوں کا انکار نہیں کرتے مگر ظالم لوگ)۔ یعنی نبی اکرم، حامل قرآن ﷺ نے کسی سے لکھا پڑھا نہیں، بلکہ یہ وحی جوان پر آئی، ہمیشہ کو بن لکھے سینہ بسینہ قیامت تک باقی اور محفوظ رہے گی، اس میں کسی ادنیٰ ذرہ کا کوئی تغیر واقع نہ ہوگا، حرف بحرف اسی طرح اس کا اہتمام ہوتا رہے گا جس طرح نزول کے وقت ہوا۔

الحمد للہ علماء اسلام، حفاظ وقراء کے سینے اس کے الفاظ ومعانی، اور حرکات وسکنات کی حفاظت کریں گے۔ دیگر آسمانی کتابیں حفظ نہ ہوتی تھیں، یہ کتاب عربیوں، عجمیوں، جوانوں، بچوں، بوڑھوں، مردوں، اور عورتوں کے سینوں کی زینت وافتخار بنے گی۔ ان کے ماتھوں کا جھومر بن کر انہیں جنت کا راستہ دکھائے گی، اور برزخ وقبر اور میدانِ محشر تک ان کے ساتھ رہے گی، اور ان کے ہاتھ پکڑ کر جنت کے درجات پر بلند کر کے چھوڑے گی۔

دشمنانِ اسلام کو دندان شکن چیلنج:

یعنی اے دشمنان اسلام! تمہارا استہزا اور تعنت، اور قرآن لانے والے عظیم المرتبت پوری انسانیت کے محسن حضرت رحمۃ للعٰلمین، سید الانبیاء والمرسلین محمد ﷺ کی طرف جنون کی نسبت کرنا قرآن وحامل قرآن پر قطعاً اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھو! اس قرآن کے اتارنے والے ہم ہیں، اور ہم ہی نے اس کی ہر قسم کی حفاظت کا ذمہ لے لیا ہے۔ جس شان وشوکت سے وہ اترا ہے بدون ایک شوشہ، یا زبر وزیر کی تبدیلی کے، چار دانگ عالم میں پہنچ کر رہے گا اور قیامت تک ہر طرح کی تحریف لفظی ومعنوی سے محفوظ ومصون رکھا جائے گا۔ زمانہ کتنا ہی بدل جائے، مگر اس کے اصول واحکام کبھی نہ بدلیں گے۔

زبان کی فصاحت و بلاغت، اور علم و حکمت کی موشگافیاں کتنی ہی ترقی کر جائیں، پر قرآن کی صوری و معنوی اعجاز میں اصلاً ضعف و انحطاط محسوس نہ ہوگا۔ قومیں اور سلطنتیں قرآن کی آواز کو دبانے یا گم کردینے میں ساعی ہوں گی، لیکن اس کے ایک نقطہ کو گم نہ کرسکیں گی۔ حفاظت قرآن کے متعلق یہ عظیم الشان وعدۂ الٰہی ایسی صفائی اور حیرت انگیز طریقہ سے پورا ہو رہا ہے جسے دیکھ کر بڑے بڑے یہودی متعصب، بدخواہان اسلام، اور دشمنان رسالت، مغرور مخالفوں کے سر نیچے ہوگئے۔

میور کہتا ہے: ”جہاں تک ہماری معلومات ہیں، دنیا بھر میں ایک بھی ایسی کتاب نہیں جو قرآن کی طرح بارہ صدیوں تک ہر قسم کی تحریف سے پاک رہی ہو“۔ ایک اور یورپین محقق لکھتا ہے کہ: ”ہم ایسے ہی یقین سے قرآن کو بعینہٖ محمد (ﷺ) کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ سمجھتے ہیں جیسے مسلمان اُسے خدا کا کلام سمجھتے ہیں“۔

واقعات بتلاتے ہیں کہ ہر زمانہ میں ایک جم غفیر علماء کرام کا جن کی تعداد اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، ایسا رہا ہے کہ جس نے قرآن کے علوم و معارف اور مطالب، اور غیر منقضی عجائب کی حفاظت کی، کاتبوں نے رسم الخط کی، قاریوں نے طرز ادا کی، حافظوں نے اس کے الفاظ و عبارت کی وہ حفاظت کی کہ نزول کے وقت سے آج تک ایک زیر زبر تبدیل نہ ہوسکا۔ کسی نے قرآن کے رکوع گن لئے، کسی نے آیتیں شمار کیں، کسی نے کلمات و حروف کی تعداد بتلائی، حتی کہ بعض نے ایک ایک اعراب، اور ایک ایک نقطہ کو شمار کر ڈالا۔

آنحضرت حامل قرآن ﷺ کے عہد مبارک سے آج تک کوئی لمحہ، اور کوئی ساعت نہیں بتلائی جاسکتی، جس میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد حفاظ کرام کی موجود نہ رہی ہو۔ آج ہمارے زمانے میں صرف حفاظ قرآن کی تعداد پورے ممالک اسلامیہ میں سوا کروڑ ہے، اور قرآن کریم کے حواشی و تفاسیر کی تعداد مختلف زبانوں میں تقریباً تین لاکھ تفاسیر ہیں۔ کچھ کچھ تفاسیر ایسی بھی ہیں جو ایک ہزار جلدوں میں ہیں، ان میں سے کوئی جلد بڑی تقطیع کے ہزار صفحات سے کم نہیں۔

اگر اندلس و قرطبہ اور بغداد کا سقوط نہ ہوتا، جن میں بہت بڑا ذخیرۂ علوم اسلامیہ ضائع ہوگیا تو آج یہ تعداد اچار گنا زیادہ ہوتی۔ یہی حال ذخیرۂ احادیث کا بھی ہے، جسے قرآن کی شرح کی حیثیت حاصل ہے۔ آج مختلف بولی بولنے والے آٹھ دس سالہ بچے، بچیاں قرآن مجید کے حافظ ہیں، جنہیں اپنی مادری زبان میں دو تین جزء کا رسالہ یاد کرانا دشوار ہے۔ وہ ایک اجنبی زبان کی اتنی بڑی ضخیم کتاب کو جو متشابہات سے پُر ہے، کس طرح فر فر سناتا ہے۔ پھر

کسی بڑی مجلس میں، یا صلوٰۃ تراویح میں ایک بڑے معمر باوجاہت عالم دین، یا حافظ سے کوئی حرکت یا حرف چھوٹ جائے یا اعراب کی فروگزاشت ہوجائے، تو آٹھ سالہ بچہ اُسے ٹوک دیتا ہے، اور چاروں طرف سے تصحیح کرنے والے للکارتے ہیں، ممکن نہیں کہ پڑھنے والے کو غلطی پر قائم رہنے دیں۔

حفظ قرآن کے متعلق یہی اہتمام واعتناء عہد نبوت سے آج تک لوگ مشاہدہ کرتے چلے آئے ہیں۔ امیر المؤمنین فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جنگ یرموک کے موقع پر اسلامی فوج کے کمانڈروں کو خط لکھا کہ اپنی فوج کے حفاظ قرآن کی فہرست لکھ کر مجھے بھیج دو، جب وہ فہرست آپ رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچی تو آپ رضی اللہ عنہ بے حد خوش ہوئے، اور نماز شکرانہ ادا کی۔ فہرست میں دس ہزار حفاظ قرآن کے نام تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: یہ ہمارا اصلی، دینی، مذہبی سرمایہ ہے۔ ان شاء اللہ یہ فوج ہمیشہ غالب رہے گی۔

کسی وقت برصغیر پر جب عیسائیوں کا قبضہ ہوگیا تو انہوں نے غور وخوض کے بعد طے کیا کہ مسلمانوں کی دو چیزیں ہمارے لئے تباہ کن ہیں، ہمیں چاہیے کہ ان دونوں چیزوں پر پابندی لگائیں: ایک قرآن، دوئم تلوار (جہاد)۔ آج بدنصیبی کہیے کہ شومیٔ قسمت ساٹھ کے قریب اسلامی ملکوں میں کوئی ایک ملک ایسا نہیں جس میں قرآن کا نظام رائج و نافذ ہو۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

وہ معزز تھے زمانے میں مسلمان ہوکر ☆ ہم خوار ہوئے تارکِ قرآن ہوکر

اب قرآن مجید بحمدہٖ تعالیٰ ہرقسم کی لفظی ومعنوی تحریفات سے محفوظ ہے۔ مشرق کے مسلمانوں کے پاس وہی قرآن ہے جو مغرب والوں کے پاس ہے۔ مجال نہیں کہ ایک حرف تو کیا، ایک نقطہ میں بھی جدائی واختلاف ہو۔ یہ سو فیصد سچ ہے کہ یہ برکت والی کتاب ہرقسم کی تحریفات سے محفوظ ہے۔ یعنی شیاطین سے بھی محفوظ ہے، ملحدین سے بھی، فجار وفساق سے بھی، منکرین سے بھی منافقین سے بھی، مشرکین ومبتدعین سے بھی، اور محرفین سے بھی۔ چند سال پہلے بڑے عمدہ کاغذ پر، معیاری جلدوں میں، رنگدار اور اعلیٰ طباعت کے ساتھ چند لفظی تحریفات کے ساتھ امریکہ و اسرائیل نے لاکھوں کی تعداد میں قرآن مجید چھپوا کر کویت میں شائع کیا، مگر چوبیس گھنٹے سے زائد ایک لمحہ بھی نہ چل سکا، مسلمانوں کے احتجاج پر بند ہوگیا۔ ﴿وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾۔

البتہ روافض شیعہ قرآن مجید کی تحریف کے قائل ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے وعدے پر ان کا ایمان نہیں، بلکہ پورے قرآن پر بھی ان کا ایمان شاید نہ ہو۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٠ وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝١١
كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ۝١٢ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٣ وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝١٤ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝١٥

ترجمہ: اور بلا شبہ ہم نے آپ سے پہلے گزشتہ لوگوں کے گروہوں میں پیغمبر بھیجے ۝١٠ اوران کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کے ساتھ انہوں نے استہزاء نہ کیا ہو ۝١١ ہم اس طرح اس استہزاء کو مجرموں کے دلوں میں چلاتے ہیں ۝١٢ یہ لوگ اس پر ایمان نہیں لاتے، اور پہلے لوگوں کا طریقہ گزر چکا ہے ۝١٣ اور اگر ہم ان پر آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں، پھر یہ لوگ دن کے وقت اس میں چڑھ جائیں ۝١٤ تب بھی یوں کہیں گے کہ بس بات یہ ہے کہ ہماری آنکھوں کی نظر بندی کردیگئی ہے، بلکہ ہم ایسے لوگ ہیں جن پر جادو کردیا گیا ہے ۝١٥

معارف ومنازل

مشرکین مکہ کے استہزاء وتمسخر سے آنحضرت سرور عالم ﷺ کو جو پریشانی لاحق ہوتی، اس پر آپ ﷺ کو خبردار کر کے تسلی دی جارہی ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں، یہ کوئی نئی بات نہیں، آپ ﷺ سے پہلے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام آئے تھے، یہ استہزاء ان سب کے ساتھ ہوتا رہا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ برداشت کرتے رہے، اور صبر کیا، آپ بھی صبر اختیار کریں۔

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے بھی پچھلی اُمتوں میں پیغمبر بھیجے۔ شِيَع جمع ہے شيعة کی، شیعہ اُس جماعت کو کہتے ہیں جو متفق الرائے ہو، اور کسی بات پر متحد ہو۔

﴿وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ﴾ گزشتہ اقوام اور جماعتوں کا رویہ رہا ہے کہ جو بھی پیغمبران کے پاس آئے تو انہوں نے تکذیب کی اور مذاق اڑایا۔

﴿كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ﴾ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت رہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں یہ استہزا وتکذیب ڈال دیتے ہیں، جس طرح گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام کی اُمتوں کے دلوں میں کفر وتکذیب داخل کیا گیا، اسی طرح اہل مکہ کے دلوں میں بھی ہم نے یہ کفر وانکار داخل کردیا۔ نَسْلُكُ بمعنی سَلَكَ، یعنی کسی دھاگے میں تسبیح کے دانوں کے ڈالنے کو کہتے ہیں، یا کسی زخم میں دوائی ڈالنے کو یا کسی کے دل میں کسی خیال کو، یہ سب سَلَكَ کے معنی

ہیں۔

﴿لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ اسی وجہ سے یہ مجرمین قرآن پر ایمان نہیں لاتے، اور گزشتہ لوگوں کا طریقہ بھی ایسا ہی گزرا ہے کہ انہوں نے ہدایت قبول نہیں کی، یہاں تک کہ:

﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَیْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِیْهِ یَعْرُجُوْنَ﴾ اگر ان مستہزئین پر ہم آسمان کا کوئی دروازہ کھول دیں، اور یہ لوگ دن کے وقت روشنی اور بیداری میں اس میں چڑھ جائیں، اور فرشتوں کو بھی چڑھتے ہوئے دیکھ لیں، تو ایمان نہیں لائیں گے، اور یہ کہیں گے:

﴿لَقَالُوْۤا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ﴾ کہ ہماری نظر بندی کی گئی ہے، جس کی وجہ سے ہم اپنے کو آسمان پر چڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں، اور فرشتوں کو بھی چڑھتے ہوئے دیکھ رہے ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے، اس جادو کی وجہ سے یہ سب کچھ ہمیں نظر آ رہا ہے، اور حقیقت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ جب کسی قوم کا یہ حال ہو کہ کھلی آنکھوں معجزات دیکھے، اور انہیں جادو بتا دے، اور اپنی نظر بندی کا دعویٰ کرے، تو اس قوم سے ایمان لانے کی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ سکر نشہ کو کہتے ہیں، نشہ میں آدمی کا دماغ اور آنکھیں بے حس ہو جاتی ہیں، تو کہا کہ ہماری آنکھوں پر نظر بندی کی گئی اور ہمیں بے حس کر کے رکھ دیا اور ماؤف کر دیا گیا۔

.... ✿ .... ✿ .... ✿ ....

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیْنَ ﴿۱۶﴾ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَیْطٰنٍ رَّجِیْمٍ ﴿۱۷﴾ اِلَّا مَنِ اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۸﴾ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَیْنَا فِیْهَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْهَا مِنْ كُلِّ شَیْءٍ مَّوْزُوْنٍ ﴿۱۹﴾ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾

ترجمہ: اور بیشک ہم نے آسمان میں ستارے پیدا کئے، اور اسے دیکھنے والوں کے لئے زینت والا بنایا ﴿۱۶﴾ اور ہر شیطان مردود سے ہم نے اُسے محفوظ کر دیا ﴿۱۷﴾ سوائے اس کے جو چوری سے سُن لے تو اُسے اس کے پیچھے ایک روشن شعلہ ہو لیتا ہے ﴿۱۸﴾ اور ہم نے زمین کو پھیلا دیا، اور ہم نے اس میں بھاری بھاری پہاڑ ڈال دیئے، اور ہم نے اس میں ایک معین مقدار سے ہر قسم کی چیز اگائی ﴿۱۹﴾ اور ہم نے تمہارے لئے اس میں زندگی کے سامان پیدا کر دیئے، اور وہ

چیزیں (پیدا کیں) جنہیں تم رزق دینے والے نہیں ہو۲۰ اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، اور ہم اس کو صرف مقدار معلوم ہی کے بقدر نازل کرتے ہیں۲۱

معارف ومنازل

اس مقام پر چند ضروری مباحث کا سمجھنا بہت ضروری ہے، تا کہ آیت کریمہ کا مطلب اور مراد سمجھ میں آجائے۔ ہم انہیں اختصار سے بیان کرتے ہیں۔

بُروج کیا ہیں؟ بُروج کا واحد بُرج ہے، اس کا ایک لغوی معنی ہے، جس کو اہلِ زبان روزمرہ استعمال کرتے ہیں، یعنی ظاہر ہونا، بلند ہونا۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ﴾ [الأحزاب:۳۳] (اور بناؤ سنگھار دکھاتی نہ پھرو، جیسا کہ پہلی بار جاہلیت میں دکھایا جاتا تھا)۔ أصلُ البُرُوجِ الظُّهورُ ومنها تَبَرَّجَت المَرأةُ بِإِظهارِ زِينَتِها [قرطبی وغیرہ]۔ اس لغوی معنی کی مناسبت سے اس کا اطلاق ان چیزوں پر ہونے لگا جو دور سے نمایاں ہوتی ہیں، مثلاً قلعہ، محل، منارہ، وغیرہ۔ [روح المعاني]

قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿أَيْنَمَا تَكُونُوا يُدْرِككُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنتُمْ فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ [النساء:۷۸] (جہاں بھی تم ہو موت تم کو پکڑ لے گی، اگر چہ تم مضبوط قلعوں میں ہوں)۔ یہاں بُروج قلعے اور محل کے معنی میں ہیں، بالاتفاق۔ اسی وجہ سے وہ بڑے ستارے جو دور سے نظر آتے ہیں اور نمایاں ہیں، انہیں سبھی اہل عرب بُروج کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی اَلْكَوَاكِبُ الْعِظَامُ۔ [روح وقرطبي]

بُروج علماء ہیئت وفلاسفہ کے نزدیک:

قدیم علماء ہیئت نے جب یہ مشاہدہ کیا کہ سورج تین ماہ تک شمال کی طرف مائل ہوتا ہے، پھر تین ماہ تک ہٹتا رہتا ہے، اس کے بعد وہ تین ماہ تک جنوب کی طرف مائل ہوتا ہے، اور پھر تین ماہ تک ہٹتا رہتا ہے، تو انہوں نے سورج کے مدارِ حرکت کو بارہ حصوں میں تقسیم کیا، اور ہر حصہ کو "بُرج" کا نام دیا، اور مدار کے ہر حصہ میں جو بڑے بڑے ستارے پائے جاتے ہیں، ان کی ایک خیالی شکل اپنے ذہن میں مرتسم کرلی، اور اس شکل سے اس بُرج کا نام رکھ دیا گیا۔ ان بارہ بُرجوں کے نام یہ ہیں:

حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت۔

قدیم علماء ہیئت کی موشگافیاں اوران کے پرانے خیالات وعقائد نہایت رکیک اورضعیف وکمزور تھے، مثلاً وہ آسمانوں کو بجائے سات کے نو مانتے ہیں۔ دوئم یہ کہ وہ آسمانوں کو آپس میں ملے ہوئے مانتے ہیں، ان کے درمیانی فاصلوں کے منکر ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ ستاروں کو غیر متحرک اور ساکن کہتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ وہ ستاروں کو آسمانوں سے نیچے نہیں مانتے ہیں، وہ یوں کہتے ہیں کہ ستارے میخ کی طرح آسمانوں میں جڑے ہوئے ہیں۔ پانچویں یہ کہ وہ آسمان کو ساکن نہیں کہتے ہیں، ان کا کہنا ہے کہ آسمان متحرک ہیں۔ لہٰذا ان وجوہات کی بناء پر ان کا مذہب ساقط ہے۔

مسلمان سائنس دان ابو اسحٰق ابراہیم زرقلی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ نے ہیئت قدیم کے تمام نظریات پر پانی پھیر کر انہیں باطل اور غلط ثابت کیا ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل سورۃ الملک کی تفسیر میں بیان ہوجائے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

آیت کریمہ میں بُروج سے مراد کیا ہے؟

چونکہ بُروج کا جو مطلب فلاسفہ نے بیان کیا تھا وہ گزشتہ مذکورہ وجوہات کی وجہ سے یہاں مراد نہیں، اور اس لئے بھی کہ قرآن کریم کا نزول عرب اقوام کی زبان پر ہے، اور جن بُروج کو فلاسفہ نے بیان کیا تمام اہل عرب نزول قرآن سے پہلے ان بُروج سے ناواقف تھے، اور انہیں جاننا تو کیا بلکہ ان کے بارے میں سنا بھی نہیں تھا، وہ ہر طرح اس تقسیم سے لاعلم تھے۔ لہٰذا بُروج کے معنی وہی معتبر ہوں گے جنہیں قرآن حکیم کے الفاظ کی روشنی میں علماء اُمت نے متعین کیا ہو، اور علماء تفسیر نے انہیں بتایا ہو۔

بُروج علماء اُمت کے نزدیک:

حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب مظہری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بُروج سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک بڑے بڑے ستارے ہیں، جو کہ آسمان کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت مجاہد، حضرت حسن بصری، حضرت ضحاک، حضرت قتادہ، حضرت سدی رضی اللہ عنہم کا یہی قول ہے۔ دوسرے بعض ائمہ تفسیر نے بُروج سے قصور، محل، قلعے وغیرہ مراد لئے ہیں، اور قصور ومحلات سے مراد وہ مکانات ہیں جو آسمان میں پہرہ داروں اور نگراں فرشتوں کے لئے مقرر ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بُروج سے بڑے بڑے ستارے مراد ہوں یا قصور ومحلات مراد ہوں یہ سب تخمینی چیزیں ہیں، ان میں کوئی ایک چیز بھی قطعی اور یقینی نہیں۔ اس لئے دونوں اقوال اپنی اپنی جگہ میں درست ہیں، اور سب قدرت

خداوندی کے دلائل اور کائنات کے انقلابات پر دلالت کنندہ ہیں اور توحید خداوندی کے اثبات پر واضح علامات و نشانات ہیں۔ فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ۔

البتہ یہاں اور چند دیگر مقامات پر جو یہ مذکور ہے کہ یہ ستارے آسمان کی زینت اور خوبصوتی ہیں، یہ صاف واضح طور پر عیاں ہے کہ آسمان کی خوبصورتی ستاروں سے ہے، نہ کہ قصور و محلات سے، جو نظر نہیں آتے۔

﴿وَزَیَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِیۡنَ﴾ آسمان کی خوبصورتی اور دلکشی و زینت ستاروں سے ہے۔ رات کے وقت جب بادل اور گرد و غبار نہ ہو، بے شمار اربوں ستاروں کے قمقموں سے آسمان دیکھنے والوں کی نظر میں کس قدر خوبصورت اور پر عظمت معلوم ہوتا ہے، اور غور و فکر کرنے والوں کے لئے اس میں کتنے نشان حق تعالیٰ کی صنعت کاملہ، قدرت بالغہ، حکمت عظیمہ اور وحدانیت مطلقہ کے پائے جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آسمان سے فرشتے اتارنے، یا ان کو آسمان پر چڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر یہ کفار ماننا چاہیں تو آسمان و زمین میں قدرت کے نشان کیا تھوڑے ہیں؟ جنہیں دیکھ کر عقلمند آدمی توحید کا سبق بہت آسانی سے حاصل کر سکتا ہے۔ ایسے روشن نشان دیکھ کر انہوں نے کیا معرفت حاصل کی؟ جو آئندہ توقع رکھی جائے۔

﴿وَحَفِظۡنٰهَا مِنۡ کُلِّ شَیۡطٰنٍ رَّجِیۡمٍ﴾ یعنی آسمانوں پر شیاطین کا کچھ عمل دخل نہیں چلتا، بلکہ بعثت محمد ﷺ کے وقت سے تو ان کا گزر بھی وہاں نہیں ہو سکتا۔ اب انتہائی کوشش ان کی یہ ہوتی ہے کہ ایک شیطانی سلسلہ قائم کر کے آسمان کے قریب پہنچیں، اور عالمِ ملکوت سے نزدیک ہو کر اخبارِ غیبیہ کی اطلاعات حاصل کریں، اس پر بھی فرشتوں کے پہرے بٹھا دیئے گئے ہیں کہ جب شیاطین ایسی کوشش کریں تو اوپر سے خوب ان پر آتشبازی کریں۔

نصوصِ قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ تکوینی امور کے متعلق آسمانوں پر جب کسی فیصلہ کا اعلان ہوتا ہے، اور خداوند قدوس جلّ جلالہ اس سلسلہ میں فرشتوں کی طرف وحی بھیجتا ہے، تو وہ اعلان ایک خاص کیفیت کے ساتھ اوپر سے نیچے کو درجہ بدرجہ پہنچتا ہے، جو بالآخر آسمان دنیا پر پہنچتا ہے۔ صحیح بخاری کی ایک روایت کے موافق عنان (بادل) میں فرشتے اس کا مذاکرہ کرتے ہیں، شیاطین کی کوشش ہوتی ہے کہ ان معاملات کے متعلق غیبی معلومات حاصل کریں، اسی طرح جیسے آج کوئی پیغام بذریعہ وائرلیس ٹیلیفون جا رہا ہو، اسے بعض لوگ راستے میں جذب کرنے کی تدبیر کرتے ہیں، ناگہاں اوپر سے "بم" کا گولہ (شہاب ثاقب) پھٹتا ہے، اور ان غیبی پیغامات کی چوری کرنے والے شیاطین کو مجروح یا ہلاک کر کے چھوڑتا ہے۔ اسی کشمکش، ہنگامہ اور دار و گیر میں جو ایک آدھ بات شیاطین کو ہاتھ

لگ جاتی ہے وہ ہلاک ہونے سے پیشتر بڑی عجلت کے ساتھ دوسرے شیاطین کو اور وہ شیاطین اپنے دوست انسانوں کو پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ کاہن لوگ اسی ادھوری سی بات میں سینکڑوں جھوٹ اپنی طرف سے ملا کر عوام کو غیبی خبریں بتلاتے ہیں۔ جب وہ ایک آدھ سماوی بات سچی نکلتی ہے تو ان کے معتقدین اسے ان کی سچائی کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں اور جو سینکڑوں بنائی ہوئی خبریں جھوٹی ثابت ہوتی ہیں، ان سے چشم پوشی کی جاتی ہے۔

قرآن وحدیث نے یہ واقعات بیان کر کے متنبہ کر دیا کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ، اور چھوٹی سی چھوٹی سچائی کا سرچشمہ وہ یہ عالم ملکوت ہے، شیاطین الجن والانس کے خزانہ میں بجز کذب وافترا کوئی چیز نہیں۔ نیز یہ کہ آسمانی انتظامات اس قدر پختہ اور مکمل ہیں کہ کسی شیطان کی مجال نہیں کہ وہاں قدم رکھ سکے، یا باوجود انتہائی جدوجہد کے وہاں کے انتظامات اور فیصلوں پر معتد بہ دسترس حاصل کر لے۔ باقی جو ایک آدھ جملہ اِدھر اُدھر کا فرشتوں سے سن بھاگتا ہے، حق تعالیٰ نے ارادہ نہیں کیا کہ اس کی قطعاً بندش کی جائے، وہ چاہتا تو اسے بھی روک دیتا، مگر یہ بات اس کی حکمت کے موافق نہ تھی۔ آخر شیاطین الجن والانس کو جن کی بابت اسے معلوم ہے کہ جبھی اغواء واضلال سے باز نہ آئیں گے، اتنی طویل مہلت اور مغویانہ اسباب ووسائل پر دسترس دینے میں کچھ نہ کچھ حکمت تو سب کو ماننی پڑے گی، اسی طرح کی حکمت یہاں بھی سمجھ لو۔

شیاطین کی آبادی انسانوں سے کہیں زیادہ ہے، وہ ان شہاب ثاقب کے ذریعہ ہر چند بکثرت مرتے اور زخمی ہوتے ہیں، مگر نہ وہ ختم ہوتے ہیں، اور نہ عبرت حاصل کرتے ہیں، کیونکہ یہ ہمہ گیر شرارت ان کی فطرت میں ہے، جو کسی طرح شرارت سے باز نہیں آتے ہیں۔

شہاب ثاقب اور شہاب مبین کی نشاندہی:

شہاب کے دو معنی ہیں: ایک لغوی، ایک اصطلاحی۔ لغت میں شہاب چمکنے والی آگ کو کہتے ہیں۔ اَلشھاب فِي اللغة اَلنَّارُ السَّاطعة۔ قرآن کریم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا: ﴿اَوْ اٰتِيْكُمْ بِشِهَابٍ قَبَسٍ لَّعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ﴾ [النمل:۷] (یا پھر تمہارے پاس آگ کا کوئی شعلہ اٹھا کر لے آؤں، تاکہ تم آگ سے گرمی حاصل کر سکو)۔ اس کے ساتھ یہاں مُبِیْن کی صفت مذکور ہے، بمعنی ظاہر۔ اور بعض دیگر مقامات پر اس کو ثاقب کی صفت کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے، جس کے معنی ہیں، چھیدنے والا، یعنی ایسی تیز آگ جو ہر چیز میں سے سوراخ کر کے گزر جاتی ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ﴾ [الصافات:۱۰]

(البتہ جو کوئی کچھ اچک لے جائے تو ایک روشن شعلہ اس کا پیچھا کرتا ہے)۔

اور اصطلاح میں اس روشنی کو کہتے ہیں جو فضاء میں شام کے بعد لمبی لکیر کی طرح نمودار ہوتی ہے، اور پھر آہستہ آناً فاناً غائب ہو جاتی ہے۔

اس شہاب کی حقیقت کیا ہے؟

جدید علم فلکیات کے ماہرین خود بھی وثوق سے اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے۔ وہ کہتے ہیں کہ آج تک ہم جتنی تحقیق سے جس نتیجہ پر پہنچے ہیں، وہ یہ ہے کہ نظام شمسی کا کوئی چھوٹا سا تارا ٹوٹتا ہے، جس کے اجزاء جب ہوا کے کرہ میں داخل ہوتے ہیں تو رگڑ سے بھڑک اٹھتے ہیں۔

انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں ہے کہ ہم شہاب ثاقب کی ماہیت کے متعلق آج جو بہترین توجیہ بیان کر سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ نظام شمسی کا کوئی چھوٹا سا تارا ٹوٹتا ہے، اس ٹوٹنے والے تارے کا بیشتر حصہ ہماری فضاء میں پہنچنے سے پہلے یا تو گرد بن جاتا ہے، یا بخارات میں تبدیل ہو کر اڑ جاتا ہے، اور اقل قلیل ہماری فضاء میں پہنچ کر دکھائی دیتا ہے، اور اس کے کئی ٹکڑے زمین پر بھی گر پڑتے ہیں، جسے باقاعدہ لوگ دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں، پھر بڑے پیمانے پر وہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور انہیں دیکھتے ہیں۔

اور جدید علوم فلکیات کے ماہرین حکومتی سطح پر اسے محفوظ کر کے رکھ دیتے ہیں، اور وزن کرنے کے بعد کسی عجائب گھر کی زینت بنا دیتے ہیں۔ موجودہ وقت میں شہاب ثاقب کے ٹکڑے مختلف عجائب خانوں میں موجود ہیں، سب سے بڑے ٹکڑے کا وزن چالیس ٹن تقریباً (۱۱۲۰) من ہے، اور یہ ٹکڑا جنوب مغربی افریقہ میں ہے۔ اس سے کم وزن کا ایک ٹکڑا جو گرین لینڈ میں گرا تھا، اس کا وزن (36½) ٹن ہے، اسے کمانڈر پیری وہاں سے اٹھوا کر نیو یارک امریکا لے آیا۔

انسائیکلو پیڈیا گلولیرا، اٹھارہویں صدی پیرس کی سائنس اکیڈمی نے شہاب ثاقب کا بالکل انکار کیا تھا، اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ سارے نمونے جو مختلف عجائب گھروں میں ہیں، سب فرضی ہیں، اور جن لوگوں نے ان کے گرنے کی چشم دید گواہیاں اور شہادتیں دی ہیں انہوں نے جھوٹ بولا ہے، لیکن اٹھارہ سو تین میں پیرس کے قریب ہی تین ہزار شہاب ثاقب کا مینہ برسا، اس طرح قدرت نے ان تمام سائنسدانوں کے غرور کو توڑا، اور ان کی کم علمی کا پردہ چاک کیا۔ [انسائیکلو برٹانیکا پیڈیا، جلد ۱۵ ص ۱۴۱۳]

اسی ضمن میں سائنسدان حجر اسود کے متعلق بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یہ زمینی پتھر نہیں ہے، بلکہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز ہے، انہوں نے اپنی کم علمی کے باعث اسے بھی شہاب ثاقب تصور کیا ہے، لیکن یہ ان کی کم علمی ہے۔ بہر حال اس بات کا انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ وہ یہاں کا پتھر نہیں ہے۔ جب تک یونانی علم ہیئت کے زیر اثر ہم یہ سمجھتے رہے کہ زمین سے خشک بخارات اٹھتے ہیں، اور جب وہ کرۂ ناری کے قریب پہنچتے ہیں تو جل اٹھتے ہیں، انہی جلنے والے بخارات کو شہاب ثاقب کہا جاتا ہے، تو ہمیں قرآن کریم کی ان آیات کا مفہوم بیان کرنے کے لئے بڑی دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا، لیکن جدید تحقیقات سے جب یہ ثابت ہو گیا کہ شہاب ثاقب نظام شمسی کے کسی ٹوٹنے والے تارے کا جدا شدہ ٹکڑا ہے، تو اب معاملہ بہت حد تک واضح ہو گیا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ ان شہابوں سے شیطانوں کے روکنے کا کام کیوں لیا جاتا ہے؟ اگر آپ موجودہ تحقیقات کی روشنی میں اس کی کوئی علمی توجیہ پیش کرنے سے قاصر ہیں، تو جلد بازی میں ان کا انکار نہ کیجیے، اور اس پر یقین رکھیے کہ یہ سچ ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ مالک الملک کا فرمان ہے اور اس کے نبی کریم ﷺ کا واضح ارشاد ہے۔ اُسے بھی سردست ان ہی مسائل میں سے شمار کیجیے، جن کو عقل انسانی ابھی تک نہیں سمجھ سکی ہے، اور انتظار کیجیے کہ مستقبل میں کئی دوسری پیچیدہ گرہوں کی طرح اس عقدہ کی بھی گرہ کشائی کردے۔ بِاِذْنِ اللهِ تعالیٰ۔

﴿وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ﴾ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا﴾ [النبأ:٦] (کیا ہم نے زمین کو بچھونا نہیں بنایا؟)۔ اور پہاڑوں کے بارے میں فرمایا: ﴿وَجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ﴾ [المرسلات:٢٧] (اور ہم نے اس میں گڑھے ہوئے اونچے اونچے پہاڑ پیدا کیے)۔ پانی کے بارے میں فرمایا: ﴿وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا﴾ [المرسلات:٢٧] (اور تمہیں میٹھے پانی سے سیراب کرنے کا انتظام کیا)۔

اسی طرح اگر آپ پورے قرآن حکیم میں غور کریں گے تو انعامات و احسانات کو فصاحت و بلاغت کے مختلف الفاظ کے رنگوں میں پائیں گے۔ عالم بالا کے انعامات کے بعد عالم سفلی کی سب سے بڑی نعمت زمین کا تذکرہ فرما کر اپنے بندوں کو غور و فکر کی دعوت دی۔ فرمایا:

ذرا اس زمین کو بھی دیکھو جس پر سوار ہو، اور اس پر بستے ہو کہ ہم نے اسے کتنا کشادہ کر دیا۔ اربوں کی تعداد میں تو صرف انسان یہاں رہتے ہیں، بستے ہیں، پھر ان کے رہنے کے مکانات ہیں، سو سو میلوں پر پھیلے ہوئے فیکٹریاں، کارخانے اور بازار ہیں، اور اسی کے ساتھ وسیع و عریض سیر گاہیں ہیں، اس کے مزروعہ رقبہ کا شمار اتنا وسیع و

طویل ہے جس کا اندازہ کرنا طوق بشر سے باہر ہے۔ انسانوں کے علاوہ بے شمار قسم کے حیوانات، چرند پرند، لاتعداد جانداروں کا یہ مسکن ہے، اس کی کشادگی کا اندازہ کرنا ہو تو ذرا ان صحراؤں، جنگلوں کو دیکھو، جو لاکھوں میلوں کے رقبہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔

پھر ان بلند و بالا فلک بوس رنگ برنگے پہاڑوں کو دیکھو، جو اپنی جگہ کیل کی طرح ٹکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ نماز پڑھ کر التحیات پر بڑے سکون کے ساتھ بیٹھے ہوئے ہیں، اور بے شمار معدنیات، جواہرات اور قیمتی لوہے اور دھاتوں سے لدے ہوئے ہیں، یہ سب چیزیں اسی کی پیدا کی ہوئی زمین میں سمائی ہوئی ہیں، اور پھر بھی زمین کا بیشتر حصہ غیر آباد اور بنجر ہے۔ تو جس قادر مطلق نے اتنی وسیع زمین بنائی ہے اور اس میں تمہاری آسائش کے لئے ہر ضروری سامان مہیا کر دیا ہے، پھر اس کی الوہیت اور وحدانیت سے انحراف کرنا نمک حرامی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

﴿وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ﴾ اور ہم نے اس میں ایک معین مقدار سے ہر قسم کی چیز اگائی۔

قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کے ایک اور عجیب شاہکار کا بیان:

علامہ زمخشری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کشاف میں اس کا معنی یہ کیا ہے کہ ہر چیز کو حکمت کے میزان پر تولا گیا ہے، اور ہر چیز کو اتنی ہی مقدار بخشی گئی ہے جو اس کے لئے مناسب ہے، اس میں نہ زیادتی کی گنجائش ہے اور نہ کمی کا احتمال۔ اب اگر آپ کسی چیز پر سرسری نظر ڈالیں گے تو آپ کو اس میزانِ حکمت کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا، ہر چیز کے لئے خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان، نباتات ہو یا جمادات، معین مقدار، اور مخصوص قد و قامت اور مخصوص خاصیتیں رکھ دی ہیں، جن میں کہیں کمی بیشی، رد و بدل آپ کو دکھائی نہیں دے گا۔

کسی کی محنت سے انگور کا دانہ سیب کے برابر نہیں ہو سکتا، اور سیب تربوز جتنا نہیں بن سکتا، اور گندم کے پودے پر انار نہیں لگ سکتے، مرغی پر محنت کرنے سے وہ بکری نہیں بن سکتی۔ آپ کسی انسان پر ہزار محنت کریں، وہ آٹھ، نو، دس فٹ قد و قامت نہیں حاصل کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کے لئے قدرت نے جو مقدار، اندازہ، خاصیت اور نشو و نما حکمت کے میزان پر تول کر رکھے ہیں، اس میں کہیں بھی، کسی بھی تدبیر سے زیادتی کی ممکن نہیں۔ ہر چیز ترقی کے مدارج طے کرتے ہوئے جب اپنی مقدار پر پہنچ جاتی ہے تو مزید بڑھنے سے رک جاتی ہے۔ ہر چیز ہمارے سامنے ہے، جس کا صبح و شام باقاعدہ مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے جو پیمانہ مقرر کیا ہے، تمام عالم پر اسی پیمانے کی حکومت ہے اور اسی کی حکمرانی ہے۔ آپ پہاڑ برابر جہاز بنا سکتے ہیں، مگر بلّی کو ہاتھی نہیں بنا سکتے۔

﴿وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ﴾ اور ہم نے تمہارے لئے زمین میں زندگی کے سامان پیدا کردیئے۔ انسان کی بقاء، ترقی، خوشحالی اور معیشت کے ان گنت بے شمار سامان، نیز اسباب ووسائل، سب اللہ تعالیٰ نے مہیا فرمایا تاکہ انسان دربدر ٹھوکر کھانے سے محفوظ ہو۔

﴿وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ﴾ اور ہم نے تمہارے لئے وہ چیزیں پیدا کیں جنہیں تم رزق دینے والے نہیں ہو۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ مَعَايِشَ پر معطوف ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہارے لئے معیشت کی چیزیں پیدا فرمائیں، جنہیں تم استعمال کرتے ہو، اور جن سے تم خدمت لیتے ہو، ان کو بھی پیدا فرمایا، یعنی اہل وعیال، باندی، غلام اور نوکر وچاکر، مال مویشی، اور چوپائے وغیرہ پیدا فرمائے۔ تم ان چیزوں سے کام لیتے ہو، اور روزی اللہ تعالیٰ دیتا ہے، وہ تمہارا بھی رازق ہے، اور ان چیزوں کا بھی رازق ہے۔

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ﴾ کوئی ایسی چیز نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں۔

﴿وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ اور ہم اس کو صرف بقدر معلوم ہی نازل کرتے ہیں۔ اس میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بہت بڑی ہے، جو کچھ پیدا ہوتا ہے اس کی مشیت سے پیدا ہوتا ہے، اور اس کی حکمت کے مطابق ہوتا ہے۔ ہر قسم کے دنیوی، اخروی، مادی، روحانی خزانے اس کے پاس ہیں۔ جس طرح اس کی نعمتیں بے شمار اور احاطہ سے باہر ہیں، اسی طرح اس کے خزانوں کا احاطہ بھی ناممکن ہے۔ وہ اپنے خزانوں میں سے حکمت ومصلحت کے موافق نازل فرماتے رہتے ہیں، جتنا چاہے اتار دے، جتنا چاہے روک دے، ہر پہلو پر اس کی حکمت کارفرما ہے۔

❀ ❀ ❀

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿۲۲﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿۲۴﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَحْشُرُهُمْ ۭ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵﴾

ترجمہ: اور ہم نے ہواؤں کو بھیج دیا، جو بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں، پھر ہم نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے تمہیں وہ پانی پلا دیا، تم اتنا پانی جمع کرنے والے نہیں ہو ﴿۲۲﴾ اور بلا شبہ ہم زندہ کرتے ہیں، اور موت دیتے ہیں، اور ہم ہی وارث ہیں ﴿۲۳﴾ اور بلا شبہ ہمیں معلوم ہیں جو تم میں سے پہلے لوگ ہیں، اور بلا شبہ ہمیں معلوم ہیں جو

تمہارے بعد آنے والے ہیں﴿۲۴﴾اور بلاشبہ آپ کا ربّ ان سب کو جمع فرمائے گا، بیشک وہ حکیم ہے، علیم ہے ﴿۲۵﴾

معارف ومنازل

فرمایا: ہم نے ہواؤں کو بھیج دیا جو بادل کو پانی سے بھرنے والی ہیں، اور پھر ہم نے آسمانوں سے پانی اتارا، اور پھر ﴿فَاَسْقَیْنٰكُمُوْهُ﴾ وہ پانی ہم نے تمہیں پلایا۔ یہ بارش برسانے کی نعمت کا بیان ہے۔ ہوائیں مبشرات لاتی ہیں، پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو لے آتی ہیں، پھر جہاں اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے وہاں بادل پانی برسا دیتا ہے، اس سے زمین سیراب ہوکر طرح طرح کی غذائی اشیاء پیدا ہوتی ہیں، اور تمہارے مال ومویشی کے لئے چارہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی پانی کو ڈیموں میں بند باندھ کر جمع کرتے ہو، تمہارے سال بھر کے پینے کا بھی انتظام ہوجاتا ہے۔

﴿وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ﴾ اور تم اس پانی کو جمع کرنے والے نہیں ہو، تمہیں کوئی قدرت نہیں کہ پانی پیدا کرو، ہوائیں چلاؤ، بادلوں کا انتظام کرو، ان میں پانی بھر دو، پھر بادلوں سے پانی برساؤ، یہ تمہارے بس کی چیز نہیں، یہ سب کچھ تمہارے پروردگار کا کرم ہے کہ اس پانی کے نظام کے لئے ہوائیں بھیجتے ہیں، پھر وہ ہوائیں سمندر کے ترش پانی کو بادلوں میں ڈالتی ہیں، تخم ریزی کرکے۔ یہ ﴿لَوَاقِحَ﴾ کا ترجمہ ہے۔

پھر بادل اس پانی کو اپنے اندر جمع کرتے ہیں، پھر ہوائیں بادلوں کو اٹھا کر وہاں پہنچا دیتی ہیں جہاں بارش کا حکم ہے۔ صحراؤں پر بارش برسا کر باقی پورے سال کے لئے پانی کو ذخیرہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام کیا کہ بڑے بڑے اونچے پہاڑوں پر برف باری ہوتی ہے، وہ برف سال بھر وہاں صاف ستھری رہتی ہے، پھر گرمی کے دنوں میں یہ ذخیرہ آہستہ آہستہ پگھل کر چشموں کے ذریعہ دریا میں گرتا رہتا ہے، جس سے پورے سال بآسانی انسانوں اور جانوروں کی ہر قسم کی ضروریات بآسانی پوری ہوجاتی ہیں، اور خوب کھیتی باڑی کا انتظام ہوجاتا ہے۔ ﴿وَمَآ اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِیْنَ﴾ کی مختصر تشریح بیان ہوگئی۔

﴿وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ﴾ بلاشبہ ہم زندہ کرتے ہیں، اور موت دیتے ہیں، اور ہم باقی رہنے والے ہیں۔ سورۂ مریم میں فرمایا: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَیْهَا﴾ [مریم: ۴۰] (یقیناً زمین اور اس پر سارے رہنے والوں کے وارث ہم ہی ہوں گے)۔ ﴿وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [آل عمران: ۱۸۰] (اور آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے)۔ تمام کائنات اور تمام مخلوقات فنا اور موت کی زد میں ہیں۔

﴿اَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ [البقرة: ۲۸۲] (مقرر وقت) کی آمد پر کچھ باقی نہیں رہے گا، صرف اللہ تعالیٰ کے لئے بقاء ہے، اور کسی کے لئے نہیں۔

بندوں کے پاس جو کچھ ہے، وہ عاریۃً ہے، درحقیقت کوئی کسی چیز کا مالک نہیں۔ جوں ہی زوال کا وقت آئے گا سب کچھ اصلی مالک کے قبضہ میں ہی چلا جائے گا، اور وہ خود اعلان فرمائے گا: ﴿لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ﴾ [غافر: ۱۶] (آج کس کی حکومت ہے؟) جواب یہ ہے: ﴿لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ﴾ [غافر: ۱۶] (اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جو غالب اور تنہا ہے)۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ﴾ اور بلا شبہ ہمیں وہ لوگ معلوم ہیں جو تم سے پہلے تھے، اور بلا شبہ وہ لوگ ہمیں معلوم ہیں جو تمہارے بعد آنے والے ہیں۔ صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے مستقدمین اور مستأخرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں، وہ یہ ہیں:

متقدمین وہ لوگ ہیں جو اب تک پیدا ہو چکے ہیں، اور متأخرین وہ ہیں جو ابھی پیدا نہیں ہوئے۔ [قتادة، عکرمة] متقدمین سے مراد اموات ہیں، اور متأخرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو زندہ ہیں۔ [ابن عباس، ضحاک] متقدمین سے مراد گزشتہ اُمتیں، اور متأخرین سے مراد اُمت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہے۔ [مجاهد] متقدمین سے اہل خیر، اور متأخرین سے مراد اہل معاصی ہیں۔ [قتادة وحسن بصری] متقدمین وہ لوگ ہیں جو نماز اور جہاد کی پہلی صفوں میں ہوتے ہیں، اور متأخرین سے مراد پچھلی صفوں والے ہیں۔ حسن بصری، سعید بن مسیب، قرطبی، شعبی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ ائمہ تفسیر کی یہی تفسیر ہے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ آیت کریمہ کا عموم ان تمام معانی کو شامل ہے زمانہ کے اعتبار سے، اگلے پچھلے اعمال کے اعتبار سے، اعمال میں آگے بڑھنے والے اور پیچھے رہ جانے والے، اللہ تعالیٰ شانہ کو ان سب کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنے علم کے مطابق جزا دے گا، اور جب میدان حشر میں آئیں گے تو سب کے لئے فیصلہ ہو جائے گا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۶﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ ﴿۲۷﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿۲۸﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿۲۹﴾ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ

كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝۳۰ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۱ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ۝۳۲ قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝۳۳ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝۳۴ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝۳۵

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے انسان کو بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا، جو سیاہ رنگ کے سڑے ہوئے گارے سے بنی تھی ۝۲۶ اور ہم نے جن کو اس سے پہلے آگ سے پیدا کیا، جو ایک گرم ہوا سے تھی ۝۲۷ اور جب آپ کے ربّ نے فرشتوں سے فرمایا کہ بلاشبہ میں بشر کو بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کرنے والا ہوں، جو سیاہ رنگ کے سڑے ہوئے گارے سے ہوگی ۝۲۸ سو جب میں اسے پوری طرح بناؤں، اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو اس کے لئے سجدہ میں گر پڑنا ۝۲۹ سو تمام فرشتوں نے اکٹھے ہو کر سجدہ کیا ۝۳۰ مگر ابلیس نے نہیں کیا، اس نے اس بات سے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہو ۝۳۱ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے اس بات پر کس نے آمادہ کیا کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ نہ ہوا؟ ۝۳۲ ابلیس نے کہا: میں ایسے بشر کو سجدہ کرنے والا نہیں ہوں جسے آپ نے بجتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا، جو سیاہ رنگ کے سڑے ہوئے گارے سے بنی ہے ۝۳۳ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو تو اس سے نکل جا، کیونکہ تو مردود ہے ۝۳۴ اور قیامت کے دن تک تجھ پر لعنت رہے گی ۝۳۵

معارف ومنازل

آیت کریمہ میں تینوں مخلوقات کے اصول کا بیان ہے، اور اصول بھی تین ہیں۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام، اور ابوالجن الجانّ اور ابوالشیاطین ابلیس لعین۔ جمہور مفسرین کے نزدیک جانّ بتشدید نون، جنّوں کا باپ ہے، جو ایسی لطیف آگ سے پیدا کیا گیا جو لطافت کی وجہ سے مسامات میں گھس جاتی ہے، خون میں شامل ہوکر۔ كما في الحديث۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جانّ سب جنّوں کے باپ کا نام ہے، اور حسن بصری اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ جانّ شیاطین کے باپ کا نام ہے۔ ان دونوں قولوں میں یہ فرق ہے کہ جنّوں میں مسلمان بھی ہیں اور کافر بھی، وہ کھاتے پیتے ہیں، اور پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ ان کا حال انسانوں جیسا ہے، بخلاف شیاطین کے کہ ان میں کوئی مسلمان نہیں، اور نہ وہ مرتے ہیں، وہ سب کے سب ابلیس کے ساتھ مریں گے یوم الموعود

کے دن، جب کہ اس روز ان کا باپ مرے گا تو یہ بھی مریں گے۔ [قرطبي، خازن]

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنّات وشیاطین ایک جنس کی دو نوع ہیں، یعنی شیاطین جنّات کی ایک خاص قسم ہے، یعنی جنّات میں جو مؤمن ہیں ان کو شیطان نہیں کہتے، اور جو کافر ہیں وہ شیاطین ہیں۔ ملائکہ کی پیدائش نُور سے ہے، جنّات کی آگ سے ہے، اور بنی آدم کی مٹی سے ہے۔ حیوانات کی پیدائش کا معلوم نہیں کہ وہ کس چیز سے پیدا ہوئے ہیں، اور کب پیدا ہوئے۔ اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان کی پیدائش قدیم ہے۔ واللہ اعلم

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ﴾ بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو، یعنی آدم علیہ السلام کو بجتی ہوئی مٹی سے جو بنی تھی سڑے ہوئے گارے سے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اصل اور ابتداء تراب ہے، یعنی زمینی خاک کے متفرق اجزاء، پھر فرشتوں نے اس کو پانی میں تر کر کے گارا بنایا، وہ ﴿طِيْن﴾ ہوگئی، پھر چند وقت کے بعد وہ ﴿طِيْنٍ لَازِبٍ﴾ یعنی لیس دار چمکتی ہوئی، پھر ﴿حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ﴾ یعنی سڑا ہوا بد بودار ہوگیا، پھر خشک ہو کر وہ ﴿صَلْصَال﴾ بجنے والی، آواز کرنے والی بن گئی۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ﴾ [الرحمن: ۱۴] (انسان کو بجنے والی مٹی سے پیدا فرمایا)۔ فخّار اس مٹی کو کہتے ہیں جو آگ میں پکائی گئی ہو۔ صَلْصَال اس خشک شدہ کیچڑ کو کہتے ہیں جسے اگر انگلی سے ٹکرایا جائے تو وہ بجنے لگے، آواز کرے۔ حَمَأ اس مٹی کو کہتے ہیں جو کافی دیر پانی میں رہ کر سیاہ ہوگئی ہو۔ مَسْنُوْن اس کا معنی بد بودار بھی ہے، اور قالب میں ڈھلا ہوا بھی، یہاں دونوں معنی مراد لئے جاسکتے ہیں۔ فخّار اس خشک شدہ مٹی یا قالب کو کہتے ہیں جس کو آگ میں پکایا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ علماء لغت نے لکھا ہے کہ مختلف حالتوں میں مٹی کے مختلف نام ہیں۔ پانی میں بھگونے سے پہلے اُسے تُراب کہتے ہیں، پانی میں بھیگ جائے تو اُسے طِیْن کیچڑ کہتے ہیں، اور جب کافی عرصہ پانی میں بھیگی رہے، یہاں تک کہ اس کی رنگت سیاہ ہوجائے، تو اسے حَمَأ کہتے ہیں، اور جب اس میں بُو پیدا ہوجائے یا اس کو کوئی صورت دی جائے تو اُسے مَسْنُوْن کہتے ہیں، اور جب وہ خشک ہوجائے تو اُسے صَلْصَال کہتے ہیں، اور جب اسے آگ میں پکالیا جائے تو اُسے فخّار کہتے ہیں۔

اِن ساری اقسام، حالات، اور ادوار سے گزر کر انسان کی تخلیق ہوئی ہے۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ۱۴] (برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے)۔ یہ ہے انسان کی تخلیق۔ اور

انسان کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے جانّ، یعنی ابوالجن کو لُو کی آگ سے پیدا فرمایا۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ﴾ جب تیرے ربّ نے فرشتوں سے کہا کہ میں کھنکھناتی ہوئی، سڑی ہوئی، کالی کیچڑ سے ایک آدمی کا پتلا بنانے والا ہوں، سو جب میں اس کو پورا بنا چکوں، اور اس میں اپنی خاص روح پھونک دوں جس سے وہ زندہ ہو جائے، تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔

یہ سجدہ تحیہ و تعظیم تھا، جو آدم علیہ السلام کی برتری ثابت کرنے کے لئے تھا، اور اس وقت جائز تھا۔ اب ہماری شریعت میں حرام اور شرک ہے۔ سو جب اللہ تعالیٰ ان کو بنا چکا تو تمام فرشتوں نے اکٹھے ہو کر یکبارگی ہی اس کا سجدہ کیا، مگر ابلیس نے تکبر کی وجہ سے سجدہ کرنے والوں کے ساتھ ہونے سے انکار کر دیا۔ اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ وہ ملائکہ میں سے نہ تھا، بلکہ ان کے ساتھ رہتا تھا، اور خوب عبادت کرتا تھا۔ دوسری آیت میں اس کی وضاحت ہے: ﴿اِلَّآ اِبْلِيْسَ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ [الکھف: ۵۰] (سوائے ابلیس کے، وہ اپنے ربّ کے حکم سے نکل گیا)۔ ابلیس نے غرور سے اپنے کو بڑا سمجھا اور حسد کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بڑا نہیں سمجھا، اور غلط قیاس کر کے ابدی لعنتی ہو گیا۔ چنانچہ فرمایا:

﴿قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ﴾ اے ابلیس! تجھے کیا امر مانع ہوا کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل نہ ہوا؟ حالانکہ مقرب فرشتے بلا چون و چرا حکم مانتے ہوئے سجدہ کر چکے؟ اس پر ابلیس نے جواب دیا کہ میں وہ نہیں ہوں کہ ایک بشر کو سجدہ کروں، جسے تو نے کھنکھناتی ہوئی، سڑی ہوئی، سیاہ کیچڑ سے پیدا کیا۔ یعنی جب میں اس سے بہتر ہوں، تو کیسے کسی کمتر کا سجدہ کروں؟ یہ برعکس معاملہ ہے کہ برتر اپنے سے کمتر کے سامنے سجدہ کرے۔ بالفاظ دیگر میری پیدائش جسم لطیف آگ سے ہے جو کہ افضل ہے، اور اس کی پیدائش جسم کثیف مٹی سے ہے، جو کہ مفضول اور کمتر ہے۔

اس لعین نے نص صریح، یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مقابلہ میں غلط قیاس کر کے، یہ نہ سوچا کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہر چیز سے افضل ہے، اور واجب الاتباع ہے، اور اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ نورانی فرشتے آگ اور مٹی دونوں سے افضل ہیں، جب وہ حکم مانتے ہوئے سجدہ کر رہے ہیں، تو میرے لئے انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ مزید دیکھنا ہو تو سورۂ بقرہ میں دیکھیں۔

﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ﴾ یہ سب کچھ جو ہو رہا تھا، یا ہو چکا اللہ تعالیٰ شانہ کے علم ازلی میں لکھا

ہوا تھا، اس کی حقیقت کھولنے کی خاطر دنیا والوں کو بتایا جا رہا ہے تاکہ وہ شیاطین سے ہوشیار رہیں اور حکم عدولی اور تکبر سے اجتناب کریں، پس حکم ہوا کہ اے مغرور سرکش! تیری سزا یہ ہے کہ یہاں سے نکل جا، راندہ اور لعنتی ہو کر اور قیامت تک تجھ پر میری لعنت ہے، میری رحمتوں سے دوری ہے۔

قَالَ رَبِّ فَأَنْظِرْنِيْٓ إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ﴿۳۷﴾ إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ أَغْوَيْتَنِيْ لَأُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْأَرْضِ وَلَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ إِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِيْنَ ﴿۴۳﴾ لَهَا سَبْعَةُ أَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ﴿۴۴﴾

ترجمہ: ابلیس نے کہا: اے ربّ! سو آپ مجھے اس دن تک کی مہلت دیدیجئے جس دن تک لوگ اٹھائے جائیں گے ﴿۳۶﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: سو بلاشبہ تجھے مہلت دی گئی ہے ﴿۳۷﴾ معین وقت کی تاریخ تک ﴿۳۸﴾ ابلیس نے کہا: اے ربّ! اس سبب سے کہ آپ نے مجھے گمراہ کیا، میں ان کے لئے زمین میں ضرور بالضرور مزین کروں گا، اور ضرور بالضرور ان سب کو گمراہ کروں گا ﴿۳۹﴾ سوائے آپ کے ان بندوں کے جو منتخب کر لئے گئے ﴿۴۰﴾ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا: یہ سیدھا راستہ ہے، جو مجھ تک پہنچانے والا ہے ﴿۴۱﴾ بلاشبہ میرے بندوں پر تیرا بس نہ چلے گا، سوائے گمراہوں کے، جو تیرا اتباع کریں گے ﴿۴۲﴾ اور بلاشبہ ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے ﴿۴۳﴾ اس کے سات دروازے ہیں، ہر دروازے کے لئے ان میں سے ایک ایک حصہ تقسیم کر دیا گیا ہے ﴿۴۴﴾

معارف ومنازل

ابلیس نے ملعونیت منظور کرتے ہوئے نہ توبہ کی، اور نہ استغفار اور نہ کوئی پشیمانی، بلکہ جذبہ انتقام کی خاطر اللہ تعالیٰ سے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت مانگی، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی درخوست منظور فرماتے ہوئے اسے قیامت تک کی مہلت دے دی۔ سبحان اللہ! یہ وہ غفور رحیم ہے، جس کی کرم نوازیوں کا یہ حال ہے کہ اپنے دشمن اور اپنے برحق بندوں کے دشمن کی درخواست بھی منظور فرماتے ہیں، تو پھر ہمیں اپنے مہربان ربّ سے یہی اُمید ہے کہ ہماری

درخواستیں منظور ہی فرمائیں گے، اور ابلیس کی کارستانیوں سے ہماری حفاظت فرما کر ہمیں خاتمہ بالخیر کی نعمت سے سرفراز فرمائیں گے۔ اَللّٰھمَّ اٰمین مِأۃ ألفِ۔ اٰمین

﴿قَالَ رَبِّ فَاَنۡظِرۡنِیۡۤ اِلٰی یَوۡمِ یُبۡعَثُوۡنَ﴾ اے میرے ربّ! مجھے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت دیجئے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے منظور فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: بے شک تو ان لوگوں میں سے ہے جنہیں وقت معلوم تک مہلت دی گئی۔ صاحب روح المعانی﴿الۡوَقۡتِ الۡمَعۡلُوۡمِ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس سے قیامت کے دن کا نفخہ اولیٰ مراد ہے۔ یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور جمہور علماء کرام کا بھی قول ہے۔

صاحب روح المعانی اور علامہ قرطبی وغیرہم نے لکھا ہے، اور حضرت کعب احبار سے نقل کیا ہے کہ نفخہ اولیٰ کے بعد حق سبحانہ وتعالیٰ کا ملک الموت کو حکم ہوگا کہ ابلیس کی روح قبض کرلو، ابلیس لعین حضرت ملک الموت کو دیکھ کر مشرق کی طرف بھاگے گا، پھر مغرب کی طرف، ہر طرف ملک الموت سامنے نظر آئیں گے، پھر سمندروں میں گھسنا چاہے گا، سمندر بھی قبول نہ کریں گے، اسی طرح زمین میں بھاگا بھاگا پھرے گا، لیکن اُسے کسی جگہ پناہ نہ ملے گی۔ دیگر بہت سے فرشتے جو حضرت ملک الموت کے ساتھ ہوں گے اسے سنڈاسیوں کے ساتھ پکڑ لیں گے، اس کی نزع کی کیفیت شروع ہوجائے گی، اور اِلٰی ماشاء اللہ نزع کے عذاب شدید میں رہے گا۔ پھر اس کی منحوس وناپاک روح قبض کرلی جائے گی۔ عَلیهِ اللّعنة

﴿قَالَ رَبِّ بِمَاۤ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاُزَیِّنَنَّ لَهُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَلَاُغۡوِیَنَّهُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ﴾ ابلیس نے ڈھٹائی اور دلیری سے کہا: اے میرے ربّ! چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا، اور میری ملعونیت کا سبب آدم بن گیا، اور جب مجھے لمبی عمر اور مہلت مل گئی، تو میں بھی کسی طرح خاموش نہیں رہوں گا۔ ﴿ثُمَّ لَاٰتِیَنَّهُمۡ مِّنۡۢ بَیۡنِ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمِنۡ خَلۡفِهِمۡ وَعَنۡ اَیۡمَانِهِمۡ وَعَنۡ شَمَآئِلِهِمۡ ؕ وَلَا تَجِدُ اَکۡثَرَهُمۡ شٰکِرِیۡنَ﴾ [الأعراف:۱۷] (پھر میں ان پر حملہ کروں گا ان کے سامنے سے بھی، اور ان کے پیچھے سے بھی، اور ان کی دائیں طرف سے بھی، اور ان کی بائیں طرف سے بھی، اور تو ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر گزار نہیں پائے گا)۔

میں ان کے سرمایہ فطرت پر ایسا ڈاکہ ڈالوں گا کہ انہیں آپ کی بندگی سے ہٹا کر اپنا غلام وبندہ بناؤں گا، پھر سخت سے سخت بدصورت گناہوں پر خوبصورت لیبل لگا کر گناہوں پر انہیں فریفتہ بناؤں گا، اور خوبصورت نیکیوں کو ان کی نظر میں بدصورت ظاہر کر کے انہیں محروم کردوں گا، ان کی اکثریت پر مجھے پورا تسلّط حاصل رہے گا۔ البتہ نہایت

قلیل مخصوص طبقہ جن پر تیرا فضل وکرم ہوگا وہ میری گرفت سے محفوظ رہیں گے۔

یہ ہے شیطان کی دھمکی، اوراس کا اظہارِ خیال۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ایک خالی خولی ناکام دھمکی تھی یا اس کی کوئی حقیقت نفس الامری بھی ہے؟ تو سنیے ربّ العزّت سبحانہ کا فرمان سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ إِبْلِيسُ ظَنَّهُ فَاتَّبَعُوهُ إِلَّا فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ﴾ [سبأ: ۲۰] (واقعی ان لوگوں کے بارے میں ابلیس نے اپنا خیال درست پایا، چنانچہ لوگ اسی کے پیچھے چل پڑے، سوائے اس گروہ کے جو مومن تھا)۔

پہلے دن ابلیس نے تخمینہ کر کے کہا تھا: ﴿لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [الإسراء: ۶۲] (میں ضرور آدم کی اولاد کو لگام ڈالوں گا، تھوڑے لوگوں کو چھوڑ کر)۔ اور حق تعالیٰ کے حضور ابلیس نے ڈھٹائی اور غرور کے ساتھ قسم کھا کر کہا تھا کہ: ﴿فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ﴾ [ص: ۸۲] (تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو بہکاؤں گا، سوائے ان میں سے تیرے چنے ہوئے بندوں کے)۔ اب دیکھیں! جیسا شیطان نے کہا ویسا ہو گیا، اللہ تعالیٰ کے ماننے والے مٹھی بھر لوگ ہر زمانے میں رہے، اور پوری انسانیت ابلیس کی گود میں رہ کر جہنمی طریقوں پر گامزن رہی۔ قیامت کے دن ہزار میں سے جنت کے لئے ایک اور جہنم کے لئے (۹۹۹) کا اعلان ہوگا۔ [بخاري]

﴿قَالَ هَٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيمٌ﴾ یعنی بیشک بندگی اور اخلاص کی راہ سیدھی مجھ تک پہنچتی ہے، اور یہی میرا صاف و پاکیزہ اور سیدھا راستہ ہے، جس میں کوئی ہیر پھیر نہیں، اور جو بندے اخلاص وعبودیت کی راہ اختیار کریں گے، وہ شیطان لعین کے تسلّط سے محفوظ رہیں گے، اور جنت تک ان کی رسائی ہوگی، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر شیطان کا راستہ اختیار کریں گے وہ جنت سے کٹ کر دوزخ میں گر جائیں گے، اور اپنے پیشوا ابلیس کی معیت ورفاقت میں ابدالآباد جہنم کی سزا بھگتیں گے۔

اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو گمراہ نہیں ہونے دے گا، اور انہیں شیطان سے ایسے بچائے گا جیسے ایک شخص اپنے بھیڑ بکریوں کو بھیڑیئے سے بچائے، بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ اَلحمدُلِلّٰہ۔ فرمایا:

﴿إِنَّ عِبَادِي لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ إِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِينَ﴾ بیشک میرے مخلص بندوں پر تیرا مکر نہیں چلے گا، اور گمراہ لوگ تیری بات مانیں گے۔ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِينَ

اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾[النحل:۱۰۰] (اس کا بس ایسے لوگوں پر نہیں چلتا جو ایمان لائے ہیں، اور اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے ہیں۔ اس کا بس تو ان لوگوں پر چلتا ہے جو اسے دوست بناتے ہیں، اور اللہ کے ساتھ شرک کا ارتکاب کرتے ہیں)۔

مطلب یہ ہے کہ مخلص بندوں کو اللہ تعالیٰ ابلیس کے پنجہ اور گرفت سے محفوظ رکھے گا۔ ہاں جو لوگ ہدایت کو پسند نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام اور کتابوں اور علماء حق کی صحبت سے گریز کرتے ہیں، اور بغض رکھتے ہیں، تو ایسے لوگوں پر شیطان کا تسلّط مضبوط ہو جاتا ہے۔ ایسا تسلّط تو شیطان کا کسی پر نہیں کہ ڈنڈے کے زور سے کسی کو کافر بنائے، اس کا کام تو وسوسے ڈالنا، اور گناہوں کو مزیّن کرنا اور برائیوں پر ترغیب دینا ہے، آگے انسان خود مختار ہے، چاہے شیطان کی مانے یا نہ مانے۔ بہت سے لوگ بلکہ اکثریت شیطان کی بات بخوشی مانتے ہے، اور جو نہیں مانتے زبردستی شیطان انہیں نہیں منوا سکتا۔ سورۂ ابراہیم کے آخر کا مطالعہ کریں۔

﴿وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ جو لوگ شیطان کی راہ چلیں گے، ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔ بڑے گناہ کفر و شرک اگر کسی نے اختیار کیا تو وہ ابدی جہنمی ہوگا، اگر کسی مسلمان نے شیطان کے کہنے پر زنا کیا، سود کھایا، شراب پی، نماز ترک کی، تو جہنمی ہوگا، مگر ہمیشہ کے لئے نہیں۔

﴿لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ ۭ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ﴾ ہوسکتا ہے کہ انہی معاصی مختلفہ کی طرف اشارہ ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حقیقتِ اصلیہ کی طرف اشارہ ہو کہ جہنم کے درکات اور درجات، آسمانوں اور زمینوں کی طرح سات ہیں۔ سَبْعَةُ اَبْوَابٍ سے بعض سلف کے نزدیک جہنم کے ساتھ طبقے مراد ہیں، جن کے نام ترتیب وار یہ ہیں:

جهنم، لظى، حطمة، سعير، سقر، جحيم، هاوية۔ اور لفظ جہنم کا اطلاق ایک خاص طبقہ پر بھی ہوتا ہے، اور مجموعہ طبقات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور بعض علماء کے نزدیک سات دروازے مراد ہیں، جن سے الگ الگ دوزخی اپنے مختلف اعمال کے ساتھ داخل ہوں گے۔ شاہ عبد القادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جیسے بہشت کے آٹھ دروازے ہیں، نیک عمل والوں پر بانٹے ہوئے ہیں، ویسے ہی دوزخ کے سات دروازے ہیں، بدعمل والے لوگوں پر بانٹے ہوئے ہیں۔ شاید بہشت کا ایک دروازہ زیادہ اس لئے ہے کہ بعض موحّدین نرے فضل سے جنت میں جائیں گے بغیر عمل کے، باقی اعمال (نیک و بد) کے اعتبار سے دروازے برابر ہیں۔

کچھ لوگوں نے جو یہ کہا ہے کہ دوزخی دروازے مختلف گمراہ فرقوں کے حساب سے ہیں، مثلاً مشرکین کا الگ، عام کفار کا الگ، یہودی اور نصرانیوں، مجوسیوں، صابیوں وغیرہ کے الگ الگ، یہ کسی مرفوع حدیث سے ثابت نہیں، لہٰذا یہ تقسیم درست نہیں، کیونکہ جنت و دوزخ کی تخلیق بہت قدیم ہے، اور یہ فرقے بعد میں پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ باطل فرقے کوئی سات میں محصور نہیں، وہ بہت زیادہ ہیں، کئی ختم ہو گئے، اور کئی موجود ہیں، جبکہ آئندہ قیامت تک نئے نئے فرقے پیدا ہونے کے بڑے امکانات بھی ہیں۔

ایک بہت اہم سوال، اور اس کا جواب:

عام طور پر لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ شیطان کی پیدائش میں اور اسے غیر معمولی اختیارات سپرد کرنے میں حکمت کیا ہے؟ اگر یہ منحوس پیدا ہی نہ ہوتا، تو کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہوتی، اور دنیا ہر قسم کی بدامنی اور برائیوں سے پاک رہتی۔

جواب:

اگر بیماری نہ ہوتی تو شاید صحت کی قدر بھی معلوم نہ ہوتی۔ اس کی تشریح یہ ہے کہ شیطان نے جب لمبی مہلت کے لئے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علمِ الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جائے۔ جب حکمت الٰہیہ مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ، و شہنشاہانہ عظمت و جبروت کا مظاہرہ کرے تو اس نے عالم کو پیدا کیا۔ ﴿اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا﴾ [الطلاق: ۱۲] (اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے، اور زمین بھی انہی کی طرح، اللہ کا حکم ان کے درمیان اترتا رہتا ہے، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے)۔

یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو۔ اسی معرفت الٰہیہ کو آیت: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ [الذاریات: ۵۶] (میں نے جنات اور انسان کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے تاکہ میری عبادت کریں) میں بعض سلف کی تفسیر کے موافق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے، اور ظاہر ہے کہ تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اَتم جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو، اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ عالم میں مطیع و وفادار

اور باغی ومجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔

نیز اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار وقوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت وآزادی دی جائے، پھر انجام کار حکومتِ الٰہیہ کا لشکر غالب ہو، دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں، اور بعد میں امتحان کی آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے۔ اس کے بدون کُل صفاتِ کمالیہ کے ظاہر ہونے کی کوئی صورت نہیں، پس خیر وشر، اور منبع خیر وشر کا پیدا کرنا اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے۔ یعنی صفاتِ کمالیہ کا مظاہرہ، وہ بغیر اس کے پوری نہ ہوسکتی تھی۔ ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ إِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ﴾ [هود: ۱۱۸] (اور اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طریقے کا پیرو بنا دیتا، اور ہمیشہ مختلف راستوں پر ہی رہیں گے۔ البتہ جن پر تمہارے پروردگار رحم فرمائے گا ان کی بات اور ہے، اور اسی کے لیے اس نے ان کو پیدا کیا ہے)۔

اسی لئے ضروری ہوا کہ عدوّا کبر ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جائے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قویٰ ووسائل کو دل کھول کر استعمال کرلے۔ لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ براہِ راست اس محیط کُل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی۔ اس لئے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ نیابت وخلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے، جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقع مل سکے۔ ﴿وَأَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَرَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ وَعِدْهُمْ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ إِلَّا غُرُوْرًا﴾ [الإسراء: ۶۴] (اور ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کی فوج چڑھالا، اور ان کے مال اور اولاد میں اپنا حصہ لگالے، اور ان سے خوب وعدے کرلے۔ اور شیطان ان سے جو وعدہ بھی کرتا ہے وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں ہوتا)۔

اور پھر جب تک وہ مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہے، خاص شاہی فوج (ملائکہ) سے اس کو کمک پہنچائی جائے، اور باوجود ضعف وقلّت کے اپنے فضل ورحمت سے انجام کار دشمنوں کے مقابلہ میں مُظفّر ومنصور کیا جائے۔ پس خود سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم علیہ السلام کے لئے میدان جنگ ہے، اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اسی وقت ہوسکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھائے ہوں، اس لئے تکویناً دو صورتیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزیں ہوجائے۔

ابلیس آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے کی بناء پر نیچے گرایا گیا ذلیل ہوکر، اور آدم علیہ السلام کو ابلیس لعین کو وسوسہ

اندازی کی وجہ سے جنت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہوکر معرکہ کارزار خوب گرم ہوگیا۔ "وَالْحَرْبُ سِجَالٌ وَالْعِبْرَةُ بِالْخَوَاتِيْمِ" [تفسیر عثمانی]

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۵﴾ اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۴۶﴾ وَنَزَعْنَا مَا فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۴۷﴾ لَا يَمَسُّهُمْ فِيْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِيْنَ ﴿۴۸﴾ نَبِّئْ عِبَادِيْٓ اَنِّيْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۴۹﴾ وَاَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: بلاشبہ تقویٰ اختیار کرنے والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۴۵﴾ تم اس میں داخل ہو جاؤ سلامتی کے ساتھ، اس حالت میں کہ امن سے رہنے والے ہو ﴿۴۶﴾ اور ہم وہ کینہ نکال دیں گے جو ان کے سینوں میں تھا، بھائی بھائی بن کر رہیں گے، تختوں پر آمنے سامنے ہوں گے ﴿۴۷﴾ انہیں وہاں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، اور نہ وہ وہاں سے نکالے جائیں گے ﴿۴۸﴾ آپ میرے بندوں کو خبر دے دیجئے کہ بلاشبہ میں غفور رحیم ہوں ﴿۴۹﴾ اور بلاشبہ میرا عذاب دردناک عذاب ہے ﴿۵۰﴾

معارف ومنازل

جنتی زندگی کا نقشہ کھینچا جا رہا ہے کہ وہ نہایت پر لطف زندگی ہوگی۔ سب سے بڑی نعمت وہ سایہ رحمت ہے جو جنّت پر چھایا ہوا ہوگا، باغات ہیں، بے شمار پھلوں، لذیذ و پائیدار میووں کی کثرت وفراوانی کے ساتھ نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہوگا۔ نہریں ہیں، شراب خالص، میٹھا پانی، شربت، شہد خالص، خالص دودھ، اور دیگر لامحدود عجیب وغریب شربت، اور ان کی نہریں مسلسل جاری رہتی ہیں۔

جنت کے اندر کسی قسم کی پریشانی یا بیماری یا خلاف طبیعت رنج والم، بغض وحسد، ناگواری وغیرہ، سب ختم ہوں گے۔ ایک معصومانہ، پیغمبرانہ ماحول، ہر امّتی متقی کو اس کے پیغمبر کے طفیل نصیب ہوگا، نبی کا سایہ بھی سر پر ہوگا۔ سارے انبیاء کرام علیہم السلام آپس میں بھائی رہے، اب ان کے متقی مؤمن اُمتی بھی جنّت میں بھائی بھائی رہیں گے۔ تختوں پر بیٹھ کر آمنے سامنے جلوہ افروز ہوں گے، اور سلام وتحیہ کے کلمات دہرائیں گے۔ حق تعالیٰ کی رضا، مغفرت و رضوان، زیارت و دیدار الٰہی ان کا امتیازی اور خصوصی انعام رہے گا۔

اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے بندوں کو خبر دینا کہ میں غفور رحیم ہوں، جن گناہوں کی مغفرت کرتا ہوں، پھر کبھی ان کا طعنہ نہیں دیتا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنّت میں جا کر پریشان ہو جاؤ کہ شاید کسی وقت ہمارے معاف شدہ گناہوں کا ذکر سامنے آجائے، اور باعث خفت ہو، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔

البتہ جہنمیوں پر میرا عذاب جو سخت ہوگا وہ ان کے کفر وشرک اور نافرمانیوں کی وجہ سے ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تخلیق رحمت کے دن اللہ تعالیٰ نے سو رحمتیں پیدا کیں، ننانوے رحمتیں اپنے پاس روک لیں، اور ایک رحمت دنیا میں پھیلا دی، جس کی وجہ سے ماں اپنے بچے اور حیوانات اپنے بچوں پر رحم کرتے ہیں۔ [متفق علیه] احمد اور ابن ماجہ میں یہ بھی ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا، تو اس رحمت کو ان ننانوے رحمتوں سے ملا کر پورا فرمائے گا۔

سبحان اللہ! اس ایک رحمت نے پوری دنیا کا نظام چلایا، مسلمانوں، کافروں، جنّات اور حیوانات، یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے بھی اور نباتات وجمادات۔ الغرض جمیع موجودات اس کے تحت پلتے رہے، تو قیامت کی سو رحمتوں کا انسانی عقل نہ اندازہ کرسکتی ہے، نہ سمجھ سکتی ہے۔ اس لئے کہا گیا ہے کہ قیامت کی ہر چیز سمجھ سے بالاتر ہے، اور یہی صحیح ہے۔

۞ ۞ ۞

وَنَبِّئۡهُمۡ عَنۡ ضَيۡفِ اِبۡرٰهِيۡمَ ۞۵۱ اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَيۡهِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنۡكُمۡ وَجِلُوۡنَ ۞۵۲ قَالُوۡا
لَا تَوۡجَلۡ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمٍ عَلِيۡمٍ ۞۵۳ قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِىۡ عَلٰٓى اَنۡ مَّسَّنِىَ الۡـكِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ ۞۵۴ قَالُوۡا
بَشَّرۡنٰكَ بِالۡحَـقِّ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡقٰنِطِيۡنَ ۞۵۵ قَالَ وَمَنۡ يَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ۞۵۶

ترجمہ: اور ان کو ابراہیم کے مہمانوں کی اطلاع بھی دیجیے ۞۵۱ جب وہ ان پر داخل ہوئے، تو انہوں نے سلام کیا، ابراہیم نے کہا کہ بلاشبہ ہم تو تم سے ڈر رہے ہیں ۞۵۲ انہوں نے کہا: ڈرو مت، بیشک ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی بشارت دے رہے ہیں جو صاحب علم ہوگا ۞۵۳ ابراہیم نے کہا: کیا تم مجھے اس حالت میں بشارت دے رہے ہو جبکہ مجھے بڑھاپا پہنچ گیا ہے؟ سو تم کس چیز کی بشارت دیتے ہو؟ ۞۵۴ انہوں نے کہا کہ ہم نے تمہیں امر واقعی کی بشارت دی ہے، سو تم نا اُمیدوں میں سے مت ہو جاؤ ۞۵۵ ابراہیم نے کہا کہ اپنے ربّ کی رحمت سے ان لوگوں کے سوا کون نا اُمید

ہوگا جو گمراہ ہیں؟ ﴿۵۶﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مہمانوں کا تذکرہ ہے۔ یہ مہمان فرشتے تھے، خوبصورت نوجوان انسانوں کی شکل میں آئے تھے، دو تھے، اور بعض روایات میں ہے کہ دو سے زائد چار یا چھ تھے۔ پورا واقعہ سورۂ ہود میں بیان ہوا۔ یہ فرشتے اللہ کے بھیجے ہوئے تھے، اور دو مقصد کے لئے یہاں آئے تھے: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام اور ان کے پیچھے حضرت یعقوب علیہ السلام کی پیدائش کی بشارت دینے کے لئے، اور ابراہیم علیہ السلام کو اطلاع دینے کے لئے کہ ہم قوم لوط کو زیروزبر کرنے کے لئے آئے ہیں۔

لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے، اور وہاں سے ان کا علاقہ سدّوم قریب بھی تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کئی مرتبہ اس نافرمان قوم کے پاس تبلیغ کے لئے بھی جا چکے تھے۔ یہ فرشتے جب داخل ہوئے تو انہوں نے سلام کیا، ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سلام کا جواب دیدیا، اور وہ بڑے مہمان نواز تھے، چونکہ فرشتوں کو انسان سمجھ کر شناخت نہیں کیا، تو فوراً گائے کا گوسالہ ذبح کر کے کباب تیار کیا، اور مہمانوں کے سامنے دسترخوان پر رکھ دیا، اور خود بھی بیٹھ گئے۔ ﴿فَلَمَّا رَاٰۤ اَیۡدِیَہُمۡ لَا تَصِلُ اِلَیۡہِ﴾ [ہود:۷۰] یعنی جب دیکھا کہ مہمانوں کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو انہیں خوف پیدا ہوا، اور فوراً زبان سے اظہار فرماتے ہوئے کہا:

﴿اِنَّا مِنۡکُمۡ وَجِلُوۡنَ﴾ بیشک ہم تم سے ڈر رہے ہیں، آخر تم لوگ کیوں نہیں کھاتے؟ اس زمانہ کے لوگ ایسے ہوتے تھے جب کسی کو مارنے، یا قتل کرنے، یا مال لوٹنے کے لئے آتے تو اس کا دانہ پانی اور کھانا نہ کھاتے، اس طرح وہ نمک حرام بننے سے بچتے۔ ان کے نہ کھانے سے ابراہیم علیہ السلام اس لئے خوفزدہ ہو گئے۔ فرشتوں نے فوراً جواب دیا کہ ہمارے نہ کھانے کی وجہ یہ ہے کہ ہم ملائکہ (فرشتے) ہیں، جو کھانا نہیں کھاتے۔ ہم اوّلاً آپ کے پاس آئے، آپ کو ایک صاحب علم بیٹے کی بشارت دینے کے لئے۔

کہنے لگے: یہ کیسی بشارت ہے؟ عالم اسباب میں اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں، میں بوڑھا ہوں (ایک سو بیس سال کا ہوں، اور میری بیوی بوڑھی بھی ہے، بانجھ بھی، ان کی عمر اسی سال کے قریب تھی)۔ جب وہ فرشتوں سے مذاکرات کر رہے تھے تو حضرت سارہؓ قریب کھڑی تھیں، اور مذاکرات سن رہی تھیں، تو کہنے لگیں:

﴿فَصَكَّتۡ وَجۡهَهَا وَقَالَتۡ عَجُوۡزٌ عَقِيۡمٌ﴾ [الذاریات:۲۹] یعنی پیشانی پر تعجب اور حیرانگی کے عالم

میں ہتھیلی مار کر کہنے لگیں: کیا اس بوڑھی بانجھ کے لئے بشارت ہو رہی ہے؟ فرشتوں نے کہا: ہاں! یہ فیصلہ پختہ اور برحق ہے، اللہ تعالیٰ جس کسی چیز کا فیصلہ فرماتے ہیں تو ظاہری اسباب سارے ناکارہ ہو جانے کے باوجود وہ کام ہو جاتا ہے، کسی نا اُمیدی کی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے نا اُمیدی صرف گمراہوں کا کام ہے، مؤمن کو ہر وقت اس کی رحمتوں کی اُمید رکھنا ضروری ہے۔ یہ واقعہ متعدد مقامات پر مذکور ہے، مثلاً سورۂ ہود میں تفصیلاً ذکر ہے، اسی طرح سورۂ عنکبوت، سورۂ صافات اور سورۃ الذاریات، وہاں دیکھا جائے۔

....

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۵۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَآ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۶۱﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ
مُّنْكَرُوْنَ ﴿۶۲﴾ قَالُوْا بَلْ جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿۶۳﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۶۴﴾ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ
بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَقَضَيْنَآ اِلَيْهِ
ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿۶۶﴾

ترجمہ: ابراہیم نے کہا: اے بھیجے ہوئے فرشتو! تمہارا آنا کس اہم کام کے لئے ہے؟﴿۵۷﴾ انہوں نے جواب دیا کہ بیشک ہم مجرم قوم کی طرف بھیجے گئے ہیں ﴿۵۸﴾ مگر آل لوط کا خاندان، بلاشبہ ہم ان سب کو بچا لینے والے ہیں ﴿۵۹﴾ سوائے ان کی بیوی کے، ہم نے اس کے بارے میں تجویز کر رکھا ہے کہ بلاشبہ وہ مجرمین میں رہ جانے والی ہے ﴿۶۰﴾ سو جب وہ بھیجے ہوئے فرشتے خاندان لوط کے پاس آئے ﴿۶۱﴾ تو کہنے لگے: بیشک تم تو اجنبی آدمی ہو ﴿۶۲﴾ انہوں نے کہا کہ نہیں، بلکہ ہم آپ کے پاس وہ چیز لے کر آئے ہیں جس میں یہ لوگ شک کیا کرتے تھے ﴿۶۳﴾ اور ہم آپ کے پاس یقینی ہونے والی چیز لے کر آئے ہیں، اور ہم سچے ہیں ﴿۶۴﴾ سو آپ رات کے کسی حصے میں اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جایئے اور آپ ان کے پیچھے ہو لیجئے، اور تم میں سے کوئی بھی پیچھے پھر کر نہ دیکھے، اور تمہیں جس جگہ جانے کا حکم ہوا ہے اسی طرف چلے جانا ﴿۶۵﴾ اور ہم نے لوط کے پاس اپنا حکم بھیج دیا کہ صبح ہوتے ہی ان لوگوں کی جڑ کٹ جائے گی ﴿۶۶﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت سنانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب ان کی آمد کا اصل سبب دریافت کیا، تو انہوں نے یہی اظہار فرمایا کہ ہمارا اگلا قدم آگے ہے، ہم قوم لوط کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کہنے لگے کہ اس بستی میں لوط علیہ السلام بھی تو ہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے، ہم انہیں اور ان کے پورے خاندان کو، سوائے اس کی بیوی کے بچائیں گے، تب وہ مطمئن ہو گئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے رخصت ہو کر یہ فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ جس طرح ابراہیم علیہ السلام نے انہیں شناخت نہیں کیا تھا اور اجنبی سمجھا تھا، اسی طرح لوط علیہ السلام بھی انہیں اجنبی سمجھ کر کہنے لگے:

﴿اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ﴾ تم لوگ تو اجنبی معلوم ہوتے ہو۔ فرشتوں نے کہا کہ ہم آدمی نہیں ہیں بلکہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں، آپ کی مدد کے لئے آئے ہیں، آپ کی قوم کو تباہ کرنے آئے ہیں، اور یہ وہی عذاب ہے کہ لوگ اپنے منہ سے مانگتے تھے، اور اس میں شک کیا کرتے تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ عذاب کی آمد یقینی ہے، اور ہماری بات سچی ہے، ہم تمہیں اور تمہارے خاندان کو بچا کر نجات دیں گے، اور تمہاری بیوی ہلاک شدگان میں ہے، ہم نے صبح ہوتے ہی کارروائی کرنی ہے، اور تمہارے پروردگار کے حکم سے زمین کے طنابوں کو کاٹ کر پوری دھرتی کو تہہ وبالا کر کے صفحہ ہستی سے انہیں مٹانا ہے۔

پیغمبر علیہ السلام نہایت بے بسی کے عالم میں بار بار لوگوں کے آگے ہاتھ جوڑ جوڑ کر تھک چکے تھے، کہنے لگے: صبح تو بہت دور ہے، ابھی کارروائی کیوں نہیں کرتے؟ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ اتنے وقت میں آپ اپنے خاندان کو لے کر اس تباہ ہونے والے علاقہ سے نکل جائیں، پھر کارروائی ہو گی۔ آپ ابھی اپنے گھر والوں کو لے کر یہاں سے نکل جائیں، اور آپ ان کے پیچھے چلیں، اور تم میں سے کوئی مڑ کر پیچھے کی طرف نہ دیکھے، جہاں تمہیں جانے کا حکم ہوا ہے سیدھا اسی طرف چلے جائیں، یعنی متصل شام کی سرزمین ہے، وہاں چلے جاؤ۔ واللہ اعلم

وَجَآءَ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٦٧﴾ قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيْفِيْ فَلَا تَفْضَحُوْنِ ﴿٦٨﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ ﴿٦٩﴾

قَالُوْٓا اَوَلَمْ نَنْهَكَ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿٧٠﴾ قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِيْٓ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ ﴿٧١﴾ لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ

يَعۡمَهُوۡنَ ۝٧٢ فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَ ۝٧٣ فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ

سِجِّيۡلٍ ۝٧٤ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلۡمُتَوَسِّمِيۡنَ ۝٧٥ وَاِنَّهَا لَبِسَبِيۡلٍ مُّقِيۡمٍ ۝٧٦ اِنَّ فِيۡ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّلۡمُؤۡمِنِيۡنَ ۝٧٧

ترجمہ: اور شہر کے لوگ خوش ہوتے ہوئے آپہنچے ۝٦٧ لوط نے کہا: بیشک یہ میرے مہمان ہیں، سو تم مجھے رسوا نہ کرو ۝٦٨ اور اللہ تعالیٰ سے خوف کرو، مجھے شرمندہ نہ کرو ۝٦٩ ان لوگوں نے جواب میں کہا: کیا ہم نے آپ کو دنیا جہاں کے لوگوں سے منع نہیں کیا؟ ۝٧٠ لوط نے کہا: یہ میری بیٹیاں ہیں، اگر تمہیں کرنا ہی ہے ۝٧١ آپ کی جان کی قسم بیشک وہ اپنی مستی میں اندھے بن رہے تھے ۝٧٢ سو سورج نکلتے وقت انہیں سخت آواز نے پکڑ لیا ۝٧٣ سو ہم نے اس کے اوپر کے حصہ کو نیچے والا حصہ کر دیا، اور ہم نے ان پر کنکر کے پتھر برسا دیئے ۝٧٤ بلاشبہ اس میں بصیرت رکھنے والوں کے لئے نشانیاں ہیں ۝٧٥ اور بلاشبہ ان کی یہ بستیاں ایک شاہراہ عام پر پڑتی ہیں ۝٧٦ بلاشبہ اس میں اہل ایمان کے لئے نشانی ہے ۝٧٧

معارف ومنازل

قوم لوط کی ہلاکت، اور عبرتناک انجام:

یہ فرشتے جو لوط علیہ السلام کے پاس آئے یہ اتنے خوبصورت اور حسین وجمیل تھے کہ آدمی زادہ کی شکل میں ہونے کے باوجود بکھرے موتی یا جنتی انسان معلوم ہوتے تھے۔ ان کی آمد کا یہی مطلب تھا کہ قوم کی شرارت کو بچشم خود دیکھ کر مشاہدہ کریں، اور اتمامِ حجت کے بعد اس نافرماں قوم کو وہ سزا دیں جس کی نظیر نہ اگلوں میں ہو، نہ پچھلوں میں۔ جب مغرب سے پہلے دن کی روشنی میں فرشتے پیغمبر علیہ السلام کے پاس آئے، تو پوری بستی میں یہ آوازہ پھیل گیا، یہ لوگ پہلے سے خبیث وگندے تھے، خوبصورت نوجوانوں کی آمد نے انہیں مزید گندا بنا دیا۔ ناچتے ہوئے، خوشیاں مناتے ہوئے حلوا کھانے کے لئے بکثرت جمع ہو گئے، اور پیغمبر علیہ السلام کے گھر کا محاصرہ کر کے مطالبات شروع کئے کہ ہمیں ان مہمانوں سے مل کر یہ کرنا ہے، وہ کرنا ہے۔

مہمانوں کو پیغمبر علیہ السلام نے ایک کمرے میں رکھا ہوا ہے، اور خود پہرہ دے رہے ہیں۔ ابھی تک انہیں معلوم نہیں کہ یہ فرشتے ہیں، فرشتوں نے بھی آمد پر اپنا تعارف نہیں کرایا، کیونکہ انہیں قوم کی برملا خباثتوں اور شرارتوں کا بچشم خود مشاہدہ کرنا تھا کہ اِتمامِ حجت پختہ ہو۔ حضرت لوط علیہ السلام پر بد معاشوں نے گھیر ڈالا ہوا ہے، لوگ آگے بڑھ

رہے ہیں، اکیلے ہاتھ جوڑ جوڑ کر، دھکے کھاتے ہوئے، انہیں روک رہے ہیں، اور وہ زبردستی مہمانوں کی طرف پیشقدمی کررہے ہیں۔ مار کھاتے ہوئے اورزاری منت کرتے ہوئے، زارزار روتے ہوئے، اور گرتے ہوئے فریاد کررہے ہیں، چنانچہ کافی وقت اس داروگیر میں گزرا، اور پیغمبر علیہ السلام نڈھال ہوکر گر پڑے، تب حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پیغمبر علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ کر جذباتی انداز میں انہیں تسلی دیتے ہوئے فرمایا: ﴿يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ﴾ [ھود: ۸۱] (اے لوط! ہم تیرے ربّ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں، ان کی رسائی آپ تک ہرگز نہیں ہوسکتی)۔ آپ ذرا ہٹیں، پس حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پورے مجمع کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر حرکت دی، جیسے سورۂ قمر میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ﴾ [القمر: ۳۷] (اور انہوں نے لوط کو ان کے مہمانوں کے بارے میں پھسلانے کی کوشش کی۔ جس پر ہم نے ان کی آنکھوں کو اندھا کردیا کہ: چکھو میرے عذاب اور میری تنبیہات کا مزہ)۔

بس اتنے میں وہ سارے اندھے ہوگئے، گرتے ہوئے، تڑپتے ہوئے منتشر ہوگئے، یہاں وہاں گرتے رہے، یہاں تک کہ چھ گھنٹے کے بعد اس نے تاریخی عذاب کی آمد ہوئی جس نے سدّوم کی تمام بارہ بستیوں کو آبادی سمیت اس طرح تباہ کیا کہ قیامت تک ان کی وہ زمین سورج وچاند کی روشنی سے محروم ہوگئی، نیچے دب گئی۔

حضرت لوط علیہ السلام ان لوگوں کے اندھے ہونے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کے کہنے اور مشورے سے اپنے خاندان کو لے کر وہاں سے نزدیک علاقہ ملک شام کی طرف روانہ ہوئے۔ طلوع فجر سے پہلے پہلے اس تباہ شدہ، یعنی تباہ ہونے والی بستی کی حدود سے نکل گئے۔ وہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے۔ اس واقعہ میں عبرت کے علاوہ اور بہت سے علمی وعملی، اخلاقی مسائل سورہ ہود کی تفسیر میں بیان کرچکے ہیں، وہاں ملاحظہ کریں۔

رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کا بے مثال اعزاز وشرف:

﴿لَعَمْرُكَ اِنَّهُمْ لَفِيْ سَكْرَتِهِمْ يَعْمَهُوْنَ﴾ جو فرمایا ہے، اس میں اپنے حبیب وکریم، سید الانس والجن محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان کی قسم کھائی ہے۔ صاحب روح المعانی نے امام بیہقی کی دلائل النبوۃ سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے حضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وسلم کی جان سے بڑھ کر کوئی معزز ومکرم، ستودہ جان پیدا نہیں فرمائی۔ ربّ العلمین سبحانہ وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے علاوہ کسی کی حیات کی قسم نہیں کھائی۔

یہاں سرسری طور پر جو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر اللہ کی قسم کھانا تو ممنوع ہے، پھر اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ

ﷺ کی جان کی قسم کیوں کھائی؟

جواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ یہ مخلوق کے لئے منع ہے، وہ اگر غیر اللہ کی قسم کھائیں گے تو شرک ہوگا، اللہ تعالیٰ جل جلالہ خالق اور مالک ہے، اس ذات واحد فاعل مختار پر کیا پابندی ہوسکتی ہے؟ وہی تو ہے پابندیوں کا مالک اور نافذ کرنے والا، کسی کی کیا مجال کہ اس کے متعلق کوئی لب کشائی کرے؟ اس کو خدائی اختیار حاصل ہے، وہ جس کی قسم کھائے اور جس چیز کی قسم کھائے، وہ فاعل مختار مالک کُل ہے۔

قرآن مجید میں بہت سے مواقع ومقامات پر دوسری چیزوں پر قسم کھانے کا بکثرت بیان ہے: ﴿وَالتِّيْنِ وَ الزَّيْتُوْنِ ۝ وَطُوْرِ سِيْنِيْنَ ۝ وَهٰذَا الْبَلَدِ الْأَمِيْنِ ۝﴾ (قسم ہے انجیر اور زیتون کی۔ اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی۔ اور اس امن وامان والے شہر کی)۔ اسی طرح آخری پارہ کی اکثر سورتوں کے شروع میں بکثرت قسمیں مذکور ہیں۔ سورۃ القلم میں اس پر کلام آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

****

﴿وَاِنْ كَانَ اَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ لَظٰلِمِيْنَ ۝۷۸ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۹﴾

ترجمہ: اور بلا شبہ ایکہ والے ظلم کرنے والوں میں سے تھے ۝۷۸ سو ہم نے ان سے انتقام لے لیا، اور بلا شبہ یہ دونوں بڑی شاہراہ پر پڑتی ہیں ۝۷۹

معارف ومنازل

اصحاب الایکہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم جنہوں نے خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام کی تکذیب کی، توحید باری تعالیٰ اور وقوع قیامت وغیرہ کے منکر ہوگئے، اسی کفر وشرک کی وجہ سے ظالمین میں شمار ہوئے، اور دوزخ کے مستحق ہوگئے۔ اَیْکَة بمعنی: جنگل، گھنے درخت، جھاڑی۔ یہ لوگ اسی جنگل میں رہتے تھے۔

﴿فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ﴾ ہم نے ان سے انتقام لیا، کفر وشرک اور ناپ تول میں کمی کرنے اور دیگر بہت سے گناہوں کی وجہ سے انہیں انتقام کا نشانہ بنا کر انہیں سزا دی۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے سات روز تک ان پر سخت بے پناہ گرمی مسلط کردی، سات روز کے بعد بادل کا ایک ٹکڑا آگیا، لوگوں نے آرام لینے اور سکھ پانے کی خاطر اسے ٹھنڈا سایہ سمجھ کر دوڑ لگائی، وہ سایہ نہ تھا، بادل نے ان پر آگ برسا کر انہیں بھسم کردیا۔ اسی لئے سورۂ شعراء میں انہیں

﴿اَصْحٰبُ الظُّلَّةِ﴾ کہا گیا، اور اس عذاب کو ﴿یَوْمُ الظُّلَّةِ﴾ کہا گیا۔

﴿وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیْنٍ﴾ اور یہ دونوں قوموں کی بستیاں صاف میدانی سڑک پر واقع ہیں، اور اصحاب بصیرت کے لئے عبرت وموعظہ کا نشان ہیں۔ یہ مکہ والوں سے بلکہ قیام قیامت تک سارے لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ ان بستیوں کے خوشحال مکینوں کے انجام وتباہی سے عبرت حاصل کرلیا کرو۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی بعثت اصحابِ مدین اور اصحابُ الایکہ دونوں کے لئے تھی، کفروشرک اور تکذیب کی وجہ سے یکے بعد دیگرے دونوں قومیں تباہ ہوگئیں، جیسا کہ گزرا ہے۔

.......۞.......۞.......۞.......

وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۸۰﴾ وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ ﴿۸۱﴾ وَكَانُوْا یَنْحِتُوْنَ
مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا اٰمِنِیْنَ ﴿۸۲﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الصَّیْحَةُ مُصْبِحِیْنَ ﴿۸۳﴾ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ حجر والوں نے پیغمبروں کو جھٹلایا ﴿۸۰﴾ اور ہم نے انہیں نشانیاں دیں، سو وہ ان سے رُوگردانی کرنے والے ہوگئے ﴿۸۱﴾ اور وہ لوگ پہاڑوں کو تراش کر گھر بنالیتے تھے، امن کے ساتھ رہتے تھے ﴿۸۲﴾ سو ان کو علی الصباح چیخ نے پکڑ لیا ﴿۸۳﴾ سو ان کو اس چیز نے کچھ کام نہ دیا جسے وہ کسب کرتے تھے ﴿۸۴﴾

معارف ومنازل

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم اصحابِ حجر جنہیں ثمود کہتے ہیں، یہ لوگ خالص عرب تھے، قوم عاد کے بھائی تھے، عاد کی ہلاکت کے دوسو (۲۰۰) سال بعد ان کی تباہی ہوئی۔ بڑے طاقتور اور قدآور تھے، کم سے کم قد والا اٹھارہ فٹ کا ہوتا تھا۔ بڑے انجنیئر اور کان کن تھے، پہاڑوں کو کاٹ کر نہایت شاندار عمدہ مکانات بناتے تھے۔ ان کی بہت بڑی آبادی تھی، جو کہ چھوٹی بڑی اٹھارہ سو بستیوں پر مشتمل تھی، یہ بڑے مغرور ومتکبر اور خود پسند تھے۔

﴿وَلَقَدْ كَذَّبَ اَصْحٰبُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِیْنَ﴾ حجر والوں نے بلاشبہ پیغمبروں کی تکذیب کی۔ ایک نبی کی تکذیب سے سارے انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب لازم آتی ہے۔ حجر ایک بہت بڑا وسیع علاقہ ہے، حجاز مقدس اور شام کے درمیان واقع ہے، پہاڑوں میں ان کے مکانات اب بھی موجود ہیں۔

﴿وَاٰتَیْنٰهُمْ اٰیٰتِنَا فَكَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِیْنَ﴾ اور ہم نے ان کو اپنی نشانیاں دیں۔ سب سے بڑی نشانی

اونٹنی اور اس کا بچہ تھا، مگر یہ لوگ روگردانی کر کے اپنے شرک وکفر پر جمے رہے۔ صرف ایک مختصر طبقہ مشرف باسلام ہوا، جس کی تعداد چھ ہزار تھی، اور عذاب آنے سے پہلے حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ وادی سے نکل گئے اور بچ گئے۔

﴿وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ﴾ بڑے انجنیئر وصنعتکار تھے۔ پہاڑوں کو تراش تراش کر گھر بناتے تھے، تا کہ امن وخوشحالی میں رہیں، مگر اللہ تعالیٰ کے عذاب میں بہہ گئے، اور مکانات چھوڑ گئے۔ اور:

﴿فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ﴾ انہیں پکڑ لیا فرشتے کی زوردار چیخ نے اور اسی کے ساتھ پورا علاقہ لرزاٹھا، پوری قوم گھٹنوں کے بل تباہ ہوگئی۔ عذاب کے آثار تین دن سے شروع ہو گئے تھے، اور وہ جانتے بھی تھے کہ یہ عذاب کے آثار ہیں، مگر انابت وتوبہ ان کی قسمت میں نہ تھی۔

﴿فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ ان کے مکانات اور قوت وطاقت، صنعت گری اور اموال انہیں کام نہیں آئے۔ اللہ تعالیٰ کی کسی قوم پر جب مار پڑتی ہے تو تمام اسباب ووسائل ناکارہ ہو جاتے ہیں، اور تباہی عام ہو جاتی ہے۔

...... ۞ ...... ۞ ...... ۞ ......

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ
لَآتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ ﴿٨٦﴾

ترجمہ: اور ہم نے آسمانوں کو، اور زمین کو، اور جو کچھ ان کے درمیان ہے پیدا نہیں کیا مگر حق کے ساتھ، اور بلاشبہ قیامت ضرور آنے والی ہے، تو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے ﴿٨٥﴾ بلاشبہ آپ کا ربّ بڑا خالق ہے، بڑا عالم ہے ﴿٨٦﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ نے اتنے بڑے جہاں کو (جو کہ انسانوں کی ضرورت سے بے انتہاء زائد ہے) اس لئے پیدا فرمایا تا کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو، جس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کریں، اور اس کی عبادت کریں، جس سے دنیا میں امن وامان اور خوشحالی پیدا ہو، اور ہر قسم کے فتنے اور فساد و بے راہ روی کا خاتمہ ہو، مگر جو لوگ ایمان نہیں لاتے اور فساد کرتے ہیں، تو ان کے ساتھ جہاد ہونا چاہیے۔ اگر جہاد کا امکان معدوم ہو تو دفع فساد کی خاطر انہیں دنیاوی عذاب سے ختم کیا جائے۔

ان کا اصلی عذاب دنیا کی مختصر زندگی میں چونکہ ممکن نہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ ایک دوسرا جہاں بھی ہو جس میں اچھے لوگوں کو ان کی نیکیوں کا بدلہ اور صلہ عطاء ہو، اور بُرے لوگوں کی بُرائی اور غلط اعمال کی انہیں سزا ہو تا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے عدل وانصاف کے تقاضے پورے ہوں، جس کی مثال اسی دنیا میں بھی رائج ہے کہ مسلم وغیر مسلم ممالک اپنے ملکی نظام میں اچھے کام کرنے والوں کو انعام وبخشش سے نوازتے ہیں، اور بُرے کام کرنے والوں کو جرمانہ قید و بند اور دیگر قسم کی مختلف سزائیں دیتے ہیں۔

پس جن جن مشرکوں کافر قوموں پر عذاب آیا ہے اور وہ تباہ ہو چکے ہیں، یہ ان کے اعمالِ بد کی اصلی اور مکمل سزا نہیں، وہ ان کو قیامت میں بھگتنا ہوگی۔ دیناوی سزا کا ایک مقصد تو یہ ہے کہ فساد کی جڑ کٹ جائے، مزید دنیا میں فساد نہ ہو۔ دوم اس لئے ہے تا کہ آئندہ لوگوں کے لئے درسِ عبرت ہو، جیسے بار بار تنبیہ ہوئی۔ تو یہاں ﴿الْحَقِّ﴾ سے مراد عدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں کو اور زمینوں کو، اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اسی لئے پیدا فرمایا ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عدل اور انصاف کے ساتھ فیصلہ فرمائے، اور سب کو پورا پورا اجزا دے۔ ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ﴾ [الزلزال:۸] (پس جس نے ذرہ برابر خیر کا عمل کیا اس کو دیکھے گا، اور جس نے ذرہ برابر شر کا عمل کیا اس کو دیکھے گا)۔

قیامت کے روز سب اپنے اچھے اور بُرے کا بدلہ پائیں گے، کسی پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا، بلکہ مغفرت کا دروازہ بھی کھلا رہے گا۔

﴿فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ﴾ کہ آپ حسن وخوبی کے ساتھ درگزر فرمائیں۔ یہ اعلیٰ حکم کسی آیت جہاد سے منسوخ نہیں، اس کا تعلق مکارمِ اخلاق کے ساتھ ہے۔ قرآن مجید نے بار بار یہی نصیحت دہرائی ہے کہ صبر وتحمل کا پیکر بن کر ہر قسم کے لوگوں کو حتی الامکان معافی دیدو، اور دشمنانِ دین کی ہر قسم کی بداخلاقیوں پر صبر جمیل، صفح جمیل اختیار کرو۔ آئندہ آیت میں اس کی دلیل ہے، فرمایا:

وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ﴿۸۷﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۸﴾ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو سات آیتیں دی ہیں، جو بار بار پڑھی جاتی ہیں، اور قرآن عظیم دیا﴿۸۷﴾ آپ اپنی

آنکھیں ان چیزوں کی طرف نہ بڑھایئے جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو فائدہ حاصل کرنے کے لئے دی ہیں، اور آپ ان پر غم نہ کیجئے، اور ایمان والوں کے لئے اپنے بازوؤں کو جھکائے رکھیے ﴿۸۸﴾ اور آپ فرما دیجئے کہ بلاشبہ میں واضح طور پر ڈرانے والا ہوں ﴿۸۹﴾

معارف ومنازل

جو لوگ آنحضرت ﷺ کی تکذیب کرتے تھے، وہ لوگ کھاتے پیتے مالدار لوگ تھے، وہ اپنے مال کے غرور میں آپ ﷺ پر، اور آپ ﷺ کے اصحاب رضی اللہ عنہم پر طنز کر کے کہتے تھے: دیکھو! یہ لوگ اگر اچھے ہوتے تو ہماری طرح خوشحال ہوتے، ان کے پاس کچھ نہیں، ہم لوگ ان سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک بہتر ہیں۔ آیت کریمہ میں اسی طنز کا جواب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اتنی بڑی نعمت سے نوازا ہے کہ اس کے مقابلہ میں سارا جہاں ہیچ ہے، کائنات کی ہر چیز تمہارے ربّ کی پیدا کردہ ہے، اور اس کی مخلوق ہے، جبکہ آپ پر نازل شدہ سورۃ الفاتحہ اور قرآن عظیم غیر مخلوق ہیں اور تمام مخلوقات سے بلند اور بالا اور برتر وافضل ہے۔ تو کہاں یہ عظیم نعمت، اور کہاں دنیا اور اس کی نعمتیں؟ ساری دنیا قرآن عظیم کے مقابلے میں مچھر کے پَر کے برابر بھی نہیں، یہ سب سے بلند وبالا ہے۔

﴿سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ﴾ سبع مثانی کے مصداق میں اختلاف ہے۔ صحیح اور راجح یہی ہے کہ اس سے مراد سورۂ فاتحہ کی سات آیتیں ہیں، جو ہر نماز کی ہر رکعت میں دہرائی جاتی ہیں، اور ان کو بطور وظیفہ بار بار پڑھا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے توریت، انجیل، زبور میں قرآن کے علاوہ کسی کتاب میں اس کی مثال نازل نہیں فرمائی۔ احادیث صحیحہ میں تصریح ہے کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے سورۂ فاتحہ کے بارے میں فرمایا کہ یہی سبع مثانی اور قرآن عظیم ہے، جو مجھ کو دیا گیا۔

اس چھوٹی سی سورت کو قرآن عظیم (بڑا قرآن) فرمانا درجہ کے اعتبار سے ہے۔ اس سورت کو اُمّ القرآن بھی اسی لحاظ سے کہتے ہیں کہ گویا یہ سورۃ ایک جامع متن اور خلاصہ ہے، جس کی تفصیل وشرح پورے قرآن کو سمجھنا چاہیے۔ قرآن کے تمام علوم ومعارف کا اجمالی نقشہ تنہا اس سورۃ میں موجود ہے۔ یوں ﴿مَثَانِيْ﴾ کا لفظ بعض حیثیات سے پورے قرآن پر بھی اطلاق کیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ﴾ [زمر: ۲۳] (اللہ نے بہترین کلام نازل فرمایا ہے، ایک ایسی کتاب جس کے مضامین ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، جس کی باتیں بار بار دہرائی گئی ہیں)۔

اور ممکن ہے دوسری سورتوں کو مختلف وجوہ سے ﴿مَثَانِي﴾ کہہ دیا جائے، مگر اس جگہ ﴿سَبْعٍ مَثَانِي﴾ اور قرآن عظیم کا مصداق یہی سورۃ الفاتحہ ہے۔ [عثماني]

﴿لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ﴾ ازواج سے مراد اقسام یعنی کافروں کے مختلف گروہ۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مختلف قسم کے اموال اور زیب وزینت وغیرہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی آنکھیں ان مختلف چیزوں کی طرف نہ بڑھایئے، نہ اٹھایئے جو ہم نے مختلف قسم کے کافروں کو چندروزہ عارضی فائدہ حاصل کرنے کے لئے دی ہیں، کیونکہ یہ دنیا اور اس کی ساری چیزیں جب اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر نہیں۔ [مشکوٰۃ] تو حامل قرآن کے لئے کوئی جواز نہ ہوگا کہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے، یا کسی کے حقیر مال کی طرف نگاہ کرے۔

سچ پوچھئے کہ مال ہو یا منال، یا بادشاہت ہو یا اقتدار، قرآن حکیم کے مقابلہ میں ان کی حیثیت گرد وغبار سے بھی حقیر اور کم ہے۔ پہلا بدنصیب وہ ہے کہ جس کے پاس قرآن نہیں۔ دوسرے درجہ میں اس سے بڑا بدنصیب وہ حامل قرآن ہے جو خود کو فقیر سمجھتا ہے، اور مالداروں کو اپنے سے بہتر خیال کرتا ہے، اور انہیں اچھا سمجھتا ہے، اور مال کی وجہ سے ان کا احترام کرتا ہے، یا قرآن کریم کو اپنا ذریعہ معاش بنا کر اسی سے اپنے پیٹ کو پالتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہماری مدد فرمائے۔ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: ﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى﴾ [طٰهٰ:١٣١] (اور دنیوی زندگی کی اس بہار کی طرف آنکھیں اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو مزے اڑانے کے لیے دے رکھی، تاکہ ہم ان کو اس کے ذریعے آزمائیں اور تمہارے ربّ کا رزق سب سے بہتر اور سب سے زیادہ دیرپا ہے)۔ حدیث شریف میں فرمایا: ”اللہ تعالیٰ نیک بندوں کو مال ودولت سے اس طرح حفاظت کرکے بچاتا ہے جیسے تم اپنے مریض کو ناموافق چیز کے کھانے سے بطور پرہیز حفاظت کرکے بچاتے ہو“۔ [مشکوٰۃ]

كَمَآ أَنْزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِيْنَ ﴿٩٠﴾ الَّذِيْنَ جَعَلُوا الْقُرْاٰنَ عِضِيْنَ ﴿٩١﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ
أَجْمَعِيْنَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٣﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿٩٤﴾
إِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ ﴿٩٥﴾ الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ إِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿٩٦﴾

ترجمہ: جیسا کہ ہم نے ان لوگوں پر نازل کیا ﴿۹۰﴾ جنہوں نے قرآن کے مختلف اجزاء بنالئے تھے ﴿۹۱﴾ سو آپ کے ربّ کی قسم ہے، ہم ان سب سے ضرور باز پرس کرلیں گے ﴿۹۲﴾ کہ وہ کیا کچھ کیا کرتے تھے ﴿۹۳﴾ جس چیز کا آپ کو حکم دیا جاتا ہے اسے خوب صاف طریقے پر بیان کیجئے، اور مشرکین سے اعراض کیجئے ﴿۹۴﴾ بلاشبہ ہم آپ کے لیے کافی ہیں، ان لوگوں سے نمٹنے کے لیے جو ہنسی کرنے والے ہیں ﴿۹۵﴾ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرا معبود تجویز کرتے ہیں، سو وہ عنقریب جان لیں گے ﴿۹۶﴾

معارف ومنازل

﴿الْمُقْتَسِمِيْنَ﴾ یعنی تقسیم کرنے والے۔ اس سے مراد اہل کتاب ہیں اور اہل مکہ بھی۔ اہل کتاب کے بارے میں ارشاد ہوا تھا کہ: ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ [البقرة:۸۵] (کیا تم ایمان لاتے ہو کتاب کے بعض حصے پر اور بعض کا انکار کرتے ہو؟)۔ انہوں نے تورات وانجیل میں خوب تحریف کی، اور اپنی مرضی کی باتوں پر عمل کیا اور ایمان لائے، اور باقی پر نہ ایمان لائے، نہ عمل کیا، بلکہ انہیں مٹادیئے۔

لفظِ قرآن اپنے لغوی معنیٰ (قراءت) کے اعتبار سے عام ہے، تورات، انجیل اور قرآن مجید سب پر اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح ہم نے گزشتہ زمانہ میں یہود ونصاریٰ پر عذاب نازل کئے، جنہوں نے اپنی کتابوں تورات وانجیل میں تحریف کرکے احکامِ الٰہیہ کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے چھوڑا تھا، اسی طرح ہم کفار مکہ کو بھی عذاب دے سکتے ہیں، جنہوں نے قرآن کو تقسیم کررکھا ہے۔

اس تقسیم کے دو پہلو مفسرین نے بیان کئے ہیں:

اوّل یہ کہ مشرکین مکہ نے قرآن کو اللہ تعالیٰ کی کتاب تسلیم نہیں کیا، اور حامل قرآن آنحضرت ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا رسول تسلیم نہیں کیا، جس کے نتیجے میں تقسیم کرکے ان کے مختلف نام تجویز کیے، وہ کہتے کہ یہ نبی شاعر ہے، اس کی کتاب شعر ہے، یہ ساحر ہے، کتاب سحر ہے، یہ مجنون ہے (العیاذ باللہ) اس کتاب میں اس کی بے تکی غیر مہذب باتیں ہیں، یہ قرآن افسانہ ہے، اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ہے، اور وہ قصہ گو ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ تو فرمایا کہ جس طرح پہلے تقسیم کنندگان پر عذاب آیا، اسی طرح اس مکہ مکرمہ کے تقسیم کنندگان پر بھی عذاب آجائے گا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ مکہ مکرمہ پر چاروں اطرف سے راستے آتے تھے، مشرکین مکہ نے ان راستوں کو

سولہ حصوں میں تقسیم کیا تھا، اور ہر ناکہ پر آدمی بٹھائے تھے، خاص کر ایام حج میں یہ ناکے والے لوگ باہر سے آنے والوں کو خبردار کر کے ڈراتے تھے کہ مکہ میں ایک بہت بڑا جادوگر ہے، اس کے پاس ہرگز نہ جانا، ملاقات نہ کرنا ورنہ یہ ہوگا وہ ہوگا۔ چنانچہ یمن کا مشہور شاعر اعشیٰ جسے پورے عرب میں فن شاعری میں پیغمبر مانا جاتا تھا، اس کے خیال میں آیا کہ مکہ میں جو پیغمبر مبعوث ہوا ہے، لوگ اسے شاعر کہتے ہیں، میں بھی جا کر اسے دیکھ لوں، چنانچہ وہ یمن سے مکہ پہنچا، مُقْتَسِمِیْن نے سوچا کہ یہ جاتے ہی اسلام قبول کرلے گا، چنانچہ انہوں نے اناج سے لدے ہوئے سو اونٹ اسے رشوت میں اس لئے پیش کیے کہ وہ آنحضرت ﷺ سے ملاقات نہ کرے، اس نے اتنے بڑے مال کو دیکھ کر اپنا ارادہ منسوخ کیا، اور یہ مال لے کر اپنے وطن یمن واپس ہوا، اور آپ ﷺ سے ملاقات نہ کی۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے تقسیم کنندگان کو دنیا ہی میں سزا دی، ان کے یہ سارے صنادید غزوۂ بدر میں جہنم رسید ہوئے، دس گیارہ لوگ جو بچ گئے تھے سوائے ابوسفیان کے، وہ سارے مختلف عذابوں اور ناگفتہ بہ بیماریوں میں ہلاک ہوگئے۔ ابوسفیان کو ایمان نصیب ہوا، وہ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے۔ رضی اللہ عنہ

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ تیرے ربّ کی قسم! دنیا کا عذاب اور ہلاکت عارضی ہے، اصل پوچھ گچھ اور سوالات قیامت کے دن ہوں گے۔ قیامت کے سوال وجوابات محض اتمام حجت کے لئے ہیں۔ ورنہ ﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ﴾[الرحمٰن: ۴۱] (مجرم لوگوں کو ان کی علامتوں سے پہچان لیا جائے گا، پھر انہیں سر کے بالوں اور پاؤں سے پکڑا جائے گا)۔

اور سورۂ رحمٰن میں یہ بھی ہے: ﴿فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْـَٔلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ﴾ [الرحمٰن: ۳۹] (پھر اس دن نہ کسی انسان سے اس کے گناہ کے بارے میں پوچھا جائے گا، اور نہ کسی جن سے)۔ مطلب یہ ہے کہ پھر بھی اتمام حجت کے لئے سوالات وہاں ہوں گے، اور ڈانٹنے کے لئے بھی۔

﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ پس آپ خوب صفائی کے ساتھ دل کھول کر بیان کیجئے جو اللہ تعالیٰ کا امر و حکم ہے، بلاخوف وخطر اس کی تبلیغ فرمایئے، اور مشرکین سے اعراض فرمایئے، اور ان کی مخالفت سے پریشان اور غمگین نہ ہو جایئے۔ آپ سارے پیغمبروں علیہم السلام کے امام ہیں، آپ کسی بھی بادِ مخالف سے گھبرانے والے نہیں، کیونکہ ہماری مخفی نصرت تو آپ کے ساتھ ہے، اور تباہی آپ کے دشمنوں کی مقدر ہے۔

﴿اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾ یہ بھی مُقْتَسِمِیْن کا ایک گروہ تھا، جنہیں صرف یہ سونپا گیا تھا کہ جہاں

دیکھو مذاق اڑاؤ، استہزاء کرو، اور آنکھیں ٹیڑھی کرو، منہ ٹیڑھا کرو، یہ کرو، وہ کرو، طرح طرح کے کرتب دکھاتے تھے۔ جب ان کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے لیا تو مسئلہ حل ہوا۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے اشاروں سے یہ دس کے دس کرتب دکھانے والے جیسا اشارہ ویسے عذاب میں مبتلا ہو گئے، جو قابل دید نہ رہے۔ اسی کشمکش کے عذابوں میں واصلِ جہنم ہوئے۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ولید بن مغیرہ، عاصم بن وائل عاص بن وائل، اسود بن عبدالمطلب، اسود بن عبدیغوث، حارث بن قیس، وغیرہم۔ قرآن مجید نے ایسے خبث باطن سرداروں کے متعلق جب اعلان فرمایا کہ:

﴿اِنَّا كَفَيْنٰكَ الْمُسْتَهْزِءِيْنَ﴾ تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مطمئن ہو گئے۔ فرمایا: ﴿الَّذِيْنَ يَجْعَلُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ﴾ یہ آپ پر استہزاء کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ بے جان وبے زبان پتھروں کو شریک بنایا، انہیں عنقریب پتہ چلے گا، جب کہ ان پر عذاب آجائے گا۔

❁ ❁ ❁

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ ﴿۹۷﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۹۸﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ ﴿۹۹﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں اس سے آپ تنگدل ہوتے ہیں ﴿۹۷﴾ سو آپ اپنے ربّ کی تسبیح بیان کیجئے، جس کے ساتھ تحمید بھی ہو، اور آپ سجدہ کرنے والوں میں سے ہو جایئے ﴿۹۸﴾ اور اپنے ربّ کی عبادت کیجئے، یہاں تک کہ آپ کے پاس یقین (یعنی موت) آجائے ﴿۹۹﴾

معارف ومنازل

مصیبتوں کا علاج ذکرِ الٰہی ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ آپ ہر وقت ہماری نگاہ میں ہوتے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ آپ ان مشرکین کے شرک، انکار توحید، استہزاء، مذاق اور ان کی بے جا تکذیب سے طبعی طور پر تنگدل، رنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ پس آپ کو ان تمام پریشانیوں کا علاج بتایا جا رہا ہے کہ وہ ہے قربِ الٰہی عزّ شانہ، اور اس کا ذریعہ وسبب ہے ذکرِ الٰہی، لہٰذا آپ اپنے ربّ کی تسبیح وتحمید کا مشغلہ بکثرت جاری فرمایئے۔ ﴿بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ [الفرقان: ۵] (یعنی صبح وشام تسبیح وتحمید کا وِرد جاری رکھیے)، اور کثرت سے نماز ادا کیجئے، اور بکثرت سجدوں میں وقت

صرف کیجئے، جس سے قلبی وروحانی سکون حاصل رہے گا، اور تمام ہموم وغموم کافور ہو جائیں گے، اور اس عمل کو پوری زندگی جاری رکھیں، موت آنے تک۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کوئی پریشانی پیش آجاتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھنے لگتے تھے۔ [مشکوٰۃ] اللہ تعالیٰ نے ہر چیز میں خاصیتیں رکھی ہیں۔ تو نماز، ذکر، تسبیح وتہلیل اور تکبیر وتحمید میں وہ عظیم خاصیت ہے کہ عبادت گزار، عابد وذاکر انسان کے سوا کوئی اس کا ادراک نہیں کر سکتا، گویا کہ یہ تمام خوشیوں، فرحتوں اور راحتوں کی چابی ہے، اور پریشانیوں، بیماریوں، غموں کا علاج وتریاق ہے۔

سُورَۃ النَّحل

مکیۃ آیاتھا ١٢٨ رکوعاتھا ١٦

سورۂ نحل مکی ہے، اس میں ایک سو اٹھائیس (١٢٨) آیتیں، اور سولہ (١٦) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۂ نحل ہے، اور سورۂ نعم بھی ہے۔ اس کی آیت (٦٨) میں کلمہ نحل مذکور ہے، اسی سے سورت کا نام ماخوذ ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ ترتیبِ تلاوت میں یہ سولہویں (١٦) سورت ہے، اور ترتیبِ نزول میں (٧٠) ویں نمبر پر ہے، اس کا نزول سورۃ الکہف کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات، حروف:

اس سورت میں سولہ (١٦) رکوع، ایک سو اٹھائیس (١٢٨) آیات ہیں، اور یہ سورت (١٨٧١) کلمات اور (٧٩٧٤) حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

(١) گزشتہ سورت کے آخر اور اس سورت کی ابتداء دونوں میں شرک کی تردید ہے۔ (٢) گزشتہ سورت اور اس سورت دونوں کی ابتداء میں صداقتِ قرآن کا بیان ہے۔ (٣) ان دونوں سورتوں کے آخر میں فرائضِ نبوی کا بیان

ہے۔(۴)اسی طرح دونوں سورتوں میں آپ ﷺ کی تسلی کا ذکر ہے ۔(۵)اسی طرح توحیدورسالت،اثباتِ
قیامت، متقین کا حسنِ انجام اور مشرکین کے بُرے اور تباہ کن انجام وغیرہ کا بیان دونوں سورتوں میں یکساں ہے۔

مختصر موضوع:

مقصدِ وحی، دعوت الیٰ التوحید، اثباتِ توحید، ردشرک، منکرین توحید ورسالت اور قرآن کے لئے وعید، تذکیراتِ ثلاثہ، مؤمنین کے لئے بشارت، ہجرت کی فضیلت، ایفاء عہد کا بیان، مسائل اِکراہ، کفروشرک کی قباحت، اور اخروی وبال، ایمان واعمالِ صالحہ کی فضیلت وبرکات اور انجام خیر، عدل، احسان، صلہ رحمی وبندہ نوازی کے فضائل، فحشاء، منکرات وغیرہ کی قباحت کا بیان، رسالتِ محمدیہ کی حقانیت، اور صبر وشکر اور عفو ودرگزر کی فضیلت، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے مناقب وفضائل کا بیان، تقویٰ کی ترغیب وغیرہ کا ذکر ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَتٰۤی اَمۡرُ اللّٰہِ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡہُ ؕ سُبۡحٰنَہٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشۡرِکُوۡنَ ① یُنَزِّلُ الۡمَلٰٓئِکَۃَ بِالرُّوۡحِ
مِنۡ اَمۡرِہٖ عَلٰی مَنۡ یَّشَآءُ مِنۡ عِبَادِہٖۤ اَنۡ اَنۡذِرُوۡۤا اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاتَّقُوۡنِ ②

ترجمہ: آپہنچا اللہ تعالیٰ کا حکم، سوتم اس میں جلدی نہ کرو، وہ پاک ہے، اوراس سے برتر ہے جو وہ شریک تجویز کرتے ہیں ① وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے فرشتوں کو وحی، یعنی اپنا حکم دے کر نازل فرماتا ہے کہ اس بات سے باخبر کردو کہ بلاشبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سوتم مجھ سے ڈرو ②

معارف ومنازل

یہاں سے سورۂ نحل شروع ہے۔سورت کا آغاز بغیر کسی تمہید کے یک لخت ایک تنبیہی جملے سے ہوتا ہے۔کفارِ مکہ بار بار کہتے تھے کہ جب ہم تمہیں جھٹلا چکے ہیں، اور کھلم کھلا تمہاری مخالفت کررہے ہیں، تو آخر وہ خدا کا عذاب آ کیوں نہیں جاتا جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے ہو؟ اس بات کو وہ صبح وشام تکیہ کلام بنا کر کہتے تھے۔اس پر اللہ تعالیٰ نے انہیں تنبیہ فرمائی کہ بے وقوفو! خدا کا عذاب تو تمہارے سر پُلا کھڑا ہے، اب اس کے ٹوٹ پڑنے کے لئے جلدی نہ مچاؤ، بلکہ جو ذرا سی مہلت باقی ہے، اس سے فائدہ اٹھا کر بات سمجھنے کی کوشش کرو، کیونکہ وہ عذاب آہی چاہتا ہے، اس کے ظہور کا یہی وقت ہے۔اس بات کو صیغہ ماضی میں یا تو اس کے انتہائی یقینی اور انتہائی قریب ہونے کا تصور دلانے

کے لئے فرمایا گیا، یا پھر اس لئے کہ کفار قریش کی سرکشی و بد عملی کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا، اور آخری فیصلہ کن قدم اٹھائے جانے کا وقت آ گیا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہ فیصلہ جو ان کے سر پر تُلا ہوا تھا، یہ کیا تھا؟ بعض حضرات اُسے قیامت کے آنے پر محمول کرتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "بُعِثْتُ أَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ"۔ [بخاري] یعنی میں اور قیامت دونوں اس طرح سے بھیجے گئے ہیں جیسے کہ آپس میں یہ دو انگلیاں ملی ہوئی ہیں، اور ان میں بیچ کی انگلی اشارہ والی انگلی سے ذرا سی آگے بڑھی ہوئی ہے، اتنی بات ہے کہ میں اس سے پہلے آ گیا، لہٰذا اس سے مراد قیامت ہے۔ جیسے فرمایا: ﴿اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا﴾ [المعارج: ۷] (یہ لوگ اسے دور سمجھ رہے ہیں۔ اور ہم اسے قریب دیکھ رہے ہیں)۔ ایک تو قریب ہے، پھر یقینی ہے، تو سمجھو کہ آ گیا اور حاضر ہوا۔

اور بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا کہ جنگ بدر وغیرہ میں جو بڑے بڑے صنادید و سرغنے مارے گئے، امر اللہ سے یہی مراد ہے کہ مشرکین پر عذاب آ گیا، جس سے ان کی کمر ٹوٹ گئی، اور وہ ذلیل ہوئے۔ راجح یہ ہے کہ اسی سورت کی آیت (۴۱) میں ہجرت اور اس کے فضائل کا بیان ہے۔ ﴿اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ﴾ سے ممکن ہے کہ یہی ہجرت والا فیصلہ مراد ہو، جس کا حکم اس کے بعد مختصر وقت میں دیا گیا۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر جن لوگوں کے درمیان مبعوث ہوتا ہے، ان کے جحود و انکار کی آخری سرحد پر پہنچ کر ہی اسے ہجرت کا حکم دیا جاتا ہے، اور یہ حکم کفار کی قسمت کا فیصلہ ہوتا ہے، اس کے بعد یا تو ان پر تباہ کن عذاب آ جاتا ہے، یا پھر پیغمبر اور اس کے متبعین کے ہاتھوں ان کی جڑ کاٹ کر رکھ دی جاتی ہے۔ یہی بات تاریخ سے بھی معلوم ہوتی ہے کہ ہجرت جب واقع ہوئی تو کفار مکہ یہ سمجھے کہ فیصلہ ہمارے حق میں ہوا، مگر آٹھ سال کے اندر یہ دنیا نے دیکھ لیا کہ نہ صرف مکے سے بلکہ پوری سرزمین عرب ہی سے کفر و شرک کی جڑیں اکھاڑ کر پھینک دی گئیں، اور شیطان پورے جزیرۂ عرب سے سر پر مٹی ڈالتے ہوئے ہمیشہ کے لئے جلا وطن ہو گیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

﴿سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ﴾ وہ پاک ہے، اور اس سے برتر ہے جو وہ شرک کرتے ہیں۔ ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾۔ [الإخلاص: ۴] (نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں)۔

﴿يُنَزِّلُ الْمَلٰۤىِٕكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ﴾ وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے، یعنی اپنا حکم (وحی)

فرشتوں کو نازل فرماتا ہے کہ اس بات سے خبر کردو کہ بلا شبہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سوتم مجھ سے ڈرو۔ مفسرین حضرات نے ﴿رُوح﴾ سے وحی مراد لی ہے، اور ﴿مِنۡ اَمۡرِهٖ﴾ کو اس کا بیان قرار دیا ہے، اور ملائکہ سے جنس کے طور پر حضرت جبرئیل علیہ السلام مراد لیا ہے۔

آیت کریمہ میں یہ بتایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے جس بندے پر چاہے فرشتوں کے ذریعہ وحی بھیج دیتا ہے، اور وحی بھیجنا اس لئے ہے کہ وحی لانے والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخاطبین کو یہ پیغام پہنچادیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ شانہ کا یہ فرمان بھی پہنچادیں کہ اگر تم نے توحید کی دعوت کو قبول نہ کیا تو عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے، لہٰذا تم مجھ سے ڈرتے رہو۔ فرمایا:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِالۡحَقِّ ؕ تَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ۝۳
خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيۡمٌ مُّبِيۡنٌ ۝۴

ترجمہ: اس نے آسمانوں اور زمین کو حق کے ساتھ پیدا فرمایا، وہ اس سے برتر ہے جو لوگ شریک بناتے ہیں ۝۳ اس نے انسان کو نطفہ سے پیدا فرمایا، سو وہ یکا یک واضح طور پر جھگڑا کرنے والا ہو گیا ۝۴

معارف و منازل

آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق بالحق اور مبنی بر حکمت ہے۔ کائنات کے ہر ہر ذرہ کی تخلیق کسی حکمت کے تحت ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان کی رسائی ہر چیز کی حکمت تک ہو۔ اتنے بڑے جہاں کو بغیر کسی سابق مادہ وصورت، اور تیار شدہ نقشہ کے پیدا کرنا صرف ربّ تعالیٰ شانہ کی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ کا کرشمہ ہے۔ اس کے بعد انسان کی پیدائش کا قریبی مادہ ذکر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے گندہ، ناپاک اور بے جان و بے قیمت، ناپاک قطرہ منی سے تخلیق فرمایا۔ ابتدائی پیدائش کا حال یہ تھا کہ گندہ، سڑی ہوئی، بدبودار، سیاہ رنگ کی کیچڑ سے انسانی تخلیق ہوئی، اب قریبی مرحلہ وار تخلیق منی سے ہوتی ہے۔ کبھی قرآن کریم اسے ﴿مَاءٍ مَّهِيۡنٍ﴾ بے قدر و مردار پانی کہتا ہے، جو کپڑوں اور بدن پر لگنے سے کپڑے اور بدن دونوں ناپاک ہو جاتے ہیں، اور بدن سے نکلنے پر غسل واجب ہو جاتا ہے، کیونکہ بدن ناپاک ہوا۔

کاش یہ ناحق شناس انسان ربّ تعالیٰ کے حکموں کا باغی ونافرمان ہیرے وجواہرات، یاقوت وموتیوں سے پیدا ہوتا، تو ناز ونخرے، خودسری ایک حد تک اسے زیب دیتا، مگر ناپاک، بدبودار پانی کی پیداوار کو زیب نہیں دیتا کہ بجائے فرمانبرداری واطاعت کے وہ خصومت پر اتر آئے، اور اپنے خالق ومالک کے حکموں کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کا مذاق اڑائے۔

میں کہتا ہوں: اس کا اصلی سبب یہی سمجھ میں آتا ہے کہ: "كُلّ شَئٍ يَرجِعُ اِلى أَصلِهٖ وَأَصلُهٗ هُوَ الْمَاءُ الْخَبِيثُ وَالطِّينُ الْمَسْنُونُ دُونَ اللَّبَنِ وَمَاءُ الْجَنَّةِ أَوْ مَاءُ الْكَوْثَرِ أَوِ الزَّمْزَمِ"۔ یہ عبارت صوفیاء کرام کے امام نے لکھی کہ ہر چیز اپنی اصلی اور بنیاد کی طرف رجوع کرتی ہے، چونکہ انسان کی اصل ناپاک، سڑی ہوئی، بدبودار مٹی، اور ناپاک منی ہے، اس لئے اس کے اعمال اور کردار سارے ناپاک اور بُرے ہیں۔ اگر اس کی پیدائش دودھ، یا جنتی پانی آب کوثر، یا آب زمزم سے ہوتی تو یہ کبھی خطاکار اور باغی نہ ہوتا، کیونکہ ہر سبزہ اپنے تخم کی پیداوار سے اور اسی کا تابع ہے۔ سورۂ یٰسں میں فرمایا: ﴿اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ [یسٓ:۷۸] (کیا انسان نے نہیں دیکھا کہ بلاشبہ ہم نے اسے نطفہ سے پیدا کیا، سویکایک واضح طور پر جھگڑالو ہوگیا، اور اس نے ہمارے بارے میں مثال بیان کردی، اور اپنی پیدائش کو بھول گیا۔ وہ کہتا ہے کہ بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندہ کرتا ہے یا کرے گا، اس حال میں کہ وہ ریزہ ریزہ ہوچکی ہوں؟)۔ یہ ہے انسانی عقل ومنطق۔ ایک ادنیٰ ممکن کو پہاڑوں جیسا بڑا ناممکن بنادیا۔

شاید آپ کا یہ خیال ہو کہ مکہ شریف کے جاہل، غیر مہذب، بے تعلیم مشرکین کا یہ فرسودہ نظریہ تھا۔ نہیں، ہرگز نہیں، آج کا ترقی یافتہ انسان جو چاند سورج پر کمند ڈالنے کا عزم کیے ہوئے ہے، اس بیچارے کا بھی ہو بہو یہی نظریہ ہے کہ خوب کماؤ، کھاؤ، پیو، عیش وعشرت کرو، آگے کچھ بھی نہیں۔ نہ دوبارہ زندگی ہے، نہ قیامت، نہ حساب، نہ کتاب، پھر تو اپنے مردوں کو جلاؤ، یا ممی لگاؤ، یا محض تعفن نہ پھیلنے کی خاطر سپرد خاک کرو۔ یہ اسلامی نظریے، اور اسلامی نظریات محض بے سروپا افسانے ہیں، مفروضے اور خیالی ہیں۔

بہ بیں تفاوت راہ، از کجاست تا بہ کجا

وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا ۚ لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝٥ وَلَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۝٦ وَتَحْمِلُ اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ ۭ اِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝٧ وَّالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا وَزِيْنَةً ۭ وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٨

ترجمہ: اور اس نے چوپایوں کو پیدا فرمایا، ان میں تمہارے لئے سردی سے بچنے کا سامان ہے، اور دیگر فائدے ہیں، اور ان میں سے تم کھاتے ہو۝٥ اور تمہارے لئے ان میں رونق ہے، جب تم شام کو لاتے ہو، اور صبح کو چھوڑتے ہو۝٦ اور وہ تمہارے بوجھوں کو ایسے شہروں کی طرف اٹھا کر لے جاتے ہیں، جہاں تم اپنی جانوں کو مشقت کے بغیر پہنچ نہیں سکتے تھے، بلاشبہ تمہارا ربّ رؤف ہے، رحیم ہے۝٧ اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا فرمائے تاکہ تم ان پر سوار ہو، اور زینت کے طور پر، اور وہ پیدا فرماتا ہے جو تم نہیں جانتے۝٨

معارف ومنازل

کائنات کی تخلیق جب انسان کے لئے ہے تو کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی طرح بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کا کوئی فائدہ ومنفعت وابستہ نہ ہو۔ ان آیات میں انہی فوائد اور منفعتوں کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے طرح طرح کی چیزیں پیدا فرمائی ہیں، جن کے فوائد ومنافع کا تمہیں بخوبی علم ہے۔ ان چیزں میں سرِ فہرست حیوانات اور چوپائے ہیں، جیسے اونٹ، گائے، بھینس، بھیڑ، بکری وغیرہ۔ ان کے دودھ، گھی، دہی اور گوشت تمہارے کھانے کے لئے ہیں اور پشم، بال، اون ہڈی اور چمڑے تمہاری کاروباری تجارت اور پیسے کمانے کے ذرائع ہیں۔ ان پشم، اون وبال وغیرہ سے پہننے کے کپڑے، بسترے، کمبل، خیمے اور دھاگے، رسیاں تیار کر کے اپنی ضروریات پوری کرتے ہو۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں جن کی پیدائش پر سوائے حق تعالیٰ شانہ کے کوئی قدرت و استطاعت نہیں رکھتا۔ ﴿فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ﴾ [المؤمنون: ١٤] (برکت والا ہے اللہ جو بہترین پیدا کرنے والا ہے)۔

ان جانوروں میں اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے رونق، خوبصورتی اور ہزاروں خوشیوں کا سامان پیدا فرمایا ہے۔ یہ خوشی اور فخر ومباہات ان لوگوں کو حاصل ہیں جو مال مویشی پالتے ہیں، اور مالداری کرتے ہیں۔ تو فرمایا کہ جبکہ تم شام کو چراگاہوں سے واپس لاتے ہو اور صبح کو چراگاہوں کی طرف لے جانے کے لئے چھوڑتے ہو، یہ رونق جو

جانوروں سے حاصل ہوتی ہے، اس کو مالدار لوگ ہی جانتے ہیں۔ جب کسی کے پاس بہت سے جانور ہوں، بہت سے مویشی ہوں، جب وہ صبح وشام اپنے جانوروں کو آتا جاتا قطار میں دیکھتا ہے تو خوشی میں پھولے نہیں سماتا۔

غرض یہ ہے کہ یہ پیشہ بہت اچھا بابرکت پیشہ ہے، اس سلسلے یہ مویشی والے بڑے خوشحال ہوتے ہیں، اور اپنے اس پیشے کو تمام دیگر کاروباری پیشوں سے بہتر سمجھتے ہیں۔ جانوروں کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ تمہارے لئے بوجھ اٹھاتے ہیں، بار برداری کے سلسلے میں عرب لوگ اونٹ کو سَفِينَةُ البر کہتے ہیں، یعنی خشکی کی کشتی۔ اس میں شک نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اونٹ میں بہت ہی شرافت، متانت واطاعت رکھی ہے۔ آٹھ، دس من کا سامان اٹھا کر بخوشی چلتا ہے، بشرطیکہ راستہ ہموار ہو۔

اوران اونٹوں کی کئی نسلیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی نسلوں میں بہت سے خصوصی امتیازی کمالات رکھے ہیں۔ عرب کے لوگ اونٹوں پر کھانے پینے کے اسباب اور دیگر سامان لاد کر کئی ہزار میل کی مسافت پر بخوشی قافلوں کی شکل میں تجارت کرتے تھے۔ اس کے ساتھ سواری کے جانور، گھوڑے، خچر اور گدھے پیدا فرمائے تا کہ تم ان پر سواری کرو، اوران میں تمہارے لئے زینت بھی ہے۔ اوران کی تسخیر کا معاملہ قابلِ ذکر ہے۔ رات دن سو سو میل سفر کرتے ہیں، اور تمہاری خدمت سے کبھی منحرف نہیں ہوتے، مالک کی نافرمانی کا مادہ جانوروں میں نہیں ہوتا۔ یہ تمغہ امتیاز صرف انسان کے پاس ہے کہ اپنے مالک کا نافرماں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے مویشوں کے متعلق فرمایا:

﴿وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ﴾ اور سواری کے جانور، گھوڑوں، خچروں، اور گدھوں کے متعلق فرمایا:

﴿لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً﴾ پس یہ شان وشوکت سب میں موجود ہے۔ ابھی موجودہ ترقی یافتہ بہت سے ملکوں میں دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں جہاں گاڑیاں نہیں چل سکتیں، وہاں گدھوں، خچروں سے بکثرت کام لیا جاتا ہے، اور انہیں اسی مقصد کی خاطر ہمیشہ اکثر فوجیوں کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔

﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ اللہ تعالیٰ وہ چیزیں پیدا فرماتے ہیں جنہیں تم نہیں جانتے۔ اس کے عموم میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت دنیا میں موجود نہ تھیں، اللہ تعالیٰ بعد میں پیدا فرمائیں گے، اور آئندہ کیا کیا پیدا ہوگا، اس کا علم بندوں کو نہیں، اللہ تعالیٰ شانہ کو ان کا بھی علم ہے۔ چونکہ اس بات کو سواریوں کے ذیل میں ذکر فرمایا ہے، اس لئے بعض اکابر علماء کرام نے نوایجاد سواریوں کے بارے میں فرمایا کہ ہوائی جہاز، ریل، بسیں، ٹرکیں، موٹر کار، جیپ وغیرہ ان سب کے وجود میں آنے کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ ہے، بلکہ قیامت تک جتنی بھی

سواریاں ایجاد ہوں گی عمومی الفاظ میں ان سب کی خبر دی گئی ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَآئِرٌ ؕ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۹﴾ هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ﴿۱۰﴾ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ
وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَ
النَّهَارَ ۙ وَالشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ ؕ وَالنُّجُوْمُ مُسَخَّرٰتٌۢ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۲﴾
وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اور سیدھا راستہ اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے، اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اس سے ہٹے ہوئے ہیں، اور اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت دے دیتا ﴿۹﴾ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، اس میں پینے کا پانی ہے، اور اس کے ذریعہ درخت پیدا ہوتے ہیں، جن میں تم چراتے ہو ﴿۱۰﴾ وہ تمہارے لئے اس کے ذریعہ کھیتی اور زیتون، اور کھجوریں اور انگور، اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو غور کرتے ہیں ﴿۱۱﴾ اور اس نے تمہارے لئے رات کو، اور دن کو، اور چاند کو، اور سورج کو مسخر فرمایا، اور ستارے اس کے حکم سے مسخر ہیں، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو سمجھ رکھتے ہیں ﴿۱۲﴾ اور جو چیزیں زمین میں پھیلا دیں جن کے رنگ مختلف ہیں، بلاشبہ اس میں نشانی ہے ان کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں ﴿۱۳﴾

معارف و منازل

اللہ تعالیٰ کی توحید کا انعامات کے ضمن میں اثبات ہو رہا ہے۔ چند نعمتوں کا بیان ہو چکا، اب دیگر نعمتوں کا تذکرہ ہو رہا ہے، درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر بیدار فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ﴾ یہاں پر عَلٰی، اِلٰی کے معنی میں ہے۔ سیدھا راستہ جو اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندوں کا ہے، وہ اللہ تعالیٰ تک پہنچتا ہے۔ یعنی یہی صراط مستقیم ہے جس کی انتہاء اللہ تعالیٰ کی رضا ہے، اور دوسرے بہت سے راستے ٹیڑھے ہیں، صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ تک نہیں پہنچتے وہ شیطانی راستے ہیں، جن پر چلنے والے ناشکرے لوگ ہیں، یہ سارے راستے جہنم تک پہنچتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ چاہے تم سب کو ہدایت

دے، مگر ایسا نہیں کیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہدایت کے ذرائع کھول دیئے، عقل کی نعمت سے نوازا، انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعہ سے سمجھایا، ظاہری وباطنی نعمتوں کی بارش برسائی، اتمام حجت ہوگیا، مکمل اختیار ہر شخص کو سپرد ہوا، اب ہر آدمی کی مرضی کہ وہ صراط مستقیم کا انتخاب کرے یا جہنمی راستوں کا۔ ﴿فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ [الكهف: ۲۹] (جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے)۔

ایمان وکفر، اسی طرح ہدایت وگمراہی، اور پھر اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ، یہ سب اختیاری ہیں۔

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَاۗءِ مَاۗءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ﴾ فرمایا: پانی کی حیثیت تمہاری زندگی وبقاء کے لئے بمنزلہ ریڑھ کی ہڈی کی ہے، تمہارے اپنے اور تمہارے جانوروں کے لئے، اسی طرح ان کی خوارک وغذا اور زمین کی سرسبزی وحیات نَو کی خاطر ہم نے آسمان سے لذیذ، میٹھا اور خوشگوار پانی نازل فرمایا، جس سے تم پیتے ہو، اور تمہارے جانوروں کے لئے درخت گھاس پیدا ہوگا، جس میں تم مال مویشی کو چراتے ہوئے نفع کماتے ہو۔

﴿يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ﴾ اس پانی سے اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کھیتی، سبزی، زیتون، کھجور، انگور اور طرح طرح کے عمدہ پھل اور میوے اُگاتا ہے، جس سے تم لوگ ہر موسم کھاتے اور سیر ہوتے ہو۔ اس کے ساتھ فرمایا کہ بلاشبہ فکر کرنے والوں کے لئے اس میں نشانی ہے، یعنی توحید وربوبیت کے اثبات میں۔

﴿وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہارے آرام وسکون کیلئے رات کو، اور معاشی ضرورتوں کے لئے دن کو، اسی طرح سورج، چاند اور مختلف ستاروں، سیارچوں کو پیدا فرمایا، اور تمہارے مقصد وفوائد کے لئے مسخر فرمایا۔ بلاشبہ اس میں عقلمندوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

﴿وَمَا ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ﴾ اللہ تعالیٰ نے یہ چیزیں تمہاری زمین میں پیدا فرمائیں ہیں، مختلف رنگ، مختلف قسم، مختلف فوائد، مختلف خاصیت کی سب چیزیں جتنی بھی زمین پر ہیں یہ سب کو اپنے عموم ﴿وَمَا ذَرَاَ﴾ کے اعتبار سے شامل ہے، وہ مختلف چیزیں یہ ہیں۔ حیوانات، نباتات، معدنیات، جمادات وغیرہ۔ فرمایا: بلاشبہ اس میں نشانی ہے ایسے لوگوں کے لئے جو نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

وَهُوَ الَّذِیْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا مِنْهُ لَحْمًا طَرِیًّا وَّ تَسْتَخْرِجُوْا مِنْهُ حِلْیَةً تَلْبَسُوْنَهَا ۚ وَ تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِیْهِ وَ لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۴﴾ وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِكُمْ وَ اَنْهٰرًا وَّ سُبُلًا لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَ عَلٰمٰتٍ ؕ وَ بِالنَّجْمِ هُمْ یَهْتَدُوْنَ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے سمندر کو مسخر فرمادیا تاکہ تم اس میں سے تازہ گوشت کھاؤ، اور اس میں سے زیور نکالو، جسے تم پہنتے ہو، اور اے مخاطب! تو کشتیوں کو دیکھتا ہے کہ وہ اس میں پھاڑنے والی ہیں تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو ﴿۱۴﴾ اور اللہ تعالیٰ نے زمین میں بھاری پہاڑ ڈال دیئے، تاکہ زمین تمہیں لے کر ہلنے نہ لگے، اور اس نے نہریں بنائیں، اور راستے بنائے، تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۱۵﴾ اور نشانیاں بنائیں، اور وہ ستاروں کے ذریعہ راہ پاتے ہیں ﴿۱۶﴾

معارف و منازل

نعمتوں کا سلسلہ جاری ہے۔ پہلی نعمت پانی کا ذکر، دوسری رات دن وغیرہ، تیسری سورج چاند، چوتھی ستارے، پانچویں زمین کی مختلف اشیاء۔ اب چھٹی نعمت سمندر کی تسخیر کا بیان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سارے سمندر پیدا فرمائے اور تمہارے لئے مسخر فرمادیئے، تمہاری پہاڑوں جیسی کشتیاں اور بحری جہاز اس میں سفر کرتے ہیں، کئی لاکھ ٹن سامان اٹھا کر دنیا کے اکناف واطرف تک پہنچاتے ہیں۔ یہاں صرف چار چیزوں کا تذکرہ فرمایا:

(۱) تم سمندر سے مچھلی کا تازہ گوشت کھاتے ہو۔ (۲) سمندر سے ہیرے، جواہرات، موتی، لعل، یاقوت وغیرہ بیش قیمت زیور نکالتے ہو۔ (۳) تمہاری کشتیاں سمندر کی موجوں کو پھاڑتے ہوئے سفر کرتی ہیں، کیا یہ معمولی نعمت ہے؟ (۴) ان کشتیوں کے ذریعہ اربوں روپوں کا مال ایشیاء سے یورپ، افریقہ، مشرق وسطیٰ، مشرق بعید وغیرہ سے سامان لے جاتے ہو، تجارت کرتے ہو۔ آج دنیاوی تجارت کا سب سے بڑا ذریعہ سمندر ہے، اور اسی پر پورے عالم کا انحصار ہے۔

﴿وَ اَلْقٰى فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ﴾۔ ﴿رَوَاسِیَ﴾ رَسَا سے ماخوذ ہے، یعنی کسی چیز کا جم کر مضبوطی سے کھڑا ہونا، اور پہاڑوں کی یہی کیفیت ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ میں ہے: ﴿بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَ مُرْسٰىهَا﴾ [ہود: ۴۱] (اللہ کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا)۔ یہ ساتویں نعمت کا تذکرہ ہے۔ زمین پر بھاری، فلک

بوس، موٹے اور بلند و بالا، رنگ برنگ پہاڑوں کا عجیب سلسلہ قائم فرما کر پہاڑوں کو زمین پر ڈال دیا، تاکہ زمین اپنی طبعی اضطرابی حرکت کے ساتھ تمہیں لے نہ ڈوبے اور حرکت نہ کرے۔ ہاں! وہ الگ بات ہے کہ جب کسی قوم یا آبادی کو کسی حکمت کے تحت تباہ کرنا یا تنبیہ کرنا مقصود ہو تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے زلزلہ آ ہی جاتا ہے۔

آٹھویں نعمت نہروں کی ہے، میٹھے دریاؤں کی ہے، جو دنیا کے مختلف حصوں میں تخلیق کائنات سے لے کر آج تک جاری ہیں۔ تین سو کے قریب دریائی نہریں بہہ رہی ہیں، سب سے بڑا دریائے نیل ہے، جو کہ سوڈان سے گزر کر مصر میں آبپاشی کرتا ہے۔

نویں نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر، پھر خاص کر پہاڑی علاقوں میں تمہارے لئے آنے جانے، سفر کرنے، نقل و حرکت، آمد و رفت، کے لئے ہر قسم کے راستے بنا دیے۔ جنگلوں، صحراؤں، پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں، اور جزیروں، الغرض ہر جگہ، ہر آبادی، ہر معمورہ پر راستے موجود ہیں، اور تکوینی نظام سے جڑے ہوئے مربوط ہیں۔ سورۂ نوح میں فرمایا: ﴿سُبُلًا فِجَاجًا﴾ [نوح: ۲۰] (کشادہ راستہ اور گزرگاہیں)۔

دسویں نعمت: ﴿وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ﴾ ستاروں کے ذریعہ لوگ راستہ معلوم کرتے ہیں۔ راتوں کو لق و دق صحراؤں میں جب قافلے چلتے ہیں تو ستاروں کو سامنے اور دائیں بائیں رکھ کر بلا خوف و خطر سفر کرتے ہیں، اور کبھی غلطی نہیں کرتے ہیں۔ یہ ایک تجربہ ہے جس پر سارے عربوں کا عمل ہوتا تھا اور اب بھی ہے۔ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ کُلَّ شَیْءٍ بِقُدْرَتِہٖ وَ حِکْمَتِہٖ۔ علماء کرام نے قرآن پاک کی آیات کو نجم اور نجوم کہا ہے، جو اپنے قاری کے لئے ہدایت کے ذریعہ ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہماری راہنمائی فرما۔ آمین

اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝۱۷ وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۸ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُسِرُّوْنَ وَمَا تُعْلِنُوْنَ ۝۱۹ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا يَخْلُقُوْنَ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ۝۲۰ اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ۝۲۱

ترجمہ: سو کیا جو پیدا کرتا ہو وہ اس کی طرح ہوگا جو پیدا نہیں کرتا؟ کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے؟ ۝۱۷ اور اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنے لگو تو شمار نہیں کر سکتے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ غفور ہے رحیم ہے ۝۱۸ اور اللہ تعالیٰ

جانتا ہے جو تم چھپاتے ہو، اور جو ظاہر کرتے ہو ⑲ اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیروں کو پکارتے ہیں، وہ کوئی چیز بھی پیدا نہیں کرتے، اور وہ پیدا کئے جاتے ہیں ⑳ بے جان ہیں، زندہ نہیں ہیں، اور انہیں خبر نہیں ہے کہ کب اٹھائے جائیں گے ㉑

معارف ومنازل

پچھلی آیتوں میں کائنات کی تخلیق کی اور اللہ تعالیٰ کی علوی، سفلی اور ظاہری وباطنی نعمتوں کا تذکرہ ہوتا رہا، اس ضمن میں معبود حقیقی سبحانہ وتعالیٰ کی صفات کمالیہ وجلالیہ کا بیان ہوا۔ اب ارشاد فرمارہے ہیں کہ جو ذات پاک ان تمام چیزوں کی مالک وخالق ہو، اور اس کی نعمتیں شمار کے احاطہ سے باہر ہوں، اور وہ ہر چیز پر قادر وتوانا بھی ہو، اور تمہارے ظاہر وباطن سے باخبر وعالم بھی ہو، حیّ وقیّوم بھی ہو، اور تمام کائنات کو حیات وزندگی دینے والی ہو۔ ان چند حقائق کو جاننے اور سمجھنے کے بعد کتنی حماقت ونادانی اور بے انصافی ہوگی کہ تم اسے چھوڑ کر عاجز وناتواں، بے جان وبے زبان مخلوق اور بتوں کو جو ایک مکھی اور مچھر تخلیق کرنا درکنار، اسے روزی دینے پر قدرت نہیں رکھتے، تم نے انہیں خدا کا شریک ٹھہرایا، اور ان کی عبادت شروع کی، پس تمہارے مقدر میں سوائے تباہی کے کچھ نہ ہوگا۔

حق تو یہ تھا کہ زمین میں دھنس جاتے، یا بنی اسرائیلیوں کی طرح مسخ ہو جاتے، مگر یہ عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مسعود، جس پر کائنات کے مالک ربّ نے بھی قسم کھائی، یہ ہر قسم کے آسمانی اجتماعی عذاب کے نزول سے مانع ہے۔ سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿هٰذَا خَلْقُ اللهِ فَأَرُونِي مَاذَا خَلَقَ الَّذِينَ﴾ یہ جو بیان ہوا، یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی مخلوق ہے۔ سو مجھے تم دکھاؤ جن کو تم نے معبود بنایا، کیا انہوں نے بھی کچھ پیدا کیا؟ وہ اتنے عاجز وبے جان ہیں جنہیں اپنے اٹھائے جانے کا بھی پتہ نہیں، وہ اتنے حقیر اور چھوٹے ہیں کہ جن سے تم جاندار بڑے اور ہوشیار ہو۔ حالیؔ نے کہا: کھڑے ہیں، کھڑے ہیں، پڑے ہیں، پڑے ہیں ☆ جو نا ہو تو بندے خدا سے بڑے ہیں

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر جب طوفان آیا تو لوگ زندہ انسان تھے، اِدھر اُدھر جان بچانے کے لئے بھاگے، کوئی درختوں پر، کچھ لوگوں نے ٹیلوں اور پہاڑوں پر چڑھ کر جان بچانے کی کوشش کی، جبکہ ان کے پتھر کے بے جان ومردہ معبود جہاں تھے وہیں پڑے رہے۔ لوگوں کو کیا بچاتے؟ وہ سب سے پہلے خود غرقاب ہو گئے، لوگ ابھی پہاڑوں پر زندہ ہیں، جبکہ باطل معبود ان سے پہلے جہنم پہنچ چکے ہیں۔

﴿وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ انہیں نہ قیامت کا پتہ، نہ حساب وکتاب کا اور نہ ہی جزا وسزا کا، اور نہ ہی اپنی ہلاکت وتباہی کا۔ جو اپنے وجود کا مالک نہ ہو وہ تمہیں کیا کچھ دے سکتا ہے، سوائے تباہی اور ہلاکت کے۔

......❁......❁......❁......

اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ ﴿٢٢﴾
لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ ﴿٢٣﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ
مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿٢٤﴾ لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۙ
وَمِنْ اَوْزَارِ الَّذِيْنَ يُضِلُّوْنَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٢٥﴾

ترجمہ: تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے دل منکر ہو رہے ہیں، اور وہ تکبر کرنے والے ہیں ﴿٢٢﴾ یہ بات ضروری ہے، یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو وہ ظاہر کرتے ہیں، بلاشبہ وہ تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ﴿٢٣﴾ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تمہارے ربّ نے کیا نازل کیا؟ تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ پہلے لوگوں کی لکھی ہوئی باتیں ہیں ﴿٢٤﴾ تاکہ وہ قیامت کے دن اپنے بوجھ پورے پورے اٹھا لیں، اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھا لیں جنہیں بغیر علم کے گمراہ کرتے ہیں، خبردار! بُرا ہے وہ بوجھ جسے وہ اپنے اوپر لاد رہے ہیں ﴿٢٥﴾

معارف ومنازل

تمہارا معبود حقیقی ایک ہی ہے، اس کا ایک اسم اعظم ہے، بشرطیکہ پڑھنے والے میں جان ہو۔ ''اَلسَّیفُ بِالسَّاعِدِ لَا السَّاعِدُ بِالسَّیفِ''۔ اسم اعظم کی شرائط سورۂ بقرہ میں لکھ چکے ہیں، وہاں دیکھی جائے۔ کائنات کی ہر چیز اس پر گواہ ہے کہ تمہارا معبود صرف ایک ہی اللہ تعالیٰ ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

﴿فَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مُّنْكِرَةٌ﴾ پس جو لوگ آخرت کو نہیں مانتے ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی بے شمار نعمتوں سے انکار کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے قلوب کو نورِ معرفت سے محروم کر دیا ہے، وہ گونگے، بہرے، اندھے اور جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: ''اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو تاریکی (کثیف مادیت، اور حیوانی

جہالت) میں پیدا فرمایا، پھران پر اپنا نور (یعنی اس کا ایک چھینٹا) ڈال دیا، جس شخص پر وہ چھینٹا پڑ گیا اس کو راستہ مل گیا، اور ہدایت پا گیا اور جس پر نہ پڑا وہ محروم رہا، بھٹکتا رہا، اور ہدایت نہ پا سکا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، اس کی تحریر ہو چکی، فیصلہ لکھنے والا قلم خشک ہو گیا، اب اس فیصلے میں تبدیلی نہیں ہو سکتی"۔ [رواه أحمد والترمذي]

﴿وَّهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ﴾ وہ قبولِ حق سے تکبر کرتے ہیں، جیسے شیطان نے قبول حق سے غرور کیا۔ دراصل غرور ہی تمام گمراہیوں کا سرچشمہ اور بنیاد ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ متکبر انسان ہدایت یافتہ نہیں ہوتا۔ فرمایا:

﴿لَا جَرَمَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ﴾ ضروری اور یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ظاہر اور باطن کے تمام احوال سے باخبر ہے، اور ان کے غرور و تکبر کے نتائج سے بھی خبردار ہے، اور:

﴿اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ﴾ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ غرور اور تکبر کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی مذمت اور نقصان بیان فرماتے ہوئے کہا کہ: "سرخ چھوٹی چیونٹی کے برابر اگر کسی کے دل میں تکبر ہو وہ جنت میں نہیں جائے گا اور سرخ چھوٹی چیونٹی کے برابر ایمان والا دوزخ میں (ابدی) داخل نہ ہوگا"۔ ایک شخص نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم میں سے ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کا لباس خوبصورت ہو، اگر یہ تکبر کی علامت ہے تو پھر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ فرمایا: "اللہ تعالیٰ شانہ جمال والا ہے، جمال کو پسند فرماتا ہے، اور غرور کپڑوں کی پسندیدگی کا نام نہیں، خوش پوشاکی کی خواہش تکبر نہیں، بلکہ تکبر لوگوں کو حقیر سمجھنے، خود کو برتر سمجھنے، اور حق کو قبول نہ کرنے کا نام ہے، کیونکہ کبر و غرور والا حق قبول کرنے سے محروم رہتا ہے"۔ فرمایا: "اَلْکِبْرُ بَطَرُ الْحَق"۔ یعنی حق سے بیزاری اور انحراف کا نام کبر ہے۔ [مشکوۃ]

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ مَّاذَآ اَنْزَلَ رَبُّكُمْ ۙ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ دراصل یہی غرور اور اس کی علامت ہے۔ ایک طرف سے توحید و رسالت اور قیامت کا انکار، اور پھر قرآن حکیم کی صداقت کا انکار۔ وہ قرآن کی جب مختصر سورت کی مثل لانے سے عاجز ہو گئے، تو انہیں تسلیم کرنا چاہیے تھا کہ یہ کسی بشر کا کلام نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، مگر یہ سب کچھ جانتے ہوئے کہتے ہیں کہ گزشتہ قوموں کی لکھی ہوئی باتیں ہیں۔

صاحب معالم التنزیل فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی، انہوں نے مکہ مکرمہ کی گھاٹیوں کو تقسیم کیا تھا، جیسے پہلے بیان ہوا۔ مختلف گھاٹیوں پر مختلف لوگ بیٹھ گئے تھے، جو لوگ حج کے لئے آتے تھے، انہیں بہکاتے، دھوکہ دیتے، اور جھوٹ بولتے، انہیں اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے ڈراتے، بدظن

کرتے تھے، تاکہ وہ اسلام قبول نہ کریں۔ باہر سے آنے والے حجاج ان سے دریافت کرتے تھے کہ تمہارے ربّ کی طرف سے کیا نازل ہوا؟ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کن چیزوں کی وحی کا تذکرہ فرمایا؟ اس پر یہ لوگ کہہ دیتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کچھ نہیں ہوا، یہ جو کچھ سنایا جارہا ہے یہ پہلے لوگوں کے لکھے ہوئے قصے کہانیاں ہیں۔ اس سے وہ خود مجرم ٹھہرے کہ انہوں نے تکذیب کی اور ایمان نہ لانے کا بوجھ اپنے اوپر اٹھالیا، اور جن بے علم و ناواقف لوگوں کو جھوٹ بول کر ایمان لانے سے محروم کیا، اور انہیں ان کے کفر پر جمے رہنے کا گناہ بھی اپنے سروں پر اٹھالیا۔ اب یہ دُہرے مجرم ہوئے، اپنے کفر کا جرم، اور دوسروں کے کفر کا بھی جرم، دونوں کو اپنے سروں پر اٹھالئے۔ اسی کو فرمایا:

﴿لِيَحْمِلُوٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً﴾ قیامت کے دن اپنے کفر و شرک اور گناہوں کے پورے پورے بوجھ اپنے اوپر اٹھا کر لائیں گے، اور ان لوگوں کے بھی بوجھ اٹھائے ہوئے ہوں گے جنہیں گمراہ کیا تھا۔

﴿اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ﴾ خبردار! یہ بُرا بوجھ ہے جسے اپنے اوپر لادرہے ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں فرمایا: ﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ﴾ [العنکبوت: ۱۳] (اور یہ لوگ ضرور بضرور اپنے بوجھوں کو اٹھائیں گے، اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور بوجھ بھی اٹھائیں گے)۔ اور قیامت کے دن ان سے ان باتوں کے بارے میں باز پرس ہوگی، جو جھوٹ موٹ بنایا کرتے تھے۔

...... ✿ ...... ✿ ...... ✿ ......

قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَ اَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَآقُّوْنَ فِيْهِمْ ؕ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْٓءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۷﴾ الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ۪ فَاَلْقَوُا السَّلَمَ مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْٓءٍ ؕ بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ان سے پہلے تھے انہوں نے مکر کیا، سو اللہ تعالیٰ نے ان کا بنایا ہوا گھر بنیادوں سے ڈھادیا، پھر اوپر سے ان پر چھت آپڑی، اور ان پر اس طرح عذاب آگیا کہ انہیں خیال بھی نہ تھا ﴿۲۶﴾ پھر وہ انہیں قیامت کے دن رسوا کرے گا، اور فرمان ہوگا کہ کہاں ہیں میرے شرکاء؟ جن کے بارے میں تم جھگڑا کرتے تھے،

جن کو علم دیا گیا وہ کہیں گے کہ بلا شبہ آج رسوائی اور بد حالی ہے کافروں پر﴿۲۷﴾ جن کی جانیں فرشتوں نے اس حال میں قبض کی تھیں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، وہ لوگ صلح کا پیغام ڈالیں گے کہ ہم کوئی بُرا کام نہ کرتے تھے، ہاں! بلاشبہ اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے جو تم کیا کرتے تھے﴿۲۸﴾ سو جہنم کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہو گے، سو تکبر کرنے والوں کا بُرا ٹھکانہ ہے﴿۲۹﴾

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کی تفسیر بعض علماء نے یہ کی ہے کہ یہ ایک تمثیل ہے، جو پچھلی قوموں سے متعلق ہے۔ گزشتہ لوگ اپنے پیغمبروں علیہم السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں کرتے رہتے تھے، اور انہیں ہر قسم کے مصائب میں پھنسانے کی تدبیریں کیا کرتے تھے، پھر ہر موقع پر اللہ تعالیٰ نے کافروں کا کیا کرایا سب ناکام اور برباد کیا۔ جیسے کوئی شخص عمارت بنائے اور پھر اس کی بنیادیں اور ستون گر پڑیں، اور اوپر سے چھت بھی گر جائے، اور رہنے والے لوگ دب کر مر جائیں، یا زخمی ہو جائیں، تو مکان بھی گیا، تعمیر بھی گئی اور مالک بھی گیا۔ یہ عذاب شاید ان کی غلط کارکردگی کا نتیجہ ہو، جو ان کے خیال میں بھی نہ تھا۔

اسی طرح معاندین کفار کی سازشوں اور مکاریوں کا جو انہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کے خلاف منصوبہ بندی کی تھی، ناکام ہوئے اور وہ منصوبے بھی منہدم ہو گئے، اور خود بھی عذابِ الٰہی کی زد میں آ کر بالکل تباہ و برباد ہو گئے۔ بقولِ قرآن کریم: ﴿وَلَا يَحِيقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ إِلَّا بِأَهْلِهِ﴾ [فاطر: ۴۳] (بری چالیں کسی اور کو نہیں خود اپنے چلنے والوں ہی کو گھیرے میں لے لیتی ہیں)۔ تھوڑی تفصیل سورۂ ابراہیم کے آخر میں گزر گئی ہے۔ یہ ایک تفسیر ہے کہ جس کا خلاصہ بطورِ تمثیل بیان ہوا۔

جبکہ دوسری تفسیر خصوصی ہے، جو یہ ہے:

صاحب روح المعانی، صاحب مظہری، حافظ ابن کثیر، اور علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہم نے معالم التنزیل میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ: ﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ﴾ سے نمرود بن کنعان مراد ہے۔ جس نے شہر بابل میں ایک محل بنایا تھا، جس کی اونچائی پانچ ہزار ہاتھ، اور چوڑائی تین ہزار ہاتھ تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آسمان پر چڑھے اور وہیں کے حالات معلوم کر کے آسمان والوں سے قتال کرے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک ہوا، باد

صرصر بھیج دی، جس نے اس محل کو گرا دیا، اور اس کی چھت نمرود والوں پر گر پڑی، جس سے وہ ہلاک ہو گئے۔

صاحب روح المعانی نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ خود نمرود اس حادثہ میں ہلاک نہیں ہوا، بلکہ اس کی ہلاکت ایک مچھر کے ذریعہ سے ہوئی۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ مچھر چار سو سال تک اس کے دماغ میں رہا، اور اسے ستاتا رہا، جس سے وہ بہت بُرے حال میں رہا۔ اور حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے بخت نصر مراد ہے۔ اس نے بھی مکاری کی تھی، اور اونچا محل تعمیر کرایا تھا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے شداد مراد ہو۔

یہ سب غالباً اسرائیلی روایات ہیں، جنہیں ائمہ تفسیر نے روایت کیا۔ اگر محل بنانے والی روایت درست ہو تو یہ ایسا ہی ہے جیسے فرعون مصر نے اپنے وزیر ہامان سے کہا تھا: ﴿يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا﴾ [غافر:٣٦-٣٧] (اے ہامان! بنا دے میرے لئے ایک بُرج، شاید میں آسمان پر جانے کی راہوں تک پہنچ جاؤں، پھر موسیٰ (علیہ السلام) کے معبود کو دیکھوں، اور میں تو اسے جھوٹا ہی سمجھتا ہوں)۔ چنانچہ اس پر عمل ہوا۔ تیاری کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہوا سے اس کو گرا دیا۔ قارون بھی اپنے گھروں، خزانوں سمیت مسخ ہو کر زندہ زمین میں دھنسایا گیا۔ عاد و ثمود بھی برباد ہوئے، سب مٹ گئے، مگر:

﴿قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اہل مکہ سے جو لوگ پہلے گزرے ہیں، انہوں نے توحید اور حق کے خلاف چالبازی کی، مگر:

﴿فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِّنَ الْقَوَاعِدِ﴾ اللہ تعالیٰ نے ان کی چالبازی کی عمارتوں کو (منصوبوں کی) بنیاد سے اکھاڑ دیا۔ ﴿قَوَاعِد﴾ بنیاد کے معنی میں ہیں۔

﴿فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ﴾ اوپر سے ان کی چھتیں ان پر گر پڑیں۔ ظاہر ہے کہ جب بنیادیں، ستون اور دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں تو چھت کیونکر باقی رہ سکتی ہے؟

﴿وَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ﴾ چالبازی کی وجہ سے ان پر ایسی جگہ سے عذاب آیا جو ان کے وہم و گمان میں نہ تھا۔ ہم کہتے ہیں کہ قیامت تک ان شاء اللہ یہی سلسلہ رہے گا۔ جو لوگ اور جو بھی باطل فرقے اہل اسلام کے خلاف منصوبہ بندی کریں گے، ان کے منصوبے بھی فیل ہو جائیں گے، اور وہ نادانستہ طور پر عذابِ الٰہی کی گرفت میں آ جائیں گے، خواہ وہ کوئی بھی ہوں۔

﴿ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُخْزِيْهِمْ﴾ پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل و رسوا کرے گا۔

﴿وَيَقُوْلُ اَيْنَ شُرَكَاءِىَ الَّذِيْنَ كُنْتُمْ تُشَاۗقُّوْنَ فِيْهِمْ﴾ بتاؤ، آج میرے وہ مصنوعی شریک کہاں ہیں، جن کے بارے میں تم دنیا میں جھگڑا کیا کرتے تھے؟ اہل حق کے ساتھ لڑتے جھگڑتے تھے، آج انہیں پکارو، بلاؤ، تمہاری مدد کریں۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ﴾ اس وقت اہل علم کہیں گے۔ یہ اہل علم وہ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے شرف علم سے نوازا، انہوں نے توحیدِ الٰہی کو سینے سے لگا کر کفر وشرک اور تمام معاصی سے کنارہ کشی کی۔ وہ کہیں گے:

﴿اِنَّ الْخِزْيَ الْيَوْمَ وَالسُّوْۗءَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ بیشک آج کے دن کی رسوائی اور برائی، نیز بُرا انجام کفر کرنے والوں کا ہے۔ اہل علم کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں کفار نے ان کے ساتھ جھگڑا کیا، اور ان کی باتوں کی تکذیب کی۔

﴿الَّذِيْنَ تَتَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰۗىِٕكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ﴾ وہ کفار ایسے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں نے ان کو اس حالت میں موت دی کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے تھے، مشرک تھے، نافرمان تھے۔ سب سے بڑا ظلم شرک ہی ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ۱۳] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔ ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۵۴] (اور کافر لوگ ظالم ہیں)۔ قیامت کے روز کفار اپنے آپ کو کفر سے بری الذمہ قرار دینے کی ناکام کوشش کریں گے:

﴿فَاَلْقَوُا السَّلَمَ﴾ اپنی سلامتی واطاعت کا اظہار کرتے ہوئے کہیں گے:

﴿مَا كُنَّا نَعْمَلُ مِنْ سُوْۗءٍ﴾ ہم تو دنیا میں بُرائی کا ارتکاب نہیں کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ کا ارشاد ہوگا: جھوٹ بولتے ہو:

﴿بَلٰٓى اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ تم دنیا میں کیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ایک ایک ارادہ اور ہر عمل وہر ذرہ سے باخبر ہے۔ لہٰذا:

﴿فَادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ﴾ جہنم کے دروازوں میں اندر داخل ہو جاؤ، اب تمہاری نجات کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ تمہیں جہنم میں ابدی (ہمیشہ) رہنا ہوگا۔ جہنم کے ساتوں دروازے تمہارے استقبال کر کے تمہاری میزبانی کریں گے۔ ﴿فَلَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ﴾ تکبر کرنے والوں کا بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

وَقِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ؕ قَالُوۡا خَيۡرًا ؕ لِلَّذِيۡنَ اَحۡسَنُوۡا فِىۡ هٰذِهِ الدُّنۡيَا حَسَنَةٌ ؕ
وَلَدَارُ الۡاٰخِرَةِ خَيۡرٌ ؕ وَلَنِعۡمَ دَارُ الۡمُتَّقِيۡنَ ۞ جَنّٰتُ عَدۡنٍ يَّدۡخُلُوۡنَهَا تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ
لَهُمۡ فِيۡهَا مَا يَشَآءُوۡنَ ؕ كَذٰلِكَ يَجۡزِى اللّٰهُ الۡمُتَّقِيۡنَ ۞ الَّذِيۡنَ تَتَوَفّٰٮهُمُ الۡمَلٰۤـئِكَةُ طَيِّبِيۡنَ ۙ
يَقُوۡلُوۡنَ سَلٰمٌ عَلَيۡكُمُ ۙ ادۡخُلُوا الۡجَـنَّةَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ ۞

ترجمہ: اور جولوگ کفروشرک سے بچتے ہیں، ان سے کہا گیا کہ تمہارے ربّ نے کیا نازل کیا؟ انہوں نے کہا کہ بڑی خیر نازل فرمائی، جن لوگوں نے اس دنیا میں اچھے کام کئے، ان کے لئے بھلائی ہے اور بلاشبہ دارِ آخرت بہتر ہے، اور البتہ متقیوں کا گھر اچھا ہے ۳۰ ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں، ان میں وہ داخل ہوں گے، ان باغوں کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان کے لئے اس میں وہ سب کچھ ہوگا جو وہ چاہیں گے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو بدلہ دیتا ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ۳۱ جن کی روحیں فرشتے اس حال میں قبض کرتے ہیں کہ وہ پاک ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم پر سلام ہو، تم اپنے اعمال کے سبب جنت میں داخل ہو جاؤ ۳۲

معارف ومنازل

کفار ومشرکین کے احوال وسلوک کے بالمقابل مؤمنین مخلصین کے احوال کا بیان ہو رہا ہے۔ چند آیات پہلے فرمایا تھا: ﴿وَاِذَا قِيۡلَ لَهُمۡ مَّاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ قَالُوۡۤا اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ﴾ اور یہاں فرمایا:

﴿وَقِيۡلَ لِلَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ ؕ قَالُوۡا خَيۡرًا﴾ مفسرین کرام نے فرمایا: جیسا کہ دونوں آیتوں کا مضمون ایک ہے، اسی طرح ان کا شانِ نزول بھی ایک ہے، جس کا کچھ تذکرہ آیت کریمہ: ﴿كَمَاۤ اَنۡزَلۡنَا عَلَى الۡمُقۡتَسِمِيۡنَ﴾ [الحجر: ۹۰] (جیسا کہ ہم نے نازل کیا تقسیم کرنے والوں پر) کے ذیل میں بیان ہوا ہے، اور وہ یہ کہ مکہ مکرمہ کے مشرکین نے راستوں میں اپنے آدمی بٹھائے تھے، باہر سے آنے والے حجاج جب ان سے قرآن اور اس کے نزول کا پوچھتے تھے تو وہ ﴿اَسَاطِيۡرُ الۡاَوَّلِيۡنَ﴾ کہہ کر ان کو بدظن کرتے تھے، لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ باہر کے لوگ اصل حقیقت جاننے کے لئے مکہ مکرمہ کے اندر آ کر مسلمانوں کو تلاش کر کے ان سے پوچھتے تھے:

﴿مَاذَاۤ اَنۡزَلَ رَبُّكُمۡ﴾ تو وہ ﴿قَالُوۡا خَيۡرًا﴾ کہہ کر جواب دیتے تھے۔ جس کا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ باہر سے

آنے والے خود بھی اسلام قبول کرتے، اور اپنے وطن واپس لوٹ کر لوگوں کو صحیح صورت حال بتادیتے، جس سے وہ لوگ بھی آمادہ ہوتے، اور اسلام قبول کرتے۔ آیت کریمہ میں انہی مسلمانوں کا تذکرہ اوران کی تعریف ہے، اوراس کے ساتھ مسلمانوں اور کافروں کے جوابات کی حقیقت کا بیان بھی ہے کہ مسلمانوں کا جواب مبنی برحقیقت اور سچا ہے، اور کافروں کا جھوٹا ہے۔

﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ﴾ گزشتہ آیات میں کفار کے اعمال بد، اوران کے کفروشرک کی مذمت اوران کے بُرے انجام، اورابدی دوزخی ہونے کا بیان تھا۔ اب ان آیات میں اہل ایمان کے اچھے اقوال، اور اچھے اعمال کا تذکرہ ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ان کی سعادت ابدی اور فوز وفلاح کا بیان ہے، اور انہیں بشارت دی جارہی ہے کہ وہ ایسے باغوں میں داخل ہوں گے، جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور وہاں وہ جو بھی خواہش کریں گے وہ سب پوری ہوں گی۔ جنتی نعمتوں کا نہ کوئی شمار ہے، نہ کمی، اور نہ رکاوٹ وغیرہ۔ فرمایا: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ﴾ [حم سجدة:۱۷] (کوئی نہیں جانتا جو کچھ ان کے لیے چھپایا گیا ہے، یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک)۔ اسی طرح: ﴿وَفِيْهَا مَا تَشْتَهِيْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْاَعْيُنُ﴾ [الزخرف: ۷۱] (ان کے نفسوں کی جو جو خواہش وچاہت ہوگی وہ سب پوری ہوگی، جن نعمتوں کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی اور خوش ہوں گی۔)

فرمایا کہ یہ انعامات متقی لوگوں کے لئے ہیں، جنہوں نے کفروشرک اور دیگر معاصی وبدعات، اور ہرقسم کی نافرمانیوں سے اجتناب کیا، اور حسنات واعمالِ صالحہ کے ساتھ اپنے ایمان کو خوب صورت اور کامل کردیا۔ یہی تقویٰ کی اصل تعریف ہے، اور ایسے لوگوں کے لئے ہر موقع پر بشارت کا پیغام ہے۔ جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو پاکیزگی وطہارت کے ساتھ اورنہایت اکرام واحترام، اور سہولتوں اور بشارتوں کے ساتھ انہیں سلام کرتے ہیں، اور سلامتی کی خوشخبری سناتے ہیں، اورانہیں دخول جنت کا مژدہ سناتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنْهُمْ۔ آمین۔

بچہ ناز رفتہ باشد زجہان نیازمندے ☆ کہ بوقت جان سپردن بہ سرش رسیدہ باشی

حدیث شریف میں فرمایا کہ صالحین کی جان کنی پر خصوصی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ اَمْرُ رَبِّكَ ۭ كَذٰلِكَ فَعَلَ

الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۳۳

فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۴

ترجمہ: یہ لوگ اس بات کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آجائیں، یا آپ کے ربّ کا حکم آجائے، اسی طرح ان لوگوں نے کیا جو ان سے پہلے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ اپنی جانوں پر خود ظلم کرتے تھے ۝۳۳ سو انہوں نے جو بُرے کام کئے ان کی سزائیں انہیں مل گئیں، اور جس چیز کا وہ مذاق بناتے تھے، اس نے انہیں آکر گھیر لیا ۝۳۴

معارف ومنازل

جنت کی خوبیاں اور ان کا تفوق اور امتیاز بیان فرمانے کے بعد ان غافلوں کو تنبیہ کی جاتی ہے جو محض دنیاوی سامانوں پر مست ہو کر آخرت کو بھلائے بیٹھے ہیں، اور اپنا انجام سدھارنے کی کوئی فکر نہیں کرتے۔ تو فرمایا کہ کیا یہ لوگ اس کے منتظر ہیں کہ جس وقت فرشتے جان نکالنے کو آجائیں گے، یا خدا کے حکم کے موافق قیامت قائم ہو جائے گی، یا مجرموں کو سزا دہی کا حکم پہنچ جائے گا اور جوتا سر پر پڑنے لگے گا تب ایمان لا کر اپنی حالت درست کریں گے؟ حالانکہ اس وقت کا ایمان یا توبہ وانابت فائدہ مند نہ ہوگا۔

ضرورت تو اس کی ہے کہ موت سے پہلے بعد الموت کے لئے تیاری کی جائے، اور عذاب آنے سے پیشتر بچاؤ کی تدبیر کرلیں۔ ان سے اگلے معاندین بھی غفلت میں پڑے رہے تھے، باطل پرستی کے نشہ میں حق سے منحرف رہے، انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کی، اور استہزاء کیا، نہ توبہ کی اہمیت جانی، نہ فکر آخرت پر متوجہ ہوئے۔ غفلت و ضلالت پر نازاں رہے، پیغمبروں علیہم السلام کو جی بھر کر ستایا، آخر میں جو کیا تھا سامنے آیا اور عذاب الٰہی وغیرہ کی جن خبروں سے ٹھٹھا کیا کرتے تھے وہ آنکھوں سے دیکھ لیں۔ ان کا استہزاء وتمسخر انہی پر الٹ پڑا، بھاگ کر جان بچانے کی کوئی سبیل نہ رہی، اپنی شرارتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑا، جو بویا تھا سو کاٹا۔ خدا کو ان سے کوئی بیر نہ تھا، نہ اس کے یہاں ظلم وتعدی کا امکان ہے، ان لوگوں نے اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی ماری، کسی کا کیا بگڑا، انہی کا نقصان ہوا۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا

مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۵﴾

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ وَ

مِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ ؕ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۶﴾

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۳۷﴾

ترجمہ: جن لوگوں نے شرک کیا، انہوں نے کہا کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم اس کے سوا کسی چیز کی عبادت نہ کرتے، نہ ہم نہ ہمارے باپ دادے، اور نہ ہم اس کے بغیر کسی چیز کو حرام قرار دیتے، ان لوگوں نے ایسا ہی کیا جو ان سے پہلے تھے، سو رسولوں کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے ﴿۳۵﴾ اور بلاشبہ ہم نے ہر اُمت میں ایک رسول بھیجا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور شیطان سے بچتے رہو، سو ان میں سے بعض کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی، اور ان میں سے بعض ایسے تھے جن پر گمراہی ثابت ہوگئی، سو تم زمین میں چلو پھرو، پھر دیکھو جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا؟ ﴿۳۶﴾ اگر آپ ان کی ہدایت پر حرص کریں سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ اسے ہدایت نہیں دیتا جسے گمراہ کرتا ہے، اور ان کے لئے کوئی مددگار نہ ہوگا ﴿۳۷﴾

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا مطلب سمجھنے اور بیان کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی مشیت اور رضاء الٰہی کا فرق معلوم ہو۔ مشیت کے معنی ہیں قصد اور ارادہ، یہ عام ہے، اور رضاء کے معنی ہیں پسند اور پسندیدہ۔ تو ہر رضاء میں مشیت موجود ہے، اور ہر مشیت میں رضاء کا ہونا لازمی نہیں۔ مثلاً توحید کا اقرار، اقامۃ صلوٰۃ، اور اداء زکوٰۃ تینوں میں مشیت الٰہی اور رضاء الٰہی دونوں موجود ہیں، پھر کفر وشرک اور جمیع معاصی میں مشیت الٰہی موجود ہے، مگر رضائے الٰہی موجود نہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ کفر وشرک کی ضد توحید ہے، ایک آدمی میں ان دونوں کا اجتماع محال ہے، پس کوئی موحد مشرک نہیں ہوسکتا، اور کوئی مشرک موحد نہیں کہلاتا، لہٰذا اگر کوئی موحد مسلمان سے شرک کا صدور ہوا تو وہ موحد نہیں رہ سکتا۔ مشرک شمار ہوگا۔

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی گناہ شرک وکفر یا اور کوئی گناہ کسی سے صادر ہوا، اور اس پر فوری مؤاخذہ نہ ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ اُسے ایک عرصہ تک ڈھیل میں رکھتا ہو، اور اسی میں اُسے با اختیار چھوڑ اگیا ہو تو یہ مفروضہ قائم کرنا کہ جب

اس پر مؤاخذہ نہیں تو یہ بدعملی شاید اللہ تعالیٰ کو ناپسند نہ ہو، کیونکہ مؤاخذہ نہ ہونے سے اس کام کا جواز پیدا ہوا، یہ قطعاً غلط اور احمقانہ سوچ ہے۔ تمام عالمِ کفر اسی غلط فہمی میں مبتلا ہے، اور آیت بالا مکمل اسی کی تردید میں ہے۔ فرمایا:

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا﴾ اس آیت کریمہ میں اس بات کا بیان ہے جس کو وہ اپنے شرک کے جواز میں پیش کرتے تھے، گویا کہ اپنے شرکیہ افعال کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کر کے خود کو بری الذمہ قرار دے رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کو ہمارے شرکیہ افعال پسند نہ ہوتے تو وہ فوراً ہمیں روک دیتا، ہماری زبانوں کو بند کر دیتا، ہمارے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب کر لیتا تاکہ ہم ایسا کام نہ کر سکیں۔

اگر اس نے ہمیں ایسے کاموں سے دیکھنے کے باوجود نہیں روکا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہمارے شرکیہ اعمال سے راضی ہے، لہٰذا ہمارا طریقہ درست، اور ہم لوگ حق بجانب ہیں۔ یہ ہے مشرکین کی بے ڈھنگ، اور بے دست و پا دلیل۔ اس کا جواب مقدمات میں ہو چکا، غور کرنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے، اور اس کے بطلان پر یہ دلیل بھی ہے کہ آئندہ جو بھی کوئی غلط کام، اور ہزاروں بدمعاشیاں کر کے کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے یہ سب کچھ ہوا، میرا کوئی قصور نہیں، تقدیر میں لکھا ہوا ہی تو تھا، تو میں اسے کیسے ٹال سکتا تھا۔ حلّت و حرمت، سائبہ، وصیلہ، بحیرہ حام، وغیرہ شرکیہ محرمات سب اسی میں آگئے۔ وہ یہی کہتے رہتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے، وہ مشیت پر ڈال کر اپنی بے گناہی کو ثابت کرنا چاہتے تھے۔

سورۂ انعام کی آیت: ﴿سَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكْنَا وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ﴾ [الأنعام: ۱۴۸] (جن لوگوں نے شرک اپنایا ہوا ہے وہ یہ کہیں گے کہ: اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے، نہ ہمارے باپ دادا، اور نہ ہم کسی بھی چیز کو حرام قرار دیتے) کے ذیل میں ان بیہودہ خیالات کا تفصیلاً جواب آ گیا ہے، وہاں دیکھا جائے۔

﴿كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ ان سے پہلے لوگوں نے ایسا ہی کیا تھا۔ یہ ہر زمانہ میں ہوتا رہا ہے، اور آئندہ بھی ملحد و زندیق لوگ ہمیشہ ایسا ہی کہا کریں گے، اور ابلیس انہیں ایسی پٹی پڑھائے گا بھی۔ ہم کہہ چکے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا، پھر اگر مشیت کو تمام معاصی و جرائم کے ساتھ منسلک کیا جائے جیسا کہ انہوں نے اپنے شرک کو منسلک کیا تھا، پھر تو دنیا میں کسی قسم کے جرائم نہیں رہیں گے، سب مشیت کے طفیل جائز بنیں گے، جو کہ باطل اور سراسر غلط ہے۔

پھر بقول تمہارے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے شرک سے راضی ہے، تو اس کو مٹانے کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام کو کیوں مبعوث فرمایا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنی پسندیدہ چیز کو ہرگز مٹانے کا حکم نہیں دیتا، البتہ! رسولوں علیہم السلام کی ذمہ داری تبلیغ ہے۔

﴿فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ رسولوں علیہم السلام کا کام کھول کر بیان کرنا ہے، زبردستی منوانا نہیں۔ جہاں کفار نے اپنے کفر وشرک کو مشیت کا لباس پہنا کر، اُسے خدا کا پسندیدہ بنا دیا، پس انہیں چاہئے کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کو بھی مشیت کا حصہ قرار دیں، اور ان کی اطاعت وفرمانبرداری کریں، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، معلوم ہوا کہ وہ سراسر غلطی پر ہیں۔

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا﴾ ہم نے ہر قوم اور ہر اُمت میں رسول بھیجا، تاکہ اپنی اُمت کو ہمارا پیغام پہنچادیں، وہ پیغام یہ ہے کہ:

﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو، اور شیاطین سے بچو۔ طاغوت طغیان سے مشتق ہے۔ كُلّ مَاأَضلَ عَنِ الْحَقّ فَهو طَاغُوت۔ یعنی ہر وہ چیز جو حق کے راستے سے دور کردے وہ طاغوت ہے۔ [ابن ہشام] طاغوت کا یہ معنی عام ہے، جس میں ہر قسم کے دشمنان دین، یا وہ اعمال جو حقیقی حکم شرعی سے ہٹانے کا ذریعہ ہوں سب شامل ہوں۔

﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ هَدَى اللّٰهُ﴾ اُمتی لوگوں میں کچھ وہ ہیں جنہیں رب تعالیٰ شانہ نے ہدایت نصیب کی، اور:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ حَقَّتْ عَلَيْهِ الضَّلٰلَةُ﴾ اور ان سے بعض وہ ہیں جن پر گمراہی ثابت ہوگئی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے قلوب پر ضلالت کی مہر لگ چکی تھی۔

﴿فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ پس سیاحت کرو، اور زمین میں چل پھر کر ہر طرف دیکھو، گزشتہ گمراہ اقوام اور ہلاک شدگان کی بستیوں کو دیکھیں، اور عبرت سیکھیں، ان کی بستیوں کے کھنڈرات تمہارے لئے درس عبرت سے کم نہیں۔

﴿فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ﴾ دیکھو، جھٹلانے والوں کا کیسا انجام ہوا؟ عاد وثمود کا کیا ہوا؟ فرعون، ہامان، شداد، نمرود، بخت نصر وغیرہ کا کیا ہوا؟ سب جہنم کے ایندھن بن گئے، اور نشان عبرت بنے۔

﴿اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ﴾ اگر آپ لوگوں کے ایمان پر حرص کریں تو

یہ آپ کی حرص بجا اور برحق ہے، مگر ان کی ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، تو اللہ تعالیٰ جسے گمراہ فرماتا ہے اسے ہدایت نہیں دیتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک میں اس بات کا تقاضا رہتا تھا کہ سارے لوگ ہدایت سے ہمکنار ہوں، مگر اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے، وہ کہاں چاہتا ہے کہ کفر ہمیشہ کے لئے دنیا سے ختم ہو؟

ع دوزخ کرا بسوز دگر بولہب نباشد

فرمایا: آپ اپنا مشن جاری رکھیں، جن میں طلب ہو وہ ہدایت پائیں گے، اور جن میں طلب نہ ہو، اور وہ الٹا اپنے کفر وشرک کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے گلے میں ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دیتے ہوں گے، ان کا انجام ہمارے ہاتھ میں ہے، جب انہیں ہمارا عذاب چاروں طرف سے گھیرے میں لے لے گا، تو:

﴿وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ﴾ کا ضابطہ ان کے سامنے آجائے گا، اور فرشتہ عذاب انہیں یہ پیغام دے گا: ﴿ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ إِنَّ هَٰذَا مَا كُنتُم بِهِ تَمْتَرُونَ﴾ [الدخان: ۵۰] یعنی چکھو یہ عذاب، تم دنیا میں بڑے بیرسٹر اور مغرور سمجھے جاتے تھے، لوگوں کی قسمت کے فیصلے تمہارے ہاتھ میں ہوتے تھے، اور کبھی تم یہ بھی کہا کرتے تھے کہ اسلام ایک فرسودہ نظام ہے، وغیرہ، آؤ بلاؤ اپنے تمام ہمنواؤں کو، مشیروں کو، ہاں میں ہاں ملانے والوں کو، کاش تم پیغمبر اور اس کے کفش برداروں کی آواز پر لبیک کہتے، تو آج بچ جاتے۔

....

وَأَقْسَمُوا بِاللَّهِ جَهْدَ أَيْمَانِهِمْ ۙ لَا يَبْعَثُ اللَّهُ مَن يَمُوتُ ۚ بَلَىٰ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا وَلَٰكِنَّ
أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٨﴾ لِيُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي يَخْتَلِفُونَ فِيهِ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ كَفَرُوا
أَنَّهُمْ كَانُوا كَاذِبِينَ ﴿٣٩﴾ إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَن نَّقُولَ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٤٠﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں نے خوب زوردار طریقے پر اللہ تعالیٰ شانہ کی قسم کھائی کہ جو شخص مرجاتا ہے اللہ تعالیٰ اُسے نہ اٹھائے گا۔ ناں! اللہ تعالیٰ اُسے ضرور اٹھائے گا، یہ پکا وعدہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿۳۸﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے لئے ان باتوں کو بیان فرمادے جن کے بارے میں یہ لوگ اختلاف کرتے ہیں، اور تاکہ کافر لوگ جان لیں کہ وہ جھوٹے تھے ﴿۳۹﴾ ہم جس کسی چیز کو پیدا کرنا چاہیں اس کے بارے میں ہمارا یہ کہہ دینا ہوتا ہے کہ ہوجا، لہٰذا وہ وجود میں آجاتی ہے ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

ماقبل کے مضمون کا تتمہ بیان ہو رہا ہے۔ منکرین قیامت طرح طرح کے شکوک وشبہات میں گرے ہوئے ہوتے تھے، شیطان نے روزِ ازل ان کے گمراہ کرنے پر جو قسم کھائی تھی تو کیا وہ اپنی رعیت کی سرپرستی اور خیالداری سے غافل رہے گا؟ اور انہیں پٹیاں نہیں پڑھائے گا؟ تو ان آیات میں منکرینِ بعث کا ذکر ہے۔ مشرکین اور دوسرے کفار قیامت، بعث وحشر کا انکار کرتے تھے، اور انکار بھی سطحی اور سادہ انداز میں نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی زوردار قسم کھا کر یوں کہتے تھے کہ جو لوگ مرجاتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں دوبارہ زندہ نہیں فرمائے گا۔ قرآن حکیم نے ان کے جواب میں فرمایا: ﴿بَلٰى﴾ کیوں نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارا انکار کرنا اور قسم کھانا یہ سب جھوٹ اور بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا ہے، اور پکا وعدہ فرمایا ہے کہ میں سارے مرنے والے مردوں کو ضرور زندہ کر کے دوبارہ اٹھاؤں گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا پکا وعدہ ہے، اس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا، لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ نہ جاننا اور نہ ماننا اس بات کی دلیل نہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا نہ ہو۔ نہ کسی کو قیامت میں، نہ حشر ونشر، حساب وکتاب میں، نہ دوبارہ زندہ ہونے میں شک وانکار کی گنجائش ہے، یہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام نے بتایا وہی ہوگا۔ ﴿وَمَا تَشَاۗءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ﴾۔ [الإنسان: ۳۰] (اور تم چاہو گے نہیں جب تک اللہ نہ چاہے)۔

قیامت قائم ہونے پر سارے منکرین کو اپنے جھوٹے ہونے کا یقین ہو جائے گا۔ سورۂ تغابن میں فرمایا: ﴿زَعَمَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ لَّنْ يُّبْعَثُوْا﴾ [التغابن: ۷] (جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کا گمان یہ ہے کہ ان کو نہیں اٹھایا جائے گا)۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قُلْ بَلٰى وَرَبِّيْ لَتُبْعَثُنَّ ثُمَّ لَتُنَبَّؤُنَّ بِمَا عَمِلْتُمْ﴾ [التغابن: ۷] (آپ کہہ دیں: کیوں نہیں، ضرور بضرور تمہیں اٹھایا جائے گا، پھر تمہیں آگاہ کیا جائے گا ان کا اعمال سے جو تم کیا کرتے تھے)۔

قیامت برپا کر کے ثابت کر دے گا کہ کافر جھوٹے تھے، جو قیامت کا انکار کرتے تھے۔ کفر اختیار کر کے جو یہ کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اگر ہم سے ناراض ہے تو ہمیں جبراً روک کیوں نہیں دیتا، اور یہ کہتے تھے کہ قیامت قائم نہ ہوگی، اور رسولوں علیہم السلام کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں ہیں، ان سب باتوں میں ان کا جھوٹا ہونا

ظاہر ہو جائے گا۔

﴿اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ کہ جب ہم کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ کریں تو ہمارا یہ فرمان کافی ہے کہ ہو جا، پس وہ چیز وجود میں آجاتی ہے، اور یہ لوگ اچھی طرح جانتے ہیں، بلکہ مانتے بھی ہیں اور اقرار بھی کرتے ہیں کہ سب چیزوں کو پیدا کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن یہ بات کیوں نہیں مانتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہے، جو ہر چیز پر قادر ہے۔ سورۂ ق میں فرمایا: ﴿اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ﴾ [ق: ۱۵] (کیا ہم پہلی بار پیدا کر کے تھک گئے؟)۔ اسی طرح سورۂ انعام، سورۂ روم، سورۂ یٰس اور سورۂ احقاف اور دیگر متعدد مقامات پر منکرین کے جوابات دیئے گئے ہیں، اور ان کی جہالت اور حماقت اور ہٹ دھرمی کی قلعی کھول دی گئی ہے۔

❁ ❁ ❁

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ۭ وَلَاَجْرُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۴۲﴾

ترجمہ: اور جن لوگوں نے مظلوم ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہجرت کی، ہم انہیں دنیا میں ضرور بالضرور اچھا ٹھکانہ دیں گے، اور یہ بات یقینی ہے کہ آخرت کا ثواب بدرجہا بڑا ہے، کاش یہ لوگ جان لیں ﴿۴۱﴾ وہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے صبر کیا، اور اپنے ربّ (جلّ شانہ) پر بھروسہ رکھتے ہیں ﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

ہجرت بمعنی چھوڑ دینا، وطن چھوڑ دینا، اخلاق ذمیمہ کو چھوڑ دینا، وغیرہ۔ یہاں ہجرت سے مراد ترک وطن ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی رضاء میں دین کی خاطر ترک وطن کیا جائے تو اس کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "اَلْهِجرَةُ تَهدِمُ مَا كَانَ قَبلَهَا"۔ یعنی ہجرت ان تمام گناہوں کو ختم کر دیتی ہے جو کسی نے ہجرت سے پہلے کیا ہو۔ [مشکوٰۃ]

ہجرت کا تعلق عام طور پر ملکی اور مذہبی حالت کے ساتھ ہوتا ہے، اسی بنیاد پر کبھی ہجرت فرض ہوتی ہے، کبھی واجب، اور کبھی مستحب۔ ابتداء اسلام میں ہجرت فرض تھی، جس پر مسلمانوں نے پہلی دفعہ مکہ مکرمہ سے افریقی ملک

حبشہ کو ہجرت کی، پھر عام ہجرت مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ ہجرت جاری رہی۔ سنہ ۸ھ میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو ہجرت کی فرضیت منسوخ ہوگئی، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "لَا هِجْرَةَ بَعْدَ الْفَتْحِ وَلٰكِنْ جِهَادٌ وَنِيَّةٌ"۔ [بخاري]

آیت کریمہ میں مہاجرین کے لئے دو عظیم الشان وعدوں کا ذکر ہے: اوّل یہ کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکم پر محض اس کی رضاء کے لئے ہجرت کرتے ہیں، یعنی اپنا وطن اصلی چھوڑ دیتے ہیں، اسی طرح عزیز ورشتہ دار، بیوی بچوں، مال ومنال، کاروبار، اور گھر بار سب اللہ تعالیٰ کے لئے قربان کردیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان تمام چھوڑی ہوئی چیزوں کا بہترین اور اعلیٰ بدلہ اسی دنیا میں ایک کی بجائے کئی گنا زیادہ عطاء فرماتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مہاجرین کی زندگی، اور ان ساز وسامان کی فراوانی جو انہیں ہجرت مدینہ منورہ کے بعد عطاء ہوئی، وہ ہمارے علم میں ہے۔

دوسرا وعدہ آخرت کے متعلق ہے، وہ اُخروی ثواب وبخشش جسے ربّ العزت سبحانہ نے اکبر کہہ کر اس کا وعدہ فرمایا، تو یہ چیز جسے اللہ تعالیٰ نے اکبر کہا ہو اس کی عظمت وبڑائی کا کوئی انسان اندازہ نہیں لگا سکتا، وہ اجر بے شمار ہی ہوگا۔ سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً﴾ [النساء:۱۰۰] (اور جو شخص اللہ کے راستے میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت جگہ اور بڑی گنجائش پائے گا) جس میں وسعت وفراخی عیش خاص طور پر مذکور ہیں۔ البتہ ان حقیقی مہاجروں کے لئے جو اوصاف مذکور ہیں، یہ ایک اعتبار سے بمنزلہ شرط کے ہیں، اگر مہاجر میں یہ شرائط نہ ہوں تو ثواب موعود کا استحقاق نہ ہوگا، اور یہ اوصاف وشرائط چار ہیں:

(۱) پہلی شرط ﴿فِي اللّٰهِ﴾ یہ خالص اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، کسی اور مقصد کے لئے نہ ہو۔

(۲) دوسری شرط ﴿مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا﴾ یعنی مظلوم ہونا، خواہ کسی اعتبار سے ہو۔

(۳) تیسری شرط ﴿الَّذِيْنَ صَبَرُوْا﴾ صبر کرنا، مصائب پر ثابت قدم رہنا۔

(۴) چوتھی شرط ﴿عَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا۔ جب کسی مہاجر میں یہ شرائط موجود ہوں تو اللہ تعالیٰ دنیا وآخرت دونوں میں کامیابی سے نوازیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ اکسیری نسخہ تمام مسلمانوں کے لئے ہے، جو شخص اس پر عمل کرے گا فلاح پائے گا۔

ہجرت کی بہت سی قسمیں ہیں:

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بحوالہ امام ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھا ہے کہ اپنے وطن سے نکل کر سفر کرنا دو حال سے خالی نہیں ہے: یا کسی جلب منفعت کے لئے ہو کہ کوئی دینی فائدہ ومنفعت حاصل ہو، یا کسی دفع مضرت کے لئے ہو کہ کسی مصیبت

سے نجات مقصد ہو۔ جو سفر و ہجرت کسی جلب منفعت کے لئے ہو اس کی دس قسمیں ہیں:

(١) سفر عبرت۔ یعنی دنیا کے مختلف حصوں کا سفر کرنا، اچھے اور بُرے انسانوں کو دیکھنا، تباہ شدہ اقوام کی بستیوں کو دیکھنا، عبرت حاصل کرنا۔ (٢) سفر حج و عمرہ، جو ایک بابرکت سفر بھی ہے، اور عبادت بھی۔ (٣) سفر جہاد، جو کبھی فرض عین ہے، کبھی فرض کفایہ، کبھی مستحب۔ (٤) سفر معاش، اپنے اہل و عیال کی کفالت کرنے کی خاطر سفر کرنا۔ (٥) سفر تجارت، جو کہ عام کاروباری لوگ دوسرے ملکوں کا سفر کرتے ہیں۔ (٦) طلب علم کے لئے سفر، عموماً اپنے شہروں سے باہر جانا لازمی ہوتا ہے۔ (٧) تبلیغ دین کے لئے سفر، جیسے تبلیغی جماعت والے دور دور علاقوں کا سفر کرتے ہیں۔ (٨) مسجد حرام، مسجد اقصیٰ، مسجد نبوی کی زیارت کے لئے سفر کرنا۔ (٩) اسلامی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سفر کرنا، جس کو رِباط کہتے ہیں۔ (١٠) والدین، بہن بھائی، رشتہ داروں سے ملنے کے لئے سفر کرنا۔

اور جو سفر دفعِ مضرت، یعنی کسی مصیبت سے بچنے کی خاطر سفر کرنا ہو، اس میں جان بچانے، ایمان بچانے کی تدبیر ہو، اس کی آٹھ قسمیں ہیں:

(١) دارلکفر سے دار الاسلام کی طرف جانا، یہ سفر عہد رسالت میں فرض رہا۔ ابھی بھی نامساعد حالات میں فرض ہوسکتا ہے۔ (٢) شہری زندگی کے ناموافق فسق و فجور سے بھاگ کر دیہات میں جانا۔ (٣) دار البدعۃ سے ہجرت کرنا، کسی دار السنۃ میں جانا۔ (٤) جہاں حرام و سود کا غلبہ ہو وہاں سے بھاگ کر صحیح علاقہ میں جانا۔ (٥) جہاں ظلم و زیادتیوں کا راج ہو وہاں سے سفر ہجرت اختیار کرنا۔ (٦) جہاں آب و ہوا موافق نہ ہو، ہر وقت بیماری ہو، وہاں سے ہجرت کرنا۔ (٧) اپنے مال کی حفاظت کے پیش نظر غیر محفوظ شہر سے ہجرت کرنا۔ (٨) جہاں تباہ کن قحط سالی اور گرانی ہو وہاں سے سفر کر کے ہجرت کرنا۔

ان کے علاوہ دیگر بہت سے اسباب ایسے ہیں جن کی وجہ سے لوگ نقل مکانی پر مجبور ہوتے ہیں، اور دوسرے علاقوں میں جاتے ہیں۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٣﴾

بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ ۭ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿٤٤﴾

ترجمہ: اور آپ سے پہلے ہم نے صرف مردوں کو رسول بنا کر بھیجا، جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے، سو تم اہل

علم سے پوچھ لو، اگر تم نہیں جانتے۞ ان رسولوں کو دلائل اور کتب کے ساتھ بھیجا، اور ہم نے آپ پر قرآن نازل کیا، تا کہ آپ لوگوں کے لئے بیان کریں جو آپ کی طرف اتارا گیا، اور تا کہ وہ لوگ فکر کریں۞

معارف ومنازل

گزشتہ رکوع میں گزر چکا ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا﴾۔ اب اس آیت میں رسول کی ایک خاص صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ رسول صرف مرد ہی ہوتے ہیں۔ منصب رسالت مردوں کے ساتھ مخصوص ہے، کوئی عورت خواہ وہ کتنی باعظمت کیوں نہ ہو نبی نہیں بن سکتی۔ تو فرمایا:

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا﴾ آپ سے پہلے ہم نے جن کو رسول بنا کر بھیجا وہ انسان یعنی مرد ہی تھے۔ مشرکین مکہ نے ہمیشہ یہی کہا کہ آپ ہماری طرح کے آدمی ہیں، ان کے جوابات بار بار دیئے گئے، مگر ضد وعناد کی بیماری کا علاج کوئی نہیں ہوتا۔

﴿نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ﴾ ان رسولوں مردوں کی طرف ہم نے وحی بھی کی، ان سب کی وحی کا اصلی مقصد اور بنیادی حکم یہی ہوتا تھا: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ﴾ [النحل: ۳۶] (کہ اللہ کی عبادت کرو، اور طاغوت سے بچ کر رہو)۔ یا یہ: ﴿اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ﴾ [المؤمنون: ۳۲] (کہ اللہ کی عبادت کرو، تمہارے لیے اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں)۔ سارے انبیاء کرام علیہم السلام کا مقصد التزام توحید اور اجتناب عن الشرک رہا ہے۔

﴿فَسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ مفسرین کرام نے فرمایا ہے کہ اہل الذکر سے اہل کتاب یہود ونصاریٰ کے علماء مراد ہیں۔ مشرکین مکہ ﴿رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ﴾ [قریش: ۲] (سردی اور گرمی کے سفر) کے خوگر تھے، ان کے سفروں کا رُخ گرمیوں کے موسم میں ملک شام کی طرف ہوتا تھا، وہاں نصرانیوں کی حکومت تھی، اور شام جاتے ہوئے مدینہ منورہ پر ان کا گزر رہتا تھا، یہاں یہود کے تینوں قبائل تھے۔ مشرکین مکہ علماء یہود ونصاریٰ سے واقف بھی تھے، اور ان کے درمیان تعارفی مراسم بھی تھے۔ اس لئے فرمایا کہ تم یہود ونصاریٰ والوں سے معلوم کر لو کہ سابقین انبیاء کرام علیہم السلام انسان تھے، یا فرشتہ تھے، یا اور کسی جنس سے تھے؟

ان سے پوچھو گے تو یہی بتائیں گے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے جو رسول اور نبی آئے تھے وہ سب بشر تھے، اور آدمی تھے۔ جیسے موسیٰ، عیسیٰ، ابراہیم، اسحٰق، یعقوب اور یوسف علیہم السلام۔ مشرکین اگر چہ جہلاء تھے، مگر اہل

کتاب کو وہ بھی اہل علم کہتے تھے، اس لئے فرمایا کہ اہل علم سے پوچھو۔ یہود ونصاریٰ بے دین و بے ایمان تھے، انہوں نے مکہ کے مشرکین کو مسلمانوں سے برحق اور افضل کہا تھا، جیسے سورۂ نساء میں بیان ہوا۔ یہ صرف اسلام دشمنی کے باعث انہوں نے غلط بیانی کی، مگر انبیاء کرام علیہم السلام کے بشر اور آدمی کہنے میں وہ چنداں منکر نہیں رہے، اس لئے فرمایا کہ ان سے دریافت کرو۔

﴿بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ﴾ یہ ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا﴾ کے ساتھ متعلق ہے، یعنی ہم نے آپ سے پہلے مردوں کو رسول بنا کر بھیجا، کھلی نشانیوں کے ساتھ، اور کتابوں کے ساتھ اور پھر:

﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ﴾ یہاں ذِکر سے مراد قرآن مجید ہے۔ یہ اس کے ناموں میں ایک نام ہے، بمعنی نصیحت کے، کیونکہ قرآن مجید اوّل سے آخر تک نصیحتوں کا خزانہ ہے۔

﴿لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ تا کہ آپ لوگوں کے سامنے وہ چیز بیان کر دیں جو ان کی طرف نازل کی گئی ہے، یعنی آپ کی زبان سے قرآن کی تفسیر وتشریح وابستہ ہے۔

اس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے، اور اسی پر اُمت کا اجماع ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح وہی قابل قبول ہے جس کا ثبوت سنّت سے ہو، یا اقوال صحابہ کرام سے، کیونکہ قرآن کے مجمل احکام اور اشارات ومعانی کا حل بھی اسی راستے پر موقوف ہے، جس کا راستہ قرآن کا راستہ ہو، یعنی وحی جلی قرآن کا اور وحی خفی حدیث پاک کا منبع ومرکز ایک ہی ہے۔ اگر حدیث شریف کو نظر انداز کیا جائے، جیسے کہ زندیق وملحد یہود ونصاریٰ کے گماشتے منکرین حدیث کا پروگرام ہے تو قرآن کریم حرف بے معنی رہے گا، اس پر کسی قسم کا نہ عمل ہو سکے گا اور نہ کوئی عقیدہ ثابت ہوگا۔ پس منکر حدیث منکر قرآن ہی کہلائے گا، اور منکر رسالت بھی، جس کے کفر میں کسی جاہل دیہاتی کو بھی شک نہ ہوگا، لہٰذا قرآن کلام الٰہی کی تفسیر وتشریح وہی قابل قبول ہوگی جو حدیث اور اقوال صحابہ رضی اللہ عنہم کی روشنی میں ہو، یا جسے علماء اُمت اور راسخین فی العلم نے انجام دیا ہو۔

کسی زندیق، مرتد و کافر پرویزی کی تشریح وتفسیر کی حقیقت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ ان کے ناپاک اوراق کو زمین بوس کر دیا جائے۔ مجاہد کبیر شکیب ارسلان متوفی ۱۹۴۰ء نے اپنے رسالہ "اسلام اور مستشرقین" میں لکھا ہے کہ یہود ونصاریٰ نے قرآن مجید کی تحریف اور احکام تبدیل کرنے کے لئے پانچ ارب ڈالر مختص کئے ہیں، یہ پہلی قسط ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ اس میں سالانہ اضافہ ہوتا رہے گا، اور اس کام اور اس اہم خدمت پر وہ لوگ مامور ہوں

گے جن کی شکل وصورت اسلامی ہو، اور فکرودماغ یہود ونصاریٰ والا ہو۔

ہمارے موجودہ زمانہ کے تعلیم یافتہ طبقہ، سیاسی لیڈروں، اور سماجی کارکنوں میں اس طرح کے لوگوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کچھ علماء سوء بھی اس طبقے کے سیاسی اور سپاہی وکارکن ہیں۔ اس وقت عالم اسلام اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کے زندیق اور ملاحدہ کا ٹارگٹ ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کفری منصوبوں کی مکمل نشاندہی کے لئے غیبی رجال کار مقرر کیے ہوئے ہیں، جو ان کے تمام تر منصوبوں پر پانی پھیر کر ان کو ناکام بنا رہے ہیں اور ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ [الحجر: ۹] (ہم ہی نے قرآن کو نازل کیا ہے، اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں) کا مصداق بن کر اسلام اور قرآن وحدیث کی صحیح خدمت انجام دے رہے ہیں، اور حق کی ترجمانی کر رہے ہیں، جن کا تعارف اور شناخت علماء دیوبند کے نام سے ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے قرآن حکیم کا صحیح علم اپنے رسول ﷺ کو عطاء فرمایا، جن پر قرآن کا نزول ہوا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ قرآن کا نزول نبی پر ہو، اور اس کی تفسیر چودہ سو سال بعد آنے والا فاسق وفاجر غیر مسلم جسے اسلام کے ابجد تک معلوم نہ ہوں اس کے سپرد ہو۔ تو صاحب قرآن ہی کو اللہ تعالیٰ نے تفویض کر کے فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ﴾ [القیامۃ: ۱۹] (پھر ہمارے ذمہ ہے اس کو بیان کرنا)۔ ہمارا ذمہ ہے کہ آپ کے توسط سے اس کے معانی ومطالب بیان کریں، اور اس کے اجمال کی تفصیل، اور اوامر ونواہی کی وضاحت وتمام احکام شریعت کی تفسیر و تشریح اور حلال وحرام کے مسائل کو بسط وتفصیل سے واضح کریں۔

قرآن مجید نے تو ہر عبادت کا اجمالی حکم صادر فرمایا، اس کی تشریح نبی انور ﷺ کو سپرد ہوئی۔ مثلاً نماز ہی کو لیجئے، جو کہ اسلام کا ستون ہے۔ اس کے متعلق تقریباً کئی سو مسائل ہیں، جنہیں شہید اسلام امیر المؤمنین سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔ اب دیکھیے، اور غور سے قرآن مجید کا مطالعہ کیجئے، ان کئی سو مسائل میں سے صرف سات آٹھ کو قرآن مجید نے بیان کیا، باقی سب صاحب قرآن کے بیان پر چھوڑ دیا۔

یہی وجہ ہے کہ منکرین حدیث کے مذہب میں نماز کا نام تک نہیں۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ۔ حالانکہ نماز وہ عبادت حقہ ہے جس سے کسی بھی پیغمبر کی شریعت خالی نہیں۔ ان یہود ونصاریٰ کے نمک خوروں نے نماز سے ہاتھ صاف کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور نبیوں اور ساری خلقت کی لعنت ہے۔ اور وہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، انڈونیشیا ملائشیا، عربستان، یعنی عالم اسلام کے بارہ ہزار چیدہ چیدہ علماء کرام

نے کفر کا فتویٰ جاری کیا، اور منکرین حدیث کو اسلام سے خارج قرار دیدیا۔

کسی مسلمان کو نہ کوئی تعجب ہو، نہ گھبراہٹ، اور نہ پریشانی، اس جہاں رنگ وبو میں اربوں انسان منکرین خدا، منکرین اسلام، اور منکرین رسالت ونبوت، اور منکرین قیامت موجود ہیں۔ تو کیا خدا کی خدائی میں کوئی فرق یا نقصان آسکتا ہے؟ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ قیامت کے دن حضرت آدم علیہ السلام کو خطاب ہوگا کہ اپنی ذریت میں سے جہنم کا حصہ الگ کرو۔ وہ عرض کریں گے اے میرے ربّ! جہنم کا حصہ کیا اور کتنا ہوگا؟ اللہ تعالیٰ شانہ فرمائیں گے کہ ہزار میں سے ایک جنت کے لئے، اور (۹۹۹) سب جہنم کے لئے۔ [بخاري] اچھی طرح سے اندازہ لگائیں، اور یہ حقیقت ابھی دنیا میں بھی ہمارے سامنے ہے۔ واللہ اعلم

اَفَاَمِنَ الَّذِيْنَ مَكَرُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ يَّخْسِفَ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ
الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝۴۵ اَوْ يَاْخُذَهُمْ فِيْ تَقَلُّبِهِمْ فَمَا هُمْ
بِمُعْجِزِيْنَ ۝۴۶ اَوْ يَاْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ ؕ فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝۴۷

ترجمہ: جو لوگ بُری بُری تدبیریں کرتے ہیں، کیا وہ اس بات سے بے خوف ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں دھنسادے؟ یا ان کے پاس ایسی جگہ سے عذاب آجائے جہاں سے انہیں گمان بھی نہ ہو؟ ۝۴۵ یا اللہ تعالیٰ شانہ ان کو چلتے پھرتے پکڑ لے، سو یہ لوگ عاجز کرنے والے نہیں ہیں ۝۴۶ یا ان کو کم کرتے کرتے پکڑ لے، سو بلاشبہ تمہارا ربّ بڑا مہربان ہے، بڑا رحیم ہے ۝۴۷

معارف ومنازل

ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ اپنے فضل وکرم سے معاندین کو بار بار تنبیہ فرماتے ہیں تاکہ وہ فرصت اور مہلت کو غنیمت سمجھ کر سدھر جائیں، اور کفر وشرک سے تائب ہوکر ایمان لائیں، اور اپنے عناد اور سرکشی کی وجہ سے جو حق کو آگے بڑھنے سے روکنے کی تدبیریں کرتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ حق کو نہ خود مانیں، نہ دوسروں کو قبول کرنے دیں، یہ لوگ دنیا کی تھوڑی سی کھانے پینے والی، اور آرام وراحت والی زندگی سے دھوکہ نہ کھائیں، یہ نہ سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت سے باہر ہیں۔

کیا یہ لوگ اس بات سے بے خوف ہیں کہ انہیں زمین میں دھنسا دیا جائے؟ یا ان پر ایسی جگہ سے عذاب آجائے کہ انہیں خبر بھی نہ ہو؟ یا اللہ تعالیٰ انہیں زمین میں چلتے پھرتے پکڑ لے؟ یا ان کی اس طرح گرفت فرمادے کہ ان کی جانیں اور مال واولاد کم ہوتی چلی جائیں، اور ان کی راحت، خوشی وآرام گھٹتے چلے جائیں؟ (یہ تَخَوُّف کا ترجمہ ہے)۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اگر اللہ تعالیٰ گرفت فرمائے، چلنے پھرنے اور کروٹ بدلنے میں پکڑ لے، اور عذاب میں مبتلا فرمادے، تو یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے، اور اللہ تعالیٰ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے، اور بھاگ کر اُسے عاجز نہیں کر سکتے۔ وہ جس طرح عذاب دینا چاہے، اور جس طرح گرفت فرمانا چاہے، اسے پوری قدرت حاصل ہے۔

﴿فَاِنَّ رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ یعنی خدا تعالیٰ سب کچھ کرسکتا ہے، مگر کیوں نہیں کرتا؟ اس کی رحمت اور مہربانی مانع ہے کہ مجرمین پر فوراً عذاب نازل کردے۔ اس کی رأفت ورحمت مقتضی ہے کہ مجرمین کو مہلت اور اصلاح کا موقع دیا جائے۔ یا یہ جملہ صرف ﴿يَأْخُذَهُمْ عَلٰى تَخَوُّفٍ﴾ سے متعلق ہے، بحالیکہ تَخَوُّف کو تَنَقُّص کے معنی میں لیا جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ آہستہ آہستہ کم کرنا، اور دفعۃً ہلاک نہ کرنا، اس کی رحمت وشفقت کی وجہ سے ہے، ورنہ ایک آن میں نیست ونابود کردیتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَوْا اِلٰى مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ يَّتَفَيَّؤُا ظِلٰلُهٗ عَنِ الْيَمِيْنِ وَالشَّمَآئِلِ سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ ۝۴۸ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۴۹ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝۵۰

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا جو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائی ہیں، ان کے سائے دائیں طرف اور بائیں طرف کو اس طرح جھکتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں، اور عاجز ہیں ۴۸ اور جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور زمین میں ہے، حیوانات اور فرشتے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے فرمانبردار ہیں، اور وہ تکبر نہیں کرتے ۴۹ وہ اپنے ربّ کی شان قاہریت سے ڈرتے ہیں، اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے ۵۰

معارف ومنازل

قرآن حکیم جس کا ایک نام ﴿الذِّکر﴾ بیان ہوا، سرتاپا، اوّل سے آخر تک نصیحت ہے، وہ بندوں کو دلائل توحید مختلف رنگوں میں سکھاتا ہے، کبھی آنکھوں کے راستے سے کہ ملک وملکوت کا نظارہ کرو، کبھی کانوں کے راستے سے کہ حق بات سنو، کبھی دماغ کے راستے سے کہ مظاہر قدرت میں غور وفکر کرو، کبھی قلب وباطن کے ذریعہ سے کہ تسلیم و انقیاد کا مظاہرہ کرو۔ مطلب سب کا ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرو۔

ان آیات کا اجمالی مطلب یہ ہے کہ دیکھو، تمام وہ چیزیں جن کو تم بے جان و بے شعور سمجھتے ہو، وہ تو اپنے ربّ کے حضور میں سجدہ ریز، تسبیح خوان اور عجز ونیاز پیش کرنے والے، آہ وزاری میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ حیرت ہے تم پر کہ زیرک ودانشمند اور زندہ وباشعور ہوتے ہوئے تم اپنے ربّ کی فرمانبرداری کے بدلہ اس کی نافرمانی اور عہد شکنی میں مست ہو، یہ تمہاری شان ہرگز نہیں ہے، تو برحق اور مبنی برحقیقت سچ فرمایا کہ تمہارے ربّ نے جو چیزیں پیدا فرمائی ہیں ان کو کیوں نہیں دیکھتے؟ ان کو دیکھو، اور غور کرو کہ ان کا سایہ دائیں طرف اور بائیں طرف جو زمین پر پڑتا ہے، اس سائے میں بھی اللہ تعالیٰ شانہ کی شان خالقیت ظاہر ہورہی ہے۔

یہ سایہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع وفرمانبردار ہے، اللہ تعالیٰ جس طرف چاہتے ہیں یہ سائے اسی طرف جھکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حکم پر گھٹتے اور بڑھتے ہیں، کبھی رکوع میں، کبھی سجدہ میں، اور استواء کے وقت قیام میں ہوتے نظر آتے ہیں۔ اور صرف سایوں پر اور سایہ والی چیزوں پر کچھ منحصر نہیں، جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ سب اللہ تعالیٰ کے مطیع وفرمانبردار ہیں۔ ان میں حیوانات بھی ہیں، اور فرشتے بھی ہیں، یہ فرشتے بہت طاقتور ہونے کے باوجود تکبر نہیں کرتے، فرمانبرداری اور اطاعت ہی ان کا شعار ہے۔

فرشتے اس بات کو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ پوری طرح قدرت رکھتا ہے، اور قاہر وغالب ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ شانہ سے قرب کے باوجود ڈرتے کانپتے ہیں کہ کہیں اس کی طرف سے کوئی گرفت نہ ہوجائے۔ "نزدیکاں را بیش بود حیرانی" مقولہ ہے کہ قرب والے زیادہ ڈرنے والے ہوتے ہیں، اور یہ عجیب بات ہے کہ فرشتوں کے لئے نہ جنت ہے، نہ دوزخ، نہ حساب وکتاب، اور نہ پل صراط، اس کے باوجود وہ ہر لمحہ ربّ العزّت کے عذاب سے ڈرتے ہیں۔

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ شارح بخاری نے لکھا ہے کہ فرشتوں کے سردار حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں کُل چوبیس ہزار مرتبہ تشریف لائے، اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، ہر بار وہ اسی کیفیت میں آتے تھے گویا اس پر ایک بوجھ اور پریشانی کا غلبہ ہے، پوچھنے پر کہنے لگے: یارسول اللہ! جب سے میں نے جہنم کو دیکھا ہے، اسی روز سے مجھ پر غموں کی بے پایاں پریشانی اور بوجھ سوار ہے، اور میری ہر طرح کی خوشی دل سے نکل چکی ہے، میں کبھی خوشی محسوس نہیں کرتا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی یہ کیفیت اثر انداز ہوئی۔

آہ افسوس! ہمارے لئے، ہم لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد نہ سمجھا، اور نہ جانا۔ بے جان سائے، نباتات، جمادات، کیڑے مکوڑے، چاند، سورج، ستارے، بادل ہوائیں تکوینی طور پر ہر ہر ذرہ کائنات تو سجدے میں، اور ہم لوگ غفلت وخرمستی میں، کبھی کسی گناہ میں، کبھی کسی گناہ میں۔ فرمایا:

﴿سُجَّدًا لِّلّٰهِ وَهُمْ دٰخِرُوْنَ﴾ یہ سارے عجز ونیاز کے ساتھ، فخریہ طور پر، سعادت سمجھتے ہوئے سجدہ میں پڑے ہیں۔ سورۂ فرقان میں ارشاد ہے: ﴿اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا قَبْضًا يَّسِيْرًا﴾[الفرقان:۴۶] (کیا تو نے اپنے ربّ کو نہیں دیکھا، اس نے سایہ کو کس طرح پھیلا دیا؟ اور اگر وہ چاہتا تو اُسے ٹھہرا ہوا رکھتا، پھر ہم نے آفتاب کو اس پر علامت مقرر کیا، پھر ہم نے اس کو اپنی طرف آہستہ آہستہ سمیٹ لیا)۔

جب آفتاب طلوع ہوتا ہے، تو ہر چیز کا سایہ مغرب کی طرف لمبا ہوتا ہے، پھر جیسے جیسے سورج بلند ہوتا ہے تو سایہ کم ہوتا جاتا ہے، بظاہر سایہ کا وجود سورج کے چلنے اور اس کے سامنے اجزاء کثیف آنے کی وجہ سے ہے، لیکن خود آفتاب کی حرکت ہی اللہ تعالیٰ سبحانہ کی مشیت سے ہے، اور پھر سایوں کا وجود میں آنا اور کم وزیادہ ہونا، یہ سب ہی اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ اگر وہ چاہے تو ذرا سا بھی سایہ نہ ہو، اور سایہ کا ایک مثل دو مثل ہونا سایہ کے بڑھنے ہی کی وجہ سے ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو سایہ ایک ہی جگہ پر ٹھہرا رہتا، جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے، نہ آفتاب خود کوئی حیثیت رکھتا ہے، نہ سایہ، سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ کیا کسی درخت کا پتہ بغیر اس کے حکم کے حرکت کرسکتا ہے؟ یَامُثَبِّتَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْنَا عَلٰى دِيْنِكَ۔ آمین

سایوں کی فرمانبرداری بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا جو بھی چیزیں آسمان اور زمین میں ہیں سب اللہ تعالیٰ

کی فرمانبردار ہیں۔تکوینی (قدرتی غیر اختیاری) طور پر ان کا وجود اور ان کی کیفیات اسی طرح سے ہیں جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے۔ان میں شمس وقمر، ستارے، درخت، پہاڑ اور چوپائے سبھی ہیں جیسا کہ سورۂ حج میں ان کا خصوصی تذکرہ ہے، ارشاد ہے: ﴿اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَ الۡقَمَرُ وَ النُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَ الشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَ كَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾[الحج:١٨] (کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ کے آگے وہ سب سجدہ کرتے ہیں جو آسمانوں میں ہیں، اور وہ سب جو زمین میں ہیں۔نیز سورج اور چانداور ستارے اور پہاڑ، اور درخت اور جانور، اور بہت سے انسان بھی)۔

ایک سجدہ ہے، جس میں آسمان وزمین کی ہر ایک مخلوق شامل ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آگے تکوینی طور پر (بغیر اختیار) سب مطیع ومنقاد اور عاجز و بے بس ہیں۔خواہی نخواہی اور طوعاً وکرہاً مخلوقات کو اس کے سامنے گردن ڈالنا اور سر جھکانا پڑا ہے۔دوسرا سجدہ ہے ہر چیز کا جدا، وہ یہ کہ جس چیز کو جس کام کے لئے بنایا، اس کام میں لگے۔یہ بہت سے آدمی کرتے ہیں، اور بہت سے نہیں کرتے، مگر آدمیوں کو چھوڑ کر باقی ساری خلقت کرتی ہے، اسی بناء پر ﴿يَسۡجُدُ لَهٗ﴾ ہر چیز کا اپنی شان کے لائق سجدہ مراد ہوگا، اختیاری سجدہ جو حقیقی بھی ہے، یہ فرشتوں کا، انسانوں اور جنات کے ساتھ مخصوص، اور غیر اختیاری تکوینی سجدہ، یعنی اطاعت وفرمانبرداری سب کے لئے ہے۔

……❀……❀……❀……

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوۡۤا اِلٰهَيۡنِ اثۡنَيۡنِ‌ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ‌ۚ فَاِيَّاىَ فَارۡهَبُوۡنِ ﴿۵۱﴾ وَلَهٗ مَا فِى
السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَهُ الدِّيۡنُ وَاصِبًا‌ؕ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ تَتَّقُوۡنَ ﴿۵۲﴾ وَمَا بِكُمۡ مِّنۡ نِّعۡمَةٍ فَمِنَ
اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيۡهِ تَجۡـَٔرُوۡنَ‌ۚ ﴿۵۳﴾ ثُمَّ اِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنۡكُمۡ اِذَا فَرِيۡقٌ
مِّنۡكُمۡ بِرَبِّهِمۡ يُشۡرِكُوۡنَۙ ﴿۵۴﴾ لِيَكۡفُرُوۡا بِمَاۤ اٰتَيۡنٰهُمۡ‌ؕ فَتَمَتَّعُوۡا‌ ۟ فَسَوۡفَ تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵۵﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ دو معبود مت بناؤ، صرف ایک ہی معبود ہے، سو تم مجھ ہی سے ڈرو ﴿۵۱﴾ اور اسی کے لئے ہے جو آسمانوں میں ہے، اور جو زمین میں ہے، اور فرمانبرداری کرنا صرف اسی کا حق ہے، کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے ڈرتے ہو؟ ﴿۵۲﴾ اور تمہارے پاس جو بھی کوئی نعمت ہے سو وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، پھر جب تمہیں تکلیف پہنچ جاتی ہے تو اسی سے فریاد کرتے ہو ﴿۵۳﴾ پھر جب وہ تم سے اس تکلیف کو ہٹا دیتا ہے تو تم میں سے ایک جماعت

اسی وقت اپنے ربّ کے ساتھ شرک کرنے لگتی ہے۞ تاکہ وہ ہماری اس نعمت کے منکر ہو جائیں، سوتم نفع حاصل کرلو، پھر عنقریب جان لوگے۞

معارف ومنازل

﴿وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰـهَيْنِ اثْنَيْنِ﴾ اس آیت کریمہ کے نزول سے پہلے سورۃ الاخلاص کا نزول ہوا کہ تمام کائنات کا خالق و مالک اور الٰہ ومعبود ایک ربّ ہے، جس کا نہ کوئی شریک ہے نہ ہمسر و برابر۔ پورے قرآن مجید میں تعدد و کثرت آلہہ کی نفی ہے، نہ دو معبودوں کی گنجائش ہے، نہ تین چار، نہ کسی اور کثرت کی۔

آیت بالا کا مطلب یہ ہے کہ جب تمام آسمانی وزمینی مخلوق ایک خدا کے سامنے بے اختیار سربسجود عاجز اور مقہور ہے، پھر عبادت میں کوئی دوسرا شریک کہاں سے آگیا؟ جو سارے جہاں کا مالک ومعبود اور مطاع ہے، تنہا اسی کی عبادت ہونی چاہیے، اور صرف اسی سے ڈرنا چاہیے۔

﴿وَلَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَهُ الدِّيْنُ وَاصِبًا﴾ تکوینی طور پر ہر چیز خالص اسی کی عبادت واطاعت پر مجبول ہے۔ ﴿اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ﴾ [آل عمران:۸۳] (اب کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوقات ہیں ان سب نے اللہ ہی کے آگے گردن جھکا رکھی ہے، خوشی سے اور ناچار ہوکر)۔ مطلب یہ ہے کہ ﴿وَاصِبًا﴾ ہمیشہ اسی کی عبادت ہونی چاہیے، اور وہ عبادت کے لائق ہے۔ ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ﴾ [الزمر:۳] (یادرکھو کہ خالص بندگی اللہ ہی کا حق ہے)۔

اور بعض نے یہاں دین کو جزاء کے معنی میں لیا، یعنی نیک و بد کا دائمی بدلہ اسی ایک خدا کی طرف سے ملے گا، پھر اس کو چھوڑ کر کسی اور سے ڈرنا جہالت اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔

﴿وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ﴾ یعنی سب بھلائیاں اور نعمتیں اسی کی طرف سے ہیں، اور ہر ایک برائی یا سختی کا دفع کرنا بھی اسی کے قبضہ میں ہے، چنانچہ جب کوئی سخت مصیبت انسان کو چھو جاتی ہے تو کٹر سے کٹر مشرک اور دہریہ بھی اس وقت سب سہارے چھوڑ کر خدا کو پکارنے لگتا ہے، گویا فطرت انسانی شہادت دیتی ہے کہ مصائب اور سختیوں سے بچانا خدائے واحد کے سوا کسی کا کام نہیں ہوسکتا۔ پھر جس کے قبضہ میں ہر ایک نعمت ونقمت اور ہر قسم کا نفع و

ضرر ہے۔ دوسرا کون ہے جو اس کی الوہیت میں حصہ دار اور شریک بن سکے؟ یا جس سے انسان خوف کھائے، اور اُمیدیں باندھے۔

﴿ثُمَّ إِذَا كَشَفَ الضُّرَّ عَنكُمْ إِذَا فَرِيقٌ مِّنكُم بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ﴾ پھر جب اللہ تعالیٰ مصیبت کو تم سے دُور کر دیتا ہے، تو تم میں سے کچھ لوگ یکدم اللہ تعالیٰ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کرنے لگتے ہیں۔ یعنی جہاں سختی دور ہوئی تو منعمِ حقیقی کو بھلا بیٹھے، اور نہایت بیحیائی سے خدائی کے حصے بخرے کرنے لگے، شرم نہ آئی کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے عاجز ہو کر اُسے پکار رہے تھے۔ نہ محسنِ حقیقی کا احسان مانا، نہ یہ اندیشہ کیا کہ ناشکری کی سزا میں پکڑے جائیں گے، یا کم از کم کفرانِ نعمت سلبِ نعمت کا موجب ہو جائے۔ گویا خدائے واحد لاشریک لہٗ نے جو انعام فرمایا تھا بالکل اس کے انکار پر تُل گئے۔ پس صرف چند روز کی انہیں مہلت دی جاتی ہے، تا کہ خوب دنیا کے مزے اڑا لیں، آخر معلوم ہو جائے گا کہ اس مشرکانہ کفرانِ نعمت کی کیسی سزا ملتی ہے۔

وَيَجْعَلُونَ لِمَا لَا يَعْلَمُونَ نَصِيبًا مِّمَّا رَزَقْنَاهُمْ ۗ تَاللَّهِ لَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنتُمْ تَفْتَرُونَ ﴿٥٦﴾ وَيَجْعَلُونَ لِلَّهِ
الْبَنَاتِ سُبْحَانَهُ ۙ وَلَهُم مَّا يَشْتَهُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿٥٨﴾
يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ فِي التُّرَابِ ۗ أَلَا سَاءَ مَا
يَحْكُمُونَ ﴿٥٩﴾ لِلَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۖ وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٠﴾

ترجمہ: اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے ان کے لئے حصہ مقرر کرتے ہیں، جنہیں کچھ بھی علم نہیں، اللہ تعالیٰ کی قسم تم سے اس بارے میں ضرور بالضرور باز پرس ہوگی، جو تم افترا پردازی کرتے ہو ﴿۵۶﴾ اور اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں، اور اپنے لئے اپنی چاہت کی چیز ﴿۵۷﴾ اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی کی خبر دی جاتی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ ہو جاتا ہے، اور وہ دل ہی دل میں گھٹتا رہتا ہے ﴿۵۸﴾ اسے جو بشارت دی گئی اس کی وجہ سے وہ لوگوں سے چھپا ہوا رہتا ہے کہ اُسے ذلت سمجھ کر رکا رہے، یا اُسے مٹی میں گاڑ دے، خبردار! ان کے فیصلے برے ہیں ﴿۵۹﴾ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کی بری حالت ہے، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے لئے بلند صفات ہیں، اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے ﴿۶۰﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں مشرکین کے دو بڑے باطل عقیدوں کا بیان اوران کی تردید ہے، عبادت لغیر اللہ، چاہے بدنی ہو یا مالی، دونوں حرام اور شرک ہیں، یہی حال نذر لغیر اللہ کا بھی ہے جو کہ سراسر شرک اور کفر ہے۔ مشرکین اپنے اموال ومویشی میں جو حصے اپنے معبودوں کے لئے مقرر کرتے تھے، ان کی پوری تفصیل سورۂ انعام کے آخر آٹھویں پارے میں گزر چکی ہے۔ وہاں معلوم کرلیں۔ ﴿وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا﴾ [الأنعام: ۱۳۶] (اور اللہ نے جو کھیتیاں اور جو چوپائے پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے اللہ کا بس ایک حصہ مقرر کیا ہے)۔ وہاں فرمایا: ﴿سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾ [الأنعام: ۱۳۸] (اللہ انہیں عنقریب اس کا پورا پورا بدلہ دے گا)۔ اور یہاں فرمایا:

﴿تَاللّٰهِ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَفْتَرُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ کی قسم، ان افتراء پردازیوں کے متعلق ضرور بالضرور تم سے پوچھا جائے گا، اور تمہیں ان کی سزا ضرور بالضرور بھگتنا ہوگی، اور اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے بُرے اعمال کا ضرور بدلہ دے گا۔ مشرکین کا دوسرا شرکیہ عقیدہ یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے بیٹیاں تجویز کرتے تھے، اور کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اَلعِیاذُ باللہ۔ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتایا، یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتایا، اور مشرکین مکہ نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں تجویز کیا۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ ہر قسم کے نسب و اولاد، اور ہر قسم کے رشتے ناطے سے منزہ اور بری ہے۔

جہالت وکفر کا بیڑا غرق ہو، گندے، ناپاک انسانوں نے بے ادبی اور خیانتوں میں حد کردی۔ سورۂ مریم میں فرمایا: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا وَمَا يَنْبَغِيْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا﴾ [مریم: ۹۲] (انہوں نے کہا کہ رحمٰن نے بیٹا بنایا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے بڑی سنگین حرکت کی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ اس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہوجائے، اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں۔ کہ ان لوگوں نے خدائے رحمٰن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ حالانکہ خدائے رحمٰن کی یہ شان نہیں ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو)۔

یعنی یہ ایسی بھاری بات کہی گئی، اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا ہے جسے سن کر اگر آسمان وزمین اور

پہاڑ مارے ہول کے پھٹ پڑیں، اور ریزہ ریزہ ہو جائیں تو کچھ بعید نہیں، اس گستاخی پر اگر غضب الٰہی بھڑک اٹھے، تو عالم تہ و بالا ہو جائے، اور آسمان و زمین کے پرخچے تک اڑ جائیں۔

محض اس کا حلم مانع ہے، ان بیہودگیوں کو دیکھ اور سن کر دنیا کو یکدم تباہ نہیں کرتا، جس خداوند قدوس کی توحید و پاکیزہ صفات پر آسمان و زمین، کوہ و جبال، غرض ہر علوی و سفلی چیز شہادت دے رہی ہے، انسان کی یہ جسارت کہ اس کے لئے اولاد کا احتیاج ثابت کرنے لگے۔ اَلعِیاذُ بِاللّٰہ

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اشاد فرمایا: جو کچھ میں دیکھتا ہوں، تم نہیں دیکھتے، اور جو کچھ میں سنتا ہوں، تم نہیں سنتے۔ آسمان خوب چرچرایا اللہ تعالیٰ کے خوف سے۔ اَطَتِ السَّمَاءُ وَحَقَّ لَهَا أَنْ تَـأِطَ۔ آسمان خوب چرچرایا، اور وہ خوب چرچرانے کا حقدار ہے۔ قسم ہے اس کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، آسمان میں کہیں بھی چار انگل کی جگہ ایسی نہیں کہ اس میں کوئی فرشتہ سجدہ میں پیشانی رکھے ہوئے نہ ہو۔ خدا کی قسم! جو کچھ میں جانتا ہوں اگر تم جانتے تو کم ہنستے، اور زیادہ روتے، اور بستروں پر عورتوں سے لذّت اندوز نہ ہوتے، اور میدانوں میں نکل کر اللہ تعالیٰ شانہ کے حضور چیختے چلاتے (یہ سن کر) حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کاش میں درخت ہوتا کہ کاٹ دیا جاتا۔ [أحمد، ترمذي، ابن ماجة]

صحیح بخاری میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انسان نے مجھے گالی دی، اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ وہ یوں کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے، حالانکہ میں بے نیاز ہوں، نہ میں نے کسی کو جنا، اور نہ میں کسی سے جنا گیا، اور نہ کوئی میرے برابر ہے۔ [بخاري] مشرکین کی بھونڈی عقل تو دیکھو کہ اوّل تو اللہ تعالیٰ کو صاحب اولاد بتا کر مشرک و ارندہ ہو گئے، پھر جو اولاد تجویز کی، وہ بھی لڑکی، جسے وہ اپنے لئے پسند نہیں کرتے، اور اسے برا سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے لئے لڑکوں کو پسند کرتے ہیں۔ ﴿وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِيْنَ هُمْ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ إِنَاثًا﴾ [الزخرف:١٩] (فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں انہوں نے انہیں عورت بنا رکھا ہے)۔ اسی سورت میں فرمایا: ﴿اَوَمَنْ يُّنَشَّؤُا فِي الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِيْنٍ﴾ [الزخرف:١٨] (کیا اللہ تعالیٰ نے اپنی اولاد بنانے کے لئے لڑکیوں کو پسند فرمایا؟ جو کہ زیور میں نشو و نما پائے، اور جو جھگڑے میں قوت بیان سے عاجز ہو)۔

صنف نازک و ضعیف کا انتخاب ظلم و ستم بالائے ستم ہی ہے، اور ان کا اپنا حال یہ ہے کہ جب ان میں سے کسی کو خبر ملے کہ اس کے گھر میں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس خبر سے اس کا چہرہ سیاہ و بے رونق ہو جاتا ہے، اور دل میں گھٹا گھٹا

پھرتا رہتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ اس کے اوپر آسمان گرا ہے۔ لوگوں کے سامنے آنے سے شرم محسوس کرتا ہے، اور چھپا چھپا پھرتا ہے، اور ساتھ اس فکر میں ڈوب جاتا ہے کہ ذلت برداشت کرتے ہوئے اسے روکے رکھوں، یا عار سے بچنے کے لئے اسے زمین میں گاڑ دوں۔ پھر ہوتا یہ تھا کہ بچی کو زندہ دفن کر دیتے تھے، اور رواج کی وجہ سے لوگوں کے سامنے آکر اپنے کو باعزت قرار دیتے تھے، گویا اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا، اور معاشرے میں اپنے لئے مقام پیدا کیا کہ بچی کو زندہ درگور کر دیا، اور لوگوں سے مبارکباد حاصل کی۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہ۔ ان کی جتنی زیادہ مذمت کی جائے پھر بھی کم ہے۔ سورہ تکویر میں ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ﴾ [التکویر: ۹] (اور جب زندہ دفن کی ہوئی بچی کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ کس گناہ کی وجہ سے قتل کی گئی؟)

عرب کی جہالت، اور بیگناہ بچیوں کا قتل:

عرب جن جہالتوں میں مبتلا تھے ان میں سے ایک جہالت یہ بھی تھی کہ رواج نے انہیں بے رحم اور سخت دل بنایا تھا، اپنی زندہ بچی کو بے رحمانہ پیرایہ میں دفن کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ عورت اسلام سے پہلے بالکل بے حیثیت تھی، اسے جوتے سمجھ کر تلف کرنے پر سکون محسوس کرتے تھے۔ ابھی بھی ان بچیوں کا قبرستان ایک بڑی چار دیواری میں کعبۃ اللہ شریف سے ایک کلومیٹر کے فاصلہ پر جنوب مغرب میں موجود ہے، جس کا میں نے بچشم خود معائنہ کیا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں تمام تر تاریخی حقائق تفصیل کے ساتھ سورہ تکویر کی تفسیر میں دیکھیں۔

اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَّاحِدَۃٌ۔ ہندوستانی مشرکین کا رواج تو یہ تھا کہ جب شوہر مرجاتا تو اس کی نوجوان بیوی کو بھی منحوس سمجھ کر اس کے ساتھ (شوہر کی لاش کے ساتھ) سپرد آتش کر کے جلانے کی رسم پوری کرتے تھے۔ یہ بیچاری چیختی چلاتی، آسمان سر پر اٹھالیتی، مگر شنوائی نہیں ہوتی، یہاں تک کہ مسلمان حکمرانوں نے اس رسم بد کا خاتمہ کر دیا۔ جب یہ رسم ختم ہوئی تو ہندوؤں نے تسکین خاطر کے لئے اس کی جگہ ایک دوسرا رواج نافذ کیا کہ عورت کا زندہ جلانا نہ سہی، مگر نحوست کی وجہ سے اسے زندگی بھر دوسری شادی کی اجازت نہ ہو۔ بیچاری بیوہ زندگی بھر در در ٹھوکریں کھاتی رہتی، مگر شادی سے محروم رہتی۔

یہ ہندوؤں والا رواج اتنا عام ہو گیا کہ مسلم معاشرے کا بھی حصہ بن گیا، اور مسلمانوں نے پوری قوت سے اسے قبول کیا، اور اپنا لیا۔ اللہ تعالیٰ سبحانہ نے محی السنہ قاطع بدعت مجاہد کبیر حضرت شاہ اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے دل میں یہ ولولہ پیدا فرمایا، چنانچہ انہوں نے پورے ہند میں اس کی تحریک چلائی، تحریک کا نام ہے "نکاح بیوہ گان"۔ یہ تحریک

ایک مؤثر انداز میں کامیاب رہی، اور ہندوانہ رسم بد کا برصغیر سے خاتمہ ہو گیا۔ الحمد للہ

﴿اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَ الصّٰدِقَاتِ وَالصّٰبِرِیْنَ وَالصّٰبِرَاتِ وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِیْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِیْنَ وَ الصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا﴾ [الأحزاب:۳۵] (بیشک فرمانبردار مرد ہوں یا فرمانبردار عورتیں، مؤمن مرد ہوں یا مؤمن عورتیں، عبادت گزار مرد ہوں یا عبادت گزار عورتیں، سچے مرد ہوں یا سچی عورتیں، صابر مرد ہوں یا صابر عورتیں، دل سے جھکنے والے مرد ہوں یا دل سے جھکنے والی عورتیں، صدقہ کرنے والے مرد ہوں یا صدقہ کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد ہوں یا روزہ دار عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد ہوں یا حفاظت کرنے والی عورتیں، اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والے مرد ہوں یا ذکر کرنے والی عورتیں، سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور شاندار اجر تیار کر رکھا ہے)۔

اسلام نے عورت کو بڑا مرتبہ، اور نہایت باعزّت مقام عطاء فرمایا ہے۔ اس کی حیاوعزّت کا اتنا تحفظ کیا ہوا ہے کہ کسی اجنبی مرد کو اس کے حسن و جمال اور چہرہ کی طرف نظر اٹھانے اور دیکھنے اور بات کرنے، بلکہ السلام علیکم کی اجازت تک بھی نہیں دی ہے۔ نماز جیسی عبادت میں بھی انہیں مردوں کی صفوں سے پیچھے نماز پڑھنے کا حکم دیا ہوا ہے، اسے گھر کی زینت بنا کر بچوں اور بچیوں کی پرورش کے اتنا بڑا ثوب اور اجر عظیم کا حقدار گردانا ہے کہ مردوں کی وہاں تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

آج یورپ اور اس کی شیطانی تہذیب نے عورتوں کے چہروں سے عزّت وحیاء کا نقاب اتار کر عورت کو بازیچہ اطفال سے بدتر بنا کر اس کی حیاء وعزّت کو تار تار کر کے مردوں میں تقسیم کیا ہے۔ وَلَا حَولَ وَلَا قُوة۔ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: میں نے جنت میں بنسبت مالداروں کے فقیروں کو زیادہ دیکھا، اور دوزخ میں بہ نسبت مردوں کے عورتوں کو زیادہ دیکھا۔ [مشکوۃ]

﴿لِلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ﴾ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں ان کی بُری حالت ہے، دنیا میں حماقت اور جہالت میں مبتلا ہیں، آخرت میں عذاب اور ذلّت میں مبتلا و گرفتار ہوں گے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰى﴾ اور اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عالیہ ہیں، اس کا وجود ذاتی ہے، اس کی قدرتِ کاملہ ہے، خالقیت و مالکیت میں کوئی اس کا شریک نہیں، وہ اولاد اور احتیاج اور تمام نقائص سے منزہ و پاک ہے، اس کی شان

بہت ہی بلند و عظیم ہے، وہ عزت و غلبہ والا اور حکمت والا ہے، اور ہر چیز سے باخبر ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۚ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿٦١﴾ وَيَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُوْنَ وَ تَصِفُ اَلْسِنَتُهُمُ الْكَذِبَ اَنَّ لَهُمُ الْحُسْنٰى ۭ لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ ﴿٦٢﴾

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کے ظلم کی وجہ سے ان کا مؤاخذہ فرمائے، تو زمین پر کسی بھی چلنے والے کو نہ چھوڑے، لیکن وہ انہیں ایک مقررہ مدت تک مہلت دیتا ہے، سو جب ان کا وقت معین آجائے گا تو ایک گھڑی مؤخر نہ ہوں گے، اور نہ آگے بڑھ سکیں گے ﴿٦١﴾ اور اللہ تعالیٰ کے لئے وہ چیز تجویز کرتے ہیں جسے مکروہ جانتے ہیں، اور ان کی زبانیں جھوٹا دعویٰ کرتی ہیں کہ ان کے لئے بھلائی ہے، یہ لازمی بات ہے کہ ان کے لئے دوزخ ہے، اور وہ سب سے پہلے بھیجے جائیں گے ﴿٦٢﴾

معارف ومنازل

لوگ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں جس عجلت سے دوڑ رہے ہیں، وہ ایک واقعی حقیقت ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ سارے انسان سوائے انبیاء علیہم السلام معصومین کی جماعت کے سب گناہوں میں ملوث ہیں، کوئی صغیرہ میں کوئی کبیرہ میں، انہی گناہوں کو تو ظلم کہتے ہیں۔ اگر جس عجلت سے گناہوں کی رفتار ہے اسی رفتار کے ساتھ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی طرف سے مؤاخذۂ عذاب کا سلسلہ جاری ہوتا تو زمین پر کوئی متنفس باقی نہ رہتا، سارے اپنے ظلم کی پاداش میں ہلاک ہو جاتے۔ انسان اس لئے ہلاک ہو جاتے کہ انہوں نے گناہوں کا ارتکاب کیا، اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک کیا، اور جب انسان ہلاک ہوئے تو جانوروں کے باقی رہنے کا مطلب کیا؟ وہ تو انسانوں کے تابع ہیں، اور ان کے لئے ہیں، جب متبوع نہیں رہا تو تابع بھی نہیں رہے گا۔

لیکن ایسا اس لئے نہیں ہوتا کہ بار بار اور جلدی عذاب آنے سے ربّ العزّت سبحانہ کا حلم اور مہربانی و شفقت مانع ہے، وہ اپنے بندوں کو مہلت دیتا ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کی اصلاح کر لیں، اور مہلت سے فائدہ اٹھائیں، اور اس میعاد تک باقی اور زندہ رہیں جو ان کے لئے مقرر ہے، جب وہ وقت آجائے گا تو پھر اس میں کسی تقدیم و تاخیر کی قطعاً

گنجائش نہیں ہوگی۔ پس مجرمین کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم کی مہلتوں کو غنیمت سمجھ کر اپنی اصلاح کریں۔ ؎

خطائیں دیکھتا بھی ہے، عطائیں کم نہیں کرتا ☆ میں حیران ہوں کہ بندوں پر وہ اتنا مہربان کیوں ہے

﴿وَيَجْعَلُونَ لِلّٰهِ مَا يَكْرَهُونَ﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے لئے وہ حقیر و معمولی چیز تجویز کرتے ہیں (بیٹیاں) جسے اپنے لئے گوارا نہیں کرتے ہیں، اور وہ جھوٹا دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے لئے بھلائی ہے۔ اوّل تو قیامت آئے گی نہیں، بالفرض اگر آ بھی گئی تو جس طرح ہم دنیا میں خوشحال ہیں وہاں بھی ہمارے لئے خوشحالی ہی ہوگی، کیونکہ خدا ہم سے راضی ہے۔ کیونکہ خدا اگر ہم سے ناراض ہوتا تو ہمیں خوشحال نہ رکھتا، ہم پر عذاب بھیج دیتا۔ یہ تھا ان کا "اَلْحُسْنٰى" اور بیجا غرور و تمنا۔ اس کا جواب ارشاد فرمایا:

﴿لَا جَرَمَ اَنَّ لَهُمُ النَّارَ وَاَنَّهُمْ مُّفْرَطُوْنَ﴾ یہ لازمی یقینی فیصلہ ہے کہ ان کے لئے دوزخ ہے، اور یہ بات بھی لازمی ہے کہ انہیں دوزخ میں دوسرے لوگوں سے پہلے جلدی بھیج دیا جائے گا۔

تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ فَهُوَ وَلِيُّهُمُ الْيَوْمَ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۶۳﴾ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِى اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۶۴﴾ وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ﴿۶۵﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی قسم! ہم نے اُمتوں کی طرف آپ سے پہلے رسول بھیجے، سو شیطان نے ان کے لئے ان کے اعمال اچھے کر کے دکھلائے، سو وہ آج ان کا رفیق ہے، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۶۳﴾ اور ہم نے آپ پر کتاب اسی لئے نازل کی کہ آپ ان کے لئے وہ بات بیان فرمادیں جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، اور یہ کتاب ان لوگوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں ﴿۶۴﴾ اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا سو اس کے ذریعہ زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ فرمادیا، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانی ہے جو سنتے ہیں ﴿۶۵﴾

معارف و منازل

گزشتہ آیات میں کفار کی جہالت اور خام خیالی کا بیان تھا، جس سے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم رنجیدہ

ہوتے تھے، اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی فرماتے ہیں کہ ہم نے آپ سے پہلے انبیاء علیہم السلام کو ان کی قوموں کی طرف بھیجے تھے، سو شیطان نے ان لوگوں کو ایسا بہکایا، اور گمراہ کیا کہ بُری باتوں اور گناہوں کو ان کی نظروں اور دل و دماغ میں خوبصورت اور مزیّن کر کے ان کا رفیق و ساتھی بن گیا۔

شیطان ایسے لوگوں پر مسلّط ہو کر انہیں پیغمبروں علیہم السلام سے دور رکھا، اور ان کو دعوت وتبلیغ سے بیگانہ کر کے جہنم کے راستہ پر ڈال دیا، یہی حال وکیفیت مشرکین مکہ کا بھی ہے، لہٰذا رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ انبیاء سابقین علیہم السلام کی طرح صبر واستقامت پر عمل پیرا ہوں، خواہ کوئی مانے یا نہ مانے، آپ تبلیغ ودعوت کو جاری رکھیں، تو فرمایا:

﴿تَاللّٰهِ لَقَدْ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰۤى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ﴾ اللہ تعالیٰ کی قسم۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات پاک کی قسم کھا کر ارشاد فرمایا: تحقیق ہم نے گزشتہ اُمتوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے، پس شیطان نے لوگوں کے اعمال کفریہ خبیثہ کو ان کی نظر میں آراستہ وخوبصورت کر کے دکھلایا، پس وہی شیطان آج اس زمانہ کے مشرکین کفار مکہ کا رفیق و دوست بنا ہوا ہے۔ آج ان کو بھی وہی پڑھا رہا ہے جو گزشتہ اُمتوں کو پڑھایا۔ پس کفار مکہ کا وہی حشر ہوگا جو گزشتہ اُمتوں کا ہوا۔ یہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ عذابِ الٰہی میں مبتلاء رہیں گے، اور تباہ ہو جائیں گے۔

﴿وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ﴾ اور ہم نے نہیں اتاری آپ پر یہ کتاب، جس کا نام قرآن حکیم ہے، مگر صرف اس مقصد کے لئے کہ آپ ان لوگوں کے لئے اس چیز کو واضح کر دیں جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں، یعنی توحید، قیامت، حلال وحرام کو پوری وضاحت سے بیان کریں کہ توحید اور معاد پر ایمان لانے کے بغیر کوئی نجات ممکن نہیں، اور یہ کتاب الٰہی اپنے ماننے والوں کے لئے ہدایت بھی ہے، اور رحمت بھی، جو اس کی تصدیق کرے گا وہ سعادتِ دارین کا مستحق ہوگا۔ جس طرح پانی مردہ زمین کو زندہ کرنے کا سبب ہے، اسی طرح یہ قرآن مردہ قلوب کی زندگی اور خوشحالی کا سبب بھی ہے، تو فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا﴾ اور اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر اس پانی سے زمین کو خشک اور مردہ ہونے کے بعد زندہ فرمایا، اور خوب سبزہ اگایا، بلاشبہ اس میں قدرت کی نشانی اور نصیحت ہے ان کے لئے جو بات سنتے ہیں۔

وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۚ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا
سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ۚ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾ وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ
الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ كُلِيْ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُكِيْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ۚ يَخْرُجُ مِنْۢ
بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ۚ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۶۹﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ تمہارے لئے چوپایوں میں عبرت ہے، ہم تمہیں اس چیز میں سے پلاتے ہیں جو ان کے پیٹوں میں ہے، گوبر اور خون کے درمیان سے، ایسا دودھ جو خالص ہے، پینے والوں کے حلق میں آسانی سے اترنے والا ہے ﴿۶۶﴾ اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے ہم تمہیں رزق دیتے ہیں، ان سے تم نشہ کی اور کھانے کی عمدہ چیز بناتے ہو، بلاشبہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو سمجھ رکھتے ہیں ﴿۶۷﴾ اور آپ کے ربّ نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں، اور ان عمارتوں میں جو لوگ اونچے گھر بناتے ہیں ﴿۶۸﴾ ہر قسم کے پھلوں میں سے کھاؤ، پھر تو اپنے ربّ کے راستوں میں چل جو آسان کر دیئے گئے ہیں، اس کے پیٹوں سے پینے کی چیز نکلتی ہے، جس کے رنگ مختلف ہیں، اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے، بلاشبہ اس میں نشانی ہے ان لوگوں کے لئے جو فکر کرتے ہیں ﴿۶۹﴾

معارف ومنازل

ان آیات سے پہلے سب سے بڑی نعمت جس پر پوری انسانیت کی، بلکہ حیوانات کی بھی بقاء وحیات موقوف ہے، اس کا بیان تھا، یعنی پانی، جسے اللہ تعالیٰ نے آسمان سے اتار کر تمام جانداروں کے علاوہ زمین کی زندگی کا سبب بنایا، جس میں مردہ زمین زندہ، اور سرسبز وشاداب ہوتی۔ اب ان آیات میں اوّلاً دودھ کا، اور ثانیاً سکر کا، اور اس کے ساتھ رزق حسن کا، ثالثاً شہد کا تذکرہ فرمایا۔

دودھ کا تذکرہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ دیکھو، چوپایوں میں تمہارے لئے عبرت ہے، چوپایوں سے دودھ کے جانور مراد ہیں، خوب غور کرو، اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے پیٹوں سے دودھ نکال کر پلاتا ہے۔ یہ جانور چارہ اور گھاس پھونس کھاتے ہیں، اس سے خون بھی بنتا ہے، اور گوبر بھی، اور دودھ بھی، یہ تینوں اپنی حقیقت اور رنگ ومنفعت کے اعتبار سے مختلف اور الگ ہیں۔

یہ دودھ دونوں، یعنی گوبر اور خون کے درمیان سے نکلتا ہے، اور نہایت صاف ستھرا سفید رنگ کا ہوتا ہے، اس میں ایک ذرہ بھی گوبر اور خون کا نہیں ہوتا، نہ اس کی بدبوئی، نہ خون کا سرخ رنگ، اور اس دودھ کا پینا نہایت سہل ہے، آسانی سے گلے اور حلق میں اتر جاتا ہے، یہاں تک کہ نومولود شیر خوار بچوں کو بھی بآسانی پلایا جاتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کا مظاہرہ ہے۔

جانوروں نے کھائی تھی گھاس پھونس، اور اس سے پیدا ہوا خالص سفید رنگ کا دودھ۔ یہ دودھ ہر چھوٹے بڑے کے لئے غذاء بن گیا، پھر اس دودھ سے کئی قسم کی غذائیں بھی بنتی گئیں، مثلاً پنیر، دہی، لسّی، مکھن، گھی وغیرہ۔ اور کرم بالائے کرم یہ بھی دیکھو کہ ایک عورت کی چھاتی خشک ہے، جب اس کے پیٹ میں بچہ ہوا، اور اس کی پیدائش قریب ہوئی تو چھاتی کے دونوں فوارے بغیر کسی انسانی تدبیر کے جوش مارتے ہوئے عمدہ دودھ سے بھر گئے۔ اس نظامِ تکوینی کے نشیب وفراز میں غور کرنے سے خود بخود اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت اور رزّاقیت بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جانور جب چارہ کھاتا ہے، اور اس کے معدہ میں جگہ پکڑ لیتا ہے، اور معدہ اسے جذب کرتا ہے، تو نیچے گوبر، درمیان میں دودھ، اور اوپر خون بن جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے جگر اپنا کام شروع کرتا ہے، خون رگوں میں چلا جاتا ہے، اور دودھ تھنوں میں آجاتا ہے، اور گوبر اپنی جگہ رہ جاتا ہے۔ [معالم التنزیل] حدیث شریف میں ہے کہ جب دودھ پیو تو یہ دعاء پڑھو: اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَنَا فِیْهِ وَزِدْنَا مِنْهُ. [أبو داؤد] کیونکہ دودھ کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کھانے اور پینے دونوں کا کام دیتی ہو۔ یہ قدرت کی طرف سے بہت بڑی نعمت اور عمدہ غذا ہے کہ بچوں اور بیماروں، تندرستوں سب کے لئے عمدہ اور موافق غذا ہے۔

کھجوروں اور پھلوں کا تذکرہ:

﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِیْلِ وَالْاَعْنَابِ﴾ ہم نے تمہیں کھجور اور انگور کے پھل عطاء کئے، جس سے تم سکر اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو۔ کھجوروں اور انگوروں کی مٹھاس اور غذائیت کو عام طور پر سب لوگ جانتے ہیں، اور ان دونوں سے عمدہ چیزیں تیار کرتے ہیں، اور خود بھی کھاتے ہیں، اور کاروباری تجارت میں لگا کر بہت پیسہ کماتے ہیں۔

لفظ سَکَر کا ترجمہ بعض حضرات نے نشہ والی چیز سے کیا ہے۔ اس پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ نشہ اور نشہ آور اشیاء حرام ہیں، تو اسے نعمتوں اور بخششوں کی فہرست میں کیوں اور کیسے ذکر فرمایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سورہ نحل مکی ہے، اس وقت تک نشہ والی چیزیں حرام نہ ہوئی تھیں، اس لئے اس کے ساتھ کوئی خوبی اور پسندیدہ لفظ ذکر نہیں فرمایا۔

بخلاف انگور اور کھجور کے کہ انہیں رزقِ حسن کے الفاظ کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ اہل حبشہ کے لغت میں سرکہ کو سَکَر کہتے ہیں، گویا یہاں لفظ سَکَر سے سرکہ مراد ہے، جو کہ انگور سے بناتے ہیں، جو عمدہ اور حلال غذا ہے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے ابوعبیدہ سے نقل کیا ہے کہ سَکَر سے مراد لذّت اور مٹھاس ہے، نہ اور کوئی معنی، پس اس پر کوئی اشکال نہ ہوگا۔ واللہ اعلم

شہد اور اس کے فوائد:

﴿وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ﴾ فرمایا: تیرے ربّ نے شہد کی مکھی کے جی میں یہ بات ڈالی کہ پہاڑوں میں، اور درختوں میں اور لوگوں کی بنائی ہوئی عمارتوں میں گھر بناؤ، یعنی شہد کے لئے چھتہ تیار کرو، اور شہد کی مکھی سے فرمایا کہ تو پھلوں میں سے کھالے، یعنی چوس لے، اور اس کام کے لئے اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے راستوں میں آنا جانا جاری رکھ۔ یہ راستے شہد کی مکھی کے لئے آسان فرمادیئے، جب وہ پھلوں سے چوس کر آتی ہے تو چوسا ہوا مواد ان چھتوں میں جمع کرتی ہے، جو پہلے سے بنا رکھے تھے۔ یہ جمع شدہ مواد جسے شہد کی مکھیاں چوس چوس کر لاتی ہیں، یہی عسل اور شہد ہے۔

اس کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، سفید، پیلا، سرخ، اور سرخ سیاہ مائل، موسم اور علاقہ، جڑی بوٹیوں، درختوں اور پھولوں کا مختلف رنگوں میں اثر کارفرما رہتا ہے۔ شہد اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، یہ محض غذا نہیں، بلکہ بہت سی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔ اطباء حضرات ڈیڑھ سو سے زائد مختلف بیماریوں میں شہد کا تجربہ کر چکے ہیں، چنانچہ پورے اعتماد کے ساتھ اس کی تصدیق بھی کر چکے ہیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عَلَیكُم بِالشِّفَائَینِ اَلقراٰنِ وَ العَسَلِ۔ کہ تم ایسی دو چیزوں کا التزام کرو جن میں تمہارے لئے شفاء ہے، ایک قرآن، دوسرا شہد۔ [مشکوٰۃ دوم]

قرآن مجید کا شفاء ہونا تو سب کے نزدیک مسلم ہے، روحانی اور سخت سے سخت جسمانی امراض میں سورۂ فاتحہ تیر بہدف ہے، جس کے پڑھنے اور دم کرنے کے مختلف طریقے اکابرین حضرات نے وضع کئے ہیں، یہاں تک کہ لاعلاج امراض بھی ختم ہو گئے ہیں۔ رہا شہد، اس کے بارے میں "خواص شہد" نامی کتاب کا مطالعہ کریں۔

فائدہ:

یہاں اس آیت میں اَنعام کے بعد ﴿فِیْ بُطُوْنِهٖ﴾ کی ضمیر مذکور ہے، اور سورۂ مؤمنون میں ﴿فِیْ بُطُوْنِهَا﴾ میں ضمیر مؤنث ہے، مرجع دونوں کا اَنعام ہے۔ سیبویہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اَنعام اسم جمع ہے، لفظاً مفرد ہے، اور معنیً

جمع، مذکر ضمیر میں لفظ کا لحاظ، اور مؤنث میں معنیٰ کا لحاظ ہوا ہے۔ یہی قول زجاج نحوی سے بھی منقول ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ ۙ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ
شَيْـًٔا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰي بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ ۚ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا
بِرَاۗدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰي مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَاۗءٌ ۭ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا، پھر وہ تمہیں موت دیتا ہے، اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو نکمی عمر تک پہنچا دیئے جاتے ہیں تاکہ وہ علم کے بعد کچھ بھی نہ جانیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے، قدرت والا ہے ۝ اور اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر رزق میں فضیلت دی، سو جن لوگوں کو فضیلت دی گئی وہ اپنا رزق اپنے غلاموں کو اس طرح دینے والے ہیں نہیں کہ وہ سب اس میں برابر ہو جائیں، کیا پھر بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟ ۝

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی زندگی کے مالک نہیں ہیں، ان کی تخلیق، پھر حیات وموت، جوانی، بڑھاپے، عقلمندی اور نادانی سب اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰىكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا فرمایا، پھر وہ تمہیں اٹھالے گا، یعنی موت دے گا۔ ﴿وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا﴾ اور تم میں سے بعض وہ ہوتے ہیں جو نکمی عمر کی طرف لوٹا دیئے جاتے ہیں، جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جاننے کے بعد کچھ بھی نہیں جانتے، حافظہ و یادداشت کی جو قوت اللہ تعالیٰ نے جوانی میں عطاء فرمائی وہ آہستہ آہستہ قویٰ واعصاب کے ضعف کی وجہ سے بڑھاپے میں کمزور پڑ جاتی ہے۔ اعصاب اور حافظہ ونگہداشت ناکارہ نکما ہو جاتے ہیں، ایک چیز کو جاننے کے بعد شناخت نہیں کر پائے گا، اور جتنی چیزیں یاد کر کے رٹ لگا تا رہا وہ سب نسیان کی نذر ہو کر دماغ سے نکل جاتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ اپنے اور اپنے باپ دادوں کے نام بھول گیا، نماز پڑھی سمجھ میں نہ آئی وغیرہ۔

مطلب یہ ہے کہ جوانی ہو یا بڑھاپا، قوت حافظ وعلم ہو یا سہو ونسیان کا غلبہ، یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہیں۔ انسان بذات خود ان چیزوں کا مالک نہیں، پس چاہیے کہ وہ ان تمام باتوں پر ایمان لائے، اور اپنے وجود پر اللہ تعالیٰ کے تصرفات کا اقرار کرے۔

﴿إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ قَدِيرٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ علم والا، قدرت والا ہے۔ آگے ارشاد ہے کہ جیسے سارے لوگ علم و ادراک میں برابر نہیں، اسی طرح رزق وروزی میں بھی سب ایک جیسے نہیں۔ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض پر بعض کو رزق وروزی میں فضیلت دی ہے، اس میں رزق سے وہ چیزیں مراد ہیں جو انسانوں کی ملکیت میں آتی ہیں، اللہ تعالیٰ نے جس کو جو کچھ بھی عطاء فرمایا وہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے، پھر اس انعام میں تفضیل فرمائی، بعض کو بعض پر فضیلت دیدی، کسی کے پاس مال زیادہ ہے، اور کسی کے پاس کم ہے، اور کسی کے پاس سرے سے کوئی مال ہی نہیں۔

ان تمام باتوں میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، اگر سب لوگ مالداری یا تنگدستی میں برابر ہو جائیں تو دنیا کا نظام ٹھیک طرح سے نہیں چل سکتا۔ جب سب برابر ہوں تو کوئی کسی سے کیسے کام لے، اور کوئی کسی کا کام کیوں کرے۔ محنت اور مزدوری کی وجہ سے جو بہت سے کام ہو جاتے ہیں، اور بہت سوں کو رزق مل جاتا ہے، یہ سب ختم ہو جائے۔ کارخانے ٹھپ ہو جائیں، فیکٹریاں بند ہو جائیں، کھیتی باڑی، زمینداری یکسر ختم ہو جائیں۔

ایک شخص کو کام لینے کی حاجت ہے تاکہ اس کا مکان بنے، اس کا کارخانہ چلے، اور دوسرے شخص کو پیسے کی ضرورت ہے تاکہ اس کی حاجتیں پوری ہوں، پہلا شخص کام لیتا ہے پیسے دیتا ہے، دوسرا شخص کام کرتا ہے، اور پیسے لیتا ہے۔ اگر غور سے دیکھیں تو اس طرح سے انسانوں کی مختلف انواع کی ضرورتیں بھی پوری ہو رہی ہیں، اور بازاروں اور منڈیوں میں مال آرہا ہے، بازار بھی چل رہے ہیں، نظام عالم بھی چل رہا ہے۔ ایک طرف سے ہر قسم کے مال تیار ہو رہے ہیں، دوسری طرف سے کاروبار چل رہے ہیں۔

یہ جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو مال دیا ہے، اور ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اس میں یہ بات بھی ہے کہ جس کے پاس مال ہے وہ اپنے غلاموں کو مال دے کر اپنے برابر دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، تو یہ بے انصاف لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں کیوں غلط فیصلے کرتے ہیں؟ اسی کو فرمایا:

﴿فَمَا الَّذِينَ فُضِّلُوا بِرَآدِّي رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ﴾ اس میں مشرکین کی تردید فرمائی کہ جب تم اپنے غلاموں کو اپنے برابر نہیں دیکھ سکتے، اور برابر کا درجہ نہیں دے سکتے تو تمہیں یہ کیسے گوارا ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک کو اللہ تعالیٰ کے برابر کر دیا؟ اور غیر اللہ کو حق تعالیٰ واحد قدوس کی عبادت میں شریک کر دیا؟ تم بھی مخلوق ہو، اور تمہارے غلام بھی مخلوق ہیں، جب ایک مخلوق کو گوارا نہیں کہ دوسری مخلوق کو اپنے برابر دیکھ لے، پھر خالق جلّ جلالہ کے ساتھ اس کی مخلوق کو کیسے برابر بنا دیا؟ اور مستحق عبادت سمجھ لیا؟

﴿اَفَبِنِعۡمَةِ اللّٰهِ يَجۡحَدُوۡنَ﴾ کیا اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کرتے ہیں؟ انعامات کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور دینے والا بھی وہی ہے، اور عبادت میں شریک کرلیا دوسروں کو۔ حاصل یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے انکاری ہو گئے، غیر اللہ جو کہ کسی نفع ونقصان کا مالک نہ ہو اس کو منعم حقیقی کی عبادت میں شریک کرنے کا یہی مطلب ہوگا کہ اس کی نعمتوں کا انکار ہوا۔

....

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا وَّجَعَلَ لَكُمۡ مِّنۡ اَزۡوَاجِكُمۡ بَنِيۡنَ وَحَفَدَةً
وَّرَزَقَكُمۡ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ؕ اَفَبِالۡبَاطِلِ يُؤۡمِنُوۡنَ وَبِنِعۡمَتِ اللّٰهِ هُمۡ يَكۡفُرُوۡنَ ۝٧٢ وَ
يَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ رِزۡقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ شَيۡـًٔا وَّ
لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۝٧٣ فَلَا تَضۡرِبُوۡا لِلّٰهِ الۡاَمۡثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُ وَاَنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ۝٧٤

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تم میں سے بیویاں بنادیں، اور تمہاری ان بیویوں سے تمہارے لئے بیٹے اور پوتے پیدا فرمادیئے، اور تمہیں عمدہ چیزیں کھانے کے لئے عطا فرمائیں، کیا پھر بھی وہ باطل پر ایمان لاتے ہیں؟ اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری کرتے ہیں؟ ۝٧٢ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو آسمانوں میں سے، اور زمین میں سے انہیں رزق دینے کا ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے، اور نہ انہیں قدرت ہے ۝٧٣ سو تم اللہ تعالیٰ کے لئے امثال تجویز نہ کرو، اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے ۝٧٤

معارف ومنازل

سورۂ روم میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمِنۡ اٰيٰتِهٖۤ اَنۡ خَلَقَ لَكُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِكُمۡ اَزۡوَاجًا لِّتَسۡكُنُوۡۤا اِلَيۡهَا وَجَعَلَ بَيۡنَكُمۡ مَّوَدَّةً وَّرَحۡمَةً ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوۡمٍ يَّتَفَكَّرُوۡنَ﴾ [الروم:٢١] (اور اس کی ایک نشانی یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تم میں سے بیویاں پیدا کیں تا کہ تم ان کے پاس جا کر سکون حاصل کرو، اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت کے جذبات رکھ دیئے، یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو غور وفکر سے کام لیتے ہیں)۔

یہاں اسی نعمت جلیلہ کا ذکر فرما کر اپنے احسان وکرم نوازی کی یاددہانی فرمار ہے ہیں، یعنی ہم نے تمہیں تنہا پیدا نہیں کیا، ایسی تنہائی جس میں غم کے لمحے بڑے پیچیدہ بھیانک ہوتے ہیں، اور خوشی کی ساعتیں بڑی اداس، بلکہ ہم

نے تمہیں اس زندگی کا راستہ طے کرنے کے لئے ایک غمخوار ساتھی (رفیقہ حیات) بھی دیدیا، اور مزید کرم یہ فرمایا کہ وہ تمہاری ہی جنس سے ہے، تاکہ تمہاری تمنائیں، تمہارے جذبات اور خواہشات سب یکساں ہوں، تاکہ تم ایک دوسرے کے لئے باعثِ مسرت اور موجب اطمینان وسکون بنو۔ جب تم پر کسی غم و پریشانی کا حملہ ہو تو ایک دوسرے کی اُلفت ومحبت سے اشک شوئی اور غمخواری کرکے پریشانیوں کو راحت وسکون کا جامہ پہناؤ۔

مزید کرم یہ کہ بقاءِ نسل کے لئے تمہیں اولاد کی نعمت سے بہرہ ور فرمایا، اور تمہیں پوتے اور پوتیاں بخشیں، اس طرح تمہارے دلوں کو مسرت اور تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچائی، پھر کھانے کے لئے تمہیں عمدہ سے عمدہ، پاکیزہ لذیذ وخوشگوار چیزیں مہیا فرمائیں، ان گوناگوں بے شمار احسانات کے باوجود اگر تم شرک سے باز نہ آؤ، تو تم سے بڑھ کر کوئی ناشکر، اور احسان فراموش نہ ہوگا، لیکن تم کتنے ناداں اور ناشکر ہو کہ باطل پر ایمان لاتے ہو، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بے قدری کرتے ہو۔

امام مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ باطل سے مراد شیطان ہے، اور بِنِعْمَتِ اللّٰهِ سے مراد حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، جیسے سورۂ ابراھیم میں فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا﴾ [ابراھیم:۲۸] (وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی نعمت کو ناشکری سے بدل ڈالا)۔ وہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا کہ نِعْمَتَ اللّٰهِ سے مراد حضور پرنور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، اور باطل سے شرک اور عبادت غیر اللہ وغیرہ سارے معاصی ہیں، جن کو انہوں نے شیطان کے کہنے، اور ورغلانے پر اپنایا، اور حق سے منحرف ہوگئے۔

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَهُمْ رِزْقًا مِّنَ السَّمٰوٰتِ﴾ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو آسمانوں میں سے، اور زمین میں سے انہیں رزق دینے کا ذرا بھی اختیار نہیں رکھتے، اور نہ انہیں قدرت ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ سب کو رزق دیتا ہے، اور تمام کائنات پر اس کی حکمرانی ہے۔ رزق کے سارے خزانے اسی کے قبضہ میں ہیں۔ یہ تمہارے معبود اس قسم کے بے جان اور بے حرکت مجسمے ہیں کہ وہ کسی مکھی کے دفاع یا بھاگنے پر قدرت نہیں رکھتے، پس تم جو کہتے ہو کہ یہ ہمیں عزت ورزق، اور اولاد دیتے ہیں یہ سراسر تمہاری حماقت اور جہالت کے سوا کچھ نہیں، لہٰذا:

﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ کہ اللہ تعالیٰ کے لئے مثالیں مت گڑھ لو، اس کی شبیہ اور مماثل اپنے بتوں کو مت ٹھہراؤ، وہ ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ [الشوریٰ:۱۱] (کوئی چیز اس کی مثل نہیں) کی صفت کے ساتھ ہے، نہ

اس کی کوئی مثل ہے، نہ شبیہ اور ہمسر، اور نہ اس کی صفات (خالقیت، معبودیت وغیرہ) میں کوئی اس کا شریک ہے۔

مشرک کہتے تھے کہ مالک درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی ہے، مگر ہمارے معبود اس کے پیارے ہیں، اور انہیں اللہ تعالیٰ نے کچھ اختیارات دیئے ہوئے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ تک ہماری براہِ راست رسائی نہیں ہوسکتی، اس لئے یہ ہمارا اور خدا کے درمیان واسطے ہیں، جو ہماری باتیں اور عجز و نیاز وہاں تک پہنچاتے ہیں۔ فرمایا: ایسی مثال مت بناؤ، یہ تمہارے کفر سے بھی بدتر ہے، اور سراسر غلط ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ براہ راست بغیر کسی واسطہ کے اپنے بندوں کا سنتا ہے، اور انہیں دیکھتا بھی ہے، اور ان کی مَافِي الضَّمِير سے آگاہ بھی ہے، ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ﴾ [الحدید: ۴] (اللہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو، اور اللہ دیکھنے والا ہے ان اعمال کو جو تم کرتے ہو)۔ لہٰذا تم اللہ تعالیٰ کو کسی حاکم یا حکمران پر ہرگز قیاس نہ کرو، جو تمہارے احوال سے بے خبر ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ ازل سے لے کر ابد تک اپنی مخلوقات کے ذرہ ذرہ احوال سے خبردار ہے۔

﴿إِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے، اور تم نہیں جانتے ہو۔ یہ تمہاری جہالت و حماقت نہیں تو اور کیا ہے کہ خالق کو مخلوق پر، اور قادر کو عاجز محض پر قیاس کرتے ہو؟ اب اس کی تشریح کی جارہی ہے:

ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَمَن رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ
يُنفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَجَهْرًا ۖ هَلْ يَسْتَوُونَ ۚ الْحَمْدُ لِلَّهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾ وَضَرَبَ
اللَّهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ أَحَدُهُمَا أَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلَىٰ شَيْءٍ وَهُوَ كَلٌّ عَلَىٰ مَوْلَاهُ أَيْنَمَا يُوَجِّههُّ
لَا يَأْتِ بِخَيْرٍ ۖ هَلْ يَسْتَوِي هُوَ ۙ وَمَن يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿٧٦﴾

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی، ایک غلام مملوک ہے، جو کسی چیز پر قادر نہیں، ایک وہ شخص ہے جسے ہم نے اپنے پاس سے اچھا رزق عطاء کیا، سو وہ اس میں سے پوشیدہ طور پر، اور لوگوں کے سامنے خرچ کرتا ہے، کیا یہ برابر ہوسکتے ہیں؟ سب تعریف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، بلکہ بات یہ ہے کہ ان میں اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿٧٥﴾ اور اللہ تعالیٰ نے ایک مثال بیان فرمائی، یہ مثال دو آدمیوں کے بارے میں ہے، ان میں سے ایک گونگا ہے، وہ کسی چیز پر قادر نہیں، اور اپنے ولی پر مصیبت بنا ہوا ہے، وہ اسے جہاں بھی بھیجتا ہے کوئی خیر لے کر نہیں آتا، کیا یہ شخص اور ایسا شخص آپس میں برابر ہوسکتے ہیں جو اچھی باتوں کا حکم دیتا ہو، اور وہ سیدھے راستے پر ہو؟ ﴿٧٦﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں غلط مثال بیان کرنے سے منع فرمایا: ﴿فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ﴾ اب توحید کے اثبات اور صورت حال واضح کرنے، اور مشرکین پر اتمامِ حجت قائم کرنے کی خاطر دو آسان مثالیں بیان فرما رہے ہیں، تو ارشاد فرمایا:

﴿ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنٰهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا﴾ ایک شخص وہ ہے جو آزاد نہیں، دوسرے کا مملوک غلام ہے، کسی طرح کی قدرت و اختیار نہیں رکھتا، ہر ایک تصرف میں مالک کی اجازت کا محتاج ہے، بدونِ اجازت کہیں سفر نہیں کرسکتا، لین دین، بیع و شراء نہیں کرسکتا، حج و عمرہ نہیں کرسکتا، نکاح نہیں کرسکتا، بلکہ بے دست و پا اور بے اختیار ہے۔ دوسرا شخص مکمل صاحبِ قدرت اور بااختیار ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہر قسم کا رزق و روزی عطاء کیا ہوا ہے، وہ اپنے مال میں ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک ہر قسم کے تصرف کا مالک ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں پوشیدہ اور علانیہ بے دریغ مال خرچ کرتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں روک سکتا، کیا یہ دونوں شخص برابر ہوسکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

اسی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ مالک کُل ہے، اور کائنات کے ہر ذرہ کا حقیقی خالق و مالک مختار ہے، سب چیزیں اور سب تعریفیں اور خوبیاں اس کے خزانہ میں ہیں، جس کو جو چاہے دے، کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں، ہر چیز پر کلّی اختیار اور تصرف کا مالک ہے، دن کے بادشاہ کو رات میں فقیر بنانا، اور رات کے فقیر کو صبح تاجدار بادشاہ بنانا اس کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ یہ تمہارا کتنا بڑا ظلم اور حماقت و نادانی ہے کہ تم نے پتھروں اور اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے بے اختیار بتوں کو اس کا شریک بنایا؟ اور اس کے ساتھ برابر کردیا۔ یہ تمہارے بت اتنے نکمے اور بے جان و بے حرکت ہیں کہ کوئی عقلمند انسان اپنے گھر میں انہیں رکھنے کو گوارا نہ کرے، چہ جائے کہ ان کی پرستش کی جائے۔

تو اگر مالک مجازی اور مملوکِ مجازی برابر نہیں ہوسکتے، تو کوئی مملوک محض مالک حقیقی کا شریک کیسے بن سکتا ہے؟ یہاں سے یہ بھی سمجھ لو کہ خدائے واحد جلّ شانہ کا پرستار جسے مالک نے علم و ایمان کی دولت بخشی، اور لوگوں میں شب و روز روحانی نعمتیں تقسیم کرنے کا ذریعہ بنایا، کیا ایک پلید و ناپاک مشرک کو جو بت کا مملوک ہو، ہوا و ہوس، شکوک و اوہام کا غلام ہو، اس مؤمن موحّد کے ساتھ برابر کیا جاسکتا ہے؟

﴿وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُوَ كَلٌّ عَلٰى مَوْلٰىهُ ۙ اَيْنَمَا يُوَجِّهْهُّ لَا يَاْتِ بِخَيْرٍ ۭ هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ ۙ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۙ وَهُوَ عَلٰي صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ یہ دوسری مثال ہے، فرمایا کہ جیسے دو آدمی ہوں، ان میں سے ایک پیدائشی طور پر گونگا ہو (گونگا بہرہ بھی ہوتا ہے، وہ نہ بول سکتا ہے، نہ کچھ سن سکتا ہے، نہ کچھ سمجھتا ہے، یہ کسی چیز پر مطلقاً قادر نہیں ہوتا) اس کو کسی خدمت پر لگاؤ تو بجائے فائدہ کے نقصان اٹھاؤ، اور کسی کام پر اسے بھیج دو تو خیر لے کر واپس نہ آئے۔

اس کے مقابل ایک دوسرا شخص ہے جو بولتا بھی ہے، اور سنتا اور جانتا بھی ہے، اور سمجھتا بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں عقل وفہم بھی رکھی ہوئی ہے، یہ خود بھی سنجیدہ ہے، اور لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم بھی دیتا ہے، اور صراط مستقیم پر عملی طور پر کھڑا ہے، جو بھی کام کرے گا بہت فائدہ منداور بہتر نتائج سامنے آجاتے ہیں، وغیرہ۔

اب تم ہی بتاؤ کہ یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ہر عقلمند جواب دے گا کہ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جب دونوں برابر نہیں ہو سکتے تو یہ گونگے، بہرے، بے جان بت، اور وہ سب باطل معبود جو کسی ضرر ونفع کے مالک نہیں کیسے اللہ تعالیٰ کے برابر ہو سکتے ہیں، جن کی مشرکین عبادت کرتے ہیں؟ اسی طرح مؤمن موحّد جو معبودِ حقیقی کی عبادت کو حرزِ جان بنایا ہوا ہے، اور تقویٰ وطہارت اس کا شعار ہے، ایک مشرک وناپاک، بتوں کے پجاری کے ساتھ بھی برابر نہیں ہو سکتا۔ تفصیل آئندہ آنے والی ہے۔

وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا
كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۷۷﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں آسمانوں کی اور زمینوں کی پوشیدہ باتیں، اور قیامت کا معاملہ بس ایسا ہی ہے جیسے آنکھ کا جھپکنا، یا اس سے بھی زیادہ قریب، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شانہ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۷۷﴾

معارف ومنازل

توحید کی تقریر کے درمیان یکا یک قیامت کا یہ ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ لوگ توحید اور شرک کے درمیان کسی ایک عقیدے کے انتخاب کے سوال کو محض ایک نظری سوال نہ سمجھ بیٹھیں، اور انہیں یہ احساس رہنا چاہئے کہ ایک

فیصلے کی گھڑی کسی نامعلوم وقت پر اچانک آجانے والی ہے، اور اس وقت اسی انتخاب کے صحیح یا غلط ہونے پر آدمی کی کامیابی و ناکامی کا مدار ہوگا، اس تنبیہ کے بعد پھر وہی سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

دراصل یہ جواب ہے کفار مکہ کے اس سوال کا جو وہ اکثر آنحضرت ﷺ سے کیا کرتے تھے کہ اگر واقعی وہ قیامت آنے والی ہے جس کی تم ہمیں خبر دیتے ہو تو آخر وہ کس تاریخ کو آئے گی؟ یہاں ان کے سوال کو نقل کئے بغیر اس کا جواب دیا جارہا ہے کہ قیامت رفتہ رفتہ کسی طویل مدت میں واقع نہ ہوگی، نہ اس کی آمد سے پہلے تم دور سے اس کو آتے ہوئے دیکھو گے کہ سنبھل سکو، اور کچھ اس کے لئے تیاری کرسکو، وہ تو کسی روز اچانک چشم زدن میں، بلکہ اس سے بھی کم مدت میں آجائے گی، لہٰذا جس کو غور کرنا ہو سنجیدگی کے ساتھ غور کرے، اور اپنے رویہ کے متعلق جو بھی فیصلہ کرنا ہو جلدی کرلے، کسی کو اس بھروسے پر نہ رہنا چاہئے کہ ابھی تو قیامت دور ہے، جب آنے لگے گی تو اللہ تعالیٰ سے معاملہ درست کرلیں گے۔ فرمایا:

﴿وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ چیزیں، جو چیزیں بھی انسانوں، جنوں اور فرشتوں سے پوشیدہ ہیں، ان کا علم صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہی عالم کل اور عالم الغیب والشہادہ ہے۔ سورہ نمل میں فرمایا: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾ [النمل: ٦٥] (کہہ دیں: آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا سوائے اللہ کے، اور وہ نہیں سمجھتے کہ جب اٹھائے جائیں گے)۔ اور سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ﴾ [یونس: ٦١] (تیرے پروردگار غائب نہیں ذرہ برابر نہ زمین میں اور نہ آسمان میں)۔ تیرے پروردگار سے تو کائنات کی کوئی چیز، کوئی ذرہ پوشیدہ نہیں ہے، تو عالم الغیب والشہادہ کا یہی مطلب ہے کہ مخلوق کی نسبت سے جو چیزیں بھی ظاہر ہیں یا پوشیدہ، محسوسات میں سے ہیں یا غیر محسوسات میں سے، ورنہ اللہ تعالیٰ کی نسبت کوئی غیب و پوشیدہ نہیں، اس کے سامنے سب چیزیں ظاہر، مشاہدہ اور محسوس ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آپ لوگوں سے یہ کہیں کہ مجھے قیامت کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ کب اور کس وقت آئے گی، البتہ اتنا جانتا ہوں کہ اس کی آمد اچانک ہے، اور لمحوں میں ہے۔

﴿وَمَآ اَمْرُ السَّاعَةِ اِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ﴾ قیامت کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ آنکھ جھپکنے میں واقع ہوجائے گی، بلکہ آنکھ کا پلٹنا تو دور کی بات ہے، قیامت اس سے بھی کم مدت میں قائم ہوجائے گی۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔﴿لَا تَاْتِیْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً﴾ [الأعراف: ١٨٧] (تمہارے پاس قیامت اچانک آئے گی)۔﴿فَاِنَّمَا هِیَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ﴾ [النازعات: ١٣] (بیشک وہ ایک زور کی آواز ہوگی جس کے بعد وہ اچانک ایک کھلے میدان میں ہوں گے)۔ تفصیل وہاں دیکھیں۔

وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ
وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٧٨﴾ اَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ
جَوِّ السَّمَآءِ ؕ مَا یُمْسِكُهُنَّ اِلَّا اللّٰهُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿٧٩﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے نکالا، تم کچھ بھی نہ جانتے تھے، اور اس نے تمہارے لئے کان اور آنکھ اور دل پیدا فرمائے تاکہ تم شکر گزار ہو جاؤ ﴿٧٨﴾ کیا انہوں نے پرندوں کو نہیں دیکھا کہ آسمان کی فضاء میں مسخر ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے سوا انہیں کوئی نہیں روکتا، بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں ﴿٧٩﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش اور اس پر کئے گئے انعامات کا ذکر کر کے اسے توحید اور شکر کا حکم دیا ہے، ارشاد فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے کہ جس نے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ سے نکالا، یعنی تمہیں پیدا فرمایا، اس وقت تمہاری حالت یہ تھی:

﴿لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْـًٔا﴾ کہ تمہیں کسی بھی چیز کا علم نہیں تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر تمہیں علم عطاء فرمایا، سننے کی قوت عطاء فرمائی، دیکھنے کے لئے بن مانگے آنکھیں دیں، جاننے کے لئے دل عطاء فرمایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ بڑی بڑی نعمتیں ہیں جنہیں تم کسی قیمت سے دنیا کی منڈیوں سے حاصل نہیں کر سکتے، تمہیں چاہئے کہ شکر گزار بندہ بن کر اپنے ربّ کی توحید پر قائم رہو، اور اس کی عبادت کرو، اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ پھر ارشاد فرمایا:

﴿اَلَمْ یَرَوْا اِلَى الطَّیْرِ مُسَخَّرٰتٍ فِیْ جَوِّ السَّمَآءِ﴾ کیا تم پرندوں کو نہیں دیکھتے ہو، جو آسمانی فضاء میں مسخر ہیں؟ ان کو نیچے گرنے سے کوئی چیز روکنے والی نہیں، صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی قدرت اور مشیت سے رکے ہوئے

ہیں، اُڑ رہے ہیں، اور آگے بڑھ رہے ہیں، زمین کی کشش کے باوجود گرنے سے محفوظ ہیں، ان میں کچھ ایسے بھاری بھرکم موٹے وزن دار ہیں کہ منوں برابر وزنی ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ پروں کی حرکت کی وجہ سے ہوا میں تموّج اور تحریک ہے جس کی وجہ سے نہیں گرتے، اس کا جواب یہ ہے کہ پروں میں قوت اور ہوا میں یہ تحریک اور تموّج کہاں سے آیا؟ یہ بھی تو اللہ تعالیٰ ہی کا پیدا فرمایا ہوا ہے۔ زرا یہ انسان اُڑ کے دیکھ لے، اپنے ہاتھوں کو حرکت دے کر آزمائے کہ فضا میں کتنا ٹھہر سکتا ہے یا نہیں۔

ہوائی جہاز کو دیکھیں، اللہ تعالیٰ نے انسان کو صلاحیت و استعداد عطاء کی، انسان نے پرندوں پر اس کو قیاس کر کے بنایا، اور کامیاب ہو گیا، اب یہ نعمت بھی اللہ تعالیٰ ہی کی ہے کہ اس کے لئے فضاء کو ہموار اور مسخر فرمایا، جس میں ہوائی جہاز بغیر کسی خوف وخطرہ کے چکر لگا رہے ہیں، اور ہزاروں میلوں کا سفر طے کر رہے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو یہ سارا نظام درہم برہم ہو کر ٹھپ ہو جائے۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ﴾ اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو ایمان لاتے ہیں۔

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِّنْۢ بُیُوْتِكُمْ سَكَنًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنْ جُلُوْدِ الْاَنْعَامِ بُیُوْتًا تَسْتَخِفُّوْنَهَا یَوْمَ
ظَعْنِكُمْ وَیَوْمَ اِقَامَتِكُمْ ۙ وَمِنْ اَصْوَافِهَا وَاَوْبَارِهَا وَاَشْعَارِهَاۤ اَثَاثًا وَّمَتَاعًا اِلٰى حِیْنٍ ﴿۸۰﴾ وَاللّٰهُ
جَعَلَ لَكُمْ مِّمَّا خَلَقَ ظِلٰلًا وَّجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْجِبَالِ اَكْنَانًا وَّجَعَلَ لَكُمْ سَرَابِیْلَ تَقِیْكُمُ الْحَرَّ
وَسَرَابِیْلَ تَقِیْكُمْ بَاْسَكُمْ ؕ كَذٰلِكَ یُتِمُّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْلِمُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا
عَلَیْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ﴿۸۲﴾ یَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ یُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہارے گھروں میں رہنے کی جگہ بنائی، اور تمہارے لئے جانوروں کی کھالوں کے گھر بنائے، جن کو تم سفر کرنے کے دن، اور اقامت کرنے کے دن ہلکا پاتے ہو، اور اونوں، اور اونٹوں کے بالوں، اور دوسرے بالوں سے گھر کا سامان اور دوسری چیزیں بنائیں، جو ایک مدت تک کام دیتی ہیں ﴿۸۰﴾ اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ پیدا فرمایا ہے ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو سایہ والی ہیں، اور اس نے تمہارے لئے پہاڑوں میں چھپنے کی جگہیں بنائیں، اور تمہارے لئے کُرتے بنائے، وہ تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں، اور ایسے کُرتے بنائے جو لڑائی سے تمہاری حفاظت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ تم پر ایسے ہی اپنی نعمت پوری فرماتا ہے تاکہ تم فرمانبردار بنو ﴿۸۱﴾ سو اگر یہ لوگ

اعراض کریں تو آپ کے ذمہ صرف واضح طور پر پہنچا دینا ہے ﴿۸۲﴾ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمت کو پہچانتے ہیں، پھر اس کے منکر ہوتے ہیں، ان میں سے اکثر ناشکرے ہیں ﴿۸۳﴾

معارف ومنازل

انسان اپنی خوشگوار باعزّت زندگی گزارنے کے لئے گھر اور مسکن کا محتاج رہتا ہے، وہ بغیر گھر کے ایک دن بھی میدان میں گزارہ نہیں کرسکتا۔ گھر ہی وہ نعمت ہے جس سے انسان کی اہل وعیال اور سامان معاش کا تحفظ ہوسکتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس نعمت کا تذکرہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے گھر بنائے، جن میں وہ باعزّت رہتے ہیں، اور سکون وراحت حاصل کرتے ہیں۔

یہ گھر کبھی مٹی سے، کبھی پتھروں اور اینٹوں سے بنالیتے ہیں، اور ان کی چھتیں کبھی پختہ، کبھی گھاس پھونس، اور کبھی درختوں کی شاخوں اور پتوں سے بھی بنالیتے ہیں۔ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ شانہ نے پیدا فرمائیں، اور انہیں الہام کرکے سمجھایا کہ ان چیزوں کے ذریعہ اپنے لئے گھر تیار کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ شانہ کی مہربانی ہے کہ محض انسان نہیں جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کو بھی بذریعہ الہام ہدایت وراہنمائی فرمائی کہ اپنے لئے مسکن بنائیں۔ ایک مکڑی اپنے لئے لعاب اور گرد وغبار سے جالا تیار کرتی ہے، وہ قابلِ دید ہے، شاید کوئی ماہر انجنیئر بھی اس جیسے مکان بنانے پر قادر نہ ہو، علیٰ ہذا القیاس دوسرے جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کا بھی حال ہے۔

اور انسانوں کے کچھ گھر ایسے ہیں جو جانوروں کی کھالوں سے تیار کرتے ہیں، ان کھالوں کو جڑی بوٹیوں کے ذریعہ رنگ کرکے خشک کرلیتے ہیں، دباغت کے بعد اس کے تمام نقصانات اور عیب ختم ہوتے ہیں، جنہیں گھروں کے بنانے اور بے شمار دیگر مقاصد کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ ان کھالوں سے اعلیٰ قسم کے ہلکے پھلکے خیمے تیار کرتے ہیں، جو سفر وحضر دونوں میں بڑی سہولت وآرام سے استعمال میں آتے ہیں، جن کے اٹھانے اور رکھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔

چوتھے درجے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے جانوروں کے اون اور پشم سے، اور اونٹوں کے بالوں سے، اور دوسرے جانوروں کے بالوں سے تمہارے لئے گھر کا سامان بنادیا، جسے تم ایک مدت تک استعمال کرتے ہو، اور کام میں لاتے ہو، اور ان سے خوراک کے لئے تھیلے بناتے ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے تو جانور پیدا ہوئے، اور اگر وہ نہ

چاہتا تو ان کی کھالیں الگ نہ ہو پاتیں، جنہیں علیٰحدہ کر کے اوڑھنے، بچھانے، کمبل، شال، بلکہ لباس پہننے اور خیمے بنانے میں استعمال کرتے ہیں، پھر اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت نہ ہوتی تو جانوروں کے جسم پر نہ اون و پشم ہوتا، نہ بال ہوتے، بالکل چکنی سپاٹ کھال ہوتی۔ یہ اون اور بالوں اور پشم سے جو فائدے حاصل کرتے ہیں ان سے بالکل محروم ہوجاتے۔ سبحان اللہ

ان بالوں سے جس طرح انسان فائدہ حاصل کرتا ہے، اسی طرح خود جانوروں کا سردی و گرمی سے بھی انہی بالوں سے تحفظ ہوتا ہے، اور خوبصورتی و زینت بھی۔

پانچویں نعمت کا ذکر اس طرح فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے بعض ایسی مخلوقات پیدا فرمائیں جن سے تمہیں سایہ حاصل کرنے کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس میں درخت، مکانات، پہاڑ اور وہ سب چیزیں داخل ہیں جن سے سایہ حاصل کیا جاتا ہے۔

چھٹے نمبر پر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں میں تمہارے لئے پناہ لینے اور سر چھپانے کی جگہ بنائی۔ اس سے پہاڑوں کے غار مراد ہیں، اور پہاڑوں کو کاٹ کر جو بڑے بڑے گھر بنالیتے ہیں وہ بھی مراد ہیں۔

ساتویں نمبر پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے کُرتے بنائے، یعنی وہ چیزیں پیدا فرمائیں جن سے کُرتے بنائے جاتے ہیں۔ اس میں روئی اور اون اور وہ سب چیزیں داخل ہیں جن سے باریک اور موٹے کپڑے تیار کئے جاتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں پلاسٹک، نائیلون اور پلاسٹر وغیرہ سے طرح طرح کے کپڑے بننے لگے ہیں، اور ان ہی چیزوں سے دری، قالین، جائے نماز اور نہایت بیش قیمت دیگر مصنوعات تیار کی جاتی ہیں۔ آگے آگے دیکھئے، اللہ تعالیٰ اور کیا کیا چیزیں پیدا فرمائیں گے، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النحل:۸] (اور اللہ پیدا فرماتا ہے جو کچھ تم نہیں جانتے)۔ اس میں آئندہ چیزوں کے لئے پیشین گوئی ہے۔

کپڑوں کا فائدہ یہ بتایا کہ یہ کپڑے تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں۔ یہاں صرف گرمی کا ذکر فرمایا، حالانکہ یہ کپڑے سردی سے بھی بچاتے ہیں۔ علماء کرام نے فرمایا ہے کہ یہ برسبیلِ اکتفاء ہے، ایک چیز کو ذکر کیا جس سے اس کی ضد و مقابل بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور بعض علماء کرام کہتے ہیں کہ یہاں گرم کپڑوں کا ذکر اس لئے نہیں فرمایا کہ سورت کے شروع میں ﴿وَالْأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ﴾ [النحل:۵] میں ان کا تذکرہ آچکا ہے، اور ایسے کُرتوں کا بھی ذکر فرمایا جو لڑائی میں حفاظت کرتے ہیں، اس سے لوہے کی وہ زرہیں مراد ہیں جن کو میدان جنگ میں

حفاظت کی خاطر پہنتے ہیں۔ ان کا پہننا اسباب کے طور پر جائز ہے۔ یہ توکل کے خلاف نہیں۔ آنحضرت ﷺ نے بھی غزوات میں زرہ پہن رکھے ہیں۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ﴾ اگر گوناگوں انعامات، اور پیہم نوازشات کے باوجود یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، اور دین حق کو قبول نہیں کرتے، تو آپ پریشان نہ ہوں، آپ کا جو فرض تھا وہ آپ نے احسن وجوہ سے ادا فرمایا۔ مزید ہدایت دینا یہ آپ کا کام نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے۔

﴿يَعْرِفُوْنَ نِعْمَتَ اللّٰهِ ثُمَّ يُنْكِرُوْنَهَا وَاَكْثَرُهُمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ ان کے اس انکار کی وجہ یہ نہیں کہ آپ نے انہیں واضح طور پر سمجھایا نہیں، یا وہ اپنے ربّ کے احسانات سے بے خبر ہیں، آپ نے خوب سمجھایا، اور انہوں نے اچھی طرح سے سمجھ بھی لیا، لیکن وہ دانستہ ضد و عناد کی بنیاد پر ناحق باطل کفر و شرک سے چمٹے ہوئے ہیں۔

وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۵﴾ وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَآءَهُمْ قَالُوْا رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ شُرَكَآؤُنَا الَّذِيْنَ كُنَّا نَدْعُوْا مِنْ دُوْنِكَ ۚ فَاَلْقَوْا اِلَيْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۸۶﴾ وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ يَوْمَئِذِ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۸۷﴾ اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ بِمَا كَانُوْا يُفْسِدُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۭ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: اور جس دن ہم ہر اُمت سے ایک گواہ قائم کریں گے، پھر ان لوگوں کو اجازت نہ دی جائے گی جنہوں نے کفر کیا، اور نہ ان سے اس بات کی فرمائش کی جائے گی کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرلیں ﴿۸۴﴾ اور جن لوگوں نے ظلم کیا جب وہ عذاب کو دیکھیں گے تو ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا، اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ﴿۸۵﴾ اور جن لوگوں نے شرک کیا، جب اپنے شرکاء کو دیکھیں گے تو یوں کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! یہ ہمارے وہ شرکاء ہیں کہ آپ کو چھوڑ کر ہم جن کی عبادت کرتے تھے، سو وہ ان کی طرف بات ڈالتے ہوئے کہیں گے کہ بلاشبہ تم جھوٹے ہو ﴿۸۶﴾ اور اس دن اللہ تعالیٰ کے حضور میں فرمانبرداری کی باتیں کرنے لگیں گے، اور جو کچھ افتراء پردازی کرتے تھے وہ سب گم ہو جائے

گی ﴿۸۷﴾ جن لوگوں نے کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے روکا، ہم عذاب پر ان کا عذاب بڑھا دیں گے، اس سبب سے کہ وہ فساد کرتے تھے ﴿۸۸﴾ اور جس دن ہم ہر اُمت میں ایک گواہ قائم کریں گے، جو انہی میں سے ہوگا، وہ ان کے خلاف گواہی دے گا، اور ہم آپ کو ان لوگوں پر گواہ بنا کر لائیں گے، اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے، جو ہر چیز کو بیان کرنے والی ہے، اور فرمانبرداروں کے لئے ہدایت ہے، اور رحمت ہے، اور خوش خبری ہے ﴿۸۹﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں گزشتہ آیات کا نتیجہ ذکر فرمایا۔ یعنی کفار نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کے طرح طرح کے احسانات اور انعامات کا محض عناد کی بنیاد پر انکار کیا، اور شرک وکفر پر جمے رہے، اب قیامت کے دن ان کے خلاف انبیاء علیہم السلام گواہی دیں گے، اور ان کے اپنے اعضاء وجوارح بھی گواہی دیں گے، اور جن جن معبودوں پر وہ بھروسہ رکھتے تھے ﴿هٰؤُلَاۤءِ شُفَعَاۤؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ [یونس:۱۸] (یہ بت ہمارے سفارشی ہیں اللہ کے ہاں) کہتے تھے، ان معبودوں کو اللہ تعالیٰ قوت گویائی دیدے گا، وہ بھی ان کی تکذیب کریں گے، اور اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔ اس وقت ان کے سامنے جہنم کا عذاب ہوگا، وہ معذرت ومعافی اور بہانے تلاش کریں گے، جن کو مسترد فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں ابدی سزا کا فیصلہ صادر فرمائیں گے، تو فرمایا:

﴿وَيَوْمَ نَبْعَثُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا﴾ کہ قیامت کے دن ہر اُمت میں سے ہم ایک گواہ قائم کریں گے، یہ گواہ اس اُمت کا پیغمبر ہوگا، جو کہ ان کے کفر کے بارے میں گواہی دے گا، فرمایا:

﴿ثُمَّ لَا يُؤْذَنُ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ﴾ تو انہیں کسی قسم کے عذر ومعذرت کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور نہ ان سے یوں کہا جائے گا کہ تم اللہ تعالیٰ کو راضی کرلو، راضی کرنے کا وقت دار العمل تھا، اور وہ وقت گزر گیا، اب کوئی فائدہ نہیں، اب دار الجزاء کا پروگرام ہی چلے گا۔

﴿وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الْعَذَابَ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ......﴾ کفر کی سزا میں جب انہیں عذاب نظر آئے گا تو خلاصی کا، یا تخفیف کا، یا کسی مہلت کا کوئی ذریعہ اور راستہ نہیں پائیں گے، تمام راستے مسدود اور بند رہیں گے۔

﴿وَاِذَا رَاَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا شُرَكَاۤءَهُمْ......﴾ جب وہ اپنے شرکاء کو دیکھیں گے، تو ان کے بارے میں کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! یہ ہمارے شرکاء ہیں، یعنی وہ معبود ہیں جنہیں ہم نے آپ کی عبادت میں شریک کیا تھا، یہ وہ

ہیں جنہوں نے ہمیں گمراہ کرلیا تھا۔

﴿فَاَلْقَوْا اِلَیْهِمُ الْقَوْلَ اِنَّكُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾ ان کے باطل شرکاء ان کی طرف متوجہ ہو کر کہیں گے کہ تم لوگ جھوٹے ہو، ہم نے کب تمہیں کہا تھا کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک بناؤ، آج ہم تم سے بیزار اور لاتعلق ہیں۔

﴿وَاَلْقَوْا اِلَى اللّٰهِ یَوْمَىٕذِ السَّلَمَ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ﴾ اور جب یہ کفار عذاب کو دیکھیں گے، اور عذاب سے نجات کا کوئی راستہ نہیں پائیں گے تو فرمانبرداری کی باتیں کرنے لگیں گے، اور یوں کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! جو کچھ آپ کا حکم ہو ہم کرنے کے لئے تیار ہیں، ہمیں عذاب سے محفوظ کر دیا جائے۔ مگر اب یہ تسلیم ورضا کام کیا دے، جب اس کا وقت گزر چکا؟ اب یہ تمام افتراء پردازیاں ختم ہوگئیں، اور معذرتوں کا دروازہ بند ہوگیا۔

﴿اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ﴾ جن لوگوں نے کفر کیا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکا، وہ دُہرے عذاب میں مبتلا ہوں گے، اور انہیں فساد پھیلانے کی وجہ سے عذاب بالائے عذاب ہوگا، ایک عذاب کفر کا، اور ایک عذاب فساد پھیلانے کا، یا دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنے کا۔ كمامرّ

﴿وَیَوْمَ نَبْعَثُ فِیْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِیْدًا عَلَیْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ﴾ جس دن ہم ہر جماعت میں سے ایک گواہ قائم کریں گے، جو انہیں میں سے ہوگا، اور ان پر گواہی دے گا۔ یہ ہر اُمت کا نبی ہوگا، اور سرورِ عالم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اپنی اُمت پر گواہ بنایا جائے گا۔ اس کی تفصیل سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اُمت کا تزکیہ فرمائیں گے (امت اجابت کا تزکیہ) یہ اُمت دوسری اُمتوں کے بارے میں گواہی دے گی، اس وقت آپ فرمائیں گے کہ میری اُمت گواہی دینے کی لائق ہے۔

اور بعض مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم نے فرمایا کہ عَلٰی هٰٓؤُلَآءِ سے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام مراد ہیں، وہ حضرات اپنی اپنی اُمتوں کے بارے میں گواہی دیں گے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے بارے میں گواہی دیں گے کہ ان حضرات کی گواہی حق ہے۔

﴿وَنَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْكِتٰبَ تِبْیَانًا لِّكُلِّ شَیْءٍ﴾ اور ہم نے آپ پر کتاب نازل کی ہے، جو ہر چیز کو بیان کرنے والی ہے۔ یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں کی تفصیلات اور محکمات کا خلاصہ بھی ہے، اور جامع بھی ہے، حلال و

حرام، احکام ومسائل، مبدأ ومعاد، خاص کر توحید ذات وصفات اور دین اسلام کے تمام امور واحکام اور معاملات، الغرض! ہر چیز کا اس میں اجمالاً بیان ہے، جس کی تشریح وتفصیل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت مطہرہ میں عَلٰی وَجْهِ الْأَتَمِّ وَ الْكَمَال موجود ہے، جیسے پہلے بار بار بیان ہوا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی دیگر تین صفات بھی بیان فرمائیں:

﴿وَهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ یعنی ہدایت، اور رحمت، اور بشارت ہے۔ پہلی دو صفات کا تعلق ساری خلقت کے ساتھ ہے، اور بشارت کا تعلق صرف مسلمانوں کے ساتھ ہے۔ یا تینوں کا تعلق مسلمانوں کے ساتھ ہو، تو یہ بھی صحیح ہے۔ ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الاسراء: ۸۲] (اور ہم قرآن سے وہ نازل کرتے ہیں جو مومنوں کے لیے شفاء اور رحمت ہے، اور ظالم لوگوں کا نقصان ہی بڑھتا ہے) تفصیل سورۂ بقرہ کے شروع میں گزر چکی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى
عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ﴿۹۰﴾

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالیٰ عدل کا اور احسان کا اور قرابتداروں کو دینے کا حکم دیتا ہے، اور فحش کاموں سے اور برائیوں سے، اور ظلم کرنے سے منع کرتا ہے، وہ تمہیں نصیحت فرماتا ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو ﴿۹۰﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے قرآن حکیم کو ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ فرمایا تھا، یہ آیت اس کا ایک نمونہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک خیر وشر کے بیان کو اس آیت میں اکٹھا کر دیا ہے، گویا کوئی عقیدہ، خُلق، نیت، عمل، معاملہ اچھا یا برا ایسا نہیں جو امراً ونہیاً اس کے تحت داخل نہ ہو گیا ہو۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ قرآن کریم میں کوئی دوسری آیت نہ ہوتی تو تنہا یہ ہی آیت کریمہ: ﴿تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ﴾ کا ثبوت دینے کے لئے کافی تھی، جیسا کہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے سورۃ العصر کے متعلق یہی فرمایا تھا۔

شاید اسی لئے خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خطبہ جمعہ کے آخر میں اس کو پڑھنے کا پورے ملک میں حکم صادر فرمایا تھا، اور اُمت کے لئے اسوۂ حسنہ قائم کر دیا تھا۔ جو آج تک باقی ہے۔ حضرت امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا ہے کہ بعض خلفاء بنوامیہ اپنے خطبوں کے آخر میں سیدنا علی کرم اللہ وجہہ پر لعن طعن کیا کرتے تھے، جب عمر

بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے اس کو ممنوع قرار دیا، اور حکم دیا کہ اس کی جگہ یہ آیت پڑھی جائے، اور سب سے پہلے اس پر انہوں نے عمل کیا۔[روح المعاني] اس آیت کی جامعیت سمجھانے کے لئے بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، مختصر خلاصہ یہ ہے کہ آیت کریمہ میں تین باتوں کا امر ہے، اور تین چیزوں سے منع کیا گیا ہے۔

پہلے تینوں مامورات یہ ہیں: عدل، حسان، ایتاء ذی القربیٰ۔

☆عدل: عدل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے تمام عقائد، اعمال، اخلاق، معاملات، جذبات، کردار اعتدال وانصاف کے ترازو میں تلے ہوئے ہوں، افراط وتفریط سے کوئی پلّہ جھکنے نہ پائے، اور اٹھنے بھی نہ پائے۔ سخت سے سخت دشمن کے ساتھ بھی معاملہ کرے تو انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے، اس کا ظاہر وباطن یکساں ہو، جو بات اپنے لئے پسند نہ کرتا ہو اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

☆احسان کے معنی یہ ہیں کہ انسان بذات خود نیکی اور بھلائی کا پیکر بن کر دوسروں کا بھلا چاہے۔ مقام عدل وانصاف سے ذرا اور بلند ہو کر فضل وعفو اور تلطف وترحم کی خصلت اختیار کرے۔ فرائض ادا کرنے کے بعد تطوّع اور تبرع کی طرف قدم بڑھائے، انصاف کے ساتھ مروّت کو جمع کرے، اور یقین رکھے کہ جو کچھ بھلائی کرے گا خدا تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے۔ ادھر سے بھلائی کا جواب ضرور بھلائی کی صورت میں ملے گا۔ اَلْاِحْسَانُ أَنْ تَعْبُدَاللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ. [بخاري] ﴿هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ﴾ [الرحمن: ۶۰] (نیکی کا بدلہ نیکی ہی ہے)۔

یہ دونوں خصلتیں، یعنی عدل واحسان، یا یوں کہو: انصاف ومروّت تو اپنے نفس اور ہر ایک خویش وبے گانہ، اور دوست ودشمن سے متعلق تھیں، لیکن اقارب کا حق اجانب سے کچھ زائد ہے، جو تعلقات قرابتداروں کے لئے قدرت نے وضع کئے ہیں، ان کی تمامتر خیالداری ہر مسلمان پر ضروری اور لازم ہے۔ یہ بڑی بے مروّتی اور سنگدلی ہوگی کہ ایک شخص تندرست اور خوشحال ہو، اور وہ عیش کر رہا ہو، اور اس کے خاندان میں اس کے عزیز ورشتہ دار بیمار ہوں، یا کھانے کے لئے ترس رہے ہوں، اور محتاج ہوں، اور یہ ان کی خبر گیری نہ کر رہا ہو۔

صلہ رحمی ایک مستقل بڑی عبادت ہے، جو اسے نبھائے گا اور جوڑے گا اللہ تعالیٰ سے ہو بہو یہی انعام پائے گا، اور جو اسے قطع کرے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے عفو وکرم سے کٹ جائے گا۔

پھر عزیز وقریبوں کے جو درجہ بدرجہ حقوق ہیں اسی مناسبت سے ان کی ادائیگی ہونی چاہئے۔ فرق مراتب کو

فراموش کرنا ایک طرح قدرت کے مقرر کردہ قوانین سے بے اعتنائی اور بے وفائی ہے جو کہ ناجائز اور حرام ہے، اب ان تینوں لفظوں (عدل، احسان، ایتاءِ ذِی القربیٰ) کی ہمہ گیری کو پیش نظر رکھتے ہوئے عقلمند آدمی فیصلہ کر سکتا ہے کہ وہ کونسی فطری خوبی وبھلائی اور نیکی دنیا میں ایسی رہ گئی ہے جو ان تین فطری اصولوں کے احاطہ سے باہر ہو۔

اور جن تین چیزوں سے منع فرمایا گیا ہے وہ فحشاء، منکر اور بغی ہیں، کیونکہ انسان میں تین قوتیں ہیں جن کے بے موقع اور غلط استعمال سے ساری برائیاں اور خرابیاں پیدا ہوتی ہیں: قوت بہیمیہ شہوانیہ، قوت وہمیہ شیطانیہ، قوت غضبیہ سبعیہ۔ غالباً فحشاء سے وہ بے حیائی کی باتیں مراد ہیں جن کا منشا شہوت وبہیمیت کی افراط ہو۔

منکر معروف کی ضد ہے۔ یعنی نامعقول کام جس پر فطرت سلیمہ اور عقل سلیم انکار کرے۔ گویا قوت وہمیہ شیطانیہ کے غلبہ سے قوت عقلیہ ملکیہ دب جائے، مغلوب ہو جائے۔

تیسری چیز بغی ہے۔ یعنی سرکشی کر کے حد سے نکل جانا، ظلم وتعدی پر کمربستہ ہو کر درندوں کی طرح کھانے پھاڑنے کو دوڑنا، اور دوسروں کے جان ومال اور آبرو وغیرہ لینے کے لئے ناحق دست اندازی کرنا۔ اس قسم کی تمام حرکات قوت سبعیہ غضبیہ کے بے جا استعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ آیت کریمہ میں تنبیہ فرمادی کہ انسان جب تک ان تینوں قوتوں کو قابو میں نہ رکھے، اور قوت عقلیہ ملکیہ کو ان سب پر حاکم نہ بنائے وہ مہذب اور شریف وپاک نہیں ہوسکتا۔

﴿يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ تم کو سمجھاتا ہے تاکہ نصیحت حاصل کرو۔ اکثم بن صیفی (ایک مشرک سردار تھا) نے اس آیت کریمہ کو سن کر اپنی قوم سے کہا: میں دیکھتا ہوں کہ یہ پیغمبر تمام عمدہ اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتے ہیں، اور کمینہ اعمال اور اخلاق سے روکتے ہیں، تو تم اس کے ماننے میں جلدی کرو۔ فَكُوْنُوْا فِي هٰذَا الْأَمْرِ رُؤُسًا وَّلَا تَكُوْنُوْا فِيْهِ أَذْنَابًا. یعنی تم اس سلسلہ کا سر بنو، دُم نہ بنو، یعنی جلدی پیش قدمی کرو۔ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اسی آیت کو سن کر میرے دل میں ایمان راسخ ہوا، اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت جاگزیں ہوئی، چنانچہ میں نے خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ

وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا وَقَدْ جَعَلْتُمُ

اللّٰهَ عَلَيْكُمْ كَفِيْلًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ
بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا ۭ تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًۢا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِىَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ ۭ
اِنَّمَا يَبْلُوْكُمُ اللّٰهُ بِهٖ ۭ وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ مَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۹۲﴾

ترجمہ: اور تم اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، جبکہ تم عہد کرلو، اور اپنی قسموں کو مؤکد کرنے کے بعد مت توڑو، اور تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو ﴿۹۱﴾ اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے اپنے کاتے ہوئے کو محنت کرنے کے بعد ذرا ذرا کر کے توڑ ڈالا، تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بناتے ہو، اس وجہ سے ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھی ہوئی ہو، بات یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے ذریعے آزماتا ہے، اور یہ بات ضروری ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان چیزوں کو بیان فرمادے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے ﴿۹۲﴾

معارف ومنازل

عدل واحسان کے حکم فرمانے کے بعد ایفائے عہد کا حکم فرمایا۔ گو ایفائے عہد بھی عدل واحسان میں داخل ہے، لیکن خصوصی طور پر الگ اس کا حکم فرمایا تاکہ لوگ اسے مہتم بالشان سمجھیں، اور اپنی زندگی میں اس کا خاص خیال رکھیں، اور بدعہدی اور عہد شکنی سے ہر طرح سے پرہیز کریں، کیونکہ قرآن کریم کے نزول کے زمانہ میں عام طور پر ان چیزوں کا اہتمام نہ تھا، اور عہد و پیمان کی کوئی اہمیت نہ تھی، جدھر قوت و کثرت دیکھی ادھر جھک گئے، اور کمزور جماعت کے عہد و پیمان کو پس پشت ڈال دیا، جیسا کہ آج کل مغربی اقوام کا شیوہ ہے۔

ایفائے عہد کے متعلق سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عَنْ أَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَلَّمَا خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِلَّا قَالَ: لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهٗ وَلَا دِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ. [مشكوة بحواله شعب الايمان، بيهقي]

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ بہت کم ایسا ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو خطبہ دیا ہو، اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ جس میں امانت کی خصلت نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جس میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اٰيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَاِذَا ائْتُمِنَ خَانَ. [متفق عليه] فرمایا: منافق کی تین نشانیاں ہیں: جب بات

کرے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو اس کو پورا نہ کرے، اور امانت میں خیانت کرے۔

جھوٹ، بدعہدی اور خیانت دراصل یہ منافقوں کی بنیادی خصلت اور علامت ہے، اور جس شخص میں یہ بُری خصلتیں موجود ہوں وہ خواہ عقیدہ کا منافق نہ ہو، لیکن سیرت وعمل کے اعتبار سے وہ منافق ہی ہوگا۔ صحیح مسلم میں یہ الفاظ بھی ہیں: وَاِنْ صَلّٰی وَصَامَ وَزَعَمَ أنہ مُسْلِمٌ۔ یعنی وہ آدمی اگرچہ نماز پڑھتا ہو، اور روزہ رکھتا ہو، اور اپنے کو مسلمان بھی کہتا ہو، اور سمجھتا ہو، پھر بھی ان خصلتوں کی وجہ سے وہ منافق ہی ہے۔

آج کل عہد کو توڑ دینا معمولی سی بات بن کر رہ گیا ہے۔ موجودہ سیاست کی دنیا میں تو عہد کرنا، پھر مال اور کرسی کے لئے عہد توڑ دینا نہ عیب شمار ہے، نہ گناہ، جدھر جاہ ومال کا فائدہ نظر آیا ادھر ڈھل گئے، نہ اسلامی اقدار کا لحاظ، نہ اللہ تعالیٰ کا خوف، دوسرے ملکوں کے غیر مسلموں سے بھی پیچھے ہیں، اور زیادہ آزاد خیال بھی۔ پتہ نہیں کہ ایسے لوگ صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ کو مانتے بھی ہیں یا نہیں۔ ایسے لوگوں کی پوری زندگی اسلامی اعمال کی خوشبوؤں سے سراسر خالی نظر آتی ہے۔ الیکشنوں سے پہلے اتنے بڑے لمبے چوڑے عہد ومیثاق کرتے ہیں کہ شاید دھرتی ان کے اٹھانے سے معذرت خواہ ہو، کامیابی کے بعد کسی وعدے کا پاس نہیں کرتے، بلکہ لوگوں کی شناخت سے بھی لاپرواہ رہتے ہیں۔

اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وزراء اور بڑے بڑے لوگ جو اللہ تعالیٰ عَزَّ مَجْدُہٗ کا نام لے کر حلف اٹھاتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے، اور مسلمانوں کے ملک کے لئے صدق ودیانت کے ساتھ، ہمدردانہ طور پر بے لوث کام کریں گے، تو وہ اپنے حلف میں کس قدر پورا اترتے ہیں؟ جاننے والے خوب جانتے ہیں۔ ملک اور قوم کے مفاد کی بجائے صرف اپنی کرسی اور منصب کی فکر میں رہنا، اور اپنی جماعت اور اپنے رشتہ داروں کو نوازنا، اور سرکاری نوکریوں کو بلاخوف وخطر بیچنا، اور لوگوں سے پیسہ وصول کرنا، یہ ایسے لوگوں کا حال ہے جو اسلام کے دعویدار ہیں۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو بھی کوئی شخص مسلمانوں میں سے کچھ لوگوں کا والی بنا (یعنی ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لے لی) پھر وہ اس حال میں فوت ہوگیا کہ وہ ان کے بارے میں خائن تھا، تو اس پر اللہ تعالیٰ نے جنت حرام کردی۔ [مشکوٰۃ باب الإمارۃ]

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے کہ قیامت کے دن عہد شکنی کرنے والے شخص کی پشت پر ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا، جو میدانِ حشر میں اس کی رسوائی کا سبب بنے گا، اور فرشتے اس کی نشاندہی کر کے کہیں گے: یہ فلاں بن فلاں کی خیانت کا جھنڈا ہے۔ [بخاري]

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾ اور تم اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرو، جب تم عہد کرلو۔ تم نے ازل کے روز جو عہد کیا تھا، اطاعت اور فرمانبرداری کا، خواہ وہ حقوق اللہ کے متعلق ہوں یا حقوق العباد کے متعلق، اس کو ضرور پورا کرو۔

﴿وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْكِیْدِهَا﴾ اور اپنی قسموں کو مؤکد و پختہ کرنے کے بعد مت توڑو۔ جب بغیر قسم کے عہد کا پورا کرنا لازم ہے، تو قسم والا بطریق اولیٰ ضروری ہے۔

﴿وَقَدْ جَعَلْتُمُ اللّٰهَ عَلَیْكُمْ كَفِیْلًا﴾ اور تم اللہ تعالیٰ کو اپنے اوپر گواہ بنا چکے ہو۔ جب تم نے قسم کھا کر اللہ تعالیٰ کو گواہ بھی بنالیا تو عہد کا پورا کرنا اور زیادہ لازم ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ شانہ سب کچھ جانتا ہے، تم گواہ نہ بناتے تو وہ تب بھی گواہ تھا، لیکن خود سے جو اللہ کو گواہ بنایا، اس کا خیال رکھنا اور زیادہ لازم ہوگا۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا﴾ اس پاگل عورت کی طرح نہ ہوجاؤ جس نے اپنا سوت کاتنے کے بعد ریزہ ریزہ کرکے نوچ ڈالا۔ غَزْل گھٹی تنا ہوا کاتنا اور مضبوط کرنا۔ اَنْكَاثًا نکث کی جمع ہے، ریزہ ریزہ، کھلے ہوئے۔ بعض مفسرینؒ نے فرمایا ہے کہ یہ بطور تمثیل ہے، اور مطلب یہ ہے کہ اگر تم عہد و میثاق کرکے اسے توڑو گے تو اس عورت کی طرح ہوجاؤ گے کہ محنت کرکے چرخہ پر سوت کاتنے کے بعد اس کو ریزہ ریزہ کرکے کھول دے، اور نوچ ڈالے۔

لیکن دیگر مفسرینؒ نے فرمایا کہ سعیدہ یا ریطہ نامی مکہ مکرمہ میں ایک پاگل عورت تھی جو کہ پورے دن شام تک اون اور پشم کات کر چرخہ چلاتی، مضبوط دھاگے تیار کرکے شام کو انہیں کھول کر ریزہ ریزہ کرکے نوچ ڈالتی۔ واضح رہے کہ یہ حکم عام ہے، مثلاً کوئی عبادت بجالانا، پھر اُسے فاسد کرکے ضائع کرنا، یا کسی دینی یا دنیوی کام کرکے اسے خراب کرنا، یہ سب کو شامل ہے، اور یہ ممنوع ہے۔

﴿تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَیْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِیَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ﴾ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد ڈالنے کا ذریعہ بناتے ہو، اس وجہ سے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھی ہوئی ہو۔ دَخَل دھوکہ، بگاڑ، فریب، خیانت وغیرہ۔ اَرْبٰى مال کی زیادتی، افرادی قوت کی کثرت۔ امام مجاہدؒ نے فرمایا کہ دورِ جاہلیت میں عرب کا دستور تھا کہ قبائل کی آپس میں دشمنیاں اور عداوتیں چلتی تھیں، جس کی وجہ سے اپنے بچاؤ اور حفاظت کے لئے ایک قبیلہ کسی دوسرے قبیلہ سے دفاعی معاہدہ کرلیتا تھا کہ جب کوئی قبیلہ ہم میں سے کسی پر حملہ کرے گا تو دونوں اتحادی قبیلے مل

کر دفاع کریں گے، اور حملہ آور قبیلہ سے جنگ کریں گے۔ جب معاہدہ کرنے کے بعد محسوس کرتے تھے کہ جس قبیلہ سے ہم نے معاہدہ کیا ہے وہ مال اور عدد کے اعتبار سے کمزور ہے تو اس سے معاہدہ کو توڑ کر کسی دوسرے قبیلہ سے معاہدہ کر لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے اس طرح کرنے سے منع فرمایا، اور پہلے قبیلہ سے جو قسم کھا کر معاہدہ کیا تھا اس معاہدہ کے توڑنے کو ﴿دَخَلًا بَيْنَكُمْ﴾ سے تعبیر فرمایا کہ یہ چیز آپس میں فساد برپا کرنے والی ہے۔

﴿إِنَّمَا يَبْلُوكُمُ اللَّهُ بِهِ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کے ذریعہ آزماتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی جماعت سے معاہدہ کرنے کے بعد زیادہ تعداد والی دوسری جماعت سامنے آجانے پر پہلی جماعت کے معاہدہ کو توڑ کر دوسری بڑی تعداد والی جماعت سے معاہدہ کرتے ہو، یا پرانے معاہدہ پر قائم رہتے ہو، اس میں تمہاری آزمائش ہوتی ہے۔ سورۂ انفال میں ایک نکتہ بیان ہوا کہ معاہدہ کے بعد اگر اندیشہ ہو کہ معاہدہ والا دوسرا فریق دھوکہ دینے والا ہے، اور شدید خطرہ ہے کہ وہ نقضِ عہد کرے گا، اور اس کے ساتھ معاہدہ باقی رکھنا خلافِ مصلحت معلوم ہوتا ہے تو فرمایا: ﴿وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ﴾ [الأنفال: ٥٨] (اور اگر تمہیں کسی قسم سے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تم وہ معاہدہ ان کی طرف صاف سیدھے طریقے سے پھینک دو)۔

﴿وَلَيُبَيِّنَنَّ لَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ﴾ اور یہ بات ضروری ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ شانہ ان چیزوں کو بیان فرمادے گا جن میں تم اختلاف کرتے تھے۔ قیامت کے روز سارے کرتے دھرتے کھل کر سامنے آئیں گے، پوشیدہ کچھ بھی نہیں رہے گا، اچھے کام کرنے والے جزاء خیر پائیں گے، اور نافرماں اپنی نافرمانیوں کی سزا بھگتیں گے، اور عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

❀ ❀ ❀

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَٰكِنْ يُضِلُّ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلَتُسْأَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾ وَلَا تَتَّخِذُوا أَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ فَتَزِلَّ قَدَمٌ بَعْدَ ثُبُوتِهَا وَتَذُوقُوا السُّوءَ بِمَا صَدَدْتُمْ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلَكُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٩٤﴾ وَلَا تَشْتَرُوا بِعَهْدِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۚ إِنَّمَا عِنْدَ اللَّهِ هُوَ خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٩٥﴾

ترجمہ: اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک جماعت بنا دیتا، لیکن وہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے، اور تم جو اعمال کرتے تھے ان کے بارے میں تم سے ضرور باز پرس ہوگی ﴿۹۳﴾ اور اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد ڈالنے کا ذریعہ نہ بناؤ کہ جمنے کے بعد قدم پھسل جائے، اور تم اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنے کا عذاب چکھو، اور تمہارے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۹۴﴾ اور اللہ تعالیٰ کے عہد کے عوض تھوڑی قیمت حاصل نہ کرو، بلاشبہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، وہ تمہارے لئے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو ﴿۹۵﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیت میں اختلاف کا ذکر ہوا۔ دراصل یہ موجودہ آیت اس کے لئے بمنزلہ دلیل ہے، کیونکہ یہی اللہ تعالیٰ کی کمال حکمت ہے کہ سب لوگ کسی طرح ایک جیسے نہیں، کوئی مؤمن ہے، کوئی کافر، کوئی منافق، کوئی نیک اور کوئی بد، اسی کو فرمایا: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ [هود:١١٨] (اور اگر آپ کا ربّ چاہتا تو سارے لوگوں کو ایک گروہ بنا دیتا)۔ یہ آیت کریمہ کئی مقامات پر مکرر ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ایک ہی اُمت یا ایک ہی جماعت بنا دیتا، مگر یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے۔ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿وَلَوْ شَاءَ اللهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى﴾ [الأنعام:٣٥] (اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا)۔

مگر یہ جبری ہدایت ہوتی، جو اس کی منشاء کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہدایت اور گمراہی خود انسان کی صوابدید پر رکھی ہے، ایمان وہی قابلِ قبول ہوگا جو وہ اپنی رضا ورغبت سے اختیار کرے گا، اور اگر کفر کا راستہ اختیار کرے گا تو عند اللہ مجرم ہوگا، جب سب کو ایک جماعت نہیں بنایا تو اس کی حکمت ہے۔

﴿وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَاءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ﴾ بلکہ وہ جسے چاہتا ہے گمراہی کے راستے پر ڈال دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے ہدایت کے راستے پر ڈال دیتا ہے۔ پہلی گمراہی کا بیان یہ ہے کہ گمراہ وہ ہوتا ہے جو کبر وغرور، ہٹ دھرمی اور ظلم وزیادتی کی بناء پر اپنی فطری استعداد کو ضائع کر لیتا ہے، تو ایسے لوگوں کے بارے میں واضح طور پر ارشاد ہے: ﴿وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ [المائدة:١٠٨] (اللہ تعالیٰ نافرمانوں کو ہدایت نہیں دیتا)۔ ﴿وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ [الجمعة:٥] (اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا)۔ ﴿إِنَّ اللهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ [المائدة:٦٧] (اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نصیب نہیں کرتا)۔ اور ایسے لوگوں کے لئے عمومی فرمان یہ

ہے کہ: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾[البقرة:۷] (اللہ نے مہر لگا دی ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے)۔ اور ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ [النساء:۱۵۵] (بلکہ اللہ نے ان پر مہر لگا دی ہے ان کے کفر کی وجہ سے)۔ ﴿كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾[المطففين:۱۴] (ہرگز نہیں، بلکہ جو عمل یہ کرتے رہے ہیں اس نے ان کے دلوں پر زنگ چڑھا دیا ہے)۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر مہربان ہے، ﴿وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ﴾[یونس:۲۵] (اللہ انہیں ہدایت اور جنت کی طرف دعوت دیتا ہے) وہ ہرگز بلا وجہ کسی کے دل پر مہر لگوا کر اُسے ہدایت سے محروم نہیں کر دیتا، اور نہ ہی کسی کو ایمان سے محروم کر دیتا ہے۔ اس نے اسی ہدایت وایمان ہی کی خاطر ہزاروں انبیاء علیہم السلام کو مبعوث کیا، اور ایمان اس کو ہر چیز سے محبوب ہے، اور کفر اس کے نزدیک مبغوض ہے، اور اس کی صفت عدل اسی کا متقاضی ہے کہ وہ بلا وجہ کسی کو جہنمی نہ بنائے۔ ہاں! ان لوگوں نے ہدایت کو چھوڑ کر اپنی سرکشی کی بنیاد پر اپنے قلوب پر مہر لگوائی، تب وہ ہدایت سے محروم ہوئے، اپنی حماقت سے۔

اب ہدایت کا مطلب ﴿وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ اور وہ جسے چاہتا ہے ہدایت کے راستے پر ڈال دیتا ہے، کیونکہ جو شخص ہدایت کا طالب اور متلاشی ہو، فسق ومعاصی سے منحرف ہو، کبر وغرور وسرکشی سے نفرت کرتا ہو، تو ان باتوں کا نتیجہ یہی ہوگا کہ اس کو ہدایت وایمان کی دولت نصیب ہو۔ مختصر یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور کے رسولوں علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہتا ہے اسے ہدایت مل جاتی ہے، اور جو شخص اس دعوت کو مسترد کرتا ہے تو اسے کفر مل جاتا ہے۔ یہ انتخاب بندوں کے اپنے اختیار پر موقوف ہے، ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾[الكهف:۲۹] (جو چاہے ایمان لائے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے)۔ یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ ہدایت کا طالب ہدایت سے محروم ہو۔ اگر یہ کفار ہدایت کے متلاشی ہوتے تو انہیں ہدایت ضرور نصیب ہو جاتی، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔

﴿وَلَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ اور تم سے ضرور سوال ہوگا ان کاموں کے متعلق جو تم کیا کرتے تھے، اور وہاں تمہارا کوئی عذر نہیں سنا جائے گا۔

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اَيْمَانَكُمْ دَخَلًاۢ بَيْنَكُمْ﴾ کہ اپنی قسموں کو اپنے درمیان فساد کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس مضمون کو بطور تاکید دوبارہ ذکر فرمایا، اور ساتھ ساتھ اس کا نتیجہ بھی ذکر فرمایا:

﴿فَتَزِلَّ قَدَمٌۢ بَعۡدَ ثُبُوتِهَا﴾ کہ اس کی وجہ سے قدم جمنے اور قرار پکڑنے کے بعد پھسل جائے گا، جس کا نتیجہ سوائے بداعتمادی کے اور کچھ نہیں ہوگا، اور آئندہ کوئی تم پر کسی طرح اعتماد بھی نہیں کرے گا، اور کوئی تمہارا حامی بھی نہیں ہوگا، خاص کر غیر مسلم لوگ، جو تمہارے اخلاق و اعمال اور عہد و پیمان کے ایفاء سے متاثر ہو کر ایمان قبول کرتے ہیں، پس ایسی صورت میں جب تم بدعہدی کا مظاہرہ کرو گے تو وہ تمہاری وجہ سے اسلام سے بیزار اور دور رہیں گے، پس انہیں گویا تم نے اسلام سے روکا، یہ گناہ بھی تم پر عائد ہوگا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿وَتَذُوقُوا السُّوٓءَ بِمَا صَدَدتُّمۡ عَن سَبِيلِ اللّٰهِ﴾ اور تم اس وجہ سے سزا کا مزہ چکھو گے کہ تم نے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا۔

﴿وَلَكُمۡ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ اور تم بہت بڑے عذاب میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ عذاب دنیا میں بھی ہو، اور آخرت میں بھی۔ [روح المعاني] کیونکہ جو شخص عہد شکنی کرے گا، وہ لوگوں کے لئے نمونہ اور مثال بن جائے گا، اور دوسروں کے لئے نقضِ عہد کا راستہ ہموار کرے گا، جس کا گناہ بھی عظیم ہے، اور عذاب بھی عظیم ہوگا۔ [معالم التنزيل] رہا یہ کہ لوگ بدعہدی اور عہد شکنی کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں؟ تو اس پر تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَا تَشۡتَرُوا بِعَهۡدِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيلًا﴾ اور نہ خرید و اللہ تعالیٰ کے عہد کے ذریعہ تھوڑی قیمت۔ اللہ تعالیٰ نے جس چیز سے منع فرمایا دراصل عہد شکنی کی علت و اسباب کی یہی نشاندہی فرمائی کہ تم اللہ تعالیٰ کے قیمتی عہد کو توڑتے ہو، اس کا سبب حطام دنیا کی حرص اور لالچ ہے۔ اکثر و بیشتر یہی ہوتا ہے کہ مال اور دیگر بہت سی چیزوں کے لالچ کی وجہ سے لوگ عہد شکنی کرتے ہیں، اور بتادیا کہ دنیا اور دنیوی ساز و سامان جس کی خاطر تم عہد شکنی کرتے ہو، یہ جتنا بھی زیادہ ہو آخرت کے مقابلے میں، اور تمہارے ایفائے عہد کے ثواب کے مقابلے میں قلیل اور حقیر ہے، لہٰذا تم بجائے اس حقیر مال کے اگر تم وعدہ خلافی سے بچ کر اللہ تعالیٰ کے ثواب و اجر کی اُمید رکھو تو تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہوگا۔ فرمایا:

﴿إِنَّمَا عِندَ اللّٰهِ هُوَ خَيۡرٌ لَّكُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ کے ہاں عہد کے پورا کرنے کا جو ثواب ہے، وہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے، پس اسی کا انتظار کرو، اور ثمنِ قلیل جو کہ ایک قسم کی رشوت ہے، اس سے پرہیز کرو۔ فرمایا:

﴿إِن كُنتُمۡ تَعۡلَمُونَ﴾ اگر تم جانتے ہو، عہد و پیمان پورا کرنے کی صورت میں گناہ سے بچو گے، اللہ تعالیٰ

کے نام کا احترام بھی ہوگا، لوگوں کا تم پر اعتماد بحال ہوگا، اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنے کے جرم سے بھی بچو گے، اللہ تعالیٰ کے ہاں بہتر اجر بھی پاؤ گے۔ یہ پانچ چھ فائدے تمہیں حاصل رہیں گے، اگر تم جانتے ہو۔

مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَلَنَجۡزِيَنَّ الَّذِيۡنَ صَبَرُوۡۤا اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ
مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿٩٦﴾ مَنۡ عَمِلَ صَالِحًا مِّنۡ ذَكَرٍ اَوۡ اُنۡثٰى وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ
حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَجۡرَهُمۡ بِاَحۡسَنِ مَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿٩٧﴾

ترجمہ: تمہارے پاس جو کچھ ہے ختم ہو جائے گا، اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے، اور جن لوگوں نے صبر کیا، ہم انہیں ضرور بضرور ان کے اچھے کاموں کا عوض دیدیں گے ﴿٩٦﴾ جس کسی مرد یا عورت نے نیک عمل کیا اس حال میں کہ وہ مؤمن ہے تو ہم اسے ضرور اچھی پاکیزہ زندگی دیں گے، اور ان کے اچھے کام کے عوض ہم انہیں ان کا اجر ضرور دیں گے ﴿٩٧﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں عہد و پیان کو پورا کرنے کی سخت تلقین فرمائی تھی، اور اپنی قسموں کے ذریعہ حقیر مال حاصل کرنے کی مذمت فرمائی، اب اللہ تعالیٰ اس مال کی حقیقت بیان فرمارہے ہیں جو عہد شکنی کے ذریعہ کمایا جاتا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿مَا عِنۡدَكُمۡ يَنۡفَدُ وَمَا عِنۡدَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ جتنی بھی دنیا کماؤ گے وہ ایک دن ختم ہو جائے گی، اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آخرت میں انعام ملے گا، اور وہاں جو اکرام و اعزاز ملے گا وہ سب باقی رہنے والا ہے۔ جس مال کی خاطر تم نے جو جھوٹی قسمیں اٹھائیں، یا کسی اعزاز و دنیوی منفعت کی خاطر عہد شکنی کا ارتکاب کیا، اور عہد توڑا وہ ختم ہو جائے گا، اور تمہارے پاس نہیں رہے گا۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ لفظ "ما" عام ہے، اور اس سے صرف مال دولت ہی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہر چیز زندگی کی صحت، زمین، مکان، باغات، کھیتیاں، کارخانے وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ تمہیں اس دنیا سے بالآخر ایک دن جانا ہے، پھر تمہارے پاس کچھ بھی نہیں رہے گا، اور تم اکیلا سفر کرو گے، دنیا کی چیزوں میں سے کوئی

کچھ ساتھ لے کر نہیں جاؤ گے۔ خالی ہاتھ آئے تھے خالی ہاتھ گناہوں کا بوجھ لے کر جاؤ گے۔

﴿وَمَا عِندَ اللّٰهِ بَاقٍ﴾ اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ ہر چیز کا والی، وارث اللہ تعالیٰ ہی ہے، یہ سارے خزانے اسی کے ہیں، تم چار روزہ چوکیدار رہ کر غرور سے چوہدھری بنے ہوئے تھے۔ انسان کا ایمان، علم، نیکی، اخلاص، خضوع وخشوع، طہارت، اعمالِ صالحہ، تقویٰ، سب اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچتے ہیں، اور محفوظ رہتے ہیں، ان میں سے کوئی ذرہ ضائع نہیں ہوتا، لہٰذا دنیا کی فانی اور ناپائیدار چیزوں کی خاطر اپنی باقی، دائمی، ابدی، قیمتی چیزوں کو ضائع نہ کرو۔ فانی چیزوں کے لئے دائمی نعمتوں سے محروم رہنا کوئی دانشمندی نہیں، بلکہ جہالت اور نادانی ہے۔ تمام گناہوں اور غیر شرعی امور سے اجتناب کرو، صبر کرو، اس لئے صبر کا حکم دے دیا:

﴿وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوٓا أَجْرَهُم﴾ ہم صبر کرنے والوں کو ضرور ان کا اجر عطاء کریں گے، جنہوں نے ایفائے عہد یا دوسرے معاملات پر صبر کے تلخ ومشکل جام نوش کیے، اور ہمارے حکموں کا پاس رکھا۔ آج انہیں دوہرے انعامات سے نوازیں گے۔

﴿بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ ان بہتر اور شرعی کاموں کے بدلے میں جو وہ انجام دیتے رہے، اور یہ اجر بہرصورت ان کے اعمال سے بہتر ہوگا، اور یہ بات باعث مسرت ہے کہ اس اجر کی خوبی کا حسن وکمال اللہ تعالیٰ خود بیان فرما رہے ہیں۔ کبھی مؤمن کی نیکی کا ثواب دس گنا، اور کبھی سات سو گنا۔ [بخاري] اور کبھی بیس لاکھ گناہ ہوتا ہے۔ [درمنثور از ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ]

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّن ذَكَرٍ أَوْ أُنثَىٰ﴾ جس شخص نے نیک عمل کیا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ یہ قانون کتنا اہم اور خوش کن ہے کہ نیک اعمال کے صلہ وبخشش، اجر وثواب میں مرد وزن میں کوئی تفاوت نہیں، ہر صنف کو اس کے اعمال کا پورا پورا ثواب ملے گا۔ نزولِ قرآن کریم کے زمانے میں بعض عورتوں کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ ہر میدان میں مرد ہی پیش پیش ہیں، اور ہر مقام پر ان کا تذکرہ ہے، حالانکہ ہم بھی نصف انسانیت ہیں۔ تو ان کے اس تردد کے جواب میں قرآن پاک کے مختلف مقامات پر مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کی پہلی مثال تو یہی آیت ہے، جس میں مردوں کے ساتھ عورتوں کا بھی ذکر ہے۔

سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ﴾ [النساء: ۳۵] (مردوں کے لیے حصہ ان اعمال کا جو انہوں نے کیے ہیں، اور عورتوں کے لیے حصہ ان اعمال کا جو انہوں نے

کیے ہیں)۔ پھر یہ بھی فرمان الٰہی ہے: ﴿وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنۡ ذَکَرٍ اَوۡ اُنۡثٰی﴾ [النساء: ۱۲۴] (اور جو نیکی کا عمل کرے گا مرد ہو یا عورت ہو)۔ اور سورۂ احزاب، آیت ۳۵ میں بڑی تفصیل کے ساتھ دونوں صنفوں کا قاعدہ امتزاج کے ساتھ، نہایت پیارے انداز میں، مسرت افزا تذکرہ ہے: ﴿اِنَّ الۡمُسۡلِمِیۡنَ وَ الۡمُسۡلِمَاتِ﴾ سے لے کر ﴿اَجۡرًا عَظِیۡمًا﴾ تک۔ اسی طرح سورۂ نور میں بھی چند مقامات پر مسلمان مردوں اور مسلمان عورتوں کا یکساں تذکرہ ہے۔

﴿وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَنُحۡيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ بشرطیکہ وہ مؤمن ہو۔ اس میں یہ بتادیا کہ حیاتِ طیبہ دنیاوی و اخروی ان ہی بندوں کے لئے ہے جو حالت ایمان میں عملِ صالح کرتے ہوں۔ حالت کفر کا کوئی عمل اگرچہ پہاڑوں کے برابر کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کے ہاں قابل قبول نہیں، یہی تو بنیادی فرق ہے کہ مسلمان کے آدھی صدقہ کی ہوئی کھجور کا ثواب پہاڑوں کے برابر ہوگا، جبکہ کافر کے پہاڑ برابر صدقہ کا ثواب ذرہ برابر بھی نہ ہوگا۔ البتہ کفار کے نیک اعمال کا بدلہ انہیں دنیا میں ضرور مل جائے گا۔

حَيٰوةً طَيِّبَةً، اچھی زندگی:

اس آیت میں کم نظر اور دنیادار لوگوں کی غلط فہمی کا پورا پورا جواب دیا گیا ہے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی، دیانت اور پرہیزگاری کی روش اختیار کرنے سے آدمی کی آخرت تو بن جاتی ہے، مگر اس کی دنیا بگڑ جاتی ہے۔ ربّ العزّت سبحانہ نے ایسے لوگوں کے وساوس کا جواب دے کر ان کی غلط فہمی دور فرمادی کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ دینداری، تقویٰ اور سچائی سے محض آخرت نہیں بنتی، بلکہ دنیا بھی بنتی ہے، جو لوگ حقیقت میں ایماندار، متقی اور پاکباز ہوتے ہیں ان کی دنیوی زندگی بھی دنیادار اور بدعمل لوگوں کے مقابلہ میں صریحاً بہتر اور مثالی رہتی ہے۔ جو ساکھ اور سچی عزّت اور بے داغ سیرت و اخلاق اور اتباعِ شریعت کی وجہ سے انہیں نصیب ہوتی وہ دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی، جو ستھری اور پاکیزہ کامیابیاں انہیں حاصل ہوتی ہیں وہ ان لوگوں کو میسر نہیں آتیں جن کی ہر کامیابی گندے اور گھناؤنے طریقوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔

وہ بوریا نشین ہو کر بھی قلب کے جس اطمینان اور ضمیر کی جس ٹھنڈک و سکون سے سرشار و بہرہ مند ہوتے ہیں اس کا کوئی ادنیٰ سا حصہ بھی محلوں اور بنگلوں میں رہنے والے فساق و فجار نہیں پا سکتے۔ ان سرمایہ داروں کے پاس ہے کیا؟ سوائے ﴿فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا﴾ [طٰہٰ: ۱۲۴] (بیشک اس کے لیے تنگ زندگی ہے) کے، جنہیں نہ رات کا

آرام نصیب ہے، نہ دن کا سکون، جبکہ پاکباز، دیندار لوگوں کے اطمینان وسکون پر انہیں رشک آتا ہے۔تارکِ دنیا بزرگوں نے فرمایا ہے کہ جولذّت وراحت، اور سکون قلب دنیا میں متقی، پرہیزگار، نماز گزاروں کو حاصل ہے، اگر بادشاہوں اور امیروں کو اس کا علم ہوجاتا تو وہ دینداروں پر رشک کرتے۔

﴿حَیٰوۃً طَیِّبَۃً﴾ (اچھی زندگی) سے مراد کیا ہے؟ اس کے بارے میں علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے قناعت مراد ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے طاعات کی توفیق دینا مراد ہے۔ تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے جنت مراد ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت مراد ہے، اور قیامت میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں مقعد صدق کی سعادت مراد ہے۔ پانچواں قول یہ ہے کہ غیر اللہ سے بے نیازی اور استغناء مراد ہے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ اس سے رضا بالقضاء مراد ہے، وغیرہ وغیرہ۔

ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ مؤمن بندوں کی زندگی تعلق مع اللہ تعالیٰ کی وجہ سے جنتی زندگی کا پرتو اور نمونہ ہوتی ہے۔ سکون واطمینان، صبر وشکر، استلذاذ بالطاعات میں اتنے منہمک ہوتے ہیں کہ لطف وسرور سے سرشار رہتے ہیں۔ فقر وفاقہ اور بیماریوں، تکلیفوں، پریشانیوں کو ہضم کرتے ہوئے رات دن سربسجود رہتے ہیں، اور حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ پڑھتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی جنت نما زندگی کا حصول کہاں سے، اور کس طرح ممکن ہے؟ تو رحیم وکریم جل شانہ نے خود نسخہ بتادیا، جو یہ ہے:

فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ﴿۹۸﴾ اِنَّہٗ لَیْسَ لَہٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ ﴿۹۹﴾ اِنَّمَا سُلْطٰنُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ وَالَّذِیْنَ ہُمْ بِہٖ مُشْرِکُوْنَ ﴿۱۰۰﴾

ترجمہ: سو آپ جب قرآن پڑھنے لگیں تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگ لیا کریں ﴿۹۸﴾ بلاشبہ بات یہ ہے کہ شیطان کا زور ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان لائے، اور اپنے ربّ پر بھروسہ رکھتے ہیں ﴿۹۹﴾ اس کا زور ان پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک تجویز کرتے ہیں ﴿۱۰۰﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں یہ بتایا جارہا ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حیاتِ طیبہ دنیاوی اور اُخروی کا جو وعدہ فرمایا ہے اس کا حصول تب ممکن اور آسان ہوگا جب بندہ کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہر وقت قائم ہو، اس کی

صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر مکمل بھروسہ ہو، اور قرآن حکیم کے ساتھ ربط ہو، پھر ان دونوں میں جو رکاوٹ ہے، یعنی شیطان اس سے مکمل بیزاری ہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پناہ کی طلب کے ساتھ شیطان سے استعاذہ ہو، وَھُوَ الْمُرَادُ۔ روزِ ازل سے جب شیطان کے مردود ہونے کا فیصلہ ہو چکا ہے، وہاں ابلیس نے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر بڑی دلیری سے اظہار کر چکا ہے کہ میں بنی آدم کے آگے پیچھے، دائیں بائیں سے آ کر اسے گمراہ کروں گا، وہ اپنے اس وعدے پر تا قیامِ قیامت قام رہے گا۔

انسان ویسے تو خود ضعیف و کمزور ہے، جب یہ چالاک اور طاقتور دشمن ہر موقعے پر، ہر وقت اس کے پیچھے لگا رہے گا تو یہ خطرہ ہر وقت موجود رہے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چالباز دشمن اُسے نعمت ایمان سے، اور اس پر مرتب حیاتِ طیبہ سے محروم نہ کر بیٹھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا علاج اور تدبیر بتا دی کہ تم اللہ تعالیٰ کی محکم اور مضبوط پناہ کی تلاش میں رہو، اور شیطان کی شرارتوں سے بچنے کی خاطر اس کی پناہ میں آ کر اپنی حفاظت کا سامان تیار کرو۔

انسان کے ساتھ شیطان کی دشمنی کے تین اسباب وذرائع ہیں، اور تینوں خطرناک ہیں:

پہلا یہ کہ شیطان بے رحم طاقتور دشمن ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ نظر نہیں آتا، چھپا ہوا ہے۔ تیسرا یہ کہ بدنِ انسانی میں پہلے سے نفسِ امارہ جو کہ شیطان کا معاون و مددگار ہے موجود ہے، پس ان وجوہات کے پیش نظر اس کا مقابلہ بڑا سخت اور مشکل ہے، اس لئے فرمایا کہ تم جب اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے اس کی پناہ میں آ جاؤ گے تو تمہارا تحفظ فرما کر شیطانی حربوں سے تمہیں بچائے گا۔ اس طرح تم سلامت رہو گے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی اس نعمت تحفظ کا جتنا شکر ادا کیا جائے پھر بھی کم ہے۔

یہاں تعوّذ کا تعلق اگرچہ تلاوت قرآن کے ساتھ خاص ہے، مگر اللہ تعالیٰ شانہ کی پناہ محکم میں آنے کا حکم عام ہے کہ جب بھی اگر تمہیں وسوسوں اور بُرے خیالات سے واسطہ پڑے، یا کسی غفلت میں پھنس جاؤ، یا کسی بُرے مکان میں، یا بُری مجلس سے واسطہ پڑے تو صدق دل سے استعاذہ کرو۔ سرورِ عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب بیت الخلاء جانے کا ارادہ ہو تو استعاذہ کر کے یہ دعا پڑھو: اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ۔ [متفق علیہ] اس لئے کہ شیاطین اکثر ناپاک جگہوں میں رہائش رکھتے ہیں، اور محض یہ نہیں، بلکہ سیکڑوں شر اور برائیوں سے آپ ﷺ نے استعاذہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ حدیث شریف کی کتابوں میں اور دعاؤں کی کتابوں میں بے شمار چیزوں سے پناہ مانگنے کی دعوات ماثورہ موجود ہیں، چاہئے کہ التزام و پابندی کے ساتھ ان کی تلاوت کا اہتمام ہو۔ اس

مضمون کو تفصیل کے ساتھ سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ معوّذتین کی تفسیر میں بھی مفصّل لکھا جائے گا۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

آیت کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کا ارادہ ہو تو پہلے اپنے دل کو شیطانی خیالات سے پاک کر کے اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم پڑھ کر فوراً بِسْمِ اللہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیمِ پڑھ کر اپنے دل کو اللہ تعالیٰ کے نام سے مزیّن کرلے، اور اس کی رحمت کا استحضار کر کے زبان پاک کرلے۔

مسئلہ:

تلاوت کے شروع میں ایک بار اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم پڑھنا کافی ہے، البتہ اگر تلاوت کے دوران یا بعد میں کوئی ایسی بات کرے جو تلاوت سے متعلق نہ ہو تو دوبارہ اَعُوْذُ بِاللہِ پڑھے۔

مسئلہ:

اَعُوْذُ بِاللہِ پڑھنا صرف تلاوت کے ساتھ مخصوص ہے، کسی حدیث یا دعاء یا عربی عبارت پڑھنے پر اَعُوْذُ بِاللہِ نہ پڑھے۔ سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: ﴿وَاِمَّا یَنۡزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیۡطٰنِ نَزۡغٌ فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ﴾ [الأعراف: ۲۰۰] (اگر آپ کو شیطان کی طرف سے کوئی وسوسہ آنے لگے، تو اللہ تعالیٰ کی پناہ لیجئے، بیشک وہ سننے والا جاننے والا ہے)۔ سورۂ مؤمنون میں فرمایا: ﴿وَقُلۡ رَّبِّ اَعُوۡذُ بِكَ مِنۡ هَمَزٰتِ الشَّیٰطِیۡنِ ۙ وَاَعُوۡذُ بِكَ رَبِّ اَنۡ یَّحۡضُرُوۡنِ﴾ [المؤمنون: ۹۸] (اور آپ یوں دعا کیجئے کہ اے میرے ربّ! میں شیطان کے لگائے ہوئے چرکوں سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، اور اے میرے ربّ! میں اس بات سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ شیاطین میرے پاس آئیں)۔ اگر غصہ آجائے، یا اور کوئی بُری چیز سامنے آجائے، یا گدھے اور کتے کی آواز سنے تو اَعُوْذُ بِاللہِ مِنَ الشَّیطٰنِ الرَّجِیم پڑھ لے۔ [مشکوٰۃ]

﴿اِنَّهٗ لَیۡسَ لَهٗ سُلۡطٰنٌ عَلَی الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَلٰی رَبِّهِمۡ یَتَوَكَّلُوۡنَ﴾ بلا شبہ بات یہ ہے کہ شیطان کا زور ان لوگوں پر نہیں ہے جو ایمان لاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں۔ شیطان تو ہر لحہ بغیر کسی توقف کے لوگوں کو گمراہ کرنے اور ورغلانے میں مصروف رہتا ہے، مگر کامل ایمان والوں پر، اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے والوں پر اس کا زور نہیں چلتا۔ بالفرض اگر ان سے غیر اختیاری طور پر کوئی گناہ کا صدور ہوا تو فوراً توبہ کر کے شیطان کے شر سے بچ جاتے ہیں، جیسا کہ حضرت آدم و حضرت حواء علیہما السلام سے خطاء کا ظہور ہوا، اور وہ فوراً تائب ہوئے، اور مغفرت

پائے، اور توبہ کے ساتھ گناہ کا معاف ہونا یہ ایک عظیم انعام ہے۔

﴿اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ﴾ اس کا زور ان پر ہے جو اس سے دوستی رکھتے ہیں، اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک مانتے ہیں۔ شیطان کے سب سے بڑے دوست وہ لوگ ہوتے ہیں جو کافر اور مشرک ہوتے ہیں۔ دوسرے درجے میں وہ فاسق وفاجر مسلمان جو نیکیوں سے دور رہتے ہیں، اور گناہوں میں لت پت رہتے ہیں، جن کے ہاں مذہبی آزادی کا دور دورہ ہے، اور اتباعِ شریعت کا کوئی داعیہ نہیں ہوتا۔

ہمارے اس معاشرے میں جتنے شیطانی اعمال وگناہوں کی بلاخوف وخطر پذیرائی ہو رہی ہے، وہ حیران کن بھی ہے، اور مایوس کن بھی ہے۔ مغربی تہذیب اور مخلوط نظامِ تعلیم نے ہمارے اچھے خاصے خاندانوں کی شرافت ومذہبی اقدار پر تیشہ چلا کر انہیں اسلام اور خاندانی شرافتوں سے مکمل بے گانہ بنا دیا۔ پھر بچا کھچا جو کچھ رہتا تھا بے پردگی اور مرد وزن کے اختلاط نے اسے اتنا ناگفتہ بنا دیا کہ اَلْاَمانُ وَالْحفیظُ۔

جن اسلامی ملکوں میں کبھی جزوی طور پر قرآن کا حکم نافذ رہتا تھا آج وہاں ابلیس لعین کا اقتدار ہے۔ پورے عالم اسلام میں کوئی ایک ملک ایسا نہیں ہے جہاں کتاب وسنت کی حکمرانی ہو۔ ہم روزِ قیامت مالکُ الملک رَبّ العٰلمین کے سامنے کس منہ، اور کس نظام کے تحت پیش ہو کر جواب دیں گے؟ معلوم نہیں ہمارا حشر کن لوگوں کے ساتھ ہوگا۔

وضع میں تو ہیں نصاریٰ اور تمدن میں ہنود ☆ یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائے یہود

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ ۭ لِسَانُ الَّذِيْ يُلْحِدُوْنَ اِلَيْهِ اَعْجَمِيٌّ وَّهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۰۳﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۙ لَا يَهْدِيْهِمُ اللّٰهُ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ اِنَّمَا يَفْتَرِي الْكَذِبَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۚ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۵﴾

ترجمہ: اور جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کی جگہ بدلتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو کچھ نازل

فرماتا ہے تو مخاطبین کہتے ہیں کہ تو تو افتراء ہی کرنے والا ہے، اکثر ان کے جاہل ہوتے ہیں ﴿۱۰۱﴾ آپ فرمادیجئے کہ اس کو روح القدس نے آپ کے ربّ کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے تا کہ ان لوگوں کو مضبوط کرے جو ایمان لائے، اور یہ کلام ہدایت ہے، اور خوشخبری ہے مسلمانوں کے لئے ﴿۱۰۲﴾ اور بلاشبہ ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ان کو ایک آدمی سکھاتا ہے، یہ لوگ جس کی طرف نسبت کرتے ہیں اس کی زبان عجمی ہے، اور یہ واضح طور پر عربی زبان سے ہے ﴿۱۰۳﴾ بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نہیں دے گا، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۰۴﴾ وہی لوگ جھوٹ کا افتراء کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں رکھتے، اور یہ لوگ واقعی جھوٹے ہیں ﴿۱۰۵﴾

معارف ومنازل

ان آیات کا ماقبل کے ساتھ کتنا عمدہ ربط ہے۔ ماقبل میں فرمایا کہ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ ہو تو ﴿فَاسۡتَعِذۡ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ﴾ یہ کوئی سرسری حکم نہیں، جیسا کہ عوام الناس کا گمان ہے، اور اس کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ بس زبان سے اَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيۡطٰنِ الرَّجِيۡمِ کہہ دیا جائے، بلکہ اس کے ساتھ فی الواقع دل میں یہ خواہش اور عملاً یہ کوشش بھی ہونی چاہئے کہ آدمی قرآن پڑھتے وقت شیطان کے گمراہ کن وسوسوں سے محفوظ رہے، غلط اور بے جا شکوک وشبہات میں مبتلا نہ ہو۔ قرآن کریم کی ہر بات کو اس کی صحیح روشنی میں دیکھے، اور لوگوں کے، یا اپنے خود ساختہ نظریات، یا باہر سے حاصل کئے ہوئے تخیلات کی آمیزش سے قرآن کریم کے الفاظ کو وہ معنی نہ پہنانے لگے جو اللہ تعالیٰ کی منشا کے خلاف ہوں۔

اس کے ساتھ آدمی کے دل میں یہ احساس بھی موجود ہونا چاہئے کہ شیطان سب سے بڑھ کر جس چیز کے درپے ہے وہ یہی ہے کہ ابن آدم قرآن کریم سے ہدایت حاصل نہ کرنے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی جب اس کتاب کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیطان اس کو بہکانے، اور اخذ ہدایت سے روکنے، اور فکر وفہم کی غلط راہوں پر ڈالنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتا ہے۔ اس لئے آدمی کو قرآن کریم کے مطالعہ کے وقت انتہائی چوکنا رہنا چاہئے، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنا چاہئے کہ کہیں شیطان کی دراندازیاں اسے اس سرچشمہ ہدایت کے فیض وبرکات سے محروم نہ کردیں۔

ہمارے تجربہ میں یہ بات آچکی ہے کہ بہت سے لوگوں نے عمر کا بڑا حصہ اسی قرآن کے مطالعہ میں صرف کیا،

مگر خالی دامن اور ہدایات وانوار سے بے بہرہ نکلے، اور خوب سمجھو، جس نے یہاں سے ہدایت نہ پائی وہ پھر کہیں سے ہدایت نہ پا سکے گا، اور یہ بھی ذہن نشین کرلو، جو کوئی اس سرچشمہ ہدایت سے گمراہی اخذ کر بیٹھا اسے پھر دنیا کی کوئی چیز اور کوئی صحیفہ گمراہیوں کے چکر سے نہ نکال سکے گی، وہ پھر کہیں کا نہیں رہے گا۔ آپ نے دیکھا اور غور کیا کہ چودہ سو سال کے عرصے میں شیعوں میں ایک حافظ قرآن آج تک پیدا نہیں ہوا، ذرا غور تو کرلو، یہ کیا ہے؟

﴿وَاِذَا بَدَّلْنَاۤ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ﴾ سرور عالم ﷺ وہ واحد عظیم ہستی ہیں کہ پوری نسل آدم میں آپ ﷺ جیسا کوئی عالی مقام و مرتبت نہ آپ ﷺ سے پہلے پیدا ہوا، نہ آئندہ قیامت تک کوئی ہوگا۔ آپ ﷺ کی موجودگی میں احکام میں نسخ ہوتا رہتا تھا، اللہ تعالیٰ نے پہلے ایک حکم دیا، پھر اسے منسوخ فرما دیا، اور اس کے خلاف دوسرا حکم دیدیا، اس کو دیکھ کر اور سن کر مشرکین اور اہل کتاب نے طنز کیا، اور خواہ مخواہ اعتراض کیا۔ یہ اعتراض مشرکین نے قبل از ہجرت و بعد از ہجرت، اور اہل کتاب نے ہجرت کے بعد خاص کر قبلہ کے معاملہ میں یہ کہتے رہے کہ محمد (ﷺ) آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے رجوع کر لیتے ہیں۔ اور اگر واقعی یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ کیوں ہوتا؟ معلوم ہوتا ہے کہ محمد (ﷺ) اپنے پاس سے بدل دیتے ہیں۔

اس کا جواب ذرا تشریح کے ساتھ دیا جا رہا ہے کہ قرآن کریم کے احکام بتدریج نازل ہوئے ہیں، اور بار بار ایک ہی معاملہ میں کچھ وقفوں سے یکے بعد دیگرے دو دو، تین تین حکم نازل ہوئے ہیں، مثلاً شراب کا معاملہ یا زنا کی سزا کا معاملہ۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم کے مختلف مقامات پر کبھی ایک مضمون کو ایک مثال سے سمجھایا گیا ہے، اور کبھی وہی مضمون سمجھانے کے لئے دوسری مثال سے کام لیا گیا ہے۔ ایک ہی قصہ بار بار آیا ہے، اور ہر مرتبہ اسے دوسرے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ ایک معاملہ کا کبھی ایک پہلو پیش کیا گیا ہے، اور کبھی اسی معاملے کا دوسرا پہلو سامنے لایا گیا ہے۔ ایک بات کے لئے کبھی ایک دلیل پیش کی گئی ہے، اور کبھی دوسری دلیل۔ ایک ہی معاملہ کے اثبات کے لئے کبھی **تذکیر بایام اللہ** سے، کبھی **تذکیر بنعمۃ اللہ** سے، کبھی تذکیر بذریعہ معاد کے واسطہ سے۔ ایک بات کبھی مجمل کہی گئی ہے، اور دوسرے مقام پر مفصل۔

یہی چیز تھی جسے کفار مکہ اس بات کی دلیل ٹھہراتے تھے کہ محمد (معاذ اللہ) یہ قرآن اپنے پاس سے مرتب کرتے ہیں۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر اس کلام کا منبع علم الٰہی ہوتا تو پوری بات بیک وقت نازل ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کوئی انسان کی طرح ناقص العلم تھوڑا ہی ہے کہ سوچ سوچ کر بات کرے، اور رفتہ رفتہ معلومات حاصل کرتا رہے، اور ایک

بات ٹھیک بیٹھتی نظر نہ آئے تو دوسرے طریقہ سے بات کرے۔ یہ تو انسانی علم کی کمزوریاں ہیں، جو تمہیں اس قرآن میں نظر آرہی ہیں۔ معاندین مشرکین کے بے جا سوالات کے یہاں چار جواب دیئے گئے، جو کہ نزول قرآن کی تدریجی مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی ہیں۔

پہلا جواب: ﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ﴾ سے۔

دوسرا جواب: ﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ﴾ سے۔

تیسرا جوب: ﴿لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ سے۔

چوتھا جواب: ﴿هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ سے۔ ایک پانچواں جواب بھی ہے، جو سورہ بقرہ میں مذکور ہوا۔ اب انہیں اسی ترتیب کے ساتھ بیان کریں گے۔ فرمایا:

﴿وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ﴾ اللہ تعالیٰ بہت زیادہ جانتا ہے جس چیز کو وہ نازل کرتا ہے۔ یہ پہلی دلیل ہے، اور تدریجاً نزول قرآن کی حکمت ومصلحت کی نشاندہی ہے۔ فرمایا: اللہ تعالیٰ کو اپنے پہلے منسوخ شدہ حکم کا بھی علم ہے، اور وہ اپنے نئے حکم یعنی ناسخ کا بھی اچھی طرح علم ہے، اور دونوں حکموں کی مصلحت وحکمت کو اچھی طرح جانتا بھی ہے۔ اور یہ جان لو کہ ناسخ ومنسوخ میں رعایت ولحاظ بندوں کے حالات کا ہوتا ہے کہ شروع میں انہیں سخت احکام کے نزول سے دقت اور تکلیف پیش آتی ہے، تو حکم میں نرمی کرتے ہیں، جب ان کی عادت پختہ ہوتی ہے، اور تحمل کا مادہ پختہ ہوتا ہے تو سخت احکام کا نزول مناسب ہوتا ہے۔

دیکھیں! مکہ میں مسلمان عددی اور سامان جنگ کی قلت دونوں لحاظ سے کمزور تھے، تو انہیں آسان حکم دیا گیا کہ: ﴿كُفُّوْۤا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾ [النساء:٧٧] (کہ اپنے ہاتھوں کو لڑائی سے روکے رکھو، صرف نمازیں پڑھا کرو)۔ ان حالات کا تقاضا بھی یہی تھا، لیکن جوں ہی حالات بدل گئے، اور استعداد واستحکام کے ساتھ ان میں قوت آگئی، اور جنگ وقتال کے باقاعدہ قابل ہوگئے، تو اصلی حکم قتال کا نزول ہوا: اور ﴿فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا﴾ [البقرة:١٠٩] (معاف کرو، اور درگزر سے کام لو) کا حکم منسوخ ہوگیا، تو فرمایا: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ [التوبة:٢٩] (جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے ان سے لڑو)۔

تو پہلا حکم بھی مصلحت پر مبنی تھا، اور دوسرا حکم بھی مصلحت وحکمت پر مبنی ہے۔ دیکھو، جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو مقوی غذاء کھانے کا متحمل نہیں ہوتا، تو اسے صرف ہلکی غذاء دودھ دے کر اس کی پرورش کی جاتی ہے، جو وقت اور

حالت کا تقاضا ہوتا ہے، جوں ہی اس میں استعداد پیدا ہو جاتی ہے، تو نرم غذاء کو منسوخ کر کے مقوی سے اس کی پرورش کی جاتی ہے، جو کہ اصلی غذاء ہے۔ اسی طرح نئے نئے اسلام کی آمد سے لوگ بچوں کی طرح کمزور تھے، انہوں نے عملی میدان کو کبھی نہ دیکھا تھا، اور نہ ہی جانتے تھے، تو ان کی روحانی تربیت میں اسی طور وطریقہ کی پرورش کا لحاظ رکھا گیا جو بچے کی جسمانی پرورش اور تربیت میں کارآمد اور فائدہ مند رہا۔ فَتَبَارَكَ اللهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔

خلاصہ یہ ہے کہ نسخِ احکام کا مسئلہ ہو، یا نزولِ قرآن کریم کا مسئلہ ہو، دونوں میں تدریجی اور تَرَقِّي مِنَ الْأَدْنٰى إِلَى الْأَعْلٰى کا پہلو نمایاں ہے۔ یہی حال بچوں کی پرورش میں، اور سلسلہ تعلیم وتعلم میں کارآمد ہے۔

﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ﴾ آپ فرمادیجئے کہ اس کو روح القدس (پاکیزہ روح) نے تیرے ربّ کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے۔ سورۃ الشعراء میں فرمایا: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ﴾ [الشعراء: ۱۹۴] (روح الامین نے اس کو اتارا ہے آپ کے دل پر) یہ دوسری دلیل ہے کہ قرآن حکیم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا بنایا ہوا کوئی کلام نہیں، اس کا نزول تدریجاً تیرے ربّ کی طرف سے ہوا ہے۔ اس میں واسطہ وہ جلیل القدر سید الملئکہ ہے جو کہ پاکیزہ بھی ہے، اور امین بھی ہے، اور ﴿ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ﴾ [التکویر: ۲۱] (جو قوت والا ہے، جس کا عرش والے کے پاس بڑا رتبہ ہے۔ وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے)۔

جس طرح قرآن مجید پاکیزہ اور بے عیب اور سچی کتاب ہے، اسی طرح اس کا لانے والا فرشتہ بھی پاکیزہ اور بے عیب اور امین ہے۔ پس تمہیں کیا ہوا کہ عقل کے اندھے بن گئے؟ اور جس ہستی پر تدریجاً اس کا نزول ہوا وہ تو پورے عالم کے سچوں اور پاکیزہ وامینوں کا سردار ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے پاس سے کتاب تصنیف کر کے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرے؟ جس کی امانت ودیانت، تقویٰ وطہارت پر تم خود گواہ ہو۔

﴿لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ تا کہ ایمان لانے والوں کا ایمان پختہ کرے۔ یعنی اس کے بتدریج قرآن کو لے کر آنے، اور بیک وقت سب کچھ نہ لے آنے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم ودانش میں معاذ اللہ کوئی نقص ہے، جیسا کہ تم لوگ اپنی جہالت سے سمجھتے ہو، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کی قوت فہم اور قوت اخذ میں نقص اور کمزوری ہے، جس کے سبب سے وہ بیک وقت ساری بات کو نہ سمجھ سکتا ہے، اور نہ ایک وقت کی سمجھی ہوئی بات میں پختہ ہوسکتا ہے۔

اس لئے اللہ تعالیٰ کے حکم کا یہ تقاضا ہوا کہ روح القدس کے ذریعہ اس ہمہ گیر جامع کتاب کو تھوڑا تھوڑا کر کے

اتارا جائے، کبھی اجمال سے، کبھی تفصیل سے، کبھی ایک طریقے سے، کبھی دوسرے طریقے سے، کبھی طرز بیان ایک ہو، کبھی دو تین ہوں تا کہ تدریجی نزول کے ساتھ تدریجی فہم اور تدریجی عمل ہو سکے، سمجھنے اور یاد کرنے میں آسانی ہو، ایمانوں میں تدریجی پختگی ہو، پہلے علم الیقین، پھر عین الیقین اور آخر میں حق الیقین کا حصول ہو، جیسا کہ مدارس میں، تعلیمی اداروں میں، اور صنعتی وحرفتی اداروں میں یہی ہوتا ہے کہ تدریجاً آہستہ آہستہ سلسلہ تعلیم جاری رکھا جاتا ہے، جس سے سیکھنے والوں کا علم کامل بھی ہوتا ہے، اور پختہ بھی، اور مفید بھی۔

یہ تیسری دلیل ہے، جو کہ ہر طبقہ انسانیت کے لئے قابل فہم ہے کہ جو فوائد تدریجی ماحول میں حاصل ہو سکتے ہیں وہ بیک وقت اور غیر تدریجی احوال میں حاصل نہیں ہو سکتے۔

﴿وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ یہ اس تدریج کی چوتھی مصلحت اور دلیل ہے۔ یعنی جو لوگ ایمان لاکر فرمانبرداری کی راہ پر چل رہے ہیں، چونکہ فرمانبرداری کا تعلق ان گنت بے شمار مسائل کے ساتھ وابستہ ہے، اور ہر مسئلہ کے مختلف اور متفرق جزئیات و پہلو ہوتے ہیں، اور ہر جزء کے لئے ہدایت کے مختلف درجات ہیں، تو ظاہر ہے کہ ہزاروں لاکھوں ہدایات بیک وقت نہ کوئی بیان کر سکتا ہے، اور نہ سامعین وعمل کرنے والے انہیں یاد کر سکتے ہیں۔

البتہ اگر یہ سلسلہ تدریجی ہوگا تو ہدایات بھی بآسانی بیان ہو سکتی ہیں، اور یاد رکھنے والے بھی بآسانی یاد کر سکتے ہیں، اور عمل بھی آسان ہوگا۔ پھر وَبُشْرٰی میں بھی یہی تدریجی عمل کامیابی کا ذریعہ ہوگا، وہ اس طرح کہ دینی کام کرنے والوں کے لئے تجربہ شاہد ہے کہ فضاء ناہموار ہوتی ہے، روز روز انہیں پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، پس لازمی ہے کہ روز روز ہر پریشانی پر ان کی حوصلہ افزائی ہو، اور انہیں بشارتوں سے تدریجاً بار بار خوش رکھا جائے۔ یہ بدیہی امر ہے جسے ہر سمجھدار بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ یہی راز تدریجی نزول قرآن کا ہے۔

﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ اِنَّمَا يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ﴾ ہم خوب جانتے ہیں جو یہ کافر ومشرک کہتے ہیں کہ یہ قرآن پاک آنحضرت ﷺ کو کوئی انسان سکھاتا ہے، جب مخالف اور دشمن بوکھلا جاتا ہے تو معقولیت کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے، اور وہ پاگلوں کی طرح ایسی ایسی بے سروپا نامعقول باتیں کہتا رہتا ہے جنہیں سن کر شاید گدھوں کو بھی ہنسی آجائے۔

مکہ مکرمہ میں چند ایک عیسائی مذہب رکھنے والے غلام تھے، جبر، بلعام، یسار، یعیش وغیرہ۔ یہ بے چارے عجمی لوگ تھے، عربی زبان پر قدرت نہیں رکھتے تھے، زرخرید غلام تھے، اکثر لوہار تھے، تلوار، نیزہ، چھری، خنجر بنانا اور

فروخت کرنا ان کا پیشہ ہوتا تھا۔

ان میں سے اکثر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جانے پہچانے دوست تھے، اور اسلام قبول کر چکے تھے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی طرح اپنے مشرک آقاؤں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے ہوئے تھے۔ دن کو کام کاج کی مصروفیت کی وجہ سے فراغت نہیں پاتے تھے، رات کے وقت خدمت گرامی میں حاضری دے کر اسلام سیکھتے تھے، اور کبھی دن کے وقت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم حوصلہ افزائی اور تسلی دینے کی غرض سے ان کے پاس تشریف لے جاتے، اور ان کی خبر گیری کرتے، اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھ جاتے۔ اس صورت حال نے دشمنوں کو پریشان کر دیا، انہوں نے غیر دانشمندانہ حماقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشہور کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ان لوگوں سے کچھ سیکھ کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے، اور یہ کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ پر نازل شدہ قرآن ہے، وغیرہ۔

اس بہتان کے جواب میں اللہ تعالیٰ عزّ شانہ نے فرمایا:

﴿لِسَانُ الَّذِیْ یُلْحِدُوْنَ اِلَیْهِ اَعْجَمِیٌّ﴾ یہ مشرکین جس شخص کی طرف قرآن کو نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے، وہ سادہ عربی بولنے پر قادر نہیں، چہ جائے کہ وہ اعلیٰ فصاحت وبلاغت والے کلام پر قادر ہو۔

﴿وَهٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ کا یہ عظیم الشان کلام فصیح وبلیغ عربی زبان میں ہے۔ بھلا وہ شخص جو اپنا مافی الضمیر بھی ٹھیک طریقے سے عربی زبان میں بیان نہیں کر سکتا، وہ قرآن کریم جیسا فصیح وبلیغ معجز کلام کیسے گڑھ سکتا ہے؟ یہ مشرکین کا صریح اور ناممکن بہتان، اور خالص جھوٹ، اور نرا پروپیگنڈہ ہے۔ اس کلام معجز کو سن کر تو عرب کے بڑے بڑے مایہ ناز شعراء، بلغاء، قادر الکلام، ادیب وغیرہ انگشت بدندان رہ جاتے ہیں، بھلا اس عجمی غلام کی کیا حیثیت ہے کہ ایسا اَرفع واَعلیٰ کلام پیش کر سکے۔

قرآن کریم نے تمام جہاں والوں کو واضح چیلنج دے رکھا ہے کہ اگر تمہیں اس معجز کلام میں کوئی شک ہے تو خود بھی آؤ، اور اپنے تمام معبودوں، اور ہم خیال معاون ومددگاروں کو بھی بلاؤ، اس کی ایک نہایت مختصر چھوٹی سورۃ الکوثر کی مثال پیش کرو، ﴿فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ﴾ [البقرۃ: ۲۳] (قرآن کی مثل کوئی سورت لا کر پیش کرو)۔ اس چیلنج کے قبول کرنے سے تمہارے سارے ادیب، فصحاء، بلغاء، شاعر عاجز آ گئے، اور اس کے اعجاز کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، اور کہتے گئے: مَاهٰذَا قَوْلُ الْبَشَرِ اِنْ هُوَ اِلَّا كَلَامُ صَاحِبِ الْقُوٰی وَالْقُدَرِ۔ "یہ کسی انسان کا کلام نہیں، یہ اس رب کا کلام ہے جو ہر قوت وقدرت کا مالک ہے"۔ حضرت لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ جو عرب کے ادباء وشعراء وفصحاء کے

سردار مانے جاتے تھے، یہ اس کے الفاظ تھے، اور یہ کہتے ہوئے مقابلہ سے دست بردار ہو کر اسلام قبول کیا تھا، اور مقابلہ کے بعد شعر کہنے سے ہمیشہ کے لئے تائب ہو گئے تھے، اور دن رات تلاوت قرآن کو اپنا مشغلہ بنایا ہوا تھا۔ خلافت فاروقی میں بصرہ یا کوفہ میں انتقال فرما گئے۔ حضرت فارق اعظم رضی اللہ عنہ ان کی بڑی قدر کرتے تھے، اور بیت المال سے ان کے لئے وظیفہ شہریہ مقرر کیا ہوا تھا۔ رَضِیَ اللّٰهُ عَنهُ

یہ وہی معجزہ اَعلیٰ واَرفع کلام ہے کہ جس کے علوم و معارف کے سامنے بڑے بڑے کوہ و جبال بھی پست نظر آتے ہیں۔ ایک عربی النسل، قادر الکلام، علامہ، جیسے مفسر عبد السلام نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ محدث و مفسر حافظ ابن شاہین رحمۃ اللہ علیہ ایک ہزار جلد میں اس کی تفسیر لکھ سکتے ہیں، مگر ایک چھوٹی سورت کی مثل لانے سے عاجز ہیں۔ یہی کلام اللہ کی حقانیت کی سب سے بڑی دلیل ہے، اور یہ بھی کہ قیامت تک بغیر کسی کمی بیشی کے اسی طرح باقی رہے گا جیسے نزول کے وقت ہوتا تھا۔ تم کافر کتنے احمق جاہل ہو جو اس کو کسی عجمی گونگے غلام کی طرف منسوب کرتے ہو؟

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ بیشک جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے۔

﴿لَا یَهۡدِیۡهِمُ اللّٰهُ﴾ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

﴿وَلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ﴾ ان کے لئے دردناک، تباہ کن عذاب مقرر ہے۔

﴿اِنَّمَا یَفۡتَرِی الۡکَذِبَ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ﴾ بیشک وہی لوگ جھوٹ باندھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر ایمان نہیں لاتے ہیں، وہی جھوٹے لوگ ہیں، جنہوں نے قرآن کریم کو عام عجمی لوگوں کی طرف منسوب کیا، اور اسے ﴿اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾ [الأنفال: ۳۱] (پہلے لوگوں کی کہانیاں) کہتے رہے۔

﴿وَاُولٰٓئِکَ هُمُ الۡکٰذِبُوۡنَ﴾ یہی لوگ وہ ہیں کہ فی الواقع جھوٹے ہیں، جو پوری ملّت اور پوری شریعت کے جھٹلانے والے جھوٹے ہیں، تم نے میرے نبی پر مفتری ہونے کا الزام لگا کر کہا: ﴿اِنَّمَاۤ اَنۡتَ مُفۡتَرٍ﴾ (تو تو افتراء ہی کرنے والا ہے)۔

یاد رکھو! جھوٹے تم ہو، ربّ العزّت کا محبوب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مفتری تو کیا، اس کے غلام بھی جھوٹ نہیں بولتے۔ امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں حدیث نقل کی ہے: قِیلَ لِرَسُولِ اللّٰهِ: أَیَکُونُ الْمُؤْمِنُ جَبَانًا؟ قَالَ: نَعَم. قِیلَ لَهُ: أَیَکُونُ الْمُؤْمِنُ بَخِیلاً؟ قَالَ: نعم. فَقِیلَ لَهُ: أَیَکُونُ الْمُؤْمِنُ كَذَّابًا؟ قَالَ: لَا. آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے سوال کیا کہ کیا مؤمن بزدل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، ہوسکتا ہے۔ پھر لوگوں نے پوچھا:

کیا مؤمن بخیل ہوسکتا ہے؟ فرمایا: ہاں، ہوسکتا ہے۔ پھر لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا مؤمن جھوٹا ہوسکتا ہے؟ فرمایا: نہیں ہوسکتا۔ یہاں سے اندازہ لگائیے کہ جھوٹ کتنا بڑا گناہ ہے، اور مؤمن کی شان کتنی اونچی ہے کہ وہ بزدل اور بخیل بن سکتا ہے، مگر جھوٹا نہیں ہوسکتا۔ [مشکوۃ]

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىِٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ اُولٰٓىِٕكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰي قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۚ وَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۰۸﴾ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۰۹﴾

ترجمہ: جس شخص نے ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کیا، مگر جس شخص پر زبردستی کی گئی، اور اس کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن ہے، لیکن جس نے دل کھول کر کفر اختیار کرلیا، سو ان پر اللہ تعالیٰ کا غصہ ہے، اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ﴿۱۰۶﴾ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے دنیا والی زندگی کو آخرت کے مقابلہ میں محبوب رکھا، اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا ﴿۱۰۷﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر، اور کانوں پر، اور آنکھوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگادی، اور یہ لوگ واقعی غافل ہیں ﴿۱۰۸﴾ لازمی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ تباہ کاروں میں سے ہوں گے ﴿۱۰۹﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

ابتداء اسلام میں جب توحید ورسالت کے اعلان نے مشرکین مکہ کے ایوانوں کو تہ وبالا کر کے رکھ دیا، جہاں صدیوں سے شرک وبت پرستی کا راج ہو وہاں اچانک خدائے واحد لا شریک کی توحید کی صدا بلند ہو تو شیطان کے پجاریوں پر یقیناً قیامت برپا ہوگی۔

صنادیدِ قریش کی قسمت میں لکھا ہوا نہیں تھا کہ اسلام قبول کرلیں، چند فقراء، بے سہارا، بیکس مسکینوں، غلاموں، باندیوں نے جب اسلام قبول کرلیا تو مشرکین کو ناگوار گزرا، پس ان کا مشغلہ یہی رہا کہ ان موحّدین کو اپنے ظلم وستم کا نشانہ بنا کر انہیں طرح طرح کا عذاب دینا شروع کیا۔ آیت کریمہ میں اسی کے متعلق ایک خاص واقعہ کا

بیان ہے، اور اسی کے متعلق آیت کریمہ کا نزول ہے، فرمایا:

﴿مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِهٖۤ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَىٕنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ﴾ جولوگ ایمان لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر کرنے لگیں، مگر جن لوگوں پر زبردستی کی گئی، اور ان کا دل ایمان کے ساتھ مطمئن رہا۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: اس آیت کا نزول حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے حق میں ہوا۔ مشرکوں نے عمار رضی اللہ عنہ کو، ان کے والد یاسر کو، ان کی والدہ سمیہ کو، اور صہیب، و بلال، و خبیب، و سالم رضی اللہ عنہم کو پکڑ کر سخت جسمانی سزائیں دیں۔ حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو دو اونٹوں کے درمیان باندھ دیا گیا، ایک ٹانگ ایک اونٹ سے، دوسری ٹانگ دوسرے اونٹ سے، اور شرمگاہ میں نیزہ مار کر چیرا گیا۔ ان کے شوہر حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کو بھی قتل کیا گیا۔ اسلام میں سب سے پہلے شہید حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا اور دوسرے شہید حضرت یاسر رضی اللہ عنہ ہیں۔ (حضرت عمار رضی اللہ عنہ بعد میں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کے ہاتھوں شہید ہوئے)۔

اس وقت والدین کی شہادت کے موقع پر حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے جان بچاتے ہوئے بمجبوری وہ بات زبان سے نکال دی (جس بات کے نکالنے اور کہنے سے ان کے والدین نے انکار کیا، تب وہ شہید ہوئے) وہ بات کیا تھی جسے مشرکین چاہتے تھے، یعنی کلمہ کفر اور اسلام سے بیزاری۔ سمیہ اور یاسر رضی اللہ عنہما دونوں نے موت وقتل کو قبول کیا، مگر کلمہ کفر کو زبان سے نہیں نکالا۔ عمار رضی اللہ عنہ نے سوچا کہ میں باطنی اعتبار سے بالیقین مسلمان ہوں، اگر بامر مجبوری جان بچانے کی خاطر مشرکین کا کلمہ پڑھوں، شاید میری پکڑ نہ ہو، تو انہوں نے ظاہراً ان کی بات مان لی، اور قتل سے بچ گئے۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بنی مغیرہ نے عمار رضی اللہ عنہ کو پکڑ کر چاہ میمون میں غوطے دیئے، اور کہا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا انکار کرو، عمار رضی اللہ عنہ نے وہی بات کہہ دی جو مشرک چاہتے تھے، مگر آپ رضی اللہ عنہ کا دل اس سے نفرت کرتا رہا، اور دل کو انکار رسالت گوارا نہ تھا، اس کے بعد کسی نے جا کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دیدی کہ عمار رضی اللہ عنہ کافر ہو گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہرگز نہیں، عمار رضی اللہ عنہ کے اندر سر سے قدموں تک ایمان بھرا ہوا ہے، اس کے خون اور گوشت و پوست میں ایمان سرایت کر گیا ہے۔

آخر عمار رضی اللہ عنہ روتے ہوئے خدمت گرامی میں حاضر ہوئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا بات ہے؟ عرض کیا: یارسول اللہ! بات بری ہے، میں نے مجبوری میں آپ کو برا بھلا کہہ دیا، اور انکار کے طور پر آپ کا ذکر کیا۔ فرمایا: اس وقت تمہارے دل کی کیا حالت تھی؟ تم کو کیا محسوس ہوا؟ عرض کیا کہ میرا دل تو ایمان پر مطمئن تھا۔ یہ سن

کرآنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عمار رضی اللہ عنہ کے آنسو پونچھتے ہوئے فرمایا کہ اگر مشرکین دوبارہ تمہارے ساتھ ایسی حرکت کریں تو تم دوبارہ بھی یہی الفاظ لوٹا سکتے ہو۔اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ثعلبی اور واحدی نے بھی یہی بیان کیا۔ [درمنثور، مظهري]

تفسیر درمنثور میں یہ بھی لکھا ہے کہ عبداللہ بن ابی سرح نے، جو کاتب وحی تھے، اسلام لانے کے بعد مرتد ہو گئے، اور کافروں سے جا ملے، ان کے بارے میں آیت:

﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا﴾ نازل ہوئی۔ یہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے برضاعی بھائی تھے، فتح مکہ کے دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انہیں خدمت گرامی میں لے کر حاضر ہوئے، تو انہوں نے دوبارہ اسلام قبول کرلیا۔اگرچہ وہ بعد میں مسلمان ہو گئے، لیکن آیت کریمہ میں جو ﴿وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا﴾ فرمایا ہے، اس کا مضمون، اور اس کا حکم تا ابد باقی ہے۔

جو شخص پہلے ہی دل سے کافر ہو، یا اسلام لانے کے بعد دل سے کفر اختیار کرلے، اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب ہے، اور آخرت میں اس کے لئے بڑا عذاب ہے۔ جو لوگ اسلام قبول کر کے کافر ہو جاتے ہیں، وہ بھی مال یا عورت یا عہدہ کی وجہ سے ایمان کو چھوڑتے ہیں، حقیر دنیا کے لئے اپنی آخرت کو تباہ کر لیتے ہیں۔بعض جماعتیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتی ہیں، جن میں ختم نبوت کے منکر بھی شامل ہیں، اور خاتم الانبیاء تاجدار ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی شخص کو نبی ماننے کی وجہ سے کافر ہیں، یہ لوگ اور ان کے استاذ، یعنی نصاریٰ (جن سے انہوں نے اہل ایمان کے دلوں سے ایمان کھرچنے کا طریقہ سیکھا ہے) یہ سب مال وجاہ اور عورتوں کی پیش کش کرتے رہتے ہیں، اور دنیا سے محبت کرنے والوں کو اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں، اور اس بہانے سے انہیں کافر بناتے ہیں۔اسی کو فرمایا:

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ﴾ اللہ تعالیٰ کا یہ غضب اس لئے ہے کہ انہوں نے دنیا والی زندگی کو آخرت والی زندگی پر ترجیح دی۔ایمان ایک ایسی بڑی قیمتی سرمایہ ہے کہ پوری دنیا اور اس کی نعمتوں اور خزانوں کو ایمان پر قربان کیا جا سکتا ہے، اور متقی لوگوں کے لئے یہ بہت آسان ہے، لیکن ایمان کو کسی بھی چیز پر قربان نہیں کیا جا سکتا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ ایسے عجیب واقعات سے بھری پڑی ہے کہ انہوں نے سخت سے مشکل حالات میں کبھی کسی چیز کے ساتھ، یا اپنی جان بچانے کے عوض ایمان کا سودا نہیں کیا۔سولیوں پر چڑھے، ان کے جسموں کو

کاٹ کاٹ کر قیمہ بنا یا گیا، انہیں نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کی دھمکیاں ملیں، مگر وہ کوہِ استقلال بن کر دشمن کے سامنے نہیں جھکے۔

عورت ذات ہو کر حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا نے موت کو سینے کے ساتھ لگا کر عزیمت پر عمل کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش فرمایا، مگر رخصت پر عمل کرنے کو ناپسند کیا۔ آپ سورۃ البروج کی تفسیر کا مطالعہ کرلیں، جہاں بیس ہزار مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ یا ایمان سے کنارہ کش ہو جاؤ، یا آگ کی دہکتی ہوئی خندقوں میں جل جاؤ، انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت پر عمل کرنے کو ترجیح دی، آگ میں جلنے کو پسند کیا، مگر ایمان سے کنارہ کش نہیں ہوئے، اور آگ میں چھلانگ لگا کر جان کا نذرانہ پیش کیا۔

آج بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ جس عظیم ایمان کی قیمت سارا جہاں نہیں بن سکتا، لیکن ہم اسے دو دو ہزار یا اس سے بھی کم سرمایہ پر بازاروں، گلی کوچوں میں بے دردی کے ساتھ فروخت کر رہے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چل کر اپنے ایمان اور شرعی حیاء وتقویٰ کا تحفظ کریں، اور دنیا کی ہر نعمت و خواہش کو ایمان پر قربان کریں، اور اپنے پروردگار کی بندگی پر فخر محسوس کریں۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کافر قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔ جب دنیا کی وجہ سے کفر اختیار کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے اسے وہیں پھینک دیا جہاں وہ جانا چاہے۔ پھر فرمایا:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر، کانوں پر، اور آنکھوں پر اللہ نے مہر لگادی، اب یہ گونگے، بہرے، اندھے اور پاگل ہو گئے، ان میں کوئی صلاحیت اور فطری استعداد باقی نہیں رہی۔

﴿وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ﴾ اور یہ وہ لوگ ہیں جو بالکل ہی غافل ہیں۔ ان میں عقل وفہم بھی نہیں، جانوروں سے بدتر اور بے شعور ہیں۔ یہ بُری طرح جہالت میں غرق ہیں، جن کا نتیجہ یہ ہے:

﴿لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ﴾ یہ پکی بات ہے کہ آخرت میں یہ لوگ بالکل ہی تباہ ہوں گے، جنت سے محروم اور دوزخ کا ایندھن بن کر ابدالآباد جہنم ان کا ٹھکانہ ہوگا۔

ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جٰهَدُوا وَصَبَرُوٓا ۙ إِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۱۰﴾ يَوْمَ تَأْتِي كُلُّ نَفْسٍ تُجَادِلُ عَنْ نَّفْسِهَا وَتُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿۱۱۱﴾

ترجمہ: پھر بے شک آپ کا ربّ ایسے لوگوں کے لئے جنہوں نے فتنہ میں ڈالے جانے کے بعد ہجرت کی، پھر جہاد کیا، اور ثابت قدم رہے، تو بلاشبہ آپ کا ربّ ان چیزوں کے بعد بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے ﴿۱۱۰﴾ جس دن ہر شخص اپنے نفس کی طرف سے جدال کرے گا، اور ہر نفس کو اس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا، اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ﴿۱۱۱﴾

معارف ومنازل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اس آیت کا نزول ابوجہل کے رضاعی بھائی عیاش بن ابی ربیعہ، ابوجندل بن سہیل بن عمر، اسلمہ بن ہشام، ولید بن ولید، عبید اللہ بن اسید ثقفی وغیرہ رضی اللہ عنہم کے متعلق ہوا۔ مشرکین نے ان کو سخت اذیتیں دی تھیں، انہوں نے مشرکین کی ایذاء سے بچنے کے لئے کچھ ایسے الفاظ کہہ دیئے جو مشرکین کہلوانا چاہتے تھے، پھر یہ حضرات مکہ چھوڑ کر مدینہ آگئے، اور جہاد میں شریک رہے، اور صبر واستقامت کے ساتھ رہے۔ اسی طرح ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے طبقات الکبریٰ میں عمر بن حاکم کی روایت سے لکھا ہے کہ عمار بن یاسر، بلال، ابوفکیہہ، عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہم اور دیگر مسلمانوں کی بھی یہی حالت رہی۔ انہیں ایسے ایسے دکھ دیئے جاتے تھے کہ وہ حواس باختہ ہو کر نہیں جانتے تھے کہ کیا کریں اور کیا کہیں، اس پر ان آیات کا نزول ہوا۔

یہ سارے حضرات مدینہ ہجرت کر کے آئے، اور جہادوں میں ثابت قدم رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں خوشخبری دی کہ ربّ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے گا، اور ان پر مہربانی فرمائے گا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اور عکرمہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ یہ آیت عبداللہ بن ابی سرح کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جنہوں نے اسلام کے بعد مرتد ہو کر کفر اختیار کیا تھا، پھر فتح مکہ کے دن مسلمان ہو گئے، ہجرت بھی کی، جہادوں میں حصہ لیا، اور ثابت قدم رہے۔ ہم نے پہلے بھی ان کا واقعہ لکھا ہے مظہری کے حوالہ سے کہ سجدہ کی حالت میں ان کا انتقال ہوگیا۔ رضي الله عنه

آیت کریمہ کا سبب نزول جو بھی ہو یہ تینوں اعمال، یعنی ہجرت اور جہاد، پھر صبر واستقامت یہ خوش قسمت

لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں، یہ مکفر السیآت ہیں، ان کے ساتھ تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جیسا کہ آیت میں مغفرت ورحمت کی خوشخبری کا اعلان ہے۔ دوسری آیت میں قیامت کا منظر بیان فرمایا کہ اس دن ہر شخص اپنے نفس کی جانب سے جدال کرے گا، یعنی دفاع کرے گا۔ کفار اپنے معبودوں کے ساتھ، اور ابلیس کے ساتھ جدال کریں گے کہ تم نے تو ہمارا راستہ روکا، اور کافر بنایا، جبکہ ابلیس اور ان کے معبود اپنے دفاع میں ان سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔ اسی طرح یہ سلسلہ مؤمنین کا بھی دفاعی ہوگا، جہاں انہوں نے کبھی آپس میں ملاقاتوں، معاملات، عقائد، اعمال میں ایک دوسرے کی حق تلفی کی ہو، یا انہیں بے دین، حرام خور، بے نماز وغیرہ بنایا ہو، یا کسی بُرائی کا سبب بنا ہو، جیسے ہم دنیا میں مشاہدہ کرتے ہیں۔

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْهُمْ فَكَذَّبُوْهُ فَاَخَذَهُمُ الْعَذَابُ وَهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے ایک بستی کی مثال بیان فرمائی، یہ بستی امن والی تھی، اطمینان والی تھی، اس کا رزق ہر طرف سے بڑی فراغت کے ساتھ اس کے پاس آتا تھا، پس اس نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کی، اور ان کے کرتوتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کو بھوک اور خوف کا مزہ چکھادیا ﴿۱۱۲﴾ اور البتہ ان کے پاس انہی میں سے رسول آیا، سو انہوں نے اسے جھٹلایا، لہٰذا انہیں عذاب نے پکڑ لیا، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والے تھے ﴿۱۱۳﴾

معارف ومنازل

بعض حالات میں کسی مسئلہ کو یا کسی واقعہ کو خوب ذہن نشین کرنے اور سمجھانے کے لئے کوئی مثال بیان کرنا مقصود ہوتا ہے، تاکہ لوگ سمجھیں اور عبرت بھی حاصل کریں۔ قرآن کریم نافرمانوں کے اخروی عذابوں کی طرح دنیوی عذابوں کو بھی اسی مقصد کے لئے بیان کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ایک بستی کا نام لئے بغیر تذکرہ فرمایا، جسے اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہو، چاروں طرف سے تجارت یا زمینداری اور دیگر ذرائع سے اس کا رزق وروزی کا وافر مقدار میں رسائی اور انتظام ہو، لیکن لوگ بجائے شکر وفرمانبرداری کے ناشکری اور نافرمانی اور ناقدری پر اتر

آئے، اور جو پیغمبران کے پاس ہدایت کا پیغام لے کر آیا، انہوں نے اس کی تصدیق کی بجائے تکذیب کی۔

پس اللہ تعالیٰ کا عام قانون ہے کہ ﴿لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ﴾ [ابراهیم:۷] (اگر تم نے شکر کیا تو میں ضرور بضرور زیادہ دوں گا، اور اگر ناشکری کی تو میرا عذاب بہت سخت ہے) کے تحت ان پر دنیوی عذاب کا نزول اس طرح ہوا کہ ان کا امن خوف کے ساتھ بدل گیا، اور خوشی کی جگہ غم، اور سیری کی جگہ بھوک نے لے لی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ ایک عام مثال ہے جو کہ قیامت تک کی بستیوں اور افراد کے لئے ہے، یا اس سے کوئی خاص بستی مثلاً مکہ معظمہ مراد ہے، جہاں مشرکین مکہ پر اس قسم کا عذاب آیا تھا، جب ان کی شرارت اور سرکشی حد سے بڑھ گئی تھی، تو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر بددعا کی۔ اور فرمایا: اَللّٰهُمَّ اَعِنِّي عَلَيْهِمْ بِسَبْعٍ سِنِيْنَ كَسِنِيْ يُوْسُفَ. [بخاري] پس ان پر بدامنی اور بھوک اور سات سالہ قحط مسلط ہوا، یہاں تک کہ ان کے مال مویشی ہلاک ہو گئے، اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے، ان کا بہت برا حال ہوا، جنگل سے سڑی ہوئی بدبودار ہڈیاں جمع کر کے کھانے لگے، پھر ابوسفیان بن حرب نے خدمت گرامی میں آکر زاری و منت شروع کی: اے محمد! آپ لوگوں کو صلہ رحمی کی تعلیم دیتے ہیں، اور یہ قریش آپ کی قوم ہے، آپ کے عزیز و رشتہ دار ہیں، یہ قحط سے ہلاک ہو گئے، انہیں معاف کیجئے، ان سے قحط اٹھا دیجئے، وغیرہ۔

تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعاء فرمائی، جس سے قحط ختم ہو گیا، مگر قوم کی سرکشی میں فرق نہیں آیا، اور وہ بدستور اپنے کفر و شرک پر جمے رہے۔ بہر حال! مفسرین کے دونوں اقوال مذکور ہیں۔ صحیح بات یہی ہے کہ واقعہ اگر چہ خاص ہو، مگر اس کا حکم عام ہے، قیامت تک آنے والے سب لوگوں کے لئے ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری کرے گا، اور احکامِ الٰہی کو نظر انداز کرے گا، کتاب و سنت کی عملاً تکذیب کرے گا، وہ ضرور عذابِ الٰہی کی لپیٹ میں آجائے گا، اس کا امن تباہ و برباد ہوگا، خوف و بدامنی مسلط ہوگی، بھوک و پیاس کا دور دورہ ہوگا، لاقانونیت ہوگی، غذائی اشیاء کی قلت اور مہنگائی ہوگی، پانی کی بوند بوند کے لئے لوگ ترسیں گے، رات کو گھروں سے باہر نہیں نکل سکیں گے، اوپر کا پانی سیکڑوں میٹر زمین کے نیچے جذب ہو کر چلا جائے گا۔

گویا کہ اس آیت کریمہ نے پورے عالم کا عموماً اور ہمارے ملک کا خصوصاً نقشہ کھینچ کر ہمارے سامنے رکھا، اور ہمیں تنبیہ فرمائی کہ اپنے اعمال و کردار پر نظر ثانی کرو، اور مزید عذابِ الٰہی کو دعوت نہ دو۔ ہمارے گرد و پیش ایسی

ایسی آبادیاں ہیں جو باغات، کثرتِ آب، لہلہاتے سبزے سے مالا مال تھیں، اور جہاں عجیب وغریب زرعی فراوانی کا دور دورہ تھا، آج وہ علاقے قحط وخشک ہیں، اور میلوں دور دور تک باغات ہوتے تھے، لاکھوں پھلدار درختوں کی قطاریں لگی ہوتی تھیں، جنہیں قلت آب کی وجہ سے کاٹ کاٹ کر لوگوں نے رکھ دیا۔ اب وہاں کے لوگ پینے کے پانی کے لئے ترس رہے ہیں، کیا قوم سبا کی تاریخ ہمارے سامنے نہیں ہے؟

حدیث پاک میں ارشاد ہے کہ جو قوم عشر وزکوٰۃ سے دستبردار اور منکر ہو تو ان پر قحط اور خوف مسلط ہوگا۔ [ترمذي] اللہ تعالیٰ کے عذاب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں، اس اُمت پر اس کے عظیم الشان، جلیل القدر، ہادی ومرشد پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل اگر آسمانی عذاب نہیں آسکتا تو زمینی عذاب ضرور آتے رہیں گے۔ یہ ہمارے بُرے اعمال کے نتیجے میں ہمیں تباہی کے کنارے پہنچائیں گے۔ وہ کونسا گناہ ہے جس کا وجود ہمارے شہروں میں نہیں؟ اگر اس اُمت کا اور اس کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شرف نہ ہوتا تو پتہ نہیں آج ہمارا کیا حال اور کیا نقشہ ہوتا؟ اللہ تعالیٰ ہم سب پر رحم فرمائے۔

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ میں نسبت مجازی ہے۔ واللہ اعلم

﴿فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ﴾ جوع اور خوف کو "لباس" فرمایا، اس کے بارے میں مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ لوگ پہلے نعمتوں میں ڈوبے ہوتے تھے، نعمتوں نے انہیں لباس کی طرح ڈھانپ رکھا تھا، اب جب بھوک کی وجہ سے دبلے پتلے ہوگئے، اور ان کا حال بدل گیا تو گویا پہلے لباس کے بعد انہوں نے بھوک کا لباس اوڑھ لیا، اس لئے بھوک اور خوف کو لباس سے تعبیر فرمایا، اور یہ تبدیلی لباس کی چونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوئی، اس لئے فرمایا: ﴿فَاَذَاقَهَا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ لباس پہنا دیا، پھر چاہیے تھا کَسَاهَا لِبَاسَ الْجُوْعِ ہوتا، اس کو اَذَاقَهَا سے تعبیر فرمانے میں یہ حکمت ہے کہ ان کی بدحالی کو عذاب کہا گیا، جو معنوی اعتبار سے چکھنے کے معنی میں ہے، جیسا کہ دوزخیوں کو خطاب ہے: ﴿ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ﴾ [القمر: ۴۸] (چکھو دوزخ کے چھونے کا مزہ)۔ یا ابھی جو گزرا: ﴿وَتَذُوْقُوا السُّوْٓءَ﴾ [النحل: ۹۴] (تم سزا چکھو گے)۔ اور یہ معنی مجازی ہے، جو کہ بہت مشہور ہے، اور قرآن مجید میں بکثرت مذکور ہے۔

فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ

اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾

ترجمہ: سواس میں سے کھاؤ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں رزق حلال پاک عطاء فرمایا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اس کی عبادت کرتے ہو ﴿۱۱۴﴾ تم پر صرف مردار اور خون اور خنزیر کا گوشت اور وہ جانور حرام کیا گیا جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارا گیا ہو، سو جو شخص مجبوری میں ڈال دیا جائے اس حال میں کہ باغی نہ ہو، اور حد سے بڑھ جانے والا نہ ہو، سو بلاشبہ اللہ تعالیٰ غفور ہے، رحیم ہے ﴿۱۱۵﴾

معارف ومنازل

سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ [البقرة:۱٦۸] (کھاؤ زمین میں موجود حلال اور پاکیزہ چیزیں) اور سورۂ مؤمنون میں ارشاد ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ [المؤمنون:۵۱] (اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور نیک عمل کرو)۔ سارے انبیاء علیہم السلام کی یہی تعلیم ہے کہ پاکیزہ اور حلال رزق کماؤ، اور اسی میں سے کھاؤ۔ حرام اور ناپاک رزق کے قریب بھی مت جاؤ۔

حرام مال دین اور اخلاق کو بگاڑ دیتا ہے، اخلاقِ رزیلہ پیدا کرتا ہے، پھر نہ کوئی عمل قبول ہوتا ہے، نہ دعا، اس لئے ارشاد فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ خوراک کھاؤ، اور اس کے ساتھ ہر طریقہ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اگر تم خالص اس کی عبادت کرنے والے ہو، کیونکہ حرام کھانے سے تمہاری عبادتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر حرام کا ایک لقمہ کھا گئے تو چالیس روز تک کوئی نماز قبول نہیں ہوتی، پس تم اللہ تعالیٰ کے عبادت گزار تو نہ بنے، تمہارا شمار بے نمازوں میں ہوگا، جس کا نتیجہ سوائے جہنم کے اور کچھ نہ ہوگا۔ دوسری آیت میں بعض ان چیزوں کا تذکرہ ہے جن کا کھانا حرام ہے۔ ان کی تفصیل سورۂ بقرہ، سورۂ انعام اور سورۂ مائدہ کے شروع میں دیکھیں۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ﴿۱۱٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۪ وَّلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ
هَادُوْا حَرَّمْنَا مَا قَصَصْنَا عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ ۚ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ترجمہ: اور جن چیزوں کے بارے میں تمہاری زبانیں جھوٹا دعویٰ کرتی ہیں، ان کے بارے میں یوں نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے، تاکہ تم اللہ تعالیٰ پر جھوٹا افتراء کرو، بلاشبہ جو لوگ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ فلاح نہیں پائیں گے ﴿۱۱۶﴾ تھوڑا سا نفع ہے، اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۱۱۷﴾ اور ہم نے یہودیوں پر وہ چیزیں حرام کردی تھیں جن کا بیان ہم پہلے آپ سے کرچکے ہیں، اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا، لیکن وہ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ﴿۱۱۸﴾

معارف ومنازل

تحلیل اور تحریم کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے۔ مشرکین مکہ کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے خیال سے اشیاء کی حلّت وحرمت تجویز کرتے تھے، جانوروں کی تحلیل وتحریم کے بارے میں بہت سی باتیں ان کی خود تراشیدہ تھیں، جن کا ذکر سورۂ انعام رکوع ۱۶ میں اور سورۂ مائدہ کے رکوع ۱۴ میں بیان فرمایا ہے۔ یہاں اس پر تنبیہ فرمائی کہ جن چیزوں کو تم نے خود سے حلال کر رکھا ہے، ان کے بارے میں اپنے پاس سے حلال وحرام مت کہو، حلال وحرام قرار دینے کا اختیار اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، اس کے اختیار کو اپنے لئے استعمال کرو گے تو یہ اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہوگا۔

کسی شرعی دلیل ہی سے اللہ تعالیٰ کی پیدا فرمودہ اشیاء کو حلال یا حرام کہا جاسکتا ہے، اپنی طرف سے خود تجویز نہیں کرسکتے، جب شرعی دلیل نہیں ہے تو اپنی طرف سے حلال وحرام تجویز کرنا حرام ہے۔ اللہ تعالیٰ پر افتراء کرنے والے کامیاب نہ ہوں گے، تو فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّهٰذَا حَرَامٌ﴾ کسی چیز کو اپنی زبانوں سے حلال اور حرام نہ کہو، اور حلّت وحرمت تمہارے اختیار میں نہیں، بلکہ **اَلْحَلَالُ مَا أَحَلَّ اللهُ وَالْحَرَامُ مَا حَرَّمَ اللهُ.** حلال وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے، اور حرام وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں لاشریک ہے اسی طرح اپنی صفات میں بھی لاشریک ہے، اسی طرح اشیاء کی تحلیل اور تحریم میں بھی لاشریک ہے، حتیٰ کہ اگر انبیاء علیہم السلام کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیتے ہیں تو یہ ان کا اپنا حکم نہیں ہوتا، بلکہ وحی کے ذریعہ انہیں اللہ تعالیٰ ایسا کرنے کا حکم دیتا ہے۔

پھر ائمہ مجتہدین کی طرف سے تحلیل وتحریم کا حکم بھی کتاب وسنت کی روشنی میں ہوتا ہے، اس میں مجتہد کی

رائے کا کوئی دخل نہیں ہوتا، تو فرمایا کہ اپنی زبانوں سے حلال یا حرام مت کہو:

﴿لِّتَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ﴾ کہ یہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے والی بات ہے، اور فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ يَفۡتَرُوۡنَ عَلَى اللّٰهِ الۡكَذِبَ لَا يُفۡلِحُوۡنَ﴾ اور اللہ تعالیٰ شانہ پر جھوٹ باندھنے والے کبھی فلاح نہیں پائیں گے، اور جو لوگ چند روزہ زندگی کی خوشحالی اور عیش وعشرت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال وحرام کردہ اشیاء کی پابندی نہیں کرتے ان کو تنبیہ ہے:

﴿مَتَاعٌ قَلِيۡلٌ﴾ یہ دنیوی فوائد نہایت کم اور معمولی ہیں، جن کا انجام یہ ہے:

﴿وَّلَهُمۡ عَذَابٌ اَلِيۡمٌ﴾ ان افتراء بازوں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

﴿وَعَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا مَا قَصَصۡنَا عَلَيۡكَ مِنۡ قَبۡلُ﴾ اور ہم نے یہودیوں پر وہ چیزیں حرام کردی تھیں جن کا بیان ہم پہلے آپ سے کر چکے ہیں۔ سورۂ انعام رکوع ١٨ میں مفصل کلام گزر چکا ہے، ارشاد ہے: ﴿وَعَلَى الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا كُلَّ ذِىۡ ظُفُرٍ﴾ [الأنعام:٦: ١٤٦] (اور جو لوگ یہودی ہیں ان پر ہم حرام کردیا ہر ناخن والے جانور کو)۔ یہود نے متاعِ قلیل کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال وحرام کردہ اشیاء سے تجاوز کیا، احکامِ الٰہی میں ردوبدل کیا، سودی کاروبار میں لگ گئے، احکامِ الٰہی کا مذاق اڑایا، تب زجر وتوبیخ اور سزا کے طور پر اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو ان پر حرام قرار دیا۔ سورۂ نساء میں ان کا بیان ہے، چنانچہ ارشاد ہے: ﴿فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِيۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا عَلَيۡهِمۡ ......﴾ [النساء: ١٦٠] (یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے ان پر حرام کردیا......)۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَمَا ظَلَمۡنٰهُمۡ وَلٰـكِنۡ كَانُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ﴾ ہم نے ان پر کوئی زیادتی نہیں کی، بلکہ وہ خود ہی اپنی جانوں پر زیادتی کرنے والے تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی حدود کو توڑا، جس کی پاداش میں پاکیزہ چیزیں ان پر حرام کردی گئیں۔

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيۡنَ عَمِلُوا السُّوۡۤءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ وَاَصۡلَحُوۡۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنۡۢ بَعۡدِهَا لَغَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ﴿١١٩﴾

ترجمہ: پھر بلاشبہ آپ کا ربّ ان لوگوں کے لئے جنہوں نے جہالت سے بُرے کام کئے، پھر اس کے بعد

توبہ کرلی، اور اعمال درست کر لئے، بلاشبہ اس کے بعد ضرور اللہ تعالیٰ مغفرت فرمانے والا ہے، رحم والا ہے ۱۱۹

معارف ومنازل

جولوگ نادانی اور جہالت سے گناہ کرتے ہیں، پھر توبہ کر کے اپنی اصلاح کرتے ہیں، ان کے لئے مغفرت اور رحمت خاصہ کا وعدہ ہے۔

اِنَّ اِبۡرٰهِيۡمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيۡفًا ؕ وَلَمۡ يَكُ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۱۲۰ شَاكِرًا لِّاَنۡعُمِهٖ ؕ اِجۡتَبٰهُ
وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ ۱۲۱ وَاٰتَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۱۲۲ ثُمَّ
اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۱۲۳ اِنَّمَا جُعِلَ السَّبۡتُ عَلَى
الَّذِيۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِيۡهِ ؕ وَاِنَّ رَبَّكَ لَيَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ فِيۡمَا كَانُوۡا فِيۡهِ يَخۡتَلِفُوۡنَ ۱۲۴

ترجمہ: بلاشبہ ابراہیم ایک بڑے مقتدیٰ تھے، اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار تھے، سب کو چھوڑ کر ایک ہی طرف ہورہے تھے، اور مشرکین میں سے نہ تھے ۱۲۰ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکرادا کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا، اور انہیں سیدھے راستے کی ہدایت دی ۱۲۱ اور ہم نے انہیں دنیا میں خوبیاں دیں، اور بلاشبہ وہ آخرت میں صالحین میں سے ہوں گے ۱۲۲ پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی کہ ابراہیم کی ملّت کا اتباع کیجئے، جو سب کو چھوڑ کر ایک طرف ہورہے تھے، اور وہ مشرکین میں سے نہ تھے ۱۲۳ ہفتہ کے دن کی تعظیم ان لوگوں پر لازم کی گئی تھی جنہوں نے اس میں اختلاف کیا، اور بلاشبہ آپ کا ربّ قیامت کے دن ان کے درمیان ان چیزوں کے بارے میں ضرور فیصلہ فرمادے گا جن میں وہ اختلاف کرتے تھے ۱۲۴

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں مشرکین کے شرک اور اشیاء کی تحلیل وتحریم کے متعلق ان پر رد فرمایا۔ اس ضمن میں ان کے ساتھ یہود کا بھی تذکرہ ہوا، جن کے جرائم کی وجہ سے ان پر اللہ تعالیٰ نے چند طیّبات کو حرام فرمایا تھا۔ چونکہ مشرکین اور یہود یہی دعویٰ کرتے تھے کہ ہم ملّت ابراہیمی پر قائم ہیں، اور ہم ہی ابراہیم کے اصلی متبعین ہیں، اور حلال وحرام جو سمجھتے

ہیں یہ بھی ملت ابراہیم علیہ السلام کی اقتداء کر کے، اس کے ساتھ یہود یَومُ السّبت کی نسبت بھی ملت ابراہیمی کی طرف کرتے تھے۔

ان آیات میں مشرکین اور یہود دونوں کی تردید ہے۔ جس طرح کہ سورۂ آل عمران میں زوردار لفظوں میں ان کی تردید ہو چکی ہے، فرمایا:

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَّمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾

[آل عمران: ٦٧] (ابراہیم نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، بلکہ وہ تو سیدھے سیدھے مسلمان تھے، اور شرک کرنے والوں میں کبھی شامل نہیں ہوئے)۔ یہاں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام امام الموحدین اور برگزیدہ و مقتدا تھے، اور مجتبیٰ بھی تھے، اور صراط مستقیم پر چلنے والے حنیف تھے، تم لوگ اپنے دعوے میں بالکل جھوٹے ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تمہاری نسبت جھوٹی اور بے بنیاد ہے، نہ ان کی ملّت کو تمہارے یَومُ السّبت کے ساتھ کوئی تعلق ہے، اور نہ ملّتِ ابراہیمی کو اشیاءِ طیّبہ کی حرمت کے ساتھ کوئی جوڑ ہے، اور یہ تمام اشیاء جو تم پر حرام ہوئی ہیں، ملت ابراہیمی میں حلال ہیں۔ تو فرمایا:

﴿إِنَّ إِبْرٰهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا﴾ بیشک ابراہیم علیہ السلام پیشوا اور امام و مقتداء تھے، وہ اِیک امت تھے، یعنی وہ اکیلا انسان بجائے خود ایک اُمت تھے۔ جب دنیا میں کوئی مسلمان نہ تھا، تو ایک طرف وہ اسلام کے علمبردار تھے، اور دوسری طرف ساری دنیا کفر کی علمبردار تھی، اس اکیلے بندۂ خدا نے وہ کام کیا جو ایک اُمت کے کرنے کا تھا، وہ ایک شخص نہ تھے، بلکہ ایک پورا ادارہ تھے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی ذات میں وہ تمام کمالات جمع فرما دیئے تھے جو ایک پوری اُمت میں بحیثیت مجموعی ہو سکتے ہیں، اس طرح وہ جامع الکمالات تھے۔

لَيْسَ عَلَى اللهِ بِمُسْتَنْكَرٍ ★ أَنْ يَجْمَعَ الْعَالَمَ فِي وَاحِدٍ

یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں کہ پورے جہاں کے کمالات کو کسی ایک انسان میں جمع فرما دے۔

﴿وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ تاہم یہاں مقتدا و پیشوا اور امام مراد ہے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے: إِنَّ مُعَاذًا كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلّٰهِ۔ کسی نے اُمت کے کہنے پر اعتراض کیا، تو ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اُمت کا ایک معنی معلّم الخیر بھی ہوتا ہے۔ یہ صفت معاذ رضی اللہ عنہ میں موجود تھی، وہ بڑے معلّم الخیر تھے، جن کے مناقب بہت ہیں۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بڑھ کر معلّم الخیر کون ہو سکتا ہے؟

﴿قَانِتًا لِّلّٰهِ﴾ وہ اطاعت گزار تھے، تسلیم وانقیاد کے پیکر تھے۔ قُنُوت کا معنی اطاعت، خضوع کے بھی ہیں۔ سورۂ زمر میں ارشاد ہے: ﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا﴾ [الزمر: ۹] (بھلا جو رات کی گھڑیوں میں عبادت کرتا ہے کبھی سجدے میں کبھی قیام میں)۔ بھلا جو شخص رات کی گھڑیوں میں سجدے اور قیام کے ذریعے اطاعت کا حق ادا کرتا ہے، کیا وہ ناشکروں اور نافرمانوں کی طرح ہو سکتا ہے؟

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام مکمل اطاعت گزار اور شکر گزار تھے، ساتھ ساتھ:

﴿حَنِيْفًا﴾ اور حنیف بھی تھے، ہر طرف سے کٹ کر، ہر باطل دین سے ہٹ کر قوم و قبیلے سے کٹ کر، صرف اور صرف خدا کے سچے دین پر پروانہ کی طرح لگاؤ رکھتے تھے۔ حَنِیف عربی میں اس اونٹ کو کہتے ہیں جو پاؤں جھکا کر چلتا ہو، یعنی ایک طرف مائل ہو، تو ابراہیم علیہ السلام اس لحاظ سے حنیف ہیں کہ وہ ہر طرف سے ہٹ کر صرف ایک طرف لگنے والے تھے، اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے عام مؤمنوں کو بھی حنیفیت اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ فرمایا: ﴿حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ﴾ [الحج: ۳۱] (تم یکسوئی کے ساتھ اللہ کی طرف رخ کیے ہوئے ہو)۔ ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ﴾ [البینة: ۵] (اور انہیں اس کے سوا کوئی اور حکم نہیں دیا گیا تھا کہ وہ اللہ کی عبادت اس طرح کریں کہ بندگی کو بالکل یکسو ہو کر صرف اسی کے لیے خاص رکھیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور یہی سیدھی سچی امت کا دین ہے)۔

لہٰذا مشرکین کو شرم آنی چاہیے جو تمام تر شرک و کفر کے باوجود اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں کہ ہم ان کے دین پر ہیں، ان کا حال تو یہ ہے کہ حلال و حرام خود اپنی طرف سے ٹھہرا لیتے ہیں، اور ذات و صفات اور عبادت میں اللہ تعالیٰ کا شریک مانتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو حنیف تھے، شرک کے مٹانے والے تھے، صرف ایک معبود کی عبادت میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

﴿وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ وہ قطعاً مشرکین میں سے نہیں تھے، وہ اسی توحید کی خاطر اور شرک کے خلاف اکیلے تن تنہا بے مثال جہاد کر کے نمرود کی تاریخی آگ میں ڈالے گئے تھے، تم مشرکین بے حیاء و بے شرم ہو کر کس منہ سے اپنے آپ کو ابراہیمی کہنے کی جسارت کرتے ہو؟

﴿شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ﴾ آپ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والے تھے، جبکہ تم نے اللہ تعالیٰ کی ہزاروں

نعمتوں میں سے آج تک کسی ایک نعمت کا بھی شکر ادا نہیں کیا، اور ہر طرح کی ناشکری پر ڈٹے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی سب سب بڑی اور نمایاں نعمت جو تمہارے پاس ہے، یعنی رسول مقبول آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی، جس کی تکذیب و ناشکری پر مسلسل جم کر تم لوگوں نے بڑی حماقت کی، اور اس کو چھوڑ کر اس کے مقابلے میں کفر و شرک اختیار کیا۔ سورۂ ابراہیم میں ارشاد ہے: ﴿اَلَمۡ تَرَ اِلَى الَّذِيۡنَ بَدَّلُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰهِ كُفۡرًا وَّاَحَلُّوۡا قَوۡمَهُمۡ دَارَ الۡبَوَارِ جَهَنَّمَ يَصۡلَوۡنَهَا﴾ [ابراهيم: ٢٨] (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے اللہ کی نعمت کو کفر سے بدل ڈالا، اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں لا اتارا، جہنم ہے جس میں وہ داخل ہوں گے)۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس آیت میں نِعۡمَتَ اللّٰهِ سے مراد آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی ہے۔ [بخاري]

﴿اِجۡتَبٰىهُ وَهَدٰىهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسۡتَقِيۡمٍ﴾ اللہ تعالیٰ نے آپ کو برگزیدہ بنایا، آپ علیہ السلام کو اپنے دین کے لئے انتخاب فرما کر ﴿اِنِّىۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ [البقرة: ١٢٤] (میں آپ کو لوگوں کے لیے امام بنانے والا ہوں) کی خلعت سے نوازا، اور آپ علیہ السلام کو سیدھے راستے کی طرف ہدایت دی، جس کے نتیجے میں انہیں دارین کی سعادت سے مالا مال فرما کر ﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبۡرٰهِيۡمَ خَلِيۡلًا﴾ [النساء: ١٢٥] (اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنالیا)۔ آپ علیہ السلام کو مقامِ خلت کے اونچے بلند و بالا مقام پر فائز فرمایا، اور اس کے ساتھ:

﴿وَاٰتَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً﴾ ہم نے انہیں دنیا میں خوبیوں اور شرافتوں، نبوت اور ذکر خیر سے نوازا، قیامت تک آپ علیہ السلام کا ذکر خیر (جسے یہود و نصاریٰ اور مشرکین نے چھوڑ کر بھلا کر) اس آخری سرتاج اُمت نے سینے سے لگایا، اور رہتی دنیا میں قیامت تک حج وعمرہ، قربانی، طواف وسعی وغیرہ سیکڑوں اعمال وافعال کے ساتھ حتی کہ التحیات کے درود شریف تک میں آپ علیہ السلام کا ذکر بلا توقف جاری رہے گا۔

﴿وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ﴾ اور آخرت میں بھی نیکوکار لوگوں میں شامل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا، ہزاروں پیغمبر آپ علیہ السلام کی نسل میں آئے، سارے عالم اسلام کا قبلہ اور اس کے متعلق اعمال آپ علیہ السلام کے یادگار ہیں۔ یہ آخری پیغمبر رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وسلم آپ علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اور ان کی ملّت آپ علیہ السلام کی ملت کی تفسیر و تفصیل ہے۔ اسی بناء پر انہیں ﷺ آپ علیہ السلام کے اِتباع کا حکم ہے۔ اسی کو فرمایا:

﴿ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا﴾ پھر ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی۔ یہ خطاب

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے کہ آپ ملّت ابراہیمی کی پیروی اختیار کریں، آپ کی ملّت وہی دین حق دین اسلام ہے، جو ابتداء سے چلا آرہا ہے۔ دین تمام نبیوں علیہم السلام کا ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، اور ملّت سے مراد بڑے بڑے اصول ہیں، جو ہمیشہ یکساں رہے ہیں، اور ملّت میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، البتہ ہر نبی ورسول کی شریعت واحکام ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

﴿وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ تاکید کے لحاظ سے دوبارہ فرمایا کہ آپ علیہ السلام مشرکین میں سے نہیں تھے۔ آپ علیہ السلام امام المتقین، رئیس الموحدین تھے، اور ابوالانبیاء بھی تھے، لہٰذا مشرکوں کو آپ علیہ السلام کا نام لیتے ہوئے اپنی طرف نسبت کرنے پر شرم آنی چاہئے۔ اسی طرح یہود جو کہتے تھے کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر ملّت ابراہیمی پر ہیں تو پھر ہفتے کے دن کی تعظیم اور اس روز خاص عبادت کیوں نہیں کرتے؟ اس کا جواب ارشاد ہوا:

﴿اِنَّمَا جُعِلَ السَّبْتُ عَلَى الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ بیشک ہفتے کے دن کی خصوصیت (تعظیم اور خاص عبادت) ان لوگوں کے لئے مقرر کی گئی تھی جنہوں نے اس دن کے بارے میں اختلاف کیا تھا، اور اس دن کی تعظیم و عبادت ملّت ابراہیمی کا حصہ نہیں رہا، بلکہ یہ حکم بہت بعد کا ہے، جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر انبیاء علیہم السلام بنی اسرائیل کے زمانہ میں ہوا۔ اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہوئی، جیسے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے جمعہ کا خصوصی دن عبادت کے لئے مقرر فرمایا ہے، لہٰذا اس دن کاروبار ترک کر کے محض اللہ تعالیٰ کی عبادت کرلیا کرو۔ مگر یہودیوں نے اس دن کی فضیلت کو تسلیم کرنے میں اختلاف کیا، وہ کہنے لگے کہ ہم تو اس دن کو خاص دن تسلیم کریں گے، اور کاروبار ترک کر کے عبادت کریں گے جس دن اللہ تعالیٰ کائنات کو پیدا کرنے کے بعد فارغ ہوا تھا، اور وہ دن ہفتے کا دن بنتا ہے۔

اس کی تفصیل تورات میں مذکور ہے، قرآن کریم میں اشارہ سے ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری کائنات کو چھ دن میں مکمل کیا، پھر حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کے دن آخری وقت میں ہوئی۔ کائنات کی تخلیق کا سلسلہ چھ دن میں مکمل ہوگیا، اور ہفتہ کا دن خالی رہا۔ تو یہودیوں نے اسی دن کا انتخاب کرلیا، اور جمعہ کو منظور نہیں کیا، تو انہوں نے جمعہ کے بارے میں اختلاف کیا، یعنی نبی کی بات نہ مانی۔

اسی طرح نصاریٰ پر بھی جمعہ کا دن پیش کیا گیا کہ اس دن اللہ تعالیٰ کی خاص عبادت کریں، مگر انہوں نے جمعہ کو تسلیم نہیں کیا، اور کہنے لگے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہود کی عید ہمارے بعد ہو، لہٰذا انہوں نے اتوار کے دن کو اختیار کیا،

جو یہود کی عید سے دوسرے ہے۔ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ جمعۃ المبارک کی سعادت و برکت اللہ تعالیٰ نے ہمارے حصے میں رکھی تھی، جو ہمیں نصیب ہوئی، جس سے اہل کتاب محروم رہے۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: نَحْنُ الْآخِرُوْنَ وَالْأَوَّلُوْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بَيْدَ أَنَّ أُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِنَا۔ ہم سب سے آخر میں آنے والے ہیں، مگر قیامت والے دن سب سے پہلے ہوں گے، یہود ہم سے ایک دن بعد، اور نصاریٰ ان سے ایک دن بعد، علی الترتیب ہفتہ اور اتوار کو پیش ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے جمعہ کے دن کو تمام ایام پر فضیلت بخشی ہے، اور اسے سید الایام کا لقب دیا ہے کہ یہ ہفتہ کے تمام دنوں کا سردار ہے، اللہ تعالیٰ نے اس آخری اُمت کے لئے جمعۃ المبارک کا دن عبادت کے لئے مقرر فرمایا ہے، مگر اس طرح زیادہ سختی نہیں کی ہے جس طرح کی گرفت یہود پر ہوئی، جب انہوں نے ہفتہ کی بے احترامی کی، بجائے عبادت کے دوسرے دنیاوی کام کرنے لگے، تو ان پر طرح طرح کے عذاب آئے، ان کی شکلیں بدل گئیں، اور ستر اسی ہزار کے قریب لوگ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں سور اور بندر بن گئے، پھر تین دن کے اندر سارے مر گئے۔

مگر اس اُمت پر ربّ العزت سبحانہ کا اتنا کرم ہے کہ ان پر جمعۃ المبارک کے احترام اور عبادت میں سختی نہیں فرمائی کہ بے احترامی کی صورت میں کوئی عذاب آجائے، حالانکہ بہت سے مسلمان ملکوں میں جمعہ کے احترام کا کوئی نام و نشان تک نہیں۔ مغرب اور یورپ نے انہیں اسلام سے اتنا بیگانہ اور دور رکھا ہوا ہے کہ جمعہ کو جانتے بھی نہیں، تمام سرکاری ملکی دفتری چھٹی، کاروبار، عیسائیوں کی طرح اتوار کو ہوتا رہتا ہے، اور ہفتہ وار تعطیل بھی اتوار کو ہوتی ہے۔ عوام الناس اور علماء کرام کا کوئی سنتا بھی نہیں۔ بڑے حکمران لوگ اور سربراہ اتنے مرعوب و خوفزدہ ہیں کہ اپنے آقا یورپ کی ہاں میں ہاں ملانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں جانتے، اور وہ صرف نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ جب وہ دنیا کو خیر باد کر کے چھوڑیں گے تو برزخ میں انہیں معلوم ہوگا کہ کیا کھویا کیا پایا۔ افسوس کی بات ہے کہ جو ملک صرف اسلام کے نام پر بنا ہے آج اس میں اسلام کا نام لینا جرم ہے۔

ہندوؤں کے ملک میں ہندومت کا قانون ہے، یہودیوں کے ملک میں یہودیت کا، عیسائی ملکوں میں عیسائیت کا قانون ہے، انہوں نے اپنے قانون سے کوئی بغاوت نہیں کی، صرف ہم مسلمان ہی اپنے قانون کے باغی بنے ہوئے ہیں۔ ساٹھ کے قریب مسلمان ملکوں میں کوئی ایک ملک ایسا نہیں جس میں کتاب و سنت پر مبنی اسلامی قانون ہو۔ ہمارے مسلمان ممالک سرمایہ دار، مالدار ہوتے ہوئے یورپ کی مدح اور قصیدہ خواں ہیں، انہوں نے

اسلام کے عادلانہ نظام کے خلاف "جمہوریت" بنائی، آج ہمارے عوام وخواص اس کی پرستش میں یورپ سے بھی زیادہ پیش پیش ہیں۔

قیامت ہے کہ وہ اب بیٹھ کر آنسو بہاتا ہے ☆ جسے سونپا گیا تھا کام دنیا کی امامت کا

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کو ربّ العزّت سبحانہ نے سید الایام جمعہ کا دن عطاء فرمایا، جس کی فضیلت ابدی بھی ہے، اور ازلی بھی۔ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق جمعہ کو ہوئی، اس اُمت کا جو کوئی مسلمان جمعہ کو وفات پائے گا عذاب قبر سے ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگا۔ قیامت بھی جمعہ کو قائم ہو جائے گی، جنتیوں کا دخول جنت میں جمعہ کو ہوگا۔ ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ کی زیارت کا شرف جنتیوں کو جمعہ کے دن ہوگا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جمعہ کا دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے دن سے بھی افضل ہے۔ [مشکوٰۃ: ۱۲۰] کیوں نہیں، اس میں ساعتِ اجابت بھی ہے، اور اس کے نام پر قرآن کی مکی سورت کا نام بھی ہے۔ فَلِلّٰهِ الحَمدُ وَلَهُ الشُّكر

اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ بِالۡحِكۡمَةِ وَالۡمَوۡعِظَةِ الۡحَسَنَةِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِىۡ هِىَ اَحۡسَنُ‌ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعۡلَمُ بِمَنۡ ضَلَّ عَنۡ سَبِيۡلِهٖ وَهُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُهۡتَدِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾

ترجمہ: اپنے ربّ کی راہ کی طرف حکمت اور موعظہ حسنہ کے ذریعہ بلایئے، اور ان سے ایسے طریقے پر بحث کیجئے جو اچھا طریقہ ہو، بلاشبہ آپ کا ربّ اُن کو خوب جاننے والا ہے جو اس کی راہ سے بھٹک گئے، اور وہ ان کو خوب جانتا ہے جو ہدایت کی راہ پر چلنے والے ہیں ﴿۱۲۵﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

اوپر کی آیتوں میں مخاطبین کو آگاہ کرنا تھا کہ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اصلی ملّت ابراہیمی لے کر آئے ہیں، اگر کامیابی چاہتے ہو، اور حنیف ہونے کے دعوے میں سچے ہو، تو اس راستہ پر چلو:

﴿اُدۡعُ اِلٰى سَبِيۡلِ رَبِّكَ﴾ یعنی صحت عقائد، مکارم اخلاق، بلندی حوصلہ، وسعت نظر، دعوت وارشاد کا حکیمانہ انداز، دلائل کی پختگی، اخلاص وللٰہیت، بیان کی دلنشینی اور منکرین کے جور وجفا کے مقابلہ میں حلم وبردباری،

یہ وہ سنتِ ابراہیمی ہے کہ جس کی پیروی کا حکم اس آیت میں دیا جارہا ہے، جو شخص تبلیغ وارشاد کی ذمہ داری سنبھالتا ہے، تو اُسے ان امور کے تحت کام کرنا چاہئے، اوراگر کسی میں یہ اوصاف نہ ہوں تو پھر اُسے تبلیغ وارشاد کا کوئی حق اور جواز نہیں، کیونکہ ایک کم علم، بے حوصلہ اورغیر تربیت یافتہ مبلغ اپنی دعوت کے لئے دعوت کے دشمنوں سے زیادہ ضرررساں اورنقصان دہ ہوسکتا ہے۔ اگراس کی پیش کی گئی دلائل بودے اور کمزور ہوں گی۔

اگراس کا اندازِ خطابت درشت اور معاندانہ ہوگا، یااس میں اخلاص کا فقدان ہوگا، اوراس کی تبلیغ للّٰہیت کے نور سے محروم ہوگی، تو اپنے سامعین کو بجائے قائل کرنے اور منوانے کے متنفر کردے گا۔ پس چاہئے کہ بیوقوفوں کی طرح اندھا دھند تبلیغ نہ کی جائے، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، حالات کے اور موقع ومحل کے تقاضوں کے مطابق، یعنی مقتضی حال کا لحاظ کر کے کیا جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کوایک ہی ڈنڈے سے نہ ہانکا جائے، کہیں ایسا نہ ہو کہ مجلس وعظ تجارت پیشہ لوگوں کے لئے منعقد ہو، اور مولانا صاحب واقعہ معراج کی تفصیلات بیان کررہا ہو، بلکہ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل ودماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

یہاں حکم تو سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے توسط سے ساری اُمت کو اس کا حکم دیا جارہا ہے کہ عوام الناس کو کس طرح راہِ راست پر لانا چاہئے۔ آیت کریمہ میں اس کے تین طریقے بتلائے: حکمت، موعظہ حسنہ، جدال بالتی ہی احسن۔

☆......حکمت سے بعضوں نے قرآن مجید مراد لیا ہے۔[مظهري] اور بعضوں نے حدیث مراد لی ہے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ حکمت وہ صحیح بات ہے جو نفس انسانی میں خوبصورت طریقہ پر واقع ہوجائے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نہایت پختہ اوراٹل مضامین، مضبوط دلائل وبراہین کی روشنی میں، حکیمانہ انداز سے پیش کئے جائیں، جن کو سن کر فہم وادراک، اور علمی ذوق رکھنے والا طبقہ گردن جھکا سکے۔ دنیا کے خیالی فلسفے ان کے سامنے ماند پڑ جائیں، اور کسی قسم کی علمی ودماغی ترقیات وحی الٰہی کے بیان کردہ حقائق کو ایک گونہ بھی تبدیل نہ کرسکیں۔

☆......موعظہ حسنہ مؤثر اور رقت انگیز نصیحتوں سے عبارت ہے۔ فارسی کا مقولہ ہے: ”از دل خیزد بردل ریزد“۔ جو لوگ عامل بالقرآن والحدیث ہوتے ہیں، جن کا شعار تقویٰ ہوتا ہے، یہ شرف انہیں حاصل رہتا ہے کہ ان کی بلاتکلف سادہ باتیں لوگوں کے دلوں کی کیفیت بدل دیتے ہیں۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر کرتی ہے ☆ پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

موعظہ حسنہ میں اخلاص، دلسوزی، نرم خوئی کی روح بھری رہتی ہے۔ اخلاص، شفقت، حسن اخلاق، حسن کردار، حسن گفتار کے طرز وطریقہ پر جو نصیحت کی جاتی ہے بسا اوقات پتھر دل بھی موم ہوجاتے ہیں۔ کئی گھنٹے گزرنے کے باوجود لوگ نہ سیر ہوتے ہیں، نہ تھکاوٹ محسوس کرتے ہیں۔ ایسے مؤثر وعظوں سے مردہ بھی شاید زندہ ہوتے ہیں، اور بڑے بڑے مجرم اپنے جرم سے تائب ہوجاتے ہیں، اور غیر مسلم حلقہ بگوش اسلام ہوجاتے ہیں۔

حضرت امیر شریعت، خطیب ملت، سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ ایسے ہی انوار وبرکات کے حامل ہوتے تھے، جنہیں سید کائنات کے ساتھ خصوصی نسبت حاصل تھی، جس کی بدولت وہ اس مقام پر پہنچے تھے۔

ایسے مواعظ حسنہ کا یہ نمایاں اثر ہوتا ہے کہ جنہیں سن کر لوگ منزل مقصود کی طرف بیتابانہ دوڑ لگاتے ہیں، اور بالخصوص وہ جو زیادہ عالی دماغ اور فہیم وذکی نہیں ہوتے، مگر طلب کی چنگاری سینے میں رکھتے ہیں، ان میں مؤثر وعظ ونصیحت سے عمل کی ایسی اسٹیم بھری جاسکتی ہے جو بڑی اونچی عالمانہ تحقیقات کے ذریعہ ممکن نہیں۔

ہاں! دنیا میں ہمیشہ سے ایک ایسی جماعت بھی موجود رہی ہے جن کا کام ہر چیز میں الجھنا، اور بات بات میں حجتیں نکالنا، اور کج بحثیں کرنا ہوتا ہے۔ یہ لوگ نہ حکمت کی باتیں قبول کرتے ہیں، نہ وعظ ونصیحت سنتے ہیں، نہ حق کی طرف آنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہر مسئلہ میں بحث ومناظرہ کا بازار گرم ہو۔ بعض اوقات اہل فہم وانصاف، اور طالبینِ حق کو بھی شبہات گھیر لیتے ہیں، اور بدون بحث ومباحثہ کے تسلی نہیں ہوتی، اس لئے:

﴿وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ فرمادیا کہ اگر ایسا موقع پیش آئے تو بہترین طریقہ سے، شائستگی، حق شناسی، نرمی، رواداری اور انصاف کے ساتھ بحث کرو۔ اپنے حریف مقابل کو الزام دو تو بہترین اسلوب سے دو، خواہ مخواہ دل آزاری اور جگر خراش باتیں مت کرو، جن سے کسی فتنہ وفساد کا امکان پیدا ہو۔ مقصود احقاقِ حق ہونا چاہئے، الزام تراشی، عیب جوئی وغیرہ نہ ہو، بداخلاقی، ہٹ دھرمی نہ ہو۔

اور یہ یاد رکھو کہ اگر آپ کا حریف مقابل باطل پر ہو، اور کوئی بدمذہب، مشرک، شیعہ، بدعتی، منکر ختم نبوت، یا منکر حدیث، یا اسی طرح کا اور کوئی اہل باطل ہو تو اس کی یہ کوشش ہوگی کہ احقاقِ حق سے پہلے، اور حقیقت ظاہر ہونے سے پہلے مجلس برخاست ہو، اور اس کا باطل عقیدہ لوگوں کے سامنے واضح نہ ہو۔ تو وہ اس مقصد کے لئے طرح طرح کا حربہ استعمال کرے گا، اور بدزبانی، بدکلامی سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ آپ کے جذبات کے ساتھ کھیلنا چاہے گا

تا کہ آپ بھی غصہ میں آ کر کچھ تلخ کلامی پر اتر آئیں، اور معاملہ درہم برہم ہو جائے، مگر آپ صبر و استقلال کا، اور تحمل و بردباری کا پیکر بن کر سب کچھ برداشت کریں، اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا تہیہ کر کے دشمن سے میدان جیتنے کی کوشش کریں۔ بتوفیق اللہ

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ پر بھی اسی حکمت و مصلحت کی تاکید کی، فرمایا: ﴿وَلَا تُجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتٰبِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾[العنکبوت:٤٦] (اور اہل کتاب سے بحث مباحثہ نہ کرو مگر بہتر طریقہ سے)۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے جب حضرت موسیٰ و حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کی طرف بھیجا، تو فرمایا: ﴿فَقُولَا لَهُ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهُ يَتَذَكَّرُ أَوْ يَخْشٰى﴾ [طٰہٰ: ٤٤] (یعنی تم دونوں بھائی فرعون کے پاس جاؤ، کیونکہ وہ بہت سرکشی پر اتر آیا ہے، سو تم دونوں اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، ممکن ہے کہ وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے)۔

قرآن کریم نے بار بار انبیاء کرام علیہم السلام کی اپنی قوموں کی تبلیغ کا تذکرہ کیا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ رِفق و تلطف کا پہلو اور دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ قوموں نے ان کی تکذیب کی، انہیں اذیتیں پہنچائیں ہیں، طرح طرح کی تکلیفیں دیں، اور قتل، واخراج، وجلاوطنی کی دھمکیاں بھی دیتے رہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے پیارے انبیاء علیہم السلام بطیبِ خاطر برداشت کرتے رہے، اور صبر و استقلال پر ثابت قدم رہے، عفو و درگزر سے کام لیتے رہے۔

میدانِ طائف میں قبیلہ ثقیف کے ایک سو کے قریب غنڈے لاٹھیوں اور پتھروں سے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ الجھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب کر کے بے تحاشا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پتھر مارتے رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رفیق زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہر چند انہیں سمجھاتے رہے، مگر وہ باز نہیں آئے۔ تین میل تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعاقب جاری رکھ کر سنگباری کرتے رہے۔ پھولوں سے زیادہ نازک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک بدن لہولہان ہو گیا، جوتے خون سے بھر گئے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک باغ کے پاس آ کے رکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنے نڈھال تھے کہ پاؤں سے جوتے نہ اتار سکیں۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ نے کس مشکل سے جوتے اتارے، جن میں خون جم گیا تھا، وہاں تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہاں سے براستہ نخلہ مکہ کے لئے روانہ ہو گئے، تو پہاڑی کے دامن میں حضرت جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ فرمایا: یہ میرے ساتھ ملک الجبال آپ کو سلام کرتا ہے۔ اس پر ملک الجبال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملا، اور اجازت طلب کی کہ اگر آپ اجازت دیں گے تو میں لمحوں میں "اخشبین" یعنی طائف پر محیط دونوں پاڑوں کو آپس میں ٹکرا کر پوری آبادی کو پیس کر رکھ دوں گا، کچھ بھی نہیں رہے گا، سب تباہ ہو جائیں گے، تو فرمائیے!

اس پر حضرت رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہرگز نہیں، یہ لوگ ابھی مجھے جانتے نہیں، اگر جانتے ہوتے تو شاید ایسا نہ کرتے، انہیں معاف کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ نہ سہی شاید ان کی نسل مجھے تسلیم کرے، اور اسلام قبول کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ فتح مکہ کے بعد یہ لوگ مسلمان ہو گئے۔

وَاِنۡ عَاقَبۡتُمۡ فَعَاقِبُوۡا بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبۡتُمۡ بِهٖ‌ ؕ وَلَئِنۡ صَبَرۡتُمۡ لَهُوَ خَيۡرٌ لِّلصّٰبِرِيۡنَ ﴿۱۲۶﴾ وَاصۡبِرۡ وَمَا صَبۡرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ‌ وَلَا تَحۡزَنۡ عَلَيۡهِمۡ وَلَا تَكُ فِىۡ ضَيۡقٍ مِّمَّا يَمۡكُرُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيۡنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيۡنَ هُمۡ مُّحۡسِنُوۡنَ ﴿۱۲۸﴾

ترجمہ: اور اگر تم بدلہ لینے لگو تو اسی جیسا بدلہ لو جیسا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا، اور اگر تم صبر کرلو تو البتہ وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے ﴿۱۲۶﴾ اور آپ صبر کیجئے، اور آپ کا صبر کرنا بس اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے ہے، اور ان پر غم نہ کیجئے، اور یہ لوگ جو کچھ تدبیر کرتے ہیں اس کے بارے میں تنگ دل نہ ہو جایئے ﴿۱۲۷﴾ بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا، اور جو خوبی کا راستہ (طریقہ) اختیار کرنے والے ہیں ﴿۱۲۸﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بدلہ لینے کا اصول بتایا ہے، اور صبر کی فضیلت بتائی ہے، اور متقین ومحسنین کا شرف بھی ذکر فرمایا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب ومعیت حاصل ہے۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ یہ آیات شہداء اُحد کے بارے میں نازل ہوئیں، بلکہ مظہری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں تک لکھا ہے کہ غزوۂ اُحد کے بعد اسی مقام پر ان آیات کا نزول ہوا (ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ سورۂ نحل کی یہ آخری تین آیتیں مدنی ہیں)۔

غزوۂ اُحد میں ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم شہید ہوئے۔ کافروں نے ان کے ناک کان کاٹ دیئے تھے، اور اکثر کے پیٹ بھی چاک کئے تھے، جب مسلمانوں نے یہ حال دیکھا تو کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے آئندہ ہمیں ان پر غلبہ دیدیا تو ہم بھی ان کے مقتولین کے ساتھ ناک کان کاٹنے کا معاملہ کریں گے۔ ان ہی شہداء میں سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے، جو کہ آپ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محبوب چچا تھے، ان کے بھی ناک کان بہ نسبت دیگر شہداء کے نہایت بے دردی کے ساتھ کاٹے گئے تھے، اور ان کے پیٹ کو شق کرکے ان کے جگر کو نکالا گیا تھا، اور مشرکین کی

عورتوں نے چبا کر رکھ دیا تھا۔

جب آنحضرت ﷺ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا کہ اگر آئندہ اللہ تعالیٰ نے مجھے غلبہ عطاء فرمایا تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے بدلہ میں ستر کافروں کے ناک کان کاٹ کر ان کا مثلہ کروں گا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان آیات کو نازل فرمایا کہ:

﴿وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ یہ اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بدلہ لینے میں تعدّی کرے۔ ابھی چند آیات پہلے فرمایا کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ﴾ [النحل:٩٠] (اللہ انصاف کا حکم دیتا ہے)۔ تو عدل کا معنی برابری ہے۔ ہاں! اگر تمہیں بدلہ لینا ہو تو اس جیسا بدلہ لے سکتے ہو جیسا کہ تمہارے ساتھ زیادتی کی گئی ہے۔ بدلہ میں زیادتی ظلم ہے، جو کہ جائز نہیں، لیکن اگر معاف کر کے صبر کرو گے جیسا کہ تمہاری شان ہے، تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہتر ہے۔

جب یہ آیت اُتری تو سرور عالم ﷺ نے فرمایا: ہم صبر کریں گے، اور بدلہ لینے کا ارادہ بالکل ترک فرمایا۔ پھر فرمایا:

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ اور آپ صبر کیجئے، اور آپ کا صبر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، اور اس کی توفیق سے ہے۔ اور مخالفت کرنے والوں پر غم نہ کیجئے، اور یہ لوگ جو تدبیریں کرتے ہیں اس پر تنگدل نہ ہو جایئے۔ آپ اپنا کام جاری رکھیں، اللہ تعالیٰ کی نصرت و معیت آپ کے ساتھ ہے۔ اسی طرح جو کوئی تقویٰ اختیار کرے گا، یا احسان و بھلائی کا کام انجام دے گا، تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی نصرت اور معیت کو اپنے ساتھ پائے گا، اور جس کسی کو یہ معیت کی نعمتِ عظیمہ حاصل ہو وہ کامیاب و کامراں رہے گا، اور اس کا دشمن ناکام و بے مراد رہے گا۔

الحمدللہ سورۂ نحل ختم ہوئی۔

سُورَۃُ الْاِسْرَاءِ

مکیۃٌ آیاتہا ۱۱۱ رکوعاتہا ۱۲

سورۂ اسراء مکی ہے، اس میں ایک سو گیارہ (۱۱۱) آیتیں، اور بارہ (۱۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

سورۂ بنی اسرائیل، اور سورۂ اسراء۔ چونکہ اس سورت میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے اس لئے یہ بنی اسرائیل کے نام سے مشہور ہے۔ نیز اس میں اسراء اور معراج کا ذکر ہے، اس لئے اسراء بھی اس کا نام ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکی ہے۔ البتہ جمہور مفسرین کے نزدیک اس میں دو آیتیں مدنی ہیں، یعنی آیت ۷۶، اور آیت ۸۰۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں سترہویں (۱۷) نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں پچاسویں (۵۰) نمبر پر ہے۔ اس کا نزول سورۃ القصص کے بعد ہے۔

تعداد آیات، کلمات اور حروف:

اس سورت میں بارہ (۱۲) رکوع، ایک سو گیارہ (۱۱۱) آیات، ۱۵۸۲ کلمات، اور چھ ہزار سات سو دس (۶۷۱۰) حروف ہیں۔

ربط و مناسبت:

(۱) گزشتہ سورت میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے فرائض کا بیان تھا، اس سورت میں آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی رفعتِ شان کا

بیان ہے۔(۲) گزشتہ سورت کے آخر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صبر کا حکم ہوا، اس سورت کے شروع میں صبر کے ثمرہ، یعنی معراج کا بیان ہے۔(۳) دونوں سورتوں میں توحید، رسالت، معاد کا برابر تذکرہ ہے۔(۴) گزشتہ سورت میں شہد کو شفاء کہا گیا، اس سورت میں قرآن حکیم کو۔(۵) دونوں سورتوں میں صداقت قرآن کریم کا یکساں بیان ہے۔

مختصر موضوع:

دعوت الی القرآن، حقوق اللہ وحقوق العباد کا تذکرہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تائید میں حضرت موسیٰ ،حضرت نوح، حضرت داؤد علیہم السلام کا ذکر، انبیاء علیہم السلام کی تصدیق کے ضمن میں طوفانِ نوح، بنی اسرائیل کی سرکشی، اوران کی سزا کا بیان، منکرین رسالت کے شبہات کا جواب، دنیا کی مذمت اوراس کی بے ثباتی کا بیان، قرآنی اعجاز کا بیان، منکرین توحیدورسالت، اورقیامت کے لئے سخت وعید، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ودیگر بہت سی باتوں کا تذکرہ۔

﴿الجزء الخامس عشر﴾

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا
الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا ؕ اِنَّہٗ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡبَصِیۡرُ ①

ترجمہ: پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کوایک رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سفر کرایا، جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، تاکہ ہم اسے اپنی آیات دکھائیں، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے①

معارف ومنازل

یہ وہی واقعہ ہے جو اصطلاحاً معراج اور اِسراء کے نام سے مشہور ہے۔اکثر اور معتبر روایات کی رُو سے یہ واقعہ ہجرت سے ایک سال پہلے پیش آیا۔حدیث اور سیرت کی کتابوں میں اس واقعہ کی تفصیلات بکثرت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، جن کی تعداد پچیس (۲۵) تک پہنچتی ہے۔ان میں سے مفصل ترین روایات حضرت انس بن مالک، حضرت مالک بن صعصعہ، حضرت ابوذر غفاری اور حضرت ابو ہریرہ رضوانُ اللہ عَلَیھِم أجمَعین سے مروی ہیں۔ان کے علاوہ حضرت عمر بن خطاب، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن

عباس، حضرت ابو سعید خدری، حضرت حذیفہ بن یمان، حضرت عائشہ صدیقہ اور متعدد دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس کے بعض اجزاء بیان کئے ہیں۔

معراج اور اِسراء کا مفہوم و معنی:

علماء کرام کی اصطلاح میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کی سیر کو اِسراء کہتے ہیں، اور مسجد اقصیٰ سے سدرۃ المنتہیٰ تک کی سیر کو معراج کہتے ہیں۔ اور بسا اوقات اوّل سے آخر تک کی پوری سیر کو اِسراء اور معراج سے تعبیر کرتے ہیں۔

معراج کی وجہ تسمیہ:

معراج کو معراج اس لئے کہتے ہیں کہ معراج چڑھنے کی سیڑھی کو کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مبارک سفر مسجد اقصیٰ تک براق پر سوار ہوا، پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی بلندی پر سیڑھی پر طے ہوا، اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے جنت سے سیڑھی لائی گئی، جس کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمان پر چڑھے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں سیڑھی کا ذکر ہے۔ قرآن کریم میں یہ واقعہ سورۂ اِسراء اور سورۂ نجم میں اختصار اور اجمال کے ساتھ مذکور ہے۔ تفصیلات کے لئے احادیث کی طرف رجوع کریں۔

واقعہ معراج اجمالاً قرآنی آیات وکلمات کے ضمن میں:

(۱)......﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْ﴾ دلیلِ وحی۔ اس واقعہ کے ایسے الفاظ سے ابتداء کی گئی ہے کہ جو تنزیہہ الٰہی پر دلالت کرتے ہیں، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت اور توحید الٰہی پر دلیل وحی ہیں۔

﴿اَسْرٰی﴾ اور سَریٰ دونوں لغتیں ہیں، دونوں کے معنی ہیں رات کو سیر کرنا۔ ایک مرتبہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ خدمت گرامی میں رات کو آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَاسریٰ یا جابر؟ اے جابر! رات کو کیوں اور کس لئے آئے؟ سورۂ شعراء اور طٰہٰ میں ہے: ﴿وَاَوْحَیْنَآ اِلٰی مُوْسٰٓی اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْٓ اِنَّکُمْ مُّتَّبَعُوْنَ﴾ [الشعراء: ۵۲] (اور ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ: میرے بندوں کو لے کر راتوں رات روانہ ہو جاؤ، تمہارا پیچھا یقیناً کیا جائے گا)۔

﴿بِعَبْدِہٖ﴾ اپنے بندے کو، یعنی صاحب معراج کو۔ اس لفظ کے اظہار میں دو فائدے ہیں:

(۱) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب وقبولیت کا اظہار۔ (۲) اس عظیم وغریب معجزہ کی وجہ سے کوئی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

اُلوہیت کی جسارت نہ کرے۔

﴿لَیۡلًا﴾ رات کو۔ معراج ارضی کی ابتداء رات کو ہوئی۔ یہاں تنوین تنکیر اور قلّت کے لئے ہے، یعنی نہایت مختصر وقت میں یہ بڑا عظیم الشان سفر رات کے ایک قلیل حصہ میں مکمل ہوا۔

﴿مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ﴾ مسجد حرام کا اطلاق کبھی حرم پر ہوتا ہے، یہاں دونوں معانی درست ہیں، کیونکہ بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حطیم میں تشریف رکھتے تھے، اور بعض حدیثوں میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد حرام کے متصل مغرب کی طرف حضرت اُمّ ہانی بنت ابی طالب رضی اللہ عنہا کے گھر میں آرام فرما رہے تھے۔ فرمایا: فُرِجَ سَقۡفُ بَیۡتِي۔ میں جس گھر میں رہ رہا تھا اچانک دیکھا کہ اس کی چھت کھل گئی، اور حضرت جبرئیل و میکائیل علیہما السلام میرے پاس پہنچے، اور وہاں سے مجھے اٹھا کر حطیم کعبہ میں لائے، اور میرے سینے کو شق کر کے ماء زمزم سے میرے قلب کو دھو کر واپس رکھ دیا۔ یہ چوتھا شق صدر تھا۔ پوری تفصیل سورۃ الشرح کے فوائد میں دیکھیں۔

﴿اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا﴾ مسجد اقصیٰ تک۔ یہاں تک معراج ارضی اپنے اختتام کو پہنچا۔ مسجد اقصیٰ کے معنی ہیں: بہت دور کی مسجد، چونکہ یہ مسجد حرام سے بہت دور ہے یہی اس کی وجہ تسمیہ ہے۔ دونوں چالیس رات کی مسافت سے ایک دوسرے سے دور ہیں۔ جب فرشتوں نے کعبۃ اللہ بنایا تو چالیس سال بعد مسجد اقصیٰ بنائی۔ مسجد اقصیٰ سے بالاتفاق بیت المقدس مراد ہے۔ رات کا سفر محبّ و محبوب کی خلوت و محبت کی دلیل و ثبوت ہے۔

﴿الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ﴾ وہ جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ یہ تمام برکات دنیاوی، مادی اور روحانی ہیں۔ دنیاوی و مادی برکات یہ ہیں کہ وہاں چشمے ہیں، نہریں ہیں، اور نایاب و عمدہ میوہ جات کی کثرت ہے، طور سینا کی پہاڑی ہے، زیتون جیسے ہمہ فوائد اور درختوں کی بھرمار ہے، وغیرہ۔ روحانی برکات یہ ہیں کہ بہت سے بے شمار انبیاء کرام علیہم السلام کا مولد و مدفن اور مسکن ہے۔ پیغمبروں علیہم السلام کے انوار و برکات، فیوض و تعلیمات کا گہوارہ ہے۔ اور اس میں اس پہلو پر اگر دیکھا جائے تو بالکل حق بجانب ہوگا کہ وہاں کے تمام انبیاء علیہم السلام کے کمالات و برکات کو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی میں جمع کرنا مقصود ہو کہ جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام کعبہ ہیں تو اسی طرح امامت مسجد اقصیٰ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امامت میں آجائے، اور اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام القبلتین کے منصب پر فائز ہوں۔

﴿لِنُرِیَہٗ مِنۡ اٰیٰتِنَا﴾ تا کہ ہم اسے اپنی آیات دکھائیں، کیونکہ عجائبات کا مشاہدہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے عالم بالا میں جانے کے بغیر ممکن نہ تھا، اس کی تکمیل کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کمالات قدرت اور عالم غیب کی چیزوں کا

چشم دید حالت سے مشاہدہ کرایا، تاکہ علم الیقین کے بعد عین الیقین حاصل ہو، اور اسی کے ساتھ حق الیقین کا شرف بھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک جزئی مسئلہ میں (احیاء موتی) علم الیقین سے اُوپر ترقی چاہی تا کہ عین الیقین کا منظر معلوم و مشاہدہ ہو۔ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم پوری کائنات کے نبی ہیں، تو آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا مرتبہ بھی اسی کا متقاضی ہے کہ کائنات کی اہم چیزوں تک آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی رسائی ہو۔

﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ﴾ یہ اس طرف اشارہ ہے کہ رؤیت، مشاہدات وآیات اگر چہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل رہیں، مگر بالواسطہ، مثالی طور پر، نہ کہ بلا واسطہ جو کہ اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ ہے، تو سنانے والا اور دکھانے والا صرف اسی ذات پاک ہی کی صفت ہوئی، کہیں کوئی ملحد یہ غلطی نہ کر بیٹھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا علم پیغمبر کو منتقل فرما کرا سے بھی علم غیب کا جاننے والا بنا دیا۔ معاذ اللہ

پیچھے مسئلہ شفاعت، وقیامت، مقام محمود اور آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کا عرشِ الٰہی کے سایہ میں لمبا سجدہ جو کہ ہفتہ عشرہ کے برابر ہوگا، اسی کا غماز ہے، مختصراً عرض ہوا، اور لفظ اَسْرٰی سے لے کر یہاں تک تمام الفاظ اسی مقصد پر دلالت کنندہ ہیں۔

معراج جسمانی ہے، اور بیداری میں، اس پر دلائل:

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تین الفاظ ارشاد فرمائے ہیں، جو کہ آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے معراج جسمانی پر واضح دلیل ہیں:

(۱)......لفظ سُبْحٰنَ: یہ اس وقت بولا جاتا ہے جبکہ عجیب وغریب اور خارق عادت کوئی نشانی دیکھنے میں ہو۔ یہ لفظ اس چیز کی دلیل ہے کہ صاحب معراج کو جسم عنصری کے ساتھ، حالت بیداری میں معراج کرائی گئی، ورنہ خواب کوئی ایسی چیز نہیں ہوتا جس پر اظہار تعجب کے طور پر سبحانَ کا لفظ بولا جاتا ہو۔ [البدایہ والنہایہ، ابن کثیر]

(۲)......بِعَبْدِهٖ: لفظ عبد کا اطلاق زندہ انسان پر جسم اور روح دونوں کے مجموعہ پر ہوتا ہے، اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو جسم مبارک کے ساتھ سیر نہ کرائی گئی ہوتی تو اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ نہ بولا جاتا، بلکہ أسریٰ بِرُوحِ عَبْدِهٖ ہوتا، حالانکہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ [شفاء قاضی عیاض]

(۳) مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کے سفر کو اللہ تعالیٰ نے لفظ اَسْرٰی سے تعبیر فرمایا ہے، اور سریٰ کا اطلاق حقیقتاً رات کی سیر پر ہوتا ہے، جو جسم اور روح دونوں کے ساتھ ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ

بِقِطۡعٍ مِّنَ الَّیۡلِ﴾[ھود: ۸۱] (اے لوط! آپ رات کے کسی حصے میں اپنے لوگوں کو لے کر نکل جاؤ)۔ اس سے قطعاً یہ مراد نہیں کہ لوگوں کی ارواح کو ساتھ لے کر نکل جاؤ، اور جسم یہاں دھرے رہیں، بلکہ جسم اور روح دونوں کو لے کر چلے جانے کا حکم ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا: ﴿وَاَوۡحَیۡنَاۤ اِلٰی مُوۡسٰۤی اَنۡ اَسۡرِ بِعِبَادِیۡۤ اِنَّکُمۡ مُّتَّبَعُوۡنَ﴾ [الشعراء: ۵۲] (اور ہم نے موسیٰ کے پاس وحی بھیجی کہ: میرے بندوں کو لے کر راتوں رات روانہ ہو جاؤ، تمہارا پیچھا یقیناً کیا جائے گا)۔

اس آیت کا مطلب بھی وہی ہے کہ زندہ لوگوں کو جسم و روح کے ساتھ لے کر مصر سے نکلو، بحالت بیداری۔

اسی طرح اسی سورۂ اِسراء کی آیت نمبر ۶۰ میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا جَعَلۡنَا الرُّءۡیَا الَّتِیۡۤ اَرَیۡنٰکَ اِلَّا فِتۡنَۃً لِّلنَّاسِ﴾ [الإسراء: ۶۰] (اور نہیں بنایا ہم نے وہ دکھلاوا جو ہم نے تجھ کو دکھایا، مگر لوگوں کی آزمائش کے لیے) کہ کون آپ کی بات، یعنی معراج کی تصدیق کرے گا، اور کون منکر ہوگا۔

اگر مسئلہ خواب کا ہوتا تو کوئی آزمائش نہ ہوتی، خواب پر تو کوئی سیخ پا نہیں ہوتا، اور کوئی اسے محال اور خلاف عقل نہیں سمجھتا۔ مسئلہ چونکہ بیداری کا تھا، اور اتنے طویل ولمبا سفر کا تھا، پھر اس کا وقت نہایت مختصر رہا، اس لئے اسے غیر ممکن سمجھ کر کچھ نَو مسلم مرتد ہو گئے، اور اہل مکہ نے پوری قوت کے ساتھ انکار کر کے بیت المقدس کے درودیوار اور چند دیگر چیزوں کے متعلق سوالات کئے۔ چنانچہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے وہ سب کچھ لا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے حاضر کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ دیکھ کر ان کے سوالات کے جوابات دیئے، تب وہ خاموش ہو گئے۔ تو کیا کسی خواب پر ایسا ہنگامہ ہو سکتا ہے؟

معراج کب ہوا؟

اس میں علماء سیر کا اختلاف ہے۔ فتح الباری باب المعراج میں دس اقوال منقول ہیں، سب سے زیادہ راجح قول یہی ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی موت کے بعد، اور بیعت عقبہ سے پہلے معراج ہوا۔ یہ بات روایات سے ثابت ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا پانچ نمازیں فرض ہونے سے پہلے وفات پا گئیں، اور یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا شعب ابی طالب میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔ شعب ابی طالب سے نکلنے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رفقاء دس نبوی کو شعب سے نکلے تھے، تو معراج ایک سال بعد ۱۱ نبوی کو ہوا۔

صحیح قول یہی ہے کہ ۲۷ رجب کو معراج ہوا۔ دوسرے مہینوں کے متعلق جو اقوال ہیں وہ صحیح نہیں، مثلاً ربیع الاوّل، ربیع الثانی، رمضان، شوال وغیرہ۔ واللہ اعلم

قصہ اسراء و معراج:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اجمالی طور پر واقعہ اسراء و معراج کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے، تاکہ اوّل سے آخر تک ترتیب وقوعی کا پورا علم حاصل ہو۔ وہ یہ ہے کہ ہجرت مدینہ سے دو تین سال پہلے یہ عجیب واقعہ اس طرح پیش آیا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بہن حضرت اُمّ ہانی رضی اللہ عنہا کے گھر میں بعد از عشاء آرام فرما رہے تھے کہ اچانک گھر کی چھت کھل گئی، جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اندازہ ہو گیا کہ کوئی خارق عادت معاملہ پیش ہونے والا ہے۔ دیکھا کہ جبرئیل علیہ السلام فرشتوں کی ایک جماعت لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے، اور اُم ہانی رضی اللہ عنہا کے مکان سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد حرام لے گئے۔ (یہ فاصلہ ایک سو پچاس میٹر کے قریب ہے) کعبہ شریف کے حطیم میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سینہ مبارک چاک کیا، اور قلب مبارک کو زمزم کے پانی سے دھو کر اپنے مقام پر رکھ دیا، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براق پر سوار کر کے بیت المقدس لے گئے۔

راستہ میں کچھ عجیب واقعات پیش آئے، جن کا ذکر کتب سیرت میں ہے۔ تھوڑی دیر میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المقدس پہنچ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم براق سے اتر کر جبرئیل امین علیہ السلام نے براق کو وہاں پہلے سے موجود ایک حلقہ میں باندھ دیا۔ مسجد اقصیٰ میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک سارے انبیاء کرام علیہم السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں جمع تھے، اور آسمانوں سے کچھ فرشتے بھی آئے ہوئے تھے۔ یہ مجمع بڑا پر رونق اور نورانی تھا۔ انبیاء کرام علیہم السلام صف بستہ کھڑے تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب نماز با جماعت کا اہتمام ہو رہا ہے۔ حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے اذان دیدی، اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہاتھ مبارک پکڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امامت کے لئے آگے بڑھایا، اور نماز شروع کرانے کا پیغام دیدیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کی امامت کر کے نماز پڑھائی۔ [زرقانی وغیرہ]

نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بے مثال سیڑھی (لفٹ) لائی گئی۔ ابن سعد کی روایت میں ہے کہ یہ معراج، یعنی سیڑھی جنت الفردوس سے لائی گئی۔ پھر اس سیڑھی کے ذریعہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام آسمان پر پہنچے، اور آسمان کا دروازہ کھلوایا (براق کو بیت المقدس چھوڑ گئے تھے) پہلے آسمان میں حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے آسمان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے خالہ زاد بھائی حضرت یحیٰ علیہ السلام سے، تیسرے

آسمان پر حضرت یوسف علیہ السلام سے، چوتھے آسمان پر حضرت ادریس علیہ السلام سے، پانچویں آسمان پر حضرت ہارون علیہ السلام سے، چھٹے آسمان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، پھر ساتویں آسمان میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔

بعدازاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المعمور میں داخل ہوئے، جو فرشتوں کا قبلہ ہے، اور روزانہ ستر ہزار فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں، اور پھر قیامت تک دوبارہ عود نہیں کرتے۔ یہ بیت المعمور ساتویں آسمان میں ہے، عرش معلّٰی کے نیچے ہے، کعبۃ اللہ شریف کے محاذات میں ہے۔ بالفرض وہ اگر نیچے آجائے تو کعبہ شریف کے اوپر جاگرے۔ اس کا حکم وہی ہے جو کعبۃ اللہ شریف کا ہے۔ [زرقانی، مواہب]

پھر جبرئیل امین علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر سدرۃ المنتہیٰ پہنچے۔ سدرۃ المنتہیٰ بیری کا ایک بابرکت درخت ہے، جس کو انوارِ خداوندی ڈھانپے ہوئے ہیں، اور ہر طرف سے فرشتے اس کو گھیرے ہوئے ہیں۔ یہ مقام اوپر سے اترنے والوں، اور نیچے سے چڑھنے والوں کا منتہیٰ ہے، اور کراماً کاتبین کا بھی منتہیٰ ہے۔ کرام کاتبین اس سے اوپر نہیں جاتے، اور یہی مقام حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کا مستقر اور ٹھکانا ہے۔ اسی جگہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت میں دیکھا، ان کے چھ سو پر تھے۔ [بخاری، زرقانی] اور سدرۃ المنتہیٰ ہی کے قریب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت کا مشاہدہ کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت میں داخل ہوئے، اور وہاں کی سیر کی، وہاں دیکھا کہ گنبد موتیوں کے ہیں، اور مٹی مشک کی ہے۔

ربّ العزّت جلّشانہ کے اس ارشادِ عالی: ﴿وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝۱۳ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝۱۴ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝۱۵ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝۱۶﴾ [النجم] اور یقیناً انہوں نے اس (فرشتے) کو ایک اور مرتبہ دیکھا ہے۔ اس بیر کے درخت سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اسی کے پاس جنت الماویٰ ہے۔ اس وقت اس بیر کے درخت پر وہ چیزیں چھائی ہوئی تھیں جو بھی اس پر چھائی ہوئی تھی)۔

اس سے یہی معلوم ہوا کہ جنت سدرۃ المنتہیٰ کے قریب ہے، اور اسی مقام میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حوض کوثر کو دیکھا، جس کا اللہ تعالیٰ جلّ شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ فرمایا۔ [زرقانی] اور وہ چار نہریں جن کا ذکر قرآن حکیم کی اس آیات میں ہے: ﴿فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى﴾ [محمد: ۱۵] (اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو خراب ہونے والا نہیں، ایسے دودھ کی نہریں ہیں جس کا ذائقہ نہیں بدلے گا، ایسی شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لیے سراپا لذّت ہوگی،

جو تھرا ہوا ہوگا)۔ یہ چاروں نہر سدرۃ المنتہیٰ کی جڑ سے نکلتی ہیں، جن کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معائنہ فرمایا۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہنم بھی دکھلائی گئی، جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ربّ العزّت عزّوجلّ کے قہر و غضب کے مظاہر دیکھے، پھر بند کردی گئی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایک سبز رفرف (تخت، یا جھولا) لایا گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر بیٹھے، اور حضرت جبرئیل امین علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس فرشتے کے سپرد کیا جو رفرف کے ساتھ آیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل امین علیہ السلام سے ساتھ چلنے کی درخواست کی، مگر جبرئیل امین علیہ السلام نے کہا کہ مجھے آگے جانے کی قدرت نہیں، اگر ایک قدم بھی آگے بڑھوں تو جل جاؤں۔ ہم میں سے ہر ایک کے لئے ایک مقام معلوم ہے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی آیاتِ عظیمہ دکھلانے کے لئے بلایا ہے، آگے صرف آپ کا مقام ہے، جس کو آپ طے فرمالیں، یہ مقام آپ ہی کا ہے۔ [زرقاني]

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرئیل امین علیہ السلام کو الوداع فرمایا، اور رفرف میں بیٹھ کر اس کے فرشتے کے ہمراہ روانہ ہوئے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مستویٰ (بلند مقام) پر جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صریف الاقلام سنتے تھے، یعنی ان قلموں کی کتابت کی آواز سنتے جو احکامِ الٰہیہ اور تقادیرِ ربانیہ کی کتابت کررہے تھے۔ سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی رفرف پر جارہے تھے۔ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اسی اثناء میں یکا یک ایک نورانی ابر (بادل) نمودار ہوا، جس نے مجھے اپنے اندر لے لیا، اور میں تنہا رہ گیا، اور وہ فرشتہ جو رفرف کے ساتھ تھا، پیچھے رہ گیا، اور اس اثناء میں فرشتوں کی جو آوازیں سنائی دیتی تھیں وہ سب منقطع ہوگئیں۔

"بمقامے کہ رسیدی نہ رسد ہیچ نبی"

اس طرح میں بارگاہِ قدس اور مقامِ قرب میں عرشِ معلّی کے قریب پہنچا، جیسے ارشاد عالی ہے: ﴿ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ﴿٨﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ﴿٩﴾ فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ﴿١٠﴾﴾ [النجم] (پھر وہ قریب آیا، اور جھک پڑا۔ یہاں تک کہ وہ دو کمانوں کے فاصلے کے برابر آگیا، بلکہ اس سے بھی زیادہ نزدیک۔ اس طرح اللہ کو اپنے بندے پر جو وحی نازل فرمانی تھی، وہ نازل فرمائی)۔ اور مقام دُنُو اور تدلّی میں، یعنی مقام قرب میں حق تعالیٰ شانہ نے مجھ سے کلام فرمایا، اور پچاس نمازیں مجھ پر فرض کیں، بعد ازاں میں بارگاہِ خداوندی سے واپس ہوا، واپسی میں موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے پھر بارگاہِ خداوندی میں واپس گیا، اور تخفیف کی درخواست کی، جو منظور ہوئی۔

اس طرح یہ دس معراجیں ہوئیں، سات معراجیں تو سات آسمانوں تک ہوئیں، اور آٹھویں معراج سدرۃ

المنتہیٰ تک ہوئی، اور نویں معراج مقام صریف الاقلام تک ہوئی، اور دسویں معراج مقام دَنَا فَتَدَلّٰی تک ہوئی، یعنی قرب کے مقام تک ہوئی، جہاں آپ ﷺ لقاء ربی اور کلام ربی عزشانہ سے مشرف ہوئے۔

ازاں بعد واپسی بیت المقدس میں ہوئی، تو حسبِ سابق براق پر سوار ہو کر صبح سے پہلے مکہ معظمہ پہنچ گئے، اور صبح کی نماز مکہ معظمہ میں پڑھی، اور نماز فجر کے بعد قریش کو اپنے سفر بیت المقدس اور معراج آسمانی کی خبر دیدی۔ یہ ہے مختصر احوال معراج، جس میں ہم نے موٹی موٹی باتوں پر اکتفاء کیا۔ تفصیلات کتب سیرت میں دیکھیں۔

معراج میں دیدار الٰہی:

آپ ﷺ نے بلا کسی شک و شبہ کے، اپنی آنکھوں سے اپنے پروردگار کی زیارت کی۔ یہی جمہور محققین کا مذہب ہے۔ (۱) یہ آپ ﷺ کی خصوصیت ہے۔ (۲) جو لوگ دنیا میں رؤیت باری تعالیٰ کو محال سمجھتے ہیں، وہ عام قاعدہ کی رُو سے عوام و خواص کے لئے ہے، آپ ﷺ کا رتبہ اتنا بلند ہے کہ اس تک کسی کی رسائی نہیں۔ (۳) شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا کا ایریا ساتوں آسمانوں تک ہے، اور یہ ملاقات عرش پر ہوئی، جو کہ دنیا کا ایریا نہیں ہے۔ یہی اصلی جواب ہے۔ پھر شیخ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ خود معراج خارق عادت معجزہ ہے، اگر اس میں ملاقات و زیارتِ الٰہی ہو تو کیا بعید ہے کہ وہ بھی خارق عادت ہو۔ اسی طرح جب جنتی جنت میں اللہ تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوں گے تو یہ زیارتِ مصطفوی بھی جنت کے ایریا میں ہوئی ہے، اور آپ ﷺ کا مقام عالی تمام جنتیوں سے نہایت اعلیٰ اور بلند ہے۔

فائدہ:

معراج کے سفر میں سرور عالم ﷺ نے بہت سی چیزیں دیکھیں، جو کتب حدیث اور اس کی شروحات میں منتشر ہیں۔ اسی طرح کتب سیرت میں بھی بقدر کفایت مذکور ہیں، اور کتب تفاسیر میں بھی۔ اس سلسلہ میں مجمع الزوائد جلد اوّل، دلائل النبوۃ، بیہقی جلد دوم، جمع الزوائد، جمع الفوائد، تفسیر ابن کثیر، تفسیر مظہری، سیرت حلبیہ، سیرت ابن ہشام، سیرت المصطفیٰ، وغیرہ قابل دید ہیں۔ وباللہ التوفیق

ملحدین اور منافقین کے شکوک و شبہات

جس طرح قوم قریش نے معراج کی تکذیب کی، پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ بیت المقدس کا نظارہ اپنے نبی حضرت محمد ﷺ کے سامنے حاضر کیا، چنانچہ آپ ﷺ دیکھتے ہوئے ان کے سوالات کے

ٹھیک ٹھیک جوابات دے کرانہیں خاموش کیا۔

اسی طرح زمانۂ رسالت سے لے کرآج تک دشمنانِ اسلام خاص کر یہود ونصاریٰ نے اس حق وصداقت کے واقعہ کواتنا اچھالا، اورغلط پیرایہ پراس کی اتنی تشہیر کی، جس کی حد نہ ہو۔ یہاں تک کہ نصاریٰ کے کاسہ لیس مسلمان انگریزی خواں طبقہ نے بھی چہ میگوئیاں شروع کیں، اورمعراج کوتسلیم نہ کرتے ہوئے اسے غیرممکن کہا کہ ایک رات کے بہت مختصروقفہ میں اتنی زمینی اورآسمانی مسافتوں کوکیسے طے کیا جاسکتا ہے؟ کبھی کہتے ہیں کہ اوپر کرۂ نار ہے، جس میں ہرچیز جل کربھسم ہوجاتی ہے، یا کرۂ زمہریر ہے، جس میں پہنچ کر ہرچیز منجمد ہوجاتی ہے، یا کرۂ ہوا ہے، جو ہرچیز کوفنا کردیتی ہے، یااوپر جانے کے بعدآکسیجن ختم ہوجاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

کبھی پہلے زمانہ میں کوئی اگراس طرح کی بات کرتاتواس کی کچھ وجہ بھی تھی کہ اس وقت دنیا میں سادگی تھی، کوئی خارق عادت ایجادات کا وجود نہ تھا، اب کی دنیانے توان تمام اشکالات اورشکوک وشبہات کا پردہ چاک کرکے بہت سے محالات کوممکنات کی صف میں لاکھڑا کیا۔ آج لوگ چاند پرپہنچنے کے بعدمزیداوپر جانے کا پروگرام بنارہے ہیں۔ سرعت رفتارکا یہ عالم ہے کہ انسان کے ہاتھ کی بنائی ہوئی بجلی کی رفتارایک منٹ میں تقریباًاسی لاکھ میل ہے۔ میزائلوں اوردیگر جدید جدید آلات کا یہ حال ہے کہ انسان نے پوری کائنات کوایک چھوٹے سے کمپیوٹر میں بندکیا ہوا ہے۔ ایک شخص مشرق میں بیٹھ کرمغرب کودیکھ رہاہے، اور ہزاروں میل دورایک دوسرے کودیکھ رہے ہیں، اور بات بھی کررہے ہیں۔

پس معراج کے مسئلہ کاتعلق ایک ایسی عظیم ذات کے ساتھ وابستہ ہے جوکہ سورج کوتیرہ لاکھ بارزمین سے بڑا ہونے کے باوجودلاکھوں میل فی منٹ بھگا کرمغرب تک بارہ گھنٹوں میں رواں دواں سیر کراتا ہے۔ وہ ذات پاک ہر چیز پرقادر ہے، اس کی قدرت ہرچیز پرحاوی ہے، اس قادرمطلق نے جب اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کوجب اپنے پاس بلایا توعلویات وسفلیات پوری کائنات کے تکوینی نظام کوتھوڑی دیر کے لئے منجمد کرکے رکھ دیا، اس نکتہ پرغور کرنے سے ہرقسم کے شبہات خودبخودختم ہوجائیں گے، اورمعراج کی حقانیت نکھر کر سامنے آجائے گی۔ ﴿وَفِيٓ أَنفُسِكُمۡۚ أَفَلَا تُبۡصِرُونَ﴾ [الذاریات:۲۱] (اورتمہاری جانوں میں (نشانیاں ہیں) کیادیکھتے نہیں ہو؟) اپنی ذات میں فکر کرو، تمہاری نظرکی بینائی کی کیارفتار ہے؟ اور یہ کس کی پیداکردہ ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا ؕ ② ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ؕ اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا ③

ترجمہ: اور ہم نے موسیٰ کو کتاب دی، اور ہم نے اسے بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنادیا کہ تم لوگ میرے علاوہ کسی کو کارساز نہ بناؤ ② اے ان لوگوں کی نسل! جن کو ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا، بیشک وہ شکر گزار بندہ تھے ③

معارف ومنازل

واقعہ معراج سے اس آیت کا ربط یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر بلایا، اور انہیں تورات عطاء کی، طور پر بلانے کا مقصد ان کا اکرام واعزاز تھا، اسی طرح خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معراج پر بلانے کا مقصد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعزاز واکرام ہی ہے، اور یہ بھی یاددہانی ہورہی ہے کہ تورات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیگر صفات کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ معراج بھی ہے، جسے اگر تم چھپاؤ گے تو عذاب کا مستحق بنو گے، تو فرمایا کہ میری نعمتوں کو یاد کر کے ایسے شکر گزار بنو جیسے تمہارے آباء واجداد کو اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندہ نوح علیہ السلام نے اپنی کشتی میں سوار کرا کر اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کو نجات بخشی، اور غرق ہونے سے بچایا۔ اس کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر قائم رہو، اور اس کے علاوہ کسی کو کارساز نہ بناؤ۔ فرمایا:

﴿وَاٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ﴾ اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب، یعنی تورات عطاء فرمائی، اور یہ تورات نزول قرآن کی تمہید اور بشارت ہے۔

﴿وَجَعَلْنٰهُ هُدًى لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ اور اسے قوم بنی اسرائیل کے لئے ذریعہ ہدایت بنایا، اور واضح کیا کہ تورات کی تعلیمات کا مغز اور خلاصہ یہ ہے کہ:

﴿اَلَّا تَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِيْ وَكِيْلًا﴾ کہ میرے سوا کسی کو کارساز نہ بنانا۔ قرآن کریم کی تعلیم بھی یہی ہے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاتَّخِذْهُ وَكِيْلًا﴾ [المزمل: ۹] (اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اسی کو کارساز بنالو)۔ اور اللہ تعالیٰ کی توحید تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات کا خلاصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو کارساز نہ بنایا جائے، اور صرف اسی پر بھروسہ کیا جائے۔

﴿ذُرِّيَّةَ مَنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ﴾ تم ان لوگوں کی اولاد ہو جن کو ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار

کرایا تھا۔ یہ بات ظاہر ہے کہ نوح علیہ السلام کے بعد تمام لوگ انہی کے تینوں بیٹوں کی اولاد ہیں، جنہیں کشتی میں نجات ملی تھی۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ عَبۡدًا شَكُوۡرًا﴾ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے تھے، اور وہ اسی شکر گزاری کی بدولت غرقابی سے بچ گئے تھے، لہٰذا تم بھی اسی سنت پر عمل کر کے ہر قسم کے عذاب وتباہی سے بچو، پس خبردار رہو! اگر تم نے ناشکری کی تو تمہارا انجام بھی قوم نوح علیہ السلام سے مختلف نہ ہوگا۔

وَقَضَيۡنَاۤ اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ فِى الۡكِتٰبِ لَـتُفۡسِدُنَّ فِى الۡاَرۡضِ مَرَّتَيۡنِ وَلَتَعۡلُنَّ عُلُوًّا كَبِيۡرًا ④
فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰٮهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ‌ ؕ وَ
كَانَ وَعۡدًا مَّفۡعُوۡلًا ⑤ ثُمَّ رَدَدۡنَا لَـكُمُ الۡكَرَّةَ عَلَيۡهِمۡ وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ وَجَعَلۡنٰكُمۡ
اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا ⑥ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ‌ وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا‌ ؕ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ
لِيَسُــوْٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا ⑦
عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ‌ ۚ وَاِنۡ عُدْتُّمۡ عُدۡنَا‌ ۘ وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ حَصِيۡرًا ⑧

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب میں یہ بتا دیا تھا کہ تم دو مرتبہ زمین میں ضرور فساد کرو گے، اور بڑی بلندی تک پہنچ جاؤ گے ④ سو جب ان دونوں میں پہلی مرتبہ کی میعاد کا وقت آئے گا تو ہم تم پر اپنے ایسے بندے بھیج دیں گے جو سخت لڑائی لڑنے والے ہوں گے، پھر وہ گھروں کے اندر گھس پڑیں گے، اور یہ وہ وعدہ ہے جو پورا ہو کر رہے گا ⑤ پھر ہم ان پر تمہارا غلبہ واپس کر دیں گے، اور مالوں سے اور بیٹوں کے ذریعے تمہاری امداد کریں گے، اور جماعت کے اعتبار سے تمہیں خوب زیادہ بڑھا دیں گے ⑥ اگر تم اچھے کام کرو گے تو اپنی جانوں کے لئے ہوں گے، پھر جب دوسری مرتبہ کی میعاد کا وقت آئے گا تاکہ وہ تمہارے مونہوں (چہروں) کو بگاڑیں اور تاکہ وہ مسجد میں داخل ہو جائیں، جیسا کہ وہ اس میں پہلی بار داخل ہوئے تھے، اور تاکہ وہ ان سب کو ہلاک کر ڈالیں جو ان کے قابو میں آجائیں ⑦ قریب ہے کہ تمہارا رب تم پر رحم فرمائے، اور اگر تم پھر وہی کام کرو گے تو ہم بھی وہی معاملہ کریں گے جو پہلے تمہارے ساتھ کیا، اور ہم نے جہنم کو کافروں کا جیل خانہ بنا دیا ہے ⑧

معارف ومنازل

بنی اسرائیلی قوم کو تنبیہ کرتے ہوئے وحی کے ذریعہ خبردار کیا گیا تھا کہ تم دنیا میں دو مرتبہ بے ایمانی کر کے سخت سرکشی کرو گے، اور دونوں مرتبہ سرکشی اختیار کرنے پر تمہیں سخت سزا دی جائے گی، اور خونخوار بے رحم بادشاہوں کو تم پر مسلط کیا جائے گا، جو تمہاری اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے، اور تمہارے شہروں بستیوں کو تباہ کر کے رہیں گے۔

کتب تواریخ وتفاسیر میں بنی اسرائیل کو برباد کرنے والوں کے کئی نام لکھے ہیں:

(١) بخت نصر۔ (٢) جالوت۔ (٣) خردوش۔ (٤) سخاریب، جس کو شاہ بابل بھی کہتے ہیں۔ اس نے ایک دفعہ بنی اسرائیل سے شکست کھائی، وہ اس طرح کہ بنی اسرائیل کے بادشاہ صدیقہ نے جو کہ بہت بڑا متقی و پرہیزگار بادشاہ تھا، خوب توبہ کی، اور پیغمبر شعیاء علیہ السلام کے ہاتھ پر بیعت کی، چنانچہ پیغمبر نے سخاریب شاہ بابل کو بددعاء دی، جس کے نتیجے میں اس کی پوری فوج طاعون کی بیماری میں ہلاک ہوئی اور اس کو شکست ہوئی، صرف وہ اور اس کے چار ساتھی بچ گئے۔ یہ قصہ بہت طویل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی پہلی بربادی کس بادشاہ کے ہاتھوں ہوئی؟ اور دوسری بربادی کس بادشاہ کے ہاتھ سے ہوئی؟ اس میں بھی اختلاف ہے۔ صاحب مظہری نے بہت بڑی تفصیل لکھی ہے۔ البتہ معالم التنزیل نے بہت کچھ لکھنے کے بعد یہ فرمایا ہے کہ پہلی بربادی بخت نصر اور اس کے لشکروں کے ذریعہ ہوئی، اور دوسری بربادی خردوش (طیطوس) اور اس کے لشکروں کے ذریعہ ہوئی۔ یہ دوسری بربادی پہلی بربادی سے کہیں زیادہ تھی۔

ان بربادیوں کے بعد بنی اسرائیل کی حکومت قائم نہ رہ سکی اور وہ تباہ ہو گئے، اور ان کے تمام علاقوں میں یونانیوں کی حکومت قائم ہوگئی۔ پھر بنی اسرائیل کی آبادی بڑھ گئی، ان کی حکومت تو نہ تھی، البتہ بیت المقدس پر ان کی ریاست قائم تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس نافرماں قوم کو ہر طرح کی بے شمار نعمتوں سے نوازا، مگر وہ بڑے ناقدر اور بڑے ناشکر رہے۔ انہوں نے تورات میں تحریف کر کے اس کی شکل وصورت تبدیل کی، احکامِ الٰہی کا مذاق اڑایا، شرک وبدعات کو رواج دیا، زنا وشراب اور دیگر معاصی میں ایسے مست اور منہمک رہے جس کی حد نہ ہو، پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر طیطوس بن اسطیانوس رومی کو مسلط کر دیا، جس نے ان کے شہروں کو ویران اور مَردوں کو قتل کیا، عورتوں کو کنیز وباندی بنایا، بچوں کو غلام بنایا، ان کے تمام اموال پر قبضہ کیا۔ اس طرح وہ اِدھر اُدھر بھاگے، اور منتشر ہو گئے، اور ذلت وخواری میں

ڈوب کرتباہ ہو گئے، اور سب پر جزیہ مقرر ہوا۔ یہاں تک کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خلافت تک بیت المقدس ویران رہا، پھر اسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دوبارہ آباد کیا۔

حکیم الامت صاحب بیان القرآن قدس سرّہ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل پر جو پہلی بار تباہی آئی وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی مخالفت کی وجہ سے تھی، اور دوسری بار حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی وجہ سے تھی، پھر جب حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تو یہودیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا انکار کیا، لہٰذا جلاوطن ہوئے، اور ذلیل وخوار ہوئے۔

مسلمانوں کے لئے بنی اسرائیل اور دیگر اقوامِ ماضیہ کے احوال سراپا عبرت ہیں۔ گزشتہ قوموں نے مدعی اسلام ہوتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی نافرمانیاں کیں، ان پر عذاب آیا، اور دشمنوں نے بھی ان پر حملے کئے، اور تباہ وبرباد کیا۔ اُمت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) بھی تکوینی قوانین سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ ان کے ملک بھی چھینے جاتے رہے ہیں، اور دشمنوں کے ہاتھوں تباہی آتی رہی ہے۔ اسپین (اندلس) کا واقعہ تو سب کو معلوم ہی ہے۔ بغداد کی تباہی (چنگیزی تباہی) بھی تاریخ میں مذکور ہے۔ کئی سو سال کی حکومت جو ہندوستان میں قائم تھی اس کا حشر بھی معلوم ہے۔ دوسرے براعظم کی کافر قوم، یعنی فرنگیوں نے آ کر ہندوستان پر قبضہ کرلیا۔ لال قلعہ اور دہلی میں کیا ہوا؟ بادشاہ کا کیا حال ہوا؟ جاننے والے اس کو جانتے ہیں۔ بادشاہ ظفر کو گرفتار کیا گیا، اور رنگون میں لے جا کر بند کر دیا گیا، پھر وہیں اس کی موت ہوئی۔ سب باتیں جانتے ہوئے مسلمان اب بھی ہوش میں نہیں، گناہوں میں اور رنگ رلیوں میں اوقات گزارتے ہیں۔ اصحاب اقتدار دشمنوں کے سایوں میں جیتے ہیں، نہ دین قائم کرتے ہیں، نہ دین قائم ہونے دیتے ہیں۔ هَدَى اللّٰهُ جَمِيعَ الْمُسْلِمِينَ۔

اب ہمارے زمانے کے مسلمان ملکوں کا اندازہ لگائیں، اس وقت ساٹھ کے قریب مسلمان ملک کرۂ ارض پر موجود ہیں، سب کے سب برائے نام مسلمان ہیں۔ نہ ان میں توحید ہے، نہ اتباع سنت۔ قرآن پاک کے قانون کو محض یہ نہیں کہ قائم نہیں کرتے، بلکہ اسے اپنی دنیوی ترقی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، اغیار اور دشمنان اسلام کے کفش بردار غلام بنے ہوئے ہیں۔

آئے دن دشمن (جو بے ضمیر ہے اس کو اپنا دوست کہنے سے نہیں تھکتے) باری باری سے ان پر حملہ آور ہوتا ہے، اور انہیں قتل وغارت کرنے کے ساتھ ان کی عصمتوں کو سر بازار تاراج کرتا ہے، اور ان کے شہروں کو کھنڈرات میں

تبدیل کرتا ہے، ان کی گلی کوچوں میں خون کی ہولی کھیلتا ہے، اوران کے املاک کو تہہ وبالا کرتا ہے، لیکن یہ نام نہاد بے ضمیر اصحابِ اقتدار ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ لیبیا، تونس، مصر، یمن اور عراق وافغانستان ہمارے سامنے ہیں، جہاں بیسیوں سالوں سے آگ لگی ہوئی ہے، جو بجھنے کا نام نہیں لیتی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

خدا اس قوم کی حالت قیامت تک نہیں بدلی ☆ نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کی بدلنے کا

﴿وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ فِى الْكِتٰبِ﴾ ہم نے بنی اسرائیل کے لئے لوح محفوظ میں فیصلہ کیا، یا یہ کہ ہم نے بنی اسرائیل کو بذریعہ کتاب، یعنی تورات آگاہ کیا:

﴿لَتُفْسِدُنَّ فِى الْاَرْضِ مَرَّتَيْنِ﴾ کہ تم فساد کروگے زمین میں دو دفعہ، یعنی بڑے پیمانے پر بدامنی پیدا کروگے۔

﴿وَلَتَعْلُنَّ عُلُوًّا كَبِيْرًا﴾ اور بہت بڑی سرکشی اختیار کروگے، جس کے نتیجے میں دونوں مرتبہ تمہیں سخت سزا دی جائے گی۔

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ اُوْلٰىهُمَا﴾ پھر جب ان دو میں سے پہلا وعدہ آ گیا، یعنی بنی اسرائیل کی سرکشی کا پہلا وقت آ گیا تو:

﴿بَعَثْنَا عَلَيْكُمْ عِبَادًا لَّنَآ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ﴾ ہم بھیجیں گے تمہارے اوپر اپنی مخلوق بندے، جو سخت لڑائی لڑنے والے ہیں۔ یہ کلدانی اور آشوری بابلی لوگ تھے، جن کا بادشاہ بخت نصر ہوگا، چنانچہ وہ تمہیں سخت سے سخت عذاب دے کر تباہ کریں گے، اور یہ بھی:

﴿فَجَاسُوْا خِلٰلَ الدِّيَارِ﴾ چنانچہ بابلی فوجیں بنی اسرائیلیوں کے گھروں میں گھس گئیں، اور تباہی مچادی۔

﴿وَكَانَ وَعْدًا مَّفْعُوْلًا﴾ اس طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ پورا ہوگیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر مہربانی فرمائی، اور اس کا ذریعہ ایرانیوں کو بنایا، چنانچہ ایرانی بادشاہ نے بابل کے بادشاہ کو شکست دے کر بنی اسرائیلیوں کو اس کے قید وبند سے آزاد کر کے انہیں شام وفلسطین جانے کی اجازت دے دی، اور انہیں بابلیوں کی غلامی سے آزاد کر دیا، اوران کے بچے کچھے اموال وسامان بھی ان کے حوالہ کر دیا۔ اسی کو فرمایا:

﴿ثُمَّ رَدَدْنَا لَكُمُ الْكَرَّةَ عَلَيْهِمْ﴾ اے بنی اسرائیلیو! پھر ہم نے پلٹ دی تمہارے لئے باری ان پر۔ یعنی تم پلٹ کر پھر اپنی اصلی حالت پر آ گئے۔

﴿وَاَمۡدَدۡنٰكُمۡ بِاَمۡوَالٍ وَّبَنِيۡنَ﴾ اور مال و دولت اور بیٹوں کے ساتھ تمہاری مدد کی، تمہیں مال و دولت اور اولاد کی فراوانی حاصل ہوگئی، اور کمی پوری ہوگئی۔

﴿وَجَعَلۡنٰكُمۡ اَكۡثَرَ نَفِيۡرًا﴾ ہم نے تمہاری تعداد اور لشکر میں اضافہ کر دیا، اب آئندہ کا لائحہ عمل یہ ہوگا:

﴿اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِكُمۡ﴾ اگر تم نیکی کا کام کرو گے تو اپنے لئے ہی کرو گے، اس کا فائدہ تمہیں ہی پہنچے گا۔

﴿وَاِنۡ اَسَاۡتُمۡ فَلَهَا﴾ اور اگر تم برائی ہی کا کام کرو گے تو اس کا وبال تم ہی پر پڑے گا۔ اس تنبیہ کے باوجود انہوں نے ماضی سے سبق نہیں سیکھا، پھر دوبارہ سرکشی پر پہلے سے زیادہ اتر آئے، چنانچہ غضبِ الٰہی دوبارہ بھڑکا، اور پہلے کی نسبت زیادہ تیز ہوا۔ اسی کے متعلق فرمایا:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ الۡاٰخِرَةِ﴾ پھر جب دوسرا وعدہ کا وقت آ گیا تو یہ ہوا:

﴿لِيَسُوۡٓءٗا وُجُوۡهَكُمۡ﴾ تو اس دفعہ دشمن بگاڑیں گے، تمہارے چہروں کو۔

﴿وَلِيَدۡخُلُوا الۡمَسۡجِدَ كَمَا دَخَلُوۡهُ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ اور وہ یعنی دشمن مسجد میں داخل ہوں گے، جیسا کہ پہلی مرتبہ کے دشمن داخل ہوئے تھے۔

﴿وَّلِيُتَبِّرُوۡا مَا عَلَوۡا تَتۡبِيۡرًا﴾ تاکہ وہ اس چیز کو تباہ و برباد کر دیں جس پر انہوں نے غلبہ پایا، یعنی چڑھائی کی۔ یہ دوسری تباہی رومی بادشاہوں نے مچا دی، یعنی طیطوس نے۔ یہ بادشاہ نہ یہودی تھا اور نہ نصرانی تھا۔

﴿عَسٰى رَبُّكُمۡ اَنۡ يَّرۡحَمَكُمۡ﴾ شاید تمہارا پروردگار تم پر رحم فرمائے، اگر تم سرکشی سے باز آئے، لیکن یہ بھی یاد رکھو:

﴿وَاِنۡ عُدۡتُّمۡ عُدۡنَا﴾ اگر تم پھر برائیوں کی طرف پلٹ آئے تو ہم بھی پلٹ کر تمہیں وہی سزا دیں گے جو پہلے دے چکے ہیں، اور یہ دنیوی سزا عارضی ہے۔

﴿وَجَعَلۡنَا جَهَنَّمَ لِلۡكٰفِرِيۡنَ حَصِيۡرًا﴾ یہ ہے اصلی اور ابدی سزا، ہم نے کافروں کے لئے گھیرنے والا جہنم تیار کر رکھا ہے، آگے تمہاری مرضی۔

……❁……❁……❁……

اِنَّ هٰذَا الۡقُرۡاٰنَ يَهۡدِىۡ لِلَّتِىۡ هِىَ اَقۡوَمُ وَيُبَشِّرُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ الصّٰلِحٰتِ

اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًاۙ۝۹ وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا۝۱۰

ترجمہ: بیشک یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت دیتا ہے جو بالکل سیدھا ہے، اور ایمان والوں کو بشارت دیتا ہے، جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے بڑا اجر ہے ۹ اور یہ بات بھی بتاتا ہے کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کیا ہے ۱۰

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں یہ بتایا جارہا ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ شانہ کی وہ آخری اور کامل وجامع صحیفہ رحمت ہے جس کی تعلیمات وہدایات قیامت تک آنے والے انسانوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہدایت ورحمت والی کتاب تورات جو نازل فرمائی وہ صرف بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے نازل ہوئی تھی، جبکہ یہ کتاب قرآن کریم تمام بنی نوع انسان کے لئے اتاری گئی ہے۔

یہ کتاب انسان کی فکر، اس کے اعضاء وجوارح اور تمام قوتوں کو خواہ ظاہری ہوں یا باطنی ایسی شاہراہ پر لگاتی ہے جس پر چل کر انسان ہمیشہ کے لئے دین اور دنیا دونوں کی فلاح پاسکتے ہیں۔ فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ﴾ بیشک یہ قرآن راہنمائی کرتا ہے اس راستے کی طرف جو سب سے زیادہ سیدھا اور درست ہے۔ لِلَّتِیْ سے مراد ملّت ہے۔ مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم راہ ہدایت ہے، جو انسان کے ظاہر اور باطن، اعمال اور اخلاق کی درستگی کا سامان مہیا کرتا ہے، اور اس ملّت اسلامیہ کی طرف راہنمائی کرتا ہے، جو سب سے زیادہ درست وبرحق ہے، یعنی ملّت ابراہیمی۔ یہ ملت وہ ہے جس کی صداقت پر ربّ العزّت سبحانہ وتعالیٰ خود گواہ ہے، فرمایا: ﴿ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ﴾ [النحل: ۱۲۳] (پھر ہم نے تم پر وحی کے ذریعے یہ حکم نازل کیا ہے کہ تم ابراہیم کے دین کی پیروی کرو جس نے اپنا رخ اللہ ہی کی طرف کیا ہوا تھا، اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں)۔

روحانی اعتبار سے سارا جہاں تاریک اور بے رونق ہے، اگر اس کی روشنی اور برکت ہے تو صرف یہی ایک ملّت ابراہیمی ہے، جس میں حق وباطل، حلال وحرام، جائز وناجائز اور حقوق اللہ وحقوق العباد، مختصر یہ کہ ماں، بہن، بہو، بیٹی کی پہچان ہے۔ اب یہود ونصاریٰ کا بھی یہ فرض ہے کہ اگر وہ اہل کتاب ہونے کے مدّعی ہیں تو قرآن حکیم کی روشنی

میں سید کائنات ﷺ کی تعلیمات کی روشنی میں اسی ملّت اسلامیہ کی پیروی کریں، اور آخرت کے دہرے عذاب سے بچ جائیں، اور ایمان لاکر مؤمنین میں شامل ہو جائیں، اور آنے والی بشارت کا استحقاق حاصل کریں۔ فرمایا:

﴿وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ﴾ قرآن حکیم جہاں رحمتوں کا پیغام برحق ہے، وہاں اہل ایمان کے لئے پیامِ بشارت بھی ہے، جو لوگ اس کی ہدایات وتعلیمات پر گامزن ہیں، اور ایمان واعمالِ صالحہ پر عمل پیرا ہیں قرآن حکیم انہیں ہر قسم کی بشارتوں کا پیام دینے والا ہے، اور ربّ العزّت کی رضامندی کی بشارت دینے والا ہے۔ پس جو لوگ قرآن مجید کی امامت میں اپنے اعمال وعقائد اور فکر وسوچ کی اصلاح کرتے ہیں، وہ اہل اللہ، اہل قرآن، اور اہل جنت کہلاتے ہیں۔ یہ ہے وہ عظیم خوشخبری وبشارت جس پر سارے جہاں کی عیش وعشرت، اور ساری مادی نعمتیں قربان ہیں۔ اسی کو فرمایا:

﴿اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا﴾ بیشک ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے ہاں بہت بڑا اجر ہے۔ بعض اکابر نے فرمایا کہ اس اجر کبیر کی نوازشات عالیہ سکرات الموت سے شروع ہو کر ہمیشہ ابدالآباد بشارت در بشارت کی صورت میں رہیں گی، اور ان پر کبھی انقطاع نہیں آئے گا۔ ان خوش قسمت لوگوں کے بعد بدقسمت لوگوں کا بیان فرمایا:

﴿وَّاَنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ﴾ اور جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں لاتے تو یہی بشارت سنانے والا قرآن انہیں خبردار کرتا ہے، اور ان کو ان کے انجام بد سے آگاہ کرتا ہے کہ دیکھو تم نے میری اقتداء نہیں کی، میری ہدایات سے روگردانی کی، میں تمہیں بلاتا رہا، اور تمہاری محفلوں تک اور تمہارے گھروں تک آکر دستک دیتا رہا، اور تمہیں ہر قسم کی حسنات کی دعوت دیتا رہا، منکرات کے انجامِ بد سے خبردار کرتا رہا، لیکن تم نے میری پذیرائی نہیں کی، میرے حاملین سے بدسلوکی روا رکھی، اور انہیں گھٹیا سمجھ کر مسترد کر دیا، تو اپنا نقصان کیا، اور اپنا بیڑا غرق کیا، آج میرا یہ اعلان اپنے بارے میں سنو کہ:

﴿اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا﴾ ان کے لئے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، جس میں ان کی کھال اور چمڑے جل جائیں گی، اور یومیہ تین سو مرتبہ ایک چمڑہ جل کر اس کی جگہ دوسرا چمڑاہ پہنایا جائے گا۔ اندازہ لگاؤ، جنتی مؤمن یومیہ ریشم کے تین سو جوڑے لباس کی تبدیلی کریں گے، اور تم تین سو مرتبہ جلی ہوئی کھالوں کے عذاب بھگتو گے۔ یہ ہے ایمان وکفر کا واضح فرق۔ اَللّٰهُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْجَنَّةَ وَنَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ. آمین ثم آمین۔ آگے اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت کے ایک گوشے سے نقاب اٹھا کر فرمایا:......

وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ ۖ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا ﴿١١﴾

ترجمہ: اور انسان برائی کے لئے ایسی دعا مانگتا ہے جیسے خیر کے لئے مانگتا ہے، اور انسان جلد باز ہے ﴿١١﴾

معارف ومنازل

یہ انسان کی ایک فطری کمزوری ہے، اس کی وجہ تنگدلی اور عجلت بازی ہے، اگر یہ انسان ہر چیز پر غور وفکر اور مشورہ سے کام لے، پھر کوئی فیصلہ صادر کرے تو شاید اس کو فائدہ ہو، مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔ دراصل عجلت ایک شیطانی حربہ ہے، جس سے وہ انسان کو پشیمانی اور ناکامی کا راستہ دکھاتا ہے، اور یہ ناعاقبت اندیش دوڑ لگا کر معاملہ خراب کرتا ہے۔

تفسیر درمنثور میں حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ جب انسان کو غصہ آتا ہے تو اپنی جان کو، اور اپنی بیوی کو، اور اپنے مال کو، اور اپنی اولاد کو برے الفاظ میں یاد کرتا ہے، پھر اگر اس کی بددعا کے مطابق اللہ تعالیٰ اس پر تکلیف بھیج دے تو ناگوار معلوم ہوتا ہے، پھر خیر کی دعا کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اسے خیر عطاء فرما دیتا ہے۔ حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی بات نقل کی ہے۔

حقیقت میں انسان ذرا سی ناگواری کی وجہ سے بددعا کرنا شروع کرتا ہے، حالانکہ دعا ہمیشہ خیر ہی کی مانگنی چاہئے، اور عافیت وخوشحالی کا سوال کرنا چاہئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جانوں، اور اپنی اولاد، اور اپنے مالوں کے لئے بددعا نہ کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کسی مقبولیت کی گھڑی میں اللہ تعالیٰ جل شانہ سے سوال کر بیٹھو، اور وہ تمہاری بددعاء قبول فرمائے۔ [مشکوۃ]

اس کے بعد انسان کا مزاج بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ اور انسان جلد باز ہے۔ دوسری آیت میں فرمایا: ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبياء: ۳۷] (انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے)۔ انسان کا یہ مزاج ہے کہ اس کے اعمال اور اشغال میں عجلت ظاہر ہوتی رہتی ہے، اور یہ عجلت بہت سی مصیبتوں اور نقصانات کا سبب بن جاتی ہے۔ بہت سے ایکسیڈنٹ جلد بازی ہی کی وجہ سے ہوتے ہیں، اور بہت سے فیصلے جلدی کرتے ہیں، طلاق دے بیٹھتے ہیں، اور قتل وقتال اور جنگ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے بعد میں پشیمان ہو جاتے ہیں، اور افسوس کرتے ہیں۔ اسی لئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا ہے: اَلْاِنَاۃُ مِنَ اللهِ وَ الْعَجَلَۃُ مِنَ الشَّیْطٰنِ. [مشکوٰۃ از ترمذی] بردباری اور آہستگی اللہ کی طرف سے ہے، اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔

ہر آدمی کو چاہئے کہ ہر کام سوچ سمجھ کر اور مشورہ سے کرلے، جس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آئندہ پشیمانی نہیں ہوگی۔ البتہ ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ﴾[البقرۃ:١٤٨](خیر کے کاموں میں آگے بڑھو) کی رُو سے آخرت کے کاموں میں، اور نیکیوں میں جلدی کرے، اور دیر نہ لگائے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جلدی بازی میں آخرت کا کام خراب کرلے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ موقع ملتے ہی آخرت کا کام کرلے، دیر نہ لگائے، کیونکہ دیر لگانے میں شاید خیال بدل جائے، یا تندرستی باقی نہ رہے، یا وہ مال اور اسباب باقی نہ رہیں، تو تاخیر پر ندامت ہوگی، اور خیر کا کام رہ جائے گا، شاید آئندہ اس کی تلافی نہ ہوسکے۔ اسی بارے میں ارشاد ہے: ﴿سَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾[آل عمران:١٣٣](آگے بڑھو اپنے ربّ کی مغفرت کی طرف) کہ نیکیوں میں جلدی کرو، جوں ہی موقع ملے انجام دیدو، غفلت نہ کرو۔

اور یہ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عجلت اور سبقت کے ساتھ جو کام انجام دیا جاتا ہے تو اس کا حق نہیں ادا ہوتا، بسا اوقات وہ ناقص اور ناکارہ ہوجاتا ہے، جیسا کہ اکثر لوگ اس سبقت کے پیش نظر جلدی میں نماز پڑھتے ہیں، جس سے نماز ضائع ہوجاتی ہے، نہ قیام برابر، نہ رکوع وسجدہ وغیرہ۔ پس مسابقت میں چاہئے کہ طمانینت ہو، اور عجلت سے پرہیز ہو۔

.......❁.......❁.......❁.......

وَجَعَلْنَا الَّيْلَ وَالنَّهَارَ اٰيَتَيْنِ فَمَحَوْنَآ اٰيَةَ الَّيْلِ وَجَعَلْنَآ اٰيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً لِّتَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابَ ۭ وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ﴿١٢﴾

ترجمہ: اور ہم نے رات کو اور دن کو دو نشانیاں بنادیا، سو ہم نے رات کی نشانی کو محو کردیا، اور دن کی نشانی کو روشن کردیا، تاکہ تم اپنے ربّ کا فضل تلاش کرو، اور برسوں کی گنتی کو اور حساب کو جان لو، اور ہم نے ہر چیز کو خوب تفصیل کے ساتھ بیان کردیا ہے ﴿١٢﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیت کریمہ میں فرمایا کہ انسان شر کو اس طرح مانگتا ہے جس طرح خیر مانگنی چاہئے، انسان بڑا ہی جلد

باز ہے۔ یہ بات مطلق انسان کے لئے ہے، جو کہ مؤمن اور کافر دونوں پر صادق ہے، کفار کی جلد بازی اور طلبِ شر کی مثال یہ کہ وہ بار بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہتے تھے کہ بس لے آؤ وہ عذاب جس سے تم ہمیں ڈرایا کرتے ہو، تو انہیں تنبیہ کی گئی کہ بیوقوفو! تم بجائے خیر کے شر کی طلب کرتے ہو، تمہیں اس عذاب کا جسے تم مانگتے ہو شاید اندازہ نہیں، وہ جب آئے گا تو تمہارا بیڑا غرق کر کے رکھ دے گا۔

اسی طرح مسلمان بھی بجائے خیر کے شر کے طلبگار رہتے تھے کہ وہ جب کفار کی سرکشیوں سے تنگ آتے تھے تو ان کے لئے نزولِ عذاب کی دعاء کرنے لگتے تھے، حالانکہ ابھی کفار میں بہت سے وہ لوگ موجود تھے جو آگے چل کر ایمان لانے والے، اور دنیا بھر میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے والے تھے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ انسان بڑا بے صبر واقع ہوا ہے، ہر وہ چیز طلب کرتا ہے جس کی بروقت ضرورت محسوس ہوتی ہے، حالانکہ بعد میں اُسے خود تجربہ سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اگر اس وقت اس کی دعا قبول کر لی جاتی تو وہ اس کے حق میں خیر نہ ہوتی۔ اسی طرح وہ یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں صرف مسلمان ہی آباد ہوں، کفر کا سراسر خاتمہ ہو، تا کہ دنیا کا ایک ہی رنگ ہو۔

اس مفروضہ کا جواب دیا جا رہا ہے کہ تم اختلافات سے گھبرا کر یکسانی و یک رنگی کے لئے بے چین نہ ہو، اس دنیا کا تو سارا کارخانہ اوپر نیچے، دائیں بائیں اختلاف اور امتیاز اور تنوع کی بدولت چل رہا ہے۔ مثال کے طور پر تمہارے سامنے نمایاں ترین نشانیاں یہ رات اور دن ہیں، جو روز تم پر طاری ہوتے رہتے ہیں، خود بھی مختلف ہیں، اور ان کے مقاصد اور منافع بھی مختلف ہیں۔

دیکھو کہ ان کے اختلاف میں کتنی عظیم الشان مصلحتیں موجود ہیں، اگر تم پر ہمیشہ ایک ہی حالت طاری رہتی تو کیا یہ ہنگامہ وجود چل سکتا تھا؟ پس جس طرح تم دیکھ رہے ہو کہ عالم طبیعیات میں فرق و اختلاف اور امتیاز کے ساتھ بے شمار مصلحتیں وابستہ ہیں، اسی طرح انسانی مزاجوں اور خیالات اور رجحانات میں بھی جو فرق و امتیاز پایا جاتا ہے وہ بھی بڑی مصلحتوں کا حامل ہے۔

خیر اس میں نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی فوق الفطری مداخلت سے اس کو ہٹا کر سب انسانوں کو جبراً نیک اور مؤمن بنا دے۔ وہ اگرچہ اس پر مکمل قدرت رکھتا ہے، مگر یہ اس کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہے، یا کافروں و فاسقوں کو ہلاک کر کے دنیا میں صرف اہلِ ایمان و اہلِ طاعت ہی کو باقی رکھا کرے، اس کی خواہش کرنا تو اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ

خواہش کرنا کہ صرف دن ہی دن رہا کرے، رات کی تاریکی سرے سے کبھی طاری ہی نہ ہو۔

البتہ خیر جس چیز میں ہے وہ یہ ہے کہ ہدایت کی روشنی جن لوگوں کے پاس ہے وہ اسے مضبوطی سے لے کر ضلالت کی تاریکی دور کرنے کے لئے مسلسل جدوجہد کررہے ہیں، اور جب رات کی طرح کوئی تاریکی کا دور آئے تو اہلِ ایمان سورج کی طرح اس کا تعاقب کریں، یہاں تک کہ روزِ روشن نمودار ہوجائے، یعنی ہدایتِ عامہ۔

آخر میں اس کے ساتھ رات کی تاریکی، اور دن کی روشنی، اور ان کے آگے پیچھے آنے جانے کا ایک اور فائدہ بھی بیان فرمایا، اور وہ یہ کہ ان کے ذریعہ تم برسوں کی گنتی اور شمار سمجھ لوگے۔ ان دونوں کے گزرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کتنے ہفتے، کتنے مہینے، کتنے سال گزر گئے، لوگوں کی عمریں، معاہدے، اسی طرح نماز، زکوٰۃ، حج، عمرے، روزہ، وغیرہ تمام چیزیں انہی رات دن کے آنے جانے سے معلوم ہوجاتی ہیں۔

الغرض! دنیا کا سارا نظام انہی رات دن کے آنے جانے پر رکھا ہوا ہے۔ اگر ہمیشہ رات ہی رات ہو، یا دن ہی دن ہو، یا ایک ہی موسم ہو، تو کائنات کا نظام درہم برہم ہوگا، اسی تبدیلی میں، بلکہ ہر شے کی تبدیلی میں دنیا آباد اور نظام بامقصد رہے گا۔ یہی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کا تقاضا ہے۔ فرمایا: ﴿اِنَّا كُلَّ شَیْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ﴾ [القمر: ۴۹] (ہم نے ہر چیز کو اندازہ، اور ایک مناسب سلیقہ میں پیدا فرمایا ہے)۔

❁ ❁ ❁

وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیْ عُنُقِهٖ ؕ وَنُخْرِجُ لَهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ كِتٰبًا یَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا ⑬ اِقْرَاْ
كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْیَوْمَ عَلَیْكَ حَسِیْبًا ⑭ مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا یَهْتَدِیْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ
فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْهَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ⑮

ترجمہ: ہم ہر انسان کی گردن میں اس کا اعمال نامہ ڈال دیں گے، اور ہم اس کے لئے قیامت کے دن کتاب نکال دیں گے، وہ اس کتاب کو کھلی ہوئی دیکھ لے گا ⑬ پڑھو اپنی کتاب، آج تو اپنا حساب کرنے کے لئے کافی ہے ⑭ جس نے ہدایت پالی تو وہ اپنے ہی نفع کے لئے ہدایت اختیار کرتا ہے، اور جو شخص گمراہ ہوتا ہے اپنی ہی جان کو نقصان پہنچانے کے لئے گمراہ ہوتا ہے، اور کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والی نہیں، اور جب تک ہم کوئی رسول نہ بھیج دیں اس وقت تک عذاب نہیں بھیجتے ⑮

معارف ومنازل

ابھی ابھی گزشتہ آیت میں خیر وشر، رات دن کا بیان ہوا، جس میں ہم نے یہ لکھا کہ خیر کے بعد شر، اور شر کے بعد خیر کا آنا ایسا ہی سمجھو جیسے رات کے پیچھے دن، اور دن کے پیچھے رات برابر لگی چلی آتی ہے۔ دنیا کے تمام خیر وشر کا ضابطہ ایک معین نظام کے تحت ہے۔ کوئی شب تاریک کی طرح شر میں، اور کوئی روشن دن کی طرح اعمال خیر میں مصروف ہے، یہاں رات کے اندھیرے میں آدمی کو خیر وشر کے نتائج دکھائی نہیں دیتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ نے انبیاء ومرسلین علیہم السلام کو بھیجا کہ رات کی اندھیری میں لوگوں کو صحیح راستہ بتلادیں، اور ان کی آنکھوں کے سامنے اپنے اپنے درجہ کے موافق اجالا کریں، جس سے لوگوں کو خیر وشر کی حقیقت اور اس کے نتائج کا انکشاف ہوجائے۔

لیکن ایسا صریح اور بدیہی انکشاف، جس میں کسی فرد بشر کا انکار یا شبہ کی مجال ہی باقی نہ رہے اس وقت ہوگا جب ہماری دنیوی زندگی کی رات ختم ہوکر فردائے محشر کا دن نکل آئے۔ انسان کے وہی اعمال جو دنیا کی دھندلی زندگی میں ہر وقت اس کے گلے کا ہار بنے ہوئے تھے وہاں غفلت وجہالت اور گمراہی وغیرہ کی تاریکی میں صاف نظر نہیں آتے تھے، قیامت کی صبح ہوتے ہی ہر ایک کھلی کتاب کی شکل میں سامنے آجائیں گے۔ جسے روزِ روشن کے اجالے میں ہر شخص بے تکلف پڑھ سکے گا۔ ﴿فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ﴾ [ق: ۲۲] (ہم نے تمہارا پردہ ہٹادیا، پس آج کے دن تمہاری نظر بڑی تیز ہے)۔

اس وقت اپنے تمام چھوٹے بڑے اعمال کو اصلی رنگ میں دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں بول اٹھے گا، اور کف افسوس ملتے ہوئے کہے گا: ﴿مَالِ هَٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا﴾ [الکہف: ۴۹] (یہ کیسی کتاب ہے جس نے کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں چھوڑا جس کا پورا احاطہ نہ کرلیا ہو۔ اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے)۔

سورۂ قمر میں ارشاد ہے: ﴿وَكُلُّ صَغِيرٍ وَّكَبِيرٍ مُّسْتَطَرٌ﴾ [القمر: ۵۳] (اور ہر چھوٹی بڑی بات لکھی ہوئی ہے)۔ وہ سارے اعمال اسی کیفیت میں نظر آئیں گے جس کیفیت کے ساتھ دنیا میں ان کا ظہور ہوتا تھا۔ یہ نامہ اعمال اس کے ہاتھ میں دیدیا جائے گا کہ خود پڑھ کر فیصلہ کرلے، جو کام عمر بھر میں کئے تھے کوئی رہا تو نہیں، یا زیادہ تو نہیں لکھا گیا۔ ہر آدمی اس وقت یقین کرے گا کہ ذرہ ذرہ عمل، بلاکم وکاست اس میں موجود ہے۔

دنیا میں جو کتاب بھیجی (قرآن کریم) اور چاند وسورج وغیرہ سے جو حساب متعلق ہے، پہلے اس کا ذکر تھا۔

ان آیتوں میں قیامت کے حساب وکتاب کاذکر فرمایا، جو اسی پہلے حساب وکتاب پر بطور نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ ابھی بیان ہوئے، تو فرمایا:

﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ﴾ ہم نے ہر انسان کے ساتھ اس کا طائر، یعنی اعمال نامہ اس کی گردن میں لازم کردیا ہے۔ لغوی طور پر طائر کا معنی پرندہ ہے، اور عرب چونکہ پرندوں کو للکار کر اڑاتے، اور ان کے دائیں بائیں اڑنے سے نیک فالی اور بدفالی لیتے رہتے تھے، اور اکثر طائر سے معنی مدلول بدفالی مراد لیتے تھے، تو اس کو طائر کہتے تھے۔ سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿قَالُوْٓا اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ لَىِٕنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَلَيَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝۱۸ قَالُوْا طَآىِٕرُكُمْ مَّعَكُمْ﴾ [یٰس] (بستی والوں نے کہا: ہم نے تو تمہارے اندر نحوست محسوس کی ہے۔ یقیناً اگر تم باز نہ آئے تو ہم تم پر پتھر برسائیں گے، اور ہمارے ہاتھوں تمہیں بڑی دردناک سزا ملے گی)۔

دوسرے مقام پر فرعونیوں کے متعلق فرمایا: ﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ﴾ [الأعراف: ۱۳۱] (اور اگر ان پر کوئی مصیبت پڑ جاتی تو اس کو موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست قرار دیتے)۔ یہاں مراد عمل نامہ ہے، جس میں خیر وشر ہر قسم کے اعمال درج ہیں۔

﴿وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا﴾ جسے ہم قیامت کے دن ایک کتاب کی شکل میں نکالیں گے، جسے وہ کھلی ہوئی کتاب پائے گا، پھر خواندہ ناخواندہ ہر شخص اُسے پڑھ لے گا، تو ہر شخص کو حکم ہوگا کہ:

﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ۭ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا﴾ اپنا عمل نامہ خود پڑھو، آج کے دن تمہارا اپنا نفس ہی تمہارے محاسبہ کے لئے کافی ہے، اس کے پڑھنے کے لئے کسی فرشتے کی ضرورت نہیں، تم خود اسے پڑھ لو، اور اپنا انجام معلوم کرلو۔

﴿مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِيْ لِنَفْسِهٖ﴾ جس نے ہدایت پائی تو اس نے اپنے نفس کے لئے ہدایت پائی، اس کا فائدہ صرف اسی کے لئے ہے۔

﴿وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا﴾ اور جو کوئی گمراہ ہوا تو اس کی گمراہی کا وبال اسی کے نفس پر پڑے گا۔

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ نیکی اور بدی جو بھی کی ہے اس کا بوجھ خود یہ اپنی گردن پر اٹھائے گا۔ دنیا میں بہت سے لوگ دوسروں کے کہنے پر کافر ہوجاتے ہیں،

اور گناہ کر لیتے ہیں، اور بعض جاہل یوں بھی کہہ دیتے ہیں کہ تو میرے کہنے سے یہ گناہ کر لے، تیرا گناہ قیامت میں میرے اوپر ہوگا۔ اس طرح کی باتیں اکثر ہوتی رہتی ہیں، لیکن وہاں کوئی کسی کی طرف سے عذاب بھگتنے کو تیار نہ ہوگا، اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ منظور ہوگا کہ ایک کے بدلے دوسرے کو عذاب دیا جائے۔

یہاں ایک اہم سوال ہے، وہ یہ کہ جو لوگ شرک وکفر و بدعات کے داعی ہیں، ان کے کہنے پر جن لوگوں نے برائیاں اختیار کیں، ان لوگوں کے اعمال بھی تو ان دعوت دینے والوں اور برائیاں جاری کرنے کے حساب میں لکھے جائیں گے، جیسا کہ آیات اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے، پھر ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ کا مصداق کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے گمراہی کی دعوت دی، اور بدعتیں اور فواحش ومنکرات جاری کیں، ان کے عمل ہی کی وجہ سے لوگ گمراہ ہوئے، اور بدعتوں اور منکرات میں پڑے، برائی کا سبب بننے کی وجہ سے دوسروں کے اعمال کا وبال بھی پڑ گیا، یہ سبب بننا اپنا ہی عمل ہے، ان کی دعوت پر عمل کرنے والے جو ماخوذ ہوں گے وہ اپنے عمل کی وجہ سے پکڑے جائیں گے، اور یہ اپنے گمراہ کرنے والے عمل کی وجہ سے ماخوذ ہوں گے۔ كَمَا فِي الْحَدِيْثِ النَّبوِي: مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْئًا. کسی فریق نے دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھایا، بلکہ ہر فریق اپنے گناہوں تلے دب گیا۔

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ اور جب تک ہم کوئی رسول نہ بھیج دیں عذاب نہیں دیتے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے ایک قانون بیان فرمایا ہے، اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، جنہوں نے خوب واضح طریقے پر ہدایت کا راستہ بیان فرمایا، جنہوں نے ہدایت کا راستہ اختیار کیا، یہ لوگ دنیا میں بھی اچھے حال میں رہیں گے، اور آخرت میں بھی ان کا اچھا انجام ہوگا، اور جن لوگوں نے انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کو قبول نہ کیا، وہ دنیا میں بے راہ ہوئے، اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب ہے۔

یہ جو دنیا میں عذاب آجاتا ہے، اور آخرت میں جو عذاب ہوگا اس میں اللہ تعالیٰ شانہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ شانہ نے اپنے رسول بھیجے، کتابیں نازل فرمائیں، اور راہ حق واضح فرمادیا، جن لوگوں نے عناد سے کام لیا، حق کو ٹھکرایا، اور پیغمبروں علیہم السلام کی تکذیب کی، ان کی بات نہ مانی، اور وہ اپنے اعمال کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں مستحق عذاب ہوں گے، ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے ہدایت نہ آئے، اور لوگوں کی گرفت کر لی جائے، اور ان پر عذاب بھیج دیا جائے۔ اتمامِ حجت کے بعد اللہ تعالیٰ شانہ کی طرف سے عذاب بھیجنے کا فیصلہ ہوتا

ہے۔ سورۂ فاطر میں فرمایا: ﴿وَاِنۡ مِّنۡ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيۡهَا نَذِيۡرٌ﴾ [فاطر: ۲۴] (کوئی اُمت ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو)۔ پچھلی اُمتوں میں یکے بعد دیگرے حضرات انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لاتے رہتے تھے۔ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی رسول اور نبی آنے والا نہیں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک پیدا ہونے والے تمام انسان اور تمام جنات کے نبی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہر گھر میں، دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی ہے، جسے ہر صاحب ہوش جانتا ہے، گھر گھر قرآن حکیم پہنچ رہا ہے، دنیا کی مشہور زبانوں میں اس کے تراجم ہیں، کوئی شخص یہ حجت نہیں نکال سکتا کہ ہمیں نبی کی دعوت نہیں پہنچی۔ خوب سمجھ لیا جائے۔

ہاں! اگر کوئی شخص پہاڑوں اور غاروں میں پیدا ہوا ہو، وہیں پلا ہو، باقی دنیا کو نہ دیکھا ہو، اور اسلام کی دعوت اسے نہ پہنچی ہو، وہ شخص صرف اس بات کا مکلف ہوگا کہ اپنی عقل سے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرے، اس کا اتنا ہی ایمان باعث نجات ہوگا، اس کی عقل ہی اس کے لئے نذیر ہے، باقی دیگر احکام شرعیہ کا وہ مکلف نہیں سمجھا جائے گا۔ تو کیا ایسا کوئی ہو سکتا ہے؟ جواب یہ ایک فرضی مسئلہ ہے، اس کا وجود شاید ممکن ہو، مگر فی زمانا ایسا ہونا بہت ہی مشکل ہے۔ خوب سمجھو، مسئلہ دقیق اور نہایت باریک ہے۔ واللہ أعلم وعلمه أتم

بعض مفسرین حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ مسئلہ محض امکانی اور احتمالی نہیں، بلکہ واقعی اور نفس الامری ہے، اس سے مراد یاجوج وماجوج ہیں، جو سدّ ذوالقرنین کے پیچھے محبوس ہیں، اور یہ نہایت بہت بڑی خلقت ہے۔ آج دنیا کا کوئی ایک ایسا مختصر گوشہ نہیں جہاں امریکہ وغیرہ کی رسائی نہ ہوئی ہو، کرۂ ارض کے چپہ چپہ پر یورپ نے کمند ڈالا ہوا ہے، تقریباً ہر ملک کے مخصوص سے مخصوص مقامات تک ان کی رسائی ہو چکی ہے، مگر خالق ومالک کائنات نے انہیں دو چیزیں نہ دکھائیں، اور نہ ان کو ان تک رسائی فراہم کی ہے، وہ مسلسل، رات دن اربوں ڈالر خرچ کر چکے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر انہیں نابینا بنایا ہوا ہے، اور قدرتی حصار لگا کر انہیں روکا ہوا ہے: ایک یہی سدّ ذوالقرنین، دوسرے ان کے بڑے باپ "دجال اکبر"۔ ان دونوں پر دنیا والوں کی رسائی اس وقت ہوگی جب ساری علامات قیامت کا ظہور ہوگا۔ واللہ اعلم

وَاِذَاۤ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نُّهۡلِكَ قَرۡيَةً اَمَرۡنَا مُتۡرَفِيۡهَا فَفَسَقُوۡا فِيۡهَا فَحَقَّ عَلَيۡهَا الۡقَوۡلُ فَدَمَّرۡنٰهَا تَدۡمِيۡرًا ﴿۱۶﴾

وَكَمۡ اَهۡلَكۡنَا مِنَ الۡقُرُوۡنِ مِنۡۢ بَعۡدِ نُوۡحٍ‌ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوۡبِ عِبَادِهٖ خَبِيۡرًاۢ بَصِيۡرًا ﴿۱۷﴾

ترجمہ: اور ہم جب کسی بستی کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں تو وہاں کے خوش عیش لوگوں کو حکم دیتے ہیں، پھر وہ اس میں نافرمانی کرتے ہیں، سو اس بستی پر ہماری بات ثابت ہو جاتی ہے، پھر ہم اس بستی کو پوری طرح ہلاک کر دیتے ہیں ⑯ اور نوح کے بعد کتنی ہی قرنیں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا، اور آپ کا ربّ بندوں کے گناہوں کے جاننے دیکھنے کے لئے کافی ہے ⑰

معارف ومنازل

انسان بحیثیت ایک خودمختار مکلّف انسان کے اپنی آبادی اور بربادی کا خود ذمہ دار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس مقصد کے لئے اسے پیدا فرمایا، پھر اسے ہرگز بے یارومددگار نہیں چھوڑا، بلکہ اس کی راہنمائی اور ہدایت کے لئے وقتاً فوقتاً انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث فرمائے تاکہ لوگوں کو نیک اعمال کی تلقین کریں، اور بداعمالیوں سے منع کریں، تاکہ وہ ہلاکت سے بچ جائیں۔ پھر جب بداعمالیوں کی وجہ سے اگر کسی بستی کو ہلاک کرنا ہوتا ہے تو یوں ہی دفعتہً پکڑ کر ہلاک نہیں کر دیتے، بلکہ مکمل اتمامِ حجت کے بعد عذاب کا فیصلہ فرما دیتے ہیں۔ ﴿مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَ اٰمَنْتُمْ﴾ [النساء:۱۴۷] (تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اللہ تعالیٰ؟ اگر تم ایمان لاؤ، اور شکر کرو) وہ تم کو کبھی جلدی میں عذاب نہیں دے گا، جب تک اپنے عذاب کے لئے تم خود فیصلہ نہ کرو۔

اوّل پیغمبروں علیہم السلام اور ان کے نائبین کے ذریعہ تمہیں سمجھایا جاتا ہے، خصوصاً تمہارے امراء، وزراء، سردار وسرمایہ داروں کو، جن کا اثر ورسوخ عوام پر ہوتا ہے، اور عامۃ الناس ہر خیر وشر میں ان کے تابع ہوتے ہیں۔ جب بڑی ناک والے تمہارے امراء اللہ تعالیٰ کے پیغام کو رد کرتے ہیں، اور عوام الناس کو بھی پیغامِ حق کے قبول کرنے سے روک دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں عوام الناس بجائے پیغمبروں کے حکم ماننے کے اپنے امراء وسرداروں کی بات مانتے ہیں۔ یہ سلسلہ دیر تک جاری رہے گا، تب تکوینی طور پر ان کو امر کر کے خودمختار اور آزاد ہی رکھا جائے گا، جب ہدایت کے سارے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں، تب عذاب وہلاکت کا فیصلہ ہو جائے گا۔ یہ ایک نہ بلکہ کئی مرتبہ اتمامِ حجت کے بعد ہوگا۔

آگے نظیر پیش فرما رہے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نوح علیہ السلام تک کسی بستی اور کسی قوم کی ہلاکت اس لئے نہیں ہوئی کہ لوگوں میں ہلاکت کے اسباب پیدا نہیں ہوئے، نہ شرک تھا، نہ کفر ومعصیت، اور نہ نافرمانی، سب

سے پہلی ہلاکت وتباہی حضرت نوح علیہ السلام کی قوم پر آئی۔نوح علیہ السلام اپنی قوم کی اصلاح کے لئے بھیجے گئے، انہوں نے سیکڑوں برس قوم کو سمجھایا، وہ نہ مانے، آخر طوفان کے عذاب سے سب ہلاک کیے گئے، پھر کئی قرنوں کے بعد قوم عاد، قوم ثمود، وغیرہ اپنے شرک وکفراور تکذیب حق کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔تو نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ جہاں نافرمانی اور کفر نہیں وہاں ہلاکت بھی نہیں، اور جہاں کفروشرک اور تکذیب حق کا تسلسل ہوگا وہاں اتمامِ حجت کے بعد عذاب کا فیصلہ بھی ہوگا۔فرمایا:

﴿وَكَفٰى بِرَبِّكَ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا﴾ تیرا ربّ دانا اور بینا ہے، اسے اپنے بندوں کے گناہوں کا علم ہے، وہ سب کچھ جانتا ہے، گنہگاروں اور بے گناہوں کا اسے علم ہے، اپنے علم کے مطابق بندوں سے سلوک کرتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلٰىهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۱۸﴾ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴿۱۹﴾ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ﴿۲۰﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴿۲۱﴾ لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ: جو شخص دنیاوی منافع کا ارادہ کرتا ہے، ہم جس کے لئے چاہیں، جتنا چاہیں اسی دنیا میں اسے دیدیتے ہیں، پھر ہم اس کے لئے دوزخ تجویز کردیں گے، وہ اس میں بدحال ہوکر راندۂ درگاہ ہونے کی حالت میں داخل ہوگا ﴿۱۸﴾ اور جو شخص آخرت کا ارادہ کرے، اور اس کے لئے کوشش کرے، جیسی کوشش ہونی چاہئے، اور وہ مؤمن ہو، سو یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش کی قدردانی ہوگی ﴿۱۹﴾ ہم آپ کے ربّ کی بخشش سے ہر ایک کو دیتے ہیں، ان کو بھی، اوران کو بھی، اور آپ کے ربّ کی بخشش روکی ہوئی نہیں ہے ﴿۲۰﴾ آپ دیکھ لیجئے، ہم نے بعض کو بعض پر کیسی فضیلت دی، اور بلاشبہ آخرت درجات کے اعتبار سے بڑی چیز ہے، اور فضیلت کے اعتبار سے بھی ﴿۲۱﴾ اے مخاطب! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی دوسرے کو معبود نہ بنانا، ورنہ تو مذمت کیا جانے والا، بے یار ومددگار ہوکر بیٹھا رہے گا ﴿۲۲﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

سورۂ نساء میں ارشاد فرمایا: ﴿وَمَنۡ كَانَ يُرِيۡدُ ثَوَابَ الدُّنۡيَا فَعِنۡدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ﴾ [النساء:۱۳۴] (جوکوئی چاہتا ہو ثواب دنیا کا، سواللہ تعالیٰ کے یہاں ہے ثواب دنیا کا اور آخرت کا) وہ تو تمہیں یہی دعوت دیتا ہے کہ: ﴿رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِي الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً﴾ [البقرۃ:۲۰۱] (اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا بھی نیکی دے، اور آخرت میں بی نیکی دے)۔ یعنی کم ظرف بن کر مجھ سے صرف چارروزہ دنیا طلب نہ کرو کہ جس کا انجام بُرا ہے، بلکہ میرے خزانے اتنے بڑے اور لامحدود ہیں کہ دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی میرے قبضہ قدرت میں ہے۔ عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری فرمانبرداری کر کے مجھ سے دونوں طلب کرو، میں تمہیں دونوں کی کامیابی دیدوں گا۔

البتہ اگر پھر بھی کسی کے دل میں اخروی زندگی سنوارنے کا کبھی خیال ہی پیدانہیں ہوتا، بلکہ اس کی ساری تگ ودَو اسی فانی اور چارروزہ زندگی کو باعزّت اور آرام دہ بنانے پر مرکوز رہتی ہے، فرمایا: اسے ہم اسی دنیا میں اپنی مرضی کے مطابق اپنی چاہت کے ساتھ نہ کہ اس کی خواہش پر کچھ دیدیتے ہیں، یہ اس کی جدوجہد کا بدلہ ہی سمجھو جو اسے دنیا میں ہم دیدیتے ہیں، لیکن وہ قیامت میں ہماری ہرطرح کی بخششوں سے محروم ہی ہوگا، اوراس کی محرومیاں دیدنی ہوں گی۔ مَذۡمُوۡم: یعنی جس کی مذمت کی جائے، اور مَّدۡحُوۡر جسے ٹھکرادیا جائے، اور بارگاہِ خداوندی سے دھکے دے کر نکال دیا جائے۔

﴿وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا وَهُوَمُؤۡمِنٌ﴾ طالبِ دنیا کا انجام بیان کرنے کے بعد اب طالبِ مولیٰ کا انجام بیان کیا جارہا ہے۔ یعنی اس کی ہرنیکی کی قدردانی ہوگی، اوراس کی کوئی نیکی فراموش نہیں کی جائے گی۔ راہِ حق میں جو بھی قدم اٹھایا ہوگا، اور جو بھی عمل کیا ہوگا اسے ضرور شرفِ قبول بخشا جائے گا۔ طلبِ مولیٰ کی پہچان کے لئے تین علامتوں کا ذکر فرمایا ہے:

☆......پہلی علامت: ﴿وَمَنۡ اَرَادَ الۡاٰخِرَةَ﴾ یعنی ہرعمل سے اس کا مقصد آخرت کی سرخروئی ہو، کوئی دنیوی مقصد اس کے اعمال کا محرّک نہ ہو۔

☆......دوسری نشانی: ﴿وَسَعٰى لَهَا سَعۡيَهَا﴾ اوراس کے لئے وہ پوری طرح اپنی امکانی کوشش بروئے کارلارہا ہو۔ قربانی کا وقت آئے تو بصد مسرت دل وجان پیش کردے، اس راہ کے ہرکانٹے کو پھول سے زیادہ قیمتی

جانے، مصائب وآلام کے طوفان اُمڈ کر آئیں تو وہ چٹان بن کر کھڑا ہو جائے۔ غرضیکہ اپنی جسمانی وذہنی قوتوں اور دیگر وسائل کو حق کی سربلندی کے لئے وقف کر دے، اور چاہئے بھی ایسا، کیونکہ اس کے سامنے ایک ایسا عظیم مقصد ہے کہ جس کے سامنے پوری کائنات ہیچ ہے، یعنی رضائے مولیٰ عزّشانہ۔ یہ کتنی شرم کی بات ہے کہ دنیا کے طلبگار تو اپنی لیلائے مقصود کے لئے شب وروز بیتاب ہو، اوراس کے لئے دوڑ دھوپ کی انتہاء کر دیں، اور طالبِ مولیٰ صرف باتیں بنانے اور امیدیں سجانے، اور آرزوئیں کرنے پر ہی اکتفاء کرے؟

اس لئے راہِ حق میں قدم رکھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ ﴿سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا﴾ کے کلمات طیبات کو ہر وقت اپنے پیش نظر رکھیں، اور جب بھی ان کا "راہوار" شوق سست گام ہونے لگے تو ﴿سَعٰى لَهَا سَعْيَهَا﴾ کا مہمیز لگا کر اسے ہوشیار کریں۔

☆......طالبِ مولیٰ کی تیسری علامت یہ ہے کہ قلب وباطن نورِ ایمان سے منور ہو کر چمک رہا ہو، کفر وشرک اور نفاق وبدعات کا کوئی اندھیرا موجود نہ ہو، کیونکہ اعمال کی قبولیت کا انحصار صرف ایمان اور اتباع سنت پر ہے، اگر ایمان اور اتباع سنت نہ ہو تو عمر بھر کی ساری ریاضتیں بے سود ہیں۔ پھر طالبِ دنیا کی مساعی کا معاوضہ دینے کے لئے وعدہ اس طرح فرمایا:

﴿مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ﴾ ہم جتنی مقدار چاہیں گے، اور جسے چاہیں گے اسے دیں گے، لیکن طالبِ مولیٰ کو یوں سرفرازی بخشی:

﴿فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ ان کی ساری کاوشیں قبول فرمائیں جائیں گی، کوئی عمل اکارت نہ جائے گا۔ نیاز واخلاص جتنا زیادہ ہوگا جزاء بھی اتنا عمدہ وزیادہ ہوگا، ایک کے بدلے دس، ایک کے بدلے سات سو، ایک کے بدلے ہزار، اسی طرح بیس ہزار، پھر بیس لاکھ تک۔

اگر کسی میں ان تین علامات میں سے کوئی ایک شرط نہ ہو، یا وہ شرط ناقص ہو ﴿سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا﴾ کا اس پر ترتب یا اطلاق نہ ہوگا، جیسا کہ کسی کی نیت خالص نہ ہو، یا عملی سعی ناقص غیر شرعی ہو، یا ایمان خالص نہ ہو، اس میں شرک وبدعت کی چاشنی شامل ہو۔ بعض لوگ رات دن ہر لحہ اعمال میں لگے رہتے ہیں، لیکن شرک اور بدعات سے پرہیز نہیں کرتے ہیں، ان کی یہ تھکاوٹیں بے سود ہیں۔ ﴿وَعَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ﴾ [الغاشیۃ:۳] (مصیبت جھیلتے ہوئے، تھکن سے چور) تو ہیں، مگر ﴿تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً﴾ [الغاشیۃ:۴] (وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے) کا

پیغام انہیں اچھی طرح یاد رکھنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ایسی عبادت کو ہرگز قبول نہیں فرماتے جو خالص نہ ہو۔

﴿كُلًّا نُّمِدُّ﴾ ہم سب کو امداد دیتے ہیں۔ ﴿هٰٓؤُلَآءِ﴾ جو طالب دنیا ہیں۔ اور ﴿وَهٰٓؤُلَآءِ﴾ اور جو طالب آخرت ہیں، ان کو بھی: ﴿مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ﴾ تیرے ربّ کی بخشش ہے، وہ تمام کائنات کے لئے ہے، اس میں طالب دنیا اور طالب مولیٰ سب شریک ہیں، جس طرح اچھے لوگوں کی معاشی ضروریات پوری کرتے ہیں، اسی طرح بُرے لوگوں پر بھی عنایات کی بارش برساتے ہیں۔ یہاں كُلًّا میں تنوین مضاف الیہ کا بدل ہے، اصل عبارت یہ ہے کہ كُلَّ الْفَرِيْقَيْنِ. [مظهري]

﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا﴾ اور تیرے ربّ کی بخشش روکی ہوئی نہیں ہے، مقبولین کو بھی نعمتیں دی جاتی ہیں، اور غیر مقبولین کو بھی۔ اس دنیوی نعمتوں کے دونوں حقدار ہیں۔ البتہ آخرت کا معاملہ الگ ہوگا، اسی کو واضح کر کے فرمایا:

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ﴾ آپ دیکھ لیجئے، ہم نے کس طرح بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ یہ دنیاوی فضیلت ہے، اس میں مؤمن اور کافر کی قید نہیں ہے، یہاں مال ودولت، عزّت ومرتبہ، جاہ و منصب میں بہت ہی مراتب ہیں، کوئی برابری نہیں ہے، بلکہ بہت سے کافروں کے پاس مال زیادہ ہے، اور بہت سے مؤمنین کے پاس کم ہے۔

﴿وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا﴾ اور بلاشبہ آخرت درجات کے اعتبار سے بڑی چیز ہے، اور فضیلت کے اعتبار سے بھی۔ اصل ایمان، تقویٰ، اعمالِ صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے نتیجے تو وہیں چل کر ظاہر ہوں گے کہ کس شخص میں کس درجہ کا ایمان وتقویٰ اور اعمالِ صالحہ اور صلاحیت تھی، دنیاوی امور میں تفاوت ہم واضح طور پر دیکھ رہے ہیں، مگر اس کے مقابلے میں آخرت کا تفاوت بہت بڑا ہوگا، مگر اس تفاوت کے باوجود وہاں اہل جنت میں نہ حسد ہوگا، اور نہ پریشانی۔ اللہ تعالیٰ ان سب پر اطمینان کا لباس ڈال کر انہیں ایسا مطمئن فرمائے گا کہ ہر شخص یہی سمجھے گا کہ اس سے بہتر اور کوئی نہیں۔ آخر میں شرک اور اہل شرک کی مذمت وخواری پر تنبیہ فرمائی:

﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ اللہ تعالیٰ سبحانہ کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ یہ خطاب عام ہے، قیامت تک تمام آنے والوں کو شامل ہے۔

﴿فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا﴾ ورنہ تو اس حال میں بیٹھا رہے گا کہ تو مذموم ہوگا، اور مخذول ہوگا۔ یعنی

قیامت کے دن بدحال لوگوں میں شمار ہوگا، تمہارا کوئی یار و مددگار کوئی نہ ہوگا، اور ذلیل و رسوا ہو جائے گا۔ مذموم جس کی مذمت کی جائے، مخذول بے یار و مددگار کو کہتے ہیں، جس کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ ؕ اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ﴿۲۵﴾

ترجمہ: اور آپ کے ربّ نے حکم دیا ہے کہ عبادت نہ کرو مگر اسی کی، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اے مخاطب! اگر تیرے پاس ان دونوں میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف بھی نہ کہنا، اور ان کو مت جھڑکنا، اور ان سے اچھے طریقے سے بات کرنا ﴿۲۳﴾ اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا، اور یوں عرض کرنا کہ اے ربّ! ان پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا ہے ﴿۲۴﴾ تمہارا ربّ ان چیزوں کو خوب جاننے والا ہے جو تمہارے دلوں میں ہیں، بلاشبہ وہ رجوع کرنے والوں کو بخشنے والا ہے ﴿۲۵﴾

معارف و منازل

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ سبحانہ نے اوّل یہ حکم فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرو، اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو۔ دوئم یہ کہ والدین کے ساتھ احسان اور حسن سلوک اختیار کرو۔ یہاں سے آیت ۳۸ تک چودہ بڑے اہم اصولوں کا بیان ہو رہا ہے، ان کی نشاندہی آئندہ ہوگی۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں بنیادی اور سب سے ضروری اور اہم بات توحید کے ساتھ والدین کے ادب و احترام، اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کو ملا کر فرض قرار دیا گیا، جیسا کہ سورۂ لقمان میں اپنے شکر کے ساتھ والدین کے شکر کو ملا کر لازم فرمایا ہے، ارشاد ہے: ﴿اَنِ اشْكُرْ لِيْ وَلِوَالِدَيْكَ﴾ [لقمان: ۱۴] (یعنی میرا شکر ادا کر، اور اپنے والدین کا بھی)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سبحانہ کی عبادت کے بعد والدین کی اطاعت و خدمت گزاری سب سے اہم ہے، اور ان کی شکر گزاری بھی واجب ہے۔

صحیح بخاری کی حدیث اسی مقصد پر گواہ ہے کہ سرور عالم ﷺ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کیا ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ نماز اپنے وقت (مستحب) میں۔ سائل نے اس کے بعد پھر دریافت کیا کہ نماز کے بعد کونسا عمل سب سے زیادہ محبوب ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: والدین کے ساتھ اچھا سلوک۔ [بخاری اوّل]

والدین کی خدمت کا لزوم احادیث کی روشنی میں:

صحاح ستہ اور دیگر کتب احادیث میں اس کے متعلق سینکڑوں احادیث مروی ہیں، ان میں سے چند احادیث بطور استشہاد یہ ہیں:

(۱)......مسند احمد، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم میں صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے، اب تمہیں اختیار ہے کہ اس کی حفاظت کرو، یا اسے ضائع کردو۔ [مظهري]

(۲)......جامع ترمذی، مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ حاکم نے اسے صحیح کہا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی رضا باپ کی رضا میں ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی باپ کی ناراضگی میں ہے۔ [مظهري]

(۳)......ابن ماجہ نے بروایت حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ نقل کیا ہے کہ سرور عالم ﷺ سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ اولاد پر ماں باپ کا کیا حق ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ دونوں ہی تیری جنت یا دوزخ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنت ان کی خدمت میں، اور دوزخ ان کی بے احترامی میں ہے۔

(۴)......امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الایمان میں، اور حافظ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے اپنے ماں باپ کا فرمانبردار ہو، اس کے لئے جنت کے دو دروازے کھلے رہیں گے، اور جو شخص ماں باپ کا نافرماں ہو، اس کے لئے جہنم کے دو دروازے کھلے رہیں گے، اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہی تھا، تو ایک دروازہ جنت یا دوزخ کا کھلا رہے گا۔

اس پر ایک شخص نے سوال کیا کہ یہ جہنم کی وعید کیا اس صورت میں بھی ہے کہ ماں باپ نے اس شخص پر ظلم کیا ہو؟ تو آنحضرت ﷺ نے تین مرتبہ فرمایا: وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا وَاِنْ ظَلَمَا. یعنی ماں باپ کی نافرمانی اور ان کو

ایذاء رسانی پر جہنم کی وعید ہر حال میں ہے، خواہ ماں باپ نے ہی اولاد پر ظلم کیا ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اولاد کو ماں باپ سے انتقام لینے کی اجازت نہیں کہ اگر انہوں نے ظلم کیا تو اولاد بھی ان کی خدمت اور اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ [مظهري]

(۵)......امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہما نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو خدمت گزار بیٹا اپنے والدین پر رحمت وشفقت سے نظر ڈالتا ہے تو ہر نظر کے بدلے میں ایک حج مقبول کا ثواب پاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اگر وہ دن میں سو مرتبہ اس طرح نظر کرے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں سو مرتبہ بھی ہر نظر پر یہی ثواب ملتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ بہت بڑا ہے، اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں آئے گی۔ [مظهري]

والدین کی نافرمانی کی سزا دنیا میں:

حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اور سب گناہوں کی سزا تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں قیامت تک مؤخر کر دیتے ہیں بجز والدین کی حق تلفی اور نافرمانی کے کہ اس کی سزا آخرت سے پہلے اسی دنیا میں بھی دی جاتی ہے۔ [مظہری بحوالہ شعب الایمان، بیہقی]

والدین کی اطاعت صرف جائز امور میں ہے:

اس پر علماء وفقہاء کا اتفاق ہے کہ والدین کی اطاعت صرف جائز کاموں میں واجب ہے، گناہوں اور ناجائز کاموں میں اطاعت واجب تو کیا، بلکہ جائز بھی نہیں ہے۔ حدیث میں ہے: ”لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِي مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ“۔ [بخاري] یعنی خالق جل شانہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں ہے۔

والدین کی اطاعت ہر حال واجب ہے، چاہے وہ کافر ہوں:

صحیح بخاری میں مروی ہے کہ حضرت اسماء بنت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہما نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں عرض کیا کہ میری والدہ جو مشرکہ ہے مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہے، کیا میرے لئے جائز ہے کہ میں اس کی خدمت اور خاطر مدارات کرلوں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: صِلِيْ أُمَّکِ. اپنی ماں کی صلہ رحمی، خاطر مدارات کرو۔ اور کافر ماں باپ کے بارے میں خود قرآن کریم کا یہ ارشاد موجود ہے: ﴿وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا﴾ [لقمان: ۱۵] (دنیا میں اچھے طریقے سے ان کے ساتھ رہے)۔ دنیا میں جائز بھلائی اور فرمانبرداری کا بسا اوقات یہ بھی فائدہ

ہوتا ہے کہ وہ اولاد کی خدمت سے متاثر ہو کر شاید اسلام قبول کرلیں، بشرطیکہ اللہ تعالیٰ چاہے۔

امام سیاست، مفسر قرآن حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سکھ ماں کی ساری زندگی وہ وہ خدمت کی جس کی مثال نہ ہو، مگر اس کی قسمت میں ایمان لکھا ہوا نہیں تھا، وہ کفر پر مرگئی۔

چند مختصر مفید باتیں اور مسائل احادیث کی رُو سے:

(۱)......اگر جہاد فرض کفایہ کے درجہ میں ہو تو والدین کی اجازت شرط ہے۔

(۲)......اگر جہاد فرض عین ہو تو والدین کی اجازت شرط نہیں۔

(۳)......والدین کو اُف کہنا درکنار، تیز نظر اور ترش نگاہ سے دیکھنا بھی حرام ہے۔

(۴)......اگر والدین بلا وجہ امر کریں کہ تم اپنی بیوی کو طلاق دو تو وہ حقدار ہیں۔

(۵)......اگر والدین نفلی عبادت سے منع کریں تو وہ واجب الاتباع ہیں۔

(۶)......والدین کی نافرمانی اکبر الکبائر گناہوں میں شمار ہے، اس سے بچو۔

(۷)......والدین کی خدمت نفلی جہاد و نفلی حج و عمرہ سے افضل ہے، اسی وجہ سے حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو خیر التابعین کا لقب حاصل ہوا کہ وہ والدہ کے فرمانبردار تھے۔

(۸)......اگر کسی نے والدین کو نہیں پایا، یا گمراہی کی وجہ سے ان کی خدمت نہیں کی، لیکن ان کے مرنے کے بعد صدقہ، استغفار اور کارِ ثواب انجام دیا، اور متواتر ان کے لئے دعا کرتا رہا تو اس کا نام فرمانبرداروں میں لکھا جائے گا۔

(۹)......اگر کوئی چاہتا ہے کہ میرا مستقبل بہتر ہو تو والدین کی خدمت کرے۔

(۱۰)......اگر وہ چاہتا ہے کہ میری اولاد فرمانبردار ہو تو اپنے والدین کا فرمانبردار رہے۔

(۱۱)......اگر کوئی اپنے حسن خاتمہ کے لئے فکرمند ہے تو والدین کی خدمت کرے۔

(۱۲)......اگر کوئی چاہتا ہو کہ میری دعائیں قبول ہوں تو والدین کو راضی رکھے۔

(۱۳)......اگر کوئی چاہتا ہو کہ میری عمر میں اضافہ ہو تو الدین کی خدمت کرے۔

(۱۴)......اگر کوئی اپنے رزق میں اضافہ کا طالب ہو تو والدین کو راضی کرے۔

(۱۵)......والدین کی ناراضی سے اور انہیں ایذاء رسانی سے صرف دنیا ہی میں جو نقصانات پیش آسکتے ہیں

وہ بیس سے زائد ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں:

☆اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ☆جنت سے محرومی ☆دوزخ کا عذاب ☆شفاعت سے محرومی ☆سکرات الموت کی سختی ☆بُرے خاتمہ کا خوف ☆عذاب قبر ☆اولاد کی سرکشی ☆عمر میں کمی ☆تندرستی سے محرومی ☆بیماریوں میں ابتلاء ☆رزق وروزی میں کمی ☆تجارت وکاروبار میں بے برکتی ☆ نیکیوں سے محرومی ☆عبادات کی عدم قبولیت ☆لوگوں کی نظروں میں خفت ☆دعاؤں کی عدمِ قبولیت ☆اللہ تعالیٰ کی مغفرت سے محرومی ☆گناہوں میں دلیری ☆قدم بقدم پر بدنامی ☆خواہ مخواہ مصائب وآلام کا ہجوم وکثرت، وغیرہ۔

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ اور تیرے ربّ نے قطعی حکم دے دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور ماں باپ کے ساتھ خوب اچھا سلوک کرو۔ ﴿قضٰی﴾ کلامِ عرب میں تقریباً پندرہ سولہ معانی میں مستعمل ہے، اپنے صلہ سے اور سیاق وسباق سے ان معانی کا اعتبار وتعین ہوتا ہے۔ یہ سب معانی قرآن کریم میں متفرق مقامات پر مذکور ہیں۔ یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے ﴿قضٰی﴾ سے قطعی حکم مراد لیا ہے، ظاہری اسباب میں ماں باپ کا شمار عظیم نعمتوں میں ہے، جن کے بغیر اولاد کا وجود ہی نہیں ہوسکتا ہے، پس وہ اولاد کے وجود اور زندگی کی علت ہیں۔

﴿اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَاۤ اَوْ كِلٰهُمَا﴾ اگر تیرے پاس ان میں سے ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں۔ ﴿فَلَا تَقُلْ لَّهُمَاۤ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ تو ان کو اُف (ہوں) بھی نہ کرنا۔ یعنی اُف تک نہ کہو، اور نہ ان کو جھڑکی دینا۔ ﴿وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا﴾ اور ان سے پیار وادب سے بات کرنا، مثلاً: ابا جاں، اماں جاں، وغیرہ۔

اُف سے مراد یہ کلمہ ہی ہے، یا اُف سے مراد قلت ہے، یعنی ایسی ادنیٰ بات بھی نہ کہو جو تمہاری طرف سے نفرت یا کراہت یا تنگدلی کا اظہار کررہی ہو، جب ادنیٰ ایذاء رساں بات بصراحت نص قرآنی حرام کردی گئی تو اس سے بڑا ایذاءرساں سلوک بدرجہ اولیٰ حرام ہوگیا۔

﴿وَّلَا تَنْهَرْهُمَا﴾ جب معمولی جھڑکی حرام ہوگئی تو اس سے زائد بُرا سلوک قطعاً حرام ہوگا۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ انہوں نے بچپن میں تمہارا بول وبراز صاف کردیا، اور تمہاری بیماری پر پریشان ہوئے، اور ساری رات جاگتے رہے، لیکن انہوں نے کسی بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے اُف تک نہیں کہا، آج جب وہ اس کے حقدار ہیں کہ تم بھی ان کے بول وبراز صاف کرتے ہوئے اُف نہ کہو۔

﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾ اور دونوں کے لئے اپنی عاجزی کے بازو بچھا دو، پست رکھو، یہ کنایہ ہے عاجزی اور اطاعت بالصدق سے، انتہائی رحم کی وجہ سے کہ جس طرح بچپن میں تم قابلِ رحم وشفقت تھے، آج وہ اسی کیفیت کے ساتھ تمہارے رحم وکرم کے محتاج ہیں۔

﴿وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ اور ان کے لئے دعاء کرو، اور کہو: اے میرے ربّ! ان پر رحمت فرما، جیسے انہوں نے میری بچپن میں پرورش کی، اور پالا، اور تربیت کی۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دعاء رحمت کرنے کا حکم عام ہے، ماں باپ کافر ہوں یا مسلمان، سب کے لئے دعاء کا حکم ہے، کیونکہ کافر ماں باپ کے لئے دعاء رحمت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ ان کو اسلام کی توفیق دے، اسلام کی توفیق دینا بھی رحمت ہے۔

﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا فِيْ نُفُوْسِكُمْ﴾ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہوتا ہے تمہارا ربّ اس کو خوب جانتا ہے۔ یہ تنبیہ ہے کہ جس طرح ظاہراً کچھ لوگوں کی وجہ سے، یا کسی اور غرض سے خدمت کرتے ہو، اور دعاء بھی کرتے ہو، یہ کافی نہیں، بلکہ قلب و باطن میں بھی بوڑھے والدین کی صحیح محبت واطاعت اور حقیقی احترام سے اپنے باطن کو روشن وآباد رکھو۔ دراصل قلبی محبت واطاعت تمام فرمانبرداریوں کا سرچشمہ ہی ہے۔

اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ والدین کی فرمانبرداری کے معاملہ میں تمہاری نیتوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے، اگر ثواب کی اُمید پر، اور تعمیل حکم ربانی پر فرمانبرداری کروگے تو ثواب پاؤگے، اور اگر کسی دنیوی لالچ کی وجہ سے فرمانبرداری کروگے، تو اس کا نتیجہ نیت کے موافق ہوگا۔

﴿اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا﴾ اگر تم صلاحیت اور نیکی وخیر کے حامل ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں شامل حال ہوں گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کے لئے بہت بخشنے والا ہے۔

اَوَّابِيْنَ بمعنی تَوَّابِيْن کے ہے۔ یہ دراصل انبیاء کرام علیہم السلام کی صفت ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿اِنَّهٗ اَوَّابٌ﴾ [ص:۱۷] (بیشک وہ اللہ سے بہت لو لگائے ہوئے تھے)۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا: ﴿نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ﴾ [ص:۴۴] (بہترین بندے تھے، بیشک وہ اللہ سے خوب لو لگائے ہوئے تھے)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ﴾ [ھود:۷۵] (بیشک ابراہیم بڑے بردبار، بری آہیں بھرنے والے، ہر وقت ہم سے لو لگائے ہوئے تھے)۔

☆☆☆

صَلٰوۃُ الْاَوَّابِیْن:

یہ بہت بابرکت نماز ہے۔صبح چاشت کے وقت کم ازکم چار رکعت، زیادہ سے زیادہ آٹھ یا بارہ رکعتیں پڑھنا مستحب ہے۔اسی طرح مغرب کے بعد چھ رکعت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اس کے پڑھنے والوں کو فرشتے گھیر لیتے ہیں۔بہرحال چاشت کی نماز اور مغرب کے بعد چھ نوافل دونوں صلوٰۃ الاوّابین کہلاتے ہیں۔

فائدہ:

والدین کے حقوق اور ان سے حسنِ سلوک کی اہمیت کو جس طرح آیات میں بیان فرمایا گیا ہے اس کے بعد کون ایسا مسلمان ہے جو عملی زندگی میں ان زرین اصول سے انحراف کرے؟ اگر کسی مسلمان کو ان واضح ہدایات پر اللہ تعالیٰ نے عمل کی توفیق عطا فرمائی تو سمجھو کہ وہ خوش قسمت ہے، جسے دنیا وآخرت دونوں کی خوشحالی اور سعادت سے نوازا گیا، اور وہ ہر طرح کی ناکامیوں سے محفوظ رہا۔لیکن بدقسمت لوگ وہ ہیں جو ان ہدایات پر عمل نہیں کرتے، اور احکامِ الٰہی کا یا تو مذاق اڑاتے ہیں، یا بیوی بچوں کی محبت میں غرق ہو کر بوڑھے والدین پر توجہ نہیں دیتے ہیں، پس ان کی شقاوت انہیں گھیر لیتی ہے، جس کے نتیجے میں دنیا وآخرت دونوں میں برباد ہو جاتے ہیں۔

ان واضح تعلیمات اور روشن ہدایات کے بعد آپ اگر یورپ، امریکہ، برطانیہ ودیگر متمدّن ترقی یافتہ ملکوں کا جائزہ لیں گے تو وہاں آپ کو ایسی اولاد ہرگز نہیں ملے گی جو بوڑھے والدین کی خدمت یا دیکھ بھال کرے۔وہاں والدین کی حیثیت گھر میں رکھنے کا رواج ہی نہیں۔اسی لئے تو ان ممالک کی حکومتوں کو ایسی پناہ گاہیں (ضعیف العمر لوگوں کے لئے ادارے) بنانا پڑتی ہیں جہاں بوڑھے اور ضعیف والدین کو رکھا جاتا ہے، اور سرکاری سطح پر ان کی نگرانی ہوتی ہے۔یہ ادارے باقاعدہ سرکاری سطح پر رجسٹرڈ ہیں، جن میں سینکڑوں بوڑھے بستے بساتے ہیں۔مردوں کے الگ، عورتوں کے الگ۔اگر آپ ان سے ملیں گے تو انہیں نہایت افسردہ اور پریشان پائیں گے۔

لڑکے جب شادی کرتے ہیں تو ان کی بیویوں کا سب سے بڑا اور پہلا کارنامہ یہی ہوگا کہ شوہر کے عمر رسیدہ والدین کو گھر سے نکال کر ادارۂ تحفظِ ضعفاء کے حوالہ کریں۔اب یہ کارنامہ یورپ کا نہیں رہا، پورے مشرق سطیٰ میں جاری ہے۔مکہ مکرمہ اور مدینہ میں اور تمام شہروں میں ہیں۔اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿۲۶﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ
الشَّيٰطِيْنِ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿۲۷﴾ وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا
فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا ﴿۲۸﴾ وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ
مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا ﴿۲۹﴾ اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا ۢ بَصِيْرًا ﴿۳۰﴾

ترجمہ: اور رشتہ دار کو، اور مسکین کو دو، اور مسافر کو اس کا حق دے دو، اور مال کو بے جا مت اڑاؤ ﴿۲۶﴾ بلاشبہ مالوں کو بے جا اڑانے والے شیطانوں کے بھائی ہیں، اور شیطان اپنے ربّ کا بڑا ناشکرا ہے ﴿۲۷﴾ اور اگر تو اپنے ربّ کی رحمت کے انتظار میں جس کی تو امید رکھتا ہے، ان لوگوں کی طرف سے پہلوتہی کرے تو ان سے نرم بات کہہ دینا ﴿۲۸﴾ اور تو اپنے ہاتھ کو اپنی گردن کی طرف باندھا ہوا مت رکھ، اور نہ اسے بالکل ہی کھول دے، ورنہ تو ملامت کیا ہوا، خالی ہاتھ ہو کر بیٹھا رہے گا ﴿۲۹﴾ بلاشبہ تیرا ربّ جس کے لئے چاہے رزق میں فراخی دیدیتا ہے، اور وہ رزق میں تنگی بھی فرما دیتا ہے، بلاشبہ وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، دیکھنے والا ہے ﴿۳۰﴾

معارف ومنازل

دو تین آیات پہلے ہم نے چودہ بنیادی اصولوں کے متعلق جو نشاندہی کا وعدہ کیا تھا کہ آیت نمبر ۲۳ سے آیات ۳۸ تک چودہ اصول بیان ہوئے ہیں، اجمالاً وہ یہ ہیں:

(۱) تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ (۲) والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ (۳) رشتہ دار کو ان کا حق دو، اور مسکین ومسافر کو اس کا حق دو۔ (۴) فضول خرچی نہ کرو۔ (۵) رشتہ داروں اور حقداروں کو نرم جواب دو۔ (۶) نہ ہاتھ بند رکھو، نہ بالکل کھلا چھوڑ دو۔ (۷) اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ (۸) زنا کے قریب مت جاؤ۔ (۹) قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو۔ (۱۰) مال یتیم میں خیانت مت کرو۔ (۱۱) عہد کی پابندی کرو۔ (۱۲) کیل اور وزن میں برابری کرو۔ (۱۳) کسی ایسی چیز کے پیچھے نہ لگو جس کا تمہیں علم نہ ہو۔ (۱۴) زمین میں اکڑ کر غرور کے ساتھ نہ چلو۔ انہی اصولوں کا کچھ بیان سورۂ انعام رکوع ۱۹ میں ہوا، وہاں دیکھیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان آیات میں وہ بڑے بڑے بنیادی اصول پیش کئے جا رہے ہیں جن پر اسلام پوری انسانی زندگی کے نظام کی عمارت قائم کرنا چاہتا ہے۔ یہ گویا سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت حق کے منشور کا ایک اہم

بنیادی حصہ ہے، جسے مکی دور کے خاتمے، اور آنے والے مدنی دور کے نقطہ آغاز پر پیش کیا گیا، تاکہ دنیا بھر کو معلوم ہو جائے کہ اس نئے اسلامی معاشرے اور اسلامی ریاست کی بنیاد کن فکری، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور قانونی اصولوں پر رکھی جائے گی۔

پہلی بنیادی بات یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اس میں یہ بھی ذہن نشین ہو کہ بندگی اور غلامی اور بے چون وچرا اطاعت بھی صرف اسی کی کرو، اسی کے حکم کو حکم، اور اسی کے قانون کو قانون مانو، اور اس کے سوا کسی کا اقتدارِ اعلیٰ تسلیم نہ کرو۔

یہ صرف ایک مذہبی عقیدہ، اور صرف انفرادی طرز عمل کے لئے ایک ہدایت ہی نہیں ہے، بلکہ اس پورے نظام، اخلاق وتمدن اور سیاست اسلامیہ کا سنگ بنیاد بھی ہے جو مدینہ طیبہ پہنچ کر سرورِ عالم ﷺ نے عملاً قائم فرمایا۔ اس کی عمارت اسی نظریے پر اٹھائی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ شانہ ہی ملک کا مالک اور بادشاہ ہے، اور اسی کی شریعت پورے عالم کا قانون ہے۔

﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ﴾ یہ تیسرا اصول ہے۔ فرمایا: رشتہ داروں کو ان کا حق دو، اور مسکین ومسافر کو بھی دو۔ ان اصولوں کا منشا یہ ہے کہ آدمی اپنی کمائی اور اپنی دولت کو اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا عطیہ سمجھے، اور خود کو اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ تصور کر کے یہ فیصلہ کرلے کہ مالک حقیقی کا جو حکم ہوگا میں اسے بسروچشم قبول کروں گا۔ اس کا حکم مانتے ہوئے جہاں اس کا حکم ہوگا وہاں اس مال کو خرچ کروں گا، میں اس مال کا مالک نہیں، صرف نگراں ہوں، اپنی ضروریات پوری کرنے کے بعد اپنے رشتہ داروں، اپنے ہمسایوں اور دوسرے حاجتمند لوگوں کے حقوق بھی ادا کروں گا۔

اجتماعی زندگی میں تعاون، ہمدردی، حق شناسی وحق رسانی کی روح جاری وساری ہو، ہر رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کا معاون، اور ہر مالدار سرمایہ دار انسان اپنے پاس کے محتاج انسان کا مددگار ہو۔ ایک مسافر جس بستی میں بھی جائے اپنے آپ کو مہمان نواز لوگوں کے درمیان پائے، معاشرے میں حقوق کا تصور اتنا وسیع ہو کہ ہر شخص ان سب انسانوں کے حقوق اپنی ذات پر اور اپنے مال پر محسوس کرے۔ جس کے درمیان وہ رہتا ہو ان کی خدمت کرے، تو یہ سمجھتے ہوئے کرے کہ ان کا حق ادا کر رہا ہوں، یہ نہ کہ ان پر احسان کا بوجھ رکھ رہا ہوں۔

اگر کسی کی خدمت سے بوجہ اپنے فقر ومسکنت کے معذور ہو تو اس سے معافی مانگے، اور اللہ تعالیٰ کا فضل

طلب کر کے نرمی اور انکساری کے ساتھ ان کی دلجوئی کرے، اور اپنے دل میں عہد کرے کہ اگر مولائے کریم جل شانہ نے مجھے نواز کر مال دیدیا تو میں اپنے حلقہ، احباب، دوستوں، عزیزوں، ہمسایوں، محتاجوں، مسافروں کی خدمت کروں گا، اور ان کے توسط سے اپنے پروردگار کے قرب تک پہنچنے کی کوشش جاری رکھوں گا، اور کسی کار خیر سے دریغ نہیں کروں گا۔

نزولِ قرآن کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اور ان کے شاگردوں تابعین اور تبع تابعین انہی زرین اصولوں پر پورے شوق ورغبت کے ساتھ عمل پیرا رہے، جس کے نتیجے میں ان کا شمار اللہ تعالیٰ کے مقرب لوگوں میں ہوا، اور وہ دنیا و آخرت کے سعادتمندوں اور صدیقیں میں شمار ہوئے۔

﴿وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ﴿٢٦﴾ اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴿٢٧﴾﴾

یہ چوتھا اصول ہے۔ فرمایا: اور مال کو بے جا فضول مت اڑاؤ، فضول خرچی شیطانی فعل ہے، اور اس سے بچو، اور دیکھو کہ فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں۔ قرآن کریم میں فضول خرچی کے لئے دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں: ایک "اسراف" اور دوسرا "تبذیر"۔ بعض مفسرین دونوں الفاظ کو بالکل ہم معنی قرار دیتے ہیں، جبکہ دوسرے بعض ان میں معمولی سا فرق بتاتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ کسی جائے ضرورت پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہے، جیسے فرمایا: ﴿كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا﴾ [الأعراف:۳۱] (کھاؤ پیو، اور اسراف سے بچو)۔

ضرورت سے زائد مال خرچ کرنا اسراف اور مکروہ تحریمی ہے۔ لباس کے متعلق حدیث میں ارشاد ہے: اِلْبَسُوْا مَا شِئْتُمْ مَا لَمْ يَكُنْ مَخِيْلَةً وَلَا سَرَفًا. جس قسم کا لباس چاہو پہنو، مگر اس میں نہ تکبر کا اظہار ہو، اور نہ اسراف ہو۔ یعنی بہت مہنگا اور قیمتی لباس، یا وہ جو تقویٰ کے خلاف ہو۔

دوسری چیز "تبذیر" ہے، یعنی بالکل بے موقع اور بے محل خرچ کرنا، جس کی نہ ضرورت ہو، نہ جواز، جیسے جوا، شراب، بدکاری، لہو ولعب، آتشبازی، شادی بیاہ پر پانی کی طرح پیسہ خرچ کرنا، یا یہ کہ قبروں کو پختہ بنانا، وہاں گنبد بنانا، چراغاں کرنا، میلہ لگانا، وغیرہ۔ یہ سب تبذیر میں داخل ہیں، اور حرام ہیں، اور شیطان کے بھائیوں کے کام ہیں۔

مذہبی اور غیر مذہبی رسومات کی آج کل بھر مار ہے، اور لوگ بلا تحاشا پیسے خرچ کر کے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دے رہے ہیں۔ اگر ان پیسوں سے مسجد و مدرسہ و ہسپتال تعمیر کریں، یا دوسرے رفاہی کاموں میں لگائیں، یا مسکینوں، محتاجوں، یتیموں، بیواؤں پر خرچ کریں، یا مسکینوں کی شادی اور مکانوں پر، یا غریبوں کو حج وعمرہ کرائیں۔ تو

روزِ قیامت پہاڑوں کے برابر اجر وثواب حاصل کریں، اور رضائے الٰہی کے سایہ میں محشر کے میدان میں ہر طرح کی سہولتیں حاصل کریں، اور بجائے شیطانوں کے بھائی شمار ہونے کے خیر القرون کے برگزیدہ ہستیوں کے بھائی بنیں، اور بلند وبالا جنتوں کی سیر کریں۔

امام ابوبکر جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے شیطانوں کے بھائی ہونے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ ایسے ہی لوگ شیطان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔ دوئم یہ کہ قیامت کے روز فرشتے ایسے لوگوں کو رسیوں میں باندھ کر شیطانوں کے ساتھ ہی جہنم میں پھینک دیں گے۔

﴿وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا﴾ شیطان اپنے ربّ کا ناشکرا ہے، اور اس کی نعمتوں کی بے قدری کرنے والا ہے۔ اسی طرح اسراف وتبذیر کرنے والے بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بے قدری کرنے والے ہیں، پس ان کا ٹھکانہ بھی شیطان کے ساتھ جہنم ہی ہوگا۔

﴿وَاِمَّا تُعْرِضَنَّ عَنْهُمُ﴾ اگر آپ کسی وقت ان حقداروں سے پہلوتہی کریں، یعنی اگر آپ صاحبِ استطاعت نہ ہوں کہ قرابتداروں اور مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کرسکیں، اور ان کے دینے سے بسبب مجبوری معذرت کریں تو یہ کرلیں کہ:

﴿فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا﴾ تو آپ ان کے لئے نرم پہلو اختیار کریں، ردِّ جمیل کے ساتھ ان کو خوش رکھیں، کہ فی الحال میں خالی ہاتھ ہوں، جب میرے پاس کچھ ہوگا میں تمہیں تمہارا حق پورا پورا دیدوں گا۔ اسی کو فرمایا:

﴿ابْتِغَآءَ رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ تَرْجُوْهَا﴾

اِبْتِغَآءَ بمعنی تلاش۔ ﴿رَحْمَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ﴾ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی۔ تَرْجُوْهَا جس رحمت اور مال کی تجھے امید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اپنے ربّ کی طرف سے جس رزق کے آنے کی تم کو امید ہو اس کے انتظار میں تم کو ان کی طرف سے رخ پھیرنا، یا پہلوتہی کرنا پڑے تو ان کے ساتھ نہایت نرم بات کرو، تاکہ وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ یہ پانچواں اصول تھا، جو بیان ہوا۔

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ اور نہ ہی تم اپنا ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ لو (یعنی بخل نہ کرو) اور نہ ہی بالکل کھول دو (کہ تمام مال فنا کردو)۔ ابن مردویہ رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت گرامی میں ایک لڑکا حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میری

ماں نے آپ سے فلاں فلاں چیز مانگی ہے (یعنی کھانا، کپڑا اور کچھ نقد) آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ آج ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ لڑکا بولا: میری ماں کہتی ہے کہ آپ اپنا کرتہ عنایت فرمائیں۔ آپ ﷺ نے اپنا کرتہ مبارک انہیں عنایت فرمادیا، اور خود گھر میں برہنہ بیٹھ گئے۔ اس کے بعد اذان عصر ہوگئی، لوگ کافی دیر تک آپ ﷺ کا انتظار کرتے رہے، اور معلوم ہونے کے بعد کسی نے اپنی چادر خدمت گرامی پیش کی، جسے پہن کر آپ مسجد تشریف لے گئے، اس پر یہ آیت نازل ہوگئی۔ ابن ابی حاتم نے منہال ابن عمرو رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی یہ واقعہ اسی طرح نقل کیا ہے۔ [مظہری بزیادۃ] یہ چھٹا اصول بیان ہورہا ہے کہ کنجوسی بھی نہ ہو، اور سب کچھ خرچ کرنا بھی نہ ہو، بلکہ میانہ روی ہو۔

﴿فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا﴾ مَلُوْم بمعنی ملامت کیا ہوا، اس کا تعلق کنجوسی کے ساتھ ہے کہ پھر لوگ آپ کو کنجوس کہیں گے، ملامت کریں گے۔ مَحْسُوْرًا کا تعلق كُلَّ الْبَسْطِ کے ساتھ ہے کہ سب کچھ دینے سے آپ حسرت زدہ اور پریشان ہوجائیں گے، اور یہ دونوں غیر مناسب ہیں۔

﴿اِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ﴾ آپ کا ربّ بلاشبہ جن کو چاہتا ہے فراخی عطاء فرماتا ہے، اور جس کا رزق تنگ کرنا چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، یعنی ارزاق کی فراخی اور تنگی دونوں اسی کے اختیار میں ہیں، وہ اپنی صوابدید اور حکمت کے مطابق کسی کو زیادہ اور کسی کو کم عطاء فرماتا ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ﴿۳۱﴾ وَ
لَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ۭ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ﴿۳۲﴾ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ
وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا ﴿۳۳﴾ وَ
لَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۠ وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ
مَسْـُٔوْلًا ﴿۳۴﴾ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۭ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ: اور تم اپنی اولاد کو تنگدستی کے ڈر سے قتل نہ کرو، انہیں ہم رزق دیں گے، اور تمہیں بھی، بلاشبہ ان کا قتل کرنا کبیرہ گناہ ہے ﴿۳۱﴾ اور زنا کے پاس نہ جاؤ، بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی اور بری راہ ہے ﴿۳۲﴾ اور اس جان کو قتل نہ کرو

جس کا قتل اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، مگر یہ کہ حق کے ساتھ ہو، اور جو شخص مظلوم ہونے کی صورت میں قتل کیا گیا تو ہم نے اس کے ولی کے لئے تسلط رکھا ہے، سو وہ قتل میں حد سے آگے نہ بڑھے، بلاشبہ اس کی مدد کی جائے گی ﴿۳۳﴾ اور تم یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ، مگر اس طریقہ پر جو بہتر ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے، اور عہد کو پورا کرو، بلاشبہ عہد کی پوچھ گچھ ہوگی ﴿۳۴﴾ اور جب تم ناپو تو پورا ناپو، اور صحیح ترازو سے تولو، یہ بہتر ہے، اور انجام کے اعتبار سے اچھی چیز ہے ﴿۳۵﴾

معارف و منازل

یہاں سے ساتویں اصول کا بیان ہو رہا ہے کہ معاشی پریشانی اور تنگدستی کے ڈر سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔ یہ آیت کریمہ ان معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبطِ ولادت یا نسلِ انسانی کو کم کرنے، اور آبادی کو روکنے کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ اس طرح کی تحریکیں وہ لوگ چلاتے رہے ہیں، یا چلانے کی تدبیر کر رہے ہیں جن کا خداوند قدوس پر ایمان نہیں ہے، اور اس کی رزاقیت کے مفہوم سے ناواقف اور جاہل ہیں۔

افلاس کا خوف قدیم زمانے میں قتلِ اطفال اور اسقاطِ حمل کا محرک ہوا کرتا تھا، اور آج وہ ایک تیسری تدبیر، یعنی منعِ حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے۔ لیکن منشورِ اسلامی کا یہ اصول انسان کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر ان کی تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے، جن سے اللہ تعالیٰ عزّ و جلّ کے بنائے ہوئے قانونِ فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتا ہے۔ اس اصول کی رُو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائش نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتا ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ اس خالق و مالک کے ہاتھ میں ہے، جس نے تجھے زمین میں بسایا ہے، جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو روزی دیتا رہا ہے، بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔

تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے اتنے ہی، بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں، لہٰذا خداوند تعالیٰ کی تخلیقی انتظامات میں انسان کی

بے جا دخل اندازیاں حماقت وتنگ نظری کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ یہ اسی اسلامی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ نزول قرآن کے زمانہ سے لے کر آج تک کسی زمانے میں بھی مسلمانوں کے اندر نسل کشی کا کوئی عام میلان پیدا نہیں ہوا۔ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ﴾ [الأنعام:١٥١] (اور اپنی اولاد کو تنگدستی کی وجہ سے قتل نہ کرو) اور یہاں فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ مطلب دونوں کا ایک ہے کہ اہل عرب میں سے کچھ لوگ بچوں کو اس لئے قتل کرتے تھے کہ ان کو کہاں سے کھلائیں گے، اور دوسرے کچھ لوگ اولاد کو اس لئے قتل کرتے تھے کہ ممکن ہے کہ آئندہ تنگدست ہو جائیں۔

قرآن کریم نے دونوں نظریوں کی دونوں آیتوں میں وضاحت کے ساتھ تردید فرمائی۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں دشمنانِ اسلام جو آج کر رہے ہیں، اور کہہ رہے ہیں ہمارا ضعیف العقیدہ اور کمزور ایمان والے مسلمان ان کی منگھڑت اور بے بنیاد باتوں پر یقین کر رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت پر ان کا عقیدہ نہیں جمتا، جو فرمایا:

﴿نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ ہم تمہیں بھی رزق دیں گے، اور انہیں بھی رزق دیں گے، اور یاد رکھو، تم جتنے بھی طریقے تقلیل اولاد کے لئے جاری کرو، اور خوب منصوبہ بندیاں کرو، یہ سب ربّ العزّت کی قضاء وقدر کے سامنے ناکام ہیں۔ کیا فرعون ہزاروں بچوں کے قتل سے اپنے ممکنہ دشمن پیغمبر اعظم موسیٰ علیہ السلام کا راستہ اور آمد کو روک سکا تھا؟ قدرت نے جو کام کرنا تھا کر کے دکھایا، اور موسیٰ علیہ السلام کو اس کے محل میں پہنچا کر اسی کی زیر نگرانی پرورش کرائی۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: مَامِنْ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اِلَّا وَهِيَ كَائِنَةٌ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے علم میں قیامت تک جتنی بھی جانیں پیدا ہونے والی ہیں، وہ ضرور پیدا ہو کر رہیں گی۔ ایک اور حدیث میں ارشاد فرمایا: مَامِنْ كُلِّ الْمَاءِ يَكُوْنُ الْوَلَدُ وَاِذَا اَرَادَ اللّٰهُ خَلْقَ شَيْءٍ لَمْ يَمْنَعْهُ شَيْءٌ. ہر نطفے سے اولاد نہیں ہوتی، اور جب اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے کوئی چیز روکنے والی نہیں۔ [مشکوۃ]

دیکھا جاتا ہے کہ مرد وعورت ولادت کو روکنے کے لئے کئی طرح کی چیزیں استعمال کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو جب تخلیق منظور ہوتی ہے تو ان سب انسانی تدبیروں کے باوجود استقرار ہو جاتا ہے، اور اولاد پیدا ہو جاتی ہے۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا﴾ اور زنا کے پاس بھی مت پھٹکو، بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی اور بری راہ ہے۔ زنا ایسا برا عمل ہے جو کہ قتل سے بھی برا ہے، قتل میں صرف قاتل کا منہ کالا ہوتا ہے، مقتول گناہ سے محفوظ رہتا ہے، جبکہ زنا میں دونوں زنا کاروں کا منہ کالا ہوتا ہے، اور انسانی عزت وشرف تباہ ہو جاتا ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب مجھے معراج کرائی گئی تو میں ایسے لوگوں پر گزرا جن کی کھالیں آگ کی قینچیوں سے کاٹی جارہی تھیں، میں نے کہا: اے جبرئیل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: یہ وہ لوگ ہیں جو زنا کرنے کے لئے زینت اختیار کرتے ہیں۔ پھر میں ایسے بدبودار گڑھے پر گزرا جس میں بہت سخت آوازیں آرہی تھیں، میں نے کہا: اے جبرئیل! یہ کون ہیں؟ انہوں جواب دیا کہ یہ وہ عورتیں ہیں جو زنا کاری کے لئے بنتی سنوارتی ہیں، اور وہ کام کرتی ہیں جو ان کے لئے حلال نہیں۔ [الترھیب: جلد۳]

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سَآءَ سَبِیْلًا یہ زنا بہت بُرا عمل اور بُرا راستہ ہے، جس سے بے حیائی کا وہ خطرناک راستہ کھل جاتا ہے جس سے پورا معاشرہ تباہ ہو جاتا ہے۔ زنا کار یہ سمجھے کہ وہ دوسروں کی ننگ وعزّت کو لوٹ رہا ہے، اور اس کی ماں، بہن، بیٹی اور بیوی محفوظ رہیں گی، قدرت کا تازیانہ اور چابک اس کے خاندان پر اسی طرح حملہ آور رہے گا جس طرح وہ دوسروں پر حملہ آور ہوگا۔ اس کی خاندانی عورتیں ہزار محل میں چھپ جائیں، لیکن ان کے ساتھ ایسی غلط کارروائی ہوگی جو ان کے وہم وگمان میں نہ ہو۔ کَمَا تُدِیْنُ تُدَانُ ۔ یعنی جیسا کروگے ویسا بھروگے مشہور ہے۔ پس چاہئے کہ زنا کار اپنے خاندان کی عورتوں پر رحم کر کے ان کی عزّت کو دوسروں کے ہاتھوں تار تار نہ کرے۔

ایک حدیث میں اسی بات پر اشارہ ہے۔ مسند احمد میں حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ ہذیل کے ایک شخص نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے زنا کی اجازت دے دیجئے، حاضرین نے اسے ڈانٹ پلائی، اور ملامت کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حضور ایسی گستاخی؟ آنحضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرے قریب آؤ، وہ قریب آکر بیٹھا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کیا تو یہ حرکت اپنی ماں، بہن، بیٹی، پھوپھی، خالہ میں سے کسی کی نسبت پسند کرتا ہے؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! خدا مجھ کو آپ پر قربان کردے، ہرگز نہیں۔ فرمایا: دوسرے لوگ بھی اپنی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں، پھوپھیوں اور خالاؤں کے لئے یہ حرکت گوارا نہیں کرتے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کے لئے دعاء فرمائی کہ الٰہی! اس کے گناہ کو معاف فرمادے، اور اس کے دل کو پاک کردے، اور

شرمگاہ کو محفوظ فرمادے۔

ابوامامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ دعاء کے بعد اس شخص کی یہ حالت ہوگئی کہ کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا۔

يَارَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا ★ عَلٰى حَبِيْبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

اے ہمارے مہربان ربّ! ہمیں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت نصیب فرما۔ آمین

اسلام اللہ تعالیٰ کا پاکیزہ دین ہے:

اسلام اللہ تعالیٰ کا دین ہے۔ اسلام عصمت اور پاکدامنی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام میں فواحش ومنکرات، زناکاری اور اس کے اسباب ودواعی، اور ہر قسم کے محرکات پر بڑی سخت پابندی ہے۔ اسی طرح بے پردگی، عریانی، رنگ ناچ، گانے وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ زنا تو دور کی بات ہے محرمات کے نکاح پر بھی پابندی ہے، یہاں تک کہ غیر قوم کی بچی دودھ شریک رضاع سے بہن بن جاتی ہے، اور دودھ پلانے والی عورت ماں بن جاتی ہے، یہ سب کچھ اسلام کی تعلیم اور اس کی برکت ہے۔ اس گناہ سے بچانے کے لئے شریعت مطہرہ نے بدنظری تک سے منع فرمایا ہے، اور یہ فرمایا ہے کہ آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں، اور ہاتھ پاؤں بھی زنا کرتے ہیں، اور اس گناہ پر سخت سے سخت دنیاوی سزا مقرر کی ہے۔

غیر شادی شدہ کے لئے سو کوڑے، اور شادی شدہ کے لئے سنگساری تجویز کی ہے کہ مجمع عام میں اسے پتھروں سے مار مار کر ہلاک کیا جائے، تاکہ سارے لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ یہ صرف دنیاوی سزا ہے، اور آخرت کے لئے جو سزا مقرر ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جہاں جہاں یہ شرعی سزا نافذ ہے وہاں زنا کی شرح اور وجود نہ ہونے کے برابر ہے، اور یہ حدود شریعت کے نفاذ کی برکت ہے، اور جہاں حدودِ شرعیہ کا نفاذ نہیں وہاں زنا کا عام رواج ہے، اور کوئی حال پرساں نہیں۔

یورپ کے شہوت پرست انسان نما حیوانوں میں زناکاری عام ہے۔ محرم عورتوں (ماں، بہن، خالہ وغیرہ) تک سے زنا عام ہے، اور اسے کوئی عیب نہیں سمجھتے ہیں، جبکہ ہمارے ملک میں بھینسا بھی اتنا حیادار ہے کہ اپنی ماں اور بہن سے جفتی نہیں کرتا۔ اگر کسی وجہ سے ضرورت محسوس ہوئی تو اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال کر یہ کام کراتے ہیں۔ مگر عیسائی دنیا میں صرف اتنا قانون ہے کہ زنا بالجبر ممنوع ہے، اگر رضامندی سے ہو تو کوئی قباحت نہیں۔ نکاح ثانی پر

پابندی ہے، جبکہ زنا پر کوئی پابندی نہیں۔

کسی وقت یورپ کی آبادی پینتالیس کروڑ کی لگ بھگ تھی، اس وقت یورپ کے ایک منصف مزاج مؤرخ نے خود افسوس کرتے ہوئے لکھا کہ مجھے یہ صدمہ اور پریشانی لاحق ہے کہ ہماری اس پوری آبادی میں پچاس حلالی بھی نہیں، سب حرامی ہیں۔ [معالم العرفان]

ویتنام سے لے کر عراق وافغانستان تک میں جو امریکی سپاہی لڑ رہے ہیں یہ سارے حرامزادے ہیں، تب ہی تو پیچھے سے ان کے لئے نہ رونے والے ہوتے ہیں، اور نہ احتجاج کرنے والے۔ وہاں تو یہ حال ہے کہ کوئی انسانی نسب باقی نہیں رہا، معلوم نہیں ہوتا کہ کون کس کا بیٹا ہے، اور کس کا بھائی، کس کا بھتیجا ہے۔ صلہ رحمی اور عزیز وقریب کا سلسلہ ہی ختم ہے، وہ حلالی ہونے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، بلکہ حرامی ہونے پر فخر کرتے ہیں، اور اسے اپنی آزادی تصور کرتے ہیں۔

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾ قتل نفس کا ارتکاب نہ کرو، جسے اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔ یہ نواں اصول ہے۔ قتل نفس کی حرمت قطعی ہے، خواہ اپنا نفس ہو (خودکشی) یا کسی دوسرے انسان کا، مطلق حرام اور کبیرہ ہے۔ اس مسئلہ کی تفصیلات سورۂ بقرہ کے رکوع ۲۱، سورۂ نساء کے رکوع ۱۳ اور سورۂ مائدہ کے رکوع ۷ میں گزر چکی ہیں۔ صحیحین میں ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں مگر تین صورتوں میں: جان کے بدلے جان، یا زانی محصن شادی شدہ، یا جو شخص دین کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔

﴿وَمَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِیِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا یُسْرِفْ فِّی الْقَتْلِ﴾ اور جو شخص ظلماً قتل کیا گیا اس کے ولی کے لئے ہم نے اختیار دے رکھا ہے، سو وہ قتل کرنے میں حد سے آگے نہ بڑھے۔ کسی کے قتل کرنے پر جو عذاب ہے وہ آخرت سے متعلق ہے، اور دنیا میں اس کے بارے میں شرعی احکام ہیں، ان کے مطابق قتل کا ثبوت ہو جانے پر انہیں حدود پر عمل کرے جو حدود اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہیں۔ مثلاً: قتل خطاء میں قاتل کو قتل نہ کرے، کیونکہ یہ تعدی شمار ہوگا، اور قتل عمد میں جو شریعت مطہرہ نے قصاص لینے کا اختیار دیا ہے، اسے قاتل تک ہی محدود رکھا جائے، جوش انتقام میں قاتل کے سوا کسی دوسرے بیگناہ کو قتل نہ کرے، اور ایک شخص کے عوض متعدد لوگوں کو قتل نہ کرے۔ نیز قاتل کے قتل کرنے میں زیادتی نہ کرے، لاش کی بے حرمتی اور مثلہ نہ کرے، ہاتھ پاؤں کا کاٹنا اور آگ میں جلانا وغیرہ سب ممنوع اور حرام ہیں۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا﴾ بلا شبہ مقتول کے ولی کی مدد ہوگی، قصاص لینے اور دیت کے بارے میں، شرعی قاضی اس کے ساتھ تعاون کرے گا، اسے بے یارومددگار نہیں چھوڑے گا، بشرطیکہ وہ حدود شریعت سے تجاوز نہ کرے۔ تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جائے۔

﴿وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ﴾ یہ دسواں اصول ہے۔ فرمایا کہ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ، مگر ایسے طریقے پر جو مستحسن ہو، یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ معاشرے کی درستگی کا انحصار اس بات پر ہے کہ کمزور طبقات کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، اس معاملہ میں یتامیٰ سرفہرست ہیں۔ تفصیل سورۂ نساء میں گزر چکی ہے۔

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾ اور عہد کو پورا کرو، بیشک عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔ یہ گیارہواں اصول ہے۔ فرمایا کہ عہد کے متعلق باز پرس ہوگی، عہد شکنی غیر اخلاقی اور غیر شرعی کام ہے۔ قرآن کریم نے متعدد مقامات پر بہت بکثرت ایفائے عہد کا حکم دیا ہے، اور عہد شکنی سے منع فرمایا ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا﴾ [البقرة:۱۷۷] (اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جب وعدہ کرتے ہیں)۔ سورۂ مائدہ میں فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ﴾ [المائدة: ۱] (اے ایمان والو! وعدوں کو پورا کرو)۔ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾ [النحل: ۹۱] (اور اللہ کے وعدے کو پورا کرو جب تم وعدہ کرو) علیٰ ہذا القیاس۔ دوسرے مقامات پر بھی اس کا ذکر ہے۔

﴿وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ﴾ اور پورا کرو ماپ کو، جب تم کوئی چیز ماپتے ہو، اور سیدھے ترازو کے ساتھ پورا پورا وزن کر کے دیدو۔ ماپ وتول میں کمی بیشی نہ کرو، جو کہ خیانت اور حرام ہے، اور اس کا شمار کبیرہ گناہوں میں ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم اسی گناہ میں ہلاک ہوگئی۔ اس کے متعلق سورۂ مطففین میں بہت بڑی وعید آئی ہوئی ہے۔

﴿ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ ان احکام پر عمل کرنا بہتر ہے، اور انجام کے اعتبار سے بہت اچھی چیز ہے۔ یہ بارہواں اصول بیان ہوا کہ کیل اور وزن میں خیانت نہ کرو۔

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۭ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰۗىِٕكَ

كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا ۝٣٦ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۝٣٧ كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا ۝٣٨

ترجمہ: اورتو اس کے پیچھے نہ پڑ جس کا تجھے علم نہ ہو، بلاشبہ کان اور آنکھ اور دل ان سب کے بارے میں سوال ہوگا ۝٣٦ اور تو زمین میں اتراتا ہوا نہ چل، بیشک تو ہرگز زمین کو پھاڑ نہیں سکتا، اور ہرگز پہاڑوں کی لمبائی کو نہیں پہنچ سکتا ۝٣٧ یہ سب بُرے کام تیرے ربّ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں ۝٣٨

معارف ومنازل

حدیث شریف میں ایسے لوگوں کے لئے وعید آئی ہے کہ جو بغیر تحقیق ہر بات پر یقین کر کے اسے روایت کرتے ہیں، یا اپنی طرف سے حدیث وضع کرتے ہیں، یا بغیر تحقیق عام باتوں کو حدیث کہتے ہیں۔ آیت کریمہ میں عموم کے ساتھ خطاب ہے کہ اے مخاطب! بے تحقیق بات زبان سے مت نکال، نہ کسی بات کی اندھا دھند پیروی کر، آدمی کو چاہئے کہ کان، آنکھ، دل ودماغ سے کام لے لے، اور بقدر کفایت تحقیق کر کے کوئی بات منہ سے نکالے، یا عمل میں لائے۔ سنی سنائی باتوں پر، بے سوچے سمجھے، یوں ہی اٹکل پچو کوئی قطعی حکم نہ لگائے، یا عملدرآمد شروع نہ کر دے۔

اس میں جھوٹی شہادت دینا، غلط تہمتیں لگانا، بے تحقیق چیزیں سن کر کسی کے درپئے آزار ہونا، یا بغض وعداوت قائم کر لینا، باپ دادا کی تقلید یا رسم ورواج کی پابندی میں خلاف شرع اور ناحق باتوں کی حمایت کرنا، ان دیکھی یا ان سنی چیزوں کو دیکھی اور سنی بتلانا، غیر معلوم چیزوں کے متعلق دعویٰ کرنا کہ میں جانتا ہوں، یہ سب صورتیں اس آیت میں داخل ہیں۔

یاد رکھنا چاہئے کہ قیامت کے دن تمام قویٰ واعضاء کے متعلق سوال ہوگا، اور باز پرس ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے جو اعضاء دیئے ہیں یوں ہی نہیں دیئے ہیں، بلکہ جن جن مقاصد کے لئے دیئے ہیں انہیں ان مقاصد میں استعمال کرنے کا حکم بھی دیا ہوا ہے، اور غیر متعلقہ مقاصد میں استعمال کرنے سے منع بھی فرمایا ہے۔ ہر ہر عضو کا کام دوسرے سے الگ ہے، پس ان کا استعمال اگر صحیح مصرف میں ہوگا تو تقویٰ شمار ہوگا، اور شکر بھی، اگر مقصد میں استعمال ہی نہ ہو، یا کسی غیر مقصد میں ہو تو ناشکری ہوگی، اور تقویٰ کے خلاف بھی ہوگا جو کہ گناہ ہے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میرے لئے چھ

چیزوں کے ضامن بن جاؤ، میں تمہارے لئے جنت کا ضامن بن جاتا ہوں: (۱) جب بات کرو تو سچ بولو۔ (۲) وعدہ کرو تو پورا کرو۔ (۳) جب تمہارے پاس امانت رکھ دی جائے تو اسے ادا کرو۔ (۴) اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرو۔ (۵) اپنی نگاہوں کو نیچی رکھو۔ (۶) اپنے ہاتھوں کو بے جا استعمال سے روکے رکھو۔ [مشکوٰۃ المصابیح: ۴۱۵]

یاد رکھنا چاہئے یہ سارے اعضاء یہاں دنیا میں تو فرمانبردار ہیں، اور آپ کا حکم ماننے والے ہیں، لیکن قیامت کے دن تمہارے خلاف گواہی دیں گے۔ سورۂ نور میں فرمایا: ﴿يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ اَلْسِنَتُهُمْ وَاَيْدِيْهِمْ وَاَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ [النور: ۲۴] (جس دن ان کی زبانیں اور ان کے ہاتھ پاؤں ان کے خلاف اس عمل کی گواہی دیں گے جو وہ دنیا میں کیا کرتے تھے)۔

اسی چیز کو نظر میں رکھ کر سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ دعاء بتلادی: اَللّٰهُمَّ اِنِّي اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ سَمْعِي وَمِنْ شَرِّ بَصَرِيْ وَمِنْ شَرِّ لِسَانِي وَمِنْ شَرِّ قَلْبِي وَمِنْ شَرِّ مَنِيِّ۔

کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ یہ میرے اعضاء ہیں، جیسے چاہوں استعمال کروں، تم خود اپنے نہیں ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک ہو، اور تیرے اعضاء بھی اسی کے حکم کے تابع ہیں، اور اس کے حکم کو ماننے والے ہیں۔

یہ تھا تیراہواں اصول۔ اس کے بعد چودہواں اصول کا بیان ہے، جو یہ ہے:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ۚ اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا﴾ تو زمین میں اکڑ کر، اتراتا ہوا مت چل، بیشک تو زمین کو نہیں پھاڑ سکتا، اور پہاڑوں کی بلندی کو نہیں پہنچ سکتا۔ یہ انفرادی اور اجتماعی و قومی فخر و غرور دونوں کے لئے حکم ہے۔ انسان ایک عجیب ہستی ہے، جب اسے کوئی عہدہ یا مال و شرف نصیب ہوتا ہے تو وہ اپنی اصلی بنیاد کو بھول جاتا ہے، اور اس کا ظرف بجائے وسیع و کشادہ ہونے کے تنگ ہو جاتا ہے، وہ اپنے آپ کو ایک ناقابلِ تسخیر شخصیت تصور کرتا ہے، اور خود کو تمام مخلوقات سے بہتر گمان کرتا ہے، دوسرے لوگ اسے حقیر معلوم ہونے لگتے ہیں، اور حق بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا ہے۔ اس کی باتیں، گفتار و کردار، چال چلن یک لخت بدل جاتے ہیں، وہ سوائے اپنے وجود کے سب کو ناکارہ سمجھتا ہے۔ وہ سینہ تان کر، زمین پر پاؤں مار کر، اپنی گردن کو اونٹ کی گردن کی طرح اوپر کر کے چلنے لگتا ہے۔ اسی کو فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ اکڑ کر زمین پر مت چلو، تم نہ زمین کو پھاڑ کر سوراخ کر سکتے ہو، اور نہ اپنی گردن اوپر اٹھا کر پہاڑوں کی بلندی تک پہنچ سکتے ہو۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایک شخص دو چادریں پہنے ہوئے

نازوغرور کے انداز میں چل رہا تھا، خود پسندی اختیار کیا ہوا تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا، وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جائے گا۔ [بخاري]

ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ تکبر کرنے والوں کا حشر قیامت کے دن اس حال میں ہوگا کہ ان کی صورتیں انسانوں جیسی ہوں گی، اور جسم چیونٹیوں کے برابر چھوٹے چھوٹے ہوں گے، ان پر ذلت چھائی ہوئی ہوگی، انہیں دوزخ کے جیل خانے کی طرف ہانکا جائے گا، جس کا نام ''بُولَس'' ہے، ان لوگوں پر آگوں کو جلانے والی آگ چڑھی ہوئی ہوگی، ان کو دوزخیوں کے جسم کا نچوڑا ہوا پیپ پلایا جائے گا۔ [مشکوٰۃ: ۴۳۳]

حضرت عیاض بن حمارؓ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ تواضع اختیار کرو تا کہ کوئی شخص کسی کے مقابلہ میں فخر نہ کرے، اور کوئی کسی پر ظلم نہ کرے۔ [مشکوٰۃ: ۴۱۷] حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں داخل نہ ہوگا وہ آدمی جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا۔ [مسلم]

﴿كُلُّ ذٰلِكَ كَانَ سَيِّئُهٗ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوْهًا﴾ یہ سب بُرے کام تیرے ربّ کے نزدیک ناپسندیدہ ہیں۔ صاحب معالم فرماتے ہیں کہ وَقَضٰی رَبُّكَ سے یہاں تک جتنے امور واصول بیان ہوئے ان کے ترک کو ناپسندیدہ فرمایا، اور جتنے امور سے بچنے کا حکم ہے ان کے ارتکاب کو ناپاپسندیدہ فرمایا، یعنی مامورات کا ترک اور منہیات کا ارتکاب، یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

ذٰلِكَ مِمَّآ اَوْحٰٓى اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنَ الْحِكْمَةِ ؕ وَلَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتُلْقٰى فِىْ جَهَنَّمَ مَلُوْمًا مَّدْحُوْرًا ﴿۳۹﴾ اَفَاَصْفٰىكُمْ رَبُّكُمْ بِالْبَنِيْنَ وَاتَّخَذَ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ اِنَاثًا ؕ اِنَّكُمْ لَتَقُوْلُوْنَ قَوْلًا عَظِيْمًا ﴿۴۰﴾

ترجمہ: یہ باتیں اس حکمت میں سے ہیں جو آپ کے ربّ نے آپ کی طرف وحی کے ذریعے بھیجی ہیں، اور اے مخاطب! اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود تجویز نہ کرو، ورنہ تو ملامت کیا ہوا، راندہ کیا ہوا، دوزخ میں ڈالا جائے گا ﴿۳۹﴾ کیا تمہارے ربّ نے تم کو بیٹوں کے ساتھ مخصوص کرادیا، اور فرشتوں کو اپنی بیٹیاں بنالیا؟ بلاشبہ تم بڑی بات کہتے ہو ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

یعنی اوپر جو پُرمغز اور بیش بہا عجیب نصیحتیں کی گئیں یہ وہ علم وحکمت اور تہذیب اخلاق کی باتیں ہیں جنہیں عقل سلیم قبول کرتی ہے، اور انہیں اپنانے سے آدمی قربِ الٰہی اور ابدی سعادت کا استحقاق حاصل کرسکتا ہے۔ یہ تمام باتیں آپ ﷺ کے پاس وحی الٰہی کے ذریعہ بھیجی گئی ہیں، ان میں سب سے ضروری اور اہم باری تعالیٰ کی توحید ہے۔ ان مذکورہ بالا نصیحتوں کا بیان اسی توحید سے شروع کیا گیا تھا: ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا﴾ خاتمہ پر بھی توحید یاد دلائی گئی تاکہ مسلمان سمجھ لیں کہ تمام حسنات کا آغاز وانجام خالص توحید کو ہونا چاہئے۔

یہاں ﴿لَا تَجْعَلْ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ﴾ میں خطاب ساری اُمت دعوت اور ساری اُمت اجابت کو ہے، کوئی بھی شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے گا وہ مستحق ملامت ہوگا، اور قیامت کے دن جہنم میں دھکیل دیا جائے گا۔

مَدْحُوْر بمعنی ذلیل اور پھٹکار وراندۂ درگاہ، جیسے رَجِیم۔ مشرکین نے شیطان کے سمجھانے پر فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بتا کر عیسائیوں سے بھی چند قدم آگے نکلے۔ اس کی پوری تفصیل سورۂ نحل کی آیت ۵۷۔۵۸ کے تحت دیکھ لیں۔

۞ ۞ ۞

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا ﴿۴۱﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ
اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا ﴿۴۲﴾ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ
عُلُوًّا كَبِيْرًا ﴿۴۳﴾ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ؕ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ
اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ﴿۴۴﴾

ترجمہ: بلاشبہ ہم نے اس قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ سمجھیں، اور یہ ان کی نفرت ہی میں اضافہ کرتا ہے ﴿۴۱﴾ آپ فرما دیجئے کہ اگر اس کے ساتھ اور معبود بھی ہوتے جیسا کہ یہ لوگ کہتے ہیں تو انہوں نے عرش والے کی طرف راستہ تلاش کیا ہوتا (کرلیا ہوتا)۔ ﴿۴۲﴾ وہ پاک ہے، اور اس سے بہت برتر ہے جو یہ لوگ کہتے ہیں ﴿۴۳﴾ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے اس کی پاکی بیان کرتے ہیں، اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی پاکی بیان نہیں کرتی ہو، لیکن تم ان کی حمد کو نہیں سمجھتے، بلاشبہ وہ حلیم ہے، غفور ہے ﴿۴۴﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اوّل تو یہ فرمایا کہ ہم نے قرآن کریم میں جو باتیں بیان کی ہیں، جن میں توحید کی دعوت ہے، تذکیر بأیام اللہ، تذکیر بآلاء اللہ، تذکیر بمابعد الموت، شرک کی مذمت، افعالِ خیر کی ترغیب اوران کا انجام، افعالِ شر کی وعیدیں، جنت اوراس کی راحتوں کا بیان، اسی طرح جہنم اوراس کے عذابوں کی کیفیت، دلائل توحید اور ضرب الامثال کے ذریعہ اثبات توحید وابطالِ شرک، اسی طرح حق تعالیٰ کی صفات کا بیان وغیرہ، تاکہ لوگ غور کریں، سوچیں، اورعبرت حاصل کریں، اور سمجھیں، جس کے ذریعہ ایمان قبول کریں، اوراعمالِ صالحہ بجالائیں، مگر:

﴿وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا﴾ اورحال یہ ہے کہ وہ لوگ ان باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، وہ تو اور زیادہ گمراہ ہوکر متنفر ہوتے ہیں۔ ان کے قلوب وحواس پر مہر لگ چکی ہے، وہ بجائے ہدایت کے سرکشی اختیار کررہے ہیں، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الإسراء: ۸۲] (اور ہم وہ قرآن نازل کررہے ہیں جو مؤمنوں کے لیے شفاء اوررحمت کا سامان ہے، البتہ ظالموں کے حصے میں اس سے نقصان کے سوا کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہوتا)۔

اس کے بعد عجیب پیرایہ میں مشرکین کی تردید فرمائی:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ مَعَهٗۤ اٰلِهَةٌ كَمَا يَقُوْلُوْنَ اِذًا لَّابْتَغَوْا اِلٰى ذِى الْعَرْشِ سَبِيْلًا﴾ کہ تم جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود تجویز کرتے ہو، اپنی اس احمقانہ بات کے بارے میں یوں سوچو کہ اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہوتے تو وہ بھی زوردار قدرت والے ہوتے، اوراپنی طاقت کو استعمال کرلیتے، اوراللہ تعالیٰ شانہ جو عرش والا ہے اس تک پہنچنے کا انہوں نے کبھی راستہ ڈھونڈ لیا ہوتا، یعنی راستہ تلاش کرکے عرش والے معبود حقیقی تک پہنچ جاتے (جیسا کہ دنیا میں بادشاہ وملوک ایسا کرتے رہتے ہیں) پھرآپس میں لڑائی ہوتی، اوراس لڑائی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مخلوق کا نظام درہم برہم ہوجاتا، علویات وسفلیات، شمس وقمر اورستارے تباہ ہوتے، لیکن ذرا غوروفکر تو کرلو کہ اگلے پچھلے سب دیکھ چکے، اورمشاہدہ کررہے ہیں کہ ہزاروں سالوں سے ایک خاص محکم ومربوط نظام کے ساتھ سارے عالم کا نظام بغیر کسی کمی بیشی اورتصادم کے، یکساں رواں دواں ہے، اگرایک سے زیادہ خدا ہوتے تو یہ امن وسکون والا نظام کبھی بھی باقی نہ رہتا، بلکہ سب کچھ بگڑ کررہ جاتا۔

جب کوئی مقابل اور معارض وہمسر وہم پلہ نہیں ہے تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معبود حقیقی ایک ہی ہے۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی دلیل سے اپنے مخالف نمرود بن کنعان کو شکست دے کر لا جواب کر دیا، لہٰذا یہ ثابت اور واقعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ ہر قسم کے شرک سے بالاتر ہے، وہ وحدہٗ لا شریک ہے۔ سورۂ انبیاء میں فرمایا: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء: ۲۲] (اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا دوسرے خدا ہوتے تو دونوں درہم برہم ہو جاتے)۔ ان شاء اللہ تفصیل وہاں بیان ہوگی۔

﴿تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ﴾ ساتوں آسمان اور زمین اور جو کچھ ان کے اندر ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔ ؎

خاک، و باد، و آب، و آتش بندہ اند ☆ با من و تو مردہ، با حق زندہ اند

تسبیح کی دو صورتیں ہیں:

ایک تسبیح حالی، دوسری تسبیح مقالی۔ کائنات میں ذوی العقول (مکلف) تین مخلوقات ہیں: فرشتے، انسان اور جنات۔ اس طبقہ میں تسبیح وتحمید کا ہونا، اور اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا واضح ہے۔ دوسرے نمبر پر ذوی الارواح غیر ذوی العقول حیوانات بجميع أنواعه، چرند، پرند، کیڑے مکوڑے، حشرات الارض وغیرہ۔ تیسرے نمبر پر نباتات، درخت، سبزے، جڑی بوٹی وغیرہ بجميع أنواعه۔ چوتھے نمبر پر جمادات، پتھر، پہاڑ، مٹی اور ان سے پیدا شدہ طرح طرح کی چیزیں وغیرہ۔ ان کے متعلق محققین کے دو اقوال ہیں:

ایک یہ کہ ان کی تسبیح حالی ہے، جبکہ دوسرا قول یہ ہے کہ حالی بھی ہے اور مقالی بھی ہے، اگرچہ انسان استعداد نہ ہونے کی وجہ سے ان مخلوقات کی تسبیح کو نہیں سنتا، اور ادراک نہیں کر سکتا، مگر ان کی تسبیح شب و روز مقالی طور پر جاری رہتی ہے، اور:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ﴾ کے عموم کے بغیر کسی استثناء کے یہی معنی ہیں۔ اور شیء کا اطلاق تمام موجودات کو شامل ہے، اور سب پر یکساں اطلاق ہو رہا ہے۔ آئندہ اس کی مثالیں اور بہت سارے جزئیات کا بیان ہوگا۔

تسبیح حالی کا مطلب یہ ہے کہ ہر چیز کا اپنا مستقل وجود ہے، اور اس کے اپنے ذاتی احوال ہیں، جو اس پر گزرتے ہیں۔ یہ اس بات پر دلالت کر رہے ہیں کہ وہ اپنے وجود میں، اپنے باقی رہنے میں، اور اپنے احوال کی تبدیلی

میں کسی صاحب قدرت کے تابع ہیں، پس یہی وجود اور انقلاب وتبدیلی احوال کی شہادت حق تعالیٰ سبحانہ خالق کائنات کی تسبیح وتقدیس ہے۔(یہ تسبیح حالی جبلی،فطری،تکوینی،غیر اختیاری ہے)۔

اس عمومی معنی کے اعتبار سے کائنات کا ہر ذرہ ذرہ، ذی روح ہو، یا جماد ہو، شجر ہو، یا حجر ہو، مؤمن ہو یا کافر ہو، سب کے وجود سے اللہ تعالیٰ شانہ کی تسبیح وتحمید ظاہر ہورہی ہے۔

دوسری قسم تسبیح مقالی کا مطلب یہ ہے کہ جو الفاظ وحروف وکلمات کے ذریعے ہو یہ وہ تسبیح ہے جس میں یہ ضروری نہیں کہ انسان بھی انہیں سمجھ جائیں، یا سن لے، جب آپ اس کی زبانیں نہیں سمجھ پاتے تو جانوروں وغیرہ کی زبانیں کیا سمجھیں گے، اور جمادات کی تسبیح کیا سنیں گے، اور سمجھیں گے۔

جانورں اور نباتات اور جمادات کی تسبیح کا ثبوت:

(۱) اسطوانہ حنانہ کا قصہ مشہور ومعروف ہے کہ جب سرور عالم ﷺ منبر پر خطبہ کے لئے تشریف لے گئے تو وہ کھجور کا تنہ بچے کی طرح زار وقطار رونے لگا، آپ ﷺ ممبر سے اترے اور اس سے چمٹ گئے، تو بچے کی طرح روں روں کرنے لگا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اس وجہ سے رویا کہ اس کے پاس جو اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا تھا اسے وہ سنتا تھا، اسی کے فراق میں رونے لگا۔[بخاري] ے

اُستن حنانہ از ہجر رسول ☆ نالہ میزد ہمچوارباب عقول
درمیان مجلس وعظ ہمچنان ☆ کزوے آگاہ گشت ہر پیرو جوان
گفت پیغمبر چہ خواہی اے ستون ☆ گفت جانم ازفراقت گشت خون
مسندت بودم توازمن تاختی ☆ برسر منبر تو مسند ساختی

[رومی]

(۲) سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم یہودیوں سے جنگ کروگے، اور اللہ تعالیٰ تمہیں ان پر غلبہ عطاء فرمائے گا، یہاں تک کہ پتھر تمہیں آواز دیکر کہیں گے کہ اے مسلمان! یہ یہودی میرے پیچھے چھپے ہوئے ہیں، تو انہیں قتل کردے، البتہ درخت غرقد ایسا نہیں کہتے، کیونکہ وہ یہودیوں کا درخت ہے (یہ قرب قیامت میں ہوگا)۔[بخاري]

(۳) حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ عالم کے لئے آسمانوں اور زمین والے استغفار کرتے ہیں، حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَالْحِيتَانَ فِي الْمَاءِ. حتی کہ چیونٹیاں اپنے سوراخوں

میں، اور مچھلیاں پانی میں علماء کے لئے استغفار کرتی ہیں۔ [مشکوۃ المصابیح: ۳۴]

(۴) حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ مَعَهٗ وَالطَّیْرَ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِیْدَ﴾ [سبأ: ۱۰] (اے پہاڑو! تم بھی تسبیح میں ان کے ساتھ ہم آواز بن جاؤ، اور اے پرندو! تم بھی، اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تھا)۔ ﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ﴾ [ص: ۱۸] (ہم نے پہاڑوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ شام کے وقت اور سورج کے نکلتے وقت ان کے ساتھ تسبیح کیا کریں)۔ یہاں پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کا ذکر و بیان ہے۔

(۵) حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا: ﴿قَالَتْ نَمْلَةٌ یّٰۤاَیُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ﴾ [النمل: ۱۸] (ایک چیونٹی نے کہا: چیونٹیو! اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ)۔ اسی کے ساتھ ہدہد نے کہا: ﴿اَحَطْتُّ بِمَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ وَجِئْتُكَ مِنْ سَبَاٍۭ بِنَبَاٍ یَّقِیْنٍ﴾ [النمل: ۲۲] (میں نے ایسی معلومات حاصل کی ہیں جن کا آپ کو علم نہیں ہے، اور میں ملک سبا سے آپ کے پاس ایک یقینی خبر لے کر آیا ہوں)۔ چیونٹی اور ہدہد نے بات کی ہے۔

(۶) حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بلاشبہ مکہ مکرمہ میں ایک پتھر ہے، میں اسے پہچانتا ہوں، وہ مجھے میری بعثت سے پہلے سلام کیا کرتا تھا۔ [مجمع الزوائد]

(۷) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک پہاڑ دوسرے پہاڑ کا نام لے کر آواز دیتا ہے، اور دریافت کرتا ہے کہ اے فلاں! کیا تجھ پر آج کوئی ایسا شخص گزرا ہے جس نے اللہ تعالیٰ شانہ کا ذکر کیا ہو؟ وہ دوسرا پہاڑ جواب دیتا ہے کہ ہاں! ایک شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا میرے اوپر سے گزرا ہے، اس پر وہ سوال کرنے والا پہاڑ خوش ہو جاتا ہے۔ [مجمع الزوائد] یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہے، ایسی باتیں رائے سے نہیں کہی جاتیں۔

(۸) ایک دن ابو جہل چند سنگریزے پتھر ہاتھ کی مٹھی میں لے کر آیا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کہنے لگا: آپ ہمیں آسمانوں کی باتیں بتایا کرتے ہیں، یہاں نزدیک کی چیزوں کا بتاؤ کہ میری مٹھی میں کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں بتادوں یا ہاتھ کی چیز خود بتادے؟ ابو جہل نے کہا: یہ دوسری بات تو ممکن نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میرے رب کے لئے آسان ہے، اتنے میں اس کی مٹھی کے پتھروں نے صاف صاف پڑھا: لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، جس سے ابو جہل نے شرمندہ ہو کر پتھروں کو پھینک دیا، اور کہا یہ جادو ہے۔

سنگہا اندر کف بوجہل بود	☆	گفت احمد را بگو این چیست زود

گر رسولے چیست در دستم نہاں	☆	چون خبرداری زراز آسمان
گفت من گویم کہ در دست چہاست	☆	یا بگویند آن کہ ما حقیم وراست
گفت بوجہل این دوم نادر ترست	☆	گفت آرے حق برآن قادر ترست
لا الٰہ گفت والا اللہ گفت	☆	گوہر احمد رسول اللہ سفت

[مثنوی]

ان کے علاوہ بہت سی احادیث میں مروی ہے کہ بھیڑوں، اونٹوں، گایوں، ضب، سوسمار اور دیگر جانوروں نے باتیں کی ہیں، اور یہ ممکنات کے قبیلے سے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے لئے ہر چیز آسان ہے۔ پس ان مخلوقات کی تسبیح و تحمید پڑھنا نہ ناممکن ہے، اور نہ مشکل، جیسے قرآن مجید میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو منطق الطیر پرندوں کی بولی سکھائی، اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم کھانا کھاتے تھے، اور کھانے کی تسبیح سنتے تھے، اور فرمایا کہ مرغا جب اذان دیتا ہے تو یہ کہتا ہے: سُبُوحٌ قُدُوسٌ رَبُّ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالرُّوحِ. وغیرہ۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا﴾ اس میں مشرکین کے سوال کا جواب ہے۔ کہتے تھے کہ اگر ہم باطل پر ہیں تو ہمارے اوپر عذاب کیوں نہیں آتا؟ اللہ تعالیٰ شانہ حلیم بردبار ہے، سزا دینے میں جلدی نہیں فرماتا، وہ اپنی حکمت کے مطابق جب چاہے گا دنیا میں بھی سزا دے گا، اور آخرت کی سزا تو مشرکین کے لئے ہے ہی، وہ غفور بھی ہے، جو کوئی شرک سے توبہ کرے اس کی مغفرت فرمائے گا۔

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا ۝۴۵ وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓي اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا ۝۴۶ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ۝۴۷ اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ۝۴۸

ترجمہ: اور جب آپ قرآن پڑھتے ہیں تو ہم آپ کے اور ان کے درمیان ایک پردہ حائل کردیتے ہیں ۝۴۵ اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیتے ہیں، اس سے کہ وہ اس کو سمجھیں، اور ہم ان کے کانوں میں

ڈانٹ دیتے ہیں، اور جب آپ قرآن میں صرف اپنے ربّ کا ذکر کرتے ہیں تو وہ پشت پھیر کر نفرت کرتے ہوئے چل دیتے ہیں ﴿۴۶﴾ جس وقت وہ آپ کی طرف کان لگاتے ہیں تو ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کس غرض سے کان لگائے ہوئے ہیں، جس وقت یہ لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں ہمیں اس کا بھی خوب علم ہے، جبکہ ظالم لوگ یوں کہتے ہیں کہ تم لوگ بس ایک ایسے شخص کا اتباع کر رہے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے ﴿۴۷﴾ دیکھ لیجئے! آپ کے لئے کیسے کیسے القاب تجویز کرتے ہیں، سو یہ لوگ گمراہ ہو گئے، سو راہ یاب نہیں ہوں گے ﴿۴۸﴾

معارف و منازل

مشرکین مکہ جو توحید اور رسالت، نیز قرآن کریم اور آخرت کے منکر تھے، اس سلسلے میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں صراطِ مستقیم پر ڈالنے کی کوشش فرماتے، اور شرک و کفر کی اندھیریوں سے نکالنے کی جدوجہد فرماتے تو وہ نورِ نبوت اور نورِ قرآن کے پاس آنے کی بجائے اپنے شرک و کفر میں اتنے محو رہتے کہ گویا ان کے اور داعی حق کے درمیان کفر و عناد کا تاریک پردہ حائل ہوا ہے۔ اس آیت کریمہ میں فہم قرآن تک رسائی حاصل نہ کر سکنے کا بیان ہے۔ یعنی اس قرآن میں ایسی عجیب قوی تاثیر ہے کہ جس سے پتھر موم ہو جاتے ہیں، اور در و دیوار، شجر و حجر جھوم جاتے ہیں، مگر کافروں پر اثر نہیں ہوتا۔

یہ اس سبب سے ہے کہ وہ پردے کے پیچھے ہیں (اوٹ میں ہیں) سورج سے سارا جہاں روشن ہے، لیکن اگر کوئی شخص تہ خانہ میں تمام دروازے اور کھڑکیاں، روشندان بند کر کے بیٹھ جائے، بلکہ آنکھیں بھی بند کر لے تو اسے آفتاب عالمتاب کی روشنی سے کیا حاصل ہوگا؟ جب بنیتِ استفادہ و انتفاع یہ کچھ سننا نہیں چاہتے تو گویا سنتے ہی نہیں، اور چاہتے بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے جو حجاب اور پردے وغیرہ ڈالے یہ وہی ہیں جن کا وجود انہوں نے خود اپنے لئے بھی خوشی اور فخر سے ثابت کیا تھا: ﴿وَقَالُوا قُلُوبُنَا فِي أَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُونَا إِلَيْهِ وَفِي آذَانِنَا وَقْرٌ وَمِن بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ إِنَّنَا عَامِلُونَ﴾ [فصلت: ۵] (اور وہ کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تم ہمیں بلا رہے ہو اس کے لیے ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں، ہمارے کان بہرے ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ایک پردہ حائل ہے، لہٰذا تم اپنا کام کرتے رہو، ہم اپنا کام کر رہے ہیں)۔

آخرت پر ایمان نہ رکھنا، اور انجام سے بے فکر رہنا، خداوند تعالیٰ کے ذکر سے چڑنا، پیغمبروں علیہم السّلام کے

ساتھ تمسخر کرنا وہ چیزیں ہیں جو حجاب کنان اور وقر کی صورت میں اختیار کر لیتی ہیں، اور خالق چونکہ ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہے، اس لئے خلق کی نسبت اس کی طرف کی جاتی ہے، جب کسی کے قلب وحواس ناکارہ ہوں تو آپ انہیں ہرگز سمجھا نہیں سکتے۔

﴿وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِي الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا﴾ یعنی اللہ تعالیٰ واحد لاشریک کے ذکر سے چڑھتے، بدکتے اور پیٹھ پھیر کر بھاگتے ہیں۔ ہاں! اگر ان کے باطل معبودوں کا تذکرہ آئے تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ سورۂ زمر میں فرمایا: ﴿وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ﴾ [الزمر:۴۵] (اور جب کبھی تنہا اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل بیزار ہو جاتے ہیں، اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر کیا جاتا ہے تو یہ لوگ خوشی سے کھل اٹھتے ہیں)۔

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَسْتَمِعُوْنَ بِهٖٓ﴾ ہم خوب جانتے ہیں کہ جس غرض اور جس نیت سے یہ لوگ قرآن سنتے ہیں۔

﴿اِذْ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ﴾ جب وہ تیری طرف کان لگاتے ہیں۔ دراصل کبھی کسی وقت یہ لوگ قرآن سنتے بھی تھے، مگر ان کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ اس میں کوئی عیب یا نقص تلاش کرنا، اور پھر اسے عوام میں پھیلانا، اور لوگوں کو ایمان سے روکنا، اور بدظن کرنا۔ وہ اسی مقصد کے لئے میٹنگیں منعقد کرتے تھے، اور باہمی مشاورت سے کوئی لائحہ عمل طے کرتے تھے، جیسے فرمایا:

﴿وَاِذْ هُمْ نَجْوٰٓى﴾ کہ وہ آپ کے متعلق سرگوشی کرتے تھے، اور یہ فیصلہ صادر کرتے تھے:

﴿اِذْ يَقُوْلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا﴾ جب یہ ظالم مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ نہیں پیروی کرتے ہو تم مگر ایسے شخص کی جس پر جادو کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے اس کی عقل زائل ہوگئی ہے۔ اس لئے عجیب عجیب باتیں کرتا ہے، اور اتنے بڑے جہاں کے لئے ایک خدا کا عقیدہ رکھتا ہے۔

﴿اُنْظُرْ كَيْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا﴾ دیکھ لیجئے کہ ان بدقسمت گمراہوں نے تیرے لئے کیسی کیسی کہاوتیں (مثالیں) بنائیں، کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساحر کہا، کسی نے کاہن، کسی نے شاعر، اور کسی نے مجنون۔ پس یہ لوگ گمراہ ہوئے، اور عناد و دشمنی کی بناء پر گمراہ ہوئے، سو یہ ہرگز ہدایت والا راستہ

نہیں پائیں گے، اور گمراہی پر مریں گے۔

دشمنوں کی نظر سے پوشیدہ رہنے کا عمل:

حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ جب مشرکین کی آنکھوں سے پوشیدہ رہنا چاہتے تو قرآن کریم کی یہ تین آیتیں پڑھتے تھے، اس کے اثر سے کفار آپ ﷺ کو نہ دیکھ سکتے تھے، وہ تین آیتیں یہ ہیں:

(۱)...... ﴿اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا﴾ [الکهف:۵۷]

(۲)...... ﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ﴾ [النحل:۱۰۸]

(۳)...... ﴿اَفَرَاَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ [الجاثیة:۲۳]

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان تینوں آیات کے ساتھ سورۂ یٰسٓ کی ابتدائی آیات تا ﴿فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ﴾ تک بھی ملالی جائیں، جن کو آنحضرت ﷺ نے ہجرت کی رات گھر سے نکلتے وقت تلاوت فرمائی تھی، جبکہ مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کے مکان کا محاصرہ کیا تھا، آپ ﷺ یہ آیات پڑھ کر ان کے درمیان سے نکلے، بلکہ ان کے سروں پر مٹی ڈالتے ہوئے تشریف لے گئے، اس طرح ان کو کچھ بھی محسوس یا علم نہیں ہوا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص دشمن سے پوشیدہ رہنا چاہے، یا کوئی حاسد اس کے تعاقب میں ہو، اسے گرفتار کرنا چاہتا ہو، یا جان سے مارنا چاہتا ہو تو ان آیات کا وِرد جاری رکھے، ان شاء اللہ کامیاب ہوگا۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا واقعہ بھی اسی طرح بیان کیا ہے کہ وہ دشمنوں کی نگاہ سے پوشیدہ رہے، حالانکہ دشمن کے لوگ بالکل قریب تھے، انہوں نے آیات کا وِرد جاری رکھا، جس سے دشمن کے سپاہی اندھے ہوگئے۔

...... ❁ ...... ❁ ...... ❁ ......

وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا ﴿۴۹﴾ قُلْ كُوْنُوْا حِجَارَةً اَوْ حَدِيْدًا ﴿۵۰﴾ اَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِيْ صُدُوْرِكُمْ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ مَنْ يُّعِيْدُنَا ۭ قُلِ الَّذِيْ فَطَرَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ فَسَيُنْغِضُوْنَ اِلَيْكَ رُءُوْسَهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ۭ قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا ﴿۵۱﴾ يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۵۲﴾

ترجمہ: اور انہوں نے کہا: کیا جب ہم ہڈیاں اور چورا ہو جائیں گے، تو کیا ہم از سر نو نئی پیدائش کی صورت میں اٹھائے جائیں گے؟ ﴿۴۹﴾ آپ فرما دیجئے کہ تم پتھر ہو جاؤ، یا لوہا ﴿۵۰﴾ یا کوئی دوسری مخلوق، اس مخلوق میں سے جو بن جاؤ جو تمہارے سینوں میں بڑی معلوم ہو رہی ہو، اس پر وہ کہیں گے کہ وہ کون ہے جو ہمیں دوبارہ زندہ کرے گا؟ آپ فرما دیجئے وہی دوبارہ زندہ فرمائے گا جس نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا، اس پر وہ آپ کی طرف اپنے سروں کو ہلائیں گے، اور کہیں گے کہ یہ کب ہوگا؟ آپ فرما دیجئے کہ وہ عنقریب ہو جانے والا ہے ﴿۵۱﴾ جس دن تمہیں بلائے گا، سو تم اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کر لو گے، اور یوں خیال کرو گے کہ تم بہت ہی کم ٹھہرے ﴿۵۲﴾

معارف ومنازل

سورۂ یٰسٓ میں فرمایا: ﴿وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ﴾ [یٰس: ۷۸] ( )ور انسان (منکر قیامت) نے ہماری شان میں مثال بیان کردی، اور اپنی شان مخلوقیت کو بھول گیا، وہ کہنے لگا کہ ہڈیوں کو کون زندہ کرے گا؟ جبکہ وہ غبار کی طرح بوسیدہ ہو چکی ہوں گی)۔ اس کے جواب میں فرمایا: ﴿قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ﴾ [یٰس: ۷۹] (آپ فرما دیجئے کہ انہیں وہی زندہ فرمائے گا جس نے انہیں پہلی مرتبہ زندہ فرمایا تھا، اور وہ ہر طرح کا پیدا کرنا جانتا ہے)۔

اور سورۂ واقعہ میں فرمایا: ﴿وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ﴾ [الواقعة: ۴۸] (اور منکرین قیامت کہا کرتے تھے: کیا جب ہم مر گئے، اور ہو چکے مٹی اور ہڈیاں، کیا ہم پھر اٹھائے جائیں گے؟) اس کے جواب میں فرمایا: ﴿قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ لَمَجْمُوْعُوْنَ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ﴾ [الواقعة: ۵۰] (آپ فرما دیجئے کہ اگلے اور پچھلے سب اکٹھے ہونے والے ہیں ایک دن مقرر کے وقت پر)۔

اور سورۂ روم میں فرمایا: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [الروم: ۲۷] (اللہ وہ ذات ہے جو پہلی مرتبہ پیدا فرماتا ہے، پھر اس کو لوٹائے گا، اور یہ اس پر بہت آسان ہے)۔ یہ مرض اتنا عام اور کفار کے دل و دماغ میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ وہ کسی طرح اس بات پر یقین نہیں رکھتے تھے کہ اس موجودہ جہان کے بعد ایک اور جہان ہوگا، جس میں ساری خلقت کا اجتماع اور حساب و کتاب کا مرحلہ ہوگا۔ وہ واضح طور پر کائنات کا خالق

خدا تعالیٰ شانہ کو مانتے تھے، مگر اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے کہ خالق عزّ وجلّ ہمیں ریزہ ریزہ، اور بوسیدہ ہونے کے بعد دوبارہ زندہ فرمائیں گے۔ وہ یہی کہا کرتے تھے کہ بس زندگی ابھی کی ہے، مرنے کے بعد دوبارہ کوئی زندگی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کی تردید اس مقام پر ایک خاص انداز میں فرمائی، ارشاد ہے:

﴿قُلْ كُونُوا حِجَارَةً أَوْ حَدِيدًا ۝ أَوْ خَلْقًا مِّمَّا يَكْبُرُ فِي صُدُورِكُمْ﴾ کہ تم پتھر ہو جاؤ، یا لوہا بن جاؤ، یا کوئی ایسی چیز بن جاؤ جس میں تمہارے نزدیک زندگی آجانا بہت ہی بعید اور مشکل ہو، تم کچھ بھی بن جاؤ، موت کے بعد ضرور اٹھائے جاؤ گے، اور یہ خوب سوچو کہ ہڈیوں میں پہلے تو زندگی خوب نمایاں تھی، اب دوبارہ اس کی زندگی کونسی مشکل ہے؟ اور لوہے پتھروں میں تو کبھی زندگی نہیں رہی، اور حیات کا ان میں نام ونشان نہیں رہا، اور وہ حیات کے قابل بھی کبھی نہیں رہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان میں فوراً زندگی آسکتی ہے، کیونکہ وہ ﴿يُحْيِي وَيُمِيتُ﴾ کی صفت کا مالک ہے، اور اسے ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

اتنی بڑی کائنات کو بغیر کسی مادہ اور نقشہ کے ایک حکم کے ساتھ پیدا کرسکتا ہے، تمہارے پانچ چھ فٹ بدن کو سابق مادہ اور نقشہ پر پیدا کرنا کوئی مشکل نہیں۔ اسی کو فرمایا: ﴿وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ﴾ [الروم:۲۷] (اور یہ دوبارہ پیدا کرنا اس پر بہت آسان ہے)۔ اور جب وہ کہتے ہیں:

﴿فَسَيَقُولُونَ مَن يُعِيدُنَا﴾ اور وہ کون ہے جو ہمیں دوبارہ پیدا کرے گا؟

﴿قُلِ الَّذِي فَطَرَكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ آپ جواب دیجئے کہ وہی تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا جس نے تمہیں پہلی بار پیدا فرمایا۔ اس پر:

﴿فَسَيُنْغِضُونَ إِلَيْكَ رُءُوسَهُمْ﴾ وہ آپ کی طرف اپنے سروں کو ہلائیں گے، انکار کرتے ہوئے، استہزاء کے طور پر، اور کہیں گے کہ اچھا، ذرا یہ بتاؤ، وہ آپ والی قیامت کب آئے گی؟ مطلب یہ ہے کہ وہ تکذیب و استہزاء کرتے ہوئے کہیں گے، نہ بطور استفسار و سمجھنے، جیسے دوسرے مقام پر ہے: ﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الملک:۲۵] (اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہے؟ اور تم سچے ہو)۔ سورۂ سبا میں اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا: ﴿قُل لَّكُم مِّيعَادُ يَوْمٍ لَّا تَسْتَأْخِرُونَ عَنْهُ سَاعَةً وَلَا تَسْتَقْدِمُونَ﴾ [سبأ:۳۰] (آپ فرمائیے کہ تمہارے لئے خاص دن کا وعدہ ہے کہ اس سے نہ ایک ساعت پیچھے ہٹ سکتے ہو، نہ آگے بڑھ سکتے

ہو۔) یعنی قیامت اپنے وقت پر آئے گی، اس میں کسی تقدیم وتاخیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی نہ یہ کہے کہ جب وہ ہمارے مطالبہ پر نہیں آئی تو آئندہ بھی نہیں آئے گی۔

﴿قُلْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَرِيْبًا﴾ جب اس کا آنا یقینی ہے تو قریب ہی سمجھو۔

﴿يَوْمَ يَدْعُوْكُمْ فَتَسْتَجِيْبُوْنَ بِحَمْدِهٖ﴾ قیامت کا وقوع اس دن ہوگا جس دن اللہ تعالیٰ تمہیں بلائے گا، اس روز اس کی حمد وثناء کرتے ہوئے اس کے حکم کی تعمیل کروگے۔ یعنی زندہ ہوکر میدانِ حشر میں حاضر ہوجاؤگے۔ وہاں اس کی قدرتِ کاملہ اور اس کی عظمت وتوحید کا اقرار کروگے، اور اس کی حمد وثناء بھی بیان کروگے۔

صاحب روح المعانی نے عبد بن حمید سے نقل کیا ہے کہ جب قبروں سے نکلیں گے تو سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ پڑھتے ہوئے حاضر ہوجائیں گے، اور کافروں کے منہ سے بھی یہی کلمات نکلیں گے، مگر اس وقت ان کے پڑھنے سے انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

بعض علماء تفسیر نے لکھا ہے کہ آیت میں خطاب مؤمنوں کو ہے، قبروں سے اٹھتے وقت مؤمن اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء کہتے ہوئے اٹھیں گے، اور کافر حمد نہیں کریں گے، وہ قبروں سے اٹھتے وقت ہائے ہائے کہیں گے، اور کہیں گے: ﴿يٰوَيْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا ۜ هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ [یس: ۵۲] (ہائے ہماری ہلاکت! کس نے ہمیں اٹھایا ہمارے مرقد سے؟ (جواب ملے گا کہ:) یہ وہی چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا، اور پیغمبروں نے سچی بات کہی تھی)۔

دونوں باتوں میں تطبیق ہوسکتی ہے کہ شروع میں کافر بھی حمد کرتے ہوں گے، پھر دوسرے مرحلے میں ہائے ہائے اور ویل کہنا شروع کریں گے، یا پہلے ویل کہیں گے، پھر حمد کریں گے۔ واللہ اعلم

﴿وَتَظُنُّوْنَ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ اور یوں خیال کروگے کہ تم بہت ہی کم دن ٹھہرے ہو۔ یعنی تم یہ خیال کروگے کہ قبر اور دنیا میں زیادہ دن نہیں رہے۔ قیامت کا دن جو ہولناک ہوگا وہ سابق زندگی اور اس کی عیش وعشرت سب کو بھلادے گا، وہ سابق زندگی کو ایک مختصر وقفہ تصور کریں گے۔ سورۂ احقاف میں فرمایا: ﴿لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ﴾ [الأحقاف: ۳۵] (وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر ایک گھڑی)، اور سورۃ النازعات میں فرمایا: ﴿لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰىهَا﴾ [النازعات: ۴۶] (وہ دنیا میں نہیں ٹھہرے مگر ایک شام یا ایک صبح)۔ دنیا میں ایک دن کا تھوڑا حصہ ٹھہرے، پچھلے پہر، یا پہلے پہر کا ایک حصہ ٹھہرے۔ وہ ابدی اور دائمی ہونے والے عذاب کے مقابلہ میں دنیوی

زندگی کو ایک گھڑی سمجھیں گے۔

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ
كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ﴿۵۳﴾ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ
يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا ﴿۵۴﴾ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ؕ وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۵۵﴾

ترجمہ: اور آپ میرے بندوں سے فرما دیجئے کہ وہ ایسی بات کہیں جو بہتر ہو، بلا شبہ شیطان ان کے درمیان فساد ڈلواتا ہے، واقعی شیطان انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے ﴿۵۳﴾ تمہارا ربّ تمہیں خوب جانتا ہے، اگر وہ چاہے تو تم پر رحم فرمائے، یا اگر چاہے تو تمہیں عذاب دے، اور ہم نے آپ کو ان پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا ﴿۵۴﴾ اور آپ کا ربّ انہیں خوب جانتا ہے جو آسمانوں میں ہیں، اور زمین میں ہیں، اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی، اور ہم نے داؤد کو زبور عنایت کی ﴿۵۵﴾

معارف ومسائل

امام کلبی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ جب مشرکون نے مسلمانوں کو زیادہ دکھ پہنچانے شروع کئے، تو مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی شکایت کی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ﴾ آپ میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ وہی بات کہیں جو سب سے اچھی ہو۔ اس اچھی اور بہتری کے عموم میں نرمی سے بات کرنا، اور خیر خواہی اختیار کرنا، اور حکمت وموعظت کی وہ سب صورتیں داخل ہیں جن کے ذریعہ لوگ متاثر ہوسکیں، خواہ مسلمانوں کا کفار کے ساتھ ہم کلامی ہو، یا آپس میں ہم کلامی اور گفت وشنید ہو، کامیابی اسی میں ہے کہ سنجیدگی اور اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ ہو۔ کسی قسم کی درشتی، بداخلاقی وبدکلامی کا مظاہرہ نہ ہو، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ﴾ [النحل: ۱۲۵] (اپنے ربّ کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت کے ساتھ اور خوش اسلوبی سے نصیحت کر کے دعوت دو، اور ان

سے بحث بھی ایسے طریقے سے کرو جو بہترین ہو۔ یقیناً تمہارا پروردگار ان لوگوں کو بھی خوب جانتا ہے جو اس کے راستے سے بھٹک گئے ہیں، اور ان سے بھی خوب واقف ہے جو راہ راست پر قائم ہیں)۔

تمہارا مقصد احقاقِ حق اور تعلیم و تفہیم ہونا چاہئے، خشونت وتندی اور بد مزاجی سے بجائے افہام و تفہیم کے مزید انتشار و اختلاف کا خطرہ ہوگا۔

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَنْزَغُ بَیْنَهُمْ﴾ شیطان تو ان کے درمیان جھگڑا ڈالتا ہے، فساد پیدا کرتا ہے، وہ تو اسی فساد کے لئے جی رہا ہے۔ پس یہ تمہارا کام ہے کہ شیطان کو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہونے دو۔ بلند اخلاق اور صبر و استقامت کا مظاہرہ کرو، جو کہ تمہارے شایان شان ہے۔

﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِیْنًا﴾ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، اسی نے تو تمہارے باپ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالا، اور روزِ ازل حق سبحانہ وتعالیٰ کے حضور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ قسم کھا کر یہ کہا کہ: ﴿وَلَاُغْوِیَنَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ﴾ [الحجر: ۳۹] (میں اولاد آدم کو گمراہ کر کے رہوں گا)۔ یہ شیطان ہمیشہ تاک میں رہتا ہے کہ میں لوگوں کو کس طرح گمراہ کرلوں۔ کافروں کو تو بہکا کر جہنم لے جاتا ہے، اور مسلمانوں میں شر و فساد کی آگ بھڑکا کر انہیں مفلوج کر کے تباہ کرتا ہے۔ لہٰذا اُسے کسی شرارت کا موقع ہی نہ دو۔

﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ﴾ تمہارا پروردگار تمہاری حالت کو خوب جانتا ہے، اگر چاہے تم پر رحم فرمائے، یا اگر چاہے تمہیں عذاب دے۔ اس کا رحم یہ ہے کہ اپنے بندوں کو ایمان، اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ کی توفیق اور ہمت عطاء فرمائے، جبکہ عذاب کی صورت میں انہیں ہر خیر سے محروم ہی کردے، اور ان کے قلوب وحواس پر مہر لگوائے، اور ان پر شیطان کو مسلط فرمادے۔ ﴿بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِكُفْرِهِمْ﴾ [النساء: ۱۵۵] (بلکہ اللہ ان کے دلوں پر مہر لگادی ہے، ان کے کفر کی وجہ سے)۔ یا ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [البقرۃ: ۷] (اللہ نے ان دلوں پر مہر لگادی ہے)۔ یا ﴿نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى﴾ [النساء: ۱۱۵] (اس کو ہم اسی راہ کے حوالے کریں گے جو اس نے خود اپنائی ہے)۔ یا ﴿بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ [المطففین: ۱۴] (بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھ گیا ہے) وغیرہ۔ پھر فرمایا:

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ وَكِیْلًا﴾ ہم نے آپ کو ان کفار و مشرکین پر ذمہ دار بنا کر نہیں بھیجا کہ آپ ضرور انہیں راہ راست پر لے آئیں۔ ہدایت دینا آپ کا کام نہیں، آپ کا کام صرف راستہ بتانا ہے، ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے کسی کی ہدایت کے لئے پیغمبر کو ذمہ دار نہیں

بنایا تو اُمت کے لوگوں کو بھی زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہئے کہ فلاں جماعت، یا گروہ، یا افراد ہدایت کو قبول کیوں نہیں کرتے۔ اسی لئے ارشاد فرمایا: ﴿اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ [القصص:٥٦] (آپ ہدایت نہیں دے سکتے جس کو آپ چاہے، لیکن اللہ ہدایت دیتا ہے جسے چاہے)۔ پھر فرمایا: ﴿وَلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ﴾ [البقرۃ:١١٩] (آپ سے جہنم والوں کے بارے میں نہیں پوچھا جائے گا) کہ وہ کیوں دوزخ میں گئے؟

﴿وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِمَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ اور آپ کا ربّ ان سب کو خوب جانتا ہے جو آسمان میں ہیں، اور زمین میں ہیں، علویات وسفلیات کا خالق و مالک ہے، وہ تمام انسانوں اور جنات کا پیدا کرنے والا ہے، وہ ہر آدمی کی استعداد و قابلیت اور لیاقت و ہنر سے خوب واقف ہے، وہ جو کچھ فیصلہ کرتا ہے اپنے علم محیط اور حکمت بالغہ کے موافق کرتا ہے۔ اس کے انتخاب میں رائے زنی اور مداخلت جہالت اور حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ اس کے فیصلوں کو تسلیم نہیں کرتے وہ پرلے درجے کے کودن ناعاقبت اندیش اور جہنمی ہیں۔

مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں مشرکین کی اس بات کا جواب ہے جو وہ اعتراض کرتے تھے کہ ابوطالب کا یتیم نبی کیسے ہوسکتا ہے؟ اور بلال وصہیب جیسے محتاج اللہ تعالیٰ کے ولی اور جنتی کیسے ہو سکتے ہیں؟ اور مکہ کے بڑے بڑے سردار وشرفاء دوزخی کیسے بن سکتے ہیں؟ نبوت دراصل ہمارے بڑے شہر مکہ اور طائف کے سرمایہ دار رؤساء کا حق ہے، اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ نبوت سے محروم ہوں؟ اور نبوت ایسے شخص کو ملے جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو؟ آیت کریمہ میں ایسے بے سروپا، بیہودہ خیالات کا جواب ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ آسمانوں میں، اور زمین میں سب ہماری مخلوق ہے، ان سب کے احوال ظاہرہ و باطنہ سب ہمیں معلوم ہیں، پھر ایک مخلوق کی استعداد و قابلیت بھی ہمارا دیا ہوا عطیہ ہے، اور ہم نے جن جن مخلوقات میں جو جو صلاحیتیں رکھی ہیں وہ سب ہمیں معلوم ہیں۔ نبوت کا منصب عالی بہت ہی اونچا ہے، یہاں تک کہ اس کے برابر کی کوئی چیز کائنات میں نہیں، اس کا انتخاب صرف اور صرف ہم ہی کرتے ہیں۔ دنیا کا مال ومتاع نبوت کے مقابلہ میں اتنا حقیر ہے کہ تمام دنیا کے مال ومتاع کی ایک درہم کی حیثیت نہیں۔

جب حقیر دنیا کی تقسیم تمہاری خواہش پر نہیں رکھی گئی، تو نبوت کی تجویز کیونکر تمہارے سپرد ہو؟ جس کے ابجد تک سے تم جاہل ہو۔ یہ منصب اتنا اونچا ہے کہ تم لوگ محض اس کے تصور کا بھی اہل نہیں ہو، پس اللہ تعالیٰ ہی اس کا

منتخاب کرنے والا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] (اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت رکھ دے)۔ وہ جسے چاہے نبوت سے سرفراز فرمائے، اور اس کی استعداد و قابلیت کو نبوت کے تحمل واٹھانے کا اہل بنادے۔

﴿وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيّٖنَ عَلٰى بَعْضٍ﴾ یعنی نبوت کی بخشش بھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، اور وہی نبوت کے لحاظ سے فضیلتوں کا تقسیم کنندہ بھی ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعض کی بعض پر فضیلت کا بیان تیسرے پارے کے شروع میں ذکر کر چکے ہیں، وہاں دیکھا جائے۔

﴿وَّاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا﴾ ہم نے داؤد کو زبور عطاء کی۔ صاحب معالم التنزیل نے لکھا ہے کہ زبور ایک سو پچاس سورتوں پر مشتمل تھی، جو دعاء اور اللہ تعالیٰ کی ثناء وتمجید پر مشتمل تھی، اس میں فرائض وحدود اور حلال وحرام کے احکام نہیں تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام انبیاء بنی اسرائیل میں سے تھے، اور بنی اسرائیل کے سارے انبیاء کرام علیہم السلام شریعت موسوی کے پابند تھے، حتی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جو بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر تھے انہوں نے بنی اسرائیل کو یوں خطاب فرمایا: ﴿وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ﴾ [آل عمران: ۵۰] (اور تصدیق کرتے ہوئے اس کتاب کی جو میرے سامنے ہے، یعنی تورات)۔

اس آیت کریمہ میں حضرت داؤد علیہ السلام اور زبور کی تخصیص کی وجہ یہی ہے جسے سورۃ انبیاء میں بیان فرمایا: ﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ﴾ [الأنبياء: ۱۰۵] (اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد یہ لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے)۔ اس سے مراد خیر الاُمم، اور آخر الاُمم امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہے، جس کی بشارت زبور شریف میں ہے۔

* * *

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ﴿۵۶﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ
وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ۭ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ﴿۵۷﴾ وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا
قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا ۭ كَانَ ذٰلِكَ فِي الْكِتٰبِ مَسْطُوْرًا ﴿۵۸﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ تم انہیں بلا لو جنہیں تم معبود خیال کرتے ہو، سو وہ تمہاری تکلیف کو دور کرنے کا اختیار نہیں رکھتے، اور نہ اس کے بدلنے کا ﴿۵۶﴾ یہ لوگ جنہیں مشرکین پکار رہے ہیں اپنے ربّ کی طرف ذریعہ تلاش کرر ہے ہیں کہ ان میں کون زیادہ مقرّب ہے، اور اس کی رحمت کی امید رکھتے ہیں، اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں، بلا شبہ آپ کے ربّ کا عذاب ایسا ہے کہ اس سے ڈرا جائے ﴿۵۷﴾ اور کوئی بستی ایسی نہیں ہے جسے ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کردیں، یا اسے سخت عذاب نہ دیں؛ یہ بات کتاب میں لکھی ہوئی ہے ﴿۵۸﴾

معارف ومنازل

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ﴾ میں بہت عموم ہے۔ دوسری آیت اس پر دلیل بھی ہے، اور اس کا بیان بھی۔ دنیا میں غیر اللہ کی عبادت کرنے والے مختلف قسم کے لوگ ہوتے ہیں، کچھ بتوں کی پوجا کرتے ہیں، کچھ فرشتوں کی، کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ کی، کچھ دوسرے پیغمبروں کی، کچھ جنات کی۔ آیت کریمہ کا عموم سب کو شامل ہے۔ اسی طرح آیت کریمہ اس بات کی بھی نشاندہی فرما رہی ہے کہ شرک محض غیر اللہ کی عبادت کا نام نہیں، بلکہ غیر اللہ سے مافوق الاسباب کسی چیز کا، مثلاً بیماری میں شفاء کی طلب، یا اولاد کی طلب، یا عزّت ومال کی طلب بھی شرک اور حرام ہے۔

فرمایا کہ تم جن کو اللہ تعالیٰ کی علاوہ معبود سمجھتے ہو، یا پریشانیوں اور مصیبتوں میں انہیں مشکل کشا اور حاجت روا سمجھ کر پکارتے ہو، وہ عاجز بندے اور بے اختیار مخلوق ہیں، وہ تمہاری کوئی تکلیف، دکھ، قحط سالی وغیرہ دُور نہیں کرسکتے، اور یہ بھی نہیں کرسکتے کہ تم سے مصیبت ہٹا کر کسی دوسرے پر ڈال دیں، یا آئی ہوئی مصیبت میں کمی کردیں، اور یہ بھی نہیں کرسکتے کہ ایک مصیبت ہٹا کر دوسری مصیبت پہنچائیں۔ جنات ہوں، یا فرشتے، یا انبیاء علیہم السلام ہوں۔ یا اولیاء، کوئی بھی دیوی ہو یا دیوتا ہو، انہیں میں سے کسی کو نہ اپنے لئے اور نہ کسی دوسرے کے لئے کسی نفع ونقصان، یا خیر و شر کا ذرہ برابر اختیار اور قدرت نہیں۔ یہ سارے اپنے ربّ کے محتاج ہیں، اور شب وروز تکوینی طور پر (یعنی بت) اور تشریعی طور پر (انبیاء علیہم السلام، فرشتے، جنات، اولیاء) اللہ تعالیٰ کے حضور میں سجدہ ریز ہیں، اور ہر لمحہ اس کی عبادت میں مشغول ہیں، اور اپنے تمام امور اور حاجات کے لئے اللہ تعالیٰ سے سوال کرنے والے ہیں، اور اس کے قرب ورضا کے حصول کا وسیلہ تلاش کرتے ہیں۔

جب وہ اپنے پروردگار کے حضور سوالی اور مانگنے والے ہیں تو تمہیں بھی اسی ذات پاک سے وہ سب کچھ مانگنا چاہئے جس سے وہ مانگا کرتے ہیں، اور جس ذات پاک سے وہ اُمید وخوف رکھتے ہیں تمہیں بھی اسی ذات پاک سے اُمید اور خوف رکھنا چاہئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ ایسے تھے جو جنات کی عبادت کرتے تھے، وہ جنات تو مسلمان ہو گئے، لیکن ان کی عبادت کرنے والے برابر ان ہی کی عبادت میں لگے رہے، اور اپنا دین باطل نہیں چھوڑا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ [بخاري]

﴿وَاِنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اِلَّا نَحۡنُ مُهۡلِكُوۡهَا قَبۡلَ يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ اَوۡ مُعَذِّبُوۡهَا﴾ اور (کفار کی) کوئی ایسی بستی نہیں جس کو ہم قیامت سے پہلے ہلاک نہ کریں (طبعی موت کے ساتھ) یا قیامت کے دن اس کو سخت عذاب نہ دیں۔ یعنی جو بستی کفر ومعصیت کرنے والی ہے اس کو یا تو قیامت سے پہلے ہلاک یا تباہ کر دیں گے، یا سخت عذاب دیں گے۔

امام مقاتل رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے کہا: ہلاک کرنے سے مراد ہے مارڈالنا، موت کو مسلط کر دینا، یعنی بستی والے اگر مؤمن ہوں تو ہم ان پر طبعی موت مسلط کر دیں گے، اور اگر کافر ہوں تو سخت عذاب دیں گے، طرح طرح کے عذابوں میں مبتلا کر دیں گے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو تو اللہ تعالیٰ اس بستی کو تباہ کرنے کا حکم دیدیتا ہے۔ [مظهري]

﴿كَانَ ذٰلِكَ فِى الۡكِتٰبِ مَسۡطُوۡرًا﴾ لوح محفوظ میں اسی طرح لکھا ہوا ہے۔ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہر شہر، اور ہر بستی کے لوگ ایک ایک بزرگ کی پرستش کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم اس کی پناہ میں ہیں، مگر عذاب اور موت آنے پر کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا۔

وَمَا مَنَعَنَاۤ اَنۡ نُّرۡسِلَ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّاۤ اَنۡ كَذَّبَ بِهَا الۡاَوَّلُوۡنَ ؕ وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا ؕ وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا ۝۵۹

ترجمہ: اور آیات بھیجنے سے ہمیں صرف یہی بات مانع ہے کہ پہلے لوگ اس کی تکذیب کر چکے ہیں، اور ہم نے قوم ثمود کو اونٹنی دی تھی، جو بصیرت کا ذریعہ تھی، سوانہوں نے اس کے ساتھ ظلم کا معاملہ کیا، اور ہم آیات کو صرف ڈرانے کے لئے بھیجا کرتے ہیں ۝۵۹

معارف ومنازل

معالم التنزیل اور روح المعانی نے بحوالہ حاکم واحمد ونسائی وطبرانی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ابن مردویہ و طبرانی نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ اہل مکہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ آپ صفا پہاڑ کو سونا بنا دیجئے، اور مکہ میں جو پہاڑ ہیں ان کو ہٹا دیجئے تا کہ یہاں ہمیں کھیتی کرنے کا موقع مل جائے (اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ کی رسالت پر ہم ایمان لے آئیں گے) اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر وحی بھیجی کہ آپ چاہیں تو میں ان کو ڈھیل دیدوں، اور اگر چاہیں تو ان کا سوال پورا کردوں، پھر اگر ایمان نہ لائے تو انہیں ہلاک کردوں گا، جیسے ان سے پہلے ایمان نہ لانے پر معجزات خاصہ طلب کرنے والوں کو (جیسے قوم ثمود) ہلاک کر دیا گیا ہے۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرض کیا: اے اللہ تعالیٰ! میں چاہتا ہوں کہ آپ انہیں ڈھیل دے دیں (ممکن ہے ان میں سے کچھ لوگ ایمان لائیں، اور ہلاکت سے بچ جائیں) اس پر آیت کریمہ بالا کا نزول ہوا، اور حق تعالیٰ سجانہ نے فرمایا کہ یہ لوگ جو فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں ایسے معجزات ظاہر کرنے پر قدرت ہے، لیکن ظاہر اس لئے نہیں کرتے کہ جیسے پہلی اُمتوں نے فرمائشی معجزے طلب کئے، پھر وہ ظہور میں آگئے، تو اس پر بھی ایمان نہ لائے تو ہلاک کردیئے گئے، اگر اس اُمت کے سامنے بھی فرمائشی معجزات ظاہر کردیئے جائیں پھر ایمان نہ لائیں، تو تکوینی قانون کے مطابق یہ بھی ہلاک کردیئے جائیں گے، جیسا کہ گزشتہ قوموں کا حشر ہوا۔ اسی خاطر بطور مثال قوم ثمود کی اونٹنی کا تذکرہ فرمایا کہ:

﴿وَاٰتَيۡنَا ثَمُوۡدَ النَّاقَةَ مُبۡصِرَةً فَظَلَمُوۡا بِهَا﴾ یہ اونٹنی بصیرت افروز چیز تھی، فرمائشی معجزہ کے طور پر ظاہر ہوئی، پینتیس گز اس کی لمبائی تھی، چاہئے تھا کہ اس کو دیکھ کر وہ لوگ ایمان لے آتے، مگر وہ مزید گمراہ و بے راہ ہوگئے۔ اس پوری بڑی قوم میں صرف چھ ہزار لوگ ایمان لائے، اور باقی اپنے کفر پر جمے رہے، اور انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام کے قتل کا منصوبہ بنایا، جس میں وہ ناکام ہوئے، پھر اونٹنی کو قتل کر ڈالا، جس پر انہیں عذاب نے مکمل ہلاک کر دیا۔ سورۂ ہود میں تفصیل گزر چکی ہے۔

﴿وَمَا نُرۡسِلُ بِالۡاٰيٰتِ اِلَّا تَخۡوِيۡفًا﴾ فرمائشی معجزات کا مقصد ڈرانا اور تخویف ہوتا ہے کہ لوگ انہیں دیکھ کر تکذیب اور ہلاکت کے ڈر سے ایمان لائیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے فرمائشی نشانی دکھلانا خداوند تعالیٰ کو کچھ دشوار نہ تھا، لیکن پہلے لوگوں کو ان کی فرمائش کے مطابق نشان دکھلائے گئے، وہ تب بھی نہ مانے، بلکہ سرکشی میں مزید ترقی

کر گئے، آخر نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہلاک کئے گئے۔ اب اہل مکہ کی سب فرمائشیں اگر پوری کی جائیں، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے، بلکہ ان کے احوال سے بھی ظاہر ہے کہ وہ پھر بھی ماننے والے نہیں (اس سے پہلے انہوں نے تمام معجزات کا انکار کیا ہوا ہے) تو قانونِ الٰہی کے موافق ان کا استیصال و بالکلیہ ہلاکت کا فیصلہ ہونا چاہئے، مگر یہ چیز اس آخری امت کے حق خلاف میں مصلحت وحکمت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارادہ اس آخری امت کی نسبت یہ نہیں کہ گزشتہ اقوام وامتوں کی طرح عمومی عذاب بھیج کر اسے بالکلیہ ہلاک کیا جائے۔ پہلی اُمتوں کو فرمائشی نشانی دکھلانا، اور پھر نہ ماننے پر بالکلیہ انہیں تباہ کرنا جائز اور مصلحت و حکمت کے موافق رکھا گیا، چنانچہ وہ تباہ ہو گئے، جبکہ اس اُمت میں ایسا کرنا خلافِ مصلحت ہے کہ انہیں فرمائشی معجزات دکھلا کر نہ ماننے پر کلی ہلاکت اور تباہی کا فیصلہ ہو۔

ہاں! اتنا ضرور ہے کہ غیر فرمائشی معجزات انہیں دکھلا کر ایمان پر آمادہ کیا جائے، یا بصورت نہ ماننے کے جزوی مؤاخذہ پر اکتفاء کیا جائے، جیسا کہ شق القمر کے معجزہ کو تسلیم نہ کرنے پر جزوی مؤاخذہ ہوا کہ اہل مکہ متواتر سات سال قحط میں مبتلا ہوئے، وغیرہ۔

فائدہ:

بہت سے لوگ حتی کہ اہل علم بھی شبہ کرتے ہیں کہ اقوامِ سابقہ ایک ایک گناہ میں تباہ ہو چکی ہیں، جبکہ موجودہ اقوام عالم ایک کفر نہیں ہزاروں جرائم اور خطرناک بھیانک جرائم میں ملوث ہیں، ان کے ایک دن کے جرائم گزشتہ اقوام کے ہزاروں سالوں کے جرائم سے کہیں زیادہ ہیں، مگر ان پر کوئی عذاب آسمانی نازل کیوں نہیں ہوتا؟

اس کا جواب یہی ہے کہ اس آخری اُمت کا (اُمتِ دعوت اور اُمتِ اجابت دونوں مراد ہیں) معاملہ استدراج اور ڈھیل پر رکھا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صفت "رحمۃ للعٰلمین" ہر قسم کے آسمانی استیصالی عذاب کے آنے سے مانع ہے، اور بمنزلہ ایک ڈھال اور امن کے ہے، اسی کا نتیجہ روز قیامت شفاعت کبریٰ کی صورت میں ظاہر ہوگا، جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیامت کے ہولناک دن کے لئے ذخیرہ رکھا۔ اگر آپ اقوامِ سابقہ کی ہلاکت کے اسباب کو تلاش کریں گے تو سب سے بڑا سبب اس تباہ شدہ قوم کے پیغمبر کی بددعاء کو پائیں گے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ پیغمبر کی بددعاء کے بغیر قوم کی تباہی ہوگئی ہو۔ وَبِاللّٰہِ التَّوفِیْقُ، وَھُوَ الْمُلْھِمُ لِلصَّوابِ، لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ھُو.

وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ ۭ وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ ۭ وَنُخَوِّفُهُمْ ۙ فَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا طُغْيَانًا كَبِيْرًا ۝۶۰

ترجمہ: اور جب ہم نے آپ سے کہا: بلاشبہ آپ کا ربّ سب لوگوں کو محیط ہے، اور ہم نے جو دکھلاوا آپ کو دکھلایا، اور وہ درخت جسے قرآن میں ملعون بتایا، یہ دونوں چیزیں صرف اس لئے تھیں کہ لوگوں کو آزمائش میں ڈالا جائے، اور ہم انہیں ڈراتے ہیں، یہ ڈرانا ان کی سرکشی میں اضافہ ہی کرتا ہے ۝۶۰

معارف ومنازل

جب مشرکین مکہ نے آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کیا کہ آپ کوہِ صفات کو سونا بنادیں، اور سرزمین مکہ سے پہاڑوں کو ہٹادیں، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ پریشان ہوئے، اس آیت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تسلی ہے۔

﴿وَاِذْ قُلْنَا لَكَ اِنَّ رَبَّكَ اَحَاطَ بِالنَّاسِ﴾ اور جب کہ ہم نے کہہ دیا کہ بیشک آپ کے پروردگار نے لوگوں کا احاطہ کر رکھا ہے، یعنی اس کا علم، اور اس کی قدرت کاملہ سب پر محیط ہے، اس کو ذرہ ذرہ کا علم اور ہر چیز پر قدرت حاصل ہے، وہ جس طرح چاہے مکذّبین کو سزا دے، یہ اس کا اختیار ہے، آپ تنگدل اور پریشان نہ ہوں۔ وہ لوگ ایک ابتلا وآزمائش سے گزر رہے ہیں، جس کا انجام عنقریب ان کو معلوم ہوجائے گا، جیسا کہ ارشاد ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِيْٓ اَرَيْنٰكَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ﴾ اور نہیں بنایا ہم نے آپ کے دکھلانے کو جو آپ کو دکھلایا گیا تھا مگر لوگوں کے لئے آزمائش۔ دکھلاوے سے مراد واقعہ معراج ہے، اور وہ تمام دیگر مشاہدات ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مختصر وقت میں معجزانہ طور پر دکھائے گئے تھے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى﴾ [النجم:۱۸] (یقیناً انہوں نے اپنے ربّ کی بڑی نشانیوں کو دیکھا)۔ یہ واقعہ مشرکین مکہ اور چند بدقسمت نَو مسلم لوگوں کے لئے آزمائش کا سبب بن گیا، اہلِ ایمان سچوں نے اسے فوراً تسلیم کرلیا، جبکہ کچوں نے اس کی تکذیب کی۔

﴿رُءْيَا﴾ کا اطلاق خواب اور بیداری دونوں پر یکساں ہوتا ہے، لیکن یہاں مراد اس سے وہ بیداری ہے جس کے متعلق ﴿مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى﴾ [النجم:۱۷] (نہ آنکھ چکرائی، اور نہ حد سے آگے بڑھی) فرمایا گیا۔ یعنی بیداری کے عالم میں آنکھوں سے دیکھنا مراد ہے۔ تفسیر مظہری میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سعید بن جبیر، حسن بصری، مسروق، قتادہ، مجاہد، عکرمہ، ابن جریج اور اکثر علماء کرام رحمۃ اللہ علیہم کا قول یہی ہے کہ: رُؤْيَا عَيْنٍ أُرِيهَا رَسُولَ اللهِ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فِي الْمِعْرَاجِ وَالْإِسْرَاءِ. یعنی جو واقعہ اللہ تعالیٰ نے معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دکھایا وہ آنکھوں کا دکھلاوا تھا، نہ کہ خواب کا۔ وَعَلَيْهِ جُمْهُوْرُ الْأُمَّةِ۔

تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ملکوت السمٰوٰت، جنت، دوزخ، سدرۃ المنتہیٰ اور انبیاء علیہم السلام سے ملاقات وغیرہ عالم بیداری میں، ظاہری آنکھوں سے دکھادیئے تھے۔ اس پر سب سے بڑا قرینہ یہ ہے کہ کسی چیز کا خواب میں دیکھنا تو کوئی حقیقت نہیں رکھتا، کیونکہ انسان خواب میں بہت کچھ دیکھنے کے باوجود اس پر تعجب نہیں کرتا۔ اگر مشرکین اسے خواب کا واقعہ سمجھتے تو آسمان سر پر اٹھا کر ہرگز اتنا واویلا نہ کرتے، ان کو تو مخالفت کا موقع ہی اس لئے ملا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام واقعات بالمشافہ آنکھوں سے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا، کیونکہ جمہور علماء محدثین اور مفسرین کرامؒ اس بات کے قائل ہیں کہ واقعہ معراج حالت بیداری میں پیش آیا۔ احادیث میں پینتالیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے یہ واقعہ منقول ہے، اور اس واقعہ کو مختلف متفرق اوقات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بکثرت ذکر فرمایا ہے۔

غرضیکہ اس واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے آزمائش کا سبب بنادیا کہ کون اس کی تصدیق کرتا ہے، اور کون اس کا انکار کرتا ہے۔ دوئم سبب آزمائش یہ ہے:

﴿وَالشَّجَرَةَ الْمَلْعُوْنَةَ فِي الْقُرْاٰنِ﴾ اس درخت کو بھی ذریعہ آزمائش بنادیا، جس پر قرآن میں لعنت کی گئی ہے، یا جس کے کھانے والوں پر قرآن نے لعنت کی ہے۔ یہ زقوم تھوہڑ کا درخت ہے۔ سورۂ واقعہ میں فرمایا: ﴿ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ لَاٰكِلُوْنَ مِنْ شَجَرٍ مِّنْ زَقُّوْمٍ﴾ [الواقعة:۵۲] (پھر اے جھٹلانے والے گمراہو، تم لوگوں کو ایک ایسے درخت میں سے کھانا پڑے گا جس کا نام زقوم ہے)۔ اسی طرح سورۂ صافات اور سورۂ دخان میں بھی اس شجرۂ خبیث کا تذکرہ ہے، اور یہ درخت نہایت تلخ، بدبودار اور مہلک تباہ کن ہے۔ ﴿طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ﴾ [الصافات:۶۵] (اس کا خوشہ شیاطین کے سر جیسا ہوگا)۔ شیاطین سانپوں کو کہتے ہیں۔

اس پر مشرکین مکہ ابوجہل اور اس کی پارٹی نے اعتراض کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایک طرف دوزخ کی آگ ہو، اور دوسری طرف اس میں درخت سبز بھی؟ یہ صاف واضح اور کھلم کھلا جھوٹ ہے۔ العیاذ باللہ

پھر وہ کہتے تھے کہ زقوم کھجور اور مکھن کا مرکب نام ہے، جسے ہم دنیا میں بڑے شوق سے کھاتے ہیں، جس سے کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرتے۔ یہ سب تمسخر اور مذاق کے طور پر کہتے رہتے تھے۔

☆☆☆

جہنم کی آگ، اور اس میں درخت اور سانپ بچھو:

ربّ العزّت خالق جہاں نے اس کائنات کی تخلیق و پیدائش میں وہ وہ متضاد کرشموں کی تخلیق کی ہے، جنہیں دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ آگ میں کیڑوں کی پیدائش اور پرورش سب کے سامنے ہیں۔ یورپ اور چینا میں عجیب وغریب نسل کے سبز درخت ہیں، بجائے پانی کے ان کی پرورش آگ سے ہوتی ہے۔ چینی ترکستان میں سمندل نام کا جانور ہے جس کی کھال کو کپڑے اور زیادہ تر دسترخوان میں استعمال کرتے ہیں، میلا ہونے پر بجائے پانی سے دھونے کے اس کو تنور میں ڈالتے ہیں، ساری میل کچیل جل جائے گی، اور دسترخوان صاف ستھرا چمکدار ہوگا۔

شتر مرغ ہر جگہ دستیاب موجود ہے، اور قدرت کا ایک اعجوبہ ہے۔ آپ اسے لوہا سرخ کر کے کھلاؤ، آگے کا گولہ اس سے قریب کرو، پس نظارہ کرو، وہ اسے گاجر مولی کی طرح کھائے گا، اور خوش ہوگا، لہٰذا اگر جہنم کی آگ میں درخت ہو، یا سانپ بچھو ہوں، جن کی فطرت اور پیدائش میں آگ والی طبیعت ہو تو کیا مشکل ہے؟ ربّ العزّت جلّ جلالہ ہر چیز اور ہر صفت اور متضاد طبائع پر چیزوں کی تخلیق پر قادر ہے۔ کائنات کا ہر ذرہ اس کی قدرت کاملہ پر گواہ ہے۔

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا ۚ﴿۶۱﴾ قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ ۫ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ﴿۶۳﴾

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کرلیا، مگر ابلیس نے نہیں کیا، وہ کہنے لگا: کیا میں اسے سجدہ کروں جسے آپ نے کیچڑ سے بنایا ہے؟ ﴿۶۱﴾ اس نے کہا کہ آپ ہی بتائیے! یہ جسے آپ نے مجھ پر فوقیت دی ہے، اگر آپ نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیدی تو میں تھوڑے سے افراد کے علاوہ اس کی پوری ذریت کو اپنے قابو میں کرلوں گا ﴿۶۲﴾ فرمایا: جا، ان میں سے جو کوئی شخص تیرے پیچھے چلے گا تو تم سب کی جزاء جہنم ہے، جو پوری سزا ہوگی ﴿۶۳﴾

معارف ومنازل

گمراہ لوگوں کی گمراہی کا اصل سبب اتباعِ نفس وشیطان ہے، اس لئے اس آیت میں اسی سبب کا بیان

ہو رہا ہے۔

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ﴾ یاد رکھو، کہ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کے لئے سجدہ کریں۔ یہ سجدۂ تعظیمی کا امر ہو رہا ہے، جو کہ اب منسوخ اور حرام ہے۔

﴿فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ﴾ تو ان سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے، وہ حکم عدولی اور تکبر کرتے ہوئے بولا:

﴿قَالَ ءَاَسْجُدُ لِمَنْ خَلَقْتَ طِيْنًا﴾ کیا میں ایسے آدمی کے حضور سجدہ کروں جسے آپ نے مٹی سے پیدا کیا؟ جبکہ میری پیدائش آگ سے ہے۔ تو بھلا آگ والی مخلوق جو کہ مٹی والی مخلوق سے افضل ہے، کیسے اس کا سجدہ کرے؟ پھر مزید گستاخی کر کے کہا:

﴿قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِيْ كَرَّمْتَ عَلَيَّ﴾ مجھے بتلا دیں، مجھے خبر دیں کہ یہ کیا ہے جسے تو نے مجھ پر فوقیت دی ہے؟

﴿لَىِٕنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ اگر تو نے مجھے قیامت کے دن تک مہلت دیدی تو میں اس کی اولاد کو پوری طرح قابو میں کرلوں گا، یعنی جس مقصد کے لئے تو نے انہیں پیدا کیا ہے، اس کے نزدیک تک نہیں آنے دوں گا، مگر بہت تھوڑے لوگ، جو تیرے فرمانبردار ہوں گے۔

اِحْتِنَاك کے معنی ہیں کسی چیز کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ کر فنا کرنا۔ دراصل یہ ابلیس کی حکم عدولی اور چیلنج ہے، جو کہ ازل میں پوری ڈھٹائی کے ساتھ قسم کھاتے ہوئے ظاہر کیا۔ سورۂ اعراف میں شیطان کا بیان یہ منقول ہے: ﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الأعراف:۱٦] (یعنی چونکہ تو نے مجھے گمراہ ہی ٹھہرا دیا ہے تو اب میں اولادِ آدم کے راستے میں بیٹھوں گا، اور انہیں صراط مستقیم اختیار نہیں کرنے دوں گا)۔

﴿قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا﴾ اللہ تعالیٰ نے تہدید و توبیخ کے طور پر فرمایا: جاؤ، اولاد آدم میں سے جو کوئی تیرے پیچھے چلے گا تو جہنم تمہارا سب کا بدلہ ہوگا، اور تم اور تمہارے پیروکاروں کا پورا پورا بدلہ ہی ہوگا۔ پھر توبیخاً مزید فرمایا: اور اسے مکمل طاقت آزمائی کا حکم دیدیا:

وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَاَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ
رَجِلِكَ وَشَارِكْهُمْ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ وَعِدْهُمْ ۭ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ

اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۶۴﴾ اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ ؕ وَ كَفٰى بِرَبِّكَ وَكِیْلًا ﴿۶۵﴾

ترجمہ: اوران میں سے جس جس پر تیرا قابو چلے، اپنی پکار سے ان کے قدم اکھاڑ دینا، اوران پر اپنے سوار اور پیادے چڑھالانا، اوران کے اموال اوراولاد میں اپنا ساجھا (شراکت) کرلینا، اوران سے وعدے کرلینا، اور شیطان ان سے جو وعدے کرتا ہے، وہ صرف دھوکہ ہی ہوتے ہیں ﴿۶۴﴾ بلاشبہ میرے بندوں (عبادالرحمٰن) پر تیرازور نہ چلے گا، اور تیرا ربّ کارساز ہونے کے لئے کافی ہے ﴿۶۵﴾

معارف ومنازل

شیطان کو بہت بڑی توبیخ وتہدید کے ساتھ چار باتوں کا کھلم کھلا اختیار عام دیا جارہا ہے:

☆ پہلی یہ کہ اپنی آوازوں کے ساتھ جتنے لوگوں کو گمراہ کرسکتے ہو کرلو۔

☆ دوسری یہ کہ جتنے جنات وانسان جو معاصی پر فریفتہ ہیں، وہ سب تیرے لشکر کے سوار اور پیادہ ہیں۔ ان کے ذریعہ جتنے لوگوں جو جہنمی بنا سکتے ہو بناؤ۔

☆ تیسری یہ کہ لوگوں کے اموال اوراولاد میں خوب اپنی شراکت قائم کرسکتے ہو، کرو۔

☆ چوتھی یہ کہ جھوٹے اور فرضی وعدوں کے ذریعہ اپنے پیروکاروں کو سبز باغ دکھا کر، اپنی فطرت سے ہٹا سکتے ہو، جاؤ، ہٹاؤ، اور یہ خوب یادرکھو کہ تمہارے کہنے پر جتنے لوگ تمہارے ساتھی (عبادالشیطان) بنیں گے، وہ سب تمہاری میزبانی کے سایہ میں جہنم میں داخل ہوکر شجرۃ الزقوم کا ڈنر وعشائیہ کھائیں گے، اور یادرکھو! جن پر ہمارے لطف وکرم کا سایہ ہوگا، ان عبادالرحمٰن کے خلاف تمہارازور نہیں چلے گا، اور تمہارا ہر حربہ ناکام ہوگا، وہ اپنے پروردگار کی میزبانی میں جنتوں کی سیر کریں گے، اور بے شمار جنتی نعمتوں سے محظوظ ہوں گے۔ تو فرمایا:

﴿وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ﴾ تجھ سے جو کچھ ہوسکے اپنی کوشش کرلینا، لوگوں کے بہکانے اور ورغلانے میں خوب سریلی آواز لگاؤ، معازف ومزامیر اور گانوں کے ذریعہ جتنے لوگوں کو بے حیاء اور جہنمی بنا سکتے ہو بنالو، خوب ناچو، قوالی پڑھو، ناچ گانوں کے محافل منعقد کرو، منگنیوں میں، شادیوں میں، اور دیگر تقریبات میں ایک طرف پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پروگرام ہوگا، جو فرماتے ہیں کہ میں ناچ گانے، معازف ومزامیر، رقص وسرود کو مٹانے آیا ہوں، پوری دنیا کو اس لعنت سے پاک کرنے آیا ہوں، اور دوسری طرف تمہارا ابلیسی پروگرام ہوگا۔ اب

دیکھنا ہے کہ کون عباد الرحمٰن کا ممبر بنے گا، اور تم سے علیحدہ گی اختیار کرے گا؟ اور کون تمہارا بندہ بنے گا، اور جہنمی لشکر کا ممبر بنے گا؟ اور پیغمبر اسلام ﷺ کی جماعت سے علیحدہ ہونے کا اعلان کرے گا؟ یہ میدان سب کے لئے کھلا ہے۔

اِسۡتِفۡزَاز کا معنی: ہلکا کرنا، اور کمزور بنا کر قابو پالینا ہوتا ہے۔ یعنی جن کو کمزور پاؤ ان پر قابو کرلو۔ مطلب یہ ہے کہ تو اپنی خوبصورت سریلی آوازوں، میوزک وموسیقی، رقص وسرود کے ساتھ جتنا گمراہ کرسکتے ہو تمہیں اجازت ہے۔ اور تو کیا کہیں؟ اگر کوئی قرآن پاک کو گانے کی آواز میں تلاوت کرے تو گنہگار ہوگا، اور اس طرح یہ مکروہ تحریمہ شمار ہوگا۔

﴿وَاَجۡلِبۡ عَلَيۡهِمۡ بِخَيۡلِكَ وَرَجِلِكَ﴾ اور اپنے لشکر کے سوار اور پیادہ، سب کھینچ کر لاؤ۔

جَلب کے معنی ہیں: دوڑانا، کھینچ کر لانا۔ شیطان سے کہا جارہا ہے کہ اپنی فوج کے سپاہیوں کو سوار اور پیدل دونوں صورتوں میں میدان جنگ میں اتار دینا، اور خوب لڑائیاں لڑا کر انسانوں کو جتنا گمراہ کرسکتے ہو کرلو۔ یہ دوسرا حربہ تھا، جس کا راستہ شیاطین الانس والجن کے لئے کھولا گیا۔ اس حربے کے ذریعے ابلیسی کارنامے مختلف طرز وطریقے پر تمام دنیا میں، ہر قسم کے شرک، کفر، بدعت اور طرح طرح کے ہزاروں معاصی پھیلا رہے ہیں۔

﴿وَشَارِكۡهُمۡ فِي الۡاَمۡوَالِ وَالۡاَوۡلَادِ﴾ کہ ان کے مالوں میں، اور اولاد میں شراکت قائم کر، مال خرچ کرنے اور کمانے کے جتنے شرعی طریقے اور ذرائع ہیں ان میں شیطان کی کوئی شراکت نہیں، اور نہ ہی وہ مالدار شیطان کے گماشتے ہوتے ہیں، البتہ شیطان کے گماشتے اور اس کے ساتھی، بلکہ بھائی وہ لوگ ہیں جو غیر شرعی طور پر مال حاصل کرتے ہیں، اور اسلامی روایات سے ہٹ کر مال کماتے ہیں، اور پھر غیر شرعی، غیر اسلامی طریقے پر مال خرچ کرتے ہیں، جیسے سود، جوا، سٹہ بازی، سمگلنگ، رشوت، دھوکہ، فریب، خیانت، چوری، ڈاکہ زنی، شراب فروشی، حق تلفی، وغیرہ۔

اسی طرح غیر شرعی طور پر خرچ کرنا، مثلاً حرام جگہوں میں، رسم ورواج کے غیر شرعی مصارف میں، شادی بیاہ، منگنیوں میں، اسراف وتبذیر، ڈھول، ناچ رقص کی محفلوں میں، ریاکاری، نام ونمود، لہو ولعب، سینما، کھیل تماشے، وغیرہ غیر شرعی مصارف میں۔ عجیب بات ہے مال تم نے کمایا، اور بڑی محنت کر کے کمایا، مگر خرچ شیطان کرا رہا ہے، اور خرچ کرنے میں وہ پیش پیش ہے، تم بے اختیار ہو، یہی تو شیطان کی شراکت ہے۔

اور اولاد میں شیطان کی شراکت یہ ہے کہ زنا عام ہوجاتا ہے، معاشرہ اتنا خراب ہوجاتا ہے کہ بکثرت

حرامزادے ولدالزنا پیدا ہوجاتے ہیں، والدین حرام کمائی سے بچوں کی پرورش کرتے ہیں، انہیں دینی تعلیم نہیں دیتے ہیں، ان کے عقائد اوراعمال پر شیطان کا تسلط ہوجاتا ہے، اس طرح اولاد میں شیطان کی شراکت اوراس کی گرفت مضبوط ہوجاتی ہے۔ ہمارے آج کے معاشرے میں اس کی ہزاروں لاکھوں مثالیں ہیں۔

﴿وَعِدْهُمْ ۚ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ ان سے جھوٹے وعدے کرکے خوب آزمالو۔ یہ چوتھا شیطانی حربہ ہے، جوکہ سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ تمام برائیوں کو مزیّن اور خوبصورت بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے، اور تمام اچھے اعمال اور شرعی اقدار کو فرسودہ اور بدصورت بنا کر لوگوں کو ان سے دور رہنے کا نہایت مخلصانہ مشورہ دیتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غیر مسلم تو درکنار، آج مسلمان کا یہ حال ہے کہ غیر شرعی کام اور گناہ کرنے پر سکون محسوس کرتا ہے، اوراذان کی آواز اور رمضان شریف کی آمد پر اس کا بلڈ پریشر ڈون ہوجاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہورہا ہے کہ انسان مجبور محض اور بے اختیار ہے، اور شیطان اس پر ہرحال میں مسلط ہے، چاہے اسے کافر بنادے، چاہے فاسق وفاجر، پس وہ مکلف کیونکر ہوا؟ اوراس پر مؤاخذہ کیونکر ہوا؟ اس کا جواب ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ﴾ بلاشبہ میرے بندوں پر تیرازور نہیں چلے گا۔ مطلب یہ ہے کہ تو اولادآدم کو بہکانے، ورغلانے اور راہِ حق سے ہٹانے کی وہ سب تدبیریں کرلینا جوتو کرسکتا ہے، لیکن تجھے ایسا کوئی اختیار حاصل نہیں کہ تو انسانوں کو اپنی قوت سے مجبور کرے، زبردستی کافرومشرک بنالو، تیری ساری تدبیروں اور شرارتوں کے باوجود وہ سب اپنے عمل میں مختار رہیں گے، اوران کے بے شمار لوگ تیرے وسوسے اورمکروخیانت کو قبول نہیں کریں گے، اوراسی خودمختاری کی وجہ سے ان کا مؤاخذہ ہوگا۔ سورۂ حجر میں فرمایا: ﴿اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِيْنَ﴾ [الحجر: ۴۲] (بلاشبہ میرے بندوں پر تیراتسلّط نہ ہوگا، سوائے ان گمراہوں کے جوتیرااتباع کریں)۔

اور لفظِ اتباع صاف صاف بتارہا ہے کہ ان گمراہوں نے اپنی مرضی سے، اختیار سے شیطان کا اتباع کیا، اوراس کا حکم مانا، کیونکہ ایسے لوگ اپنے اختیار کو استعمال نہیں کرتے ہیں، بصد خوشی ابلیس کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس مضمون کی تفصیل سورۂ ابراہیم میں گزرچکی ہے، وہاں دیکھی جائے۔

﴿وَكَفٰى بِرَبِّكَ وَكِيْلًا﴾ اور تیرارب کافی ہے کارساز۔ جولوگ اللہ تعالیٰ کا حکم مانتے ہیں اخلاص کے ساتھ

اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرتے ہیں، اور شیطان کی بات نہیں مانتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کا شیطان سے خوب تحفظ کرتے ہیں، اور انہیں ہدایت کے راستے پر قائم رکھتے ہیں۔

رَبُّكُمُ الَّذِىۡ يُزۡجِىۡ لَـكُمُ الۡفُلۡكَ فِى الۡبَحۡرِ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِكُمۡ رَحِيۡمًا ﴿۶۶﴾
وَاِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِى الۡبَحۡرِ ضَلَّ مَنۡ تَدۡعُوۡنَ اِلَّاۤ اِيَّاهُ‌ ۚ فَلَمَّا نَجّٰٮكُمۡ اِلَى الۡبَرِّ اَعۡرَضۡتُمۡ‌ ؕ
وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ كَفُوۡرًا ﴿۶۷﴾ اَفَاَمِنۡتُمۡ اَنۡ يَّخۡسِفَ بِكُمۡ جَانِبَ الۡبَرِّ اَوۡ يُرۡسِلَ عَلَيۡكُمۡ
حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَـكُمۡ وَكِيۡلًا ۙ ﴿۶۸﴾ اَمۡ اَمِنۡتُمۡ اَنۡ يُّعِيۡدَكُمۡ فِيۡهِ تَارَةً اُخۡرٰى فَيُرۡسِلَ
عَلَيۡكُمۡ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيۡحِ فَيُغۡرِقَكُمۡ بِمَا كَفَرۡتُمۡ‌ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوۡا لَـكُمۡ عَلَيۡنَا بِهٖ تَبِيۡعًا ﴿۶۹﴾

ترجمہ: تمہارا ربّ وہ ہے جو تمہارے لئے دریا میں کشتیوں کو چلاتا ہے تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو، بلاشبہ وہ تم پر مہربان ہے ﴿۶۶﴾ اور جب سمندر میں تمہیں کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو اس کے علاوہ جن کو تم پکارتے ہو وہ سب غائب ہوجاتے ہیں، پھر وہ جب تمہیں خشکی کی طرف نجات دیتا ہے تو روگردانی کرتے ہو، اور انسان بڑا ناشکرا ہے ﴿۶۷﴾ کیا تم اس بات سے بےفکر ہو کہ وہ تمہیں خشکی کی جانب میں لاکر زمین میں دھنسا دے؟ یا تم پر کوئی سخت آندھی بھیج دے، جو کنکر برسانے والی ہو؟ پھر تم اپنے لئے کسی کو کارساز نہ پاؤگے ﴿۶۸﴾ یا تم اس سے بےفکر ہو کہ وہ تمہیں دوبارہ سمندر میں لوٹا دے، پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے، پھر تمہیں تمہارے کفر کی وجہ سے غرق کردے؟ پھر تمہیں کوئی ایسا نہ ملے جو ہمارا پیچھا کرنے والا ہو ﴿۶۹﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں توحید باری تعالیٰ کا بیان ہوا، اس کے ساتھ ابلیس کی نافرمانی کا بیان، اور اس کے گمراہ کن کارناموں کا بیان ہوا۔ مذکورہ آیات میں اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کے ضمن میں توحید کے بیان کے ساتھ انسانوں کی ناشکری اور ہٹ دھرمی کا بیان ہورہا ہے، جب ان پر مصیبت آتی ہے تو خالص اللہ تعالیٰ پکارتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بچانے والا نہیں، لیکن نجات پانے اور مصیبت دور ہونے کے بعد پھر دوبارہ اپنا شرک شروع کرتے ہیں، تو فرمایا:

﴿رَبُّكُمُ الَّذِي يُزْجِي لَكُمُ الْفُلْكَ فِي الْبَحْرِ﴾ تمہارا پروردگار وہ ہے جو تمہارے لئے کشتیاں اور جہاز سمندر میں چلاتا ہے، اور تمہارے لئے سمندر کو مسخر فرمایا ہے، جس میں تمہاری کشتیاں اور اسی اسی ہزار ٹن وزنی جہاز اپنے بوجھ سے دوگنا، سہ گنا وزن اٹھا کر سمندر کے سینے کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی رحمت اور اس کی تسخیر ہے، جس کے ذریعے تم اپنے لئے طرح طرح کے رزق حاصل کرتے ہو، تمہیں چاہئے تھا کہ اپنے پروردگار کا شکر بجالا کر اس کی وحدانیت کا اقرار کرتے، مگر تم لوگوں نے ایسا نہیں کیا۔

﴿لِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ﴾ تاکہ تم اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرسکو۔ یہ فضل تمہارے حق میں اتنا وسیع ہے جس کے بارے میں تم خود اقرار کرتے ہو کہ خشکی کے تمام راستے تمہاری تجارت اور کاروبار کے لئے اتنے سہل اور موزوں نہیں جتنا کہ سمندر کے راستے، کیونکہ سمندر کے راستے لاکھوں کروڑوں اموال تجارت کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک نہایت آسانی سے منتقل کرتے رہتے ہو، یہ اس لئے کہ:

﴿إِنَّهُ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ بیشک تمہارا ربّ تمہارے ساتھ بڑا ہی مہربان ہے کہ سمندر جیسے عظیم دریا کو تمہارے لئے مسخر فرمایا۔

﴿وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ﴾ جب سمندر میں سفر کے دوران تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے، سمندر کی موجوں میں طغیانی آجاتی ہے، اور ہلاکت کا خطرہ پیدا ہوجاتا ہے، تو:

﴿ضَلَّ مَنْ تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ﴾ تو وہ سارے معبود گم ہوجاتے ہیں جنہیں تم اللہ تعالیٰ کے علاوہ پکارا کرتے ہو۔ تمہارا ضمیر خود گواہی دیتا ہے کہ ایسے وقت میں سوائے اللہ تعالیٰ کے کوئی تمہیں بچا نہیں سکتا، ایسے وقت ﴿دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ﴾ [یونس:۲۲] (خلوص کے ساتھ صرف اللہ پر اعتقاد کر کے صرف اسی کو پکارتے ہیں) پس خالص اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہو، اور دیگر تمام شرکاء کو بھول جاتے ہو، مگر کتنے بیوقوف جاہل ہو کہ:

﴿فَلَمَّا نَجَّاكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ﴾ جب تمہیں مشکل سے نجات بخشتا ہے اور سمندر کی طغیانیوں اور تاریک موجوں سے نکال کر خشکی پر پہنچادیتا ہے تو اعراض اور روگردانی شروع کرتے ہو، اور پھر غیر اللہ کی طرف دوبارہ بھاگنا شروع کرتے ہو۔

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا﴾ انسان تو بڑا ہی ناشکرا ہے، اس کا حال یہ ہے کہ اسی قدرتی نجات کو غیر اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کی نفی کرتا ہے۔

﴿اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا﴾
سو کیا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے کہ تم کو خشکی کی طرف لا کر زمین میں دھنسا دے؟ یا تم پر کوئی ایسی آندھی بھیج دے جو کنکر پتھر برسانے لگے؟ پھر کسی کو تم اپنا کارساز بچانے والا نہ پاؤ، یعنی تم خشکی کے جس حصہ پر موجود ہو اللہ تعالیٰ اس کو اُلٹ دے، جیسا کہ وہ دریا کو اُلٹ دیتا ہے، اور جس طرح وہ دریا کی موجوں سے تمہیں ہلاک کرسکتا ہے، اسی طرح خشکی پر اور تیز ہواؤں سے بھی تمہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے، لہٰذا جس طرح تم دریا میں صرف اسی کو پکارتے ہو تو چاہئے کہ خشکی پر بھی صرف اسی کو پکارا کرو۔

﴿وَكِيْل﴾ سے حفاظت کرنے والا، بچانے والا مراد ہے، جو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں۔

﴿اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ۙ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا﴾ یا تم اس بات سے بے فکر ہو بیٹھے ہو کہ اللہ تعالیٰ پھر تم کو دوبارہ دریا میں ہی لے جائے، پھر تم پر ہوا کا سخت طوفان بھیج دے، پھر تم کو تمہارے کفر کے سبب غرق کردے، پھر اس بات پر ہمارا پیچھا کرنے والا تم کو کوئی بھی نہ ملے؟ یعنی ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے اسباب تمہارے لئے پیدا کردے کہ دوبارہ تم کو سمندر کا سفر کرنا پڑ جائے، اور ایک طوفان بھیج کر تمہیں غرق کردے۔

﴿قَاصِف﴾ سے مراد وہ طوفانی ہوا جو ہر چیز کو تباہ کردے۔ مطلب یہ ہے کہ سمندر ہو یا خشکی، تم ہر صورت میں قابلِ مؤاخذہ ہو، اور اللہ تعالیٰ ہر حال میں، ہر جگہ تمہیں ہلاک کرنے پر قادر ہے، اور تمہارے باطل معبود کسی بھی مرحلے پر تمہاری حفاظت و مدد کرنے سے عاجز ہیں۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا ۝٧٠

ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے بنی آدم کو عزت دی، اور انہیں خشکی میں اور سمندر میں سوار کیا، اور انہیں عمدہ چیزیں عطاء فرمائیں، اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی ۝٧٠

☆☆☆

معارف ومنازل

اس آیت میں اوّل تو اجمالی طور پر بنی آدم کی تکریم بیان فرمائی کہ اس کو ان صفاتِ عالیہ سے نوازا گیا، جو صرف انہیں کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً قوت گویائی عطاء کیا جانا، مافی الضمیر کے اظہار پر قدرت عطاء کیا جانا، مختلف زبانوں سے بولنے کی قوت عطاء کرنا، فصاحت وبلاغت سے بات کرنا، کتابت وقلم کے ذریعہ علوم ومعارف بیان کرنا، عقل وفہم کی نزاکتوں سے دنیا میں اپنے کمالات کا لوہا منوانا، پورے عالم پر حکمرانی کرنا، احسن تقویم سے زینت پانا، خوبصورتی اور حسن وجمال کا مالک بننا، قدوقامت کا مستقیم ہونا، خیر وشر، اور نفع ونقصان، اور خبیث وطیب میں امتیاز کرنا، بہت سی مخلوقات کا اس کے لئے مسخر ہونا، ہزاروں لاکھوں چیزوں کا مالک ہونا، اور طرح طرح کی ایجادات کرنا، نئی نئی مصنوعات ایجاد کرنا، بڑی بڑی فلک بوس عمارات تعمیر کرنا، پہاڑوں سے اور زمین کی گہرائیوں سے سیکڑوں معدنیات کا نکالنا، فضاؤں، صحراؤں، سمندروں کو تسخیر کرنا، ہوائی جہازوں میں سفر کرنا۔

الغرض! موجودہ دنیا اور اس کی مصنوعات اور حیران کن ایجادات اور طرح طرح کے مشینری اور مشینی ایجادات وہ محیر العقول چیزیں ہیں جنہیں اور ان کے فوائد کو شمار کرنا خارج از امکان ہے، اور یہ سب چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے ساتھ خاص ہیں، اور ان چیزوں کے ساتھ انسان کا مکرم ومشرف ہونا ظاہر ہے۔

﴿وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ اور ہم نے اس کو خشکی اور سمندر میں سوار کیا۔ خشکی کی سواریاں حیوانات ہیں، اور موجودہ ہزاروں قسم کی سواریاں ہیں۔ سمندر میں وہ پہاڑوں کے برابر دریائی جہاز ہیں جو کروڑوں ٹنوں کا بوجھ اٹھا کر ایک براعظم سے دوسرے براعظم کے سمندر کو چیرتے ہوئے سفر کرتے ہیں۔

﴿وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ﴾ ہم نے بنی آدم کو عمدہ چیزیں عطاء فرمائیں۔ یعنی کھانے، پہننے، رہنے سہنے، بچھانے کی بے شمار عمدہ وپاکیزہ چیزیں، یہ سب چیزیں عمدہ، حلال، پاکیزہ، اعلیٰ، نفیس، منافع بخش اشیاء مراد ہیں۔ یہاں ماکولات کا ذکر نہیں، لہٰذا یہ سب چیزوں کا شمار رزق میں ہے۔ یعنی رزق کا اطلاق ان سب چیزوں پر ہوتا ہے۔

﴿وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا﴾ اور ہم نے انہیں اپنی بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

یہاں چند امور قابل غور ہیں، جو یہ ہیں:

(۱) آیت کریمہ میں ﴿عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا﴾ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا شرف وفضیلت تمام مخلوقات پر نہیں (مثلاً فرشتوں پر) بلکہ بعض مخلوقات پر ہے۔

(۲) یہ فضیلت نوع بنی آدم کے لئے ہے، ہر ہر فرد کے لئے نہیں۔ یہ آگے بیان ہوگا۔

(۳) یہ فضیلت چونکہ نوع بنی آدم کے لئے ہے، اور دنیوی امور کا بھی اس میں لحاظ اور اعتبار ہے، اور فضیلت کے جو اسباب بیان ہوئے ان میں مؤمن وکافر دونوں کا حصہ برابر ہے، لہٰذا کفار بھی اس میں شامل ہیں۔ البتہ اخروی فضیلت صرف مؤمنین کے لئے ہے، وہ ان مذکورہ اسباب کی وجہ سے نہیں، بلکہ ایمان واعمال کی وجہ سے ہے، جن کا یہاں تذکرہ نہیں ہوا۔

(۴) بعض علماء نے فضیلت بنی آدم کے لئے انبیاء کرام علیہم السلام اور ایمان واعمال کو جو ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ کفار بھی اس میں شامل رہے، لیکن چونکہ انہوں نے اپنی فطری ایمانی استعداد کو ضائع کیا، پس اس فضیلت سے محروم ہوئے۔ دراصل انسانی فضیلت کا اصلی معیار معرفتِ الٰہی ہے، جس کی خاطر انسان کی تخلیق ہوئی۔ ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ [الذاریات:۵۶] (اور میں انسانوں اور جنات کو پیدا نہیں کیا مگر اس لیے کہ میری عبادت کریں)۔ اسی طرح: ﴿ثُمَّ رَدَدْنٰهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ إِلَّا الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ [التین:۶] (پھر ہم اسے پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں) بھی اسی طرف اشارہ کنندہ ہیں۔ واللہ اعلم

(۵) اولاد آدم کو اکثر مخلوقات پر فضیلت دینے کا کیا مطلب ہے؟ اس میں تو کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات علویہ اور سفلیہ، اور تمام جانوروں پر اولاد آدم کو فضیلت حاصل ہے۔ اسی طرح جنات جو عقل وشعور میں انسان ہی کی طرح ہیں، ان پر بھی انسان کا افضل ہونا سب کے نزدیک مسلم ہے۔

اب معاملہ صرف فرشتوں کا رہ جاتا ہے کہ انسان اور فرشتہ میں کون افضل ہے؟

اس میں تحقیقی بات یہ ہے کہ انسان میں عام مؤمنین صالحین جیسے صدیقین اولیاء کرام وہ عام فرشتوں سے افضل ہیں، مگر خواص ملائکہ جیسے جبرئیل ومکائیل علیہما السلام یہ ان صالحین مؤمنین سے افضل ہیں، اور خواص مؤمنین جیسے انبیاء کرام علیہم السلام وہ خواص ملائکہ سے بھی افضل ہیں، اور عام مؤمنین سے عام فرشتے افضل ہیں۔ باقی رہے انسانوں کے کفار وفجار ومنافقین، وہ فرشتوں سے تو کیا افضل ہوتے وہ تو جانوروں گدھے اور کتے سے بھی بدتر ہیں، جن کے متعلق قرآن کریم کا فیصلہ ہے: ﴿أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ﴾ [الأعراف:۱۷۹] (وہ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں)۔ نیز ﴿إِنَّمَا الْمُشْرِكُونَ نَجَسٌ﴾ [التوبۃ:۲۸] (بیشک مشرک لوگ گندے ہیں)۔

[مظھري وغیرہ]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی روایت میں جسے امام طبرانیؒ نے نقل کیا، اور امام ابن کثیرؒ نے بیان کیا ہے کہ سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اِنَّ الْمَلٰئِكَةَ قَالَتْ: يَارَبَّنَا! اَتَيْتَ بَنِى اٰدَمَ الدُّنْيَا يَاْ كُلُوْنَ فِيْهَا وَيَشْرَبُوْنَ وَ يَلْبَسُوْنَ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ لَا نَاْكُلُ وَ لَا نَشْرَبُ وَ لَا نَلْهُوْا كَمَا جَعَلْتَ لَهُمُ الدُّنْيَا فَاجْعَلْ لَنَا الْاٰخِرَةَ. قَالَ: ءَ أَجْعَلُ صَالِحِ ذُرِّيَّةِ مَنْ خَلَقْتُ بِيَدَىَّ كَمَنْ قُلْتُ لَهٗ: كُنْ فَيَكُوْنُ؟ بیشک فرشتوں نے کہا: اے ہمارے پروردگار! اولاد آدم کو تو نے دنیا عطاء کی، وہ دنیا میں کھاتے پیتے لباس پہنتے ہیں، اور ہم تیری تسبیح بیان کرتے ہیں، تیرے حمد کے ساتھ، اور نہ کھاتے ہیں، نہ پیتے ہیں، اور نہ کھیل کود کرتے ہیں، تو جس طرح تو نے اولاد آدم کے لئے دنیا بنائی اسی طرح ہمارے لئے آخرت بنادے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا: کیا میں اپنے ہاتھ سے پیدا کردہ ہستی کی نیک اولاد کو ان (فرشتوں) کے برابر کردوں جن کو میں نے کہا: ہوجاؤ، تو وہ ہوگئے؟

آپ غور کرو، حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کس طرح ہوئی، جسے قرآن مجید نے یوں بیان کیا، جب شیطان حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکاری ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَىَّ﴾ [ص:۷۵] (میں نے جس کو اپنے دست قدرت سے بنایا، اس کے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا؟) یہ حضرت آدم علیہ السلام کا اعزاز وشرف ہوا کہ اس کی تخلیق کُنْ فَيَكُوْنُ کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ دست قدرت کے ذریعہ سے ہے۔

يَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۢ بِاِمَامِهِمْ ۚ فَمَنْ اُوْتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتٰبَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۷۱﴾ وَمَنْ كَانَ فِىْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۷۲﴾

ترجمہ: جس دن ہم سب لوگوں کو ان کے امام کے ساتھ بلائیں گے، سو جس کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا گیا سو یہ لوگ اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے، اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ کیا جائے گا ﴿۷۱﴾ جو شخص اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا، اور زیادہ راہ گم کردہ ہوگا ﴿۷۲﴾

معارف ومنازل

اِمَام بمعنی پیشوا، مقتداء، رہنما، بروزن فِعَال، اسم ہے بمعنی مَنْ يُؤْتَمُّ بِهٖ کے، یعنی جس کا قصد کیا

جائے، چونکہ مقتداء اور رہنما کا قصد کیا جاتا ہے اس لئے اس کو امام کہتے ہیں۔ الغرض جس کی پیروی کی جائے وہ امام ہے۔ حق وسچائی میں پیروی ہو، یا ناحق اور باطل میں، اور خواہ جس کی پیروی کی جائے وہ انسان ہو کہ اس کے قول وفعل کی اقتداء کریں، یا کتاب ہو کہ اس کے اوامر ونواہی پر عمل کیا جائے، یا اور کوئی شے۔ مذکر اور مؤنث دونوں کے لئے آتا ہے۔ نیز جمع کے مواقع پر لفظ واحد بھی مستعمل ہے۔

سورۂ حجر میں راستہ کے معنی میں مستعمل ہے: ﴿وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الحجر:۷۹] (اور وہ واضح راستے پر ہیں)۔ اور سورۂ یٰسٓ میں ﴿وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ﴾ [یس:۱۲] (اور ہر چیز کو ہم نے گن رکھا ہے لوح محفوظ میں) لوح محفوظ اور قرآن کریم کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس کی جمع اَئِمة ہے، جیسے کہتے ہیں: ائمۃ المساجد، ائمۂ تفسیر، ائمۂ حدیث، ائمۂ اربعہ وغیرہ۔ یہاں آیت کریمہ میں اِمَامِ کتاب کے معنی میں زیادہ بہتر رہے گا، اگرچہ دوسرے معنی اگر مراد لئے جائیں تو وہ بھی صحیح اور مناسب رہیں گے۔ تفصیل یہ ہے:

(۱) اِمَام سے مراد نامہ اعمال ہے۔ علامہ قرطبی ﷫ نے حضرت ابن عباس ﷠، حضرت قتادہ، اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما سے یہی نقل کیا ہے، اور یہ معنی سیاق کلام کے موافق ہے، کیونکہ متصل بعد میں داہنے ہاتھ میں اعمال نامے دیئے جانے کا ذکر ہے، اور اسی سورت کے دوسرے رکوع میں گزر چکا ہے: ﴿وَكُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ ۭ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا﴾ [الإسراء:۱۳] (ہم ہر انسان کی گردن میں اس کا اعمال نامہ ڈال دیں گے اور ہم اس کے لئے قیامت کے دن کتاب نکال دیں گے، وہ اس کتاب کو کھلی ہوئی دیکھ لے گا)۔

اس میں بتایا ہے کہ انسان کو اس کا اعمال نامہ ملے گا، اور وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا، اور یہاں فرمایا کہ جن لوگوں کے داہنے ہاتھ میں اعمال نامے دیئے جائیں گے وہ ان کو پڑھیں گے، اور یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔ اسی کا بیان سورۂ الحاقہ میں تفصیلاً مذکور ہے، اور یہی لوگ اَصْحٰبُ الْيَمِيْنِ کہلائیں گے۔ ان کے ساتھ متصل دوسرے گروہ اَصْحَابُ الشِّمَالِ کا تذکرہ ہے:

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى﴾ جن کا بیان سورۃ الحاقہ اور سورۃ الانشقاق میں بھی ہے۔

﴿وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا﴾ اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہ ہوگا۔ کھجور کی گٹھلی کے گڑھے میں جو باریک تاگہ ہوتا ہے، اُسے فَتِيل کہتے ہیں، اور اُسے بطور مثال "ذرہ" سے تعبیر کرتے ہیں۔

(۲) حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور امام مجاہد وغیرہ مفسرینؒ سے یہاں لفظ اِمَام کے معنی مقتداء و پیشوا کے منقول ہیں کہ ہر شخص کو اس کے مقتدء اور پیشوا کا نام لے کر پکارا جائے گا، خواہ مقتداء اور پیشوا انبیاء کرام علیہم السلام ہوں، یا ان کے نائب مشائخ اور علماء ہوں، یا شرک ومعصیت اور گمراہی کی طرف دعوت دینے والے باطل ومردود پیشوا ہوں۔ [قرطبي] اس معنی کی تائید اس آیت سے ہوتی ہے: ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ﴾ [النساء: ۴۱] (پھر اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے)۔

(۳) حضرت ابن زیدؒ فرماتے ہیں کہ اِمَام سے مراد ہر اُمت پر نازل شدہ کتاب ہے۔ اہل تورات تورات کے ساتھ، اہل انجیل انجیل کے ساتھ، اور آخری ہماری اُمت قرآن حکیم کے ساتھ بلائے جائیں گے۔ حدیث شریف میں ختم القرآن کے موقع پر جو دعاء منقول ہے، وہ یہ ہے: اَللّٰهُمَّ اٰنِسْ وَحْشَتِیْ فِیْ قَبْرِیْ وَارْحَمْنِیْ بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَاجْعَلْهُ لِیْ اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًی وَّرَحْمَةً. یہاں لفظ اِمَام مذکور ہے، جس سے قرآن مجید ہی مراد ہے۔ امیر المؤمنین فی الحدیث حضرت امام بخاریؒ نے صحیح بخاری میں بَاب يُدْعٰى النَّاسُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ بِاٰبَائِهِم قائم کر کے صحیح احادیث سے ثابت کر دیا ہے کہ قیامت کے روز باپوں کے نام سے بلاوا ہوگا۔

دراصل قیامت کے دن میں لوگوں کو مختلف مراحل سے گزرنا ہوگا، اور مختلف کیفیتیں سامنے آئیں گی۔ کبھی تو زبانوں سے کچھ ہی نہیں کہہ سکیں گے، پھر یہ کیفیت ختم ہو کر دیکھو بولنا شروع کریں گے، اور کبھی دیکھا گیا کہ کفار اندھے ہیں، بعد میں ان کی آنکھیں دیکھ رہی ہوں گی، کبھی دیکھا کہ کفار اپنے کفر کو چھپا رہے ہوں گے، پھر دیکھو وہ اقرار کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ قرآن وحدیث کے نصوص میں جو متضاد احوال کا تذکرہ ہے ان میں کسی قسم کا تعارض نہیں، بلکہ روز قیامت کے مراحلِ مختلفہ پر ہر حکم کو بآسانی منطبق کیا جا سکتا ہے۔ [بخاري]

﴿وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا﴾ اصحاب الیمین کے بعد اصحاب الشمال کا تذکرہ ہو رہا ہے، یا یہ کہا جائے کہ بینا لوگوں کے بعد اندھے نابینا لوگوں کا بیان ہے، جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدرتوں اور عظمتوں کو ظاہری آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود دل کی بینائی (ایمان) حاصل نہیں کی، انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کی تکذیب کی، اور آسمانی کتابوں کا مذاق اڑایا، اور جو لوگ مسلمان تھے انہیں گمراہ کہا، اور خود کو عقلمند و دانشور بتایا، تب تو یہ حق سے اندھے ہوئے، ظاہری بینائی کے ہوتے ہوئے عقل کے اور دل کے اندھے بنے۔

پس قیامت کے روز اوّل مرحلہ میں آنکھوں سے اندھے اٹھائے جائیں گے، دوسرے مرحلہ پر آنکھوں کی

بینائی تو لوٹ آئے گی، مگر دل کی نابینائی بدستور رہے گی، جس کے ہوتے ہوئے جنت اور اس کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ وہاں صرف ان لوگوں کی رسائی ممکن ہے جو دل کے بینا اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہوں۔

قرآن مجید نے سورۂ حج میں فرمایا: ﴿فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ﴾ [الحج:٤٦] (بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوئیں، لیکن سینوں میں پڑے ہوئے دل اندھے ہو جاتے ہیں) اور یہ بات ظاہر ہے کہ ایمان کا مرکز و مستقر دل ہی ہے، نہ کہ آنکھیں۔

اسی سورت کے گیارہویں رکوع میں ﴿وَنَحۡشُرُهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ عُمۡيًا وَّبُكۡمًا وَّصُمًّا﴾ [الإسراء:٩٧] (اور قیامت کے دن ہم انہیں اٹھائیں گے چہروں کے بل، اندھے، بہرے اور گونگے) تاکہ خوب رسوا اور ذلیل ہوں۔ پھر میدان دیکھنے، اور مظاہرہ کرنے، جنتیوں کی کامیابی اور خوشحالی دیکھ کر افسوس و پشیمانی اور آہ و فغان کرنے کی خاطر ان کی بینائی لوٹا دیں گے تاکہ حسرتوں میں غرق ہو جائیں۔ اسی کو فرمایا: ﴿وَاَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَاَبۡصِرۡ يَوۡمَ يَاۡتُوۡنَنَا﴾ [مریم:٣٨] (کیا خوب سنیں گے، اور کیا خوب دیکھیں گے جس دن ہمارے پاس آئیں گے)۔ یہ دونوں فعل تعجب کے صیغے ہیں، معنی یہ ہے کہ کیا خوب سننے والے ہوں گے، کیا خوب دیکھنے والے ہوں گے۔ پھر فرمایا: ﴿فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ﴾ [ق:٢٢] (پس ہم نے تم پر سے پردہ ہٹا دیا، چنانچہ آج تمہاری نظر بڑی تیز ہے)۔

کفار سے کہا جائے گا کہ دنیا کے مزوں میں پڑ کر تو آج کے دن سے بے خبر تھا، اور تیری آنکھوں کے سامنے شہوات و خواہشات کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو سمجھاتے تھے، تجھے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، آج تمہاری آنکھوں سے وہ پردے ہٹا دیئے، اور نگاہ خوب تیز کر دی، اب حسرتوں کے ساتھ دیکھ لیں کہ کیا ہوگا۔

وَاِنۡ كَادُوۡا لَيَفۡتِنُوۡنَكَ عَنِ الَّذِىۡۤ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ لِتَفۡتَرِىَ عَلَيۡنَا غَيۡرَهٗ ‌ۖ وَاِذًا لَّاتَّخَذُوۡكَ خَلِيۡلًا ۞ وَلَوۡلَاۤ اَنۡ ثَبَّتۡنٰكَ لَقَدۡ كِدۡتَّ تَرۡكَنُ اِلَيۡهِمۡ شَيۡــًٔـا قَلِيۡلًا ۞ اِذًا لَّاَذَقۡنٰكَ ضِعۡفَ الۡحَيٰوةِ وَضِعۡفَ الۡمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيۡنَا نَصِيۡرًا ۞

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ کو اس چیز سے ہٹانے ہی لگے تھے جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی تاکہ آپ

ہماری طرف اس کے علاوہ دوسری بات کی نسبت کردیں، اور اس صورت میں وہ آپ کو اپنا دوست بنا لیتے ﴿۷۳﴾ اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ آپ ان کی طرف تھوڑے سے مائل ہو جاتے ﴿۷۴﴾ اس وقت ہم آپ کو زندگی میں اور موت کے بعد دہرا عذاب چکھاتے، پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار نہ پاتے ﴿۷۵﴾

معارف ومنازل

اس سے پہلے اندھوں کا بیان ہوا کہ ان کی آخرت تباہ ہے، وہ اس لئے بھی کہ وہ خود صراط مستقیم پر کیا آتے، وہ بڑی بڑی ہستیوں کو بھی اپنی حمایتی بنانے پر تلے ہوئے ہیں، چنانچہ کفار مکہ کی اس بے حیائی اور جسارت کو دیکھئے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس آخری نبی برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اللہ چھوڑ دیں، یا ہمارے مفاد میں اسے بدل ڈالیں۔ وہ کبھی حکومت و سرداری، کبھی دولت و مال، کبھی حسین عورتوں کی پیشکش کرکے لالچ دیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ آپ قرآن کا وہ حصہ جو ہمارے معبودوں کے خلاف ہے قرآن سے نکال دیں، کبھی کہتے ہیں ہم آپ کے تابع ہو جائیں گے بشرطیکہ آپ اپنے دین کے معاملے میں ہم سے مشورہ لیں گے، اور دیگر بہت سے خرافات بکتے تھے۔

تو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے واضح کیا کہ اگر آپ (العیاذ باللہ) بفرض محال ایسا کر گزرے تو بیشک وہ آپ کو گاڑھا دوست بنا لیتے، لیکن آپ کا جواب یہ تھا کہ خدا کی قسم! اگر تم چاند اتار کر میری ایک مٹھی میں دیں، اور سورج اتار کر دوسری مٹھی میں دیدیں، اور تمام روئے زمین کے سرخ وسفید میرے پاؤں پر نچھاور کرلیں تو تب بھی میں اپنے ربّ کا پیغام نہ چھوڑوں گا، نہ تبدیلی کروں گا، نہ تمہاری بات مانوں گا۔ ؎

میرے ہاتھوں پہ لاکر چاند وسورج بھی اگر رکھ دیں ☆ میرے پاؤں تلے روئے زمین کا مال وزر رکھ دیں
خدا کے حکم سے میں باز ہرگز رہ نہیں سکتا ☆ یہ بت جھوٹے ہیں، میں جھوٹوں کو سچا کہہ نہیں سکتا
دست از طلب ندارم تا کہ کام من برآید ☆ یا تن رسد بجانان یا جان زتن برآید

﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا﴾ تَرْكَنُ رَکون سے ہے، جو ادنیٰ جھکاؤ اور خفیف میلانِ قلب کو کہتے ہیں، اس کے ساتھ ﴿شَيْـًٔا قَلِيْلًا﴾ بڑھا دیا گیا، تو ادنیٰ سے ادنیٰ ترین مراد ہوگا۔ پھر ﴿لَقَدْ كِدْتَّ﴾ فرما کر اس کے وقوع کو مزید گھٹا دیا۔ یعنی اگر یہ بات نہ ہوتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی معصوم ہیں، جن کی

عصمت کی سنبھال حق تعالیٰ اپنے خصوصی فضل سے کرتا رہتا ہے، تو ان سرکش شریروں کی فریب بازیوں سے بہت ہی تھوڑا سا ادھر مائل ہونے کے قریب ہو جاتے، مگر انبیاء علیہم السلام کی عصمت کی کفالت و ذمہ داری ان کا پروردگار لے چکا ہے، اس لئے اتنا خفیف جھکاؤ بھی نہ پایا گیا۔

﴿لَوْلَآ﴾ یعنی انتفاء ثانی (جھکاؤ) بسبب وجود اوّل (یعني تثبت من جانب الله) نحوی قاعدہ کی رُو سے۔ یہی مطلب ہوتا ہے کہ اوّل امر کے وجود امر ثانی کے وجود کو روکتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذات گرامی میں تقویٰ کی فطری قوت کس قدر مضبوط اور ناقابل تسخیر ہے۔ دراصل یہ آپ ﷺ کے شرح صدر کا حصہ اور کمال ہے، جو کہ پورے جہاں کے عزم واستقلال سے کئی مرتبہ زیادہ ہے۔

﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَیٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَیْنَا نَصِیْرًا﴾ اس سے بھی آپ ﷺ کے فضل وشرف کا نہایت لطیف پیرایہ میں اظہار مقصود ہے۔ مقربین کے لئے حسب مراتب جہاں انعامات بڑے ہیں "نزدیکاں رابیش بود حیرانی" کے قاعدہ سے ان کی ادنیٰ غلطی اور کوتاہی پر عتاب بہت زیادہ ہوتا ہے، جیسے ازواج مطہرات کو فرمایا: ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ مَنْ یَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ یُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَیْنِ﴾ [الأحزاب: ۳۰] (اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کسی کھلی بے ہودگی کا ارتکاب کرے گی، اس کا عذاب بڑھا کر دوگنا کر دیا جائے گا، اور اللہ کے لیے ایسا کرنا بہت آسان ہے)۔

تو بتا دیا کہ آپ کا مرتبہ بہت ہی اونچا ہے، اگر بفرض محال ادنیٰ سے ادنیٰ غلطی ہو تو دنیا میں اور آخرت میں دوگنا عذاب چکھانا پڑے گا۔ اس آیت کے نزول کے بعد آپ ﷺ کثرت سے یہ دعاء پڑھتے رہے: اَللّٰهُمَّ لَا تَكِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ وَلَا أَقَلَّ... الخ۔ اے میرے ربّ! چشم زدن کے لئے بھی مجھ کو میرے نفس کے حوالہ نہ کیجئے، یعنی ہمیشہ اپنی حفاظت وکفالت میں رکھئے۔ چاہئے ہر مسلمان نماز کے بعد یہ دعا پڑھا کرے۔

وَاِنْ كَادُوْا لَیَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ لِیُخْرِجُوْكَ مِنْهَا وَاِذًا لَّا یَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۷۶﴾ سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا ﴿۷۷﴾

ترجمہ: اور قریب تھا کہ یہ لوگ اس سرزمین سے آپ کے قدم اکھاڑ دیتے تاکہ آپ کو اس سے نکال

دیتے، اور اگر ایسا ہو جاتا تو یہ لوگ آپ کے بعد بہت کم ٹھہر پاتے ﴿۷۶﴾ طریقہ ان لوگوں کا جن رسولوں کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا ہے، اور آپ ہمارے طریقہ میں تغیر (تبدیلی) نہ پائیں گے ﴿۷۷﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیت کے مضمون کے بعد اس آیت میں سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تسلی ہے، اور ساتھ ساتھ ایک اصول کا بیان ہے۔ فرمایا: ﴿وَاِنْ كَادُوْا لَيَسْتَفِزُّوْنَكَ مِنَ الْاَرْضِ﴾ اور قریب تھا کہ یہ اہل مکہ آپ کے قدم زمین سے متزلزل کر دیں۔

اِستِفزاز کا معنی ہلا دینا، کمزور کرنا، اکھاڑنا۔ یہ مشرکین آپ کے ساتھ ایسا سلوک کرنا چاہتے ہیں:

﴿لِيُخْرِجُوْكَ مِنْهَا﴾ تا کہ آپ کو مکہ کی بستی سے نکال دیں۔ سورۂ انفال میں ہے: ﴿وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ﴾[الأنفال: ۳۰] (اور وہ وقت یاد کرو جب کافر لوگ تمہارے خلاف منصوبے بنا رہے تھے کہ تمہیں گرفتار کر لیں، یا تمہیں قتل کر دیں، یا تمہیں (وطن سے) نکال دیں) کا بھی ذکر و بیان ہوا۔ پہلے وہ طرح طرح کے حربے استعمال کرتے رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نہ کسی طرح مصالحت کریں، جیسے سورۃ القلم اور سورۃ الکفرون میں اس کا بیان ہے۔ جب مایوس ہو گئے تو پیشکشوں کا سہارا لیا، مال وزر کی، اور پوری قوم کی سرداری کی پیش کش کی، حسین وخوبصورت عورتوں کے نکاح کی بھی پیشکش ہوئی، جب ہر طرف سے ناکام ہوئے، تو آخری مرحلہ پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زور زبردستی جلاوطن کرنے کا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا، اور طرح طرح کی دھمکیاں دینے لگے، تو فرمایا:

اگر وہ ایسا کرتے، اور بزور شمشیر آپ کو جلاوطن کرتے، تو:

﴿اِذًا لَّا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ تیرا ربّ انہیں آپ کے بعد کبھی سکون اور آرام کا موقع نہ دیتا، تو پھر یہ بھی آپ کے بعد نہیں ٹھہر سکیں گے، مگر بہت تھوڑا عرصہ۔ یہ ہے اصول اور قاعدۂ خداوندی۔ اگلی آیت میں اسی وعدہ وسنت کا بیان ہے۔

بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب قریش مکہ کی ایذا رسانیاں حد سے بڑھ گئیں، اور مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہوتا رہا۔ دوسری طرف سے انصار مدینہ کے مطالبوں میں تیزی آ گئی کہ آپ اسلامی نظام کے قیام کے لئے جتنا جلد

ممکن ہو سکے ہمارے پاس تشریف لائیں، ہم ہرطرح کی جانی مالی قربانی دینے کا عہد کر چکے ہیں۔ تو ان نا مساعد حالات کے پیشِ نظر حق سبحانہ وتعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت مدینہ کا حکم دے دیا، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کی تیاری مکمل کر لی، اور ہجرت کے لئے دشمن کے حصار اور صفوں کو چیرتے ہوئے غارِ ثور پہنچے، اور تین روز قیام کے بعد وہاں سے روانہ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے۔

سمجھو کہ مدینہ طیبہ کے افق پر شمس نبوت کا طلوع ہوا۔ تو پھر دنیا نے دیکھا، اور تاریخ نے اپنے اوراق میں رقم کیا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ مکرمہ چھوڑنے کے بعد ابھی دو سال گزرنے بھی نہ پائے تھے کہ وعدہ پورا ہونے لگا کہ:

﴿لَا يَلْبَثُوْنَ خِلٰفَكَ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ کہ واقعہ بدر کا ظہور ہوا، جہاں قریش قوم کے سارے جگر گوشے، اور نامی گرامی سرمایہ، یعنی ان کے سردار جہنم رسید ہونے کے لئے میدان بدر فروکش ہوئے۔

ان کی سرکشی اور غرور قابلِ دید تھا، وہ اپنے معبود لات وعزّیٰ پر قسم کھاتے ہوئے آئے تھے کہ آج اسلام دین الٰہی کا نام ونشان تک مٹا کر دم لیں گے۔ دوسری طرف یہ ہو رہا تھا کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جماعۃ المسلمین سے فرما رہے تھے، اور میدانِ بدر میں ائمۃ الکفر کی موت کی جگہ متعین فرما رہے تھے، ان میں سے ہر ایک کی واصلِ جہنم ہونے کی جگہ پر نشان لگوا کر، یا ہاتھ مبارک کے اشارے سے سمجھا رہے تھے۔

حدیث شریف میں آیا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا یہ انتقام اتنا سخت تھا کہ لوگوں کی عقول اس کے سمجھنے سے قاصر رہی، بلکہ قیامت تک آنے والے اس کی سمجھ نہیں پائیں گے، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ان کی موت کی نشان زدہ جگہ سے ایک انچ بھی اِدھر اُدھر واقع نہ ہوئی۔ کافروں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں کی اتنی کمزور اور نہتے بے سرو سامان جماعت اپنے سے تین چار گنا بڑے لشکر کو جو کہ ہر قسم کے اسلحہ سے لیس ہے شکست فاش دے کر ان پر غالب آجائے گی۔ مگر یہ اللہ تعالیٰ شانہ کا وعدہ تھا جو پورا ہو کر رہا۔

﴿سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا﴾ یہ ان رسولوں کا دستور ہے جنہیں ہم نے آپ سے پہلے بھیجا، جب بھی کسی رسول کی قوم نے اپنے نبی کو ہجرت پر مجبور کیا، اور اسے اپنی بستی سے نکال دیا، تو پھر وہ لوگ بھی عذاب الٰہی کا شکار ہو کر ہلاک ہو گئے۔ مشرکین مکہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ پیش آیا، جب انہوں نے حضرت رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت پر مجبور کیا تو وہ بھی کسی وقت چین وآرام نہیں پائے، اور ہر طرح تباہی سے دوچار رہے۔ جنگ بدر نے ان کی کمر مکمل توڑ دی، یہاں تک کہ فتح مکہ نے انہیں مکمل ملیامیٹ کر کے رکھ دیا۔

﴿وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلًا﴾ یہ ہمارے پہلے رسولوں کا دستور ہے، آپ ہمارے اس دستور میں کوئی تبدیلی نہیں پائیں گے۔ یہی قانون مشرکین مکہ کے لئے بھی ہے کہ آپ کے نکلنے کے بعد وہ بھی اس بستی میں آرام سے نہیں رہیں گے، چنانچہ وہ ڈیڑھ سال کے عرصہ میں اپنی شان وشوکت کھو بیٹھے، اور تباہ ہو گئے۔

اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا﴿۷۸﴾ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا﴿۷۹﴾

ترجمہ:۔ آفتاب ڈھلنے کے بعد سے رات اندھیرا ہونے تک نمازیں قائم کیجئے، اور فجر کی نماز بھی، بلاشبہ فجر کی نماز حاضر ہونے کا وقت ہے﴿۷۸﴾ اور رات کے حصہ میں نماز تہجد پڑھا کیجئے، جو آپ کے لئے زائد چیز ہے، عنقریب آپ کا ربّ آپ کو مقام محمود میں جگہ دے گا﴿۷۹﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں پریشانیوں کا روحانی علاج اور ان کا بہترین انجام بتایا جارہا ہے، جس کے طفیل ہر پریشانی دور ہوجاتی ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس بارے میں فرمایا: ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ [البقرۃ: ۱۵۳] (اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔ اور سورۂ حجر میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّكَ يَضِيْقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ﴾ [الحجر: ۹۷] (یقیناً ہم جانتے ہیں کہ جو باتیں یہ بناتے ہیں، ان سے تمہارا دل تنگ ہوتا ہے۔ تو تم اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرتے رہو، اور سجدہ بجالانے والوں میں شامل رہو)۔

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشاد ہے: اَلصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّيْنِ۔ اسی طرح یہ بھی فرمایا: اَلصَّلٰوةُ أُمُّ الْعِبَادَاتِ۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب بھی کوئی پریشانی لاحق ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کثرت سے نماز پڑھا کرتے۔ [مشکوٰۃ] عام طور پر قرآن مجید میں نماز کا حکم جمع کے صیغہ کے ساتھ وارد ہے، اور یہاں واحد کا صیغہ ذکر فرما کر اس پر مقام محمود کے قیام کا ترتب ہو رہا ہے کہ آپ اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام کریں، جس کے نتیجے میں تیرا ربّ تجھے مقام محمود کا شرف عطاء فرمائے گا، جس پر اوّلین وآخرین سب رشک کریں گے۔

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ دُلُوك، یہ لفظ مشترک ہے، یعنی اس کے دو معنی ہیں، اس کا اصل معنی مائل ہونے کا ہے۔ مجمع البحار اور لغات القرآن میں ہے کہ اصل معنی میلان ہے، اور اس کا اطلاق زوال اور غروب دونوں پر ہے۔ حضرت ابن عباس، ابن عمر، ابو برزہ، شعبی، حسن، مجاہد اور عطا رضی اللہ عنہم نے دُلُوك الشَّمْس سے زوال شمس مراد لیا ہے۔ اور حضرت علی، اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے غروب شمس سے مراد ہے۔

لفظ غَسَق جو کہ سورۃ الفلق میں بھی موجود ہے، اس سے مراد سخت تاریکی ہے۔ بعضوں نے اس سے غروب کے بعد ابتداء تاریکی مراد لیا ہے۔ مطلب واضح ہے کہ ابتداء تاریکی سے لے کر سخت تاریکی تک سب پر غسق کا اطلاق ہوتا ہے۔ دُلُوک سے زوال مراد لینے کی صورت میں آیت کریمہ میں پانچوں نمازوں کا تذکرہ مقصود ہے، کیونکہ زوال شمس سے لے کر رات کی خوب زیادہ تاریکی آنے تک نمازیں پڑھنے میں ظہر، عصر، مغرب اور عشاء سب کا حکم آ گیا، اور فجر کی نماز کا ذکر مستقل قُرْاٰنَ الْفَجْرِ میں فرما دیا، کیونکہ یہ وقت نیند سے اٹھنے کا ہوتا ہے، اس لئے اس کو مستقل ذکر فرمایا۔

چونکہ فجر کی نماز میں جہر کے ساتھ سب نمازوں سے زیادہ لمبی قراءت پڑھی جاتی ہے، اس لئے اسے قُرْاٰنَ الْفَجْرِ فرمایا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالعموم فجر کی نماز میں چالیس سے لے کر سو آیات تک تلاوت فرماتے تھے، اور امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بکثرت فجر کی نماز میں سورۂ یوسف مکمل تلاوت فرماتے تھے، اور اتنے زور سے روتے تھے کہ آپ کے رونے کی آواز آخری صفوں میں سنی جاتی تھی۔

صلوٰۃ فجر اور صلوٰۃ عصر میں فرشتوں کا اجتماع:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے آگے پیچھے آتے رہتے ہیں، اور نماز فجر اور نماز عصر میں جمع ہو جاتے ہیں، پھر وہ فرشتے جو رات کو تمہارے ساتھ رہے وہ اوپر جاتے ہیں تو ان کا رب جل شانہ ان سے دریافت فرماتے ہیں، حالانکہ وہ اپنے بندوں کو ان سے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس حال میں چھوڑا کہ وہ نماز میں مشغول تھے، اور جب ہم ان کے پاس گئے تھے اس وقت بھی وہ نماز میں مشغول تھے۔ [بخاري]

فرشتے عصر اور فجر دونوں ہی نمازوں میں حاضر ہوتے ہیں، لیکن آیت کریمہ میں خاص طور پر فجر کے وقت کی

حاضری کا ذکر اس لئے فرمایا کہ نماز فجر میں نیند چھوڑ کر مسجد میں حاضر ہونا نفسوں پر بہت شاق ہوتا ہے، جسے ہر آدمی پورا نہیں کرسکتا، اور اس وقت اٹھنا اور نماز کا اہتمام کرنا کسی جہاد سے کم نہیں (جہاد مع الشیطان) اس لئے بندوں کو خبردار فرمایا کہ نیند کو چھوڑو، اپنے پروردگار کے حضور حاضری دیدو، اور پوری رات نماز پڑھنے کا ثواب حاصل کرو، اور فرشتوں کی کتاب میں نام درج کراؤ۔

﴿وَمِنَ الَّيۡلِ فَتَهَجَّدۡ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ اور رات کے حصے میں نماز تہجد پڑھا کیجئے، جو آپ کے لئے زائد چیز ہے۔ لفظ تَهَجَّدۡ هُجُود سے ماخوذ ہے، هُجود سونے کو کہتے ہیں، اور تہجد ترک النوم یعنی سونے کے بعد اٹھنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یہ اضداد میں سے ہے، یعنی نیند کو بھی کہتے ہیں، اور ترک نیند کو بھی۔

تہجد کے بارے میں ایک مختصر تحقیق:

سورۂ مزمل کا نزول بالکل ابتداء نبوت کے ساتھ ہے، اس میں نماز تہجد کی فرضیت کا بیان بھی ہے، اور آخری رکوع میں اس فرضیت کے نسخ کا بھی بیان ہے۔ سورۂ مزمل کے نزول کے وقت پانچ نمازیں تو فرض نہ تھیں، تقریباً دس سال بعد شب معراج شریف میں پانچوں نمازیں فرض ہوئیں۔ مزمل شریف کے نزول کے ساتھ سب پر نماز تہجد فرض ہوئی، اور ایک سال بعد دوسرے رکوع کے نزول کے ساتھ عام امت سے فرضیت منسوخ ہوگئی۔

اور اس میں اختلاف رہا کہ سرور عالم ﷺ سے بھی تہجد کی فرضیت منسوخ ہوگئی، یا آپ ﷺ کے حق میں اس کی فرضیت بدستور قائم رہی۔ اور اس آیت میں نَافِلَةً لَّكَ سے یہی معنی ہیں کہ نماز تہجد آپ ﷺ کے ذمہ اُمت کے علاوہ ایک زائد فرض ہے۔ مگر تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ کئی وجوہ سے صحیح نہیں:

اوّل یہ کہ فرض کو نَافِلَةً کہنا، یعنی فرض کو نفل سے تعبیر کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر کہا جائے کہ مجازاً ہے، تو یہ ایک ایسا مجاز ہوگا جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ دوسری احادیث صحیحہ میں صرف پانچ نمازوں کی تعیین کے ساتھ فرض ہونے کا ذکر ہے، اور ایک حدیث میں اس کے آخر میں یہ بھی مذکور ہے کہ شب معراج میں جو اوّل پچاس نمازیں فرض کی گئی تھیں، پھر تخفیف کر کے پانچ کردی گئیں تو اگرچہ عدد گھٹا دیا گیا، مگر ثواب پچاس ہی کا ملے گا۔ اور پھر فرمایا: ﴿مَا يُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَىَّ﴾ [ق:۲۹] (یعنی میرا قول بدلا نہیں کرتا)۔ جب پچاس کا حکم دیا تھا تو ثواب پچاس ہی کا دیا جائے گا، اگرچہ عمل میں کمی کردی گئی، لوگوں کی سہولت کے لئے، مگر ثواب میں کمی نہیں ہوگی۔ ان روایات کا حاصل یہی ہے کہ آنحضرت ﷺ پر اور اُمت پر پانچ نمازوں کے علاوہ کوئی نماز (مثلاً تہجد) فرض نہیں ہے۔

اسی طرح تفسیر مظہری میں صحیح اسی کو قرار دیا ہے کہ جب تہجد کی فرضیت اُمت سے منسوخ ہوئی، تو سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھی منسوخ ہوگئی، اور سب کے لئے نفل رہ گئی۔ اس صورت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خصوصیت کیا ہے کہ نفل ہونا تو سب کے لئے ثابت ہے، پھر نَافِلَةً لَّكَ فرمانے کا کیا مطلب ہو گا؟

جواب یہ ہے کہ حسب تصریح احادیث تمام اُمت کی نفلی عبادات ان کے گناہوں کا کفارہ، اور فرض نمازوں میں جو کمی یا کوتاہی رہ جائے ان کی تکمیل کا کام دیتی ہیں، مگر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہیں، اور نماز کے آداب میں کوتاہی سے بھی معصوم ہیں، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حق میں نفلی عبادت بالکل زائد ہی ہے، جو کسی کوتاہی کا تدارک نہیں، بلکہ محض زیادت تقرب کا ذریعہ ہے۔ [مظهري، قرطبي]

فضائل وبرکات نمازِ تہجد:

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں نماز تہجد جو پڑھی جاتی ہے، جس وقت خصوصی رحمتوں کا نزول سماء دنیا پر ہو رہا ہوتا ہے، اور تمام دنیا کے حتی کہ بادشاہوں اور حکمرانوں کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں، نیز تمام لوگ خواب وغفلت میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں، ایسے وقت میں میٹھی نیند کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ شانہ کے حضور میں سجدہ ریز ہونا، اور دعاء ومناجات، الحاح وزاری کرنے والا بڑا خوش قسمت ہوگا، وہ اپنی قبر کو اتنا روشن اور فراخ پائے گا جس کا اندازہ نہ ہو، اور پل صراط پر بجلی کی طرح گزر کر جنت میں پہنچ جائے گا۔

حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تحقیق جنت میں ایسے بالاخانے ہیں جن کا باہر کا حصہ اندر سے، اور اندر کا حصہ باہر سے نظر آتا ہے (شیش محل بنگلے) یہ بالاخانے اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے تیار کئے ہیں جو نرمی سے بات کریں، اور محتاجوں کو کھانا کھلائیں، اور لگاتار روزے رکھا کریں، اور رات کو نماز پڑھیں، جبکہ لوگ سارے سو رہے ہوں۔ [مشکوٰۃ بحوالہ بیہقی، شعب الایمان]

اسی طرح حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم رات کے قیام کو لازم پکڑ لو، کیونکہ تم سے پہلے جو صالحین گزرے ہیں یہ ان کا طریقہ وعمل رہا ہے، اور تمہارے ربّ کی نزدیکی کا سبب ہے، اور تمہارے گناہوں کا کفارہ ہے، اور گناہوں سے روکنے والی ہے۔ [ترمذي]

اور بکثرت صحیح احادیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بے گناہ اور طاہر ومطہر، معصوم ہونے کے باوجود

آپ ﷺ کا دائمی معمول رہا کہ لمبی طویل قراءت کے ساتھ نمازِ تہجد ادا فرماتے، یہاں تک کہ قدم متورم ہو جاتے، اور کثرتِ قیام سے پھٹ جاتے، اور آپ ﷺ شکر گزار بندہ بننے کا مظاہرہ فرماتے۔

نمازِ تہجد کے بارے میں مزید تفصیلات دیکھنی ہوں تو سورۂ مزمل کا مطالعہ کریں۔

﴿عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا﴾ عنقریب آپ کو آپ کا ربّ جلّ شانہ شافعِ محشر بنا کر مقامِ محمود میں کھڑا کر دے گا۔ مقامِ محمود سے مراد مقامِ شفاعتِ کبریٰ ہے، جو عزّت و شرف اور کرامت کا اعلیٰ ترین مقام ہے، جو بنی آدم میں سوائے سرورِ کائنات ﷺ کے کسی دوسری ہستی کو نصیب نہیں ہوگا۔ اس کی تفسیر میں صحیح وہ ہے جو احادیثِ صحیحہ میں خود سرورِ عالم ﷺ سے منقول ہے۔

یہ مقامِ شفاعتِ کبریٰ کا ہے کہ میدانِ حشر میں جس وقت تمام بنی آدم جمع ہوں گے، اور سب لوگ پریشان اور بے چینی میں سر جھکائے تڑپ رہے ہوں گے، اور پسینے میں ناف تک، اور کچھ سینے اور منہ تک شرابور ڈوبے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ کیفیت نہایت سخت المناک، ناقابلِ برداشت ہوگی۔ آخر تمام اہلِ محشر حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں شفاعت کے لئے التجاء اور خواست پیش کریں گے، اور آپ علیہ السلام معذرت کر کے کسی اور کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے، پھر باری باری سے اولوالعزم انبیاء حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے پاس آئیں گے، اور یہ سارے حضرات معذرت کریں گے، اور حضرت امام الانبیاء ﷺ کے پاس جانے کا مشورہ دیں گے۔

تب لوگ الحاح وزاری کے ساتھ آپ ﷺ کی خدمتِ عالی میں حاضر ہوں گے، اور ختمِ نبوت جیسے عظیم منصب کا واسطہ پیش کریں گے۔ آپ ﷺ سارا ماجرا سن کر ارشاد فرمائیں گے: أنا لَهَا أنا لَهَا. میں ہی شفاعت کا حقدار اور سزاوار ہوں، میں ہی یہ کام انجام دوں گا، چنانچہ آپ ﷺ عرشِ الٰہی کے سایہ میں جا کر سجدہ ریز ہو جائیں گے، اور اپنے ربّ جلّ شانہ کی حمد و ثناء ایک مخصوص کلمات کے ساتھ، مخصوص انداز اور خاص طرز پر پیش کریں گے۔ فرمایا: وہ کلمات ابھی میرے ذہن میں نہیں، وہاں مجھے الہام ہوں گے۔ حضرت جبار جلّ شانہ ارشاد فرمائیں گے: یَا محمّد! اِرْفَعْ رَاْسَکَ سَلْ تُعْطَهْ وَقُلْ تُسْمَعْ وَاشْفَعْ تُشَفَّع. اے محمد! سر اٹھاؤ، مانگو جو مانگتا ہے، جو سوال کرو گے پورا ہو جائے گا، جو شفاعت کرو گے قبول کر لی جائے گی۔ یہی مطلب ہے آیت کریمہ: ﴿عَسٰۤی اَنۡ یَّبۡعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحۡمُوۡدًا﴾ کا۔

یہ وہ شفاعت کبریٰ ہے جو کہ سید المرسلین رحمۃ للعٰلمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے، اسی شفاعت عظمیٰ کا ثمرہ و فائدہ تمام موقف والوں کو حاصل ہوگا، مشرک، کافر، منافق، یہودی نصرانی، صابی، مجوسی، ہندو، بدھ مت، پارسی، غرض بے شمار تمام مذاہب باطلہ ماننے والے اس سے مستفید ہوجائیں گے۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت جس طرح عمومی ساری خلقت کے لئے ہے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت بھی عمومی ساری خلقت کے لئے ہوگی۔ صَلّی اللہ عَلَیہ وَآلہٖ وَصَحبہٖ وَسلَّم۔

صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، اور مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سے، اور مسند احمد میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت سے، اور بزار و بیہقی نے حضرت عبدالرحمٰن بن عقیل کی روایت سے بیان کیا کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ہر پیغمبر کی ایک خصوصی مقبول دعا ہوتی ہے، چنانچہ ہر پیغمبر نے اپنی دعاء میں عجلت کی (اور وہ دعاء دنیا میں مقبول ہوگئی) لیکن میں نے اپنی وہ خصوصی دعاء امت کی شفاعت کے لئے ذخیرہ کرلی، یعنی محفوظ رکھ کر دنیا میں نہیں مانگی۔

امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: یہ حدیث معنی کے لحاظ سے متواتر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: شَفَاعَتِي لِأَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ أُمَّتِي۔ میری شفاعت میری اُمت کے ان لوگوں کے لئے ہوگی جنہوں نے کبائر معاصی کا ارتکاب کیا۔ اس سلسلہ شفاعت میں مختلف سیاق وسباق کے ساتھ بے شمار احادیث وارد ہیں، جن کو فتح الباری میں کتاب الرقاق، کتاب التوحید کے ضمن میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے تفصیل وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

صحیح بخاری میں حدیث شفاعت حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ دونوں سے مروی ہے، اس میں یہ تصریح ہے کہ شفاعت کبریٰ کے علاوہ مختلف قسم کے گناہگاروں کے لئے چار قسم کی شفاعتیں ہوں گی۔ یہ حدیث صحیح بخاری، جلد دوم، کتاب التوحید میں بایں الفاظ موجود ہے: ثُمَّ أَعُودُ الرَّابِعَةَ فَأَحْمَدُهُ بِتِلْكَ الْمَحَامِدِ، ثُمَّ أَخِرُّ لَهُ سَاجِدًا فَيُقَالُ: يَا مُحَمَّدُ! اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ يُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ، فَأَقُولُ: يَا رَبِّ! اِئْذَنْ لِي فِيمَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ. فَيَقُولُ: وَعِزَّتِي وَجَلَالِي وَكِبْرِيَائِي وَعَظَمَتِي لَأُخْرِجَنَّ مِنْهَا مَنْ قَالَ: لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ. [بخاري]

انبیاء کرام علیہم السلام، صلحاء، شہداء اور علماء کی شفاعت:

قیامت کے دن اللہ ربّ العزّت کے حکم واجازت سے کئی قسم کی شفاعتیں ہوں گی، لیکن ہر قسم کی شفاعتوں

کے حقدار اہل توحید ہوں گے، کفار و مشرکین کے لئے کسی قسم کی شفاعت نہیں ہوگی۔ مختصر اور جزوی شفاعتوں کی بڑی فہرست ہے۔ انبیاء علیہم السلام اپنی اپنی اُمتوں کے لئے جزوی شفاعت کریں گے، اسی طرح صلحاء و پاکباز حضرات اپنے متعلقین کے لئے شفاعت کریں گے، کہیں گے: اے ہمارے پروردگار! یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں، دنیا میں ہمارے ساتھ روزہ رکھتے تھے، نماز پڑھتے تھے، زکوٰۃ وصدقات دیتے تھے، اچھے اچھے اعمال کرتے تھے، ان کی مغفرت فرما، پس ان کی شفاعت قبول ہو جائے گی۔

اسی طرح قرآن کریم بھی اپنے پڑھنے والوں کے لئے، نماز میں سننے والوں کے لئے شفاعت فرمائے گا، جو قبول ہو جائے گی۔ ماہ رمضان المبارک روزہ داروں کے لئے، اور کعبۃ اللہ شریف اپنے زائرین کے لئے، صدیقین، قراء وحفاظ کرام اپنے ساتھیوں کے لئے، اور نابالغ بچے اپنے والدین کے لئے شفاعت کریں گے، پس ان سب کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ [مشکوٰۃ المصابیح وغیرہ]

ابن ماجہ اور بیہقی میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز پہلے انبیاء علیہم السلام، پھر علماء، پھر شہداء شفاعت کریں گے۔ مسند فردوس دیلمی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عالم سے کہا جائے گا کہ آپ اپنے شاگردوں کے لئے شفاعت کر سکتے ہیں، اگرچہ ان کی تعداد آسمان کے ستاروں کے برابر ہو۔ اور ابوداؤد اور ابن حبان نے بروایت حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ مرفوعاً نقل کیا ہے کہ شہید کی شفاعت اس کے خاندان کے ستر آدمیوں کے لئے قبول کی جائے گی۔

مسند احمد، طبرانی اور بیہقی نے بسند صحیح حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت کے ایک آدمی کی شفاعت پر قبیلہ ربیعہ اور قبیلہ مضر کے تمام لوگوں سے زیادہ آدمی جنت میں داخل کئے جائیں گے (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا نام نہیں بتایا)۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خود شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عمومی اور خصوصی دس شفاعتیں فرمائیں گے، تو پھر علماء، وشہداء، وصلحاء کی شفاعت کی کیا ضرورت؟ اور اس کی صورت کیا ہوگی؟

صاحب مظہری نے فرمایا کہ غالباً اس کی صورت یہ ہوگی کہ تمام شفاعت کرنے والے اپنی اپنی شفاعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کریں گے، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بارگاہ ربّ العزّت میں شفاعت فرمائیں گے۔

شفاعت کی اقسام:

آنحضرت شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کُل شفاعتوں کی تعداد دس ہیں، جن میں سے دو شفاعتیں وہی ہیں، جو صحیح بخاری کے حوالہ سے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں بیان ہوئیں، جس میں فرمایا: **ثُمَّ اَعُوْدُ الرَّابِعَة۔(الحدیث)**

پنجم شفاعت کبریٰ عامہ: جس سے اپنے، پرائے، مؤمن، مشرک، کافر، غرض تمام اہل موقف مستفید ہوں گے، اور ربّ العزّت عزّ شانہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نوازے گا، اور سارے اہل محشر، ساری خلقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مدح وثناء بیان کرے گی، یہی مقام محمود ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مخصوص مقام وشرف ہے، جسے قرآن کریم اور احادیث نے تواتر کے ساتھ بیان کیا، اور جسے ستائیس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے روایت کی۔

ششم: بعض خوش نصیبوں کے لئے بغیر حساب کے جنت میں داخل کرنے کی شفاعت فرمائیں، جو قبول کی جائے گی۔

ہفتم: وہ موحّد مسلمان جو اپنے گناہوں کے باعث دوزخ کے عذاب کے مستحق ہوں گے، مگر وہ دخول جہنم سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت کی بدولت بخش دیئے جائیں گے۔

ہشتم: اہل جنت کے مدارج ودرجات عالیہ تک ترقی کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شفاعت فرمائیں گے، اور ان کے حق میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

نہم: پل صراط پر اپنی اُمت کی شفاعت فرمائیں گے۔ پل صراط عبور کرنا اتنا سخت اور خطرناک ومشکل ہے جس کے بیان کرنے سے زبان قاصر ہے، اور لکھنے سے قلم عاجز ہے، اور تصور سوچنے سے قوت عقلیہ جواب دے دیتی ہے۔ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خصوصی شفاعت نہ فرمائیں تو شاید معدودے چند شخصیتوں کے سوا کسی کے لئے گزرنا ممکن نہ ہو، پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شفاعت کے طفیل عام مؤمن موحّدوں کا گزرنا ممکن ہو جائے گا۔

دہم شفاعت عامہ: یہ بھی شفاعت عظمیٰ ہوگی، جس سے تمام امتوں کے موحّد مسلمان مستفیض ہوں گے۔ یہ عظیم شفاعت جنت کے دروازے پر دخول جنت سے پہلے ہوگی، جہاں اوّلین وآخرین تمام اُمتوں کے مؤمن موحّد جمع ہو جائیں گے، مگر جنت کا دروازہ بند ہوگا، کھلے گا نہیں، پس سارے لوگ پہلے حضرت آدم، پھر حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے پاس باری باری سے رجوع کریں گے، اور یہ سارے حضرات **اِذْهَبُوْا اِلٰى غَيْرِىْ** اور **اِذْهَبُوْا اِلٰى مُحَمَّد** کہیں گے، پس میں عرش الٰہی کے سایہ میں سجدہ ریز ہو کر الحاح

وزاری شروع کروں گا، جس طرح پہلے شفاعت کبریٰ میں کیا تھا، پس وہی جواب ملے گا جس طرح پہلے ملا تھا، حتی کہ جنت کا داروغہ میرے لئے جنت کا دروازہ کھول دے گا۔ [ابن کثیر، تفسیر سورۃ الزمر] یہ کُل دس شفاعتیں ہوں گی۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر ☆ بروئے مصطفیٰ شرمندہ باشی

واللہ اعلم

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِيْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِيْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ﴿۸۰﴾
وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ
لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا
مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَئُوْسًا ﴿۸۳﴾ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اور آپ یوں دعا کیجئے کہ اے ربّ! مجھے ایسی جگہ میں داخل کیجئے جو خوبی کی جگہ ہو، اور مجھے خوبی کے ساتھ نکالئے، اور میرے لئے اپنے پاس سے ایسا غلبہ عطاء فرمائیے جس کے ساتھ مدد ہو ﴿۸۰﴾ اور آپ یوں کہہ دیجئے کہ حق آگیا، اور باطل چلا گیا، بلاشبہ باطل جانے ہی والا ہے ﴿۸۱﴾ اور ہم ایسی چیز، یعنی قرآن نازل کرتے ہیں جو شفاء ہے، اور رحمت ہے مؤمنین کے لئے، اور وہ ظالموں کے نقصان ہی میں اضافہ کرتا ہے ﴿۸۲﴾ اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں وہ اعرض کر لیتا ہے، اور رُخ بدل کر دُور ہو جاتا ہے، اور جب اسے تکلیف پہنچ جائے تو نا اُمید ہو جاتا ہے ﴿۸۳﴾ آپ فرما دیجئے کہ ہر شخص اپنے طریقے پر کام میں لگا ہوا ہے، سو تمہارا ربّ خوب جانتا ہے جو زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے ﴿۸۴﴾

معارف ومنازل

مُدْخَلَ صِدْقٍ سے مراد مدینہ طیبہ، مُخْرَجَ صِدْقٍ سے مراد مکہ معظمہ ہے۔ الْحَق سے مراد اسلام ہے، الْبَاطِلَ سے مراد کفر ہے۔

یہ پانچ آیات ہیں: پہلی آیت سفر ہجرت کے بارے میں ہے، دوسری آیت میں فتح مکہ کی پیشینگوئی اور خوشخبری ہے، تیسری آیت میں قرآن کریم کی حقانیت وفضیلت کا بیان ہے، چوتھی آیت میں انسان کی ناشکری اور

تنگدلی کا بیان ہے، پانچویں آیت میں مؤمنین اوران کے اعمالِ صالحہ کی مدح کا، اور مشرکین اوران کے بُرے اعمال کے ذم کا بیان ہے۔

پہلی آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکہ معظّمہ سے مدینہ منورہ کی طرف جب ہجرت کا حکم ملا، اس وقت یہ آیت کریمہ اتری، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دعا تلقین کی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حضور یوں التجاء کریں کہ اے ربّ! مجھے بہترین داخل ہونے کی جگہ داخل فرمائیں، اور میرا اپنے شہر سے نکلنا بھی میرے لئے اچھا بنا دیجئے، یعنی میرے دخول وخروج دونوں کامیابی کے ساتھ ہوں، اور انجام بخیر ہو، اور میرے لئے اپنے پاس سے ایسا غلبہ عطاء فرمایئے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت ومدد نمایاں ہو۔[ترمذي كتاب التفسير]

مُدْخَلَ صِدْقٍ سے جائے ہجرت مدینہ منورہ، اور مُخْرَجَ صِدْقٍ سے مکہ معظّمہ مراد ہے۔ صِدق عربی زبان میں ہر ایسے فعل کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ظاہراً اور باطناً بہتر اور درست ہو۔ قرآن کریم میں قَدَمَ صِدْقٍ. لِسَانَ صِدْقٍ اور مَقْعَدَ صِدْقٍ اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔

آنحضرت سرورعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی دعاء پڑھتے ہوئے مکہ معظّمہ سے بخیر وعافیت روانہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں رہے، دشمن نے ہر طرح کی تدبیر کی، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی نظر سے پوشیدہ رہے، حتی کہ انہوں نے اس بارے میں سو اونٹوں کا انعام بھی رکھا کہ جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر اور پتہ بتلا دے۔ سراقہ بن مالک اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے، مگر سراغ رسانی کی بجائے حامی بن کر واپس ہوئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحمدہٖ تعالیٰ پورے اطمینان کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچے۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعاء قبول ہوئی۔ فَصلَّی اللهُ عَلَيهِ وَعلٰی اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ عَدَدَ مَعلُومَاتِ اللهِ.

﴿وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا﴾ اور بنا دے میرے لئے اپنی طرف سے ایک غلبہ، اقتدار و سلطنت اور تسلّط، جس کے ساتھ تیری مدد شامل حال ہو۔ اس سے مراد اسلام کا ظاہری غلبہ ہے، کیونکہ دنیا میں کوئی قانون اس وقت تک نافذ العمل نہیں ہوسکتا جب تک اس کے پیچھے قوت نافذہ نہ ہو۔ قرآنی آیات واحکام کے نفاذ میں جب تک سلطنت وامارت کی قوت نہ ہو، صرف وعظ کرنے سے اسلام نافذ نہیں ہوتا۔ جب سیاسی طاقت نہ ہو محض وعظ وتذکیر سے اسلام نافذ نہیں ہوتا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ حکومت کی طاقت سے ان چیزوں کا سدّ باب کردیتا ہے جن کا سدّ باب قرآن سے نہیں کرتا۔ اِنَّ اللهَ لَيَضَعُ بِالْاِسلَامِ مَالَا يَضَعُ بِالْقُراٰنِ. آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ دعا قبول ہوگئی،

اور مدینہ میں اسلامی سلطنت اللہ تعالیٰ نے قائم کی۔ الحمد للہ

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ اس دوسری آیت میں فتح مکہ کا ذکر ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر (اسی آیت کریمہ کو تلاوت فرماتے ہوئے) مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ اس وقت بیت اللہ شریف کے چاروں طرف تین سو ساٹھ بُت نصب تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں اپنے ہاتھ کی چھڑی سے ایک ایک بُت کے سینے میں مارتے ہوئے سب کو گراتے رہے۔ [متفق علیه] اور یہی آیت تلاوت فرماتے رہے، اور یہ بھی پڑھتے رہے: جَاءَ الْحَقُّ وَمَايُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَايُعِيدُ. [بخاري]

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَشِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ یہ تیسری آیت ہے، جو کہ صداقت وحقانیت قرآن کے بارے میں ہے۔ قرآن کریم ﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ﴾ مسلمانوں کے لئے ہدایت ہے، ظاہری اور باطنی تمام بیماریوں کے لئے شفاء اور رحمت ہے، اور مشرکین ظالمین پر حجت ہے، جو اس کو نہیں مانتے، اور اس کی تکذیب کرتے ہیں، اس کے انوار وبرکات کا انکار کرتے، اور اس کی اصلاحی ہدایات سے دور بھاگتے ہیں۔ پس ان کا یہ طریقہ خود ان کے لئے بربادی وتباہی اور خسارے کا سبب ہے۔ جیسے جیسے اس کی آیتوں کا نزول ہوتا ہے یہ اس کی تکذیب کرتے رہتے ہیں، اور اپنے خسارے میں اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں۔

سورۂ توبہ میں ارشاد ہے: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ. وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ [التوبة: ۱۲۴] (تو جو لوگ ایمان لائے ہیں ان کے ایمان میں تو اس سورت نے واقعی اضافہ کیا ہے، اور وہ خوش ہوتے ہیں۔ اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے، تو اس سورت نے ان کی گندگی میں کچھ اور گندگی کا اضافہ کر دیا ہے، اور ان کی موت بھی کفر ہی کی حالت میں آتی ہے)۔ پھر ارشاد ہوا:

﴿وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ﴾ یہ چوتھی آیت انسان کی تنگدلی اور ناشکری کے بیان میں ہے۔ فرمایا: جب ہم اس پر انعام فرماتے ہیں، اور نعمت عطاء کرتے ہیں، تو وہ اعراض کرتا ہے، اور اعراض بھی تھوڑا سا نہیں، خوب زیادہ اعراض کرتا ہے، وہ یہ کہ غرور وسرکشی کے ساتھ رُخ پھیر کر دوسری طرف مڑ جاتا ہے، اور جب اسے کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے تو سراسر مایوس ہو جاتا ہے۔ سورۂ ہود میں فرمایا: ﴿وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَـُٔوْسٌ كَفُوْرٌ﴾ [هود: ۹] (اور اگر ہم انسان کو اپنی مہربانی کا مزہ چکھا کر پھر اس

سے چھین لیتے ہیں تو وہ نا اُمید اور ناشکرا ہو جاتا ہے) اور اگر اس کو کسی تکلیف کے بعد جو کہ اس پر واقع ہوئی ہو کسی نعمت کا مزہ چکھا دیں، تو کہنے لگتا ہے کہ میرا سب درد دکھ رخصت ہوا، وہ اترانے لگتا ہے، شیخی وغرور کرتا ہے، مگر جو لوگ مؤمن، مستقل مزاج ہیں، اور نیک کام کرتے ہیں وہ ایسے نہیں ہوتے، ایسے لوگوں کے لئے بڑی مغفرت اور بڑا اجر ہے۔

﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ﴾ یہ پانچویں آیت ہے، جس میں مؤمنین کی مدح وستائش ہے، اور کفرو مشرکین کی مذمت ہے۔ فرمایا: ہر ایک عمل کرتا ہے اپنے ڈھنگ پر۔ شَاكِلَتِهٖ کے ائمہ سلف نے مختلف معانی بیان کئے ہیں، مثلاً: طبیعت، جبلت، عادت، طریقہ، نیت، وغیرہ، اور سب کا حاصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے ماحول، عادت، رسم ورواج کے اعتبار سے ایک نہ ایک طرح عمل کرتا ہے، جس کا ماحول اچھا ہو اس کا عمل بھی اچھا ہوگا، اور برے ماحول والا اپنے بُرے ماحول کے موافق عمل کرے گا۔

آج کی دنیا میں یہ سب کچھ ہمارے مشاہدہ میں ہے کہ ہر شخص اپنے علاقے، شہر، بستی، ماحول کے مطابق عمل پیرا رہتا ہے۔ پس مسلمانوں کے لئے یہ تنبیہ ہے کہ وہ قرآن وسنت اور اپنے مذہبی راہنماؤں کے فرمودات پر عمل پیرا ہوں، اور تمام بُرے ماحولوں سے یکسر اعراض کرنے والے اور بیزار ہوں، اور خیر وہدایت کی طلب میں سرشار ہوں۔

سورۂ نور میں ارشاد ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَ الطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ﴾ [النور:٢٦] (ناپاک عورتیں ناپاک مردوں کے لیے ہیں، اور ناپاک مرد ناپاک عورتوں کے لیے ہیں، اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے ہیں، اور پاکیزہ مرد پاکیزہ عورتوں کے لیے ہیں۔)۔ پس جس طرح پاکیزہ مرد ناپاک عورت کو، اور پاکیزہ عورت ناپاک مرد کو نہیں چاہتے ہیں، اسی طرح مسلمان مردوں، اور مسلمان عورتوں کو چاہئے کہ بُرے ماحول، بُری صحبت، اور بُرے اعمال واخلاق سے بھی پرہیز کریں۔ وَاللہُ الْمُوَفِّق

﴿فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا﴾ اللہ تعالیٰ کو اچھے بُرے سب کا علم ہے، جو ہدایت پر ہیں انہیں بھی خوب جانتا ہے، اور جو گمراہی پر ہیں انہیں بھی جانتا ہے، وہ سب کو اپنے علم کے مطابق جزا دے گا۔

....

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۸۵

ترجمہ: اور لوگ آپ سے روح کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ روح میرے ربّ کے حکم سے ہے، اور تمہیں بس تھوڑا سا علم دیا گیا ہے ﴿۸۵﴾

معارف ومنازل

﴿الرُّوْح﴾ لفظِ رُوح معرف باللام، غیر معرف باللام، اور اضافت کے ساتھ پورے قرآن حکیم میں اکیس مرتبہ مذکور ہے۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے کہ قرآن مجید میں روح کا استعمال متعدد اور مختلف معانی کے لئے ہوا ہے، وہ معانی یہ ہیں: (۱) امر الٰہی (۲) وحی (۳) قرآن حکیم (۴) رحمت الٰہی (۵) حیات (۶) جبریل امین علیہ السلام (۷) ایک بہت عظیم المرتبت فرشتہ (۸) فرشتوں کا ایک خاص لشکر (۹) روحِ بدن، جس کا معنی ہے" جان"۔ یہ ہیں روح کے مختلف معانی جو کہ سب کے سب مختلف مقامات پر قرآن حکم میں موجود ہیں۔ سورۃ القدر کی تفسیر میں مثالوں کے ساتھ ان کی نشاندہی کی جائے گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ

شانِ نزول:

صاحب معالم التنزیل نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ یہ آیت مکی ہے، اور سوال کرنے والے مشرکین ہیں، جنہوں نے یہود مدینہ سے مدد چاہی، تو یہود نے انہیں یہ بتا دیا کہ تم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بطور امتحان یہ تین سوالات پوچھو: (۱) وہ نوجوان کون تھے جو بھاگ کر پہاڑی میں چھپ گئے تھے۔ (۲) وہ کون شخص تھا جس نے مشرق ومغرب تک فتوحات کیں، وغیرہ۔ (۳) روح کیا ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس کے برعکس حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے بخاری میں مروی ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ مدینہ جا رہا تھا، وہاں چند یہودی موجود تھے، انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے متعلق سوال کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے:

﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ۭ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ﴾ آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس روایت میں سوال صرف روح کے بارے میں ہے، فقط، اور آیت مدنی ہے۔ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں حدیثوں کا تعارض دور کرنے کے لئے تکرار نزول کا قول اختیار کیا ہے۔ اور حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی قول کو پسند کیا ہے۔ البتہ اگر تکرار نزول کے قول سے قطع نظر کیا جائے تو صحیحین کی روایت کو ترجیح ہوگی۔ اس پر آیت روح کا نزول ہی محقق

سمجھا جائے گا، اور باقی دو سوالوں کا اس کے ساتھ تعلق نہیں رہے گا، اور وہ علیحدہ سوالات ہوں گے، جن کے جوابات سورۂ کہف میں تفصیلاً مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

﴿وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ﴾ آیت کریمہ کی تفسیر میں روح کے متعلق مختلف اقوال ہیں: بعض کہتے ہیں کہ وہ سب سے بڑا فرشتہ مراد ہے جس کے ستر ہزار منہ ہیں، اور ہر منہ میں ستر ہزار زبانیں ہیں، وغیرہ۔ ایسے فرشتہ کے متعلق جتنی روایات ہیں سب ضعیف ہیں۔ بعض کے نزدیک روح سے قرآن مجید مراد ہے، جیسے کہ ماقبل ومابعد کا تقاضا ومناسبت ہے کہ قرآن پاک کا بیان ہے۔ بعض کہتے ہیں یہاں روح سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں روح سے مراد ملائکہ ہیں۔

حضرت امام خطابی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں ممکنہ ارواح میں سے جس روح کے متعلق سوال ہوا، اس کے بارے میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، اور اکثر اہل تاویل اس طرف گئے ہیں کہ سوال اس روح کے متعلق کیا تھا جس سے حیات جسم وابستہ ہے، یعنی جانداروں کی جان، اور ان میں اہل نظر کا یہ بیان ہے کہ روح کی کیفیت کو دریافت کیا تھا کہ کس طرح بدن میں چلتی ہے، اور جسم میں اس کے امتزاج اور حیات کے اس سے وابستہ ہونے کی کیا صورت ہے۔

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ و دیگر حضرات فرماتے ہیں کہ واضح یہی ہے کہ انہوں نے روح انسانی کے متعلق سوال کیا تھا، کیونکہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روح اللہ ہونے کے قائل نہیں، اور یہ بھی جانتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام وحی والا فرشتہ ہے، جسے یہود اپنا دشمن بتاتے ہیں، اور ملائکہ ارواح ہیں۔ [فتح الباري، ج:۸، ص:۴۰۴]

بہر حال! یہاں الرُّوْح سے مراد جسم انسانی کی روح ہو، یا فرشتہ ہو، یا وحی ہو، جواب کی جامعیت ہر ایک پر حاوی ہے کہ جو کچھ تمہیں بتلایا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عزّ شانہ کا حکم کام کر رہا ہے، اس سے زیادہ بتلانے کی تمہاری تنگنائے علم میں وسعت نہیں۔ یہ ایک مخصوص تکوینی امر ہے، جس کے سمندر میں تمہاری نہ کشتی چل سکتی ہے، اور نہ تمہاری عقول کی وہاں تک رسائی ہو سکتی ہے۔ تم اس عریض وسیع میدان میں اگر چلنے کی کوشش کرو گے تو گم ہو جاؤ گے، اور واپسی کی راہ ہرگز نہیں پاؤ گے۔

﴿وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ تمہیں جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ تھوڑا ہے، تم اور تمہاری عقول ایسے تکوینی امور کی شناخت سے کلیۃً عاجز ہیں۔

روح کے متعلق فلاسفہ، متکلمین، مفسرین، محدثین، فقہاء اور خاص کر صوفیاء وغیرہ میں بڑا اختلاف رائے

ہے، بہت سے لوگوں نے اس پر مستقل ضخیم کتابیں لکھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس اختلاف کی تعداد سو اقوال تک جا پہنچتی ہے۔ علماء سلف نے اس قسم کی باتوں میں بحث کرتے ہوئے سکوت اختیار کیا ہے۔ محقق کبیر حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں لکھتے ہیں: ﴿وَثَبتَ عَنِ ابنِ عَبّاس رضی اللہ عنہ أ نه كانَ لَا يُفسّرُ الرّوحَ أي لَا يُعَيّنُ الْمُرادَ بِه﴾. [فتح الباري، ج:۸] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ ثابت ہے کہ روح کی تفسیر نہیں کرتے تھے، یعنی یہ متعین نہیں کرتے تھے کہ یہی مراد ہے۔

روح اور نفس میں فرق:

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ روح اور نفس دونوں ایک ہی شئے ہیں، یعنی یہ دونوں ایک ہی شئے کے دو نام ہیں، یا دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، ہر ایک کی ماہیت اور حقیقت جدا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک دونوں ایک ہی شئے ہیں، مگر علماء محققین کے نزدیک روح اور نفس دو الگ الگ حقیقتیں ہیں۔ روح انسان کو آخرت کی طرف بلاتی ہے، اور نفس دنیا کی طرف بلاتا اور کھینچتا ہے۔ نفس کو کھانے پینے پہننے اور عیش وعشرت کے سوا اور کچھ معلوم نہیں، نفس شہوات، لذات، خواہشات کا کہتا ہے، اور غیظ وغضب کے اعتبار سے درندہ ہے، اور مکر وفریب کے اعتبار سے شیطان کا بھائی اور استاذ ہے، وہ اَمارہ اور سرکش اتنا ہے کہ حتی المقدور وامکان حق کا دشمن اور باطل کا رفیق ومعاون ہے، جبکہ روح ان چیزوں سے دور ہے، اِلّا یہ کہ نفس اسے اپنا تابع اور غلام بنائے، جیسے کفار وفجار کی ارواح ہوتی ہیں۔

استاذ ابوالقاسم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اعمالِ حسنہ، اخلاقِ حمیدہ کا معدن اور منبع روح ہے، اور اخلاق ذمیمہ واعمالِ سیئہ کا معدن ومنبع نفس ہے، مگر جسمِ لطیف ہونے میں دونوں شریک ہیں، جیسے ملائکہ اور شیاطین، جسمِ لطیف ہونے میں دونوں شریک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ملائکہ نورانی ہیں، نور سے پیدا ہوئے ہیں، اور شیاطین ناری ہیں، نار سے پیدا ہوئے ہیں۔ اور یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ روح اور نفس دونوں کا ظرف بدنِ انسانی ہے۔

شریعت مطہرہ نے نفس کے خلاف جہاد کرنے کا حکم اس لئے دیدیا کہ نفس میں گمراہی اور شرارت کا مادہ رکھا ہوا ہے، اور اس کا تعلق عالم سفلی کے ساتھ ہے، اسی وجہ سے اس کی خوراک وغذا کا سرچشمہ بھی عالم سفلی ہے۔ بخلاف روح کے کہ شریعت نے اس کے خلاف جہاد کا حکم نہیں دیا، کیونکہ اس کا تعلق عالم بالا سے ہے، اور اس کی غذا بھی وہاں سے آتی ہے، مگر چونکہ ان دونوں کا تعلق جسمِ کثیف انسانی بدن کے ساتھ ہے، اس لئے یہ آپس میں قریبی رابطہ رکھتے ہیں، اور اپنے اپنے ذوق وشوق کا کام انجام دیتے رہتے ہیں، اور ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کی جدوجہد کرتے

ہیں، اور ایک دوسرے پرغلبہ پانے کی کوششوں میں ہر لمحہ دلچسپی رکھتے ہیں۔

اگر روح کو نفس پر غلبہ حاصل ہوا تو وہ نفس کو امارہ کی صفت سے نکال کر لوامہ اور وہاں سے مطمئنہ بنا سکتی ہے، جیسا کہ خواص میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، لیکن اگر روح پر نفس کو غلبہ حاصل ہو گیا تو وہ روحِ طاہرہ کو روحِ خبیثہ بنا کر رکھ دیتا ہے۔

پس روح کی فطری پیدائشی پاکیزہ صفت معدوم ہو کر وہ روحِ خبیثہ بن جاتی ہے، جس کی صلاحیت اصلی ختم ہو جاتی ہے، جیسے کفار و منافقین اور فجار میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ ربّ العزت رحمٰن و رحیم ہماری روحانی کمزوریوں سے حفاظت فرمائے، اور نفس کی شرارتوں سے محفوظ فرمائے، روحِ طیبہ اور نفسِ مطمئنہ کی سعادتوں سے مالا مال فرمائے۔ آمین ثم آمین

وَلَىِٕنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ بِهٖ عَلَیۡنَا وَكِیۡلًا ﴿۸۶﴾ اِلَّا رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضۡلَهٗ كَانَ عَلَیۡكَ كَبِیۡرًا ﴿۸۷﴾

ترجمہ: اور اگر ہم چاہیں تو جس قدر ہم نے آپ پر وحی بھیجی ہے اُسے سلب کر لیں، پھر آپ ہمارے مقابلے میں اپنے لئے اس بارے میں کوئی حمایتی نہ پائیں ﴿۸۶﴾ مگر یہ کہ آپ کے ربّ کی طرف سے رحمت ہو جائے، بلاشبہ آپ پر اس کا بڑا فضل ہے ﴿۸۷﴾

معارف و منازل

پہلی آیت کریمہ میں اظہار قدرت خداوندی کا بیان ہے کہ جس طرح روح أمر ربي ہے، اسی طرح وحی الٰہی اور قرآن کریم بھی أمر ربي ہے، پس جس طرح روح سبب حیات ہے، اور اس کے دینے اور قبض کرنے پر اللہ تعالیٰ قادر ہے، یہی مثال وحی کی بھی ہے۔ فرمایا:

﴿وَلَىِٕنۡ شِئۡنَا لَنَذۡهَبَنَّ بِالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡكَ﴾ اگر ہم چاہیں جو وحی آپ کی طرف بھیجی جاتی ہے وہ اٹھا لیں (ابھی، یا قرب قیامت میں، جب قرآن کریم کو اوراق سے اور لوگوں کے سینوں سے اٹھایا جائے گا۔ [رواہ مظهري عن ابن مسعود رضی اللہ عنہ] پھر اس کی واپس لانے کے لئے آپ ہمارے مقابلہ میں اپنا کوئی حمایتی بھی نہ

پائیں۔اس سے اشارہ ہے کہ انسان کو جس قدر علم ملا ہے، وہ اس کی ذاتی جاگیر نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا عطاء کیا ہوا انعام ہے، وہ جس طرح دینے پر قادر ہے اسی طرح وہ واپس لینے اور سلب کرنے پر قادر ہے۔

اس میں بظاہر خطاب اگرچہ سرور عالم ﷺ کو ہے، مگر اصل مقصود اُمت کو بتانا ہے کہ جب پیغمبر اعظم ﷺ کا علم اس کی ذاتی جاگیر نہیں، اور اس کو اس پر اختیار نہیں، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ چاہے، دوسروں کا کیا کہنا۔اور اس کو اس کا امر ہوا کہ: ﴿وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا﴾[طٰہٰ: ۱۱۴] (اور کہہ دیں: اے میرے ربّ! میرے علم میں اضافہ فرما)۔﴿وَعَلَّمَكَ مَالَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكَ عَظِیْمًا﴾[النساء: ۱۱۳] (اور اللہ نے آپ کو وہ چیزیں بتائیں جن کا علم آپ کو نہیں تھا، اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل تھا)۔

مطلب یہ ہے کہ دیگر چیزوں کی طرح وحی الٰہی بھی اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، اگر وہ عطاء کرے تو اس کا کرم، اگر واپس لے لے تو اس کی قدرت ایسے وقت میں اس کے مقابلے میں کوئی حمایتی نہیں ملے گا۔ہاں! اگر وہ اپنی رحمت سے پھر واپس فرمادے، یا سرے سے واپس ہی نہ لے تو یہ اس کا فضل وکرم ہے۔البتہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ دیا ہوا علم آپ سے واپس لے۔

﴿اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ﴾ استثناء منقطع ہے۔﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَیْكَ كَبِیْرًا﴾ بلا شبہ آپ پر اس کا فضل بہت بڑا ہے۔آپ کو اشرف الخلائق اور سید الخلائق بنایا، آپ کو مقام محمود اور حوض کوثر عطاء فرمایا، ختم نبوت کا تاج آپ کے سر کی زینت بنایا، قرآن حکیم جیسی ابدی کتاب کا آپ پر نزول ہوا، اور آپ کو معراج اور اسراء کا مالک بنایا، اور جنت کی کنجی کا آپ کو وارث بنایا، وغیرہ۔آپ ﷺ کی فضیلتیں اتنی بکثرت اور زیادہ ہیں جنہیں احاطہ اور شمار نہیں کیا جاسکتا۔اب اس وحی کی عظمت وحقانیت کا بیان فرمایا:

قُلْ لَّىِٕنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا ﴿۸۸﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِیْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ؗ فَاَبٰۤى اَكْثَرُ النَّاسِ اِلَّا كُفُوْرًا ﴿۸۹﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن سب اس کے لئے جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا بنا کر لائیں تو اس جیسا نہیں لاسکیں گے، اگرچہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں ﴿۸۸﴾ اور البتہ ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر قسم کے اچھے مضامین طرح طرح سے بیان فرمائے ہیں، پھر اکثر لوگوں نے اس کے ماننے سے انکار ہی کیا ﴿۸۹﴾

معارف ومنازل

یہ چیلنج اس سے پہلے قرآن کریم میں تین مقامات پر گزر چکا ہے: سورۂ بقرہ آیات ۲۳۔۲۴، اور سورۂ یونس آیت ۳۸، اور سورۂ ہود آیت ۱۳۔ آگے سورۂ طور آیات ۳۳۔۳۴ میں بھی یہ مضمون آ رہا ہے۔ ان سب مقامات پر یہ بات کفار کے اس الزام کے جواب میں ارشاد ہوئی ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود یہ قرآن تصنیف کیا ہے، اور خواہ مخواہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کا کلام بتا کر پیش کر رہے ہیں۔

مزید برآں سورۂ یونس آیت ۱۶ میں اسی الزام کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا گیا کہ: ﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾[یونس:۱۶] (یعنی آپ ان سے کہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ نہ چاہا ہوتا کہ میں یہ قرآن تمہیں سناؤں تو میں ہرگز نہ سنا سکتا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں، کیا تم اتنے بھی نہیں سمجھتے؟)۔

تو فرمایا، اور بڑی تاکید وقوت کے ساتھ کہ سارے انسان اور سارے جنات آپس میں مل کر ایک دوسرے کے مددگار بن کر اگر یہ کوشش کریں کہ قرآن حکیم جیسی کوئی چیز بنا کر لے آئیں، تو ہرگز نہیں لا سکتے، اور کبھی نہیں لا سکیں گے۔ قرآن حکیم ایک ابدی معجزہ ہے، اور سراپا معجزہ ہے، معجزہ کی نظیر یا مثال پیش کرنا کسی پیغمبر کے اختیار میں نہیں، چہ جائیکہ عوام الناس کے اختیار میں ہو۔ قرآن کریم کی تالیف ونظم، بلاغت وفصاحت کا وہ کمال ہے جس کا مقابلہ طوق بشر میں نہیں ہے۔ قرآن کریم کے عہد اوّل سے صرف عرب نہیں پورے جہاں کے فصحاء وبلغاء وشعراء کو یہ چیلنج ہے کہ اس جیسی ایک چھوٹی سورت بنا کر لاؤ، مگر آج تک مخالفین عاجز رہے، اور قیامت تک عاجز رہیں گے۔

یہ بلاغت وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے، اس کے علاوہ اور بھی وجوہ اعجاز ہیں، چونکہ صاحب معجزہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آخر الانبیاء ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت آخر الامم ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت قیامت تک سارے انسانوں کے لئے ہے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت سے معجزات جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں کثیر تعداد میں دیئے گئے ان کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیامت تک عمومی دعوت کی خاطر ایک ایسا ابدی معجزہ دیا گیا جو ہمیشہ کے لئے ہو، وہ ہے قرآن کریم۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ﴾ قرآن کریم کے طرز بیان، اور حکیمانہ انداز بیان کے بارے میں ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم نے اس قرآن کریم میں ہر قسم کے عمدہ مضامین مختلف طریقوں سے اس

طرح بیان کئے ہیں کہ اس کا قاری کبھی دل برداشتہ ہو کر تھکاوٹ محسوس نہ کرے، کیونکہ اس میں امثال ہیں، مواعظ ہیں، عبرتیں ہیں، احکام ہیں، اور وعدے ہیں، اسی کے ساتھ وعیدیں بھی، ترغیب وترہیب ہیں، تخلیق کائنات کے اسرار ورموز بھی ہیں۔ کثیر نعمتوں اور عنایات ربانی کی عجیب فرمائشیں ہیں۔ دنیا، برزخ، آخرت کے احوال کا بیان بھی، اور تباہ شدہ اقوام کے واقعات بھی ہیں، اوامر ونواہی بھی۔ الغرض کوئی ایسا مسئلہ نہیں کہ قرآن حکیم نے اُسے نظر انداز کر کے بیان نہ کیا ہو، جس کی انسانی معاشرہ میں ضرورت ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اس سمندر بے کراں کی گہرائیوں میں غوطہ لگا کر علماء اُمت، خاص کر مفسرین نے ہزار ہزار جلدوں میں تفسیریں لکھیں، علوم ومعارف بیان کئے، پھر یہ کہتے ہوئے سبکدوش ہوئے کہ مشت نمونہ خروار سے آگے ہماری تحقیق رک گئی، اور عجائبات وغرائبات بدستور تشنہ تکمیل رہے، ہم اپنے آنے والے بھائیوں سے پرامید ہیں کہ وہ اس میدان کے گمشدہ مضامین کی تکمیل اور نشاندہی فرمائیں گے، اور انہیں اوراق کی زینت بنائیں گے۔

جس وقت میں اس آیت کی تشریح لکھ رہا ہوں اس وقت پوری دنیا میں بارہ ہزار آٹھ سو چوراسی (۱۲۸۸۴) زبانیں بولی جاتی ہیں، اور قرآن حکیم کے سات سو ایک (۷۰۱) زبانوں میں تراجم وحواشی اور تفاسیر شائع ہو چکے ہیں، اور ایک سرسری اندازے میں اس وقت قلمی اور مطبوعہ تفاسیر، تقریباً تین لاکھ کے قریب ہیں، مگر کوئی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس زندہ جاوید معجزہ کا حق ادا ہو گیا، اور مزید کسی عالم کو قرآن پر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ سبحان اللہ! یہ معجزہ پر معجزہ، جبکہ دنیا میں حفاظ وقراء کی تعداد کروڑوں میں ہے، اس کے باوجود لوگ اگر اس رشد وہدایت کے خزانے سے بہرہ ور نہیں ہوتے تو وہ بدنصیب ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ چودہ صدیوں سے یہ چیلنج کسی نے قبول نہیں کیا، حالانکہ عیسائی ویہودی اقوام قرآن مجید کی مخالفت اور اس کی تعلیمات میں ہر طرح کے نقائص تلاش کرنے میں دوسرے تمام مخالفین ومعاندین سے پیش پیش ہیں۔ یہی بات اس کی حقانیت وصداقت کی واضح دلیل ہے۔ بعض مفسرین کرامؒ فرما رہے ہیں کہ قرآن مجید کی مثل لانے کا چیلنج اس کی فصاحت وبلاغت کے اعتبار سے ہے کہ ایسی فصاحت وبلاغت کسی دوسرے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ تاہم امام ابو بکر جصاصؒ اور بعض دوسرے مفسرین کرامؒ فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کا یہ چیلنج نہ صرف فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے ہے، بلکہ اس کے علوم ومعارف، اس کی حکمتیں اور مصلحتیں، اس کے عالمگیر نظام اور پروگرام، ہر اعتبار سے یہ چیلنج قائم ہے۔

امام ہمام حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ سارے انسان، بلکہ ساری مخلوق مل کر بھی قرآن مجید کی حکمتوں اور مصلحتوں کی مثال پیش نہیں کرسکتی۔ فرماتے ہیں کہ میں قرآن مجید کی کسی آیت میں غور کرتا ہوں تو مجھے اس کے تحت علوم و معارف کا وسیع سمندر نظر آتا ہے، جس کی کوئی حد نہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثال ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی بے مثال ہیں۔ انسان اللہ تعالیٰ کی صفت قرآن مجید پر کبھی حاوی نہیں ہوسکتا، بلکہ اس میں جتنا غور و فکر کرے گا اس کے علم میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ اسی لئے ربّ العزّت نے اپنے برگزیدہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی ہے: ﴿قُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۴] (اور کہہ دیں: اے میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما)۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید کا لائحہ عمل اور پیش کردہ نظام بے مثال ہے، دنیا میں جتنے بھی انسانی ہاتھوں سے قوانین و دساتیر بنتے ہیں وہ کچھ عرصہ بعد فیل ہوجاتے ہیں، اور انہیں یا تو منسوخ کرنا پڑتا ہے، یا پھر ان میں بار بار ترمیم کی ضرورت پیش آتی ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایسے قوانین کی خامیاں منظر عام پر آتی رہتی ہیں، جن کی بناء پر ان کی تبدیلی اور ترمیم لازمی ہوجاتی ہے۔

اس کے برخلاف ہر عیب اور نقص سے پاک اگر کوئی قانون ہے تو وہ صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی کتاب قرآن پاک کے اوراق میں محفوظ ہے۔ یہ ایسا آفاقی عالمگیر پروگرام ہے جس میں قیامت تک کسی ترمیم اور تغیر و تبدل کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ اس کتاب کی قدردانی کریں، اسے حرز جان بنائیں، اس کے احکام کو پورے معاشرے میں پھیلائیں، اس کی ہدایت کو عام کرنے کی کوشش کریں، اسی میں ہماری فلاح و کامیابی کا راز ہے۔

وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ﴿۹۰﴾ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ
وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ﴿۹۱﴾ اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ
بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا ﴿۹۲﴾ اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ ۭ وَلَنْ نُّؤْمِنَ
لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ ۭ قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۳﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا کہ ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک آپ ہمارے لئے زمین سے کوئی چشمہ جاری نہ کردیں ﴿۹۰﴾ یا خاص کر آپ کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، پھر آپ اس باغ کے درمیان

بہت سی نہریں جاری کردیں ۹۱ یا آپ ہمارے اوپر آسمان کو ٹکڑوں کی صورت میں گرادیں، جیسا کہ آپ کا بیان ہے، یا آپ اللہ تعالیٰ کو اور فرشتوں کو سامنے لے آئیں ۹۲ یا آپ کا گھر ہو جو خوب زینت والا ہو، یا آپ آسمان میں چڑھ جائیں، اور ہم آپ کے چڑھنے پر ہرگز یقین نہ کریں یہاں تک کہ آپ ہمارے اوپر ایک لکھی ہوئی کتاب نازل کردیں، جسے ہم پڑھ لیں، آپ فرما دیجئے کہ میرا ربّ پاک ہے، میں تو صرف ایک بشر ہوں، پیغمبر ہوں ۹۳

معارف ومنازل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ نے لکھا ہے کہ قریش مکہ کے چند افراد جمع ہوئے، انہوں نے سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کیا کہ یہ جو آپ نے نئی باتیں شروع کی ہیں، اگر آپ کا مقصد کوئی مال ہے، تو بتا دیجئے ہم آپ کو مال دیدیں گے، تو آپ ہمارے اندر سب سے بڑے مالدار ہو جائیں گے، اور اگر آپ کو بڑائی اور سرداری کا شوق ہے تو ہم آپ کو اپنا بڑا سردار بنالیتے ہیں، اور اگر آپ کو کوئی جنون ہو گیا ہے، تو ہم اپنے اموال خرچ کر کے آپ کا علاج کرادیتے ہیں، وغیرہ۔

آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں ہے، مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا ہے، اور مجھ پر کتاب نازل فرمائی ہے، اور مجھے حکم دیا ہے کہ تمہیں اس کے قبول کرنے اور ایمان لانے پر بشارتیں سناؤں، اور مخالفت کے بُرے انجام سے ڈراؤں۔ میں نے تمہیں پہنچا دیا، اور خیر خواہی کے ساتھ سب کچھ سمجھا دیا، اگر تم اس کو قبول کرتے ہو تو دنیا و آخرت میں تمہارا نصیب اچھا ہوگا، اور اگر اس کو نہیں مانتے ہو تو میں صبر کرتا ہوں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرمائیں۔

وہ لوگ کہنے لگے: تو پھر ایسا کرو کہ اپنے ربّ سے سوال کرو کہ یہ پہاڑ مکہ کی سرزمین سے ہٹ جائیں تا کہ ہماری جگہ کشادہ ہو جائے، اور پھر شام وعراق کی طرح ہمارے لئے نہریں جاری کردیں تا کہ ہم باغات لگائیں، اور خوب کھیتی باڑی اور زراعت کریں، اور ہمارے باپ دادوں کو زندہ کرلیں، قبروں سے اٹھائیں تا کہ وہ آپ کی تصدیق کریں، تو ہم بھی آپ کی تصدیق کریں گے، اور مانیں گے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ یہ میرا کام نہیں، میں تمہاری ہر بات ماننے کیلئے نہیں آیا، میں نے تمہیں معجزات اور شق القمر جیسے معجزہ دکھایا، مگر تم لوگوں نے نہیں مانا، میرا کہنا اگر مانو گے تو فلاح پاؤ گے، اگر نہیں مانو گے تو میں

صبر کروں گا۔

وہ کہنے لگے: ایسا نہیں کرتے تو اپنے ربّ سے یہ سوال کریں کہ آپ کی تصدیق کے لئے ایک فرشتہ بھیج دے، اور یہ سوالات کریں کہ آپ کو باغات اور خوبصورت محلات دیدے، اور سونے چاندی کے خزانے دیدے تاکہ آپ غنی ہوجائیں، اور آپ کا دنیاوی حال دوسروں سے ممتاز ہوجائے۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مجھے ایسی چیزوں کی نہ کوئی خواہش ہے، نہ ضرورت، مجھے اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے سمجھانے اور ہدایت کا راستہ بتانے کے لئے بھیجا ہے۔ کہنے لگے: اچھا، تم ایسا کرو کہ ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرادو، اور اپنے ربّ کی قدرت کا یہ نشان ہمیں دکھادو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: یہ چیز میرے دائرۂ اختیار میں نہیں، اگر اللہ تعالیٰ ایسا کرنا چاہے تو وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ پھر انہوں نے کہا: ہم آپ پر اس وقت ایمان لائیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو اور اس کے فرشتوں کو ہمارے سامنے لائیں۔ ان باتوں کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مایوس ہوکر وہاں سے کھڑے ہوگئے۔

ان لوگوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی عاتکہ بنت عبدالمطلب کا بیٹا عبداللہ بن امیہ بھی تھا، وہ بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھڑا ہوگیا، اس نے کہا: اے محمد! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کی قوم نے آپ کے سامنے بہت سی باتیں پیش کیں، آپ نے کسی بات کو قبول نہ کیا، اب آپ ایسا کریں کہ ایک سیڑھی لیں، اور میرے سامنے آسمان پر چڑھ جائیں، اور ایک نوشتہ لکھی ہوئی کتاب بھی وہاں سے لائیں، اور آپ کے ساتھ فرشتے بھی آئیں، جو آپ کی تصدیق کریں۔ اگر آپ نے ایسا کرلیا تو میں آپ کی تصدیق کرلوں گا۔

یہ سب کچھ سن کر آنحضرت سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غمگین ہوئے، اور اسی حالت میں تھے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے یہ آیت نازل فرمائی، اور آپ کو حکم دیا کہ آپ لوگوں کو جواب میں فرمائیں:

﴿سُبۡحَانَ رَبِّیۡ﴾ میرا ربّ پاک ہے، وہ تمہارے طلب کردہ فرمائشی معجزات سے عاجز نہیں ہے، اگر وہ چاہے تو فرمائشی معجزات ظاہر فرمادے، لیکن وہ کسی کا پابند نہیں کہ خوامخواہ بے ڈھنگ اور بے مقصد ہر کسی کے مطالبے پورا کردے۔

﴿هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا﴾ میں تو ایک بشر ہی ہوں، ایک انسان ہوں۔ تمہارا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے کہ آپ ہماری طرح کے بشر ہیں، ہم کیسے آپ کو بشر ہوتے ہوئے رسول تسلیم کریں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نے فرمایا: جس طرح میں بشر ہوں اسی طرح مجھ سے پہلے جتنے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث ہوئے وہ سب بشر تھے، جب میں بشر ہوں تو میں بھی بشری صفات کا حامل ہوں، تمہاری طرح کھاتا پیتا سوتا ہوں، بازاروں میں چلتا پھرتا ہوں، کبھی خوش اور کبھی غمگین ہوتا ہوں۔

الغرض! بشریت کے تمام تقاضے میرے اندر موجود ہیں، اور تمہارے سامنے توحید اور معاد کی جو باتیں کرتا ہوں یہ رسول ہونے کی حیثیت سے ہیں، اور رسول ہونے کے لوازم میں یہ باتیں نہیں ہیں جن کا تم نے مطالبہ کیا ہے۔ جو مجھ پر ایمان لائے گا وہ فلاح پائے گا، اور جو منکر ہوگا وہ اپنا نقصان کرے گا، میرا کام خلقِ خدا کو صحیح راہنمائی کے ساتھ حق پہنچانا ہے، اور ہر طرح کے بے ڈھنگے اور من مانی مطالبات وسوالات کو پورا کرنا میرے فرائض میں نہیں، خاص کر ایسے لوگوں کے کہ جن کا مقصد ایمان لانا نہیں ہوتا۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا﴾ ہم ہرگز آپ پر ایمان نہیں لائیں گے، یہاں تک کہ آپ ہمارے لئے زمین میں چشمہ جاری کردیں، اسی کے ساتھ یہ بڑے بڑے پہاڑوں کو ہٹائیں، اور ہمارے لئے زمین بھی ہموار کردیں۔

﴿اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا﴾ اور یہ کہ آپ کا کھجوروں اور انگور کا باغ ہونا چاہئے، تا کہ آپ کی شان وشوکت واضح ہو، اور آپ کے باغوں کے نیچے نہریں بھی جاری ہوں، تا کہ آپ کی حیثیت نمایاں ہو، تا کہ لوگ آپ کے اتباع میں فخر محسوس کریں۔

﴿اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا﴾ جیسا کہ آپ خیال کرتے ہیں ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا ہی گرادیں تا کہ ہمیں پتہ چل جائے کہ آپ والا عذاب واقعی سچ ہے، اور آپ کا ربّ آپ کی بات مانتا ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو یہ کریں:

﴿اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ قَبِيْلًا﴾ تو اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لائیں، جو گواہی دیں کہ آپ واقعی رسول ہیں۔ یا کم از کم یہ تو کرلیں:

﴿اَوْ يَكُوْنَ لَكَ بَيْتٌ مِّنْ زُخْرُفٍ﴾ کہ آپ کا گھر ہی سونے کا بنا ہوا ہو۔

﴿اَوْ تَرْقٰى فِي السَّمَآءِ﴾ یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں۔ ﴿وَلَنْ نُّؤْمِنَ لِرُقِيِّكَ﴾ ہم محض آپ کے آسمان تک پہنچ جانے کی وجہ سے ایمان نہیں لائیں گے۔ ﴿حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيْنَا كِتٰبًا نَّقْرَؤُهٗ﴾ یہاں تک کہ آپ ہم پر

ایک لکھی ہوئی کتاب اتاریں، جسے ہم خود پڑھ سکیں۔ آپ معراج کا دعویٰ کرتے ہیں کہ میں نے ساتوں آسمانوں اور جنت ودوزخ کی سیر کی، بھلا ابھی ہمارے سامنے آسمان پر چڑھ جاؤ، اور وہاں سے لکھی لکھائی کتاب لے آؤ، تو پھر ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔

اب اللہ تعالیٰ جسے خوب معلوم ہے کہ ان بے سروپا معاندانہ مطالبات کے نتیجے میں، اور ان منگھڑت مطالبات کے پیچھے سوائے ہٹ دھرمی اور ضد وعناد کے اور کچھ نہیں، یہ نہ ایمان لائیں گے، اور نہ ہی تصدیق کریں گے۔ مختصر جواب سے انہیں خاموش فرمایا:

﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾۔ سورۂ غافر میں فرمایا: ﴿وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ [غافر: ۷۸] (کسی رسول کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ ازخود کوئی معجزہ پیش کرے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے حکم سے)۔ ایک ایسی جماعت بھی پائی جاتی ہے جسے سید المرسلین ﷺ کی محبت کا بہت بڑا خشک دعویٰ ہے، مگر اتباعِ سنت سے سراسر بے بہرہ ہے، اور اپنے اس دعویٰ کی وجہ سے سید کائنات ﷺ کے بارے میں ایسے عقائد اختیار کئے ہیں جو قرآن وحدیث کے نصوصِ قطعیہ کے سراسر خلاف ہیں۔ انہیں میں سے ان کا ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ آپ کی بشریت کا انکار کرتے ہیں کہ آپ بشر نہیں تھے، اور ان میں سے بعض مدعیانِ علم نے تو غضب کر دیا (تحریف قرآن میں یہودی علماء کو بھی پیچھے چھوڑ گئے) سورۂ کہف کے آخر میں جو فرمایا ہے: ﴿قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ [الکھف: ۱۱۰] (آپ کہہ دیں: یقیناً میں تمہاری طرح بشر ہی ہوں) اس کے بارے میں کہنے لگے کہ یہ "مَا" نافیہ ہے۔ ان جاہلوں کو یہ بھی پتہ نہیں کہ "اِنَّ" حرف تحقیق ہے، جملہ منفیہ پر داخل نہیں ہوتا۔

پھر قرآن مجید میں آنحضرت ﷺ کی بشریت ثابت کرنے کے لئے صرف یہی تو ایک آیت نہیں ہے، جس میں "اِنَّمَا" آیا ہے، مذکورہ بالا آیت بھی تو ہے، جس میں: ﴿قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا﴾ فرمایا ہے، یہاں تو کوئی "مَا" نافیہ نہیں ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ ۹۴

قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا

رَسُوۡلًا ﴿۹۵﴾ قُلۡ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيۡدًاۢ بَيۡنِىۡ وَبَيۡنَكُمۡؕ اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيۡرًۢا بَصِيۡرًا‏ ﴿۹۶﴾

ترجمہ: اور لوگوں کو ایمان قبول کرنے سے صرف اس بات نے روکا کہ جب ان کے پاس ہدایت آئی تو صرف یہ بات کہنے لگے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنایا ہے؟ ﴿۹۴﴾ آپ فرمادیجئے: اگر زمین میں فرشتے ہوتے جو اطمینان سے چلتے پھرتے، تو یہ ضروری بات ہوتی کہ ہم ان پر فرشتہ کو رسول بنا کر اتار دیتے ﴿۹۵﴾ آپ فرمادیجئے کہ میرے تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ کافی گواہ ہے، بیشک وہ اپنے بندوں سے باخبر ہے، دیکھنے والا ہے ﴿۹۶﴾

معارف ومنازل

لوگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام جب دین حق کی دعوت دیتے، اور بتاتے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں، تو وہ یوں کہہ دیتے کہ انسان کا رسول ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ کسی انسان، یعنی بشر کے نبی ہونے کے قائل نہ تھے۔ فرمایا:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰٓى﴾ کہ جب بھی لوگوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت لے کر رسول آیا۔

﴿اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا﴾ تو انہوں نے محض اس بناء پر ایمان لانے سے انکار کر دیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ ان کے دماغ میں شیطان نے یہ بات ڈال رکھی تھی کہ انسان جو کھاتا پیتا ہے، اور سوتا ہے، بازاروں میں چلتا پھرتا ہے، اور بیوی بچے بھی رکھتا ہے تو یہ کیسے رسول ہو سکتا ہے، اس لئے وہ اپنے جیسے انسان کو رسول ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ یہ چیز ان کے ایمان لانے میں رکاوٹ تھی۔

یہ نظریہ صرف مشرکینِ مکہ تک محدود نہ تھا، بلکہ سابقہ اُمتوں نے بھی اپنے انبیاء کرام علیہم السلام کا اسی بناء پر انکار کیا۔ سورۂ ابراہیم میں ہے کہ انہوں نے اپنے رسولوں علیہم السلام سے یوں کہا: ﴿وَمَاۤ اَنۡتُمۡ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُنَا﴾۔ [ابراهیم:۱۰] (تم نہیں ہو مگر ہماری بشر)۔ اور قوم ثمود نے بھی یہی کہا: ﴿اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗۤ﴾ [القمر: ۲۴] (کیا ہم اپنے میں سے ایک انسان کی اتباع کر لیں؟) اللہ تعالیٰ شانہ نے کفار کے جواب میں فرمایا:

﴿قُلۡ لَّوۡ كَانَ فِى الۡاَرۡضِ مَلٰۤـئِكَةٌ يَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّيۡنَ﴾ آپ فرمادیجئے: اگر زمین میں انسانوں کے بجائے فرشتے چلتے پھرتے، اور آباد ہوتے۔

﴿لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا﴾ تو ہم ان کی طرف آسمان سے فرشتے رسول بنا کر بھیج دیتے۔ مطلب یہ کہ جب زمین پر انسان آباد ہیں تو ان کی ہدایت اور راہنمائی کے لئے انسانوں ہی سے رسولوں کا منتخب ہونا معقول اور فائدہ مند ہے۔ بھلا انسانوں کے پاس فرشتہ کیسے رسول بن کر آسکتا ہے؟ جبکہ دونوں کی انواع، اطوار، رہن سہن، طرز گفتگو، غرض یہ کہ ہر چیز میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک نورانی ہے، خواہشات سے پاک ہے، دوسرا ہزاروں گناہ اور خواہشات کا بندہ ہے۔

سورۃ الانعام میں فرمایا کہ انسان کے پاس اگر فرشتہ آجائے تو اس کی دو صورتیں ہیں، اور دونوں غیر مفید و ناکام ہیں: پہلی صورت یہ ہے کہ فرشتہ انسانی شکل وصورت میں ہو، تو اس پر منکرین کا اعتراض اپنی جگہ قائم رہے گا کہ یہ تو ہمارے جیسے انسان ہے، ہم اس کی اتباع کیوں کریں؟ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتے کو اس کی اصلی شکل وصورت میں بھیجیں، تو انسان اسے برداشت نہیں کرسکیں گے، اس کی نورانیت، چمک دمک، اور شکل وصورت دیکھ کر انسان فوراً دہشت زدہ ہو کر ہلاک ہو جائیں گے۔ عام انسان ہرگز فرشتے کو اصلی شکل وصورت میں دیکھ کر برداشت نہیں کرسکتا۔ لہٰذا انسانوں کی طرف انسان ہی بطور رسول آتا ہے۔ مشرکین کا مطالبہ بالکل بیہودہ اور عقل و فطرت کے سراسر خلاف ہے۔

﴿قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ﴾ آپ فرمادیجئے! میرے اور تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ ہی گواہ کافی ہے۔ اگر تم میری نبوت پر گواہی نہیں دو گے، تو اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی گواہی کافی ہے۔ پس تم یاد رکھو، یہ بات:

﴿اِنَّهٗ كَانَ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرًا بَصِيْرًا﴾ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے تمام حالات، ظاہر و باطن سب سے باخبر ہے، ہر چیز اس کی نگاہ میں ہے، تم اس کے پکڑ سے اور قیامت کی ہلاکت سے نہیں بچ سکو گے۔

۞ ۞ ۞

وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِهٖ ۭ وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا ۭ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ كُلَّمَا خَبَتْ زِدْنٰهُمْ سَعِيْرًا ۝ ذٰلِكَ جَزَاۗؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا

لَمَبۡعُوۡثُوۡنَ خَلۡقًا جَدِیۡدًا ﴿۹۸﴾ اَوَلَمۡ یَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ قَادِرٌ
عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ وَجَعَلَ لَهُمۡ اَجَلًا لَّا رَیۡبَ فِیۡهِ ؕ فَاَبَی الظّٰلِمُوۡنَ اِلَّا كُفُوۡرًا ﴿۹۹﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ جسے ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے، اور وہ جسے گمراہ کرے سو آپ اس کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور ہم انہیں قیامت کے دن چہروں کے بل اس حال میں چلائیں گے کہ وہ اندھے اور گونگے اور بہرے ہوں گے، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے، جب بھی بجھنے لگے گی ہم ان کے لئے اس کو اور زیادہ بھڑکا دیں گے ﴿۹۷﴾ یہ ان کی سزا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا، اور یوں کہا کہ جب ہم ہڈیاں اور بالکل ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو کیا ہم از سرِ نو پیدا کر کے اٹھائے جائیں گے؟ ﴿۹۸﴾ کیا وہ یہ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا؟ کیا انہیں معلوم نہیں کہ جس اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا وہ اس پر قادر ہے کہ ان جیسے پیدا فرما دے؟ اور اس نے ان کے لئے ایک اجل مقرر کر رکھی ہے، جس میں کوئی شک نہیں، سو ظالموں نے بس انکار ہی کیا ﴿۹۹﴾

معارف ومنازل

پہلی آیت میں ہدایت وضلالت کا قانون بتا کر معاندین نے جو جو اعتراضات، اور طرح طرح کے مطالبات کئے تھے، جن کی تردید ہو چکی۔ اب آخری ایک قانونِ ہدایت اور اس کے ضمن میں معاندین کے لئے ایک سخت وعید کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿وَمَنۡ یَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ﴾ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت عطاء کرے وہ ہدایت یاب ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت ان ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو ہدایت کے طلبگار ہوتے ہیں، اور حجت بازی وعناد سے دور بھاگتے ہیں، چشم بصیرت سے کام لیتے ہیں، اندھے، بہرے، گونگے نہیں ہوتے ہیں۔

﴿وَمَنۡ یُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهُمۡ اَوۡلِیَآءَ مِنۡ دُوۡنِهٖ﴾ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کر دے تو آپ ہر گز نہ پائیں گے ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار یا کارساز، جو ان کو ہدایت دے سکے، وہ جب ہدایت کی بات سنتے ہیں تو انہیں برا محسوس ہوتا ہے، وہ بجائے ہدایت حاصل کرنے، اور چشم بصیرت سے دیکھنے اور طلبگار رہنے کے اُلٹا انکار کر لیتے ہیں۔ بھلا انہیں کوئی ہدایت کی راہ دکھا سکتا ہے؟ ہر گز نہیں، وہ گمراہ ہی رہیں گے۔ فرمایا:

﴿وَنَحۡشُرُهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوۡهِهِمۡ عُمۡيًا وَّبُكۡمًا وَّصُمًّا﴾ ہم ان کو قیامت کے دن ان کے چہروں کے بل اس حالت میں اٹھائیں گے کہ وہ اندھے، گونگے اور بہرے ہوں گے، جیسے دوسری آیت میں ہے: ﴿وَمَنۡ كَانَ فِىۡ هٰذِهٖۤ اَعۡمٰى فَهُوَ فِى الۡاٰخِرَةِ اَعۡمٰى﴾ [الاسراء: ۷۲] (اور جو اس دنیا میں دندھا ہو وہ آخرت میں بھی اندھا ہوگا)۔ اسی طرح: ﴿صُمٌّۢ بُكۡمٌ عُمۡىٌ فَهُمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ﴾ [البقرۃ: ۱۸] (بہرے ہیں، گونگے ہیں، اندھے ہیں، پس لوٹ کر نہیں آئیں گے)۔ ﴿وَمَنۡ اَعۡرَضَ عَنۡ ذِكۡرِىۡ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيۡشَةً ضَنۡكًا وَّنَحۡشُرُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ اَعۡمٰى﴾ [طٰہٰ: ۱۲۴] (اور جو میری یاد سے اعراض کرے تو اس کے لیے تنگ زندگی ہوگی، اور ہم اسے قیامت کے دن ادھا اٹھائیں گے)۔

مگر یہ بات یاد رہے، اس کی تفصیل پہلے گزر چکی کہ نافرمانوں کا یہ حال سارے عرصہ محشر میں نہیں ہوگا، بلکہ ایک خاص وقت کے لئے ہوگا، تا کہ ان کی ذلّت ورسوائی سب کے سامنے واضح ہو جائے، اس کے بعد یہ کیفیت دور ہو جائے گی، اور ان کے حواس کام کرنے لگیں گے، وہ تیزی کے ساتھ دیکھنے اور سننے اور بولنے لگیں گے۔ فرمایا: ﴿اَسۡمِعۡ بِهِمۡ وَاَبۡصِرۡ يَوۡمَ يَاۡتُوۡنَنَا﴾ [مریم: ۳۸] (کیا خوب سنیں گے، اور کیا خوب دیکھیں گے جس دن ہمارے پاس آئیں گے)۔ ﴿فَكَشَفۡنَا عَنۡكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الۡيَوۡمَ حَدِيۡدٌ﴾ [ق: ۲۲] (آج ہم نے تم سے پردہ اٹھادیا، تو آج تیری نگاہ تیز ہے)۔ جب اس کی نگاہ تیزی پر آئے گی تو فرشتے، جنات، جنت و دوزخ ہر چیز اسے نظر آئے گی۔

ترمذی شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مرفوع حدیث منقول ہے، فرمایا: قیامت کے دن لوگ تین گروہوں میں اٹھائے جائیں گے: ایک قسم پیدل چلنے والوں کی ہوگی، ایک سواروں کی، اور ایک منہ (چہروں) کے بل چلنے والوں کی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسولُ اللہ! یہ چہروں کے بل کیسے چلیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس اللہ تعالیٰ نے انہیں پاؤں کے بل چلایا ہے وہ منہ کے بل چلانے پر بھی قدرت رکھتا ہے۔ فرمایا:

﴿مَاۡوٰٮهُمۡ جَهَنَّمُ ؕ كُلَّمَا خَبَتۡ زِدۡنٰهُمۡ سَعِيۡرًا﴾ ان لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہوگا۔ جب بھی جہنم کی آگ ذرا بجھنے لگے گی، اور اس کی حرارت کم ہو جائے گی، ہم مزید بھڑکا دیں گے، جیسا کہ فرمایا: ﴿كُلَّمَا نَضِجَتۡ جُلُوۡدُهُمۡ بَدَّلۡنٰهُمۡ جُلُوۡدًا غَيۡرَهَا﴾ [النساء: ۵۶] (جب ان کی پہلی کھال جل جائے گی تو ہم انہیں دوسری کھال پہنا دیں گے)۔ اب اس عذاب کے اسباب کا بیان ہے:

﴿ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِنَا﴾ یہ اس وجہ سے کہ انہوں نے ہماری آیات کا انکار کیا۔ آیات اپنے عمومی معنی پر تمام احکام الٰہی کو شامل ہے، انہوں نے سب کا انکار کیا ہوا ہے، اگر چہ اثبات کفر و جہنم کے لئے سب کا انکار ضروری نہیں، کسی ایک قطعی حکم کے انکار سے بھی کفر ثابت ہو جائے گا۔

﴿وَقَالُوْٓا ءَاِذَا كُنَّا عِظَامًا وَّرُفَاتًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ خَلْقًا جَدِيْدًا﴾ کیا مرنے کے بعد جب ہماری ہڈیاں گل سڑ کر چورہ چورہ اور مٹی میں مل کر مٹی بن جائیں گی تو کیا ہم دوبارہ نئی پیدائش میں اٹھائے جائیں گے؟ (یہ مضمون قرآن مجید میں بکثرت مذکور ہے، مختلف الفاظ کے ساتھ)۔ وہ کہتے تھے کہ آج تک مرنے کے بعد ہم نے کسی کو دوبارہ زندہ ہوتے نہ دیکھا نہ سنا، یہ سب منگھڑت فرضی باتیں ہیں، وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ﴾ کیا ان لوگوں نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ وہ خالق و قادر مطلق ہے جس نے اتنے بڑے بڑے آسمانوں اور زمین پیدا کئے ہیں؟ کیا وہ اس بات پر قادر نہیں ہے کہ ان جیسے دوبارہ پیدا کردے؟ جب اللہ تعالیٰ نے بڑی بڑی مخلوقات پیدا کی ہیں تو انسان جیسے چھوٹی چیز کی پیدائش اس کے لئے کون سی مشکل ہے؟ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لئے وقت مقرر کیا ہوا ہے، تم کہتے ہو کہ آج تک کوئی دوبارہ زندہ نہیں ہوا، اس کے لئے انتظار کرو۔

﴿وَجَعَلَ لَهُمْ اَجَلًا لَّا رَيْبَ فِيْهِ﴾ اللہ تعالیٰ نے سب کے لئے ایک مدّت مقرر کر رکھی ہے، جب وہ وقت آجائے تو ایک مردہ کیا، سارے مردے زندہ کئے جائیں گے۔ ﴿فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ﴾ [الزمر: ۶۸] (اچانک وہ کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے)۔ صور پھونکتے ہی دیکھو سارے کھڑے دیکھ رہے ہوں گے، اور حیرانی میں کہیں گے: ﴿مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا﴾ [یس: ۵۲] (کس نے ہمیں ہماری خوابگاہ سے اٹھایا؟) انہیں جواب ملے گا: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ﴾ [یس: ۵۲] (یہ وہ ہے جس کا وعدہ رحمٰن نے کیا تھا، اور رسولوں نے سچ کہا تھا)۔

﴿قُلْ لَّوْ اَنْتُمْ تَمْلِكُوْنَ خَزَآئِنَ رَحْمَةِ رَبِّيْٓ اِذًا لَّاَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْاِنْفَاقِ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا﴾ ۱۰۰

ترجمہ: ۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر تم میرے ربّ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہوتے، تو اس صورت میں خرچ ہو جانے کے ڈر سے ہاتھ روک لیتے، اور انسان خرچ کرنے میں بڑا تنگدل ہے ۱۰۰

معارف ومنازل

گزشتہ رکوع میں فرمایا تھا: ﴿اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا۝ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ﴾[الاسراء:۸۸] (مگر یہ کہ آپ کے ربّ کی طرف سے رحمت ہوجائے، بلاشبہ آپ پر اس کا بڑا فضل ہے ۝ آپ فرما دیجئے کہ اگر تمام انسان اور جن سب اس کے لئے جمع ہوجائیں کہ اس قرآن جیسا بنا کر لائیں تو اس جیسا نہیں لاسکیں گے، اگر چہ آپس میں ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں ۝)۔

خداوند تعالیٰ نے اپنی رحمت سے آپ ﷺ پر بہت بڑا فضل کیا ہے کہ قرآن مجید جیسی بے مثال دولت عطاء فرمائی۔ درمیان میں مخالفین کے تعنت وعناد (بے سروپا مطالبات) تکذیب واعراض عن الحق، اوران کے نتائج کا ذکر کرکے یہاں پھر اسی پہلے مضمون کی طرف عود کیا گیا ہے۔ یعنی ایک بندے کو ایسی عظیم الشان رحمت اور بے مثال دولت سے سرفراز فرمانا، اسی جواد حقیقی اور وہاب مطلق کی شان ہوسکتی ہے، جس کے پاس رحمت کے غیر متناہی خزانے ہوں، اور کسی مستحق کو زیادہ سے زیادہ دینے میں نہ اس کو اپنے تہی دست رہ جانے کا خوف ہو، نہ اس کا اندیشہ ہو کہ دوسرا ہم سے لے کر کہیں مدمقابل نہ بن جائے، یا آگے چل کر ہمیں عاجز نہ کردے۔

خداوند قدوس جلّ شانہ کے پاس ظاہری، باطنی، مادی، روحانی خزانوں کی اتنی بہتات ہے جن کی حد نہیں۔ ہاں! وہ اپنے بندوں پر ان کی استعداد کے مطابق رحمتوں کا دروازہ کھول دیتا ہے تاکہ وہ سرکشی اور بغاوت اختیار نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ شانہ کو کمزور اور تنگدل بندوں پر قیاس کرنا حرام اور کفر وحماقت ہوگا۔ اگر فرض کیا جائے اور بندے کو خزائن رحمت کا مالک مختار بنایا جائے تب بھی وہ اپنی طبیعت وفطرت سے بخل اور تنگدلی نہ چھوڑے، اور کسی مستحق کو دینے سے اس لئے گھبرا اٹھے کہ کہیں سارا مال خرچ نہ ہوجائے، اور میں خالی ہاتھ رہ جاؤں، یا جس پر آج خرچ کرتا ہوں کل وہ میری ہمسری نہ کرنے لگے۔

بہرحال! اگر رحمتِ الٰہیہ کے خزانے تمہارے قبضہ میں ہوتے تو تم کسی کو دینے والے نہ تھے، اور کہاں گوارا کرسکتے تھے کہ مکہ وطائف کے بڑے متکبر دولتمندوں کو چھوڑ کر وحی ونبوت کی یہ بیش بہا دولت بنی ہاشم کے ایک دریتیم کو مل جائے۔ یہ حق تعالیٰ کا فیض ہے کہ جس میں جیسی استعداد اور قابلیت دیکھی، اس کے مناسب کمالات وانعامات کے خزانے انڈیل دیئے۔ تمہارے تعنت وتعصب سے خدا کا فضل رکنے والا نہیں۔ سرورِ عالم ﷺ کے طفیل میں جو

خزائن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو ملنے والے ہیں مل کر رہیں گے، اور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروکار دریادلی سے اس گرانقدر دولت کو بنی نوع انسان پر خرچ کریں گے، تمہاری طرح تنگدلی نہیں دکھائیں گے۔[عثمانی]

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسٰى تِسْعَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ فَسْـَٔلْ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اِذْ جَاۗءَهُمْ فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّىْ
لَاَظُنُّكَ يٰمُوْسٰى مَسْحُوْرًا ﴿۱۰۱﴾ قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَاۗءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَاۗىِٕرَ ۚ
وَاِنِّىْ لَاَظُنُّكَ يٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا ﴿۱۰۲﴾ فَاَرَادَ اَنْ يَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِيْعًا ﴿۱۰۳﴾
وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِيْفًا ﴿۱۰۴﴾

ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے موسیٰ کو کھلی ہوئی نو نشانیاں عطاء کیں، سو آپ بنی اسرائیل سے پوچھ لیجئے، جب موسیٰ ان کے پاس آئے، تو فرعون نے ان سے کہا کہ موسیٰ! بلاشبہ میں تیرے بارے میں یہ گمان کرتا ہوں کہ کسی نے تیرے اوپر جادو کر دیا ہے ﴿۱۰۱﴾ موسیٰ نے جواب میں کہا کہ تو ضرور جانتا ہے کہ یہ چیزیں آسمانوں اور زمین کے پروردگار ہی نے نازل فرمائی ہیں، جو بصیرت کا ذریعہ ہیں، اور اے فرعون! میں تیرے بارے میں یہ خیال کرتا ہوں کہ تو ہلاک ہو جانے والا ہے ﴿۱۰۲﴾ پھر اس نے چاہا کہ انہیں زمین سے اکھاڑ دے، سو ہم نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو سب کو غرق کر دیا ﴿۱۰۳﴾ اور اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ زمین میں رہو سہو، اور پھر جب آخرت کا وعدہ آجائے گا تو ہم تمہیں جمع کر کے حاضر کر دیں گے ﴿۱۰۴﴾

معارف ومنازل

یعنی جیسے آپ کو فضل ورحمت سے قرآن عظیم عنایت فرمایا، اور بہت کچھ مہربانیاں آپ پر فرمائیں، ہم پہلے موسیٰ علیہ السلام کو صداقت کے نو کھلے ہوئے نشانات (معجزات) ان کے مناسب حال عنایت فرما چکے ہیں، جبکہ وہ بنی اسرائیل کے پاس ان کو فرعون کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے تشریف لائے تھے، اگر چاہو تو بنی اسرائیل کے باخبر اور منصف مزاج علماء سے پوچھ کر دیکھو کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ نو معجزات یہ ہیں:

(۱) ید بیضاء (۲) عصاء (۳) سنین (۴) نقص ثمرات (۵) طوفان (۶) جراد (۷) قمل (۸) ضفادع (۹)

دم۔ یہ سورۂ اعراف رکوع ۱۶ میں بیان ہوئے۔

مسند احمد، ترمذی وغیرہ کی ایک حدیث میں ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے تسع آیات کے متعلق سوال کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: وہ یہ احکام ہیں: (۱) شرک نہ کرو (۲) سود مت کھاؤ (۳) بیگناہ کو مت پکڑو کہ حاکم اُسے قتل کردے (۴) عفیف عورتوں پر تہمت نہ لگاؤ (۵) چوری نہ کرو (۶) زنا نہ کرو (۷) ناحق خون مت کرو (۸) جادو نہ کرو (۹) جہاد میں سے مت بھاگو۔ نو حکم تو یہ ہوئے جن کے سب لوگ مخاطب ہو سکتے ہیں، دسواں حکم (اے یہود!) تمہارے لئے مخصوص تھا کہ سبت (ہفتہ) کے دن حد سے تجاوز نہ کرو۔ یہود نے یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تصدیق کی۔ [مشکوٰۃ]

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ ودیگر بعض محدّثین نے اس حدیث کو مجروح قرار دیا ہے، تاہم صحیح بات یہ ہے کہ یہ حدیث قابلِ اعتماد ہے، جسے حضرت امام احمد اور امام ترمذی ودیگر محدثین رحمۃ اللہ علیہم نے بھی نقل کیا ہے۔

یہاں اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہودیوں نے تو نو نشانیوں کے متعلق پوچھا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جواب میں دس احکام ذکر فرمائے؟ محدّثین حضرات فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ جواب عَلٰی سَبِیلِ اُسْلُوْبِ الْحَکِیم تھا، یعنی مخاطب وسائل کو حکمت کے طریقے پر بات سمجھائی گئی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مطلب یہ تھا کہ تم نو نشانیوں کو معلوم کرکے کیا حاصل کرو گے؟ تم تورات کے شروع کے ان دس احکام کو سیکھو، اوران پر عمل پیرا رہو، جن سے نجات اور ابدی سعادت وابستہ ہے۔

﴿فَسْـَٔلْ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اِذْ جَآءَهُمْ﴾ پس آپ پوچھ لیں بنی اسرائیل سے جب کہ موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس آئے۔

﴿فَقَالَ لَهٗ فِرْعَوْنُ اِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰمُوْسٰی مَسْحُوْرًا﴾ اے موسیٰ! میں تو تجھے سحر زدہ گمان کرتا ہوں، کسی نے تجھ پر جادو کردیا ہے، تیرے عقل وہوش ٹھکانے پر نہیں، اس لئے میرے سوا کسی اور خدا کی باتیں کرتے ہو۔ سورۃ الشعراء میں ہے کہ فرعون نے اپنے درباریوں سے کہا کہ یہ شخص پاگل ہے، پاگلوں کی طرح باتیں کرتا ہے۔ ﴿اِنَّ رَسُوْلَكُمُ الَّذِیْۤ اُرْسِلَ اِلَیْكُمْ لَمَجْنُوْنٌ﴾ [الشعراء: ۲۷] (بیشک تمہارا پیغام رساں جو تمہاری طرف بھیجا گیا ہے پاگل ہے)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسی انداز میں فرعون کو مخاطب ہوکر فرمایا کہ مجھے سحر زدہ، ساحر ومجنون کہنے والا! ذرا سنو! کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اپنے ربّ کی طرف سے بصیرت کی چیزیں لے کر آیا ہوں، جن کے

متعلق تم بھی جانتے ہو کہ یہ سب کچھ برحق ہے، جب تم ہٹ دھرمی کی بنیاد پر نہیں مانتے ہو تو میں یہی سمجھتا ہوں کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے، تیری تباہی کا وقت آپہنچا ہے۔

﴿قَالَ لَقَدْ عَلِمْتَ مَآ اَنْزَلَ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ بَصَآئِرَ﴾ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اے فرعون! تو خوب جانتا ہے کہ یہ نشانیاں (عصاء، ید بیضاء وغیرہ) آسمان وزمین کے پروردگار نے نازل فرمائی ہیں، اور میرے ہاتھ پر ظاہر کی ہیں، یہ سب ایمان افروز اور بصیرت کی چیزیں ہیں، انہیں دیکھ کر تمہیں تسلیم کرنا ہوگا، بصورت دیگر:

﴿وَاِنِّیْ لَاَظُنُّكَ یٰفِرْعَوْنُ مَثْبُوْرًا﴾ بیشک میں تجھے ہلاک زدہ خیال کرتا ہوں، تو عنقریب ہلاک ہونے والا ہے۔ سورۂ نمل میں فرمایا: ﴿وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَیْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا﴾ [النمل:١٤] (اور اگر چہ ان کے دلوں کو ان کا یقین ہو چکا تھا مگر انہوں نے ظلم اور تکبر کی وجہ سے ان کا انکار کیا)۔ فرعونیوں نے بظاہر موسیٰ علیہ السلام کا انکار تو کیا، مگر ان کے دل تسلیم کر چکے تھے کہ جو کچھ ان کے ہاتھ پر ظاہر ہو رہا ہے یہ انسانی کام نہیں ہے، وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، خاص کر جادوگروں کی شکست اور ان کے ایمان قبول کرنے کے بعد جب تمام شبہات ختم ہو گئے تھے:

﴿فَاَرَادَ اَنْ یَّسْتَفِزَّهُمْ مِّنَ الْاَرْضِ﴾ سو ارادہ کیا کہ بنی اسرائیل کے قدم اپنی سرزمین سے اکھاڑ دے، ملک بدر کر دے، یا ایک ایک کر کے انہیں ہلاک کر دے۔

﴿فَاَغْرَقْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ جَمِیْعًا﴾ پھر ہم نے اس کو اور اس کے تمام ساتھیوں کو غرق کر دیا، وہ اور اس کا پورا لشکر جو ستر لاکھ کے قریب تھا بحر قلزم کی موجوں کی نذر کر دیا، پیچھے پوری قوم میں صرف عورتیں رہ گئیں۔

﴿وَّقُلْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ لِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اسْكُنُوا الْاَرْضَ﴾ تو اس کے بعد ہم نے بنی اسرائیل سے کہا کہ تم سرزمین شام وفلسطین میں رہو، چنانچہ وہ وہاں سے آکر میدان تیہ میں اپنی ناشکری اور نافرمانیوں کی وجہ سے ستر سال تک سرگرداں پھرتے رہے۔ تفصیل بقرۃ اور اعراف میں گزر چکی ہے۔

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ الْاٰخِرَةِ جِئْنَا بِكُمْ لَفِیْفًا﴾ پھر جب آخرت کا وعدہ آپہنچے گا تو ہم تم سب کو لپیٹ کر (جمع کر کے) لے آئیں گے۔ یعنی میدان محشر میں سب کو اکٹھا کر لیں گے۔ واقعہ بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر قریش مکہ اپنے پیشرو فرعون کی طرح ضد وسرکشی سے باز نہیں آئے، اور مسلسل کفر وشرک پر ڈٹے رہے تو ان کا انجام بھی

فرعون کی طرح ہوگا۔

وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۱۰۵﴾ وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ
عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ﴿۱۰۶﴾ قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖۤ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖۤ اِذَا يُتْلٰى عَلَيْهِمْ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ سُجَّدًا ﴿۱۰۷﴾ وَّيَقُوْلُوْنَ سُبْحٰنَ رَبِّنَاۤ اِنْ
كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ﴿۱۰۸﴾ وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ﴿۱۰۹﴾ (سجدہ)

ترجمہ: اور ہم نے اُسے حق کے ساتھ اتارا، اور وہ حق کے ساتھ نازل ہوا، اور ہم نے آپ کو صرف خوشخبری سنانے والا، اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے﴿۱۰۵﴾ اور ہم نے قرآن میں جا بجا فصل رکھا ہے، تا کہ آپ لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا ہے﴿۱۰۶﴾ آپ فرما دیجئے کہ تم اس پر ایمان لاؤ یا ایمان نہ لاؤ، بلا شبہ جن لوگوں کو اس سے پہلے علم دیا گیا ان کے سامنے رحمٰن کی آیات پڑھی جاتی ہیں، تو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں﴿۱۰۷﴾ اور کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ پاک ہے، بلا شبہ ہمارے ربّ کا وعدہ ضرور ہی پورا ہونے والا ہے﴿۱۰۸﴾ اور وہ رونے کی حالت میں ٹھوڑیوں کے بل گر پڑتے ہیں، اور یہ قرآن ان کا خشوع بڑھا دیتا ہے﴿۱۰۹﴾

معارف ومنازل

خوشتر آن باشد کے سرّ دلبران ☆ گفتہ آید در حدیث دیگران

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات آیات بینات کے تذکرہ کے بعد روئے سخن پھر عظیم المرتبت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم الشان معجزہ قرآن کریم کی طرف پھیر دیا گیا، کیونکہ وہ عظیم معجزہ ہے، جو رہتی دنیا تک چاروں افق پر باقی رہنے والا ہے۔ تو ان آیات میں اس عظیم الشان معجزہ اور اس کے عظیم المرتبت صاحب معجزہ سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کا بیان ہے، اور قرآن کریم کی تلاوت سے متاثر ہو کر رونے والوں کی تعریف ہے۔ فرمایا: ہم نے قرآن کریم کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے، اور وہ حق ہی پر نازل ہوا ہے، بھیجنے والے نے حق کے ساتھ بھیجا، لانے والے نے حق کے ساتھ لایا، جس کے پاس آیا حق ہی کے ساتھ پہنچا، درمیان میں کسی طرح کا تغیر و تبدل نہیں ہوا۔

﴿وَبِالْحَقِّ اَنْزَلْنٰهُ وَبِالْحَقِّ نَزَلَ﴾ اور حق ہی کے ساتھ ہم نے اس کو اتارا ہے، اور حق ہی کے ساتھ وہ نازل

ہوا ہے۔ اوّل الحق سے مراد ہے وہ حکمت و مصلحت جو نزول کی مقتضی تھی، دوسرے الحق سے مراد ہے دانائی اور سچائی ہے، جو قرآن کے اندر ہے۔

﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا﴾ اور ہم نے آپ کو صرف بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی آپ کا کام بشارت اور انذار ہے، ہدایت پر مجبور کرنا آپ کا کام نہیں۔ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾[النحل:۱۰۲] (کہہ دو کہ: یہ تو روح القدس تمہارے ربّ کی طرف سے ٹھیک لے کر آئے ہیں تا کہ وہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے، اور مسلمانوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری کا سامان ہو)۔

آپ کے ربّ کی طرف سے پاکیزہ فرشتہ جبرئیل امین علیہ السلام نے آہستہ آہستہ وقفہ کے ساتھ اتارا، تا کہ تدریج احکام و آیات کا نزول دیکھ کر ایمان والوں کے دل قوی اور اعتقاد پختہ ہو جائیں کہ ہمارا ربّ ہمارے ہر حال سے ہر وقت باخبر ہے، اور نہایت حکمت سے موقع بموقع ہماری تربیت فرماتا ہے، جیسے حالات پیش آئے ان کے موافق ہماری راہنمائی اور ہدایت کا انتظام کرتا ہے، اور ہر کام پر اس کی مناسبت سے خوشخبری سناتا ہے۔ یہ سارے فیوض وبرکات تدریجی نزول قرآن کے ساتھ وابستہ ہیں، جیسے کوئی معلّم اپنے شاگردوں کی تدریجی تربیت کرے۔

﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ اور قرآن میں جابجا ہم نے فصل رکھا تا کہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں، اور ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے تدریجاً اتارا۔ مطلب یہ ہے کہ فصل کہتے ہیں اس کو کہ ایک آیت کے بعد دوسری آیت شروع ہوتی ہے، اسی طرح ایک سورت کے بعد دوسری سورت، اور ایک مضمون کے بعد دوسرا مضمون۔ اس میں آیات، اوقاف، فواصل اور سورتوں کا تنوّع رکھا گیا ہے تا کہ آپ لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں تا کہ سننے والے سمجھ سکیں، اور حفظ کرنے والے حفظ کر سکیں، اور وعدہ وعید کے تکرار سے زجر و بشارات کی تجدید ہو۔

عَلٰى مُكْثٍ کے یہ معنی لئے جائیں تو اس میں ترتیل و تجوید کے ساتھ اس طرح پڑھنا بھی آ جاتا ہے کہ تلاوت میں قرآن مجید کے حروف نہ کٹیں، اور کسی طرح کی کمی بیشی نہ ہو۔

فَرَقْنٰهُ کے معنی ہیں: تھوڑا تھوڑا کرنا۔ مُكْثٍ کے معنی ہیں: وقفہ وقفہ۔ اور بعض مفسرین نے فرمایا: فَرَقْنٰهُ سے مراد ہے حق و باطل میں امتیاز کرنا، مثلاً حرام و حلال کا علیحدہ علیحدہ بیان، یا نیکی و بدی میں امتیاز وغیرہ۔

﴿وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔ صاحب روح المعانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ قرآن کریم لوح محفوظ سے ماہ رمضان میں شب قدر میں آسمان دنیا پر پورا نازل کیا گیا، اور وہاں سے بیت العزت میں رکھ دیا گیا، پھر وہاں سے تھوڑا تھوڑا کر کے حسب مصالح العباد بواسطہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تیئیس (۲۳) سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے سید الانبیاء خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا۔

لفظ تَنْزِيل تفعیل کا وزن ہے، اور یہ وزن اپنی بعض خاصیات کے اعتبار سے کسی کام کے تھوڑا تھوڑا کرنے پر دلالت کرتا ہے، اسی لئے مفسرین کرام نَزَّلْنٰهُ کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ ہم نے اُسے تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا۔ تفسیر جلالین نے کہا: وَنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا شَيْئًا بَعْدَ شَيْءٍ عَلٰى حَسَبِ الْمَصَالِحِ.

﴿قُلْ اٰمِنُوْا بِهٖٓ اَوْ لَا تُؤْمِنُوْا﴾ اس میں ربّ العزت جلّ شانہ نے آنحضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ لوگوں سے فرما دیجئے کہ تم اس قرآن پر ایمان لاؤ یا نہ لاؤ، ایمان کا فائدہ تمہیں پہنچے گا، اور انکار کا نقصان بھی تمہیں ہی پہنچے گا، تمہارے ایمان نہ لانے سے میرا کوئی ضرر نہیں، اور یہ بھی یقین کرلو کہ قرآن کا بقاء اور اس کا پورے عالم میں آگے بڑھنا، اور ہر گوشہ جہاں میں پھیلنا کوئی تم پر موقوف نہیں، اور جن لوگوں کو نزول قرآن سے پہلے علم دیدیا گیا تھا انہوں نے پہلی فرصت پر ایمان قبول کرلیا، جب قرآن کریم اس کے سامنے پڑھا جاتا ہے تو وہ ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گر پڑتے ہیں، اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ربّ تعالیٰ پاک ہے، وہ وعدہ خلافی نہیں کرتا، وہ جو وعدہ کرتا ہے وہ ضرور پورا ہو کر رہے گا۔

﴿وَيَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا﴾ یہ لوگ جو ٹھوڑیوں کے بل سجدے میں گرتے ہیں، روتے ہوئے گرتے ہیں، اور قرآن کا سننا ان کے خشوع کو اور زیادہ کر دیتا ہے۔ صاحب معالم التنزیل فرماتے ہیں کہ: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مِنْ قَبْلِهٖٓ﴾ سے مؤمنین اہل کتاب مراد ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے دین حق کی تلاش میں تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے منتظر تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا انہیں علم ہو گیا تو فوراً آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آئے، اور قرآن کو سنا اور پڑھا، جب قرآن کو سنتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایمان کی دولت اور قرآن کی حکمت سے نوازا، وہ جب روتے ہوئے سجدہ کرتے ہیں، اور یہ قرآن ان کے قلوب میں اور زیادہ خشوع بڑھنے کا سبب بن جاتا ہے، بطور مثال علامہ بغویؒ نے زید بن عمرو بن نفیل، اور سلمان فارسی، اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہم کے نام لکھے ہیں۔

اور علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا ہے کہ اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو پہلے اہل کتاب تھے، پھر مسلمان ہو گئے، جیسے ورقہ بن نوفل، عبداللہ بن سلام، حضرت اصحمہ، شاہ نجاشی وغیرہ حضرات، جیسے ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ﴾[المائدة: ۸۳] (اور جب یہ لوگ وہ کلام سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا ہے تو چونکہ انہوں نے حق کو پہچان لیا ہوتا ہے اس لیے تم ان کی آنکھوں کو دیکھو گے کہ وہ آنسوؤں سے بہہ رہی ہیں)۔

لفظ اَذْقَان ذَقَن کی جمع ہے، جس کا ترجمہ ٹھوڑی کیا گیا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اس سے چہرے مراد ہیں، سجدہ صحیح طریقے پر کیا جائے تو ٹھوڑی زمین سے لگنے کے قریب ہو جاتی ہے، اس لئے ٹھوڑیوں کے بل سجدہ کرنے سے تعبیر فرمایا۔ علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ہر وہ شخص جو صفت علم سے متصف ہوا سے اس مرتبہ تک پہنچنا چاہئے کہ قرآن کریم سننے کے وقت اس کے دل میں خشوع موجزن ہو، اور نہایت عاجزانہ تڑپ و نیاز ہو۔ مسند دارمی میں ابو محمد تیمی رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے کہ جسے علم دیا گیا لیکن اس کے علم نے اسے نہیں رلایا، وہ اس لائق ہے کہ اُسے علم نہ دیا جاتا (یعنی وہ علم کا حقدار نہیں، بے بہرہ ہے) کیونکہ اللہ تعالیٰ نے علماء کی یہ صفت بیان فرمائی کہ چہروں کے بل روتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتے ہیں، اس کے لئے انہوں نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھتے ہوئے بھی بکثرت روتے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینہ مبارک سے ایسی آواز آتی تھی جیسے چکی چلنے کی آواز ہوتی ہے۔ [أبو داؤد، نسائي] حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا نماز فجر میں رونے کا تقریباً معمول تھا۔ [بخاري]

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ ۖ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ۚ

وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ﴿۱۱۰﴾

ترجمہ: آپ فرما دیجئے کہ اللہ کہہ کر پکارو، یا رحمٰن کہہ کر، جس نام سے بھی پکارو اس کے لئے اچھے اچھے نام ہیں، اور نماز میں نہ تو زور کی آواز سے پڑھئے، اور نہ چپکے چپکے پڑھئے، اور دونوں کے درمیان اختیار کر لیجئے ﴿۱۱۰﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

تفسیر درمنثور میں حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے نقل کیا ہے کہ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں یا اللہ یا رحمٰن کہا، تو مشرکین مکہ نے کہا کہ اس نئے دین والے کو دیکھو، ہمیں دو معبودوں کی عبادت سے منع کرتا ہے، اور خود دو معبودوں کو پکار رہا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ:

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ﴾ نازل فرمائی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رحمٰن کہہ کر پکارنا دو معبودوں کا پکارنا نہیں ہے، معبود تو ایک ہے، جو وحدہٗ لاشریک لہ ہے، یہ دونوں اس کے نام ہیں، اس کو جس نام سے بھی پکار لیا تو کوئی شرک لازم نہیں آیا۔ اور تم تو کئی معبودوں کو مانتے ہو، تمہارے معبود ایسے نہیں ہے کہ ذات ایک ہو اور نام کئی عدد ہوں۔ تمہارے عقیدے میں معبودوں کی ذاتیں متعدد ہیں، اور میرا جو معبود برحق ہے، ایک ہی ہے، وہ معبود حقیقی ہے، جس کا نام اللہ بھی ہے، رحمن بھی ہے، ان دونوں ناموں کے علاوہ اور بھی اس کے بہت سے اچھے نام ہیں، ان ناموں میں سے جو نام لے کر بھی اسے پکارا جائے گا صحیح ہوگا، اور شرک نہ ہوگا، یہ سب ایک ذات پاک کے نام ہیں۔

بعض علماء جیسے حضرت امام رازی اور حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہما اور دیگر حضرات کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے مختلف زبانوں میں چار ہزار نام ہیں۔ تفصیل سورۃ الاعرف میں گزر چکی ہے، وہاں دیکھیں۔

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا﴾ صحیح بخاری میں ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم ابتداء اسلام میں مکہ معظمہ میں چھپ کر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو نماز جہراً پڑھاتے تھے، جس میں قراءت اونچی آواز میں پڑھاتے تھے۔ جب مشرکین قرآن سنتے تھے تو قرآن کو اور قرآن نازل کرنے والے کو بُرے الفاظ میں یاد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ نماز میں زور سے قراءت نہ پڑھیں، جسے سنکر مشرکین بُرے الفاظ کہنے کا موقع نہ پالیں، اور بالکل آہستہ بھی نہ پڑھیں جسے آپ کے رفقاء نہ سن سکیں، آپ دونوں کے درمیان متوسط طریقہ اختیار کرلیں۔

پس بہتر طریقہ یہ ہے کہ جن نمازوں میں قراءت جہر سے پڑھی جاتی ہے ان میں اتنا جہر کافی ہے کہ اپنے مقتدی سن سکیں، اتنے زور سے قراءت بالجہر نہ کی جائے کہ آس پاس کے لوگوں کے آرام میں خلل واقع ہو، یا فساق وفجار کو بُرے الفاظ کہنے کی جرأت وبہانہ ہو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ یہ آیت دعاء کے بارے میں نازل ہوئی کہ دعاء کرنے میں درمیانہ لہجہ اختیار کیا جائے۔ [بخاري] حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک پہاڑی کی گھاٹی میں چڑھ رہے تھے، اس وقت کچھ لوگوں نے بلند آواز سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللہ، اللہ اکبر پڑھنا شروع کیا، سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر ارشاد فرمایا کہ آہستہ پڑھو، تم لوگ کسی بہرے یا کسی غائب کو نہیں پکار رہے ہو، تم اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہو، جو سنتا بھی ہے، اور حاضر بھی ہے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا: کیا تمہیں جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ بتادوں؟ وہ ہے: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللہِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ۔ [بخاري]

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات نصف شب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر گزرے، پھر صبح کو فرمایا کہ ابوبکر! میں تمہارے قریب سے گزرا تو معلوم ہوا کہ تم پست آواز میں قرآن پڑھ رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ جس ذات پاک سے مناجات کررہا تھا اس کو میں نے سنادیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تھوڑی سے آواز اونچی کرکے پڑھا کرو۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ میں تمہارے قریب سے گزرا تو تم اونچی آواز سے قراءت پڑھ رہے تھے، انہوں نے عرض کیا کہ میں اپنی بلند آواز سے اونگھنے والوں کو جگاتا ہوں، اور شیطان کو بھگاتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اپنے آواز کو ذرا سا پست کرو۔ [بخاري، ترمذي]

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا ﴿١١١﴾

ترجمہ: اور آپ یوں کہیئے کہ سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے، جس نے اپنے لئے کوئی اولاد نہیں بنائی، اور نہ اس کے لئے ملک میں کوئی شریک ہے، اور نہ ایسی بات ہے کہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی ولی ہو، اور آپ خوب اچھی طرح سے اس کی بڑائی بیان کیجئے ﴿١١١﴾

معارف ومنازل

سورت کی ابتداء اللہ تعالیٰ کی تسبیح سے ہوئی تھی، اور خاتمہ اللہ تعالیٰ کی حمد اور تکبیر پر ہورہا ہے۔ ایک مؤمن کا سرمایہ یہی ہونا چاہئے کہ صبح وشام، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اپنا کام بھی جاری رکھے، اور یہ عظیم الشان کلمات کا وِرد بھی

جاری رکھے، جس کے ساتھ اس کے تمام مسائل حل ہوتے رہیں گے: سُبحَانَ اللهِ وَالحَمدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ أكبر. سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے انہی کلمات کی پڑھنے کا شب معراج سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلقین فرمائی تھی کہ اپنی امت کو سکھائیں۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی ہاشم کے بچوں کو جونہی بولنے لگتے یہی کلمات سکھاتے، اور صلوٰۃ تسبیح کہ جس سے تمام گناہ معاف ہوتے ہیں اس میں انہی کلمات کا تکرار اور وِرد مقرر ہے، اور مشائخ چشت کا یہی روزمرہ معمول ہے۔

اکابر نے تجربہ سے بتایا ہے کہ دعا و مناجات سے پہلے انہی کلمات کا وِرد ہو، پھر درود شریف پڑھ کر دعا کی جائے، اور آخر میں بھی، اسی سے دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔ اگر کوئی شخص سوتے وقت ان کلمات کو پڑھ کر سو جائے تو ساری رات ہر بلا سے محفوظ رہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ أَفضَلُ الذِّكرِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ ہے، اور أَفضَلُ الدُّعَاءِ الحَمدُ لِلّٰهِ ہے۔ [ترمذي] جنتی جنت میں انہی کلمات کے ساتھ داخل ہوتے ہیں: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ لَوْلَآ اَنْ هَدٰىنَا اللّٰهُ﴾ [الأعراف: ۴۳] (اور وہ کہیں گے: تمام تر شکر اللہ کا ہے، جس نے ہمیں اس منزل تک پہنچایا، اگر اللہ ہمیں نہ پہنچاتا تو ہم کبھی منزل تک نہ پہنچتے)۔ ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ﴾ [فاطر: ۳۴] (اور وہ کہیں گے کہ: تمام تر تعریف اللہ کی ہے، جس نے ہم سے ہر غم کو دور کر دیا، بیشک ہمارا پروردگار بہت بخشنے والا، اور بڑا قدرداں ہے)۔ ﴿وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ [الزمر: ۷۵] (اور کہا جائے گا: تمام تعریف اللہ کے لیے ہے جو مخلوقات کا پالنے والا ہے)۔

قرآن حکیم کی پانچ سورتوں کا شروع الْحَمْدُ لِلّٰهِ کے ساتھ ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن سب سے پہلے جنت کی طرف وہ لوگ بلائے جائیں گے جو خوشی میں اور دکھ و تکلیف میں اللہ تعالیٰ شانہ کا حمد بیان کرتے تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے روایت کی ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حمد اصل شکر ہے، اس بندے نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کیا جو اس کا حمد بیان نہیں کرتا۔ [رواه البيهقي في شعب الايمان]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں ایک مرتبہ سُبحَانَ اللهِ وَالحَمدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ أكبر. کہہ دوں تو یہ مجھے ان سب چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج نکلتا ہے، یعنی دنیا کی ساری چیزوں سے۔ [مسلم] اس آیت کریمہ میں خالص توحید الٰہی کا درس ہے، کیونکہ دوسروں سے مدد

طلب کرنے کے تین طریقے ہوتے ہیں: (۱) چھوٹے سے مدد طلب کی جاتی ہے، جیسے باپ اولاد سے مدد طلب کرتا ہے۔ (۲) یا اپنے برابر سے، جیسے ایک شریک دوسرے شریک سے طلب کرتا ہے۔ (۳) یا کسی بڑے سے، جیسے کمزور آدمی مصیبت کے وقت بڑے آدمی سے مدد طلب کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے اس آیت میں مدد طلب کرنے کے تینوں طریقوں کی نفی فرمائی ہے۔

﴿لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا﴾ سے پہلے طریقے کی۔ ﴿وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ﴾ سے دوسرے طریقے کی۔ ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلِيٌّ مِّنَ الذُّلِّ﴾ سے تیسرے طریقے کی، اور آخر میں ﴿وَ كَبِّرْهُ تَكْبِيْرًا﴾ میں اپنی عظمت کبریائی اور جلالت شان کی طرف متوجہ فرمایا ہے۔

الغرض! اس آیت کریمہ میں سورۂ اخلاص کی طرح خالص توحید کا بیان ہے، اور شرک کے ممکنہ و مروّجہ تمام اقسام کا ابطال اور بیخ کنی اور تردید ہے۔ یہود، نصاریٰ، بدھ مت، ہندومت، صابی، پارسی، مجوس، مشرکین اور اہل بدعت وغیرہ کے تمام معتقدات اور اعمالِ کفریہ وافعالِ شرکیہ کا مکمل رد اور ابطال ہے۔ اسی مقصد اعلیٰ کی تائید میں آنے والی سورت "سورۃ الکھف" میں چند برگزیدہ و مخلص وموحّد حضرات اصحاب الکھف والرقیم کا تذکرہ ہے۔

الحمدللہ سورۃ الاسراء کی تفسیر اپنے اختتام کو پہنچی۔

رَبنا تَقبَل مِنا اِنَکَ أنت السَمِیعُ العَلیمُ وَ وفقنا لِتکمِیل ھٰذاالأمرِ الجَلیلِ وَ انفعنابِه وَجمیع المُسلمین وَ المُسلِمَاتِ وَ اجعلهُ سببًا لِحُسنِ خَاتِمتِنا وَ مغفِرتِنا یَاأرحَم الرَاحِمین .آمین. بِوَسیلةِ صاحِبِ المِعراج صَلّی اللہ علیہِ و اٰلِہِ و أصحابِہ أجمعِینَ و أمَتِه. آمین.

……❁……❁……❁……

سُورَةُ الْكَهْفِ

مكيةٌ آياتها ۱۱۰ رکوعاتها ۱۲

سورۂ کہف مکی ہے، اس میں ایک سودس (۱۱۰) آیتیں، اور بارہ (۱۲) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الکھف ہے جو اس سورت کی آیت (۹) میں موجود ہے، یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔ اس سورت کو کہف اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں اُن موحدین کے حیرت انگیز محیر العقول عجیب وغریب حال کا بیان ہے جو ''کہف'' یعنی غار میں تین سونو برس (۳۰۹) تک سو کر جاگے تھے، یہ خوش قسمت لوگ اپنے ایمان کو بچانے کے لئے پہاڑی غار میں چھپ گئے تھے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں اٹھارویں (۱۸) نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں (۶۹) نمبر پر ہے۔

نزول:

یہ سورت مکّی ہے، مکی دور میں نازل ہوئی، اس کا نزول سورۃ الغاشیہ کے بعد ہے، اس سورت میں کُل رکوع ۱۲، اور کُل آیات ۱۱۰ ہیں، اور کلمات (۱۶۰۸) ہیں، اور حروف (۶۶۲۰) چھ ہزار چھ سو بیس ہیں۔

ربط ومناسبت:

(۱) گزشتہ سورت کے آخر میں حمد خداوندی اور توحید خداوندی کا بیان تھا، اس سورت کے شروع میں انہی دونوں کا بیان ہے۔ (۲) دونوں سورتوں میں دلائلِ نقلیہ کے ساتھ توحید باری تعالیٰ کا یکساں بیان ہے۔ (۳) دونوں

سورتوں میں صداقت قرآن کا ایک جیسے بیان ہے، اور دونوں سورتوں کے آخر میں فرائض خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا یکساں بیان ہے۔ (۴) گزشتہ سورت کے اوّل میں خارق عادت معراج کا بیان ہوا، اس سورت میں اصحاب الکہف والرقیم کا عجیب وغریب خارق عادت کا بیان ہے۔ (۵) اہل مکّہ نے یہود کی راہنمائی سے تین سوالات کئے گزشتہ سورت میں ان میں سے روح کا بیان تھا، جبکہ اس سورت میں باقی دو (اصحاب کہف اور ذوالقرنین) سوالوں کا تفصیلی جواب اور بیان ہے۔

مختصر موضوع:

اصولِ ثلاثہ: توحید، رسالت، قیامت کا بیان اور دنیوی زندگی کے اعتبار سے انسانوں کے چار طبقات کا بیان (۱) ادنیٰ درجہ کے دیندار اصحاب کہف (۲) اعلیٰ درجہ کے دیندار موسیٰ علیہ السلام مع خضر علیہ السلام (۳) ادنیٰ درجہ دنیادار اصحاب الجنتین (۴) اعلیٰ درجہ دنیادار حضرت ذولقرنین۔

فضیلت سورۂ کہف:

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس نے جمعہ کے روز سورۂ کہف پڑھی اس کے لئے اس جمعہ سے اگلے جمعے تک ایک نور چمکتا رہے گا۔ [مظهري] دوسری روایت میں ہے کہ جو شخص اس سورت کی تلاوت کرے وہ دجّال کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس کے نزول میں ستر ہزار فرشتے شامل رہے۔ [مظهري]

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۝۱ قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا
شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۝۲
مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ۝۳ وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۝۴ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا
لِاٰبَآئِهِمْ ۭ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۭ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ۝۵

ترجمہ: سب تعریف اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب نازل فرمائی، اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی ① اس کتاب کو استقامت والا بنایا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب سے ڈرائے، اور

مؤمنین کو بشارت دے جو نیک عمل کرتے ہیں کہ ان کے لئے اچھا اجر ہے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۝۳ اور تا کہ ان لوگوں کو ڈرائے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اولاد رکھتا ہے ۝۴ انہیں اس کے بارے میں کچھ بھی علم نہیں ہے، اور نہ ان کے باپ دادوں کو، بڑا بول (جھوٹ وافتراء) ہے جو ان کے مونہوں سے نکل رہا ہے، یہ لوگ بس جھوٹ ہی بول رہے ہیں ۝۵

معارف ومنازل

گزشتہ سورت میں ﴿سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ﴾ کا مژدہ وخوشخبری پہلی آیت میں سنایا، اب یہاں بھی پہلی آیت میں اسی پایہ کی خوشخبری سنا رہے ہیں، وہاں تسبیح تھی اور یہاں تحمید، وہاں عبد مکرّم کی معراج کا بیان، یہاں ابدی معجزہ نزول قرآن کا بیان فرمایا:

﴿اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ﴾ سب تعریف ہے اس ذات پاک کو جس نے اپنے (خاص) بندے پر قرآن مجید اتارا، یہ قرآن اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے، یہ بندوں کو ہدایت کا راستہ اور تکمیل انسانیت کا طریقہ بتاتا ہے، دنیوی معاش اور اخروی حیات جاوداں کی تعلیم دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی نے یہ نعمت عطا فرما کر اتنا بڑا احسان فرمایا ہے جس کی شکر گزاری قدم قدم پر لازم ہے، اس لئے انعام قرآن کا ذکر کر کے خود اپنی حمد وثناء کی اور اسی کے توسط سے اپنے بندوں کو حمد وثناء کرنے کی تعلیم دی۔

﴿وَلَمۡ يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا﴾ اور اس میں ذرا بھی کجی نہیں رکھی، نہ اندرونی کجی اور نہ ہی بیرونی کجی۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید کے نہ الفاظ میں کوئی نقص اور اختلال ہے، نہ معانی میں کوئی تعارض واختلاف ہے، جیسے فرمایا: ﴿لَا رَيۡبَ فِيۡهِ﴾ [البقرة: ۲] (اس میں کوئی شک نہیں)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿لَّا يَاۡتِيۡهِ الۡبَاطِلُ مِنۡۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَلَا مِنۡ خَلۡفِهٖ تَنۡزِيۡلٌ مِّنۡ حَكِيۡمٍ حَمِيۡدٍ﴾ [حم السجدة: ۴۲] (اس تک باطل کی کوئی رسائی نہیں ہے، نہ اس کے آگے سے نہ اس کے پیچھے سے، یہ اس ذات کی طرف سے اتاری جا رہی ہے جو حکمت کا ملک ہے، تمام تعریفیں اسی کی طرف لوٹتی ہیں)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ﴿قُرۡاٰنًا عَرَبِيًّا غَيۡرَ ذِيۡ عِوَجٍ﴾ [الزمر: ۲۸] (یہ عربی قرآن جس میں کوئی ٹیڑھ نہیں) کی تفسیر میں ﴿غَيۡرَ ذِيۡ عِوَجٍ﴾ کا ترجمہ غیر مخلوق کیا ہے۔ اس تفسیر کی روشنی میں بعض علماء نے

﴿وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا﴾ کا ترجمہ اور مرادی معنی یہ بیان کیا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو مخلوق نہیں کہا، یعنی قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے مخلوق نہیں، اور یہی حق بات ہے۔

"قَيِّمًا" استقامت کے ساتھ متصف فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی معتدل جس کے احکام میں نہ افراط (شدت) ہے نہ تفریط (زیادہ نرمی) ہے۔ امام فراء نے فرمایا: تمام آسمانی کتابوں کی صحت کا شاہد اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کرنے والا ہے۔ بعض اہل تفسیر نے کہا: تمام انسانوں کے مصالح کا درست کرنے والا ہے۔

"قَيِّمًا" سے پہلے عِوَجًا پر سکتہ یا وقف ضروری ہے تاکہ ﴿قَيِّمًا وَلَمْ يَجْعَلْ﴾ کی نفی کے تحت داخل نہ ہو جائے، اور "قَيِّمًا" ماقبل کا معمول نہیں، بلکہ محذوف فعل "اَنْزَلَهٗ" کا معمول ہے، اصل عبارت یوں ہے: "اَنْزَلَهٗ قَيِّمًا" اور اَنْزَلَهٗ کی ہائے ضمیر سے حال واقع ہے۔ [النشر لابن الجزري رحمه الله]

﴿قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا﴾ تاکہ (بندہ) قرآن کے ذریعہ سے کافروں کو ایک آنے والے سخت عذاب سے ڈرائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، اور جو مؤمن اچھے عمل کرتے ہیں ان کو خوشخبری و بشارت دے کہ انہیں اچھا اجر ملے گا۔

﴿مّٰكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا﴾ یہ لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے بلا کسی انقطاع کے۔

﴿وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ اور تاکہ ان لوگوں کو ڈرائے جنہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے اولاد بنالی ہے۔ پہلے تمام کافروں کو ڈرانے کا تذکرہ فرمایا، پھر مستقل طور پر ان لوگوں کے ڈرانے کا ذکر فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد تجویز کرتے تھے، جیسے مشرکین کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور یہود عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے تھے، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے ہیں، یہ سب سے بڑا شرک ہے، اسی کی تردید میں فرمایا:

﴿مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ﴾ نہ تو اس کی کوئی دلیل ان کے پاس ہے، نہ ان کے باپ دادوں کے پاس تھی، یہ جو کچھ کہتے ہیں کسی علم و دلیل کے بنیاد پر نہیں بلکہ محض اٹکل اور خود ساختہ گمان کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ جس طرح یہ محض گمراہ ہیں یہی حال ان کے آباء واجداد کا بھی رہا ہے۔

﴿كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ﴾ یہ بہت بڑا بول ہے جو ان لوگوں کے منہ سے نکل رہا ہے، جیسے

کہتے ہیں کہ چھوٹا منہ پہاڑوں جیسی بڑی بات، اس طرح کی بات انسانوں کو زیب نہیں دیتی، لیکن یہ لوگ انسانیت سے کوسوں دور اور جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

﴿اِنْ یَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا﴾ یہ لوگ سراسر جھوٹ ہی بولتے ہیں۔ سورۂ مریم میں فرمایا: ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾﴾ اور انہوں نے کہا کہ رحمٰن جل شانہ نے اپنے لئے اولاد بنالی ہے، فرمایا: یہ ایسی بھاری بات کہی گئی اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا جسے سن کر اگر آسمان، امین، پہاڑ مارے ہول کے پھٹ پڑیں اور ریزہ ریزہ ہوجائیں تو کچھ بعید نہیں، اس گستاخی پر اگر غضب الٰہی بھڑک اٹھے تو پورا عالم تہہ وبالا ہوجائے، اور آسمان وزمین کے پرخچے اڑ جائیں، محض اس کا حلم مانع ہے کہ ان بیہودگیوں کو دیکھ کر دنیا کو ایک دم تباہ نہیں کرتا، جس خداوند قدوس کی توحید پر آسمان زمین، پہاڑ اور ہر علوی سفلی چیز شہادت دے رہی ہے انسان کی یہ جسارت اور گستاخی کہ اس کے لئے اولاد ثابت کرلے نہایت سخت گستاخی ہے۔ العیاذ باللہ

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰۤى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا ﴿۶﴾ اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِیْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَیُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ﴿۷﴾ وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَیْهَا صَعِیْدًا جُرُزًا ﴿۸﴾

ترجمہ: سو ایسا تو نہیں کہ آپ ان کے پیچھے اپنی جان کو غم کی وجہ سے ہلاک کردینے والے ہیں، اگر یہ لوگ اس مضمون پر ایمان نہ لائیں ﴿۶﴾ بلاشبہ زمین پر جو کچھ ہے ہم نے اس کے لئے زینت بنایا ہے تاکہ ہم لوگوں کو آزمائیں کہ ان میں کون زیادہ اچھا عمل کرنے والا ہے ﴿۷﴾ اور زمین پر جو کچھ ہے بلاشبہ ہم اسے بالکل صاف میدان بنانے والے ہیں ﴿۸﴾

معارف ومنازل

مشرکین یہ آیات ومعجزات مسلسل دیکھتے رہے، اور ان کے ہر سوال کا جواب روز روشن کی طرح سامنے آتا رہا، مگر بجائے تصدیق وایمان لانے کے ان کے انکار اور کفر میں اضافہ ہوتا رہا، ان کی سرکشی اور مسلسل زیادتیوں کا یہ

اثر اور نتیجہ لازمی طور پر جب سامنے آیا تو سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس سے رنج وغم میں نہایت بے چین ہوئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی، فرمایا:

آپ ان کے گمراہی پر ڈٹے رہنے سے اپنی جان کو غمگین کر کے ہلاک نہ کریں، آپ کے ذمہ صرف پہنچانا ہے، منوانا اور ہدایت دینا نہیں، آپ اپنے آپ کو ان پر ہلاک نہ کریں۔ "فَلَعَلَّكَ" کا ترجمہ ہے شاید آپ ان کے ایمان نہ لانے سے کہیں اپنے آپ کو ہلاک کرلیں۔ یہ استفہام انکاری کے طور پر ہے یعنی ایسا نہیں ہونا چاہئے۔

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ﴾ بیشک ہم نے زمین پر ہر چیز کو اس کے لئے زینت اور رونق بنایا ہے تا کہ ہم تم کو آزمائیں کہ اس رونق میں پھنس کر کون اچھے عمل کرتا ہے، اور کون آخرت پر دنیا کا سودا کرتا ہے، اور کون دنیا پر آخرت کو بیچتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا کی خوشحالیوں، استراحتوں، میوے، پھل، باغات، مال و دولت، عزّت وجاہ، کرسی اور اقتدار وغیرہ زینتوں سے ہم نے دنیا کو دلہن کی طرح خوبصورت بنا دیا، پھر تمہیں اس حسن کے بازار میں بھیجا تا کہ ہم معلوم کرلیں کہ کون عقلمند بن کر دنیا پر آخرت کو ترجیح دے گا، اور کون ناداں بن کر دنیا کی چار روزہ منفعتوں پر آخرت کو نظر انداز کر دے گا۔ پس ایسے نادانوں پر آپ کبھی غمگین اور پریشان نہ ہوں، یہ اپنی جانوں پر ظلم کر کے خود جہنم کو اختیار کر رہے ہیں، اور انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ:

﴿وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾ بیشک ہم بنانے والے ہیں جو کچھ اس زمین پر ہے صاف چٹیل میدان۔ جب قیامت آئے گی تو زمین پر لوگوں کے تمام نشانات، مملوکہ باغات اور محلات، بڑے بڑے بارونق بروج اور منارے سب زمین بوس ہو جائیں گے، اور زمین کے ساتھ پیوست ہو کر ختم ہو جائیں گے، صرف چٹیل میدان رہ جائے گی، ان تمام عارضی رونقوں کا خاتمہ ہو جائے گا، لہٰذا تم اس پر رونق دنیا کی آزمائشوں کا شکار نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا بندہ بن کر دنیوی زینتوں کو خیر باد کہو، جیسے اصحاب کہف نے کیا وہ یہ:

اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝٩ اِذْ اَوَى الْفِتْيَةُ اِلَى
الْكَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ۝١٠ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ
فِى الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ۝١١ ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا ۝١٢

ترجمہ: کیا آپ نے یہ خیال کیا ہے کہ کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے عجیب چیز تھے ۝٩

جب جوانوں نے غار میں ٹھکانا پکڑا تو انہوں نے کہا کہ اے ہمارے ربّ! اپنے پاس سے ہمیں رحمت عطا فرما، اور

ہمارے لئے ہمارے کام میں اچھی صورت حال مہیا کر دیجئے ⑩ سو ہم نے ان کے کانوں پر سالہا سال تک پردہ ڈال دیا ⑪ پھر ہم نے انہیں اٹھایا تا کہ ہم جان لیں کہ دونوں گروہ میں سے کونسا گروہ ان کے ٹھہرنے کی مدت کو ٹھیک طرح شمار کرنے والا ہے ⑫

معارف ومنازل

اصحاب کہف، اور اصحاب رقیم کون تھے؟

یہاں سے اصحاب کہف کا قصہ شروع ہو رہا ہے، کہف غار کو کہتے ہیں، چند نوجوان موحد سعادتمند اپنے زمانہ کے بت پرست بادشاہ اور اس کے ہمنوا کافرین سے اپنی جان اور دین وایمان بچانے کے لئے ایک غار میں پناہ گزیں ہو گئے تھے، اس لئے انہیں اصحاب کہف کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا مفصل واقعہ ان شاء اللہ آئندہ بیان ہوگا۔

لیکن چونکہ مذکورہ آیت کریمہ میں ﴿اَصۡحٰبَ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ﴾ فرمایا ہے، اس لئے رقیم کے معنی بھی جاننے چاہئے۔ اس کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ اصحاب کہف کے کتے کا نام ہے، یہ انس صحابی رضی اللہ عنہ اور حضرت عامر شعبی تابعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے۔ اور حضرت سعید بن جبیر تابعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ایک تختی تھی جو پتھروں سے تراشی ہوئی تھی، اس میں اصحاب کہف کا قصہ لکھا ہوا تھا جو غار کے دروازہ پر رکھی ہوئی تھی۔

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب تھی جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ایلہ اور فلسطین کے درمیان وادی کا نام ہے، اور اسی وادی میں وہ غار تھا جس میں اصحاب کہف نے پناہ لی تھی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ بھی مروی ہے کہ جب ان سے رقیم کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں، پھر فرمایا کہ میں نے کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا (حضرت کعب یہودیوں کے بڑے عالم تھے، انہوں نے تورات پڑھی ہوئی تھی، خلافت فاروقی میں اسلام قبول کیا تھا) کہ رقیم اس بستی کا نام ہے جس میں سے یہ حضرات نکلے تھے، یہ کعب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا۔

صاحب روح المعانی حضرت آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ان سب اقوال کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوا کہ

﴿اَصۡحٰبُ الۡكَهۡفِ وَالرَّقِيۡمِ﴾ کا مصداق ایک ہی جماعت ہے، پھر ایک قول نقل کیا ہے کہ اصحاب کہف اور اصحاب رقیم الگ الگ دو جماعتیں تھیں، لیکن اس قول کی انہوں نے تائید نہیں کی اور اصحاب رقیم کے بارے میں احادیث صحیحہ ملتی بھی نہیں ہیں۔ واللہ اعلم

اصحاب کہف کا زمانہ:

اصحاب کہف کے بارے میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے البدایہ والنہایہ جلد دوئم میں لکھا ہے کہ یہ لوگ رومی بادشاہ دقیانوس کے زمانے میں تھے، اور یہ لوگ بادشاہوں کی اولاد میں سے تھے، ایک دن ایسا ہوا کہ عید کے دن (موقع) اپنی قوم کے ساتھ جمع ہونے کا اتفاق پڑ گیا، انہوں نے دیکھا کہ ان کی قوم بتوں کو سجدہ کر رہی ہے، اور بتوں کی تعظیم میں مشغول ہے، ان کا یہ حال دیکھ کر ان سے نفرت ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کے پردے اٹھا دیئے اور ان کے دلوں میں ہدایت ڈال دی، انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ لوگ صحیح دین سے ہٹے ہوئے گمراہ ہیں، لہٰذا انہیں چھوڑ کر چلے گئے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر ہم ان لوگوں میں رہیں گے تو یہ گمراہ ہمیں دین توحید پر نہیں رہنے دیں گے، اس لئے وہ وہاں سے چلے اور غار میں پناہ لی۔

راستے میں ایک چرواہا ملا جو ان کے عقیدہ کا تھا، ان کے ساتھ روانہ ہوا، اور اس کا کتا بھی ساتھ چلا، اللہ تعالیٰ شانہ نے سرور عالم صلّی اللہ علیہ وسلم کا تعجب دور فرمایا، اور ارشاد فرمایا کہ کیا آپ نے یہ خیال کیا ہے کہ کہف اور رقیم والے ہماری نشانیوں میں سے عجیب چیز تھے، یہ کوئی عجیب چیز نہیں ہے، کیونکہ اس سے بڑھ کر دوسرے عجائبات اور آیات موجود ہیں، مثلاً آسمان وزمین اور ان کے درمیان عجیب وغریب چیزوں کی تخلیق، اور انسان کی اپنی تدریجی پیدائش وغیرہ، یہ سب عجائبات میں شمار ہیں۔

ہاں! اصحاب کہف کے قصہ میں خارق عادت اتنی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مدت دراز تک سلا دیا، اور ان کے جسم نہیں گلے بالکل صحیح سلامت رہے، مخالفین ان کے واقعہ کو تو تعجب کی چیز سمجھتے ہیں، اور اسی لئے آپ سے سوال کر رہے ہیں، اور اس سے بڑھ کر جو تعجب کی چیزیں ہیں بے مثال مخلوقات کا تخلیقی نظام ہے اس پر غور وفکر نہیں کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ شانہ نے:

﴿اَمۡ حَسِبۡتَ﴾ فرما کر آپ کو مخاطب فرمایا، اور اسی کے ذیل میں دوسروں سے بھی خطاب ہوگیا، اور ان کو بھی بتا دیا کہ یہ قصہ اگرچہ عجیب ہے لیکن اس سے بڑھ کر جو لامحدود علوی وسفلی چیزیں ہیں ان کے مقابلہ میں یہ کچھ بھی

عجیب نہیں ہے۔

﴿اِذْ اَوَی الْفِتْیَةُ اِلَی الْکَهْفِ فَقَالُوْا رَبَّنَا﴾ اس وقت کو یاد کرو جب نوجوانوں کی جماعت نے کہف میں ٹھکانا پکڑا، اور ٹھکانہ پکڑتے ہوئے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں یوں دعا کی:

﴿رَبَّنَآ اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً﴾ اے ہمارے ربّ! ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔

﴿وَّهَيِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا﴾ اور ہمارے لئے ہمارے کام میں اچھی صورت حال مہیا فرما۔ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ سے ہوتا ہے، وہ جس پر فضل وکرم فرمانا چاہے ہر جگہ، ہر موقع، ہر حال کوئی شخص جہاں بھی ہو جس حال میں ہو تنہا ہو یا جماعت ہو، آبادی میں ہو یا جنگل میں ہو، کسی میدان میں ہو یا غار میں ہو، یا روشنی میں یا کئی تاریکیوں میں ہو، اللہ تعالیٰ اُسے دشمنوں سے محفوظ بھی رکھ سکتا ہے، اور اس کے دین وایمان کو بھی سالم رکھ سکتا ہے، اور اس کے تمام حالات کو بھی درست فرما سکتا ہے، اور یہ سب کچھ اصحاب کہف کے ساتھ ہوتا رہا، وہ آبادی کے قرب وجوار میں رہے، اور مدت دراز تک دشمنوں سے اور جنگلی درندوں سے بھی محفوظ رہے، مدّتوں کے بعد جب بیدار ہوئے تو ان کے جسم اور لباس اسی طرح تازہ تھے جیسے وہ سوئے تھے، تب آپس میں یوں سوال کرنے لگے کہ بھئی اس غار میں آپ لوگ کتنے دن ٹھہرے ہیں؟ اسی کو فرمایا:

﴿ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَيُّ الْحِزْبَيْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْٓا اَمَدًا﴾ پھر ہم نے انہیں اٹھایا تا کہ ہم جان لیں (معلوم کریں) کہ دونوں گروہ میں سے کونسا گروہ ان کے ٹھہرنے کی مدت کو ٹھیک طرح شمار کرنے والا ہے۔

بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلے گروہ سے انہیں میں سے وہ جماعت مراد ہے جنہوں نے سوال کیا کہ کتنے دن رہے، اور دوسرے گروہ سے ان کی وہ جماعت مراد ہے جنہوں نے جواب میں یوں کہا:

﴿رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ﴾ تمہارا ربّ ہی زیادہ جانتا ہے کہ تم کتنے دن ٹھہرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ ایک گروہ سے اصحاب کہف اور دوسرے گروہ سے وہ بادشاہ مراد ہیں، جو اس طویل مدت (جس میں یہ حضرات سوتے رہے) یکے بعد دیگرے بادشاہ بنے رہے۔ [روح المعاني] اللہ تعالیٰ شانہ نے اصحاب کہف پر جو نیند مسلط فرمادی تھی اسے:

﴿فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ﴾ سے تعبیر فرمایا۔ انسان سوتا تو ہے آنکھوں سے، لیکن گہری نیند وہ ہوتی ہے جب سونے والا آواز سن کر بھی بیدار نہ ہو سکے، یعنی ثقیل اور گہری نیند جس میں بیداری ممکن نہ ہو۔

اصحاب کہف کا مختصر واقعہ:

مسیحی مذہب کا ابتدائی دور ہے، نبطی حکومت کے اطراف یعنی شام وغیرہ میں عیسائیت کا زور ہے، رقیم کی چند نوجوان سعید روحیں شرک سے بیزار اور نفور ہو کر توحید کی جانب مائل ہو جاتی ہیں، اور دین عیسوی کو قبول کر لیتی ہیں، شدہ شدہ یہ بات بادشاہ وقت تک بھی پہنچ جاتی ہے، بادشاہ نوجوانوں کو دربار میں بلاتا ہے اور انکشاف حال چاہتا ہے، نوجوان کلمہ حق بلند کرنے میں بے باک اور جری ثابت ہوتے ہیں، یہ بات بت پرست بادشاہ کو ناگوار گزرتی ہے، مگر وہ دوبارہ معاملہ پر غور کرنے کے لئے ان کو چند روز کی مہلت دیتا ہے، یہ دربار سے واپس آ کر آپس میں مشورہ کرتے ہیں، اور طے پاتا ہے کہ خاموشی کے ساتھ کسی پہاڑ کے غار میں پوشیدہ ہونا چاہیے، تاکہ مشرکوں کے شر سے محفوظ رہ کر عبادت الٰہی میں مشغول رہ سکیں، یہ سوچ کر وہ ایک غار میں پوشیدہ ہو جاتے ہیں۔ جب وہ غار میں داخل ہوتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر نیند طاری کر دیتا ہے، اور خواب ہی کی حالت میں کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔

غار کی عجیب کیفیت ہے، اندر سے بہت وسیع ہے مگر قدرت نے اس کو ایسا موقع نصیب کیا ہے کہ زندگی کی بقاء کے قدرتی سامان وہاں سب موجود ہیں، ایک طرف دہانہ ہے تو دوسری طرف ہوا گزرنے کے منفذ اور سوراخ ہیں، جن کی وجہ سے ہر وقت تازہ ہوا اندر آتی رہتی ہے۔

غار شمال و جنوب رویہ ہے، اس لئے طلوع و غروب کے وقت آفتاب کی تپش اندر نہیں پہنچ پاتی، مگر ہلکی ہلکی روشنی برابر پہنچتی رہتی ہے، اور ایسی کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ نہ تاریکی ہے کہ کچھ نظر نہ آئے اور نہ اتنی روشنی ہے کہ کھلے میدان کی طرح جگہ روشن ہو جائے، اس حالت میں چند انسان اس غار میں محوِ خواب ہیں، اور ان کا رفیق کتا اپنے اگلے ہاتھ پھیلائے غار کے دہانہ پر باہر کی جانب منہ کئے بیٹھا ہے۔

اس مجموعی صورت حال نے ایسی کیفیت پیدا کر دی ہے کہ پہاڑوں کے درمیان غار کے اندر جھانکنے والے انسان پر شدید خوف و ہراس کی حالت طاری ہو جاتی ہے، اور وہ بھاگ کھڑے ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ برسوں تک یہ نوجوان اسی حالت میں آرام کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں کہ شہر میں (پورے ملک میں) انقلاب ہو جاتا ہے، رومی عیسائی لوگ نبطی حکومت پر حملہ آور ہوتے ہیں، اور انہیں شکست دے کر ان کے ملک پر قابض ہو جاتے ہیں تو شہر رقیم (پیٹرا) عیسائیت کے آغوش میں آ جاتا ہے۔

تب اللہ تعالیٰ کی مشیت فیصلہ کرتی ہے کہ یہ نوجوان خواب سے بیدار ہوں، چنانچہ وہ بیدار ہو جاتے ہیں، اور

آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے ایک دوسرے سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم کتنی مدت سوتے رہے؟ ایک نے جواب دیا کہ ایک دن، دوسرے نے کہا: یا دن کا بھی کچھ حصہ، پھر کہنے لگے کہ ہم میں سے کوئی شہر جا کر کھانا لے آئے اور یہ سکہ لے جائے، مگر جو بھی جائے اس طرح لین دین کرے کہ شہر والوں کو پتہ نہ لگ سکے کہ ہم کون ہیں، اور کہاں ہیں؟ ورنہ مصیبت آجائے گی، بادشاہ ظالم بھی ہے اور مشرک بھی، وہ تو شرک و بے دینی پر مجبور کرے گا، یا ہم سب کو قتل کرڈالے گا، اور یہ باتیں ہمارے دین ودنیا کو برباد کردینے والی ثابت ہوں گی، اور ہم پر مصیبت آئے گی۔

اب نوجوانوں میں سے ایک شخص سکہ لے کر شہر گیا، وہاں دیکھا کہ تمام حالات، لوگ، مکانات وغیرہ سب بدل چکے ہیں، اور نئے آدمی اور نیا طور وطریقہ نظر آرہا ہے، وہ خوفزدہ اور سخت پریشان ہوئے کہ یا اللہ تعالیٰ! یہ کیا ماجرا ہے؟ مگر پھر بھی ڈرتے ڈرتے ایک باورچی کی دکان پر پہنچا، اور کھانے پینے کی چیزیں خریدیں، جب قیمت ادا کرنے لگا تو باورچی نے دیکھا کہ یہ سکہ بہت قدیم ہے، پوچھا یہ کیا ہے اور تم کون اور کہاں سے ہو؟ آخر بات کھل گئی اور آس پاس بہت سارے لوگ جمع ہو گئے، لوگوں کو جب اصل حقیقت معلوم ہوگئی تو انہوں نے اس شخص کا خیر مقدم کیا، اور اس عجیب وغریب معاملہ سے بہت زیادہ دلچسپی لینے لگے، کیونکہ عرصہ ہوا کہ یہاں مشرک بادشاہوں کا دور ختم ہو چکا تھا، اور یہاں کے باشندوں نے عیسائیت قبول کر لی تھی۔

اس شخص نے جب یہ حال دیکھا تو اگر چہ عیسائیت پھیل جانے سے اس کو بیحد خوشی ہوئی، مگر اپنے اور اپنے رفیقوں کے لئے یہی پسند کیا کہ دنیا کے ہنگاموں سے علیحدہ رہ کر یادِالٰہی میں گزار دیں، اس لئے کسی طرح مجمع سے جان بچا کر واپس اپنے ساتھیوں کی طرف راہ لی اور اپنے رفقاء میں پہنچ کر سب حال کہہ سنایا۔

ادھر شہریوں میں بادشاہ سمیت ان کی جستجو کا شوق پیدا ہوا، اور وہ اسی تلاش میں آگے پیچھے اس غار تک پہنچ گئے، غار کے دہانے پر کتے کو دیکھ کر بالآخر ان کو غار میں پالیا، لوگوں نے عقیدت ومحبت اور جذبات کے ساتھ اصرار کیا کہ آپ لوگ ہمارے ساتھ شہر چلیں، اور اپنی پاکیزہ زندگی سے اہل شہر کو فائدہ پہنچائیں، مگر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے، اور انہوں نے اپنی عمر کا باقی حصہ راہبانہ زندگی کے ساتھ اسی غار میں گزار دیا۔

دوسری روایت میں ہے کہ جب بادشاہ اور ارکانِ دولت غار پر پہنچے تو تملیخا نے کہا کہ پہلے میں غار میں داخل ہوتا ہوں، تم میرے بعد داخل ہو جاؤ، چنانچہ وہ پہلے غار میں چلا گیا، اس کے داخل ہونے کے بعد لوگوں کو پتہ نہ چلا کہ تملیخا کہاں چلا گیا، اور لوگوں پر ایک ایسا خوف ورعب طاری ہوا کہ کسی نے اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کی، پھر

سب کا یہ مشورہ ہوا کہ اس غار کے قریب بطور یادگار ایک مسجد تعمیر کرادی جائے۔ [درمنثور، فتح الباري، جلدششم]

فائدہ جلیلہ:

(۱)......قرآن کریم نے اپنے حکیمانہ اصول اور اسلوب خاص کے تحت سارے قرآن مجید میں ایک قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سوا کسی قصے اور واقعے کو پوری تفصیل اور ترتیب کے ساتھ بیان نہیں کیا، جو عام تاریخی کتابوں کا طریقہ ہے، بلکہ ہر قصے کے صرف وہ ضروری اجزاء موقع بموقع بیان فرمائے ہیں جن سے انسانی ہدایات، درس عبرت، قدرتِ الٰہی کے عظیم کمالات اور تعلیمات کا تعلق ہو، اور حق کی پہچان ہو، جیسا کہ آئندہ قصہ ذوالقرنین اور یاجوج وماجوج کے واقعات بھی اسی طرزِ بیان کے ساتھ اسی سورت میں آنے والے ہیں۔

قصۂ اصحاب کہف میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ قرآن کریم میں اس کے صرف وہ اجزاء بیان کئے گئے جو مقصود اصلی سے متعلق تھے، اس قصہ کے باقی اجزاء جو خالص تاریخی یا جغرافیائی تھے ان کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔

پھر اس بارے میں حضرت معصوم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان متروکہ اور غیر مذکورہ حقائق سے کوئی پردہ نہیں اٹھایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارے حقائق پردہ خفاء میں بدستور رہے، مثلاً اصحاب کہف کے نام، ان کی تعداد، ان کی جگہ کی تعیین وغیرہ۔ ان کے سونے کے زمانے کی مدت کے سوالات کا ذکر تو فرمایا، اور جواب کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر ساتھ یہ ہدایت بھی فرمائی کہ ایسی باتوں میں زیادہ غور وفکر اور بحث وتکرار مناسب نہیں، ان کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر کے بحث ومباحثہ چھوڑ دو۔ اگر یہ ضروری اور لازمی ہوتیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور انہیں بیان فرماتے۔ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَبۡهِمُوۡا مَا اَبۡهَمَهُ اللّٰهُ تعالىٰ۔ [الاتقان] یعنی جس غیر ضروری چیز کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا تم بھی اسے مبہم رہنے دو، اس میں بحث وتمحیص نہ کرو۔ چنانچہ صحابہ کرام اور تابعین حضرات نے ان غیر ضروری اجزاء کو نظرانداز کر کے ان میں بحث ومباحثہ سے اجتناب کیا، سوائے چند باتوں کے۔

لیکن علماء مورخین اور محققین اصحاب تفسیر ان مسائل میں خوب الجھے اور عمدہ تحقیق کی جس کا نتیجہ سوائے اختلافی مسائل کے کچھ نہ نکلا، اور یہ سارے اختلافات تاریخی، جغرافی اور بہت سے اسرائیلی، ظنی اور تخمینی مسائل کے نذر ہوگئے، اور صحیح واقعی حقائق کا انکشاف نہ ہوسکا، اور ہر محقق نے دوسرے کے خلاف حقائق کا تذکرہ کیا۔ آپ اگر ان طویل وعریض تحقیقی مقالات کا جو مختلف مفسرین کرام نے بیان کئے ہیں مطالعہ کریں گے تو کبھی کسی صحیح نتیجے تک رسائی نہیں پائیں گے۔ واللہ اعلم

(۲)......سرسری نظر میں اگر دیکھا جائے تو اس میں دس قسم کے اختلافات کی نشاندہی ہو چکی ہے:

① اصحاب کہف اور اصحاب رقیم ایک جماعت کے دو نام ہیں، یہ مذہب جمہور علماء کا ہے۔ دوسرے حضرات کے نزدیک یہ دو الگ الگ جماعتیں ہیں۔

② اصحاب کہف کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ہے، یہ جمہور علماء کا خیال ہے۔ دوسرے کہتے ہیں کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے کے ہیں۔

③ یہ مقام یعنی رقیم ایشیائے کوچک کے مغربی حصہ عقبہ کے ساتھ واقع ہے، ملک شام میں، کچھ حضرات اسے روم یعنی اندلس وغرناطہ کا حصہ مانتے ہیں، یہ وہاں ہے۔

④ رقیم ان کے شہر کا نام ہے۔ بعض کے نزدیک اس تختہ کا نام ہے جس پر ان کے نام مکتوب ہیں۔

⑤ بعض کہتے ہیں ان کے کتے کا نام ہے۔ کچھ لوگ کتے کا نام قطمیر بتاتے ہیں۔

⑥ اصحاب کہف کی تعداد میں بھی اختلاف ہے، صحیح معلوم نہیں کہ وہ کتنے ہیں۔

⑦ ان کے ناموں میں شدید اختلاف پایا جاتا ہے، لوگوں نے مختلف نام لکھے ہیں۔

⑧ بادشاہ اور لوگوں کی ان کے ساتھ ملاقات میں بھی اختلاف ہے، جیسا کہ بیان ہوا۔

⑨ اب وہ نیند کی حالت میں ہیں، اور دوسروں کے نزدیک وفات پا چکے ہیں۔

⑩ ان کے غار میں رہنے اور سونے کی مدت میں بھی اختلاف ہے جو آنے والا ہے، لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اتنے اختلافات سے بچ کر صرف انہی اجزاء پر غور کیا جائے جنہیں قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے، جو بالترتیب یہ ہیں، فرمایا:

نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَـقِّ‌ؕ اِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَزِدۡنٰهُمۡ هُدًى ۖ﴿۱۳﴾ وَّرَبَطۡنَا عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ اِذۡ قَامُوۡا فَقَالُوۡا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ لَنۡ نَّدۡعُوَا۟ مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدۡ قُلۡنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾ هٰٓؤُلَۤاءِ قَوۡمُنَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً‌ ؕ لَوۡلَا يَاۡتُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ بِسُلۡطٰنٍۢ بَيِّنٍ‌ ؕ فَمَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنِ افۡتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾ وَاِذِ اعۡتَزَلۡتُمُوۡهُمۡ وَمَا يَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاۡوٗۤا اِلَى الۡـكَهۡفِ يَنۡشُرۡ لَـكُمۡ رَبُّكُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِهٖ وَيُهَيِّئۡ لَـكُمۡ مِّنۡ اَمۡرِكُمۡ مِّرۡفَقًا ﴿۱۶﴾

ترجمہ: ہم آپ سے ان کا واقعہ بالکل ٹھیک بیان کرتے ہیں، بلاشبہ یہ چند جوان تھے جو اپنے ربّ پر ایمان لائے، اور ہم نے ان کو اور زیادہ ہدایت دیدی۱۳ اور ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کردیا جب وہ کھڑے ہوئے، سوانہوں نے کہا کہ ہمارا ربّ وہ ہے، ہم اس کے علاوہ کسی کو معبود نہیں بنائیں گے، اس صورت میں تو ہم یقینی طور پر بڑی زیادتی کی بات کرنے والے ہوجائیں گے ۱۴ یہ ہماری قوم کے لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے معبود بنالئے، کیوں نہیں لے آتے اس پر کھلی ہوئی دلیل، سو اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹی تہمت لگائے۱۵ اور جب تم ان لوگوں سے اور ان کے معبودوں سے جدا ہوگئے جو اللہ تعالیٰ کے سوا ہیں، تو غار کی طرف پناہ لے لو، تمہارا ربّ تم پر اپنی رحمت پھیلادے گا، اور تمہارے مقصد میں آسانی مہیا فرمائے گا ۱۶

معارف ومنازل

﴿نَحۡنُ نَقُصُّ عَلَيۡكَ نَبَاَهُمۡ بِالۡحَقِّ﴾ ہم بیان کرتے ہیں آپ پر ان کا حال تحقیق کے ساتھ، یعنی صحیح صحیح واقعہ آپ کو سناتے ہیں، اور اس میں واقعہ کا صرف وہی حصہ بیان ہوگا جو لوگوں کے لئے مفید اور باعث عبرت ہو، جس سے اہل ایمان کا ایمان تازہ ہو، اور ہر مؤمن کے لئے قربانی دینے کا جذبہ موجزن ہو۔ دیکھیں یہ لوگ انبیاء کرام علیہم السلام نہیں ہیں، عام امتی ہیں، مگر کتنے خوش قسمت بڑے پایہ کے جنتی ہیں کہ ان کے ایمان واخلاص پر خود ربّ العٰلمین جلّ شانہ گواہ ہیں، پس ان کے ایمان اور مراتب عالیہ پر ہر مسلمان کو رشک کرنا چاہئے۔ اَللّٰھُمَّ اجۡعَلۡنَا مِنۡھُمۡ امین۔

﴿اِنَّهُمۡ فِتۡيَةٌ﴾ بیشک وہ چند نوجوان تھے جو وقت کے کافرومشرک اور بت پرست بادشاہ سے تنگ آچکے تھے، انہوں نے سر ہتھیلی پر رکھا اپنے ظالم وجابر بادشاہ کے سامنے حق اور توحید کا (اعلان کرکے بڑا کا نامہ انجام دیا)۔

موحد چو بر پائے ریزی زرش ☆ چو شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش نباشد زکس ☆ ہمین ست بنیاد توحید وبس

﴿اٰمَنُوۡا بِرَبِّهِمۡ وَزِدۡنٰهُمۡ هُدًى﴾ جو اپنے پروردگار پر ایمان لائے تھے تو ہم نے ان کے لئے سامان ہدایت قبول کرچکے وہ کفر وشرک کے اندھیروں سے نکل کر ایمان وسعادت کے انوار وبرکات کی روشنی میں غوطہ زن ہوگئے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے تین دور بیان فرمائے ہیں: یعنی بچپن، جوانی، اور

بڑھاپا۔ بچپن کا زمانہ ناپختگی اور غفلت کا دور ہوتا ہے، اس عمر میں انسان ناسمجھی کی وجہ سے کوئی اہم کام انجام نہیں دے سکتا۔ بڑھاپا ضعف اور کمزوری کا دور ہوتا ہے، اس دور میں انسان کوئی بڑا انقلابی کام انجام دینے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ البتہ جوانی کا دور ہی قوت واستعداد کا دور ہوتا ہے، جس میں انسان ہر طرح انقلابی قدم اٹھا سکتا ہے، بشرطیکہ اس کی تربیت اور فکر صحیح ہو، اور قرآنی تعلیمات سے باخبر ہو۔

بدقسمتی سے آج پورے عالم اسلام کے نوجوانوں کا یہ عالم ہے کہ ان کا رشتہ قرآن وسنت کے ساتھ قائم نہیں رہا، انہیں طاؤس ورباب اور کھیلوں سے اتنی محبت اور لگاؤ ہے کہ وہ بیچارے اسلام کے بنیادی اصول تو درکنار اسلام کے ابجد اور حروف تہجی سے بھی واقفیت نہیں رکھتے، انہیں کلمہ طیبہ کا اور درود شریف کا فرق اور امتیاز حاصل نہیں، وہ آئے دن کھلم کھلا اسلامی تعلیمات کا مذاق اڑاتے ہیں، اور اسلامی اقدار پر استہزاء کرنے سے نہیں شرماتے۔ جبکہ دیگر اقوام عالم کے نوجوانوں کا یہ حال ہے کہ اپنے باطل مذہب پر فخر کرتے ہیں، اور اپنے منگھڑت بے بنیاد مذہبی اقدار پر فریفتہ ہیں۔

وہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ ورسم شہبازی

رجوع الی اللہ کا اصل وقت جوانی کا زمانہ ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبروں علیہم السلام کا شیوہ ہے، ورنہ بوڑھا ہو کر تو ظالم بھیڑیا بھی اللہ اللہ کرنے لگتا ہے۔

درجوانی توبہ کردن شیوہ پیغمبریست ☆ وقت پیری گرگ ظالم میشود پرہیزگار

﴿وَّرَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ﴾ ہم نے ان کے دلوں کو مضبوط کر دیا، جب انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل کو مضبوط کر دیتا ہے، پھر وہ کسی سے نہیں ڈرتا، اور اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ اتنا محکم ہوجاتا ہے کہ اس کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آتی۔ جب پورے علاقے میں اصحاب کہف کی توحید وایمان کی اور بتوں سے نفرت وبیزاری کا چرچا ہونے لگا تو سپاہیوں نے انہیں پکڑ کر بت پرست ظالم بادشاہ کے سامنے پیش کیا، یہ وقت ان کے لئے سخت آزمائش کا وقت تھا۔

﴿اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا﴾ جب وہ کھڑے ہوئے، یعنی جوابدہی کے لئے بادشاہ کے سامنے کھڑے کئے گئے، تو انہوں نے کہا: ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا رب ہے، ہم کسی دوسری ذات کو ربّ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہرگز نہیں، اور ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو ہرگز معبود

نہیں پکاریں گے۔

﴿لَقَدْ قُلْنَآ اِذًا شَطَطًا﴾ اگر ہم نے کسی دوسری ذات کو بھی معبود مان لیا تو ہم بہت زیادتی والی بات کرنے والے ہو جائیں گے، اور یہ ممکن نہیں کہ ہم ظلم و زیادتی کا ارتکاب کریں۔

﴿هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً﴾ یہ ہماری قوم کے گمراہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا طرح طرح کے معبود بنا رکھے ہیں، یہ سراسر گمراہ اور بے انصاف تو ہیں۔

﴿وَلَا يَاْتُوْنَ عَلَيْهِمْ بِسُلْطٰنٍ بَيِّنٍ﴾ یہ لوگ کوئی کھلی واضح دلیل کیوں نہیں لاتے، وہ دلیل کیا لائے، ان کے پاس سوائے باطل ظن اور شیطانی چالوں کے کچھ بھی نہیں، ان کے آباء واجداد کو شیطان نے گمراہ کیا، اور یہ لوگ باپ دادوں کی تقلید و اتباع میں گمراہ ہوئے، اس سلسلے میں ساری کائنات اور ملّت کفر اگر جمع ہو جائیں کوئی ایک آدھ دلیل بھی نہیں لا سکتے، جن وانس پورے جہاں کو قرآن مجید نے جو چیلنج دیا ہوا ہے کہ تم توحید باری تعالیٰ کے خلاف کوئی ادنیٰ دلیل پیش کرو تو قیامت تک یہ چیلنج برقرار ہے، کیونکہ جب ایک چیز کا وجود ہی معدوم اور غیر ممکن ہے تو اسے لانے اور بیان کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وللہ الحمد و الثناء لا إله إلا هو الواحد القهار۔

رہی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس پر تو لاکھوں دلائل موجود ہیں، کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی اُحدیت و توحید پر گواہ ہے، بلکہ بوقت ضرورت و مجبوری یہ لوگ بانگ دہل خود بھی اقرار کرتے ہیں جیسے سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہے۔

﴿فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ﴾ [العنکبوت:۶۵] (پس جب کشتی میں سوار ہوتے ہیں تو اللہ کو بلاتے ہیں، اس کے لیے اپنا عقیدہ خالص کرتے ہوئے)۔ جب یہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور سمندر کی موجوں میں گرتے ہیں تو اپنے معبودوں کو بھول جاتے ہیں، انہیں خوب معلوم ہے کہ وہ کمزور، عاجز اور بے بس ہیں پس صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو یاد کرتے ہیں، اور خلوص کے ساتھ اس کو پکارتے ہیں۔

﴿فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ پس اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر افتراء باندھتا ہے، یہ کفر و شرک تو اللہ تعالیٰ پر افتراء اور تہمت ہے، غیر اللہ میں الوہیت ثابت کرنا، اللہ تعالیٰ کی صفت خاصہ کسی دوسرے میں ماننا، غیر اللہ کو مشکل کشا حاجت روا ماننا، قیامت کا اور دوبارہ زندگی کا انکار کرنا، یہ سب افتراء علی اللہ کے مترادف ہیں، اور جو کوئی ایسا عقیدہ رکھتا ہو اس سے بڑھ کر کوئی ظالم نہیں۔

﴿وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ اور جب تم اپنی قوم کے کفار و مشرکین سے کنارہ کش

ہو چکے ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سوا جن معبودوں کی وہ عبادت کرتے ہیں تم ان کے معبودوں سے بھی کنارہ کش اور بیزار ہو چکے ہو، تو تمہیں ان کے ساتھ رہنے کی کوئی گنجائش نہیں، پس:

﴿ فَأْوٗا اِلَى الْكَهْفِ﴾ کسی غار کی طرف چلو، وہاں پناہ لے لو، اور چھپ جاؤ، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا انتظار کرلو۔

﴿ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے اپنی رحمت پھیلا دے گا، کیونکہ تمہارے دل نور ایمان سے روشن ہیں اور اللہ تعالیٰ تمہارے قلوب کو مضبوط کیا ہوا ہے تمہیں تمہارا مالک بہر حال تحفظ عطا فرمائے گا۔

﴿وَيُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا﴾ اور تمہارے معاملہ میں تمہارے لئے رفق و نرمی اور غیبی آسانی و خوشحالی کے اسباب و ذرائع مہیا فرمائے گا۔ چنانچہ اسی پختہ اعتماد و توکل علی اللہ کی بنیاد پر چلے، راستے میں ایک چرواہے سے ملے، اس کو بھی ساتھ لیا۔ یہ چرواہا ان کے عقیدہ کا تھا جس نے ان کی رفاقت کو اپنے لئے غنیمت سمجھا۔

یہ پہلے چھ نفر تھے، اب سات ہوگئے، آٹھواں کتا، وہ بھی ان کے ساتھ روانہ ہوا، انہوں نے ہر چند اسے بھگانے کی کوشش کی مگر کتے کو اللہ تعالیٰ نے قوت گویائی عطا فرمائی، کتے نے کہا: مجھے اپنی رفاقت سے محروم نہ کرو، میں تمہاری صحبت کو پسند کرتا ہوں، اور تمہارے ساتھ چل کر اپنے لئے سعادت سمجھتا ہوں، اور تمہاری خدمت کرتا ہوں۔ کاش آج کا نوجوان کتے سے سبق سیکھ کر اللہ تعالیٰ کے مقربین کی رفاقت اختیار کرتا تو سب کچھ انعام پالیتا۔

پسر نوح بابدان بہ نشست ☆ خاندان نبوتش گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند ☆ پئے نیکیاں گرفت مردم شد

(سعدیؒ)

چنانچہ وہ جستجو کرتے ہوئے اسی غار میں پہنچے، اور اس میں رہنے کو پسند فرمایا، لگتا ہے کہ قدرت نے پہلے سے اس مخصوص و محفوظ غار کو ان کے لئے تیار کیا ہوا تھا، وہ عجیب و غریب غار جس کے متعلق قسام ازل نے فیصلہ کیا تھا وہ یہ ہے۔

وَتَرَى الشَّمْسَ اِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَاِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ
وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا

مُّرۡشِدًا ﴿۱۷﴾ وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ ؕ لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا ﴿۱۸﴾

ترجمہ: اور اے مخاطب! تو دیکھے گا کہ جب سورج نکلتا ہے تو وہ ان کے غار سے داہنی طرف کو بچ کر گزر جاتا ہے، اور جب وہ چھپتا ہے تو ان کے بائیں طرف کتراتا ہوا چلا جاتا ہے، اور وہ غار کے ایک فراخ حصّے میں ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے سو وہی ہدایت پانے والا ہے، اور جس کو وہ گمراہ کرے تو اے مخاطب! تو اس کے لئے کوئی مددگار اور راہ بتانے والا نہیں پائے گا ﴿۱۷﴾ اور اے مخاطب! تو ان کو دیکھتا تو خیال کرتا کہ وہ جاگ رہے ہیں، حالانکہ وہ سوئے ہوئے تھے، اور ہم انہیں داہنی کروٹ پر اور باہنی کروٹ پر بدل دیتے تھے، اور ان کا کتا دہلیز پر اپنے ہاتھ بچھائے ہوئے تھا، اگر تو انہیں جھانک کر دیکھ لیتا تو ان کی طرف سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتا، اور ان کی وجہ سے تیرے اندر رعب بھر جاتا ﴿۱۸﴾

معارف ومنازل

کار زلف تست مشک افشانیٔ ما عاشقان ☆ مصلحت را تہمت برآہوئے چین بستہ اند

ربّ العزّت سبحانہ نے غار کو پہلے سے تیار فرما کر اپنے مخلص بندوں کے لئے ہموار فرمایا، اس کی حالت یہ تھی:

﴿وَتَرَى الشَّمۡسَ اِذَا طَلَعَتۡ تَّزٰوَرُ عَنۡ كَهۡفِهِمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ﴾ تم دیکھو گے کہ جب سورج طلوع کرتا ہے تو غار کے دائیں جانب کترا جاتا ہے۔ امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غار کا رخ مشرق ومغرب کی بجائے شمالاً جنوباً تھا، یہی وجہ ہے کہ سورج کے طلوع وغروب کے وقت دھوپ کی تپش غار کے اندر نہیں جاتی تھی۔

﴿وَاِذَا غَرَبَتۡ تَّقۡرِضُهُمۡ ذَاتَ الشِّمَالِ﴾ اور جب سورج غروب ہونے کے قریب آتا تو بائیں طرف کترا کر نکل جاتا جس کی تپش سے وہ محفوظ رہتے۔ البتہ سورج کی روشنی دونوں صورتوں میں غار کے اندر پہنچتی رہتی تھی، اگر کوئی مزید اطمینان حاصل کرنا چاہے تو زمین کے ساتھ پیوست اسی شکل وصورت میں ایک غار نما حجرہ بنائے، اور مشاہدہ کرے اسے سب کچھ مشاہدۃً معلوم ہو جائے گا۔

﴿وَهُمۡ فِىۡ فَجۡوَةٍ مِّنۡهُ﴾ اور وہ غار میں فراخ وکشادہ جگہ پر لیٹے ہوئے تھے، اور نہایت آرام سے سو رہے تھے۔

﴿ذٰلِكَ مِنۡ اٰيٰتِ اللّٰهِ﴾ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے۔ ذٰلِكَ میں شروع سے لے کر یہاں تک سب باتیں آجاتی ہیں، جو کہ مظاہر قدرت کے کمالات اور نشانیاں ہیں۔

﴿مَنۡ يَّهۡدِ اللّٰهُ فَهُوَ الۡمُهۡتَدِ﴾ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت پانے والا ہوگا۔

﴿وَمَنۡ يُّضۡلِلۡ فَلَنۡ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرۡشِدًا﴾ اور جسے اس کی سرکشی اور ضد وعناد کی وجہ سے اللہ تعالیٰ گمراہ کردے تو اس کے لئے نہ حمایتی اور کوئی کارکارساز ہوگا، اور نہ ہی راہ دکھلانے والا ہوگا۔ جیسا کہ دقیانوس بادشاہ کا حال جو بیان ہوا، اور اہل مکہ مشرکین قریش کا جو حال ہوا۔

﴿وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ﴾ تم ان اصحاب کہف کو بیدار گمان کرو گے، ان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں، ایسا لگتا ہے کہ وہ جاگ رہے اور دیکھ رہے ہیں، لیکن وہ سورہے ہیں، گہری نیند میں محو استراحت ہیں۔

﴿وَتَحۡسَبُهُمۡ اَيۡقَاظًا وَّهُمۡ رُقُوۡدٌ وَّنُقَلِّبُهُمۡ ذَاتَ الۡيَمِيۡنِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾ اور ہم انہیں پلٹتے ہیں دائیں طرف اور بائیں طرف۔ قرآن حکیم نے ان کے متعلق اتنا کہا کہ اللہ تعالیٰ ان کی کروٹیں بدل دیتا تھا، مزید وقت اور مدت کا ذکر نہیں فرمایا، جن لوگوں نے سال میں ایک مرتبہ یا دو مرتبہ یا اور کوئی وقت ذکر کیا ہے وہ سب بے بنیاد اور اسرائیلی باتیں ہیں، صحیح یہی ہے کہ موسم کے لحاظ سے جب بھی ضرورت ہوئی قدرت نے اس کا انتظام فرمادیا۔

﴿وَكَلۡبُهُمۡ بَاسِطٌ ذِرَاعَيۡهِ بِالۡوَصِيۡدِ﴾ اور ان کا کتا اپنے اگلے بازو پھیلائے غار کی چوکھٹ پر بیٹھا رہا، جیسے وہ خود اللہ تعالیٰ کے حکم سے سوتے رہے، اور کروٹیں بدلتے رہے، اسی طرح ان کے کتے کا بھی یہی حال رہا، اور جوں ہی وہ بیدار ہوئے تو ان کے ساتھ ان کا کتا بھی بیدار ہوا۔

اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر ان کی حفاظت کا جو نظام بنایا اس کا ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ ان تک کسی انسان یا کسی درندہ کی رسائی نہ ہو، اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے لوگوں کی نظروں سے غائب ہوں، وہاں تک کسی کی رسائی نہ ہو۔ اگر بالفرض کوئی وہاں تک پہنچ بھی جائے تو اس پر ایک سخت خوف وہراس اور ایسا رعب مسلط ہو کہ وہاں کوئی ٹھہر نہ سکے، اور نہ آگے بڑھ سکے، اسی کو فرمایا:

﴿لَوِ اطَّلَعۡتَ عَلَيۡهِمۡ لَوَلَّيۡتَ مِنۡهُمۡ فِرَارًا وَّلَمُلِئۡتَ مِنۡهُمۡ رُعۡبًا﴾ اے مخاطب! اگر تو ان کو جھانک کر دیکھنا چاہے تو یہ تمہارے کے لئے ممکن نہ ہوگا، تو پیٹھ پھیر کر مارے خوف وہراس کے وہاں سے بھاگ جائے گا، اور تیرا قلب ان کے رعب سے بھر جائے گا، یہ اللہ تعالیٰ کا ایک محکم ومنظم نظام ہے کہ ان تک آج کے اس ترقی یافتہ دور

میں بھی رسائی نہیں ہوئی، جہاں انسان نے چاند تک رسائی بھی حاصل کی ہے، مگر جن چیزوں کو ربّ العزّت سبحانہ نے پردۂ خفا میں رکھا ہے، ان تک لاکھوں کوششوں کے باوجود انسانی رسائی نہیں ہوسکی ہے۔ امریکہ اور اس کے اتحادی مسلسل چھان بین میں لگے ہوئے ہیں، لیکن انہیں سدّ ذوالقرنین نظر نہیں آیا، اسی طرح ان کے محسن پیشوا دجّال اکبر کا ٹھکانا معلوم نہ ہوسکا، اور نہ ہی یاجوج ماجوج تک کا سراغ مل سکا۔

۔۔۔۔۔۔ ۔۔۔۔۔۔

وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ؕ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ؕ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ؕ فَابْعَثُوْۤا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖۤ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَاۤ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾ اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ وَلَنْ تُفْلِحُوْۤا اِذًا اَبَدًا ﴿۲۰﴾

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے انہیں اٹھایا تاکہ وہ آپس میں سوال کریں، ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ تم لوگ کتنی مدت ٹھہرے ہو؟ وہ کہنے لگے کہ ایک دن یا ایک دن سے کم، بعضوں نے کہا کہ تمہارا ربّ ہی زیادہ جانتا ہے کہ تم کتنی مدت ٹھہرے ہو، سو تم اپنے میں سے کسی کو یہ چاندی دیکر شہر کی طرف بھیجو، سو وہ دیکھے کہ اس شہر کے کھانوں میں کونسا کھانا زیادہ پاکیزہ ہے، سو وہ تمہارے پاس اس میں سے کھانا لائے، اور کام کرنے میں خوش تدبیری سے کام لے، اور تمہارے بارے میں کسی کو ہرگز خبر نہ دے ﴿۱۹﴾ بیشک بات یہ ہے کہ اگر انہیں تمہارا پتہ چل جائے تو تمہیں پتھر مار کر ہلاک کردیں گے، یا اپنے دین میں لوٹالیں گے، اور تم ہرگز کامیاب نہ ہوگے ﴿۲۰﴾

معارف ومنازل

جس طرح اصحاب کہف کا سینکڑوں سالوں تک سونا ایک عجیب وغریب نشانی رہی، اسی طرح اتنے سالوں کے بعد دوبارہ بیداری بھی عجائبات قدرت میں شمار ہے، فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ﴾ اور اسی طرح ہم نے ان کو اٹھایا بیدار کیا، یعنی جس طرح قدرت الٰہی کی بنیاد پر غار کے اندر ہم نے طویل مدت تک ان کو آرام سے سلایا، اور ان کے اجسام کو سڑنے گلنے سے محفوظ رکھا، اسی طرح اس موت نما خواب سے ان کو بیدار کیا تاکہ ان کے بیدار ہونے سے بھی قدرت الٰہی کا مظاہرہ

ہو، اور تا کہ وہ آپس میں سوال و جواب کریں اور پوچھیں، اور انہیں اپنی حالت کا علم ہو جائے، اور اپنے ساتھ اللہ تعالی سبحانہ کے سلوک کو پہچان کر قدرت خداوندی کا ان کو مزید یقین ہو جائے، اور وقوع قیامت کے عقیدے میں پختگی حاصل ہو جائے۔

﴿قَالَ قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ كَمۡ لَبِثۡتُمۡ قَالُوۡا لَبِثۡنَا يَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ يَوۡمٍ﴾ اس پر ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا: آپ لوگ کتنی مدّت سوتے رہے؟ دوسروں نے جواب دیا: پورے ایک دن ہم سوتے رہے، یا ایک دن سے کچھ کم۔ انہیں بیدار ہونے کے بعد یہ محسوس ہوا کہ ہم زیادہ دیر سوئے، لیکن دیر کی مقدار کتنی زیادہ ہوگئی اس میں اختلاف رائے ہونے لگا۔

بعض اقوال میں آیا ہے کہ زیادہ دیر سونے سے ان کی کچھ نمازیں فوت ہوگئی تھیں، اس لئے انہوں نے دن بھر سوتے رہنا ظاہر کیا، لیکن سورج ڈوبا نہ تھا، یہ دیکھ کر کچھ کم ایک دن کہا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جواب تخمینی تھا، اس کے ساتھ جب انہوں نے اپنے بال اور ناخن بڑھے ہوئے دیکھے تو خیال کیا کہ ایک دن نہیں شاید ہم طویل مدت سوتے رہے ہیں، اس لئے کہا:

﴿قَالُوۡا رَبُّكُمۡ اَعۡلَمُ بِمَا لَبِثۡتُمۡ﴾ انہوں نے کہا: تمہارے ربّ کو بخوبی علم ہے کہ تم لوگ کتنی دیر سوتے رہے، اس کا علم ہمارے ربّ کے پاس ہے۔ بہرحال بیدار ہونے کے بعد انہیں بھوک محسوس ہوئی، اور کھانے کا خیال اور اشتہاء پیدا ہوا، گھروں سے چلتے وقت انہوں نے کچھ نقدی یعنی چاندی کے پیسے اٹھالئے تھے، جو ان کے پاس رہے، اب کہنے لگے:

﴿فَابۡعَثُوۡۤا اَحَدَكُمۡ بِوَرِقِكُمۡ هٰذِهٖۤ اِلَى الۡمَدِيۡنَةِ﴾ اپنے میں سے کسی کو یہ روپیہ دے کر شہر کو بھیجو، وہ شہر طرطوس کہلاتا تھا، انہوں اپنے سب سے ہوشیار ساتھی تملیخا کا انتخاب کیا، اور وہ چاندی کے روپیہ اسے دے کر روانہ کیا، ورق چاندی کے روپیہ اور ڈلی دونوں کو کہتے ہیں۔

﴿فَلۡيَنۡظُرۡ اَيُّهَاۤ اَزۡكٰى طَعَامًا فَلۡيَاۡتِكُمۡ بِرِزۡقٍ مِّنۡهُ﴾ وہ جا کر تحقیق کرلے کہ کونسا کھانا پاکیزہ اور حلال ہے، اس میں سے کچھ کھانا خرید کر لے آئے، اور ساتھ ہی کہا:

﴿وَلۡيَتَلَطَّفۡ﴾ چاہئے کہ وہ آدمی سنجیدگی اور نرمی اختیار کرے، کوئی ایسی بات یا حرکت شہر میں نہ کرے جس سے ان کا راز فاش ہو جائے۔

﴿وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا﴾ اور اسے چاہئے کہ تمہارے متعلق کسی شخص کو کوئی خبر نہ دے۔ مطلب یہ ہے کہ نہایت محتاط رہے، کیونکہ:

﴿اِنَّهُمْ اِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ﴾ کیونکہ ان لوگوں نے اگر تمہاری اطلاع پالی یا تم پر ان کا قابو چل گیا تو:

﴿يَرْجُمُوْكُمْ اَوْ يُعِيْدُوْكُمْ فِيْ مِلَّتِهِمْ﴾ وہ پتھر مار مار کر تم کو ہلاک کر دیں گے، اگر تم نے مرتد ہونا قبول نہیں کیا، اور ان کے بتوں کی پوجا نہیں کی، یا اگر تم نے ارتداد قبول کیا تو تم کو اپنے باطل مذہب میں لوٹا دیں گے، یعنی جبراً اپنے مذہب میں داخل کر لیں گے، پھر:

﴿وَلَنْ تُفْلِحُوْا اِذًا اَبَدًا﴾ اور ایسی صورت میں تم کبھی فلاح نہیں پاؤ گے، کیونکہ ہماری فلاح ایمان اور توحید میں منحصر ہے، جب ہم اس نعمت سے پھر جائیں گے اور کفر و شرک کا حصہ بنیں گے تو خسارے میں گر جائیں گے، اور اپنی مشرک قوم کی طرح ابدی ذلت و خواری کے جہنم میں جائیں گے۔

وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا ۚ
اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا ؕ رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ ؕ
قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓى اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ﴿۲۱﴾

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے ان پر مطلع کر دیا کہ وہ اس بات کو جان لیں کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ حق ہے، اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں جب کہ وہ لوگ اپنے درمیان ان کے بارے میں جھگڑ رہے تھے، سو انہوں نے کہا کہ ان کے اوپر عمارت بنا دو، ان کا ربّ ان کو خوب جانتا ہے جو لوگ ان کے معاملہ میں غالب ہوئے انہوں نے کہا کہ ہم ضرور ضرور ان پر مسجد بنائیں گے ﴿۲۱﴾

معارف و منازل

اصحاب کہف کے زمانے کا بت پرست ظالم بادشاہ دقیانوس ہلاک ہو گیا، پھر اس تین سو سال کے عرصے میں کئی سلطنتیں اور نسلیں بدل چکی ہیں، اب موجودہ وقت کا بادشاہ اچھا نیک بخت بادشاہ تھا، توحید و ایمان کے عقیدہ کا پابند تھا، اسی طرح عوام اور رعایا بھی موحد و مؤمن تھی۔

دراصل ان کے زمانے میں مؤمن ہونے کے باوجود لوگوں میں وقوعِ قیامت اور حیات بعدالموت کے متعلق اختلاف پایا جاتا تھا، بعض لوگ وقوعِ قیامت اور دوبارہ زندگی پر ایمان رکھتے تھے، اور بادشاہ وقت بھی اسی عقیدہ پر قائم تھا، اور بعض لوگ اس کا انکار کر کے کہتے تھے کہ ارواح زندہ ہیں، اجسام کی دوبارہ زندگی ممکن نہیں، جب مرنے کے بعد اجسام گل سڑ جاتے ریزہ ریزہ ہوجاتے ہیں تو دوبارہ کیسے زندہ ہوجاتے ہیں؟

بعض روایات میں ہے کہ بادشاہ وقت ہمیشہ دعاء والحاح وزاری کرتا تھا: اے ہمارے پروردگار! اس مسئلہ کو غیب سے حل فرما کر لوگوں کو مطمئن فرمائیں، چنانچہ اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو دوبارہ زندہ فرما کر یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل فرمایا، اسی کو فرمایا:

﴿وَ كَذٰلِكَ اَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوْٓا اَنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ﴾ اسی طریقے سے ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کردیا تاکہ وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ برحق ہے، کیونکہ اصحاب کہف کا تین سو سالہ لمبی نیند سے بیداری اسی بات کی دلیل وثبوت تھی کہ دوبارہ زندہ ہونا برحق ہے، قیامت کے دن اسی طرح سارے لوگ زندہ ہوجائیں گے، اور یہی اللہ تعالیٰ شانہ کا وعدہ ہے کہ:

﴿وَّاَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيْهَا﴾ اور بیشک وقوعِ قیامت میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ اصحاب کہف کی دوبارہ بیداری نے سارے راز اور بھید کھول کر رکھ دیئے، جسے تمام دنیا نے مشاہدہ کیا، اور دیکھا، اس عجیب وغریب واقعہ سے جہاں ہر قسم کا تردد ختم ہوگیا وہاں لوگوں کا ان نیک بخت لوگوں کے ساتھ مضبوط عقیدہ بھی قائم ہوگیا، پس لوگوں نے ان کی یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس ضمن میں مختلف خیالات سامنے آگئے، اور لوگوں نے ان کی یاگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس ضمن میں مختلف خیالات سامنے آگئے، کچھ لوگوں نے وہاں عجائب گھر بنانے کا مشورہ دیا، بعض نے کوئی خصوصی مکان کی تعمیر کرنے کا خیال ظاہر کیا، بعض نے کوئی برج وکتبہ بنانے پر زور دیا، اور دیگر نے مسجد بنانے پر اصرار کیا، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿اِذْ يَتَنَازَعُوْنَ بَيْنَهُمْ اَمْرَهُمْ﴾ جب وہ اس معاملہ میں آپس میں جھگڑ رہے تھے۔

﴿فَقَالُوا ابْنُوْا عَلَيْهِمْ بُنْيَانًا﴾ بعضوں نے کہا کہ یہاں یادگار کے طور پر عمارت تعمیر کردی جائے۔

﴿رَبُّهُمْ اَعْلَمُ﴾ اللہ تعالیٰ ان کی حالت کو خوب جانتا ہے، پھر کیا ہوا؟

﴿وَقَالَ الَّذِیۡنَ غَلَبُوۡا عَلٰۤی اَمۡرِہِمۡ﴾ جولوگ غالب تھے صاحب الرائ تھے، یا بادشاہ اور اس کے ہمنوا تھے، یعنی صاحب اقتدار وغلبہ والے تھے انہوں نے یہ کہا:

﴿لَنَتَّخِذَنَّ عَلَیۡہِمۡ مَّسۡجِدًا﴾ کہ ہم یہاں پر یادگار کے طور پر عبادت خانہ تعمیر کریں گے، کیونکہ اصحاب کہف بڑے برگزیدہ لوگ تھے، جنہوں نے اپنا ایمان بچانے کے لئے تکلیفیں اٹھائیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں شرف و سعادت عطا کی، اور ان کو تین سو سال کے بعد دوبارہ زندہ کر کے اپنی قدرت کا کرشمہ دکھلایا، لہٰذا ان کی شایان شان یہ ہے کہ یہاں پر مسجد تعمیر کی جائے، چنانچہ اسی پر عمل ہوا، اور مسجد تعمیر ہوئی، اور قبروں کی طرف قبلہ بھی نہیں تھا، اس لئے یہ اشکال نہیں ہوتا کہ قبروں پر مسجد بنانے کی ممانعت ہے، اس نازک مسئلہ میں احتیاط بہت ضروری ہے۔

بزرگوں کے مقابر، اور مساجد کی تعمیر:

مسلمانوں میں سے بعض لوگوں نے قرآن مجید کی اس آیت کا بالکل الٹا مفہوم لیا ہے، وہ اسے دلیل ٹھیرا کر مقابر صلحاء پر عمارتیں اور مسجدیں بنانے کو جائز تو کیا کار ثواب اور ضروری سمجھتے ہیں، جس سے شرک کی بنیادیں اور مضبوط ہوجاتی ہیں، حالانکہ یہاں قرآن مجید ان کی اس گمراہی کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جونشانی ان ظالموں کو بعث بعد الموت اور امکانِ آخرت کا یقین دلانے کے لئے دکھائی گئی تھی اسے انہوں نے ارتکاب شرک کے لئے ایک خداداد موقع سمجھا، اور خیال کیا کہ چلو کچھ اور ولی وصالحین پوجا پاٹ کے لئے ہاتھ آگئے، پھر آخر اس آیت سے قبور صالحین پر مسجدیں بنانے کے لئے کیسے استدلال کیا جاسکتا ہے؟ جبکہ یہ اللہ تعالیٰ کا قول اور حکم نہیں کہ تم ایسا ضرور کرو، بلکہ یہ ان لوگوں کے قول عمل کی حکایت اور اخبار ہے۔ ان دونوں باتوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔

قرآن حکیم جب کسی چیز کی حکایت بطورِ اخبار بیان کرتا ہے تو اس کا مقصد صرف نشاندہی ہوتی ہے، نہ یہ کہ تم اس پر عمل کرلو، خاص کر جب سرور عالم ﷺ کے ارشادات اس چیز کی نہی میں تواتر کے ساتھ بکثرت موجود ہوں، اور اس کی آپ ﷺ نے مذمت بھی کی ہو، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَعَنَ اللّٰہُ تَعَالیٰ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَخِذِیْنَ عَلَیْھَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ۔ [أحمد، ترمذي، نسائي، ابن ماجة، أبو داؤد] فرمایا: اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر، اور قبروں پر مسجدیں بنانے اور چراغ روشن کرنے والوں پر، یعنی مردوں پر۔

اسی طرح ارشاد فرمایا: اَلَا وَاِنَّ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ کَانُوْا یَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ اَنْبِیَائِھِمْ مَسَاجِدَ فَاِنِّیْ اَنْھَاکُمْ

عَنْ ذٰلِکَ۔ [مسلم] خبردار رہو! تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے، میں تمہیں اس چیز سے منع کرتا ہوں کہ تم ایسی حرکت نہ کرو جو موجب لعنت ہو۔

پھر فرمایا: لَعَنَ اللّٰهُ الْیَهُوْدَ وَالنَّصَارٰی اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِیَائِهِمْ مَسَاجِدَ۔ [بخاري، ومسلم، وأحمد] اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی یہود اور نصاریٰ پر، انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا۔ یہ بات آپ ﷺ نے مرض موت کے موقع پر فرمائی تاکہ میری امت میری قبر کو عبادت گاہ نہ بنائے، پھر فرمایا: اِنَّ اُولٰئِکَ اِذَا کَانَ فِیْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰی قَبْرِهٖ مَسْجِدًا اَوْ صَوَّرُوْا فِیْهِ تِلْکَ الصُّوَرَ اُولٰئِکَ شِرَارُ الْخَلْقِ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ۔ [رواه البخاري ومسلم ونسائي وأحمد] ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں مرد صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے، اور اس کی تصویریں تیار کرتے تھے، یہ قیامت کے روز بدترین مخلوقات شمار ہوں گے۔

اسی طرح مسلم شریف میں روایت ہے: نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَنْ یُّجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ یُّبْنٰی عَلَیْهِ وَاَنْ یُّقْعَدَ عَلَیْهِ۔ آپ ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا کہ قبر کو پختہ بنایا جائے، اور قبر پر عمارت اور گنبد بنایا جائے، اور اس پر بیٹھا جائے۔ مسلم و بخاری کی روایت میں زائد یہ الفاظ بھی ہیں: یُحَذِّرُ مَا صَنَعُوْا۔ کہ آپ ﷺ اپنی امت کو اس طرح کرنے سے ڈراتے تھے۔

مسند احمد کی روایت میں ہے: اِنَّ مِنْ شَرِّ النَّاسِ مَنْ تُدْرِکُهُمُ السَّاعَةُ وَهُمْ اَحْیَاءٌ وَالَّذِیْنَ یَتَّخِذُوْنَ الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ۔ لوگوں میں شریر اور برے لوگ وہ ہوں گے جو قیامت برپا ہونے کے وقت زندہ ہوں گے، کیونکہ نیک لوگ تو قیامت کے آنے سے پہلے ختم ہو چکے ہوں گے، اور قیامت اس وقت برپا ہوگی جب صرف برے لوگ ہی دنیا میں رہ جائیں گے، اور دوسری قسم کے شریر لوگ وہ ہوں گے جو قبروں کو سجدہ گاہ بنالیں گے۔ اس سے واضح اشارہ ہے کہ قرب قیامت میں یہ برا عمل بکثرت ہوتا رہے گا، جیسا کہ آج کل یہ سب کچھ ہو رہا ہے، اور قبروں پر اجتماعات ہو رہے ہیں، عرس، قوالی، سجدے نذر و نیاز، چادر چڑھانا اور ہزاروں منکرات کی بھرمار ہے۔

سرور عالم ماحی شرک بدعت ﷺ کی ان تصریحات کی موجودگی میں کون خداترس آدمی یہ جرأت کر سکتا ہے کہ قرآن مجید میں عیسائی پادریوں اور رومی حکمرانوں کے جس فعل کا حکایۃً ذکر کیا گیا ہے اور جس کی نوعیت بھی غار ہونے کی وجہ سے مقابر سے مختلف اور غیر واضح ہے، اس کو اپنے لئے حجت قرار دے؟ یہ شریعت اسلامی کی توہین کے

مترادف ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں محفوظ رکھے۔ آمین

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۬ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۠ وَّلَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

ترجمہ: کچھ لوگ یوں کہیں گے کہ یہ تین آدمی ہیں چوتھا ان کا کتا ہے، اور کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ پانچ آدمی ہیں چھٹا ان کا کتا ہے، اٹکل پچو سے غیب پر حکم لگا رہے ہیں، اور کچھ لوگ کہیں گے کہ وہ سات ہیں اور آٹھواں ان کا کتا ہے، آپ فرما دیجئے: میرا رب ان کی تعداد کو خوب جاننے والا ہے، ان کو نہیں جانتے مگر تھوڑے سے لوگ، آپ ان کے بارے میں سے سرسری بحث کے علاوہ زیادہ بحث نہ کیجئے، اور ان کے بارے میں کسی سے بھی سوال نہ کیجئے ﴿۲۲﴾

معارف ومنازل

صاحب روح المعانیؒ نے بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ یہ اقوال ان لوگوں کے ہیں جو آنحضرت ﷺ کے زمانے میں تھے۔ پہلا قول یہودیوں کا ہے، اور دوسرا قول نصاریٰ کا ہے۔ یہ لوگ نجران سے آئے تھے، سرور عالم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو ان میں سے ایک شخص عاقب تھا، اور نصاریٰ کے فرقہ نسطوریہ کا سردار تھا، اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پہلی دو باتیں کہی تھیں۔ تیسرا قول بعض مسلمانوں کا ہے۔

پہلے دو قولوں کے ذکر کرنے کے بعد ﴿رَجْمًا بِالْغَيْبِ﴾ فرمایا (بغیر نشانے کے تیر چلانے والی بات)۔ اور تیسرے قول کو علیٰحدہ ذکر کیا، جس میں واو عطف بھی مذکور ہوا، فرمایا:

﴿سَبْعَةٌ وَّثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ﴾ اور ساتھ ہی فرمایا:

﴿قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ آپ فرما دیجئے کہ میرا ربّ ان کی تعداد کو خوب جانتا ہے، اور ان کو تھوڑے سے لوگ جانتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں بھی ان ہی میں سے ہوں جن کو ان کی تعداد کا علم ہے، وہ فرماتے تھے کہ ان کی تعداد سات تھی اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ عام طور پر

امت مسلمہ میں یہی قول مشہور ہے۔

﴿فَلَا تُمَارِ فِيهِمْ إِلَّا مِرَاءً ظَاهِرًا وَلَا تَسْتَفْتِ فِيهِمْ مِّنْهُمْ أَحَدًا﴾ آپ اصحاب کہف کے عدد وغیرہ کے بارے میں سرسری بحث سے زیادہ بات نہ کیجئے، اور ان کے بارے میں کسی سے کوئی سوال نہ کیجئے، کیونکہ یہ کوئی ضروری امر نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اصل چیز ان کی تعداد نہیں ہے، بلکہ اصل چیز وہ سبق ہے جو اس قصے سے ملتا ہے۔ اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ ایک سچے مؤمن کو کسی بھی حال میں حق سے منہ موڑنے اور باطل کے آگے سر جھکانے کے لئے تیار نہ ہونا چاہئے۔

اور اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ مؤمن کا اعتماد اسباب دنیا پر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ پر ہونا چاہئے، اور حق پرستی کے لئے بظاہر ماحول میں کسی سازگاری کے آثار نظر نہ آتے ہوں تب بھی اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر راہِ حق میں قدم اٹھا دینا چاہئے۔ اور اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جس عادت جاریہ کو لوگ قانون فطرت سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ اس قانون کے خلاف دنیا میں کچھ نہیں ہوسکتا، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، وہ اس کا پابند نہیں ہے، وہ جب اور جہاں چاہے اس ''عادت'' کو بدل کر جو غیر معمولی کام بھی کرنا چاہے کرسکتا ہے، اس کے لئے یہ کوئی بڑا کام نہیں ہے کہ کسی کو تین سو برس تک سلا کر اس طرح اٹھائے بٹھائے جیسے وہ چند گھنٹے سویا ہے، اور اس کی عمر، شکل، صورت، لباس، تندرستی، الغرض کسی چیز پر بھی اس امتداد زمانہ کا کچھ اثر نہ ہو۔

اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ نوعِ انسانی کی تمام اگلی پچھلی نسلوں کو بیک وقت زندہ کر کے اٹھا دینا جس کی خبر انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی نے دی ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے کچھ بھی بعید نہیں ہے۔

اور اس سے یہ سبق بھی ملتا ہے کہ جاہل انسان کس طرح ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کو اپنے لئے سرمہ چشم بصیرت بنانے کے بجائے الٹا مزید گمراہی کا سامان بناتے رہے ہیں۔ اصحاب کہف کا معجزہ اللہ تعالیٰ نے اس لئے دکھایا تھا کہ لوگ اس سے آخرت کا یقین حاصل کریں، ٹھیک اسی نشان کو انہوں نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے کچھ اور ''ولی'' پوجنے کے لئے عطا کر دیئے۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ۔

یہ ہے وہ اصل سبق جو سمجھ دار آدمی کو اس قصے سے حاصل کرنا ضروری ہے، اور اس میں توجہ کے قابل یہی امور ہیں، ان سے توجہ ہٹا کر اس کھوج میں لگ جانا کہ اصحاب کہف کتنے تھے؟ اور ان کے نام کیا کیا تھے؟ اور ان کا کتا

کس رنگ کا تھا؟ یہ ان لوگوں کا کام ہے جو مغز کو چھوڑ کر صرف چھلکوں سے دلچسپی رکھتے ہیں، اور بنیادی چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے ہیں، اور دور دراز اختلافات کا شکار رہتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ شانہ نے آنحضرت خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم کو، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی کہ اگر دوسرے لوگ اس طرح کی غیر متعلق بحثیں چھیڑیں بھی تو آپ ان میں نہ الجھیں، اور نہ ایسے سوالات کی تحقیق میں حصہ لیں، بلکہ اپنی توجہ صرف کام کی بات پر مرکوز رکھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود ان کی صحیح تعداد اور بہت سے دیگر کوائف وجزئیات بیان نہیں فرمائیں، اور فرمایا:

﴿قُلْ رَّبِّيْٓ اَعْلَمُ﴾ ایسی چیزوں کو تمہارا ربّ خوب جانتا ہے، تم اپنا وقت ضائع مت کرو۔ وَاللّٰهُ تَعَالٰى أَعْلَمُ وَعِلْمُهٗ أَكْمَلُ۔

﴿رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ [الأحزاب: ٢٣] (کتنے مرد ہیں کہ انہوں نے سچ کر دکھلایا جس بات کا انہوں نے عہد کیا تھا) اللہ تعالیٰ سے اور بڑی بڑی سختیوں کے وقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ورضا اور دین کی حمایت سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر پہاڑوں کی طرح جمے رہے۔ تاریخ کے اوراق ایسے جوانمردوں کے واقعات سے بھرے پڑے ہیں جن کے عزم واستقلال پر آسمان کے ستارے فخر کرتے ہیں کہ ان کے سایے میں ایسے باہمت انسانوں نے زندگی گزاری، کائنات کے طول وعرض میں پتھروں کی کوئی کمی نہیں، مگر ہیرا بھی تو پتھر ہے، لیکن نایاب ہے، پھر انسانوں کے ہیرے اگر ایک طرح نایاب ہیں تو دوسری طرف اتنی بیش بہا اور قیمتی ہیں کہ کائنات بھر اس کی قیمت نہیں بن سکتی۔

اس جہاں رنگ وبو میں ہر قسم کی قربانی دینے والے آئے، اور بکثرت آئے، ہر زمانہ اور ہر خطے میں آئے، ہر رنگ میں آئے، اور ہر انداز میں آئے، جنہوں نے اپنی قربانیوں سے تاریخ انسانیت میں وہ نقوش رقم کئے جن پر ملاء اعلیٰ کے فرشتوں کو للکارا، اور ایسے جانباز وسرفروش لوگوں کے نقش قدم پر چلنے کی دعوت دی۔ قرآن کریم تاریخی کتاب نہیں، اور نہ ہی اس کو تاریخ بیان کرنے کے ساتھ کوئی دلچسپی ہے، وہ کتاب ہدایت ہے، وہ اگر کسی فرد یا کسی جماعت یا قوم کی تاریخ کا کوئی عجیب پہلو بیان کرتا ہے تو صرف اس مقصد کے لئے کہ اس سے سبق سیکھا جائے۔

اگر قرآن حکیم اصحاب الکھف والرقیم کا قصہ بیان کرتا ہے تو اس کا واضح مقصد یہ ہوتا ہے کہ رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے ترغیب دیتا ہے کہ آؤ ذرا دیکھو کہ چند نوعمر لڑکے کھانے پینے پہننے والے خوشحال گھروں

کے بچے اپنے دین وایمان کی حفاظت وبقاء کے لئے ظالم وجابر حکمرانوں کے ساتھ ٹکر لیتے ہیں، اور ایوان کفر میں توحید کا علم بلند کر کے اپنی قیمتی جانوں سے کھیلتے ہیں، پھر جب انہیں تین چار روز کی مہلت ملتی ہے تا کہ وہ مزید غور کریں اور کسی حتمی نتیجے پر پہنچ کر دوبارہ شاہی دربار میں حاضر ہو کر اپنا موقف بیان کریں یا ابدی شقاوت اختیار کر کے زندگی کی عیش وعشرت کے مزے اڑائیں، بصورت دیگر تہہ تیغ ہو کر زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں، انہوں نے اس مہلت کو غنیمت جانتے ہوئے فیصلہ کیا کہ قربانی دیں گے، اور ایمان کا تحفظ کر کے رہیں گے۔ قربانی یہ دینی ہے کہ والدین، سارے رشتہ داروں، عزیزوں دوستوں، کاروبار اور پوری دنیا کی خوشحالیوں اور سارے جہاں کی وسعتوں، نزاکتوں کو بیک لحمہ چھوڑ کر جنگل کے کسی تنگ وتاریک غار میں پہنچ کر فقیرانہ زندگی گزاریں گے۔ انہیں سو فیصد یقین تھا کہ قدرت ہماری مدد فرما کر ہماری پذیرائی کرے گی۔ اس طرح انہوں نے تمام دنیا اور دنیا کی ناز ونخرے مالی خوشحالیوں کو خیر باد کہتے ہوئے پہاڑی غار کا رخ کیا، اور وہاں رہنے لگے۔ یہ وہ قربانی ہے جس کی نظیر کوئی پیش نہیں کرسکتا، اور قیامت تک کے انسانوں کے لئے درس عبرت ہے۔

آنکس کہ ترا شناخت جہانرا چہ کند ☆ فرزندوزن وعیال وخانمانرا چہ کند
دیوانہ کنی ہردو جہاں رامی بخشی ☆ دیوانہ تو ہردو جہان را چہ کند
جان زتن بردی ودرجانی ہنوز ☆ دردہا دادی ودرمانی ہنوز
قیمت خود ہر دو عالم گفتۂ ☆ نرخ بالاکن کہ ارزانی ہنوز

عالمِ شباب کی خرمستیوں کو قربان کرنا، جوانی کی نیرنگیوں کو خیر باد کہنا اور رنگیلی دنیا سے قطع تعلق کر کے صرف اور صرف ایمان پر قناعت کرنا کتنی بڑی قربانی ہے؟ جو ہر کس وناکس کے لئے ناممکن نہایت مشکل ہے۔ آج تو یہ عالم ہے کہ لوگوں کا ایمان دو دو روپیہ پر بکتا ہے، جبکہ کسی وقت سارا جہان اس کی قیمت نہیں بن سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے۔ آمین

❁ ❁ ❁

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿٢٣﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؗ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰۤی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿٢٤﴾

ترجمہ: اور کسی چیز کے بارے میں آپ ہرگز یوں نہ کہیں کہ میں اسے کل کروں گا ﴿٢٣﴾ مگر یہ کہ اس کے ساتھ

اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ذکر بھی کر دیں، اور جب آپ بھول جائیں تو اپنے ربّ کو یاد کریں، اور آپ یوں کہہ دیجئے کہ امید ہے میرا ربّ مجھے وہ بات بتادے گا جو ہدایت کے اعتبار سے اس سے قریب تر ہے ﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

ان دونوں آیات کا تعلق بھی اصحاب کہف کے واقعہ کے ساتھ ہے۔ ابن المنذرؒ نے حضرت مجاہدؒ کے حوالہ سے بیان کیا ہے کہ یہودیوں نے مشرکین مکہ سے کہا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے روح اور اصحاب کہف اور ذوالقرنین کے متعلق سوال کرو۔ پس قریش نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ سوالات کئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کل میرے پاس آنا میں بتادوں گا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان شاء اللہ نہیں فرمایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تقریباً پندرہ روز تک وحی نہیں آئی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس سے بڑی بے چینی ہوئی، اور پریشان رہے۔

ادھر دشمن نے مذاق کرنا شروع کیا، اور خوب پروپیگنڈا ہوتا رہا، پھر یہ آیت اتری کہ آپ آئندہ کوئی وعدہ اور کوئی کام ان شاء اللہ کہے بغیر نہ کریں۔ یہ ممانعت ادب آموزی اور اصلاح حال کی خاطر کی گئی تا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے اور پوری امت کے لئے نمونہ ہو، اور ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت وارادہ کے تابع ہو۔ اسی میں برکت ہے، اور کامیابی بھی ہے کہ مؤمن کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیت پر باندھا ہوا ہو۔ فرمایا:

﴿وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا﴾ آپ کسی چیز کے بارے میں یوں نہ کہیں کہ میں اسے کل کرنے والا ہوں۔

﴿اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ بلکہ یوں کہیں: اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مستقبل کے ہر فعل کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع کر دینا۔ دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [التکویر: ۲۹] (یعنی تمہارے چاہنے سے کوئی بات نہیں بنتی جب تک اللہ تعالیٰ نہ چاہے) لہٰذا اپنے تمام امور کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے ساتھ منسلک کیا کرو۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی سو بیویاں تھیں، انہوں نے قسم اٹھائی کہ میں ایک ہی رات میں تمام بیویوں کے پاس جاؤں گا، اور ان سے پیدا ہونے والے بچوں کو اللہ تعالیٰ کی خاطر جہاد میں لگاؤں گا۔ آپ علیہ السلام نے ساتھ ان شاء اللہ نہ کہا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تکمیلِ عمل کے باوجود صرف ایک بیوی کے ہاں بچہ پیدا ہوا، وہ بھی ناکارہ فالج زدہ جس سے جہاد میں شمولیت کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ فرمایا: ﴿وَاَلْقَیْنَا عَلٰی کُرْسِیِّهٖ

جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ﴾[ص:۳۴] (اور ہم نے ان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دیا، پھر انہوں نے رجوع کیا)۔اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا کہ اگر حضرت سلیمان علیہ السلام قسم اٹھاتے وقت انشاء اللہ کہہ دیتے تو آپ کی مراد پوری ہوجاتی، سو بچے پیدا ہوتے، جو سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے، مگر ان شاء اللہ نہ کہنے کی وجہ سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔[بخاري]

﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ﴾ اور اگر آپ عین موقع پر ان شاء اللہ کہنا بھول جائیں تو جس وقت یاد آجائے اسی وقت اعادہ کرلیں، یعنی بھول جانے کا قانون یہ ہے کہ یادآوری کے بعد ان الفاظ کو ادا کرے، ان شاء اللہ کہہ دے۔

مفسرین، محدثین، فقہاء اور مجتہدین حضرات کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ کسی کام کا ارادہ کرنے کے کتنی دیر بعد تک ان شاء اللہ کہنا کارآمد ہے۔حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت مجاہد، سعید بن جبیر، ابوالعالیہ رضی اللہ عنہم اور بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ کسی کام کا ارادہ کرنے کے ایک سال بعد تک بھی اگر کوئی شخص ان شاء اللہ کردیتا ہے تو اسے اس کام کے ساتھ منسلک سمجھا جائے گا۔البتہ امام حسن بصری، امام طاؤس وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ جس مجلس میں کسی کام کا ارادہ کیا ہے اگر اسی مجلس کے دوران ان شاء اللہ کہہ دے تو درست ہے، ورنہ مجلس برخاست ہونے کے بعد ان شاء اللہ کہنا اس کام کے ساتھ مطابقت نہیں رکھے گا۔

علاوہ ازیں حضرت امام ابوحنیفہ، امام ابراہیم نخعی، عطاء، امام شعبی وغیرہ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ ان شاء اللہ صرف اسی صورت میں تسلیم ہوگا یعنی درست سمجھا جائے گا جب یہ کسی کام کا ارادہ کرنے کے ساتھ متصلاً کہہ دیا جائے، اگر ان شاء اللہ کا لفظ وقفے کے ساتھ کہا تو یہ معتبر نہیں ہوگا۔

﴿وَقُلْ عَسٰۤى اَنْ يَّهْدِيَنِ رَبِّيْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا﴾ کہ آپ یہ بھی کہہ دیں کہ امید ہے کہ میرا پروردگار راہنمائی فرمائے گا، اس سے زیادہ قریب تر نیکی کے راستے کی دراصل۔ یہ سرورِ عالم ﷺ کی نبوت و رسالت کی صداقت کی دلیل بیان کی جارہی ہے۔آپ ﷺ کا اصحابِ کہف کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کردینا ہی آپ ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے، کیونکہ یہود اور مشرکین نے یہ سوال کرکے آپ کا امتحان لینا چاہا تھا، جب آپ ﷺ نے ان کے سوالات کا صحیح جواب دیدیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ ﷺ واقعی صاحبِ وحی اور اللہ تعالیٰ کے بتلانے

سے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اصحاب کہف کا واقعہ بیان کیا ہے۔

یہ تو سینکڑوں سال پرانا واقعہ تھا، اللہ تعالیٰ قریبی زمانہ کے کسی واقعہ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی دلیل کے طور پر پیش کر سکتا تھا، چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ ایسا ہے جو اس سورت کے نزول سے کچھ عرصہ بعد پیش آیا، جس طرح اصحاب کہف تین سو نو سال تک غار میں پناہ گزین رہے، اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سفر ہجرت کی ابتداء میں تین دن تک غار ثور میں رکے رہے، تمامتر کوششوں کے باوجود کفار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تلاش نہ کر سکے، تین دن کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو کر مدینہ طیبہ پہنچے، تو گویا یہ تین دن کا واقعہ تین سو سالہ واقعہ سے تو قریب تر ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت و رسالت کی صداقت کی دلیل ہے۔

مطلب یہ کہ اصحاب کہف سے زیادہ عجیب طور پر اللہ تعالیٰ آپ کی حفاظت فرمائے گا، اور کامیاب کر دے گا جیسا کہ غار ثور میں ہوا۔ یا یہ مطلب ہے کہ واقعہ کہف سے زیادہ عجیب واقعات و شواہد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے بیان کر دے گا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امید رکھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی نہیں بھولے گا۔

وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾

ترجمہ: اور وہ لوگ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور نو برس مزید اوپر گزر گئے ﴿۲۵﴾ آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہی خوب جاننے والا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے، اسی کو آسمانوں اور زمین کے غیب کا علم ہے، وہ کیا ہی دیکھنے والا ہے اور کیا ہی سننے والا ہے، ان لوگوں کا اس کے سوا کوئی مددگار نہیں، اور وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں فرماتا ﴿۲۶﴾

معارف و منازل

﴿وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ﴾ اس فقرے میں اختلافات ہیں: پہلا قول یہ ہے کہ درمیان کے جملہ معترضہ سے پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ہے، یعنی سلسلہ عبارت یوں ہے: ﴿سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ وَلَبِثُوْا فِيْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا﴾ یہ قول حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ اپنے غار میں تین سو سال رہے، اور بعض لوگوں

نے اس میں نو سال بڑھا دیئے، یہ دراصل لوگوں کے قول کی حکایت ہے، اللہ تعالیٰ کا اپنا قول نہیں، اور اس پر دلیل یہ ہے کہ بعد کے فقرے میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں: کہو اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت رہے۔ اگر ۳۰۹ سال مدت اللہ تعالیٰ خود بیان فرما چکے ہوتے تو اس کے بعد ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ نہ فرماتے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ حکایت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ شانہ کا اپنا قول ہے۔ یہ مذہب جمہور علماء کا ہے، وہ فرماتے ہیں: ﴿قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا﴾ سے واضح طور پر یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس میں پہلی بات ۳۰۹ کی تردید ہے۔ واللہ اعلم۔ اسی طرح جمہور علماء نے کہا ہے کہ شمسی اعتبار سے تین سو سال رہے، اور تین سو سال قمری اعتبار سے تھے۔

لیکن صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ یہ لفظوں سے واضح نہیں ہے، پھر یہ منجمین کے حساب کے موافق بھی نہیں ہے۔ اگر شمسی اور قمری سنین کا فرق سامنے رکھتے ہوئے حساب لگایا جائے تو تین سو سال شمسی پر نو سال تہتر دن اور نو گھنٹے اور اڑتالیس منٹ کا فرق نکلتا ہے۔ البتہ اگر کسر زائد کا اعتبار نہ ہو تو پھر صحیح ہو جاتا ہے واللہ اعلم

﴿اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ﴾ عربی زبان میں یہ دونوں تعجب کے صیغے ہیں، اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی دیکھنے والا یا سننے والا کوئی نہیں ہے، وہ سب سے بڑا سمیع و بصیر ہے، اور وہ خوب جاننے والا ہے، جو آسمانوں اور زمین میں ہے۔ علم غیب اسی کی ذات کا خاصہ ہے، اور اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ مزاحم، اسی کو اپنا ولی مددگار بنا کر خالص اس کی عبادت کرو، اور صرف اسی کو پکارو۔

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ﴿۲۷﴾ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

ترجمہ: اور آپ اپنے ربّ کی کتاب جو آپ کی طرف وحی کی گئی اس کی تلاوت کیجئے، اس کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اور ہرگز آپ اس کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے ﴿۲۷﴾ اور جو لوگ صبح و شام اپنے ربّ کو پکارتے ہیں ان کے ساتھ اپنے کو مقید رکھئے، یہ لوگ اس کی رضا کے طالب ہیں، اور آپ ایسا نہ کریں کہ دنیا والی زندگی کی زینت کے ارادے سے ان سے آپ کی نظریں ہٹ جائیں، اور ایسے شخص کی بات نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد

سے غافل کر دیا، اور جو اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، اور اس کا حال حد سے بڑھ گیا۲۸

معارف و منازل

قوموں کے سرداروں، مالداروں، حکومتی اہلکار اور افسروں کو اپنی سرداری اور مالداری اور افسری پر جو غرور اور گھمنڈ ہوتا ہے اس کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو حقیر سمجھتے ہیں، یہ سلسلہ آفرینش دنیا سے لے کر ہمیشہ ہر زمانے میں قیامت تک جاری رہے گا، حالانکہ یہ تمام چیزیں فانی اور عارضی ہیں، جبکہ ایمان اور اعمال صالحہ اصلی اور باقی ہیں، قیامت میں یہی کام آنے والی بنیادی سرمایہ ہیں، جہاں دنیاوی چیزوں کی کوئی بھی حیثیت نہیں ہوگی، پس عارضی اور فانی چیزوں پر فخر و غرور سراسر حماقت اور نادانی ہے۔

کچھ سردار اور قومی لوگ ایسے بھی تھے جیسے اُقرع بن حابس اور عیینہ بن بدر جنہیں تالیف قلب کے لئے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کچھ مال دیتے رہتے تھے، ایسے لوگوں کو مؤلفۃ القلوب کہا جاتا تھا، انہی دونوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یہ غریب لوگ جیسے کہ حضرت سلمان فارسی، ابوذر غفاری، بلال حبشی، خباب بن حارث رضی اللہ عنہم ہیں، وغیرہ فقراء آپ کے پاس بیٹھے رہتے ہیں، ان کے کپڑے اُون کے ہیں، ان میں سے بدبو آتی ہے، آپ ان سے الگ رہیں، اگر آپ ان سے الگ بیٹھیں گے تو پھر ہم بڑے لوگ ہر وقت آپ کی خدمت میں آجایا کریں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی درخواست قبول کرنے سے منع فرمایا۔ [در منثور عن سلمان رضی اللہ عنہ] اس پر یہ آیت کریمہ اتری:

﴿وَاتْلُ مَا أُوْحِيَ إِلَيْكَ﴾ سے ﴿أَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ﴾ تک۔ فرمایا کہ آپ کے ربّ کی طرف سے جو کتاب نازل کی گئی ہے آپ اس کی تلاوت کیا کریں، اس کتاب کا لوگوں تک پہنچانا اور تلاوت کرنا یہ آپ کا کام ہے، جو لوگ دنیاوی اعتبار سے بڑے ہیں اگر ایمان نہ لائیں اور آپ کے پاس بیٹھنے کے لئے کوئی ایسی شرط لگائیں جس میں اہل ایمان فقراء کو دور رکھنا پڑتا ہو تو آپ اسے قبول نہ کیجئے، اللہ تعالیٰ کے کلمات کو کوئی بدلنے والا نہیں، اللہ تعالیٰ نے جو آپ سے وعدے کئے ہیں وہ پورے ہو کر رہیں گے، آپ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی پناہ کی جگہ نہ پائیں گے۔ یہ خطاب بظاہر اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے، لیکن سنانا اور تنبیہ کرنا سرداروں کو ہے۔

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ﴾ جو لوگ صبح و شام اپنے ربّ کو پکارتے

ہیں آپ ان کے ساتھ بیٹھے رہا کیجئے، یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں۔ دراصل لوگ یعنی انسان کہلانے کے حقدار یہی لوگ ہیں، جن میں یہ دو بیش قیمت صفات موجود ہیں: اوّل یہ کہ وہ صبح وشام اپنے رب کو پکارتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کو چاہتے ہیں۔ اور آپ ایسا نہ کریں کہ دنیاوی زینت کا خیال کرتے ہوئے ان لوگوں سے آپ کی آنکھیں ہٹ جائیں جو صبح وشام اپنے ربّ کو یاد کرتے ہیں۔

اس میں واضح کیا کہ دنیوی زیب وزینت کی کوئی حیثیت نہیں ہے، لہٰذا اس کے لئے دینی شرعی تقاضوں کو نہ چھوڑا جائے۔ احتمال تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خیال ہو جائے کہ یہ سردار مسلمان ہو جائیں گے تو اسلام اور اہل اسلام کو قوت حاصل ہو جائے گی، ارشاد فرمایا کہ اسلام کا جمال باطنی یعنی اخلاص اور اطاعت ہی اس کی زینت اس کے لئے کافی ہے۔ مخلصین کو مجلس سے ہٹا کر اصحاب دنیا کے ذریعہ حاصل ہونے والی دنیا کو نہ دیکھا جائے، جب تیرے ربّ کے نزدیک سارا جہاں مچھر کے پر کے برابر بھی حیثیت نہیں رکھتا تو اس کے طالب دنیادار کی بھی کوئی قدر و منزلت نہیں، آپ اور آپ کے ابدی پیغام کے طالب ہی خدا کے دوست ہیں، لہٰذا:

﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا﴾ اور آپ ایسے شخص کی بات نہ مانئے جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا، اور وہ اپنی خواہش کے پیچھے لگ گیا، اور اس پر شیطان کا تسلّط ہوا۔

﴿وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا﴾ اور اس کا حال حد سے بڑھ گیا، وہ لوگ افراط میں چلے گئے، وہ حق سے بہت ہی دور ہیں، خواہشات کے پیچھے چلنے والے ہمیشہ اسی طرح گم ہو جاتے ہیں۔

........❁........❁........❁........

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ۭ وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ۭ بِئْسَ الشَّرَابُ ۭ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۲۹

ترجمہ: اور آپ فرما دیجئے کہ حق تمہارے ربّ کی طرف سے ہے، سو جس کا جی چاہے مؤمن ہو جائے اور جس کا جی چاہے کافر رہے، بلاشبہ ہم نے ظالموں کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے، انہیں اس کی دیواریں گھیرے ہوئے ہوں گی، اور اگر وہ فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے ان کی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، وہ مونہوں کو بھون ڈالے گا، وہ پینے کی بُری چیز ہے، اور دوزخ آرام کی بُری جگہ ہے ۲۹

معارف ومنازل

اس آیت کریمہ میں گزشتہ آیت: ﴿وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ﴾ کا نتیجہ اور مختصر خلاصہ کا بیان ہے، یعنی جن لوگوں کے دل دنیا کے نشے میں مست ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل رہتے ہیں، اور ہر وقت نفس کی خوشی اور خواہشات کی پیروی میں مشغول رہتے ہیں ایسے بدمست غافلوں کی بات پر آپ کان نہ دھریں، وہ جو کہتے ہیں کہ آپ ان فقراء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی مجلس سے دور رکھیں پھر ہم آپ کے پاس آکر آپ کی بات سنیں گے، ممکن ہے آپ کے قلب مبارک میں یہ خیال گزرا ہو کہ ان غرباء کو تھوڑی دیر علیحدہ کر دیتے ہیں، وہ چونکہ پکے مسلمان اور سنجیدہ ہیں اس بات سے وہ ناراض بھی نہیں ہوں گے، اس صورت میں شاید یہ دولتمند سردار اسلام قبول کرلیں گے، اس پر فرمایا کہ ہرگز آپ ایسا نہ کریں، آپ کے پاس وحی آچکی ہے آپ نے ان سرداروں کو بار بار خدا کا حکم بتا کر حق ادا کر چکے ہیں، خدا کی طرف سے سچی باتیں انہیں پہنچا چکے ہیں، آپ کے ربّ کو کسی کے ماننے نہ ماننے کی کچھ پروا نہیں ہے، ماننے اور نہ ماننے والے اپنے نفع ونقصان کے بارے میں خود سوچیں، جن کا انجام خود ان کے سامنے ہے، دنیا کی لذتیں محض ہیچ اور فانی ہیں، ان کا لطف جب ہی ہے کہ یہ فلاح آخرت کا ذریعہ بنیں، ورنہ سوائے ناکامی کے کچھ بھی نہ ہوگا۔ آپ اپنا حوصلہ بلند رکھیں، اور انہیں ایمان اور کفر کے انتخاب کرنے کا مکمل اختیار دیدیں۔

﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ پس جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے، میرے ربّ کو نہ تمہارے ایمان کی ضرورت ہے اور نہ تمہارے کفر سے نقصان، تمہارے کہنے سے میں ان فقراء صادقین ذاکرین متقین کو اپنے پاس سے نہیں ہٹا سکتا، اور حق کے منکر کا فر قابل التفات نہیں۔

واضح رہے کہ یہ کلام بطور زجر وتہدید وتخویف ہے، کوئی یہ نہ سمجھے کہ ﴿فَلْيَكْفُرْ﴾ کہتے ہوئے اللہ تعالیٰ کفر کی اجازت دے رہے ہیں، بلکہ بطور توبیخ فرما رہے ہیں، ورنہ اس کی شان تو یہ ہے: ﴿وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ﴾ [الزمر: ۷] (وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا)۔ مزید توبیخ کے ساتھ فرمایا:

﴿اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا﴾ اس میں شک نہیں کہ ہم نے ظالموں (کافروں) کے لئے آگ تیار کر رکھی ہے۔ ﴿اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا﴾ اس کی قناتیں اور پردے ہر طرف سے ان کو گھیر لیں گے، یہ لوگ اس کی چار دیواری سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔

﴿وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ﴾ اگر وہ پیاس سے چلائیں گے اور فریاد کریں گے تو ان کی

فریادرسی ایسے پانی سے کی جائے گی جو پگھلے ہوئے تابنے کی مانند ہوگا۔ (بعضوں نے کہا: تیل کی تلچھٹ) یا تیل کی تلچھٹ یا کچ لہو، یعنی خون اور پیپ یہ تینوں معانی درست اور صحیح ہیں۔

﴿بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَآءَتْ مُرْتَفَقًا﴾ برا پانی ہوگا اور بُری آرام گاہ ومنزل ہوگی۔ سبحان اللہ! آئندہ متصل مؤمنین کے لئے فرمایا:

﴿نِعْمَ الثَّوَابُ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا﴾ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوزخ کو چار دیواریں گھیری ہوئی ہیں جن میں ہر دیوار کا عرض چالیس سال چلنے کی مسافت رکھتا ہے۔ [ترمذي] یعنی اس کی دیواریں اتنی موٹی ہیں کہ صرف ایک دیوار کی چوڑائی طے کرنے کے لئے کوئی چلنے والا چلے تو چالیس سال لگ جائے، اس کی حکمت اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝۳۰ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّيَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ
سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝۳۱

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے یہ بات واقعی ہے کہ ہم اس کا عمل ضائع نہیں کریں گے، جو اچھے کام کرے۝۳۰ ان لوگوں کے لئے ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، انہیں سونے کے کنگنوں کا زیور پہنایا جائے گا، اور یہ لوگ سندس اور استبرق کے کپڑے (لباس) پہنیں گے، جنت میں مسہریوں (تختوں) پر تکیے لگائے ہوئے ہوں گے، وہ بہت اچھا بدلہ ہے، اور آرام کی اچھی جگہ ہے۝۳۱

معارف ومنازل

قرآن حکیم کا اصول ہے کہ جنتیوں کے ساتھ دوزخیوں اور دوزخیوں کے ساتھ جنتیوں کا تذکرہ کرکے ترہیب وترغیب دونوں پر روشنی ڈالتا ہے۔ سابقہ آیات میں اہل کفر کی سزا بیان کرنے کے بعد اہل ایمان کے ایمان اور اعمال صالحہ کی پسندیدہ جزاء کا تذکرہ فرمایا، ارشاد ہے:

ہم نیک اعمال کرنے والوں کا اجر وثواب ضائع نہیں کرتے، نیک عمل وہی ہے جو ایمان واخلاص کے ساتھ

ہو، اور شریعت وسنت کے مطابق ہو، غیر شرعی عمل اور بدعت کبھی نیک عمل میں شمار نہیں ہوتا۔ فرمایا:

یہ لوگ ہمیشہ رہنے کے باغوں میں رہیں گے، ان باغوں کے نیچے ہمیشہ نہریں جاری ہوں گی۔ (نہروں کی تفصیل سورۂ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، سورۂ رحمٰن، سورۂ واقعہ اور سورۃ الدہر کی تفسیر میں ملاحظہ کریں) اور ساتھ ہی ان کے زیور اور لباس کا بھی تذکرہ فرمایا، اور فرمایا کہ انہیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے، اور وہ وہاں سبز رنگ کے لباس پہنیں گے جو سندس اور استبرق کے ہوں گے۔ پھر ان مسہریوں کا تذکرہ فرمایا جن پر یہ لوگ تکیہ لگائے ہوئے بیٹھیں گے، اور خوب نظارہ کریں گے، یہ بیٹھنا آمنے سامنے ہوگا، ایک دوسرے کے مقابل ہوں گے۔

سندس باریک ریشمی کپڑا، استبرق (موٹا) دبیز ریشمی کپڑا۔ علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ جنت کے کپڑوں کے دبیز ہونے سے مراد ہے بناوٹ کی مضبوطی۔ بعضوں نے سندس کا ترجمہ زربفت سے کیا ہے، جس میں اعلیٰ درجہ کی چمک ہوگی۔

ابوالشیخ رحمہ اللہ نے العظمۃ میں حضرت کعب الاحبار ؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہے جو اپنی پیدائش کے آغاز سے اہل جنت کے لئے زیور ڈھال رہا ہے، اور قیامت تک ڈھالتا رہے گا، اگر اہل جنت کا ایک ہی زیور سامنے لایا جائے تو اس کی روشنی سے سورج کی روشنی ماند پڑ جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ادنیٰ جنتی کے ادنیٰ زیور کا تمام دنیا کے زیوروں سے موازنہ کیا جائے تو وہ ادنیٰ جنتی زیور دنیا کے تمام زیوروں سے بڑھ چڑھ کر ہوگا۔ [مظهري]

واضح رہے کہ جنتی زندگی، جنتی زیور اور جنتی لباس کا بلکہ کسی بھی جنتی چیز کا دنیا کی چیزوں پر قیاس کرنا بے فائدہ اور لاحاصل ہے، وہاں کا ماحول جب یہاں کے ماحول سے سراسر مختلف ہے تو قیاس ہی غلط ہوگا۔ جو چیزیں یہاں مردوں کے لئے حرام ہے جیسے سونے اور ریشم وہاں جائز ہیں اور مردوں کو جنتی عمدہ واعلیٰ سونے کا کنگن پہنایا جائے گا۔

۞ ۞ ۞

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا
زَرْعًا ﴿٣٢﴾ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ أُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ﴿٣٣﴾ وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ
فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ أَنَا أَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّأَعَزُّ نَفَرًا ﴿٣٤﴾ وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ

مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا (٣٥) وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا

مُنْقَلَبًا (٣٦) قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ

سَوّٰىكَ رَجُلًا (٣٧) لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (٣٨) وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ

اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا (٣٩) فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ

وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا (٤٠) اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ

تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا (٤١) وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى

عُرُوْشِهَا وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا (٤٢) وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ

مُنْتَصِرًا (٤٣) هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا (٤٤)

ترجمہ: اور آپ ان سے دو شخصوں کا حال بیان کیجئے، ان میں سے ایک کو ہم نے انگور کے دو باغ دیئے، اور ان کو ہم نے کھجور کے درختوں سے گھیر دیا، اور ان دونوں کے درمیان ہم نے کھیتی بھی اگا دی تھی (۳۲) دونوں باغ اپنا پورا پورا پھل دیتے تھے، اور پھلوں میں ذرا بھی کمی نہ رہتی تھی، اور ہم نے ان دونوں کے درمیان نہر جاری کر دی تھی (۳۳) اور اس کے لئے اور بھی پھل تھے، سو اس نے باتیں کرتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا کہ میں تجھ سے زیادہ مال والا ہوں، اور میرے افراد بھی غلبہ والے ہیں (۳۴) اور وہ اس حال میں اپنے باغ میں داخل ہوا کہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا، اس نے کہا کہ میں یہ گمان نہیں کرتا کہ یہ باغ کبھی ہلاک ہو گا (۳۵) اور نہ میں یہ خیال کرتا ہوں کہ قیامت قائم ہو گی، اور میں اگر اپنے ربّ کی طرف لوٹا دیا گیا تو اس سے بہتر لوٹنے کی جگہ ضرور ضرور پا لوں گا (۳۶) اس کے ساتھی نے جواب دیتے ہوئے کہا: کیا تو نے اس ذات کے ساتھ کفر کیا جس نے تجھے مٹی سے پھر نطفہ سے پیدا کیا؟ پھر تجھے صحیح سالم آدمی بنا دیا؟ (۳۷) لیکن میری بات تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ میرا ربّ ہے، اور میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا (۳۸) اور جب تو اپنے باغ میں داخل ہوا تو تو نے ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ کیوں نہ کہا؟ اگر تو مجھے اس حال میں دیکھ رہا ہے کہ میں تجھ سے مال اور اولاد کے اعتبار سے کم ہوں (۳۹) تو وہ وقت نزدیک ہے کہ میرا ربّ مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرما دے، اور تیرے باغ پر آسمان سے کوئی آفت بھیج دے جس کی وجہ سے تیرا باغ ایک صاف میدان ہو کر رہ جائے (۴۰) یا اس کا پانی زمین میں اتر جائے، پھر تو اسے طلب کرنے کی کوشش نہ کر سکے (۴۱) اور اس کے پھلوں کو آفت سے گھیر دیا

گیا، سو وہ اس حال میں ہو گیا کہ جو کچھ اسمیں خرچ کیا تھا اس پر کف افسوس ملنے لگا، اور حال یہ تھا کہ اس کا باغ اپنی ٹٹیوں پر گرا ہوا تھا، اور وہ کہہ رہا تھا کہ ہائے کاش میں اپنے ربّ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ﴿۴۲﴾ اور اس کے لئے ایسا کوئی گروہ نہ تھا جو اس کی مدد کرتا ﴿۴۳﴾ اور نہ وہ خود بدلہ لینے والا تھا، ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کے سوا اللہ تعالیٰ ہی کی مدد ہوتی ہے جو حق ہے وہ بہتر ہے ثواب کے اعتبار سے، اور بہتر ہے انجام کے اعتبار سے ﴿۴۴﴾

معارف ومنازل

دولت مندوں اور فقراء کے حالات بیان کرنے کے بعد جنتیوں اور دوزخیوں کے کوائف وحالات بیان ہوئے، اب نمونے کی خاطر ایک مثال بیان فرمارہے ہیں جس سے ایمان وکفر اور تواضع وغرور اور غربت وسرمایہ داری کا انجام سمجھارہے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جن دو شخصوں کی مثال بیان کی جارہی ہے، یہ واقع میں بھی ہوسکتے ہیں، جیسے بعضوں نے کہا ہے کہ دونوں بنی اسرائیلی بھائی تھے، ایک مومن تھا دوسرا کافر تھا۔

بعضوں نے کہا ہے کہ یہ دونوں قبیلہ بنی مخزوم کے قریشی تھے، ایک بھائی مسلمان تھا، دوسرا باغ والا کافر تھا، اور باغ طائف کے علاقے میں تھے۔ بہرحال جو بھی ہو۔

دوسرے حضرات نے کہا ہے کہ یہ ایک تمثیلی واقعہ ہے، بطور مثال عبرت کے لئے بیان فرمارہے ہیں تاکہ ایمان وکفر کا انجام معلوم ہو، اس قسم کی مثالیں قرآن مجید میں بکثرت مذکور ہیں۔ واللہ اعلم

فرمایا: ﴿وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ﴾ آپ ان مشرکین کے سامنے دو شخصوں کی مثال بیان کریں تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

﴿جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ﴾ ان دو آدمیوں سے جو مشرک تھا ہم نے اس کے لئے انگور کے دو باغ بنائے۔ ﴿وَحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ﴾ اور ان دونوں کو ہم نے کھجور کے درختوں کی باڑھ سے گھیر لیا تھا، ان دونوں باغوں کے اِردگرد اللہ تعالیٰ نے کھجور کے درخت پیدا کر دیئے تھے، جو بیک وقت باغ کے لئے باڑھ کا کام بھی دیتے، اور خود بھی اعلیٰ قسم کا پھل دیتے تھے۔

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا﴾ اور ہم نے دونوں باغوں کے درمیان کھیتی اور سبزی کا انتظام بھی کر دیا تھا۔

﴿كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْئًا﴾ یہ دونوں باغ خوب پھل دیتے تھے، اور نہیں

کم کرتے تھے اس میں سے کوئی چیز، یعنی موسم کے مطابق ان کا پھل وافر مقدار میں پیدا ہوتا تھا بغیر کسی کمی کے۔

﴿وَفَجَّرۡنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا﴾ اور ان دونوں کے درمیان ہم نے نہر جاری کردی تھی، یہ نہر پورے سال جاری رہتی تھی۔ ﴿وَكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ﴾ باغوں کے مالک کے ہاں دوسرے پھل بھی تھے، اور دیگر ذرائع آمدنی بھی وافر مقدار میں مہیا ہوتے تھے، مثلاً تجارت، مال مویشی، خدمتگار و ملازم، ثمر کا اطلاق ان سب پر ہوتا ہے۔

﴿فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ﴾ اس نے اپنے بھائی سے متکبرانہ انداز میں گفتگو کرتے ہوئے کہا:

﴿اَنَا اَكۡثَرُ مِنۡكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا﴾ میں تجھ سے مال میں بھی زیادہ ہوں اور تعداد میں بھی غالب ہوں، میری اولاد ہیں، غلام، لونڈیاں اور بہت سے نوکر چاکر خدمتگار ہیں، جبکہ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔

﴿وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ﴾ اس حال میں کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والا تھا، خود کو ایک بہت بڑی ہستی سمجھتے ہوئے دوسروں کو حقیر جانتے ہوئے دولت و مال کے نشہ میں مست تھا، اور خود کو ناقابل تسخیر سمجھتا تھا، اور فخریہ انداز میں:

﴿قَالَ مَاۤ اَظُنُّ اَنۡ تَبِيۡدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا﴾ کہنے لگا: میں نہیں گمان کرتا کہ یہ سب کچھ کبھی ہلاک بھی ہوجائے گا۔ وہ بیچارہ: ﴿يَحۡسَبُ اَنَّ مَالَهٗۤ اَخۡلَدَهٗ﴾ کے غرور کا شکار رہا کہ نہ مجھ پر کوئی آفت آئے گی، اور نہ میرے مال وسرمایہ پر آئے گی، ہم ہر مصیبت سے مستثنٰی ہی رہیں گے، اسی کے ساتھ وہ قیامت کا بھی منکر تھا تو کہا:

﴿وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً﴾ میں تو خیال نہیں کرتا کہ قیامت بھی قائم ہوگی۔ وقوعِ قیامت، محاسبہ اعمال تمام بناوٹی باتیں ہیں، ایسی بے بنیاد باتوں پر ہم یقین نہیں کرتے، پھر کہا:

﴿وَّلَئِنۡ رُّدِدۡتُّ اِلٰى رَبِّىۡ لَاَجِدَنَّ خَيۡرًا مِّنۡهَا مُنۡقَلَبًا﴾ تو وہاں پر مجھے اس سے بھی بہتر خوشحالی حاصل ہوگی، جس طرح یہاں عیش عشرت میں ہوں وہاں اس سے بھی بہتر حال میں رہوں گا۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ شخص اللہ تعالیٰ اور روزِ آخرت سب کا منکر تھا، اس کا یہ کہنا مذاق واستہزاء کی بنیاد پر تھا۔ جب مسلمان غریب بھائی نے کافر وامیر بھائی کی بات کو توجہ سے سنا۔

﴿قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗ﴾ اور اپنے بھائی سے گفتگو کرتے ہوئے جواباً کہا:

﴿اَكَفَرۡتَ بِالَّذِىۡ خَلَقَكَ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ مِنۡ نُّطۡفَةٍ ثُمَّ سَوّٰٮكَ رَجُلًا﴾ کیا تو اس ذات کے ساتھ کفر کرتا ہے جس نے تجھے پیدا کیا مٹی سے، اور پھر قطرہ منی سے، پھر تجھے مرد کی صورت میں برابر کردیا؟ جیسے ارشاد ہے: ﴿لَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ فِىۡۤ اَحۡسَنِ تَقۡوِيۡمٍ﴾ [التین: ۴] (ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر

پیدا کیا ہے)۔تم کیسے ناشکر انسان ہو، اپنے خالق و مالک اور منعم کا انکار کرتے ہو، جس نے تجھے ناپاک قطرہ آب سے پیدا فرما کر عجیب خوبصورت شکل شباہت کے ساتھ برابر کر دیا، پھر تمہیں ہر طرح کی ظاہری و باطنی نعمتوں سے مالا مال بھی فرمایا۔

﴿لٰكِنَّا۠ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَاۤ اُشْرِكُ بِرَبِّيْۤ اَحَدًا﴾ مگر میں تمہارے برخلاف یہی کہوں گا کہ میرا ربّ تو وہی اللہ تعالیٰ شانہ ہے، میں تو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کروں گا۔ لٰكِنَّا دراصل اَنَا اَقُوْلُ ہے، اسی لئے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ میں تو کہتا ہوں کہ وہ اللہ تعالیٰ ہی میرا ربّ ہے جو تمام قوتوں اور نعمتوں کا سرچشمہ ہے، اور تمام کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و متصرف ہے، اس کا نہ کوئی شریک ہے نہ مزاحم، وہ اپنی تمام صفات میں یکتا و یگانہ ہے۔ پھر اس کے ساتھ مؤمن بھائی نے اپنے کافر بھائی کو نصیحت کرتے ہوئے کہا:

﴿وَلَوْلَاۤ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ﴾ جب تم اپنے باغ میں داخل ہوئے تو تم نے کیوں اس طرح نہ کہا: جو اللہ تعالیٰ چاہے، نہیں طاقت مگر اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ۔تم مال و دولت، اولاد، نوکر چاکر، باغ و کھیتی کو دیکھ کر کہتے تھے کہ یہ کبھی ہلاک نہیں ہوں گے، اور میری زندگی تک یوں ہی رہیں گے، تم قیامت کا بھی انکار کرتے تھے، تم نے ہر چیز کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کیوں نہ کیا؟ کہ وہ چاہے گا وہی ہوگا، اور تمام قوتوں اور نعمتوں کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

ان مبارک کلمات کے بارے میں حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں عرش اور جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ نہ بتاؤں؟ اور وہ یہ ہے: لَا حَوْلَ لَا قُوَّةَ الاَّ بِاللهِ۔[بخاري عن أبي موسى رضی اللہ عنہ] یعنی برائی سے بچانے والا اور نیکی کی توفیق دینے والا اللہ تعالیٰ کسی بندے پر انعام کرے تو وہ یہ کہہ دے:

﴿مَاشَاءَ اللهُ لَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ﴾ یہ کلمات کہنے سے حق سبحانہ وتعالیٰ پر کمال درجے کا توکل ہے۔علماء کرام نے کہا کہ امام مالکؒ نے یہ کلمات اپنے گھر کے دروازے کے اوپر کندہ کرائے تھے۔اب مؤمن شخص نے اپنے بھائی کے طعن کا جواب بھی دیا کہا:

﴿اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا﴾ اگر تو دیکھتا ہے کہ میں تجھ سے مال اور اولاد میں کم ہوں تو کوئی بات نہیں ہے، کیونکہ:

﴿فَعَسٰى رَبِّيْٓ اَنْ يُّؤْتِيَنِ خَيْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ﴾ مجھے امید ہے کہ میرا پروردگار مجھے تیرے باغ سے بہتر عطا فرمائے گا، کیونکہ میرا مال اسی کی راہ میں خرچ ہوا ہے، کیونکہ اس مسلمان بھائی نے اپنے حصے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کی رضاء میں فقراء ومساکین پر خرچ کیا تھا۔ مؤمن بھائی نے یہ بھی کہا کہ تم یہ سمجھو کہ تمہارا مال اور اولاد اور سرمایہ اور باغ ہمیشہ تمہارے پاس رہیں گے، تم اس غلط فہمی میں مبتلاء نہ ہونا، ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارا مؤاخذہ ہو۔

﴿وَيُرْسِلَ عَلَيْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ﴾ وہ آسمان سے اس باغ پر عذاب بھیج دے۔ حُسْبَانًا سے مراد عذاب اور آفت ہے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کوئی ایسا طوفان آندھی، یا بگولہ بھیج دے جس سے یہ سارا باغ تباہ ہو جائے۔

﴿فَتُصْبِحَ صَعِيْدًا زَلَقًا﴾ یہ باغ چٹیل میدان بن کر رہ جائے۔ اس قسم کی کارگزاری کا اشارہ اللہ تعالیٰ نے ابتدائے سورت میں بھی دیا ہے: ﴿وَاِنَّا لَجٰعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا﴾ [الکہف:۸] (ہم زمین کی تمام چیزوں کو ملیامیٹ کر کے چٹیل میدان بنانے والے ہیں)۔

﴿اَوْ يُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا﴾ اور اس نہر کے پانی کو بہت گہرا کر دے، اور وہ تمہارے باغات تک پہنچ ہی نہ سکے، جن نہروں پر تم غرور کرتے ہو وہ تمہاری ملکیت نہیں، ان کی چابی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، جب چاہے کھول دے، جب چاہے بند کر دے۔

﴿فَلَنْ تَسْتَطِيْعَ لَهٗ طَلَبًا﴾ اور تو اسے تلاش کرنے کی طاقت بھی نہ رکھے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے، سورت ملک میں فرمایا: ﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ غَوْرًا فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ﴾ بھلا دیکھو اگر اللہ تعالیٰ شانہ تمہارے پانی کو (سزا کے طور پر) بہت گہرا لے جائے تو پھر کون ہے جو تمہارے پاس صاف ستھرا میٹھا پانی لے آئے؟ مؤمن بھائی نے جس خدشے کا اظہار کیا تھا وہ حقیقت بن کر سامنے آیا۔

﴿وَاُحِيْطَ بِثَمَرِهٖ﴾ آفت سماوی نے باغ کو گھیرے میں لے کر تباہ وبرباد کر دیا۔

﴿فَاَصْبَحَ يُقَلِّبُ كَفَّيْهِ عَلٰى مَآ اَنْفَقَ فِيْهَا﴾ اور ہاتھوں کو ملتا رہا، کف افسوس ملتا ہوا رہ گیا، اس چیز پر جو اس نے خرچ کیا تھا، یعنی باغ اور اس پر جو سرمایہ کاری کی گئی تھی سب ہی ڈوب گئے۔ سورۃ القلم میں بھی اسی قسم کا واقعہ مذکور ہے، حالانکہ وہ لوگ مؤمن تھے، مگر ان کے باغ پر ان کی کنجوسی اور بخل کی وجہ سے عذاب آیا تھا۔

﴿وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ انگوروں کی بیلیں عام طور پر لکڑی کے چھپروں اور فریموں پر چڑھائی جاتی

ہیں تاکہ وہ محفوظ ہوں اور مٹی میں مل کر ضائع نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا طوفان بادوباران آیا کہ باغ کی بیلیں چھپروں پر ٹوٹ کر گر پڑیں۔ انسان کی فطرت ہے کہ خوشحالی میں غافل رہتا ہے جب مصیبت آجاتی ہے تو اب اسے اللہ تعالیٰ یاد آجاتا ہے۔

﴿وَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا﴾ پھر اس شخص نے کف افسوس ملتے ہوئے کہا: کاش میں اپنے پروردگار کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناتا۔ اسی طرح لوگ قیامت کے روز بھی افسوس کا اظہار کریں گے مگر تباہی کے بعد افسوس کرنا بے سود ہوگا، پھر اس شخص کا یہ حال رہا:

﴿وَلَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ يَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مُنْتَصِرًا﴾ اللہ تعالیٰ شانہ کے سوا اس کی مدد کرنے والا کوئی گروہ نہ تھا، اور نہ ہی وہ کسی طرح انتقام لینے کے قابل تھا۔ بھلا خدا تعالیٰ سے کوئی انتقام لے سکتا ہے؟

اس مثال کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے موحّد اور مشرک کی مثال بیان کر کے شرک کا رد فرمایا ہے، خدا تعالیٰ کی حاکمیت وقدرت کے انکار کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے جیسے باغ والوں کا ہوا۔

﴿هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ﴾ اسی مثال سے سمجھو کہ سارا اختیار اللہ تعالیٰ کے پاس ہے جو برحق ہے۔ ولایت کے معنی تصرف واختیار اور سرپرستی اور اقتدار وحکومت کے ہیں، یہ سارے امور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں، بلا شرکت غیر، تو فرمایا: سارا اختیار اور حکومت اللہ تعالیٰ کی ہے۔

﴿هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا﴾ بدلہ دینے کے اعتبار سے بھی بہتر ہے اپنے بندوں کے نیک اعمال کو بڑھا چڑھا کر چھوٹے اعمال پر پہاڑوں برابر ثواب عطا فرماتا ہے، اور وہ انجام کے لحاظ سے بھی بہتر ہے کہ موحد مؤمنوں کو قیامت کی ہولناکیوں سے بچا کر انہیں دائمی اور ابدی خوشحالی عنایت فرمائے گا، اور ان سے راضی ہوگا۔

بہتر ثواب اور بہتر انجام کے متعلق حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مؤمن مرد اور مؤمن عورت کو اس کی جان اور مال میں اور اولاد میں تکلیف پہنچتی رہتی ہے، یہاں تک کہ جب وہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرے گا تو اس کا ایک گناہ بھی باقی نہیں رہے گا، تکلیفوں کی وجہ سے اس کے سارے گناہ معاف ہوجائیں گے۔ [ترمذي] اس قصہ میں بہت بڑی عبرت ہے، کوئی شخص اپنے مال پر گھمنڈ نہ کرے، اور جن لوگوں کے پاس مال نہیں انہیں حقیر نہ سمجھے، ورنہ ہلاکت کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخۡتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الۡاَرۡضِ
فَاَصۡبَحَ هَشِيۡمًا تَذۡرُوۡهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلۡمَالُ وَالۡبَنُوۡنَ زِيۡنَةُ
الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا ۚ وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيۡرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ وَيَوۡمَ نُسَيِّرُ الۡجِبَالَ
وَتَرَى الۡاَرۡضَ بَارِزَةً ۙ وَّحَشَرۡنٰهُمۡ فَلَمۡ نُغَادِرۡ مِنۡهُمۡ اَحَدًا ﴿۴۷﴾ وَعُرِضُوۡا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا ؕ لَقَدۡ
جِئۡتُمُوۡنَا كَمَا خَلَقۡنٰكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۢ بَلۡ زَعَمۡتُمۡ اَلَّنۡ نَّجۡعَلَ لَكُمۡ مَّوۡعِدًا ﴿۴۸﴾ وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ
فَتَرَى الۡمُجۡرِمِيۡنَ مُشۡفِقِيۡنَ مِمَّا فِيۡهِ وَيَقُوۡلُوۡنَ يٰوَيۡلَتَنَا مَالِ هٰذَا الۡكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيۡرَةً
وَّلَا كَبِيۡرَةً اِلَّاۤ اَحۡصٰٮهَا ۚ وَوَجَدُوۡا مَا عَمِلُوۡا حَاضِرًا ؕ وَلَا يَظۡلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

ترجمہ: اور آپ ان لوگوں سے دنیاوی زندگی کی حالت بیان کیجئے، جیسے پانی جسے ہم نے آسمان سے اتارا، پھر اس کے ذریعے زمین سے اُگنے والی چیزیں خوب گنجان ہوگئیں، پھر وہ چورا چورا ہو کر رہ گیا، جسے ہوائیں اڑا رہی ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے ﴿۴۵﴾ مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی زینت ہیں، اور باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ آپ کے ربّ کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں، اور امید کے اعتبار سے بھی ﴿۴۶﴾ اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلا دیں گے، اور اے مخاطب! تو زمین کو دیکھے گا کہ وہ کھلا میدان ہے، اور ہم ان سب کو جمع کریں گے، سو ان میں سے کسی کو بھی نہ چھوڑیں گے ﴿۴۷﴾ اور وہ آپ کے ربّ پر صفیں بنائے ہوئے پیش کئے جائیں گے، بلاشبہ آج تم ہمارے پاس اسی حالت میں آئے ہو جیسا کہ ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، بلکہ بات یہ ہے کہ تم نے یوں سمجھا کہ ہم تمہارے لئے کوئی وقت موعود مقرر نہ کریں گے ﴿۴۸﴾ اور اعمال نامے رکھ دیئے جائیں گے، سو آپ مجرمین کو دیکھیں گے کہ ان میں جو کچھ ہے اس سے ڈر رہے ہیں، اور وہ کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری بربادی! یہ کیسی کتاب ہے کہ اس نے کسی چھوٹے یا بڑے کو نہیں چھوڑا جسے لکھ نہ لیا ہو، اور جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سب موجود پائیں گے، اور آپ کا ربّ کسی پر ظلم نہ کرے گا ﴿۴۹﴾

معارف ومنازل

گزشتہ رکوع میں ایک باغ کی تباہی کا بیان ہوا، اب اس رکوع میں پورے جہاں کی تباہی کا بیان ہے، یعنی پوری دنیا کی بے ثباتی اور زوال کا بیان ہے۔

﴿وَاضۡرِبۡ لَهُمۡ مَّثَلَ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَآءٍ اَنۡزَلۡنٰهُ﴾ سے ﴿عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ مُّقۡتَدِرًا﴾ تک۔ فرمایا:

دنیا کی زیب و زینت اور عارضی بہار اور فانی و سریع الزوال ترو تازگی کی مثال ایسی سمجھو کہ خشک اور مردہ زمین پر آسمان سے بارش کا پانی نازل ہوا، وہ یک بیک جی اٹھی، گنجان درخت اور مختلف اجزاء سے رنگ برنگ دلکش و خوبصورت سبزہ نکل آیا، لہلہاتی کھیتی، جاذب نظر پھول اور سبزے آنکھوں کو بھلے معلوم ہونے لگے، سارا میدان ہرے بھرے پھول و سبزے سے دلہن کی طرح سجایا ہوا پر رونق ہوا، مگر چند روز ہی گزرے کہ اس پر خزاں کی آفت آنے لگی، اور وہ زرد ہوکر سوکھنا اور بے جان ہونا شروع ہوگیا، آخر وہ مرحلہ بھی آیا کہ کاٹ چھانٹ کر برابر کردی گئی، پھر ریزہ ریزہ ہوکر ہواؤں میں اڑنے لگی، ہواؤں نے اسے اڑا کر میدانوں میں منتشر کر کے رکھ دیا۔

یہی حال دنیا کے دیدہ زیب وابلہ فریب بناؤ سنگار کا سمجھو، چند روز کے لئے ہری بھری خوبصورت معلوم ہوتی ہے، اور لاکھوں کروڑوں ظاہر بین انسانوں کو حسن و جمال پر فریفتہ کر کے جہنم کی راہ دکھا کر ابدی شقاوتوں کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے، چنانچہ یہ سب پھل و پھول سبزی اور کھیتی چورہ چورہ ہوکر ہوا میں اڑ جائیں گے، اور کٹ چھٹ کر میدان صاف ہوجائے گا، یہاں تک کہ کسی کو یقین نہ آئے کہ یہاں کبھی کوئی سبزہ اور پھول موجود تھا۔

اپنی گرانمایہ قیمت والی زندگی کو اسی طرح سمجھو، اگر سمجھ رکھتے ہو، اور اپنے خیر خواہ ہو تو اسی کھیتی سے سبق سیکھو، اپنے پروردگار رحمٰن ورحیم کے حضور جھکو، اور اپنے انجام کو بہتر کرو، لاکھوں انسانوں نے دنیاوی عیش و عشرت کو زندگی کا مقصد سمجھ کر اپنی آخرت تباہ کردی، اور دنیا سے خالی ہاتھ روانہ ہوکر جہنم کے ایندھن بنے، اور یقین کرلو کہ ربّ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا﴾

مال اور بیٹے دنیا والی زندگی کی زینت ہیں، مرنے کے بعد مال و اولاد وغیرہ کام نہیں آتے، ہاں! البتہ جو اولاد مؤمن اور مخلص یا عالم و حافظِ قرآن ہوں، اور اپنے مسلمان والدین کے مرنے کے بعد ان کے لئے ایصال ثواب کے طور پر صدقات قربانی حج وغیرہ ختم قرآن استغفار و دعا کرتے ہوں تو یہ ثواب ضرور انہیں پہنچ جائے گا، جس طرح صحیح احادیث اس پر ناطق ہیں۔

دیگر باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ آپ کے ربّ کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں، اور امید کے اعتبار سے بھی۔ باقیات صالحات سے مراد دو قسم کے اعمال ہیں: ایک وہ اعمالِ صالحہ اور کارہائے خیر جو مرنے والا پیچھے چھوڑ کر چلا گیا، جیسے کوئی مسجد بنائے، دینی مدرسہ تعمیر کرے، مریضوں کے لئے ہسپتال بنائے مسافروں کے لئے

مکان وقف کرے، عوام کے لئے کنواں کھودے، پل بنائے، سڑک بنائے، قرآن مجید یا دینی کتب وقف کرلے، وغیرہ۔ قسم دوئم یہ ہے کہ اپنی زندگی کتاب وسنت کے مطابق گزارے، اعمالِ خیر نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج، تبلیغ دین اور طاعات وعبادات وغیرہ بجالائے، یہ اعمال باقی رہنے والے ہیں، اور قیامت کے روز یہ سارے اعمال کارآمد رہیں گے، جن کی بدولت اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی رضاء ومغفرت اور دخول جنت جیسے انعامات نصیب ہوں گے۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر ولا حول ولا قوة إلا بالله۔** کوکثرت سے پڑھا کرو، یہ باقیات صالحات میں ہے۔ یہ حدیث حضرت جابر بن عبداللہ اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ [مظهري]

اسی طرح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **سبحان الله والحمد لله ولا إله إلا الله والله أكبر۔** مجھے ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے، یعنی روئے زمین کی تمام چیزوں سے زیادہ پیارا ہے۔ [رواه مسلم والترمذي]

﴿وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَّحَشَرْنٰهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ اَحَدًا﴾ اور جس دن ہم پہاڑوں کو چلادیں گے (یعنی انہیں اپنی جگہوں سے ہٹادیں گے) اے مخاطب! تو زمین کو اس حال میں دیکھے گا کہ وہ کھلا ہوا میدان بنی ہوئی ہے، نہ اس پر کوئی عمارت ہے نہ بلندی، نہ شہر نہ بازار، نہ در نہ دیوار، نہ اور کچھ، اور ہم انہیں قبروں سے نکال کر جمع کریں گے، سوان میں سے کسی کو بھی نہیں چھوڑیں گے۔

﴿وَعُرِضُوْا عَلٰى رَبِّكَ صَفًّا﴾ جمع ہونے کے بعد پیشی ہوگی، ربِّ ذوالجلال جبار جلّ شانہ کے پاس صفیں بنائے ہوئے کھڑے ہوں گے، ہر طبقہ الگ صف میں حاضر ہوکر حساب کے لئے میدان میں آئے گا۔

﴿لَقَدْ جِئْتُمُوْنَا كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ تم ہمارے پاس اسی حالت میں آگئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا، ننگے دھڑ نگے، ہاتھ خالی، نہ مال ودولت ساتھ آیا، نہ رعب واقتدار ساتھ آیا، نہ پاؤں میں جوتے، نہ بدن پر کپڑے، اسی کیفیت کے ساتھ جیسے ماں کے پیٹ سے پہلی مرتبہ پیدا ہوئے تھے۔ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿وَّتَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ﴾ [الأنعام: ۹۴] (اور جو کچھ ہم نے تم کو دنیا میں دیا تھا وہ سب وہاں چھوڑ کر خالی ہاتھ آگئے)۔ آیت کریمہ کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ جس طرح پہلی مرتبہ تمہیں آسانی کے ساتھ پیدا کیا تھا

اب کی پیدائش بھی اسی طرح آسانی کے ساتھ ہوگی، تم لوگ اس دوسری پیدائش سے صرف حماقت کی بنیاد پر انکار کرتے رہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک سوبیس صفوں میں لوگوں (جنتیوں) کا حشر ہوگا، جن میں سے اسی (۸۰) صفیں اس امت کی، اور باقی چالیس دیگر امتوں کی ہوں گی۔ [مشکوٰۃ]

﴿بَلْ زَعَمْتُمْ اَلَّنْ نَّجْعَلَ لَكُمْ مَّوْعِدًا﴾ بلکہ بات یہ ہے کہ تم لوگوں نے یہ خیال کیا تھا کہ ہم تمہارے لئے کوئی وقت موعود مقرر نہ کریں گے، یعنی تم آج کے دن کے مسلسل منکر رہے، اور قیامت کو محال غیر واقع قرار دیتے رہے۔

﴿وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ﴾ تا ﴿وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ اعمال نامے رکھے جائیں گے اللہ تعالیٰ کے سامنے، اور تمہارے ہاتھوں میں بھی، اور میزان میں بھی تا کہ مکمل اتمامِ حجت ہو، اسی بنیاد پر فیصلہ ہوگا، اسی وقت مجرم ''ہائے میری ہلاکت'' کہتے ہوئے کتاب کے مندرجات پر پشیمانی کا اظہار کرتے ہوئے یالیتنی یا ویلتایا ویلتا پکارتے ہوئے چیخیں مار مار کر چلاتے رہیں گے، اور کسی طرح نجات کی صورت اس لئے نظر نہیں آئے گی، کیونکہ انبیاء کرام علیہم السلام ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ دوسرے مرحلے پر ان کے اعضاء بھی ان کے خلاف گواہی دیں گے۔ تیسرے مرحلے پر کتاب کے مندرجات بھی۔ چوتھا مرحلہ جو نہایت حیران کن اور رسوا کن ہے کہ پوری زندگی کا ریکارڈ ویڈیو کی طرح سامنے ہوگا، جسے مجرم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہوئے کف افسوس ملتا رہے گا۔ ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ ۔ اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے اس کو اپنے سامنے پائیں گے، اور تمہارا پروردگار کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔

از مکافات عمل غافل مشو ☆ گندم از گندم بروید جوز جو

.......✵.......✵.......✵.......

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ۭ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ
اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗٓ اَوْلِيَاۗءَ مِنْ دُوْنِيْ وَهُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ۭ بِئْسَ لِلظّٰلِمِيْنَ بَدَلًا ۝۵۰ مَآ اَشْهَدْتُّهُمْ
خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۠ وَمَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّيْنَ عَضُدًا ۝۵۱ وَيَوْمَ يَقُوْلُ

نَادُوْا شُرَكَآءِيَ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ۝ وَرَاَ
الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ۝

ترجمہ: اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ تم آدم کو سجدہ کرو، تو ان سب نے سجدہ کرلیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا، وہ جنات میں سے تھا، سو وہ اپنے ربّ کی فرمانبرداری سے نکل گیا، کیا تم پھر بھی مجھے چھوڑ کر اسے اور اس کی ذریت کو دوست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں، یہ ظالموں کے لئے بہت برا بدل ہے ۝۵۰ میں نے انہیں آسمانوں کے اور زمین کے پیدا کرنے کے وقت نہیں بلایا، اور نہ ان کے پیدا کرنے کے وقت، اور میں گمراہ کرنے والوں کو اپنا مددگار بنانے والا نہیں ہوں ۝۵۱ اور اس دن کو یاد کرو جس دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم انہیں بلاؤ جنہیں تم میرا شریک سمجھتے تھے، پس وہ ان کو پکاریں گے، سو وہ انہیں جواب ہی نہیں دیں گے، اور ہم ان کے درمیان ایک آڑ بنا دیں گے ۝۵۲ اور مجرم لوگ دوزخ کو دیکھیں گے، پھر یقین کرلیں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں، اور اس سے بچنے کی کوئی راہ نہ پائیں گے ۝۵۳

معارف و منازل

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف مقاصد کے لئے تمہید کے طور پر فرشتوں کو حضرت آدم علیہ السلام کے لئے سجدہ کرنے کا حکم اور فرشتوں کا سجدہ کرنا اور ابلیس کا انکار کرنا بیان کیا گیا ہے، اس جگہ بھی خاص مقصد کے لئے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی صرف ابلیس اور اس کے ساتھیوں کا کام ہے، اور جو بھی احکامِ الٰہی کی تعمیل میں سستی کرے گا وہ شیطان کا بھائی شمار ہوگا۔ تو قرآن مجید میں بار بار اس واقعہ کو تکرار کے ساتھ بیان کرنے کا یہی مقصد ہے تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔

اس آیت میں صراحۃً فرمایا کہ شیطان اگرچہ کثرت عبادت کی وجہ سے فرشتوں میں رہتا تھا مگر وہ جنات میں سے تھا، جن کی پیدائش آگ سے ہے، جس کا کئی مقامات پر تذکرہ ہو چکا ہے جیسے ابلیس نے خود کہا: ﴿خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ﴾ [الأعراف:۱۲] (آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے)۔ اور ابلیس کی نافرمانی کا اصلی سبب بھی یہی ہے کہ وہ جنات میں سے ہے۔

﴿فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ﴾ پس ابلیس نے اپنے پروردگار کے حکم کی نافرمانی کی۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿اَبٰی

وَاسۡتَكۡبَرَ وَكَانَ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ﴾[البقرة:۳۴] (اس نے انکار کیا، اور تکبر کیا، اور وہ تھا ہی کافروں میں سے)۔

لہٰذا جو کوئی اللہ تعالیٰ کے حکموں سے منحرف ہوگا وہ ابلیس کی ذریت اور اس کا بھائی شمار ہوگا، تو اس کو چاہئے کہ ان سے دشمنی کر کے قطع تعلقات کرلیں، اور اللہ تعالیٰ شانہ اور اس کے نیک بندوں کے ساتھ محبت کر کے ربّ العزّت کی طاعت وفرمانبرداری میں فرشتوں کی طرح اقدام کریں، فرمایا:

﴿اَفَتَتَّخِذُوۡنَهٗ وَذُرِّيَّتَهٗۤ اَوۡلِيَآءَ مِنۡ دُوۡنِىۡ﴾ کیا تم ایسے راندۂ درگاہ کو اور اس کی اولاد کو میرے سوا اپنا دوست اور رفیق بناتے ہو؟

﴿وَهُمۡ لَـكُمۡ عَدُوٌّ﴾ حالانکہ وہ تمہارا کھلم کھلا دشمن ہے، یہ بڑی نادانی کی بات ہے۔

﴿بِئۡسَ لِلظّٰلِمِيۡنَ بَدَلًا﴾ ظالموں کے لئے بہت بُرا بدلہ ہے۔ ابلیس تو خود اپنے تکبر اور نافرمانی کے بدلے میں واصل جہنم ہوا، پھر اس کی دوستی کا دم بھرنے والے بھی اسی قبیل کے ظالم ہیں، اور ظالموں کا بدلہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے بدلے میں قہرِ الٰہی اور غضبِ الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں، تو سوچیں کہ انہوں نے کیا کھویا اور کیا پایا۔

بقول دشمن پیمان دوست بشکستی ☆ ببین کہ از کہ بریدی وبا کہ پیوستی

تو نے دشمن کے کہنے پر اپنے دوست کے عہد وپیمان کو توڑا، ذرا دیکھ تو سہی کہ تم کس سے کٹ گئے، اور کس کے ساتھ جُڑ گئے، تم اپنے معبودِ حقیقی جلّ شانہ سے کٹ کر اپنے دشمن ابلیس سے جُڑ گئے۔ ولا حول ولا قوۃ إلّا باللہ

﴿مَاۤ اَشۡهَدْتُّهُمۡ خَلۡقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ﴾ تا ﴿عَضُدًا﴾ اس آیت میں ابلیس اور اس کے اتباع کرنے والوں کے لئے تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ میں نے جب آسمان وزمین کو پیدا کیا، اور جب ان کی اپنی جانوں کو پیدا کیا تو ان کو اپنی مدد یا مشورے کے لئے نہیں بلایا تھا، جب آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور خود ان کی تخلیق میں میرا کوئی شریک نہیں تو پھر ابلیس اور اس کی ذریت سے دوستی کیوں کرتے ہیں؟ اور اس کے ورغلانے سے اللہ تعالیٰ کے لئے کیوں شریک تجویز کرتے ہیں؟ یہ تو سراسر جہالت اور حماقت ہے۔

﴿وَمَا كُنۡتُ مُتَّخِذَ الۡمُضِلِّيۡنَ عَضُدًا﴾ اور میں گمراہ کرنے والوں کو مددگار بنانے والا نہیں، مجھے نہ کسی کی امداد کی ضرورت ہے، اور نہ کسی سے اپنی تخلیق کی تصدیق کی کوئی ضرورت ہے۔ پس ابلیس کے کہنے پر تم جن جن بے جان وبے اختیار بتوں کو اللہ تعالیٰ کا معاون ومددگار تجویز کرتے ہو یہ تمہاری بے عقلی اور گمراہی کے سوا کچھ بھی نہیں

کہ ایک بے جان بت کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔

﴿وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ﴾ اور جس دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ بلاؤ میرے ان شریکوں کو کہ جن کے متعلق تم گمان کرتے تھے کہ وہ تمہاری حاجت روائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں۔

﴿فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُم مَّوْبِقًا﴾ پس وہ ان کو بلائیں گے، اور آوازیں دیں گے کہ آج ہماری مدد کرو، مگر وہ مردہ اور عاجز و باطل معبود ان کی کسی فریاد کا جواب نہیں دیں گے، تو فرمایا کہ ہم بنا دیں گے ان کے درمیان ہلاکت کی جگہ، وہ تابع و متبوع دونوں ہلاکت کے مقام میں دھکیل دیئے جائیں گے، فرمایا کہ پھر یہ ہوگا:

﴿وَرَأَى الْمُجْرِمُونَ النَّارَ فَظَنُّوا أَنَّهُم مُّوَاقِعُوهَا﴾ اور آگ کو دیکھیں گے، اور انہیں یقین ہو جائے گا کہ وہ اس آگ میں پڑنے والے ہیں۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہنم کی آگ انہیں چالیس سال کی مسافت سے نظر آئے گی، انہیں یقین آئے گا کہ ہم اس میں ڈالے جائیں گے۔

﴿وَلَمْ يَجِدُوا عَنْهَا مَصْرِفًا﴾ وہ اس سے پھر جانے کی کوئی جگہ نہیں پائیں گے، اور نہ کوئی حمایتی انہیں بچا سکے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ موبق دوزخ میں ایک وادی کا نام ہے۔ عکرمہؒ نے فرمایا کہ موبق دوزخ میں ایک آگ کی نہر ہے جو دوزخ کے کنارے پر بہتی ہے، اس میں خچر جتنے بڑے بڑے کالے سانپ ہیں۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ لِلنَّاسِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۚ وَكَانَ الْإِنسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿٥٤﴾ وَ
مَا مَنَعَ النَّاسَ أَن يُؤْمِنُوا إِذْ جَاءَهُمُ الْهُدَىٰ وَيَسْتَغْفِرُوا رَبَّهُمْ إِلَّا أَن تَأْتِيَهُمْ سُنَّةُ
الْأَوَّلِينَ أَوْ يَأْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿٥٥﴾ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ ۚ وَ
يُجَادِلُ الَّذِينَ كَفَرُوا بِالْبَاطِلِ لِيُدْحِضُوا بِهِ الْحَقَّ ۖ وَاتَّخَذُوا آيَاتِي وَمَا أُنذِرُوا هُزُوًا ﴿٥٦﴾ وَمَنْ
أَظْلَمُ مِمَّن ذُكِّرَ بِآيَاتِ رَبِّهِ فَأَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ ۚ إِنَّا جَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ
أَكِنَّةً أَن يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۖ وَإِن تَدْعُهُمْ إِلَى الْهُدَىٰ فَلَن يَهْتَدُوا إِذًا أَبَدًا ﴿٥٧﴾ وَرَبُّكَ
الْغَفُورُ ذُو الرَّحْمَةِ ۖ لَوْ يُؤَاخِذُهُم بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ۚ بَل لَّهُم مَّوْعِدٌ لَّن

يَجِدُوا مِنْ دُونِهِ مَوْئِلًا ۞ وَتِلْكَ الْقُرَىٰ أَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ۞

ترجمہ: اور لوگوں کے لئے ہم نے اس قرآن میں طرح طرح کے عمدہ مضامین بیان کئے، اور انسان جھگڑنے میں بہت زیادہ بڑھ کر ہے ۞ اور ہدایت کے بعد لوگوں کو ایمان لانے اور اپنے ربّ سے مغفرت طلب کرنے سے صرف اس بات نے روکا ہے کہ ان کے ساتھ اگلے لوگوں جیسا معاملہ ہو جائے، یا ان کے آمنے سامنے عذاب آجائے ۞ اور ہم پیغمبروں کو صرف بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہی بنا کر بھیجتے رہے ہیں، اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا وہ باطل کے ذریعہ جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس کے ذریعہ حق کو ہٹا دیں، اور ان لوگوں نے میری آیات کو اور جس چیز سے ان کو ڈرایا گیا مذاق کی چیز بنا رکھا ہے ۞ اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جسے اس کے ربّ کی آیتوں کے ذریعہ نصیحت کی گئی، سو اس نے ان سے روگردانی کی، اور جو کچھ اس نے آگے بھیجا ہے اسے بھول گیا، بلاشبہ ہم نے ان کے دلوں پر اس کے سمجھنے سے پردے ڈال دیئے ہیں، اور ان کے کانوں پر ڈاٹ دے رکھی ہے ۞ اگر آپ ان کو ہدایت کی طرف بلائیں ایسی حالت میں ہرگز ہدایت پر نہ آئیں گے، اور آپ کا ربّ بہت مغفرت کرنے والا ہے، رحمت والا ہے، اگر وہ لوگوں کو ان کے اعمال کی وجہ سے گرفت فرماتا تو ان کے لئے جلد ہی عذاب بھیج دیتا، بلکہ ان کے لئے ایک وقت مقرر ہے، اس وقت وہ اس سے بچنے کے لئے کوئی پناہ کی جگہ ہرگز نہ پائیں گے ۞ اور ان بستیوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جبکہ انہوں نے ظلم کیا، اور ہم نے ان کے ہلاک ہونے کے لئے وقت مقرر کر رکھا تھا ۞

معارف ومنازل

ان آیات میں انسان کے ایک عمومی اور فطری خاص مزاج کا تذکرہ فرمایا، یعنی انسان کا جھگڑالو ہونا بیان فرمایا، پھر اس جھگڑے کی کچھ تفصیل بتائی۔ گزشتہ رکوع میں ابلیس اور اس کی ذریت کی شرارتوں کا بیان تھا، یہ انسان کا جھگڑالو ہونا اسی کا نتیجہ ہے، اور انسان کبھی باطل کے معاملے جھگڑا نہیں کرتا، باطل کو بلا روک ٹوک بخوشی قبول کرتا ہے، لیکن حق کے مقابلہ میں وہ طرح طرح کی حجت بازیاں شروع کرتا ہے، اسی بنیاد پر تو اہل حق باطل والوں کے مقابلہ میں آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ شانہ فرمایا کہ ہم انسانوں کے لئے اس قرآن میں ہر طرح کے مضامین بیان فرما دیئے، اور طرح طرح سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، ان ہی کی زبانوں میں اور ان میں سے انبیاء کرام علیہم السلام آسمانی صحیفے لے کر

مبعوث ہوئے، لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا، اور طرح طرح کی حجت بازی کی، اور جھگڑے شروع کئے، اور یہ انسان جھگڑے کرنے میں سب سے بڑھ کر ہے، بلکہ جھگڑوں کا امام ہے۔ سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿اَوَلَمۡ یَرَ الۡاِنۡسَانُ اَنَّا خَلَقۡنٰهُ مِنۡ نُّطۡفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیۡمٌ مُّبِیۡنٌ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلۡقَهٗ قَالَ مَنۡ یُّحۡیِ الۡعِظَامَ وَهِیَ رَمِیۡمٌ﴾ [یٰس: ۷۸] (اور کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا؟ پھر اچانک وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا بن گیا۔ ہمارے بارے میں تو وہ باتیں بناتا ہے، اور خود اپنی پیدائش کو بھلا بیٹھا ہے، کہتا ہے کہ: ان ہڈیوں کو کون زندگی دے گا جبکہ وہ گل چکی ہوں گی؟)۔

اور سورۂ زخرف میں فرمایا: ﴿مَا ضَرَبُوۡهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ خَصِمُوۡنَ﴾ [الزخرف: ۵۸] (انہوں نے تمہارے سامنے یہ مثال محض کٹ حجتی کے لیے دی ہے، بلکہ یہ لوگ ہیں ہی جھگڑالو)۔ حق کے بارے میں یہی جھگڑا اس کے مزاج کا ایک نمایاں پہچان ہے جس کا مشاہدہ ہم آج بھی کر رہے ہیں۔

﴿وَلَقَدۡ صَرَّفۡنَا فِیۡ هٰذَا الۡقُرۡاٰنِ﴾ تا ﴿جَدَلًا﴾ البتہ تحقیق ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لئے ہر قسم اور ہر طرح کی مثالیں پھیر پھیر کر بیان کی ہیں۔ دنیا اور دین کے متعلق کوئی ایسا مسئلہ نہیں جسے ہم نے بیان نہ کیا ہو، لیکن:

﴿وَكَانَ الۡاِنۡسَانُ اَكۡثَرَ شَیۡءٍ جَدَلًا﴾ مگر انسان اکثر جھگڑالو واقع ہوا ہے، جیسا کہ قرآن مجید کے مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک ہر نبی ورسول کے ساتھ لوگوں کے جھگڑے برابر جاری رہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی پوری جماعت میں کوئی ایک نبی ایسا نہیں گزرا کہ جس کے ساتھ قوم کا جھگڑا نہ ہوا ہو۔ ان تمام جھگڑوں کا سبب اور محرک خبث باطن ہے، چنانچہ خبث باطن کی اصلاح کے بعد تمام جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی نظیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی ہے، فرمایا:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ یُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰی﴾ اور نہیں روکا لوگوں کو ایمان لانے سے جب کہ ان کے پاس ہدایت آگئی، ایک تو انہیں ایمان لانے سے روکا، اور دوسرا:

﴿وَیَسۡتَغۡفِرُوۡا رَبَّهُمۡ﴾ اپنے پروردگار سے بخشش مانگنے سے بھی روکا، ان دونوں برکت والی چیزوں سے روکنے والی چیزیں بھی دو ہیں: پہلی یہ ہے:

﴿اِلَّاۤ اَنۡ تَاۡتِیَهُمۡ سُنَّةُ الۡاَوَّلِیۡنَ﴾ کہ ان کے پاس پہلے لوگوں کا دستور رہا ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی

وحدانیت کا انکار کیا۔ پیغمبروں علیہم السلام کا تمسخر اڑایا، کتب سماویہ کو تسلیم نہ کیا، اور قیامت کا انکار کر دیا، پھر یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا، اور انہیں مکمل طور پر صفحہ ہستی سے ناپید کر دیا، گو یا وہ ایمان لانے کے لئے عذاب کے منتظر ہیں جیسا کہ وہ اس عذاب کا خود مطالبہ ہی کر رہے ہیں۔ فرمایا: ایمان نہ لانے کی دوسری وجہ یہ ہے:

﴿اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا﴾ کہ یا عذاب بالکل ان کے سامنے آجائے، یعنی وہ اس بات کے انتظار میں ہیں کہ ان پر عذاب نازل ہو جائے، تو پھر وہ ایمان لائیں، اور اللہ تعالیٰ سے بخشش بھی طلب کریں۔ دراصل یہ ان کی حماقت اور خام خیالی ہے کہ عذاب کے آنے پر یا اس کو دیکھنے پر ایمان لائیں گے، انہوں نے عذاب کا غلط اندازہ لگایا ہے، کیونکہ عذاب جب نازل ہوتا ہے تو پھر موقع نہیں دیتا ہے، اور نہ ہی اس کو کوئی ٹال سکتا ہے۔

﴿وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ﴾ اور نہیں بھیجتے ہیں ہم رسولوں کو مگر اس لئے کہ وہ فرمانبرداروں کو خوشخبری سنائیں، اور نافرمانوں کو ان کے بُرے انجام سے ڈرادیں۔ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا یہی مقصد ہے کہ توحید الٰہی کی دعوت دیں، قبول کرنے والوں کو جنت کی بشارت دیں، اور کفر وشرک پر قائم رہنے والوں کو جہنم کے ابدی عذاب سے ڈرائیں اور خبردار کریں۔

﴿وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ﴾ اور کافر لوگ باطل کو ساتھ لے کر جھگڑا کرتے ہیں، یعنی باطل کے ذریعہ سے جھگڑا کرتے ہیں۔

﴿لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ﴾ تاکہ اس باطل کے ذریعہ سے حق کو گرادیں، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب معجزات کو سحر قرار دینا آسمانی کتابوں کو اساطیر الاولین کہنا، انبیاء علیہم السلام کو ساحر اور مجنون کہنا، اور کافروں نے یہ بھی کہا تھا کہ تم جو ذبح کرتے ہو وہ ذبیحہ تو حلال ہوا، اور جس کو اللہ تعالیٰ مارڈالتا ہے اس کو تم حرام کہتے ہو۔ عورت کمزور ہے، اس کا حصہ میراث نصف ہے، جبکہ مرد طاقتور ہے اس کا حصہ عورت سے دوگنا ہے۔

﴿وَاتَّخَذُوْا اٰيٰتِيْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا﴾ اور انہوں نے میری آیتوں کو اور جس عذاب سے ان کو ڈرایا گیا تھا ان کو مذاق اور ٹھٹھا بنا دیا، جہنم کے انیس فرشتوں کا مذاق اڑایا، اور شجرۃ الزقوم کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ تو عمدہ چھوارے اور مکھن کو کہتے ہیں، ہمیں جس عذاب سے ڈرایا جا رہا ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں وغیرہ۔

﴿وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ﴾ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جس کو اس کے رب کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی گئی تو اس نے ان سے منہ پھیر کر اعراض کیا، اور جو کچھ وہ

پہلے کر چکا ہے اس کے نتیجے کو بھول گیا اور نظر انداز کر دیا۔ درحقیقت یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو تعصب وعناد کی بنا پر ہدایت سے محروم ہو جاتے ہیں۔

﴿اِنَّا جَعَلۡنَا عَلٰی قُلُوۡبِهِمۡ اَكِنَّةً اَنۡ يَّفۡقَهُوۡهُ وَفِيۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَقۡرًا﴾ ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں، اور ان کے کانوں پر ڈاٹ لگا رکھے ہیں یہ ﴿صُمٌّ بُكۡمٌ عُمۡیٌ﴾ [البقرة:۱۸] (اندھے، بہرے اور گونگے) ہیں۔

﴿لَهُمۡ قُلُوۡبٌ لَّا يَفۡقَهُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اَعۡيُنٌ لَّا يُبۡصِرُوۡنَ بِهَا وَلَهُمۡ اٰذَانٌ لَّا يَسۡمَعُوۡنَ بِهَا﴾ [الأعراف:۱۷۹] (ان کے پاس دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، ان کے پاس کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں)۔

اور اسی طرح: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ وَعَلٰى سَمۡعِهِمۡ‌ؕ وَعَلٰۤى اَبۡصَارِهِمۡ غِشَاوَةٌ﴾ [البقرة:۷] (اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں اور ان کے کانوں پر، اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے)۔

اور اسی طرح: ﴿كَلَّا بَلۡ رَانَ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ﴾ [المطففين:۱۴] (ہرگز نہیں، بلکہ ان کے دلوں پر زنگ چڑھا ہوا ہے)۔

اور اسی طرح: ﴿وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوۡبِهِمۡ﴾ [التوبة:۹۳] (اور اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کے دلوں پر)۔

اور اسی طرح: ﴿اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ﴾ [الفرقان:۴۳] (بھلا بتاؤ وہ شخص جس نے اپنا خدا اپنی نفسانی خواہش کو بنا لیا ہو)۔

﴿وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلۡمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمۡعِهٖ وَقَلۡبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً﴾ [الجاثية:۲۳] (اور علم کے باوجود اللہ نے اسے گمراہی میں ڈال دیا، اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی، اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا)۔ وغیر ذالک من الأیات۔ آگے مزید مشرکین کی ہٹ دھرمی اور بدبختی کا بیان ہے:

﴿وَاِنۡ تَدۡعُهُمۡ اِلَى الۡهُدٰى فَلَنۡ يَّهۡتَدُوۡۤا اِذًا اَبَدًا﴾ اگر آپ ہدایت کی طرف انہیں دعوت دیں تو وہ کبھی ہدایت قبول نہیں کریں گے۔ یہ آیات الٰہی سے اعراض کا نتیجہ ہے کہ وہ ہدایت سے محروم ہو چکے ہیں۔

﴿وَرَبُّكَ الۡغَفُوۡرُ ذُو الرَّحۡمَةِ﴾ تیرا پروردگار بخشش کرنے والا رحمت والا ہے، یہ اس کی رحمت ہے کہ وہ مجرموں کو پکڑنے میں جلدی نہیں کرتا، وہ قانون امہال وتدریج پر کام کرتا ہے، مجرموں کو خوب موقع دیتا ہے، وہ دیر گیر

اور سخت گیر ہے، اسی لئے فرمایا:

﴿لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ﴾ اگر اللہ تعالیٰ ان کے بُرے اعمال کی وجہ سے پکڑنا چاہے تو ان کے لئے جلدی عذاب لے آئے، مگر یہ اس کی بخشش اور رحمت ہے کہ وہ مہلت دیتا رہتا ہے۔

﴿بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا﴾ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے لئے وعدے کا ایک وقت مقرر ہے، جب وہ وقت آجائے گا تو وہ گرفت میں آجائیں گے، اور وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کہیں بھی جائے پناہ نہیں پاسکیں گے۔ اللہ تعالیٰ شانہ فرماتے ہیں کہ جب میں گرفت کرنے کا فیصلہ کرتا ہوں تو اس طریقے سے پکڑتا ہوں جو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا، فرمایا: ﴿اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ [الأعراف: ۱۸۳] (میری تدبیر بڑی مضبوط ہے) اس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

سورۂ بروج میں ہے: ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ﴾ [البروج: ۱۲] (تیرے ربّ کی پکڑ بڑی سخت ہے) جس سے نافرمانوں کی ہزاروں بستیاں صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹ چکی ہیں، ذرا دیکھو تو سہی۔

﴿وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا﴾ یہ ہیں بستیاں جن کو ہم نے ہلاک کیا جب کہ انہوں نے ظلم کیا، اور ان کی ہلاکت کے لئے ہم نے ایک وعدہ یعنی وقت مقرر کر رکھا ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿۶۰﴾ فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا
نَسِيَا حُوْتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿۶۱﴾ فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَآءَنَا ۡ لَقَدْ لَقِيْنَا مِنْ
سَفَرِنَا هٰذَا نَصَبًا ﴿۶۲﴾ قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَآ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۡ وَمَآ اَنْسٰىنِيْهُ اِلَّا
الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾ قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۖ فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا
قَصَصًا ﴿۶۴﴾ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿۶۵﴾ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى
هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰٓى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿۶۶﴾ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾ وَكَيْفَ تَصْبِرُ
عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾ قَالَ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾ قَالَ فَاِنِ
اتَّبَعْتَنِيْ فَلَا تَسْـَٔلْنِيْ عَنْ شَيْءٍ حَتّٰٓى اُحْدِثَ لَكَ مِنْهُ ذِكْرًا ﴿۷۰﴾ فَانْطَلَقَا ٙ حَتّٰٓى اِذَا رَكِبَا فِي السَّفِيْنَةِ

خَرَقَهَا ۚ قَالَ اَخَرَقۡتَهَا لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا ۚ لَقَدۡ جِئۡتَ شَيۡـًٔا اِمۡرًا ﴿۷۱﴾ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا ﴿۷۲﴾ قَالَ لَا تُؤَاخِذۡنِىۡ بِمَا نَسِيۡتُ وَلَا تُرۡهِقۡنِىۡ مِنۡ اَمۡرِىۡ عُسۡرًا ﴿۷۳﴾ فَانۡطَلَقَا ۗ حَتّٰٓى اِذَا لَقِيَا غُلٰمًا فَقَتَلَهٗ ۙ قَالَ اَقَتَلۡتَ نَفۡسًا زَكِيَّةًۢ بِغَيۡرِ نَفۡسٍ ؕ لَقَدۡ جِئۡتَ شَيۡـًٔا نُّكۡرًا ﴿۷۴﴾

ترجمہ: اور جب موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا کہ میں برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ میں مجمع البحرین کو پہنچ جاؤں، یا یوں اسی زمانہ دراز تک چلتا رہوں ﴿۶۰﴾ سو جب وہ دونوں مجمع البحرین پہنچ گئے تو اپنی مچھلی کو بھول گئے، سو وہ مچھلی سمندر میں راستہ بنا کر چلی گئی ﴿۶۱﴾ سو جب وہ آگے بڑھ گئے تو موسیٰ نے اپنے جوان سے کہا کہ ہمارا صبح کا کھانا لاؤ، اس میں شک نہیں کہ اس سفر کی وجہ سے ہم کو بڑی تکلیف (تھکاوٹ) پہنچ گئی ﴿۶۲﴾ جوان نے کہا: کیا آپ کو خبر نہیں جب ہم نے پتھر کے پاس ٹھکانہ لیا تھا تو بیشک میں مچھلی کو بھول گیا، اور مچھلی کو یاد رکھنا مجھے شیطان ہی نے بھلا دیا، اور اس مچھلی نے سمندر میں عجیب طور پر اپنا راستہ بنا لیا ﴿۶۳﴾ موسیٰ نے کہا: یہی تو وہ موقع ہے جس کی ہمیں تلاش تھی، سو وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں پر واپس لوٹے ﴿۶۴﴾ سو انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ پایا جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی تھی، اور ہم نے اسے اپنے پاس سے خاص علم سکھایا تھا ﴿۶۵﴾ موسیٰ نے اس بندے سے کہا: کیا میں اس شرط پر تمہارے ساتھ ہو جاؤں کہ آپ کو جو کچھ علم مفید سکھایا گیا ہے وہ آپ مجھے سکھا دیں؟ ﴿۶۶﴾ اس بندے نے کہا: بلاشبہ تم میرے ساتھ رہتے ہوئے صبر نہیں کر سکتے ﴿۶۷﴾ اور اس چیز پر تم کیسے صبر کرو گے جو چیز تمہارے علمی احاطہ میں نہیں ہے؟ ﴿۶۸﴾ موسیٰ نے کہا: ان شاء اللہ آپ مجھے صابر پائیں گے، اور میں کسی بات میں آپ کی نافرمانی نہیں کروں گا ﴿۶۹﴾ اس بندے نے کہا: سو اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو کسی چیز کے بارے میں اس وقت تک مجھ سے کوئی بات مت پوچھنا جب تک میں خود ہی اس کے بارے میں کسی طرح کا ذکر نہ کروں ﴿۷۰﴾ اس کے بعد دونوں چل دیئے، یہاں تک کہ جب دونوں کشتی میں سوار ہو گئے، تو اس بندہ خدا نے کشتی میں شگاف کر دیا، موسیٰ نے کہا: کیا تم نے اسی لئے شگاف کیا ہے کہ کشتی والوں کو غرق کر دو؟ تم نے تو بڑا بھاری کام کیا ﴿۷۱﴾ اس بندے نے کہا: میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میرے ساتھ رہتے ہوئے تم صبر نہیں کر سکتے ﴿۷۲﴾ موسیٰ نے کہا کہ میرے بھول جانے کی وجہ سے میرا مؤاخذہ نہ کیجئے، اور میرے معاملہ میں مجھ پر تنگی نہ ڈالئے ﴿۷۳﴾ پھر دونوں چل دیئے، یہاں تک کہ ایک لڑکے سے ملاقات ہو گئی، سو اس بندہ خدا نے اسے قتل کر دیا، موسیٰ نے کہا: کیا تم نے ایک بے گناہ جان کو کسی جان کے بدلہ بغیر قتل کر دیا؟ تم نے تو بہت ہی بے جا کام کیا ﴿۷۴﴾

اَلْجُزْءُ السَّادِسُ عَشَرَ

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ
قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْ
هُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾ قَالَ هٰذَا
فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

ترجمہ: اس بندہ خدا نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہتے ہوئے صبر نہیں کر سکتے ؟ ﴿۷۵﴾ موسیٰ نے کہا: اگر میں تم سے اس کے بعد کسی چیز کے بارے میں دریافت کروں تو مجھے اپنے ساتھ نہ رکھئے، بیشک آپ میری طرف سے عذر کو پہنچ چکے ہیں ﴿۷۶﴾ پھر دونوں چل دیئے، یہاں تک کہ ایک گاؤں کے رہنے والوں پر گزرے، دونوں نے ان لوگوں سے کھانا طلب کیا، سوانہوں نے ان کی مہمانی کرنے سے انکار کر دیا، اس کے بعد اس بستی میں ان دونوں نے ایک دیوار کو پایا جو کہ گرنے ہی کو ہو رہی تھی، اس بندہ خدا نے اسے سیدھا کر دیا، موسیٰ نے کہا: اگر آپ چاہتے تو مزدوری کے طور پر اس عمل پر کچھ لے لیتے ﴿۷۷﴾ اس بندۂ خدا نے کہا کہ یہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی کا وقت ہے، میں تمہیں ان چیزوں کی حقیقت ابھی بتا دوں گا جن پر تم صبر نہ کر سکے ﴿۷۸﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مفصل واقعہ:

مذکورہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ یہ واقعہ حدیث کی کتابوں میں ذرا تفصیل سے مذکور ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب العلم میں دو جگہ لکھا ہے: پہلی جگہ صفحہ ۱۷ جلد اول میں مختصر، پھر صفحہ ۲۳ جلد دوئم میں۔ سورۂ کہف کی تفسیر میں مفصل روایت کی ہے، نیز اور بھی کئی جگہ ذکر فرمایا ہے۔ صحیح مسلم جلد دوئم صفحہ ۲۶۹ مذکور ہے۔ امام نسائی نے سنن کبریٰ میں صفحہ ۳۸۶ پر لکھا ہے۔ امام ترمذی نے بھی ابواب التفسیر سورۂ کہف میں تذکرہ فرمایا ہے۔

یہ واقعہ بہت سی حکمتوں، عبرتوں اور بہت سے علوم ومعارف پر مشتمل ہے۔ یہاں ہم صحیح البخاری کتاب

التفسیر سے واقعہ نقل کرتے ہیں، اس سے واقعہ کی تفصیل بھی معلوم ہوگی، اور مذکورہ آیات کی بھی تفسیر واضح ہوگی۔

حضرت سید القراء ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں کھڑے ہوئے، اور ان کو وعظ فرمایا، اس وعظ کی وجہ سے لوگوں کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور ان کے دلوں میں نرمی آگئی، کیونکہ یہ وعظ بڑا مؤثر تھا، جب آپ علیہ السلام چلنے لگے تو ایک شخص نے دریافت کرلیا کہ اے اللہ کے رسول! کیا زمین میں کوئی ایسا شخص ہے جو علم میں آپ سے زیادہ ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ کوئی نہیں۔

اور ایک روایت میں ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے بڑا عالم کون ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں ہوں۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا، کیونکہ انہوں نے اللہ أعلم نہیں کہا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ بلاشبہ ہمارا ایک بندہ مجمع البحرین میں ہے، وہ تم سے زیادہ علم رکھنے والا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: میں آپ جل جلالہ کے اس بندے سے کس طرح ملاقات کروں؟ میں اسے جانتا نہیں ہوں، میں اس کی تلاش میں نکلوں تو مجھے کیسے پتہ چلے گا کہ میں آپ کے اس بندہ تک پہنچ جاؤں گا؟ مجھے آپ جل جلالہ کے اس بندے سے ضرور ملنا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ایک مچھلی لے لو ٹوکری میں رکھ لو، یہ مچھلی مردہ ہو پھر جس جگہ وہ زندہ ہوگئی تو سمجھ لو کہ وہ شخص اسی جگہ آپ کو ملے گا جہاں یہ مچھلی تم سے جدا ہو جائے، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک مچھلی لے کر ٹوکری میں رکھ لی، اپنے نوجوان خادم یوشع بن نون علیہ السلام کے حوالہ کر کے وہاں سے دریا کے کنارے پر چلتے ہوئے مجمع البحرین کے سفر پر روانہ ہوئے، اور خادم کو بتادیا کہ جہاں یہ مچھلی زندہ ہو کر چلنے لگی تو مجھے اطلاع دیدینا۔ یوشع بن نون علیہ السلام نے کہا کہ یہ آپ نے بڑی بات کی ذمہ داری نہیں سونپی، ان شاء اللہ میں آپ کو مطلع کروں گا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام خادم کو لے کر مسلسل چلتے رہے، اور رات کو دریا کے کنارے پر پتھر نمودار ہوا جہاں آپ نے سر رکھ کر آرام فرمایا، اس درمیان مچھلی تڑپ کر زندہ ہوگئی اور ٹوکری سے نکل کر سمندر میں اپنے لئے راہ بنالی، اللہ تعالیٰ کے حکم سے پانی میں پائپ کی طرح سوراخ ہو کر طاقچہ بن گیا جس میں مچھلی غائب ہوگئی۔ ﴿فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا﴾۔

حضرت یوشع بن نون علیہ السلام یہ منظر دیکھ کر تعجب میں پڑ گئے، جب موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو دونوں

حضرات وہاں سے آگے چل دیئے۔ دراصل یہ مچھلی بھنی ہوئی ان کی خوراک تھی، وہ سفر میں اسی سے کھاتے رہے، جب اگلے دن صبح ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام برابر چلتے رہے اور کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں کی، جب اصل مقصد والے مقام سے جب آگے بڑھے تو تکلیف محسوس ہوئی، جب خادم سے کھانا طلب کیا تو خادم کو اب یاد آ گیا وہ کہنے لگے کہ آپ کو علم نہیں جب ہم نے پتھر کے پاس آرام کیا تھا اور آپ سو گئے تھے اس وقت مچھلی زندہ ہو کر ٹوکری سے نکلی اور سمندر میں چلی گئی تھی، اور وہاں سے چلتے وقت مجھے یاد نہ رہا، اس لئے آپ کو نہ بتا سکا، یہ بھول شیطان ہی کے بھلانے سے ہوئی، کوئی بھولنے والی بات نہ تھی، بلکہ یاد رکھنے اور بتانے والی بات تھی۔

﴿وَاتَّخَذَ سَبِيلَهٗ فِي الْبَحْرِ عَجَبًا﴾ مچھلی کے زندہ ہونے اور سمندر میں طاقچہ بنا کر جانے سے ان کو بڑا تعجب ہوا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہی وہ جگہ تھی جس کی تلاش میں ہم چلے تھے، مچھلی کا ہم سے جدا ہو جانا ہی اس بات کی نشانی تھی کہ ہم جن صاحب کی تلاش میں نکلے ہیں وہ اسی جگہ میں ہیں، اب ہمیں واپس ہونا ہی پڑے گا، لہٰذا پیچھے پاؤں لوٹے۔ ﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ دونوں اپنے قدموں کے نشانوں پر واپس لوٹے پلٹ کر:

﴿فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا﴾ جب واپس لوٹ کر اسی پتھر کے پاس پہنچے جس پر سر رکھ کر سو گئے تھے تو وہاں ہمارے ایک بندے کو پایا (صحیح حدیث میں آیا ہے کہ یہ حضرت خضر علیہ السلام تھے، ان کی کنیت ابو العباس اور اسم شریف بلیا بن ملکان ہے) وہ سمندر کے درمیان پانی پر کپڑا اوڑھے ہوئے لیٹے ہیں۔ (ایک روایت میں ہے نماز پڑھ رہے ہیں)۔

موسیٰ علیہ السلام نے انہیں سلام کیا، انہوں نے کہا کہ اس سرزمین میں سلام کہاں سے آ گیا، آپ کون ہیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: میں وہی ہوں، پھر انہوں نے سوال کیا کیسے تشریف لانا ہوا؟ فرمایا کہ آپ مجھے اپنے اس علم میں سے سکھا دیں جو آپ کو علم مفید سکھایا گیا ہے، انہوں نے جواب میں کہا: کیا تمہیں تورات کافی نہیں ہے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے؟ اور یہ وحی جو تمہارے پاس آتی ہے کیا تجھے یہ کافی نہیں؟ مزید فرمایا: اے موسیٰ! مجھے اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے (تکوینی علم) جسے آپ نہیں جانتے، اور آپ کو اللہ تعالیٰ نے جو علم دیا ہے (تشریعی علم) جسے میں نہیں جانتا۔

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک چڑیا آئی جس نے سمندر میں سے اپنی چونچ میں ایک قطرہ پانی لے لیا، حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ اے موسیٰ! اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے تمہارا علم اور میرا علم اتنا بھی نہیں ہے جتنا اس پرندہ

نے سمندر سے اپنی چونچ میں پانی بھر لیا (واضح ہو کہ یہ محض سمجھانے کے لئے کہا، ورنہ اللہ تعالیٰ کا علم غیر متناہی ہے جبکہ سمندر متناہی ہے، اور قیامت تک تمام مخلوقات کا علم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں قطرہ سے بھی کم ہے)۔

حضرت خضر علیہ السلام کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب:

﴿قَالَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا وَكَيۡفَ تَصۡبِرُ عَلٰى مَا لَمۡ تُحِطۡ بِهٖ خُبۡرًا﴾ یہ امر یقینی ہے کہ آپ میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکیں گے، اور جس بات کا آپ کو پورا علم نہ ہو اس پر آپ صبر کیسے کر سکتے ہیں؟ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھے صابر پائیں گے، اور میں آپ کی کوئی نافرمانی نہیں کروں گا۔ (خضر علیہ السلام نے کہا کہ اگر آپ میرے ساتھ حسب وعدہ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی بات کے متعلق پہلے سے نہ پوچھنا جب تک میں خود اس کے متعلق ابتداءً ذکر نہ کروں)۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے وعدہ کر لیا تو دونوں ساتھ ساتھ دریا کے کنارے کنارے چل دیئے، حتیٰ کہ ایک کشتی پر پہنچے، وہ کشتی سواریوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچایا کرتی تھی، دونوں نے کشتی والوں سے کہا کہ ہمیں بھی سوار کر لیں، کشتی والوں نے خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور احتراماً انہیں بغیر کرایہ مفت بٹھالیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک کلہاڑا لیا اور کشتی کے ایک تختہ کو اکھاڑ دیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور فرمایا کہ ایک تو ان لوگوں نے بغیر اُجرت کے ہمیں سوار کر لیا، اور اوپر سے آپ نے یہ کیا کیا کہ ان کی کشتی میں شگاف کر دیا؟ اب اس شگاف سے پانی بھرے گا تو کشتی بمع سواریوں کے دریا میں ڈوب کر غرق ہو جائے گی، تمہارا کردار ایسا ہی ہے کہ لوگوں کو غرق کر دو۔

﴿لِتُغۡرِقَ اَهۡلَهَا﴾ میں لام عاقبت کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے ایسا کام کیا ہے جس کا انجام یہ ہے کہ کشتی پر جو لوگ سوار ہیں سب ڈوب جائیں گے۔ حضرت خضر علیہ السلام کی نیت پر حملہ کرنا مقصود نہ تھا، تم نے یہ جو کام کیا بہت ہی بُرا اور ہلاکت خیز ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میرے ساتھ رہتے ہوئے آپ صبر نہیں کر سکتے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا کہ میں بھول گیا، آپ بھولنے پر میرا مؤاخذہ نہ کریں، اور میرے معاملہ میں تنگی اور سختی نہ فرمائیں، یعنی درگزر فرمائیں، معذرت قبول کریں۔

اس کے بعد کنارہ پہنچنے کے بعد کشتی سے اتر گئے، اور آگے بڑھے، دونوں ساتھ ساتھ آبادی کی طرف جا رہے تھے کہ بستی سے باہر چند لڑکوں پر گزر ہوا جو کھیل رہے تھے، حضرت خضر علیہ السلام نے ان میں سے ایک لڑکے کو پکڑا اور اس کے سر کو مروڑ کر تن سے جدا کر دیا۔ ایک روایت میں ہے کہ اسے چھری سے ذبح کیا، یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ

علیہ السلام سے نہ رہا گیا، اور حیرت کے عالم میں فرمایا: کیا تم نے ایک بے گناہ پاکیزہ جان کو قتل کردیا؟ جس نے کسی کو قتل نہیں کیا، جان کا بدلہ جان ہوتی ہے، یہ لڑکا سن بلوغ کو بھی نہیں پہنچا، اور نہ ہی اس نے کسی کو قتل کیا، پھر کیسے اور کس جرم میں آپ نے اسے قتل کیا؟ یہ تم نے بہت ہی برا کام کیا۔

﴿لَقَدْ جِئْتَ شَيْـًٔا نُّكْرًا﴾ یہ بڑا منکر کام کیا تو نے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہتے ہوئے صبر نہیں کرسکو گے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ میرا اور ان کا جوڑ نہیں بیٹھ سکتا، اور ان کے عجیب وغریب کرداروں پر مجھے خاموش رہنا پڑے گا جو میرے لئے مشکل ہے، لہٰذا حضرت خضر علیہ السلام سے بجائے معذرت کے یہ کہا کہ آئندہ اس کے بعد اگر میں آپ سے سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھئے، آپ مجھے جدا کردیں گے تو میرے لئے ناگواری کی بات نہ ہوگی، کیونکہ آپ ایسے مرحلے پر پہنچ چکے ہیں کہ آپ میری بے صبری کے بارے میں معذور ہیں، اور آپ کا یہ معذور ہونا میری طرف سے ہے، میں درمیان میں نہ بولتا تو یہ نوبت نہ آتی۔ گویا کہ انہوں نے اپنی بے صبری تسلیم کرلی۔

اس کے بعد پھر چلے، اور چلتے چلتے ایک بستی میں آئے، انہیں کھانے کی ضرورت محسوس ہورہی تھی، بستی والوں سے کچھ کھانے کے لئے طلب کیا ان لوگوں نے مہمانی کرنے اور کچھ کھلانے سے انکار کیا، ابھی زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ وہاں ایک دیوار کو دیکھا جو جھکی ہوئی تھی، اور قریب تھا کہ گر پڑے، حضرت خضر علیہ السلام نے کھڑے ہوکر اسے اپنے ہاتھ سے سیدھا کھڑا کردیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: یہ ایسے لوگ ہیں جنہوں نے نہ ہمیں کچھ کھلایا، نہ ہماری مہمانی کی، یہ کسی بھی خیر کے حقدار نہیں، مگر آپ نے ان کا کام مفت میں کردیا، اگر آپ چاہتے تو ان لوگوں سے اپنے اس عمل کی کچھ اُجرت ومزدوری لے لیتے، تاکہ ہمارے کھانے کا کام چل جاتا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا: یہ میرے اور تمہارے درمیان جدائی کا وقت ہے، ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ جن باتوں پر تم نے صبر نہیں کیا تمہیں ان کی حقیقت بتائے دیتا ہوں۔

یہ واقعہ صحیح بخاری ودیگر کتب حدیث میں معمولی کمی بیشی کے ساتھ اس طرح مذکور ہے۔ فتح الباری جلد ہشتم صفحہ ۴۲۰ میں امام ثعلبیؒ سے نقل کیا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا: کیا آپ مجھے کشتی کے پھاڑنے اور غلام کے قتل کرنے اور دیوار قائم کرنے پر ملامت کرتے ہیں؟ اور آپ اپنا حال بھول گئے، آپ کو سمندر میں ڈال دیا گیا، اور آپ نے ایک قبطی کو قتل کیا، اور آپ نے شعیب علیہ السلام کی دو بیٹیوں کی بکریوں کو پانی پلایا۔

اَمَّا السَّفِيۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ فِى الۡبَحۡرِ فَاَرَدْتُّ اَنۡ اَعِيۡبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمۡ مَّلِكٌ يَّاۡخُذُ كُلَّ سَفِيۡنَةٍ غَصۡبًا ﴿۷۹﴾ وَاَمَّا الۡغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤۡمِنَيۡنِ فَخَشِيۡنَاۤ اَنۡ يُّرۡهِقَهُمَا طُغۡيَانًا وَّكُفۡرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدۡنَاۤ اَنۡ يُّبۡدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيۡرًا مِّنۡهُ زَكٰوةً وَّاَقۡرَبَ رُحۡمًا ﴿۸۱﴾ وَاَمَّا الۡجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَيۡنِ يَتِيۡمَيۡنِ فِى الۡمَدِيۡنَةِ وَكَانَ تَحۡتَهٗ كَنۡزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوۡهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنۡ يَّبۡلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسۡتَخۡرِجَا كَنۡزَهُمَا ۖ رَحۡمَةً مِّنۡ رَّبِّكَ ۚ وَمَا فَعَلۡتُهٗ عَنۡ اَمۡرِىۡ ؕ ذٰلِكَ تَاۡوِيۡلُ مَا لَمۡ تَسۡطِعْ عَّلَيۡهِ صَبۡرًا ﴿۸۲﴾

ترجمہ: کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ وہ چند مسکینوں کی تھی جو سمندر میں کام کرتے تھے، سو میں نے کہا کہ اسے عیب دار کردوں، اور ان لوگوں کے آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو چھین لیا کرتا تھا ﴿۷۹﴾ رہا لڑکے کا معاملہ سو بات یہ ہے کہ اس کے ماں باپ مؤمن تھے، تو ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ ان دونوں کو سرکشی میں اور کفر میں نہ ڈال دے ﴿۸۰﴾ سو ہم نے چاہا کہ ان کا ربّ انہیں اس لڑکے کے بدلہ اس سے بہتر ایسی اولاد عطا فرمادے جو پاکیزگی میں اس سے بہتر ہے، اور رحم کرنے میں اس سے بڑھ کر بہتر ہو ﴿۸۱﴾ اور رہی دیوار تو اس کی صورتحال یہ ہے کہ وہ اس شہر میں دو یتیم لڑکوں کی تھی، اور اس کے نیچے ان دونوں کا خزانہ تھا، اور ان کا باپ نیک آدمی تھا، سو تیرے ربّ نے ارادہ فرمایا کہ یہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں، اور اپنے خزانے کو نکال لیں، یہ تیرے ربّ کی مہربانی کی وجہ سے ہے، اور یہ سب کام میں نے اپنی رائے سے نہیں کیئے، یہ ہے ان باتوں کی حقیقت جن پر تم صبر نہ کرسکے ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

حضرت خضر علیہ السلام جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جدا کرنے لگے تو فرمایا کہ میں آپ کو ان تینوں باتوں کی حقیقت بتائے دیتا ہوں جن پر آپ صبر نہ کرسکے۔

پہلی چیز یعنی کشتی کا معاملہ:

فرمایا: کشتی کا معاملہ یہ ہے کہ یہ غریب لوگوں کی کشتی تھی جو سمندر میں کشتی کو چلاتے تھے، اور سواریوں سے اجرت لے کر اپنے پورے خاندان کا گزارہ کرتے تھے، آگے جس علاقہ سے ان کا گزر ہوتا تھا وہاں کا ظالم بادشاہ صحیح وسلامت اچھی کشتیوں کو چھین کر غصب کرتا تھا، میں ان غریبوں کی کشتی کو ظالم سے بچاتے ہوئے عیب دار بنادیا، جب وہاں سے ان کا گزر ہوگا تو ان کی عیب دار کشتی محفوظ رہے گی، پھر وہ اس کی مرمت کرکے اپنا کام چلائیں گے، چنانچہ

ایسا ہوا کشتی بھی بچ گئی، اور سوراخ سے پانی اندر نہیں آیا۔

دوسرا معاملہ لڑکے کے قتل کا:

اس میں راز یہ ہے کہ وہ لڑکا کافر تھا، اس پر کفر کی مہر لگ چکی تھی، وہ کبھی بلوغ کے بعد مسلمان ہونے والا نہ تھا، اس کے والدین کو اس سے بہت زیادہ محبت تھی، اور وہ دونوں مسلمان تھے، اندیشہ تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہوکر اپنے والدین کو کفر پر نہ ڈال دے، پیاری اولاد کا ماں باپ پر جو زور چلتا ہے، اس زور کو استعمال کر کے یہ انہیں سرکش اور کافر نہ بنادے، لہٰذا اس کو تو قتل کر دیا، اور اس کے بدلہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دوسری اولاد عطا فرمادی جو پاکیزہ ہونے کے اعتبار سے بھی اس لڑکے سے بہتر رہی، اور والدین کے ساتھ شفقت و رحمت کا برتاؤ کرنے میں بھی ان سے بڑھ کر بہتر رہی۔ روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں پرہیزگار مؤمنہ لڑکی عطا فرمائی، جس کے بطن سے پیغمبر پیدا ہوئے۔

تیسرا معاملہ دیوار قائم کرنے کا:

اس کی حقیقت یہ ہے کہ یہ دو یتیم بچوں کی دیوار تھی، اور دیوار کے نیچے ان کا خزانہ تھا، اگر دیوار گر پڑتی تو شہر والے لوگ ان غریب صغیر السن یتیم بچوں کے خزانے پر قبضہ جماتے، اور وہ بچے محروم ہو جاتے، اوّل تو یہ بچے چھوٹے اور یتیم تھے، دوسرے یہ کہ یہ نیک آدمی کی اولاد تھے، تو یوں بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کی ضرورت تھی، لہٰذا ہم نے دیوار کو کھڑا ہی کر دیا تاکہ یہ بالغ ہو جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں یتیموں پر رحم فرمایا، اور گرنے والی دیوار کو سیدھا کھڑا کروادیا۔

اگر شہر کے بالغ لوگوں نے ہمیں کھانے کے لئے کچھ نہ دیا تو یہ بدلہ ان یتیموں سے ہمیں نہیں لینا چاہئے تھا، یتیموں کا کام ہمیں بغیر اجرت کرنا چاہئے تھا۔ یہاں دوسرا سبب یہ بتایا کہ ان کا باپ نیک آدمی تھا جس نے یتیموں کے لئے یہ خزانہ زمین میں چھپا کر اس پر علامت کے طور پر دیوار کھڑی کردی، یہ دیوار موسمی بارشوں کی وجہ سے خستہ ہوکر گرنے لگی، ہوسکتا ہے اس مرد صالح نے اپنے بچوں کو اور ان کے خزانہ کو حق تعالیٰ سبحانہ کے سپرد کیا ہو، اور یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ بایدہر مؤمن موت سے پہلے اپنے پسماندگان کو اور ان کے اموال کو ربّ العزّت سبحانہ کی کفالت میں دیدے، پس وہ کبھی ضائع نہیں ہوں گے، اور لوگوں کے دست و برد سے محفوظ رہیں گے۔

حضرت امام مالک مدنی اور امام اعمش سلیمان بن مہران رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان کو چاہئے کہ اپنے سب سے بڑے سرمایہ "ایمان" کو حق تعالیٰ شانہ کی کفالت میں دیدے، تو اللہ تعالیٰ اس کے ایمان کو شیاطین کے

دست و برد اور خیانتوں سے محفوظ فرمائیں گے، پہلے صدق دل سے کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھ کر یہ کہتے ہوئے سپرد کرے: اَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ تعالىٰ لِهٰذِهِ الشَّهَادَةِ وَهِيَ لِيْ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالىٰ وَدِيْعَةٌ۔ اے اللہ تعالیٰ! رحیم وکریم! ربّ العرش العظیم! ہمارے ایمان آپ کی کفالت میں ہے، آپ ہی ہمارے ایمانوں کی حفاظت فرما، جس طرح یتیموں کے خزانے کی حفاظت فرمائی۔ آمین

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس خزانے میں سونے چاندی بھی تھے، اور بہت سی پند ونصیحت کی بیش قیمت باتیں بھی۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ﴾ یہ جو کچھ میں نے کیا ہے اپنی رائے سے نہیں کیا، بلکہ اللہ تعالیٰ شانہ کے حکم و فرمان سے مجھ یہ کام لئے گئے۔

﴿ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا﴾ یہ حقیقت ہے ان باتوں کی جن پر آپ صبر نہ کر سکے۔ اس کے ساتھ اس واقعہ کے متعلق بیس کے قریب قیمتی فوائد وجواہرات کا بیان ہوگا۔

معارف ومنازل، اور نکات وفوائد:

(۱) اس پورے واقعہ کی بنیاد صرف وہی ایک بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کے پوچھنے پر کہا تھا کہ ”سب سے بڑا عالم میں ہوں“ اس پر عتاب شروع ہوا کہ یہ بات درست نہیں، آپ سے بڑے عالم اور بھی ہیں۔ ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِيْ عِلْمٍ عَلِيْمٌ﴾ [یوسف: ۷۶] (اور ہر علم والے اوپر ایک علم والا ہے)۔

جب حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام کو ایسا کہنا زیب نہیں دیتا تو دوسروں کو بطریق اولیٰ نہیں کہنا چاہیے۔

(۲) انبیاء علیہم السلام کا علم آسمانی ہوتا ہے، زمینی استاذ اُن کا کوئی نہیں ہوتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے جو علم سیکھا وہ تکوینی امور کے متعلق تھا، نہ کہ تشریعی، لہٰذا کوئی اشکال نہیں رہا۔

(۳) حضرت خضر علیہ السلام کے بارے میں واضح ہو کہ وہ فرشتہ نہیں تھے، بلکہ انسان تھے، پھر بنی اسرائیلی بھی نہیں تھے، ورنہ موسیٰ علیہ السلام کا اتباع اُن پر واجب ہوتا، وہ عام انسان تھے، ان کا لقب خضر، کنیت ابوالعباس نام بلیا بن ملکان بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب علیہم السلام ہے۔

(۴) حضرت خضر علیہ السلام کو کیوں خضر کہتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جب خشک گھاس یا خشک زمین پر

بیٹھ جاتے تو وہ سرسبز ہوکر لہلہانے لگتی تھی۔ حضرت مجاہدؒ نے فرمایا: جس جگہ خضر نماز پڑھتے تھے وہ جگہ سبزہ زار بنتی تھی۔

(۵) چونکہ کسی صحیح مرفوع حدیث میں حضرت خضر علیہ السلام کی نبوت کی تصریح نہیں ہے، اس لئے علماء کرام نے اس مسئلہ میں اختلاف کیا، بعض نے ان کو ولی کامل کہا، بعض نے ان کو رسول مانا، اور محققین نے انہیں نبی کہا، اور راجح قول یہی ہے۔

(٦) حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ و مقام بہت ہی اونچا ہے، وہ نبی بھی ہیں اور رسول وکلیم اللہ بھی ہیں، وہ حضرت خضر علیہ السلام سے مطلقاً افضل ہیں، یہی مذہب جمہو علماء کا ہے۔

(۷) حضرت خضر علیہ السلام کا علم تکوینی ہے، یعنی اسرار کائنات کا علم، جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا علم تشریعی ہے، اور تشریعی علم تکوینی علم سے افضل ہے جو انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، اور خلافتِ الٰہیہ کا سرچشمہ ہے، اور تکوینی امور و اسرار کائنات کا علم فرشتوں کو بھی حاصل ہے جزوی طور پر۔

(۸) حضرت خضر علیہ السلام اب زندہ ہیں یا وفات پاچکے ہیں؟ یہ بڑا اختلافی مسئلہ ہے، بہت سے محققین انہیں زندہ مانتے ہیں، وہ آب حیات کا پانی پی چکے ہیں، یہی مذہب صوفیاء کرام کا بھی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء اور محققین کہتے ہیں کہ وہ وفات پاچکے، یہی مذہب امام بخاریؒ کا بھی ہے۔ فریقین میں ہر ایک نے اپنے مسلک پر زوردار دلائل پیش کئے ہیں جنہیں حضرت حافظ ابن حجرؒ نے الاصابۃ فی معرفۃ الصحابۃ میں تفصیلاً بیان فرمایا ہے، وہاں رجوع کیا جائے، ایک عمدہ محاکمانہ قول یہ ہے کہ:

(۹) حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے پوچھا گیا کہ حضرت خضر علیہ السلام زندہ ہیں یا وفات پاچکے ہیں؟ تو وہ بارگاہ الٰہی میں حقیقت حال جاننے کے لئے متوجہ ہوئے، یعنی مراقبہ میں بیٹھ گئے تو دیکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام ان کے پاس کھڑے ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو آپ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اور حضرت الیاس علیہ السلام زندوں میں سے نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو ایسی قوت بخشی ہے کہ ہم جسم کا لباس پہن کر گم شدہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ بتاتے ہیں، اور مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا ہے تو بعض لوگوں کو علم لدنی تعلیم کرتے ہیں، اور نسبت بھی عطا کرتے ہیں، ہم کو اللہ تعالیٰ نے قطب مدار کا مددگار بنایا ہے، قطب مدار کو اللہ تعالیٰ شانہ نے قطب مدار عالم بنایا ہے، انہی کی برکت سے یہ عالم قائم ہے، ہم ان کی مدد کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کا مسکن ملک یمن ہے وہ فقہ شافعی کے پیرو ہیں، ہم بھی قطب

مدار کے ساتھ شافعی فقہ کے مطابق (موافق) نماز پڑھتے ہیں۔ [تفسیر مظهری]

(۱۰) صوفیاء کرام نے اس سلسلے میں اتنی کثرت کے ساتھ اپنے اکابرین کے واقعات بیان کئے ہیں کہ ان کے انکار کرنے کی گنجائش نہیں کہ حضرت خضر علیہ السلام اپنی اسی روحانی زندگی کے ساتھ انہیں ہر قسم کی نمازوں، تسبیحات اور اعمال اور دعاؤں، مناجاتوں وغیرہ کی تعلیم اور تربیت کرتے رہتے ہیں، یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا، انہوں نے یہاں تک بھی کہا ہے کہ خضر علیہ السلام روزانہ فجر کی نماز کعبہ شریف کے حطیم میں ادا کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

(۱۱) اس واقعہ سے یہ معلوم ہوا کہ طلبِ علم کے لئے سفر کرنا چاہیے، امام بخاریؒ نے **باب الخروج فی طلب العلم** کے ذیل میں اسی واقعہ کی تخریج کی ہے۔

(۱۲) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی جلالت شان کے باوجود اپنے سے کمتر استاذ حضرت خضر علیہ السلام سے علم حاصل کیا۔ اور اس کو اپنے لئے عار نہیں سمجھا۔

(۱۳) مجمع البحرین کہاں واقع ہے؟ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں: امام قتادہؒ نے کہا کہ بحر فارس اور بحر روم کے ملنے کی جگہ مراد ہے۔ ابن عطیہؒ نے کہا کہ یہ مقام آذربائیجان کے قریب ہے۔ بعض حضرات نے بحر قلزم اور بحر اردن کے ملنے کی جگہ بتایا ہے۔ حضرت ابی بن کعبؓ فرماتے ہیں کہ یہ مقام افریقہ میں ہے جو کہ مصر سے نزدیک ہے، غالباً بحر نیل کی دونوں شاخوں کے ملنے کی جگہ ہے۔ بعض نے بحر اندلس اور بحر محیط کے ملنے کی جگہ بتائی ہے۔ واللہ اعلم

(۱۴) آیت کریمہ کے سیاق سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجمع البحرین کسی نزدیک جگہ کا نام نہیں کہ ادھر سے چلے ادھر پہنچ گئے، بلکہ یہ مقام اچھے خاصے فاصلہ پر ہوگا۔ اس لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا﴾ یعنی میں برابر چلتا رہوں گا یہاں تک کہ مجمع البحرین کو پہنچ جاؤں، یا یوں ہی (حقب احقاب) زمانہ دراز تک چلتا رہوں، حقب کے مختلف معانی ہیں: (۱) ایک سال (۲) ۷۰ ستر سال (۳) ۸۰ اسی سال (۴) زمانہ دراز وہاں صرف ہوگا جہاں مقام مطلوب دور ہو، پس میرے نزدیک حضرت ابی بن کعبؓ والا افریقی مقام متعین ہوگا۔ واللہ اعلم

(۱۵) حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے کشتی میں شگاف کر کے اسے عیب دار بنایا وقتی طور وہ خطرے کے مقام سے سلامت آگے نکل گئی، اس کے بعد انہوں نے اسے درست کر دیا، اور آگے بڑھ گئے، حضرت خضر علیہ

السلام کا معجزہ یہ رہا کہ شگاف کے باوجود کشتی کے اندر پانی داخل نہیں ہوا۔

(١٦) لڑکے کے قتل سے یہ فائدہ ہوا کہ اس کے والدین کا ایمان بچ گیا، پھر تلافی نقصان کی صورت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بہتر مشفق رحمدل اور نیک اولاد عطا فرمائی۔ کہتے ہیں کہ انہیں ایک لڑکی عطا ہوئی جس کے بطن سے ایک نبی کی پیدائش ہوئی، پھر اس کی نسل میں (٧٠) ستر پیغمبر پیدا ہوئے۔

(١٧) دیوار قائم کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ چھوٹے یتیموں کا خزانہ لوگوں کے دست وبرد سے محفوظ ہو گیا، اور وہ اپنے مال سے محروم نہیں ہوئے۔

(١٨) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کافر لڑکے سے مسلمان لڑکی بدرجہا بہتر ہے۔

(١٩) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شرعی احکام اور تکوینی احکام ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں، ایک چیز یہاں گناہ ہے اور وہاں گناہ نہیں ثواب ہے۔

(٢٠) اس واقعہ کے ذرہ ذرہ کے حالات سے بخوبی معلوم ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام عالم الغیب نہیں ہیں، اور غیب دانی خاصہ خداوندی ہے، پس اگر کوئی انبیاء علیہم السلام یا اولیاء کرام کے متعلق عقیدہ رکھتا ہو کہ وہ عالم الغیب ہیں اور امور غیبیہ پر انہیں اطلاع ہے وہ شخص سراسر گمراہ ہوگا، پس اگر نص قطعی کا انکار کرے تو کفر لازم آئے گا، نص قطعی یہ ہے: ﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ﴾ [النمل ٦٥] (کہہ دیں کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا سوائے اللہ کے)۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ۭ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ۝ اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَ
اٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ۝ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ۝ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ
فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ڛ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ
حُسْنًا ۝ قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَاَمَّا مَنْ
اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَاۗءَ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ۝

ترجمہ: اور یہ لوگ آپ سے ذوالقرنین کے بارے میں سوال کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ میں ابھی

تمہارے سامنے اس کا ذکر کرتا ہوں ﴿۸۳﴾ بلاشبہ ہم نے ذوالقرنین کو زمین میں حکومت دی تھی، اور اسے ہر چیز کا سامان دیا تھا ﴿۸۴﴾ پھر وہ ایک راہ پر روانہ ہو گیا، یہاں تک کہ جب سورج کے چھپنے کی جگہ پر پہنچا تو سورج کو ایک چشمہ میں ڈوبتا ہوا پایا، اور اس موقع پر اس نے ایک قوم دیکھی، ہم نے کہا: اے ذوالقرنین! تم ان کو سزا دو اور یا ان میں خوبی کا معاملہ اختیار کرو ﴿۸۶﴾ اس نے کہا: جس نے ظلم کیا سو ہم عنقریب اسے سزا دیں گے، پھر وہ اپنے رب کی طرف لوٹایا جائے گا، سو وہ اسے برا عذاب دے گا۔ اور جو ایمان لایا اور نیک عمل کیا اس کے لئے بدلے میں بھلائی ہے، اور ہم اس کے بارے میں اپنے کام میں آسانی کی بات کہیں گے ﴿۸۸﴾

معارف ومنازل

علماء یہود نے قریش مکہ سے جو کہا تھا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے تین سوالات کرو: اوّل روح کے متعلق، دوم اصحاب کہف کے بارے میں، اور سوم ذوالقرنین کے بارے میں۔ پہلے دونوں کا بیان گزر چکا، اب یہاں سے تیسرے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ ذوالقرنین کون تھے؟ اور یاجوج ماجوج کہاں تھے؟ اور جو دیوار یاجوج ماجوج کے فساد سے بچانے کے لئے بنائی تھی وہ کہاں ہے؟ یہ سوال دلوں میں ابھرتے ہیں، ایک مؤمن آدمی کے لئے تو قرآن کریم کا اجمالی بیان ہی کافی ہے، لیکن موجودہ دور ترقی وتحقیق اور تفتیش کا ہے، اب کسی اجمال پر کوئی قناعت نہیں کرتا، جب تک کسی واقعہ کی پوری تحقیق نہ ہو، لہٰذا ہم ان تینوں باتوں کے جوابات عرض کرتے ہیں تاکہ اطمینان ہو۔

ذوالقرنین اور ان کی فتوحات واسفار:

پہلا سوال کہ ذوالقرنین کون تھے؟ اور ان کا نام کیا تھا؟ اور انہیں ذوالقرنین کیوں کہتے ہیں؟ اور ان کے اسفار کہاں کہاں ہوئے؟ اور ان کی فتوحات وکارنامے کیا ہیں؟

اس سلسلے میں اوّل تو یہ سمجھنا چاہئے کہ بہت سے لوگوں نے ذوالقرنین کو اسکندر مقدونی بتایا ہے، جس کا وزیر ارسطاطالیس فلسفی یونانی تھا، جو کہ افلاطون حکیم کا شاگرد ہے، اور علم منطق کا موجد ہے، یہ شخص بڑا محقق تھا، اور مسلک کے اعتبار سے دہریہ منکر خدا گزرا ہے، اس کے خیالات فیثاغورث حکیم کے ساتھ ملتے جلتے تھے، یہ شخص اسکندر رومی مقدونی کا وزیر تھا، اور اسکندر رومی اس سے بھی بڑا کافر ومشرک اور منکر خدا تھا، چنانچہ بہت سے لوگ اس اسکندر مقدونی دہریہ کی فتوحات سے متاثر ہو کر کہتے ہیں کہ قرآن حکیم نے جس ذوالقرنین کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی اسکندر

مقدونی ہے۔

مگر محققین علماء ومؤرخین کے نزدیک یہ ہرگز درست نہیں، کیونکہ قرآن کریم کے بیان سے بہت واضح ثبوت ملتا ہے کہ ذوالقرنین جنہوں نے یاجوج وماجوج پر سد بنائی تھی، اور مغرب ومشرق کا سفر کیا تھا، وہ ایک مؤمن، صالح، خدا پرست (بقول ابن کثیر پیغمبر تھے) آدمی تھے۔ اور اسکندر مقدونی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جابر، ظالم، کافر بادشاہ تھا۔

مؤرخ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اسکندر مقدونی مصر کے مشہور شہر اسکندریہ کا بانی تھا، اور وہ ذوالقرنین اوّل (جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے) سے بہت متأخر تھا، اور دونوں کے درمیان ہزار سال سے زائد مدت کا فاصلہ تھا، اور یہ اسکندر مقدونی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً تین سو سال پہلے تھا، اس نے فارس کے مشہور بادشاہ ''دارا'' کو قتل کیا، اور شاہانِ فارس کو ذلیل کر کے ان کو نیست ونابود کر دیا، اور دارا کے قتل کے بعد اس کی بیٹی ''روشنک'' سے شادی کر لی، پھر ہند کی فتح کے لئے روانہ ہوا، اور لاہور پہنچا، وہاں کے لوگوں نے اسے مشورہ دیا کہ ہند والے لوگ ہاتھیوں پر سوار ہو کر لڑتے ہیں، اس نے جب ہاتھی کو دیکھا تو پریشان ہوا، اور مزید آگے جانے کا ارادہ ترک کیا، اور فوج وحشم کے ساتھ واپس ہوا، چنانچہ راستے میں مر گیا، اس کی کُل عمر ۳۶ سال تھی، اور مدت بادشاہت صرف ۱۴ سال تھی، لیکن اس مختصر مدت میں اس کی فتوحات نہایت عجیب حیران کن رہیں، اسی بنیاد پر وہ سکندر اعظم کہلایا۔ [طبري]

خلاصہ یہ ہے کہ ذوالقرنین کو اسکندر مقدونی بتا دینا ہرگز درست نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ اس بات پر ہم نے اس لئے تنبیہ کی ہے کہ بہت سے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ قرآن مجید میں جس ذوالقرنین کا ذکر ہے وہ وہی ذوالقرنین ہے جس کا وزیر ارسطو تھا، اور اس کی وجہ سے بہت بڑی غلطی اور بہت بڑی خرابی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ ذوالقرنین اوّل جن کا ذکر قرآن مجید میں ہے وہ عبد مؤمن تھے، نہایت صالح انسان تھے، اور بادشاہ عادل تھے، اور ان کے وزیر حضرت خضر علیہ السلام تھے، اور وہ خود بھی نبی تھے، جیسا کہ ہم نے پہلے ثابت کیا ہے۔ اور دوسرا ذوالقرنین مشرک تھا، اور اس کا وزیر ایک فلسفی تھا، اور ان دونوں کے درمیان ایک ہزار سے زائد مدت کا فصل تھا، (بعضوں نے دو ہزار سال کا فاصلہ لکھا ہے) سو یہ کہاں اور وہ کہاں؟ دونوں میں کسی کور مغز آدمی کو اشتباہ ہو سکتا ہے جو حقائق کو نہ جانتا ہو۔ [البداية والنهاية: جلد ۲] یہ بات معلوم ہونے کے بعد کہ ذوالقرنین کون تھے جن کا ذکر

قرآن مجید میں ہے حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے نام کے بارے میں چند اقوال نقل کئے ہیں۔

(۱) عبداللہ بن ضحاک بن سعد (۲) مصعب بن عبداللہ بن قنان (۳) مرزوبان بن مرزبہ (۴) صعب بن ذی مرائد (۵) ہرمس (۶) ہردیس۔ پھر لکھا ہے کہ وہ سام بن نوح علیہ السلام کی نسل میں سے تھے، اور یہ بھی لکھا ہے کہ وہ قبیلہ بنی حمیر میں سے تھے، یعنی یمنی عرب تھے۔ یمن کے بادشاہوں کا لقب ''تبع'' ہے، اور ذوالقرنین یمن کا پہلا تبع کہلائے گا۔

چونکہ قرآن مجید میں ان کا لقب ہی ذکر کیا ہے، نام اور نسل کا تذکرہ نہیں فرمایا، اس لئے اتنا زیادہ اختلاف ہوا، اور اصل مقصود میں اس اختلاف سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ ذوالقرنین نبی تھے، اور اسحاق بن بشر سے نقل کیا ہے کہ ان کے مشیر اور وزیر حضرت خضر علیہ السلام ان کے لشکر کے سب سے اگلے حصہ کے امیر تھے، پھر یہ بھی لکھا ہے کہ مؤرخ ازرقی وغیرہ نے ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ کعبہ مکرمہ کا طواف کیا، اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ذوالقرنین نے پیدل حج کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب ان کے آنے کا علم ہوا تو ان کا استقبال کیا، اور ان کے لئے دعا فرمائی، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے ذوالقرنین کے لئے بادل کو مسخر کر دیا تھا، وہ جہاں جہاں چاہتے تھے بادل کو لے جاتے تھے۔ واللہ اعلم

ذوالقرنین کا یہ لقب کیوں معروف ہوا؟

اس سوال کے جواب میں اوّل تو یہ سمجھنا چاہئے کہ قرنین تثنیہ ہے قرن کا، اور قرن عموماً سینگ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور سو سال کی مدت کے لئے بھی لفظ قرن کا اطلاق ہوتا ہے۔ صاحب روح المعانی نے ان کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے اس پر گیارہ قول نقل کئے ہیں، اور نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں، ان میں وہ باتیں ہیں جو صحیح ہونے کے قریب بھی نہیں ہیں۔ ان گیارہ وجوہ میں بعض باتیں دل کو لگتی ہیں، ایک تو یہ کہ ان کے زمانہ سلطنت میں دو قرنین ختم ہوگئی تھیں، یعنی دو سو سال سے زیادہ ان کی حکومت رہی۔ دوسرا یہ کہ ان کے سر میں دو سینگیں تھیں، جیسے بکری کے کھر ہوتے ہیں، اور یہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے عمامہ استعمال کیا تاکہ سینگوں کو چھپا کر رکھا جائے۔ تیسرا یہ کہ ان کے تاج میں دو سینگیں تھیں (بہادری و مردانگی کی علامت کے طور پر)۔ چوتھا یہ کہ انہوں نے مغرب اور مشرق کا سفر کیا

تھا، ہر جانب کو ایک قرن سے تعبیر کیا گیا۔

﴿فَاَتْبَعَ سَبَبًا حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ﴾ جب اللہ تعالیٰ نے ذوالقرنین کو پورے جہاں پر حکمرانی عطا کی، اور دنیا کے تمام اسباب و وسائل کو ان کے لئے مہیا فرمایا، ضروریاتِ زندگی اسبابِ مملکت سب اس کے قدموں کے نیچے اور ان کے قلمرو میں آگئے، تو پورے جہاں پر قبضہ جمانے اور رعایا کی خبر گیری و دلجوئی کی خاطر تین بڑے عمومی سفروں کا آغاز فرمایا، سب سے پہلا سفر مغرب کا شروع فرما کر اس آخری سرزمین پر قدم رکھا جہاں سورج ایک سیاہ چشمہ اور سیاہ ندی میں غروب ہو رہا تھا، وہاں کی مٹی اور پانی سیاہ چشمہ رنگ کی تھی، بعضوں نے اس سے بحر اسود مراد لیا ہے، وہاں اس طرح معلوم ہوتا تھا کہ سورج سیاہ دلدل میں ڈوب رہا ہے۔

درحقیقت سورج سمندر میں غروب نہیں ہوتا، مگر سمندر سے آگے نگاہ نہ پہنچنے کی وجہ سے سمندر ہی میں ڈوبتا ہوا معلوم ہوتا ہے، جن حجاج کرام نے سمندری سفر کئے ہیں انہوں نے بارہا پانی کے جہاز میں یہ منظر دیکھا ہوگا، وہاں جب پہنچے تو دیکھا کہ ایک قوم آباد ہے، اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا: اے ذوالقرنین! (یہ خطاب کسی نبی کو ہوتا ہے، عام بادشاہوں کو نہیں) تمہیں اختیار ہے خواہ ان کو عذاب دو (یعنی ابتداءً کفر کی وجہ سے انہیں قتل کردو) یا ان کے بارے میں نرمی کا معاملہ اختیار کرو، یعنی ان کو ایمان کی دعوت دو، اگر نہ مانے تو پھر انہیں قتل کی سزا دیدو (ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو پہلے سے ایمان کی دعوت کسی طرح پہنچ چکی تھی، اس کے باوجود کافر رہے، اس لئے مستقل طور پر دعوت دیئے بغیر بھی قتل کرنے کا اختیار عطا فرما دیا)۔

ذوالقرنین نے عرض کیا کہ پہلے ہم ان کو ایمان کی دعوت دیں گے، دعوت دینے کے بعد جس شخص نے ظلم کی راہ اختیار کر لی یعنی کفر پر ہی برقرار رہا تو ہم اسے قتل کی سزا دیں گے، یہ سزا صرف دنیاوی ہوگی، پھر جب وہ اپنے ربّ کے پاس واپس لوٹایا جائے گا یعنی موت کے بعد بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوگا تو وہ اسے بُری سزا دے گا، اور جو شخص دعوت حق کو قبول کرے گا، اور ایمان لے آئے گا، اور نیک عمل کرے گا تو آخرت میں اس کے لئے ایمان و عمل کے بدلہ بھلائی ملے گی، یعنی جنت میں داخل ہوگا۔

سورۂ یونس میں ارشاد ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ [یونس: ۲۶] (جنہوں نے نیکی کی ان کے لئے نیکی ہے، اور اس سے زیادہ بھی ہے)۔ اور ہم بھی اپنے برتاؤ میں اس کو آسان بات کہیں گے، یعنی ہماری طرف سے اس پر کوئی عملی زبانی سختی نہ ہوگی۔

یہاں پر مغربی سفر کی روئیداد ختم ہوگئی، اور یہ معلوم نہ ہوا کہ وہ لوگ مسلمان ہوکر بچ گئے یا کفر پر ڈٹے رہے، اور قتل ہو گئے، قرآن مجید نے ان کے انجام اور نتیجہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ واللہ أعلم بحال عبادہ، ھو العلیم الخبیر

ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطۡلِعَ الشَّمۡسِ وَجَدَهَا تَطۡلُعُ عَلٰى قَوۡمٍ لَّمۡ نَجۡعَلْ لَّهُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهَا سِتۡرًا ﴿٩٠﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدۡ اَحَطۡنَا بِمَا لَدَيۡهِ خُبۡرًا ﴿٩١﴾

ترجمہ: پھر وہ ایک راہ پر روانہ ہو گیا﴿٨٩﴾ یہاں تک کہ جب وہ ایسی جگہ پر پہنچا جو آفتاب طلوع ہونے کی جگہ تھی، تو اس نے دیکھا کہ سورج ایسے لوگوں پر طلوع کر رہا ہے جن کے لئے ہم نے آفتاب سے ورے کوئی پردہ نہیں رکھا﴿٩٠﴾ یہ بات یوں ہی ہے، اور ہم کو ان سب چیزوں کی خبر ہے جو اس کے پاس تھیں﴿٩١﴾

معارف ومنازل

مشرق کا سفر:

﴿ثُمَّ اَتۡبَعَ سَبَبًا﴾ مغرب کے سفر کے بعد حضرت ذوالقرنین نے مشرق کے ممالک کا رخ کیا، اور مشرقی جانب کی راہ پر چل دیئے، چلتے چلتے جب ایسی جگہ پہنچے جہاں آفتاب طلوع ہونے کی جگہ تھی جہاں جانب مشرق میں آبادی کی آخری انتہاء تھی تو دیکھا کہ سورج ایسی قوم پر طلوع ہو رہا ہے کہ آفتاب کے اور ان کے درمیان اللہ تعالیٰ نے کوئی آڑ (پردہ) نہیں رکھی، یعنی یہ قوم ایسی تھی جو دھوپ سے بچنے کے لئے کوئی مکان یا خیمہ نہیں بناتے تھے، کھلے میدان میں رہتے تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے یہاں دھوپ کی تیزی زیادہ نہ ہوتی ہو، اور دھوپ میں رہنے کی عادت پڑ گئی ہو، جیسے جنگلی جانور اسی دھوپ میں گزارہ کرتے ہیں، اور رہتے ہیں، یا غربت کی وجہ اور وسائل کا فقدان ہو۔ واللہ اعلم

ابھی ہمارے موجودہ زمانہ کے وسائل ہر جگہ بکثرت مہیا ہیں مگر اس کے باوجود دھرتی کے دور دراز افریقی ممالک میں ایسے لوگ ہیں جو مکان نہیں بناتے، اور لباس بھی استعمال نہیں کرتے ہیں، ان پر جہالت اور حیوانیت کا پورا غلبہ ہے، اور وہ نہایت کسمپرسی کے عالم میں رہ کر زندگی گزار رہے ہیں۔

﴿كَذٰلِكَ وَقَدۡ اَحَطۡنَا بِمَا لَدَيۡهِ خُبۡرًا﴾ یہ قصہ اسی طرح واقعی ہے، اور ذوالقرنین کے پاس جو کچھ

سامان وغیرہ تھا اور ان کو جو حالات پیش آئے ہم کو اس کی پوری خبر ہے، ذوالقرنین نے جس قوم کو مشرق کے آخری حصے میں پایا قرآن کریم میں ان کے بارے میں یہ نہیں بتایا کہ وہ مؤمن تھے یا کافر تھے، اور نہ یہ بتایا کہ ان کے ساتھ ذوالقرنین نے کیا معاملہ کیا، اگر یہ کافر تھے تو بظاہر ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا ہوگا، جو کہ مغرب کی جانب رہنے والوں کے ساتھ کیا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

......❁......❁......❁......

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ۝۹۲ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ
قَوْلًا ۝۹۳ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا
عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ۝۹۴ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ
بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ۝۹۵ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ۭ حَتّٰٓى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ۭ
حَتّٰٓى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْٓ اُفْرِغْ عَلَيْهِ قِطْرًا ۝۹۶ فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا
لَهٗ نَقْبًا ۝۹۷ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَاۗءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّاۗءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ۝۹۸

ترجمہ: وہ پھر ایک راہ پر چلا ۝۹۲ یہاں تک کہ ایسی جگہ پر پہنچ گیا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھی، ان پہاڑوں سے ورے اس نے ایسی قوم کو پایا جو بات سمجھنے کے قریب بھی نہ تھی ۝۹۳ وہ کہنے لگے کہ اے ذوالقرنین! بلاشبہ یاجوج وماجوج زمین میں فساد مچاتے ہیں، سو کیا یہ ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کے لئے اس شرط پر کچھ مال جمع کردیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان ایک آڑ بنادیں؟ ۝۹۴ ذوالقرنین نے جواب دیا کہ میرے ربّ نے جو کچھ اختیار واقتدار عطا فرمایا ہے وہ بہتر ہے سو تم قوت کے ساتھ میری مدد کرو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک موٹی دیوار بنادوں گا ۝۹۵ میرے پاس لوہے کے ٹکڑے لے آؤ، یہاں تک کہ جب دونوں سروں کے درمیان کو برابر کردیا تو حکم دیا کہ اس کو دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو آگ بنادیا ۝۹۶ تو ان سے کہا کہ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ تاکہ میں اس پر ڈال دوں۔ سو وہ لوگ نہ چڑھ سکے، اور نہ اس میں سوراخ کرسکے ۝۹۷ ذوالقرنین نے کہا کہ یہ میرے ربّ کی طرف سے ایک رحمت ہے، سو جب میرے ربّ کا وعدہ آجائے گا تو اس کو چورہ چورہ کردے گا، اور میرے ربّ کا وعدہ حق ہے ۝۹۸

☆☆☆

معارف ومنازل

ذوالقرنین کا تیسرا سفر:

﴿ثُمَّ أَتْبَعَ سَبَبًا﴾ مشرق کے مہم سے فارغ ہونے کے بعد شمال کی طرف بڑھے چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے جو دواونچے پہاڑوں کے درمیان تھا (یعنی بین السدین، أي بين الجبلين) اور یہ دونوں سدّ ین یعنی دو پہاڑ اونچے تھے، ان کے درمیان خالی جگہ تھی، ان دونوں کے درمیانی درہ سے یاجوج ماجوج حملہ آور ہوتے تھے، ان پہاڑوں سے آگے ایک ایسی قوم کو دیکھا جو کسی بات کے سمجھنے میں کوئی اقدام نہیں کرسکتی، پھر شاید کسی ترجمان کے ذریعہ انہوں نے اپنی بیکسی اور یاجوج ماجوج کی سرکشی سے ذوالقرنین کو سمجھایا اور بتایا ہوگا، چنانچہ وہ لوگ ذوالقرنین کی شان وشوکت اور لشکر وسپاہ کو دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے، اور انہیں اپنے لئے نجات دہندہ سمجھ کر درخواست پیش کی کہ اے ذوالقرنین! یاجوج ماجوج زمین میں فساد مچاتے ہیں، یہ لوگ اس گھاٹی سے اُس طرف رہتے ہیں اور ہم پر حملہ آور ہوکر تباہی کرتے ہیں، قتل وغارتگری کرتے ہیں، اور ہم لوگ ان کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، اور تعداد میں بہت زیادہ ہیں، تو کیا آپ ایسا کرسکتے ہیں کہ ہم آپ کے لئے مال جمع کردیں اور اس شرط پر آپ کو دیدیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان روکنے والی ایک آڑ (دیوار) بنادیں؟ تاکہ وہ ہماری طرف نہ آسکیں۔

فائدہ نمبر (۱):

یہ لوگ اگرچہ بول چال میں پسماندہ تھے مگر عقل وسوچ میں بڑے ہی سنجیدہ تھے، کیونکہ انہوں سے سوچ کر ذوالقرنین کو سدّ بنانے کا مشورہ دیا، اور مالدار بھی تھے، تب تو انہوں نے مال جمع کرنے اور مال اکٹھا کرنے کی پیشکش کی، ذوالقرنین ان کی خواہش پوری کرنے پر آمادہ ہوئے، اور انہیں معلوم تھا کہ یہ کوئی مختصر ادنیٰ کام نہیں کہ ایک درے پہاڑوں برابر اونچا وبلند کرنا اور پہاڑوں کی مانند مضبوط ومحکم کرنا یہ نہایت سخت کام ہے، مگر ضرور انہیں اللہ تعالیٰ کا حکم ہوچکا ہوگا، اور ان کی نصرت وتائیدا سے حاصل رہی ہوگی کہ اتنے بڑے پیچیدہ کام پر وہ آمادہ بلکہ تیار ہوئے۔

فائدہ نمبر (۲):

بعض اصحاب باطن نے فرمایا کہ یاجوج ماجوج کے سامنے بند باندھنا اور انہیں ہمیشہ کے لئے محصور کرنا صرف ان لوگوں کے لئے نہ تھا، کیونکہ ذوالقرنین جیسے عظیم بادشاہ انہیں وہاں سے منتقل کرکے کسی دوسرے مقام پر بھی

آباد کر سکتے تھے، بلکہ ذوالقرنین کو منجانب اللہ یہی حکم ہوا تھا کہ یہاں بند باندھ کر پورے جہاں کو اس سرکش قوم کے قتل وغارتگری سے تحفظ دیدو، اس کا فائدہ ابھی بھی دنیا والوں کی نظر میں ہے، وہ یہ کہ اس سدّ ذوالقرنین کی برکت ہے کہ آج سارا جہاں محفوظ ہے، اگر یہ سدّ نہ ہوتا تو یاجوج ماجوج پورے عالم کو تباہ کر کے رکھ دیتے۔ واللہ اعلم

ذوالقرنین نے دیوار کو کس طرح اور کس چیز سے بنایا؟

حضرت ذوالقرنین نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ مال جمع کرنے کی ضرورت نہیں، مجھے میرے ربّ نے جو اختیار واقتدار عطا فرمایا ہے جس میں مالی تصرفات بھی شامل ہیں ﴿وَاٰتَیْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ سَبَبًا﴾ اس پر گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت کچھ اور سب کچھ عطا فرمایا تھا۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ تم اپنے ہاتھ پاؤں کی طاقت یعنی محنت وہمت کے ذریعہ میری مدد کرو، میں تمہارے اور تمہارے دشمن کے درمیان ایک مضبوط ناقابل تسخیر آڑ بناؤں گا، تم ایسا کرو کہ لوہے کے ٹکڑے جمع کر کے لاؤ، چنانچہ لوہے کے ٹکڑے جمع کر کے ان کی چنائی کی کہ اوپر نیچے لوہے اور ان کے درمیان میں لکڑی اور کوئلے رکھتے چلے گئے، یہاں تک کہ دونوں پہاڑوں کے درمیانی خالی حصے کو موٹائی اور اونچائی میں پہاڑوں کے برابر کر دیا تو حکم دیا کہ اب خوب دھونکو۔

صاحب جلالین لکھتے ہیں کہ پھونکنے کے آلات رکھ دیئے گئے، اور چاروں طرف آگ لگا دی گئی، چنانچہ لوگوں نے دھونکنا شروع کیا، اور اتنا متواتر بکثرت دھونکا کہ وہ لوہا سرخ ہو کر آگ بن گیا، اندر کی لکڑیاں اور کوئلہ تو جل گیا، اور لوہے کے ٹکڑے آگ کی طرح لال ہو کر آپس میں یکجان ہو کر جڑ گئے۔ مضبوط دیوار کے لئے تو یہی کافی تھا، لیکن مزید مضبوطی کے لئے یہ کیا کہ تانبا طلب کیا، اور ان لوگوں سے فرمایا کہ میرے پاس تانبا لے آؤ تاکہ میں تانبے کو اس پر پگھلا کر ڈال دوں، چنانچہ پگھلا ہوا تانبا اس لوہے پر ڈال دیا جیسا کہ اس کو پلستر کیا جائے۔ پہلے تو دیوار اور لوہا خود ہی جام ہو کر ایک جان بن گئے، پھر اس لوہے کی دیوار پر پگھلا ہوا تانبا ڈال دیا گیا جو لوہے کے ٹکڑوں کے اندر بچی کھچی جگہوں میں داخل ہو گیا، اور یہ دیوار اس طرح مضبوط ہو گئی کہ مضبوط پہاڑ اس کے مقابلہ میں کچھ نہ ہو۔

اس دیوار کی بلندی، موٹائی، پختگی، مضبوطی اور شیشے کی طرح صفائی و پلستر کی کیفیت اس طرح ہو گئی کہ یاجوج ماجوج نہ اس پر چڑھ سکے، اور نہ اس پر نقب لگا سکے، جو رہتی دنیا تک کار آمد رہی۔ ہاں! نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ربّ العزّت سبحانہ کے حکم کے ساتھ چورہ چورہ ہو جائے گی، اور یاجوج ماجوج نکل کر پورے عالم میں شر وفساد کے ذریعہ تباہی مچائیں گے، جیسا کہ احادیث میں اس کا بیان ہے۔

جب ذوالقرنین نے یہ پہاڑ نما تاریخی اور بے مثال دیوار کی تعمیر سے فارغ ہوئے تو فرمایا:

﴿هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ﴾ یہ میرے ربّ کی طرف سے ایک بڑی رحمت ہے، اس بڑی دیوار کی تیاری مجھ پر اللہ تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے جو میرے ہاتھ سے مکمل ہوئی، اور یہاں کے لوگوں کے لئے نیز آئندہ پورے عالم کے لئے بھی ایک بڑی رحمت ہے، کیونکہ بدترین لوگوں (یاجوج ماجوج) کی شرارت وفساد سے سب کے لئے تحفظ کا ذریعہ ہے۔ البتہ:

﴿فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا﴾ سو جب میرے ربّ کا وعدہ آپہنچے گا تو میرا ربّ اسے وقت موعود کے آنے پر چورا چورا بنادے گا، اور میرے ربّ کا وعدہ سچا ہے کہ قرب قیامت کے ساتھ یہ سارے اسباب فنا وتباہی سے ہمکنار ہوجائیں گے۔ پہلے یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا جس سے یہ دیوار چورا چورا ہوکر زمین کے ساتھ ہموار ہوجائے گی، پھر کچھ عرصہ بعد نفخ صور کے ساتھ سارا جہاں ریزہ ریزہ ہوکر فنا ہوجائے گا۔ یاجوج ماجوج اور نفخ صور کی درمیانی مدّت چالیس سال کا فاصلہ ہوگا۔ یاجوج ماجوج کا نکلنا قیامت کی علامات میں سے ہے، جیسا کہ سورۂ انبیاء میں ہے، فرمایا: ﴿حَتّٰٓى اِذَا فُتِحَتْ يَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ﴾ [الأنبياء:٩٦] (یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے، اور وہ ہر بلندی سے جلدی جلدی تیزی کے ساتھ دوڑتے ہوئے نکل پڑیں گے)۔ صحیح مسلم (جلد ٢ میں مشہور روایت ہے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بلاشبہ قیامت اس وقت تک قائم نہ ہوگی جب تک ان دس علامات کا ظہور نہ ہوجائے۔

(١) مشرق میں لوگوں کے زمین میں دھنس جانے کا واقعہ پیش آنا۔

(٢) اسی طرح مغرب میں زمین میں لوگوں کے دھنس جانے کا واقعہ پیش آنا۔

(٣) جزیرۂ عرب میں لوگوں کے دھنس جانے کا واقعہ پیش آنا۔

(٤) ایک بہت بڑا دھواں ظاہر ہونا اور پھیل جانا۔

(٥) دجال اکبر کا نکلنا اصفہان یعنی شام وعراق کے درمیان سے۔

(٦) دابة الأرض کا ظہور یہ ایک خاص قسم کا عجیب جانور ہے۔

(٧) یاجوج ماجوج کا خروج اور پھیل جانا، یہ آنے والا ہے۔

(٨) مغرب کی طرف سے سورج کا نکلنا اور توبہ کا دروازہ بند ہونا۔

(۹) قعر عدن سے ایک آگ کا نکلنا (عدن یمن کی مشہور بندرگاہ)۔

(۱۰) سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جامع دمشق پر آسمانوں سے نازل ہونا۔

یاجوج وماجوج کون ہیں، اور کہاں ہیں؟

یاجوج ماجوج عجمی لفظ ہیں، یہ اصل میں یاگوگ وماگوگ تھے، عربوں نے گاف کو جیم سے بدل کیا، اور یاجوج وماجوج پڑھا۔ قرآن کریم کا نزول بھی جیم کے ساتھ ہے، اس کا لفظی معنی ہے: آگ کا شعلہ، بھڑک، شرارہ۔ یہ غیر مسلم پختہ کافر ہیں۔ صاحب معالم اور دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ یاجوج وماجوج یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے ہیں۔ حضرت قتادہ اور بہت سے علماء ومؤرخین نے کہا ہے کہ یاجوج ماجوج کے بہت سے قبائل ہیں، جن کی تعداد تقریباً ۲۲ ہے۔ سدّ ذوالقرنین کے پیچھے ۲۱ قبائل ہیں، جبکہ سدّ سے اس طرف ایک قبیلہ ہے اسی کو ترک کہتے ہیں، یہ موجودہ مسلمان ملک ترکی کے علاوہ ہے، وہ شمالی علاقوں میں آباد ہے، چین، روس اور منگولیا وغیرہ میں منتشر ہے۔

اہل تاریخ نے لکھا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹے تھے: سام، حام، یافث، سارے عرب فارس اور ہند اور روم سام کی نسل سے ہیں، اور حام کی نسل حبش، زنج اور سیاہ فام افریقہ کے لوگ ہیں، اور یافث کی نسل سے صقلابیہ، خزر، ترک اور یاجوج اور ماجوج ہیں۔

یاجوج وماجوج کی تعداد دوگنتی:

صحیح بخاری کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یاجوج وماجوج کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ حدیث یہ ہے کہ قیامت کے دن حضرت آدم علیہ السلام سے ربّ العٰلمین سبحانہ وتعالیٰ کا ارشاد ہوگا کہ اپنی ذریت میں سے دوزخ کا حصہ الگ کردو، وہ عرض کریں گے کہ وہ کتنا حصہ ہے؟ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہوگا کہ ہر ہزار میں سے نوسوننانوے دوزخ کے لئے نکالو (مطلب یہ ہے کہ ہزار میں جنتی ایک ہوگا، اور دوزخی نوسوننانوے ہوں گے) یہ سن کر بچے بوڑھے ہوں گے، اور عورتوں کے حمل ساقط ہوجائیں گے (یعنی فرض کرو اگر وہاں بچے ہوں توغم وپریشانی کی شدت سے بوڑھے ہوں، اگر حاملہ ہوں تو ان کا حمل ساقط ہوجائے)۔ اور عام لوگوں کا یہ حال ہوگا کہ وہ بیہوش معلوم ہوں گے، لیکن بیہوش نہیں ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہوگا۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہزار میں سے جو ایک جنتی ہوگا وہ ہم میں سے کون کون ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم خوشخبری قبول کرلو، کیونکہ (تمہارے اور یاجوج وماجوج کے درمیان تعداد کا تناسب

یوں ہوگا) کہ تم میں سے ایک شخص اور یاجوج وماجوج میں سے ہزار شخص ہوں گے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی مرفوع روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یاجوج ایک الگ قوم ہے، اور ماجوج دوسری قوم ہے، ہر ایک کی تعداد چارسو ہزار (چار لاکھ) ہے، وہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، ان میں سے کوئی بھی اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اپنی پشت سے پیدا شدہ ایک ہزار آدمی ایسے نہ دیکھ لے جو ہتھیار اٹھانے کے قابل ہوں (یعنی جوان ہوں) یہ لوگ غیر آباد دنیا کی طرف پھیلتے جائیں گے۔

میں کہتا ہوں: شاید حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جب ذوالقرنین نے دیوار بنوائی تھی اور یاجوج وماجوج کی ادھر آنے سے بندش کردی تھی تو اس وقت ان کے دو گروہ تھے، ہر گروہ کی تعداد چار لاکھ تک پہنچ چکی تھی، اس کے بعد کتنی ہوگئی تو ظاہر ہے کہ جب ہر شخص اپنی نسل کے ایک ہزار آدمی چھوڑ کر مرتا ہے تو ان کی گنتی کون کرسکتا ہے؟ [مظہری]

یاجوج وماجوج کہاں ہیں؟

مؤرخ ابن خلدون پانچویں اقلیم کے نویں حصے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس حصے میں ترکی قبائل کے شہر ہیں، جوغز کے شہروں کے مغرب میں، اور کیما کے شہروں کے مشرق میں ہیں، اور مشرق کی جانب سے جبل قوقیا (کوہ قاف) اس کو گھیرے ہوئے ہے، جو یاجوج وماجوج کا احاطہ کئے ہوئے ہے، پھر چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ جزو چھٹی اقلیم کے نویں حصے تک چلا گیا ہے، اور وہیں پر سد ذوالقرنین ہے، جیسا کہ ہم ذکر کریں گے، اور اس میں سے ایک ٹکڑا باقی رہ گیا ہے جسے کوہ قوقیا (کوہ قاف) نے احاطہ کررکھا ہے، جو اس جزو کے زاویہ شرقیہ شمالیہ کے قریب ہے، اور جنوب کی طرف درازی میں چلا گیا ہے، اور یہ یاجوج وماجوج کے بلاد ہیں۔

پھر لکھا ہے کہ اسی پانچویں اقلیم کے دسویں حصے میں یاجوج ماجوج کی سرزمین ہے جو اس سے متصل ہے، پھر ساتویں اقلیم کے اجزاء بتاتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس نویں حصے میں غربی جانب خفشاح کے بلاد ہیں، اور ان کو قفجق کہا جاتا ہے، اور اس کے درمیان میں یاجوج ماجوج کی دیوار ہے، اور اسی جزو کے شرقی کونے میں یاجوج ماجوج کی سرزمین ہے، جو سمندر کے کنارے کوہ قوقیا کے پیچھے ہے، اس کا عرض کم ہے درازی زیادہ ہے، جبل قوقیا کا مشرق اور شمال کی جانب سے احاطہ کررکھا ہے۔ ابن خلدون کی تصریح سے یاجوج ماجوج کا علاقہ اور سدّ ذوالقرنین کا کچھ اتا پتا لگ سکتا ہے۔

سدّ ذوالقرنین کہاں ہے؟

مؤرخین نے لکھا ہے کہ یاجوج ماجوج کے فساد اور شرارتوں اور دیگر اقوام پر حملہ کرنے کے واقعات برابر پیش آتے رہتے تھے، ان کے شر سے بچنے کے لئے ایک سے زیادہ دیواریں بنائی گئیں، ان میں سے زیادہ مشہور دیوار چین ہے، اس کا بانی فغفور چین کا بادشاہ بتایا جاتا ہے، اور اس کی لمبائی بارہ سو میل ہے، لیکن دیوار چین وہ دیوار نہیں ہے جو ذوالقرنین نے بنائی تھی، اس کے بارے میں تو تصریح ہے کہ لوہے اور تانبے سے بنائی گئی، اور دیوار چین میں یہ بات نہیں ہے۔

دوسری دیوار وسط ایشیا میں بخارا اور ترمذ کے قریب واقع ہے، اس کے محل وقوع کا نام دربند ہے۔

تیسری دیوار داغستان میں واقع ہے، یہ دربند اور باب الابواب کے نام سے مشہور ہے۔

چوتھی دیوار قفقاز یا کوہ قوقیا کے قریب ہے، جیسا کہ ابن خلدون کے بیان سے معلوم ہوا۔ بعض اہل تاریخ کا رجحان اس طرف ہے کہ یہی ذوالقرنین کی بنائی ہوئی دیوار ہے۔ محقق العصر حافظ الحدیث مؤرخ کبیر علامہ سید انور شاہ کشمیری قدس سرہ نے اپنی منفرد مایہ ناز کتاب **عقيدة الإسلام في حياة عيسىٰ عليه السلام** میں اسی کو ترجیح دی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ جو دیوار لوہے اور تانبے کی بنی ہوئی نہیں ہے وہ بہر حال حضرت ذوالقرنین کی بنائی ہوئی نہیں ہے۔ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں سدّ یاجوج ماجوج کا عنوان قائم کیا ہے، اور اس میں تین صفحات خرچ کئے ہیں، اور بہت سی عجیب باتیں لکھی ہیں، اور یہ بھی لکھا ہے کہ خلیفہ عباسی واثق باللہ نے سلام کو اور پچاس آدمیوں کو ان کے ہمراہ بھیجا اور پچاس ہزار دینار بھی دیئے، راستے میں فلک الحرز نے پانچ رہبر ساتھ کر دیئے، چلتے چلتے ایسی جگہ پر پہنچے جہاں ایک چکنا پہاڑ تھا، اور اس کے درمیان ایک ایسی وادی کا درہ تھا جن کا چوڑاؤ ایک سو پچاس ہاتھ تھا، وہاں ایک دیوار بنی ہوئی تھی جس نے وادی کے دونوں جانب کو ملا رکھا تھا، اور یہ دیوار لوہے کی اینٹوں کی تھی جو تانبے کے اندر غائب کی ہوئی تھی، اس کی اونچائی پچاس ہاتھ تھی، اور وہاں ایک لوہے کا دروازہ بھی تھا جس پر قفل پڑا ہوا تھا، وہاں سے یہ لوگ شہر سُرَّ مَنْ رَاٰی تک واپس آ گئے۔

یہ ان کا آٹھ ماہ کا سفر تھا، یہ ساری باتیں لکھنے کے بعد علامہ یاقوت لکھتے ہیں: میں نے سدّ ذوالقرنین کے بارے میں وہ لکھ دیا ہے جو کتابوں میں لکھا ہوا پایا، اور اس میں سے میں کسی چیز کے صحیح ہونے کے بارے میں یقین نہیں کرتا، کیونکہ روایات مختلف ہیں، اور صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سدّ ذوالقرنین موجود ہے، اس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ مفسر و مؤرخ ابن کثیر

نے بھی واثق باللہ خلیفہ کے بھیجے ہوئے اس وفد کا ذکر کیا ہے، اور مؤرخ ابن خلدون نے بھی اس واقعہ کے طرف اشارہ کیا ہے، لیکن صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ: ثِقَاتُ الْمُؤَرِخِينَ عَلىٰ تَضْعِيفِهٖ۔ معتمد مؤرخین نے اس کی تضعیف کی ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک یہ قصہ جھوٹ ہے، کیونکہ اس میں دو باتیں ہیں جو آیت کریمہ کی تصریح کے موافق نہیں ہیں جیسا کہ تفصیلی طور پر واقفیت رکھنے والے پر پوشیدہ نہیں، دور حاضر کے غیر مسلم مؤلفین جو ریسرچ کے نام سے کچھ نہ کچھ مخلوقات کی ٹوہ (معلومات) لگاتے ہیں، اور جتنا معلوم ہو جائے اس کے علاوہ باقی کی نفی کرتے ہیں، یہ ان لوگوں کی جہالت ہے اور تعصب بھی، ان کا یہ کہنا کہ ہم دریا اور خشکی میں سب جگہ پھر چکے ہیں ہمیں یہ دیوار نہیں ملی تو پھر اس سے دیوار مذکور کا موجود نہ ہونا لازم نہیں آتا، میں کہتا ہوں کہ ایک حد تک ان کی بات درست بھی ہے جیسا کہ ہم نے کئی مرتبہ تصریح کی ہے کہ جن چند چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے پردۂ خفاء میں رکھا ہے وہاں تک انسانوں کی رسائی ممکن نہیں، انہی میں سے ایک یہی سدّ ذو القرنین بھی ہے۔

فائدہ نمبر (۳):

دیوار مذکور کہاں ہے؟ اور یاجوج کا کونسا علاقہ ہے؟ اس کے جاننے پر کوئی اسلامی عقیدہ موقوف نہیں، اور قرآن کریم کی کسی آیت کا سمجھنا بھی اس پر موقوف نہیں ہے، اسی وجہ سے قرآن مجید نہایت اجمال کے ساتھ چند چیزوں پر روشنی ڈال کر اس پر ایمان لانے کا حکم دیتا ہے، جیسا کہ ابھی اصحاب کہف کے واقعہ سے معلوم ہوا۔ ہمارا کام صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات پر ایمان لانا اور تصدیق کرنا ہے، جیسا کہ متشابہات کے بیان میں گزرا۔

فائدہ:

﴿وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِينَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا﴾ [الاسراء:١٥] (اور ہم عذاب دینے والے نہیں ہیں یہاں تک کہ رسول بھیجے) کے بموجب ہم کہتے ہیں کہ یاجوج و ماجوج کے پاس بھی ضرور رسول یا رسولوں کے نمائندے آئے ہوں گے، جیسے ارشاد: ﴿وَلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ﴾ [الرعد:۷] (اور ہر قوم کے لیے ایک راہنمائی کرنے والا ہے)۔ اور انہوں نے تکذیب کی ہوگی، تب تو وہ اپنے کفر اور تکذیب کی وجہ سے عذاب کے مستحق ہوں گے۔ والعلم عند اللہ العلیم الخبیر

اس کے ساتھ قرآن کریم جن زوردار الفاظ کے ساتھ تمام قوموں کے لئے جس عموم کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی عمومی بعثت کا تذکرہ فرمایا ہے وہ قابلِ غور ہے، فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ﴾ [فاطر: ۲۴] (اور کوئی ایسی امت نہیں جس میں کوئی ڈرانے والا نہ ہو)۔ اسی طرح سورۂ نحل میں ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا﴾ [النحل: ۳۶] (اور ہم نے ہر امت میں رسول بھیجا ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ اقوامِ عالم میں کوئی ایسی قوم نہیں کہ جن میں انبیاء علیہم السلام کی بعثت نہ ہوئی ہو، یا ان کے نائبین کا وہاں نزول اور ورود نہ ہوا ہو، یہ عموم خود فیصلہ کنندہ ہے کہ اگر یاجوج ماجوج میں انبیاء علیہم السلام نہیں آئے تو ان کے نائبین ضرور آئے، اور توحید کی تعلیم و ہدایت بتا گئے۔ واللہ اعلم

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا ﴿۱۰۰﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿۱۰۱﴾

ترجمہ: پھر ہم اس دن ان کو چھوڑ دیں گے بعض بعض میں گھستے رہیں گے، اور صور پھونکا جائے گا، سو ہم سب ہی کو جمع کر لیں گے ﴿۹۹﴾ اور اس دن ہم کافروں کے سامنے دوزخ پیش کر دیں گے ﴿۱۰۰﴾ جن کی آنکھوں پر میری یاد سے پردہ پڑا ہوا تھا اور وہ سن بھی نہ سکتے تھے ﴿۱۰۱﴾

معارف ومنازل

یہاں "بَعْضَهُمْ" سے اکثر مفسرین نے یاجوج ماجوج مراد لیا ہے، تو مطلب یہ ہے کہ ہم اس دن یاجوج ماجوج کو اس حال میں چھوڑیں گے کہ وہ جہالت اور عددی کثرت کی وجہ سے ایک دوسرے میں گھستے رہیں گے، یعنی قیامت سے پہلے یاجوج ماجوج جب سدّ ذوالقرنین کو توڑ کر ہجوم کی صورت میں نکلنے کی کوشش کریں گے تو پانی کی موجوں کی طرح آپس میں ٹکرائیں گے، اور ایک دوسرے میں گھستے چلے جائیں گے، گڈمڈ ہو جائیں گے، اور پوری دنیا میں پھیل جائیں گے، جہاں جہاں سے گزر جائیں گے آگ کی طرح علاقوں کو جلا کر بھسم کر لیں گے۔

یہ سب کچھ وقوعِ قیامت اور نفخِ صور سے چالیس سال پہلے ہوگا، جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام قتلِ دجال سے فارغ ہو جائیں گے۔ لیکن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ آیت کے مصداق میں تمام لوگ اور پوری

خلقت شامل ہے، بشمولِ جن وانس کہ اُن پر قیامت قائم ہوگی، تو مطلب یہ ہوگا کہ قیامت کے ہولناک منظر کو دیکھ کر سارے انس وجن خوف و پریشانی کے عالم میں گڈمڈ ہوجائیں گے، اور آپس میں ٹکرائیں گے۔ بہر حال دونوں معنی درست ہیں، اور کوئی تعارض نہیں ہوگا، پہلا معنی خاص ہے، دوسرا عام، اور خاص عام میں اکثر داخل ہی ہوتا ہے۔

﴿وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا﴾ اور صور پھونک دیا جائے گا سو ہم ان سب کو جمع کریں گے۔

﴿وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا﴾ اور ہم اس دن جہنم کو کافروں کے سامنے پیش کردیں گے۔

﴿الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ﴾ جن کی آنکھوں پر میری یاد سے پردہ پڑا ہوا تھا۔

﴿وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا﴾ اور وہ سن بھی نہ سکتے تھے۔ ذوالقرنین کے واقعہ کو پوری تفصیل سے بیان کرنے پر چاہیے تھا کہ مشرکین مکہ اور انہیں سمجھانے والے یہودی علماء سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرکے اسلام قبول کرلیتے کہ ان کے تینوں سوالات کے جوابات بہتر انداز میں حق کے ساتھ واضح ہوگئے، لیکن ان کے قلوب ناکارہ رہے، اور ان کے کان بہرے ہیں، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، وہ کہاں ایمان لائیں گے۔

❁ ❁ ❁

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾
قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ
اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ
لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾

ترجمہ: سو کیا پھر بھی کافروں کو یہ خیال ہے کہ مجھے چھوڑ کر میرے بندوں کو کارساز بنالیں؟ بلاشبہ ہم نے کافروں کے لئے دوزخ کو مہمانی کے طور پر تیار کر رکھا ہے ﴿١٠٢﴾ آپ فرمادیجئے: کیا تمہیں ہم ایسے لوگ بتادیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں؟ ﴿١٠٣﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوشش دنیاوی زندگی میں ضائع ہوگئی، اور وہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں ﴿١٠٤﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے ربّ کی آیات کا اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، سو ان کے اعمال حبط ہوگئے، سو ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن نہیں کریں گے ﴿١٠٥﴾ یہ ان کی سزا ہوگی، یعنی

دوزخ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں کا اور میرے رسولوں کا مذاق بنالیا﴿١٠٦﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

ابتدائے سورت سے یہاں تک اللہ تعالیٰ کے نیک اور شکر گزار بندوں کا تذکرہ ہوا، جن کے اعمال اللہ تعالیٰ کے حکموں کے مطابق تھے جو کہ انہیں قیامت کے دن کام آئیں گے، اب ایسے نافرماں وناشکرے لوگوں کا بیان ہے جن کے سارے اعمال شیطانی ہیں، اور روزِ قیامت ان کے سارے اعمال اکارت ہو کر ضائع ہو جائیں گے، کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل خواہ وہ پہاڑوں جتنا ہو کارآمد نہیں ہوگا، بلکہ ضائع ہو کر سبب حسرت اور پریشانی کا باعث بنے گا، تو فرمایا:

﴿اَفَحَسِبَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَنْ یَّتَّخِذُوْا عِبَادِیْ مِنْ دُوْنِیْۤ اَوْلِیَآءَ﴾ سو کیا پھر بھی ان کافروں کا خیال ہے کہ مجھ کو چھوڑ کر میرے بندوں کو اپنا کارساز (یعنی معبود وحاجت روا) قرار دیں؟ یہ بہت ہی بڑا ظلم ہی ہوگا۔

عِبَادِیْ سے مراد فرشتے، حضرت عیسیٰ وحضرت عزیر علیہم السلام ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: وہ شیطان مراد ہیں جن کی اطاعت اللہ تعالیٰ سبحانہ کے سوا کفار کرتے ہیں۔ مقاتلؒ کے نزدیک بت مراد ہیں، سورۂ اعراف آیت نمبر ١٩٤ میں ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ [الأعراف: ١٩٤] (جن معبودوں کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہو وہ تمہاری طرح کی عاجز مخلوق ہیں)۔

اَوْلِیَآءَ یعنی کارساز، مشکل کشا، حاجت روا، شفاعت کرنے والے۔ استفہام انکاری ہے، یعنی جیسا کافر لوگ خیال کرتے ہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ ان کے معبود قیامت کے دن ان کے دشمن بنیں گے، اور ان سے بیزاری کا اظہار کریں گے۔

﴿اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِیْنَ نُزُلًا﴾ ہم نے تو ان کافروں کی مہمانی اور دعوت کے لئے دوزخ کو تیار کر رکھا ہے، وہاں انہیں ماءِ غسلین اور ماءِ حمیم پلایا جائے گا، اور زقوم کی خوراک پیش کی جائے گی۔

نُزُل دراصل جنت والوں کی مہمانی کا نام ہے، یہاں استہزاء کے طور پر ہے، جیسے سورۂ دخان میں: ﴿ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ﴾ [الدخان: ٤٩] یعنی چکھو جہنم کا عذاب تم تو بڑے قابل قدر وزیر یا بادشاہ یا چوہدری ہو۔

﴿قُلۡ هَلۡ نُنَبِّئُكُم بِٱلۡأَخۡسَرِينَ أَعۡمَٰلًا﴾ تا ﴿يُحۡسِنُونَ صُنۡعًا﴾ تک۔

آپ فرما دیجئے: کیا ہم تم کو بتائیں کہ اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹے (خسارے) میں کون لوگ ہوں گے؟ سب سے زیادہ خسارے میں وہ لوگ ہوں گے کہ دنیوی زندگی میں کی ہوئی ان کی ساری کوششیں (اکارت اور رائیگاں) جائیں گی، اور وہ یہی سمجھتے رہتے ہیں کہ ہم اچھے کام کر رہے ہیں۔ حضرت ابن عباس اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم نے فرمایا: آیت میں سے زیادہ خسارہ پانے والے عیسائی اور یہودی ہوں گے، جو اپنے اپنے گروہ کو حق پر سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کی شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔ سورۂ غاشیہ میں فرمایا: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ تَصۡلَىٰ نَارًا حَامِيَةً﴾ [الغاشية: ۴] (عمل کرنے والے تھکن سے چور دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے)۔

ساری زندگی عمل کر کر کے تھک گئے مگر انجام کار دوزخ میں ڈوب گئے، اسی قسم کے اور بہت سارے بدعتی، پیر پرست، قبر پرست، بدعقیدہ لوگ بھی ہیں، انہیں دیکھو، شب و روز عبادت میں مشغول ہیں مگر شرکیہ اعمال اور بدعقیدگی کی وجہ سے ان کے اعمال ضائع ہو جائیں گے، اور جہنم میں ڈالے جائیں گے، جیسے ہمارے زمانے کے عرس منانے والے۔ بہر حال جادۂ شریعت اور قرآن وسنت اور عقائد و اعمال اہل سنت والجماعت کے خلاف جو بھی فرقہ ہو آیت کا عموم سب کو شامل ہے۔

﴿أُوْلَٰٓئِكَ ٱلَّذِينَ كَفَرُواْ بِـَٔايَٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهِۦ فَحَبِطَتۡ أَعۡمَٰلُهُمۡ﴾ یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے اپنے رب کی آیات اور اس کی ملاقات کا انکار کیا، یعنی قیامت کے منکر رہے، دوبارہ زندہ ہونے کے منکر رہے، اور اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حضور پیش ہونے کا بھی انکار کیا۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہوشیار آدمی وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنے حکم کا تابع رکھا، اور مرنے کے بعد والی زندگی کے لئے کام کیا، اور بے عقل وہ آدمی ہے جو نفس کا پیرو رہا، اور اللہ تعالیٰ پر جھوٹی آرزومندی کی، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں پر بھروسہ کیا، اور اس کی قہاریت وغضب کو نظر انداز کر دیا۔

[أحمد، ترمذي، حاكم، ابن ماجة عن انس رضي الله عنه]

اگر آیت میں عیسائی اور یہودی مراد ہوں یا دیگر فرقے تو آیات رب اور ملاقاتِ رب کے انکار کا یہ مطلب ہوگا کہ اگرچہ یہ لوگ قیامت کا اقرار تو کرتے ہیں مگر قیامت کی جو واقعی تشریح ہے اس کے منکر ہیں، یا وہ اپنے گروہ کے لئے عذاب کے منکر ہیں، جیسا کہ ان کے خیالات اسی قسم کے ہیں۔

﴿فَلَا نُقِيمُ لَهُمۡ يَوۡمَ ٱلۡقِيَٰمَةِ وَزۡنًا﴾ سو ہم قیامت کے دن ان کے لئے کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔

محدثین مفسرینؒ حضرات نے اس کا ایک مطلب تو یہ بتایا ہے کہ ان لوگوں کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر ومنزلت نہ ہوگی، اور نہ ان کے اعمال کی اہمیت ہوگی۔ اور بعض علماء کرام نے یہ مطلب بتایا ہے کہ ان کے لئے ترازو ہی نصب نہیں کی جائے گی، یعنی ان لوگوں کے اعمال تولے ہی نہیں جائیں گے، اور وہ بغیر حساب کے دوزخ میں چلے جائیں گے، کیونکہ ترازو کے دوسرے پلڑے میں جب نیکیاں کچھ نہ ہوں تو تولنے کا فائدہ نہ ہوگا۔ مگر محققین کی رائے یہ ہے کہ اتمامِ حجت کے لئے بھی اور اس مقصد کے لئے بھی کہ سارے کفار کے برے اعمال ایک جیسے برابر نہیں، اور ان کا عذاب بھی ایک جیسا نہیں، لہٰذا ان کے اعمال کا وزن ہوگا، یہاں تک کہ شدّت عذاب وخفت عذاب کا تعین ہو، اور یہ وزن اعمال ہی پر موقوف ہے۔ کیا فرعون جیسے مدّعی اُلوہیت کا عذاب عام کافر جیسا ہوگا؟

بعض علماء کہتے ہیں کہ اعمال اور صاحب اعمال دونوں کا الگ الگ وزن ہوگا، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بڑے موٹے تازے لوگ (اَلْعَظِیْمُ السَّمِیْنُ کَالسَّلَاطِیْنِ وَغَیْرِھِمْ) جن کا وزن اللہ تعالیٰ سبحانہ کے نزدیک مچھر کے پر کے برابر بھی نہ ہوگا، بڑے بڑے عہدے والے، بادشاہ وزراء، مالدار، جرنیل، سردار، نواب، دنیاوی عہدے والے اور پوزیشن والے اتنے حقیر وذلیل شمار ہوں گے کہ وہاں ان کی حیثیت مچھر کے پَر کے برابر بھی نہ ہوگی، جبکہ ان کے برعکس فقراء ومساکین حاملینِ قرآن مجید اور نیک اعمال والوں کا وزن بڑے بڑے پہاڑوں سے بھی زیادہ اور بھاری ہوگا۔

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی موت پر عرش الٰہی جھوم اٹھا، اور ستر ہزار فرشتے نماز جنازہ میں شریک ہوئے، اسی طرح ہزاروں لوگ ہوتے ہیں جو دنیا والوں کی نظروں میں حقیر اور معمولی معلوم ہوتے ہیں، دنیا والوں کے نزدیک ان کا کوئی مرتبہ ومقام نہیں ہوتا، وہ گمنامی میں لوگوں سے الگ تھلگ ہوتے ہیں، اور ان کا کوئی حال نہیں ہوتا، وہ دنیا کی تمام خوشحالیوں کو خیر باد کہنے والے گدڑی میں لعل ہوتے ہیں، اور ان کا شمار مقربانِ درگاہ الٰہی میں ہوتا ہے، نہ لوگوں کو ان کی زندگی پر رشک آتا ہے، اور نہ ہی ان کی موت پر کوئی ہجوم کا منظر ہوتا ہے، ان کی موت پر آسمان کے دروازے روتے ہیں، اور زمین کے در ودیوار شجر وحجر اور سنگلاخ بھی ماتم کرتے ہیں، اور ان کی قبر روشن اور پورے عالم سے بھی زیادہ فراخ ہوجاتی ہے، وغیرہ۔ اور جس قبرستان میں ان کا جسد خاکی دفن ہوتا ہے ایک معینہ مدّت کے لئے پورے قبرستان کے مُردوں سے عذاب اٹھ جاتا ہے، اور ان کی آمد پر جنت بھی خوش ہوجاتی ہے۔

ان میں کئی ایسے ایماندار کم عمل والے بھی ہوتے ہیں جن کے بچوں نے جنت کو (قرآن کو حفظ کرکے) اپنے

سینوں میں محفوظ کیا ہے اور ان کا شمار جنتی بادشاہوں میں ہوتا ہے، جنہیں آج تم دہشت گرد اس لئے کہتے ہو کہ ان کے سینوں میں کلام الٰہی ہے، یہ تمہارا قصور نہیں، بیٹے اکثر اپنے باپ کے نقش قدم پر چلتے ہیں، تمہارا روحانی باپ فرعون بھی ان بچوں کے روحانی باپ کلیم اللہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دہشت گرد کہتا تھا۔

عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے والے پیغمبر بھی دہشت گرد ٹھہرے، قرآن حکیم نے اسی کو نقل کر کے فرمایا: ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ﴾ [المؤمن: ۲۶] (اور کہا فرعون نے: مجھ کو چھوڑ دو کہ موسیٰ کو قتل کردوں، بلا شبہ وہ پکارے اپنے رب کو، میں ڈرتا ہوں بگاڑ دے گا تمہارے دین کو، یا پھیلائے گا ملک میں دہشت گردی اور خرابی)۔

اندازہ لگائیں! کہنے والے کفار حضرت موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ جیسے اولوالعزم پیغمبر کو دہشت گرد قرار دینے سے بھی نہ شرمائے، جن کا نتیجہ سب کے سامنے ہے کہ وہ کیسے تباہ ہوئے، تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے، حق و باطل کا معرکہ آج کا نہیں یہ معرکہ روزِ ازل سے عبادالرحمٰن اور عبادالشیطان کے درمیان جاری ہے، کبھی موسیٰ و فرعون کی شکل میں، کبھی ابراہیم و نمرود کی شکل میں، کبھی اصحاب کہف اور دقیانوس کی شکل میں، کبھی ذوالقرنین اور یاجوج و ماجوج کے درمیان، اور کبھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوجہل کے درمیان، اور آج انگریزوں کے حواری و کاسہ لیس اور وارثانِ نبوت حاملینِ قرآن وسنت کے درمیان۔ پس اہل حق کو چاہئے کہ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں، اور نصرت الٰہی کا انتظار کریں، اور اللہ تعالیٰ پر مکمل غیر متزلزل اعتماد کے ساتھ باطل کا مقابلہ کریں، آج سے آٹھ سو سال پہلے حافظ شیرازی رحمہ اللہ نے یہی نقشہ کھینچ کر کہا:

یارب چہ موسم ست کہ ناکس کسان شدند ☆ دھقان موش گیر شہ و خسروان شدند
خوبان پردہ شین ہمہ بے پردہ گشتہ اند ☆ بازاریان کہنہ ہمہ بی بیان شدند
آن نامدار علم وادب وارثان دین ☆ در کنج قید وطعنہ چرا مفسدان شدند
حیف ست دراین کہ زاغ وزغن خور جاہلان ☆ در مرغزار علم وہنر قاضیان شدند
ان خسروان کج کلاہ وارثان تخت ☆ در سنگلاخ کوہ و بیابان زیان شدند
آنانکہ فرق پشم و پنبہ ندانند در جہان ☆ آنان شہان تاجدار ولی جہان شدند

اب ذرا تصویر کا دوسرا رخ قابل توجہ رہے، جو لوگ قرآن وسنت اور مذہبی اقدار سے خالی ہاتھ اور تہی دامن

ہیں، وہ بیچارے قابلِ رحم ہیں، ان کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کی جائے، مکانات ومحلات مارکیٹیں، ہوٹل اور مسافر خانے تعمیر کئے جائیں، دنیا میں بڑے بڑے مناصب عالیہ پر قائم ہوں۔ شادیوں، منگنیوں اور قومی تقریبات کا اہتمام کیا جائے، برسیوں اور سالگروں پر پانی کی طرح مال خرچ کیا جائے، اور نام آوری کی خاطر بے تحاشا سرمایہ خرچ کریں، وغیرہ۔ انہیں کبھی اپنے ربّ کی خوشنودی حاصل کرنے کا خیال ہی نہیں آتا، اور انہیں موت کو یاد کرنے کی فرصت بھی نہیں ملتی، انہی کے بارے میں تو فرمایا تھا:

﴿اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا﴾ کہ ان کی توانائی کا ایک ایک لمحہ متاعِ دنیا کے حصول کے لئے ضائع ہو کر رہ گیا ہے وہ: ﴿يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ﴾ [الھمزة:٣] (وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ زندہ رکھے گا) کے چکر میں مست ہے کہ خدا نہ کرے اچانک صدر دفتر سے روانگی کا پیغام پہنچ جاتا ہے تو دنیا رہ گئی، مال پر غیروں کا قبضہ ہو گیا، زندگی کا سارا سرمایہ رہ گیا، مسٹر صاحب، صدر صاحب، جنرل صاحب، وزیر صاحب، بڑے بڑے القاب کا سپوت افسر صاحب چل بسے، لوگ بے تحاشا کوٹھیوں پر جمع ہو گئے، سرکاری سطح پر سوگ کا اعلان ہو گیا، پرچم سرنگوں ہو گئے، سرکاری سطح پر تجہیز وتکفین کے انتظامات ہونے لگے، فوجی وسول اعزازات کے ساتھ تدفین کا انتظام ہوتا رہا، غیر ملکی مہمان بھی آخری رسومات میں شرکت کے لئے پہنچ گئے، اخبارات نے سیاہ کالم چھپوا کر اپنا حق ادا کر لیا، ریڈیو، ٹیلیویژن ماتمی انداز میں روتے رہے۔

یہ ہے وہ منظر نامہ جس پر دنیا دار رشک کر رہے ہیں، اب جب اگلا مرحلہ شروع ہو گا تو وہاں کے حالات ناقابلِ دید ہیں، اور ناقابلِ ذکر ہیں، صرف اتنا سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسی شخصیت کی پیشی ہو رہی ہے جس نے ساری زندگی اس کو یاد تک نہیں کیا ہے، آپ ابھی خود فیصلہ کرو کہ اس ہستی کے ساتھ کیا ہونا چاہئے، وہاں جو لوگ ایمان لائے اور عملِ صالح کیا، اور دنیا سے خفا ہو کر نکلے تو فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ
الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کی مہمانی فردوس کے باغ ہیں ﴿١٠٧﴾ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے وہ کہیں جانا نہ چاہیں گے ﴿١٠٨﴾

معارف ومنازل

پہلے ان لوگوں کا بیان تھا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے رسولوں علیہم السلام کو مذاق بنالیا، اب ان آیات میں ان لوگوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے حکموں پر جان ومال اور ہر طرح کی قربانی دی۔

فردوس عربی لفظ ہے یا عجمی، رومی لفظ ہے یا حبشی یا عبرانی، یہ سب لوگوں کے مختلف اقوال ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو، کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ حصہ ہے، اور اس کے اوپر ربّ العٰلمین جلّ جلالہ کا عرش ہے، اور اسی سے جنت کی چاروں نہریں نکلتی ہیں، پھر تمام جنتوں میں پھیل جاتی ہیں۔ [بخاري] یہاں لفظ جنّٰت جمع کے ساتھ لانے میں اشارہ ہے کہ یہاں جنّٰت الفردوس سے مراد مطلق بہشت ہے، کیونکہ سارے اہل ایمان فردوس میں نہیں جائیں گے، اور فردوس مخصوص طبقے کے لئے ہے، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام صدیقین، شہداء، علماء ربانی اور حفاظ قرآن مجید، باقی اہل جنت حضرات کے لئے فردوس کے علاوہ باقی سات جنتیں مراتب اعمال کے لحاظ سے ہیں۔

﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا﴾ اہل ایمان اعمالِ صالحہ والے مذکورہ جنتوں میں ہمیشہ رہیں گے، وہاں سے کہیں جانا نہ چاہیں گے، انسان اگر ہمیشہ ایک قسم کی خوراک کھائے یا ایک جگہ میں رہے تو اس کی طبیعت اُکتی جاتی ہے، وہ پھر خوراک اور جگہ کی تبدیلی کا خواہش مند رہے گا، تو فرمایا کہ جنت میں یہ چیز نہیں کہ جنتی اکتا کر جگہ کی تبدیلی کا خواہشمند ہو۔ اللّٰھم ارزقنا۔ آمین

....

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰۤى اِلَيَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: اگر سمندر میرے ربّ کی باتوں کے لئے روشنائی ہو تو میرے ربّ کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے، اگرچہ ہم اس سمندر میں بڑھانے کے لئے اسی جیسا دوسرا سمندر لے آئیں (١٠٩)

آپ فرما دیجئے کہ: میں (جنس کے اعتبار سے) بشر ہی ہوں تمہارے جیسا، میری طرف یہ وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو جو شخص اپنے ربّ کی ملاقات کی آرزو رکھتا ہو سو چاہیئے کہ نیک عمل کرے، اور اپنے ربّ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے ﴿۱۱۰﴾

معارف و منازل

سورت کے ختم پر توحید اور رسالت اور معاد کا اجمالی تذکرہ فرمایا، اور ایسے افعال و اعمالِ حسنہ کی ترغیب دی جو آخرت میں مفید اور کامیابی کا ذریعہ ہوں گے۔ پہلے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ شانہ کے اوصاف اور کمالات بے انتہاء ہیں، اگر ان کلمات کو لکھنے کے لئے ایک سمندر کو روشنائی کی جگہ استعمال کیا جائے تو ان اوصاف و کمالات کا بیان ختم نہ ہوگا، ایک سمندر کے ساتھ اگر ایک اور سمندر بھی ملا لیا جائے اور اس کو بھی بطور روشنائی استعمال کیا جائے تب بھی اس کے اوصافِ الٰہیہ اور کمالاتِ غیر متناہیہ ختم نہ ہوں گے، حتیٰ کہ اگر ساتوں سمندروں کو بھی روشنائی کی جگہ استعمال کر لیا جائے اور دنیا میں جتنے بھی درخت اور بوٹیاں ہیں ان سب کے قلم بنا لئے جائیں، اور تمام ملائکہ، سارے انسان اور تمام جنات لکھنے والے بن جائیں، کائنات کے طول و عرض پر بار بار تبدیلی کے ساتھ لکھائی کا کام شروع کیا جائے، اور ایک سمندر میں ساتوں سمندر ملا دیئے جائیں، تو ان قلموں سے اور ان سمندروں کی روشنائی سے اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کے غیر متناہی اوصاف اور کمالات کا احاطہ نہیں ہو سکے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ متناہی کسی غیر متناہی کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

سورۂ لقمان میں فرمایا: ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَةٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ يَمُدُّهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ سَبْعَةُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ﴾ [لقمان: ۲۷] (اور زمین میں جتنے درخت ہیں، اگر وہ قلم بن جائیں، اور یہ جو سمندر ہے، اس کے علاوہ سات سمندر اس کے ساتھ اور مل جائیں تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہیں ہوں گی)۔ اور یہ سات سمندر بطور فرض کے ہیں، غیر متناہی اقلام اور غیر متناہی سمندر ہوں تب بھی خالق کائنات جلّ جلالہ کے اوصاف و کمالات کا احاطہ نہیں ہو سکتا، کیونکہ متناہی غیر متناہی کا احاطہ کر ہی نہیں سکتا، اور غیر متناہی کہتے ہیں اس کو جس کا احاطہ ممکن نہ ہو۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ آپ فرما دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا بشر ہوں، کوئی فرشتہ نہیں ہوں، تم ہی میں بچپن سے رہتا سہتا ہوں، میں تمہیں خدا تعالیٰ کی توحید کی طرف بلاتا ہوں، میرے پاس جو وحی آتی ہے اس کا سب سے بڑا پیغام جو تمہیں سکھاتا ہوں وہ خالق کائنات کی توحید اور خالص اس کی عبادت ہے، جس میں کسی غیر کی شراکت نہیں ہے، وہ جس طرح خالقیت کی صفت میں تنہا و اکیلا ہے جس کو تم بھی مانتے ہو، اسی طرح عبادت کی صفت میں بھی

واحد لاشریک ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت ہرگز جائز نہیں۔

﴿فَمَنۡ كَانَ يَرۡجُوۡا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلۡيَعۡمَلۡ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشۡرِكۡ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖۤ اَحَدًا﴾ سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھتا ہے، اور چاہتا ہے کہ اس کا مقرب بندہ بن کر میدانِ قیامت میں حاضر ہو کر سرخروئی حاصل کرلوں تو اسے چاہئے کہ نیک عمل کرے، اور شرک جلی اور شرک خفی (ریاکاری) دونوں سے پرہیز کرے۔

واضح رہے کہ یہ آخری آیت شرک خفی سے بچنے بارے میں ہے، پس جس طرح شرک جلی سے بچنا فرض اور مقتضائے ایمان ہے اسی طرح شرک خفی سے بچنا بھی فرض اور مقتضائے ایمان ہے۔ آنحضرت سرور عالم ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے بارے میں جس چیز پر سب سے زیادہ خوف رکھتا ہوں وہ شرک اصغر ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! شرک اصغر کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "ریا"۔ [أحمد عن محمود بن لبيد رضي الله عنه]

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے نیک عمل کو لوگوں میں شہرت کے لئے کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ سبحانہ بھی اس کے ساتھ ایسا ہی معاملہ فرماتے ہیں کہ لوگوں میں (بجائے شہرت کے) وہ حقیر و ذلیل اور بدنام ہو جاتا ہے۔ [رواه أحمد والبيهقي في شعب الإيمان، مظهري]

سُورَةُ مَرْيَمَ

مکیۃ آیاتہا ۹۸ رکوعاتہا ۶

سورۂ مریم مکی ہے، اس میں اٹھانوے (۹۸) آیتیں، اور چھ (۶) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ مریم ہے، اس سورت کے دوسرے رکوع میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریم سلام اللہ علیہا کے واقعہ کا تفصیلی بیان ہے، اسی لئے سورت کا نام مریم رکھا گیا۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں (۱۹) ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں (۴۴) نمبر پر ہے۔ اس کا نزول سورۃ الفاطر کے بعد ہے۔

نزول:

یہ سورت بالاتفاق مکّی ہے، اس میں چھ رکوع، ۹۸ آیات ہیں۔ یہ سورت ۹۶۸ کلمات، اور ۳۹۸۶ حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

(۱) گزشتہ سورت میں خرق عادت چیزوں کا بیان ہوا، اس سورت میں بھی ایک عجیب خرق عادت چیز کا بیان ہے، یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور تکلّم فی المهد کا۔

(۲) گزشتہ سورت میں ﴿ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ﴾ [الکھف: ۱۱۰] (بیشک تمہارا معبود ایک ہی معبود

ہے) حصر الألوهية في ذات الله کا بیان ہوا، اس سورت میں ﴿اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا﴾ [مريم:٣] (جب اپنے ربّ کو چھپکے سے پکارا) حصر النداء في ذات الله کا بیان ہے۔

(۳) گزشتہ سورت میں توحید، رسالت، صداقتِ قرآن، معاد اور عجائباتِ قدرت کا بیان تھا، اس سورت میں بھی انہی چیزوں کا بیان ہے۔

مختصر موضوع:

اس سورت میں حضرت زکریا، حضرت یحیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت مریم حضرت ابراہیم، حضرت اسمٰعیل، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون حضرت ادریس علیہم السلام کے واقعات، تعلیمات، فضائل وغیرہ کا بیان ہے، اس ضمن میں توحید باری تعالیٰ، اثبات نبوت، اثبات قیامت، مؤمنین موحدین کے نیک انجام اور جنت کا بیان، کفار ومشرکین معاندین کے برے انجام دوزخ اور اس کی نقمتوں کا بیان ہے، اور منکرین کے شکوک وشبہات کی تردید وابطال اور دیگر جزوی احکام ومسائل کا مختصر تذکرہ ہے، وغیرہ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ① ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ② اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ③ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ
مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ④ وَاِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَ
كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ⑤ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ
رَضِيًّا ⑥ يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ ۨاسْمُهٗ يَحْيٰى ۙ لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ⑦ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ
لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ⑧ قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ
وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ⑨ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ
ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑩ فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ⑪ يٰيَحْيٰى
خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۭ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ⑫ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۭ وَكَانَ تَقِيًّا ⑬ وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ
وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ⑭ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ⑮

ترجمہ: كٓهٰيٰعٓصٓ ① یہ آپ کے ربّ کی رحمت کا ذکر ہے، جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی ②

جبکہ انہوں نے اپنے ربّ کو پوشیدہ طریقہ پر پکارا ③ عرض کیا کہ اے میرے ربّ! میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں، اور میرے سر میں بڑھاپے کی وجہ سے سفیدی پھیل گئی، اور میں آپ سے دعا مانگنے میں کبھی ناکام نہیں رہا ④ اور بلاشبہ مجھے اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے اندیشہ ہے، اور میری بیوی بانجھ ہے، سو آپ مجھے اپنے پاس سے ایک ولی عطا فرما دیجئے ⑤ جو میرا وارث بنے اور یعقوب کی اولاد کا بھی، اور اے ربّ! آپ اسے پسندیدہ بنا دیجئے ⑥ اے زکریا! بیشک ہم تمہیں ایک لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں، اس کا نام یحییٰ ہے، ہم نے اس سے پہلے اس کا کوئی ہمنام نہیں بنایا ⑦ عرض کیا: اے میرے ربّ! میرا لڑکا کہاں سے ہوگا؟ اور حال یہ ہے کہ میری بیوی بانجھ ہے، اور میں بڑھاپے کے انتہائی درجے کو پہنچ چکا ہوں ⑧ فرمایا: یوں ہی ہوگا، تمہارے ربّ کا فرمان ہے کہ وہ مجھ پر آسان ہے، اور میں نے تمہیں اس سے پہلے پیدا کیا، حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے ⑨ عرض کیا: اے میرے ربّ! میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرما دیجئے، فرمایا: تمہاری نشانی یہ ہے کہ تم لوگوں سے تین رات بات نہ کرسکو گے، حالانکہ تم تندرست رہو گے ⑩ سو وہ محراب سے اپنی قوم پر نکلے، اور ان کو اشارہ سے فرمایا کہ صبح شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول رہو ⑪ اے یحییٰ! کتاب کو مضبوطی کے ساتھ لے لو، اور ہم نے ان کو بچپن میں حکم دے دیا ⑫ اور ان کو اپنے پاس سے رقتِ قلبی کی صفت اور پاکیزگی عطا فرمائی، اور وہ پرہیزگار تھے ⑬ اور اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے والے تھے، اور سرکشی کرنے والے نافرمانی کرنے والے نہ تھے ⑭ اور ان پر اللہ تعالیٰ کا سلام ہو جس دن پیدا ہوئے، اور جس دن وفات پائیں گے، اور جس دن زندہ ہوکر اٹھائے جائیں گے ⑮

معارف ومنازل

حضرت زکریا علیہ السلام کا ذکر چار سورتوں آل عمران، انعام، مریم اور انبیاء میں کُل ۱۸ مرتبہ نام کے ساتھ آیا ہے۔

نسب نامہ:

حضرت زکریا علیہ السلام بن اُدن (دان) یا ابن شبوی یا ابن لدن یا ابن برخیا۔ یہ چار ہوئے اسی طرح حافظ ابن حجر، امام ابن کثیر نے حافظ ابن عساکر سے نقل کیا ہے۔ باپ میں اختلاف کے بعد آگے نسب نامہ یہ ہے: مسلم بن صدوق بن حبشان بن داوٗد بن سلیمان بن مسلم بن صدیقہ بن برخیا بن بلعاطہ بن ناحور بن شلوم بن بہفاشاط بن اینا

من بن رجعام بن سلیمان بن داؤد علیہم السلام۔ واللہ اعلم

شاہ نجاشی کے دربار میں سورۂ مریم کا تحفہ:

ام المؤمنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے حبشہ گئے تو پیچھے سے مشرکین مکہ نے تحفے تحائف دے کر اپنا وفد بادشاہ حبشہ کی خدمت میں بھیجا کہ ہمارے کچھ لوگ اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر آپ کے ملک میں آکر پناہ گزین ہو گئے ہیں، آپ انہیں اپنے ملک سے نکال کر ہمارے حوالہ کردیں۔ بادشاہ نے کہا: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو لوگ ہماری پناہ میں آئے ہم ان کو تمہارے حوالے کریں؟ پہلے میں انہیں بلا کر صورت حال معلوم کروں، پھر تمہارے ساتھ بات کروں۔ چنانچہ بادشاہ نے انہیں طلب کیا، وہ آگئے، انہوں نے اپنا متکلم حضرت جعفر ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، جب یہ نورانی چہرے والے شاہی دربار میں پہنچے تو اسلامی طرز پر مجلس کو السلام علیکم کا تحفہ پیش کیا، اور کھڑے ہو گئے۔

مشرکین کے وفد والوں نے بادشاہ سے کہا کہ بادشاہ صاحب! دیکھیں ان لوگوں نے آداب مجلس شاہی کی خلاف ورزی کی، بادشاہ کے سامنے سجدہ نہیں کیا، بادشاہ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر ان سے سوال کیا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لئے سجدہ جائز نہیں، پھر اسلامی تعلیمات کی روشنی میں مختصر مقالہ زبانی پیش کیا، جس سے بادشاہ اور اس کے ہم نشین بڑے متاثر ہوئے۔

بادشاہ نے کہا کہ تمہارا پیغمبر ہمارے نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے کیا عقیدہ رکھتا ہے؟ اور اگر تمہارے نبی پر کوئی آسمانی کتاب اتری ہے تو وہ ہمیں سناؤ۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے سورۂ مریم کی تلاوت شروع کی، دو رکوع تک تلاوت جاری رکھی، بادشاہ نجاشی اس قدر رویا کہ اس کی داڑھی تر ہو گئی، اور اس کی مجلس میں بیٹھے ہوئے قسیسین ورہبان، علماء، اہل کتاب اس قدر روئے کہ ان کے سامنے رکھی ہوئی کتابیں ان کے آنسوؤں سے تر ہو کر بھیگ گئیں۔ نجاشی نے کہا کہ یہ کلام اور وہ پیغام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے ایک مشکوٰۃ کے نور ہیں۔

پھر نجاشی نے انہیں اپنے ملک میں اعزاز واکرام کے ساتھ رہنے کی مکمل آزادی دی، اور مشرکین مکہ کے تحفے تحائف واپس کر کے ان کے وفد کو اپنے ملک سے نکلنے کا حکم دیدیا۔ یہی نجاشی نے جن کا نام، اصحمہ، ہے صدق دل سے اسلام قبول کیا، اور حضرت ام المؤمنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایجاب قبول کر کے حق مہر چار سو دینار اپنی جیب سے ادا کیا۔ جب اس خوش قسمت بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس وقت سید الانبیاء

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما چکے تھے، مدینہ طیبہ میں تشریف فرما تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حکم سے مدینہ منورہ میں نجاشی کی موت کا اعلان فرمایا، چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جمع ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غائبانہ حضرت نجاشیؓ کی نماز جنازہ ادا فرمائی۔

ع آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

یہ واقعہ کتب سیرت میں بہت طویل ہے، میں نے مختصر لکھا۔ واللہ اعلم

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا، اور یحییٰ علیہ السلام کی بشارت:

جب حضرت زکریا علیہ السلام کی عمر ستر (۷۰) یا نوے (۹۰) سال کی ہوئی، اور ان کے بال سفید ہو گئے، اور بدنی کمزوری بھی زیادہ ہوگئی، تو انہیں یہ خیال ہوا کہ میرے دنیا سے چلے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی کتاب توریت شریف کو اور دینی علوم اور اعمال کو کون تحفظ دے گا، اور ان کی سرپرستی کرے گا، اور تبلیغ دین موسوی کو کون انجام دے گا۔ ان کے خاندان کے جو لوگ تھے ان سے اندیشہ تھا کہ وہ اس میراث کو ضائع کریں گے، چونکہ وہ خود بے اولاد تھے ان کا کوئی لڑکا نہ تھا جو آپ کے علوم اور حکمت اور اعمال دینیہ کا وارث ہوتا۔

ایک دن جب وہ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس آئے تو بے موسم طرح طرح کے پھل دیکھے، پوچھا: یہ کہاں سے؟ کہنے لگیں: یہ سب اللہ تعالیٰ کی نوازش اور کرم سے، تو انہیں خیال پیدا ہوا کہ جو پروردگار مریم علیہا السلام کو بے موسم ہر طرح کا رزق مہیا کرسکتا ہے، وہ مجھے بڑھاپے میں بے موسم یعنی ضعف و کمزوری میں اولاد بھی دے سکتا ہے، تو اس جذبے سے انہوں نے اولاد (بیٹے) کے لئے الحاح وزاری کے ساتھ دعا شروع کی، سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿٣٨﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى﴾ [آل عمران] (جب بھی زکریا ان کے پاس ان کی عبادت گاہ میں جاتے، ان کے پاس کوئی رزق پاتے، انہوں نے پوچھا: مریم! تمہارے پاس یہ چیزیں کہاں سے آئیں؟ وہ بولیں: اللہ کے پاس سے۔ اللہ جس کو چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ اس موقع پر زکریا نے اپنے ربّ سے دعا کی، کہنے لگے: یا ربّ! مجھے خاص اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرمادے بیشک تو دعا کا سننے والا ہے۔ چنانچہ جب زکریا عبادت گاہ میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے فرشتوں نے

انہیں آواز دی کہ: اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے)۔

توانہوں نے اللہ تعالیٰ جلّ ذکرہٗ کی بارگاہ میں خفیہ طور سے دعا کی، جیسا کہ دعاء کا ادب بھی یہی ہے کہ خفیہ طریقے سے عجز وانکساری کے ساتھ ہو، انہوں نے کہا: اے میرے ربّ! میری ہڈیاں کمزور ہوگئیں، میرے بال بالکل سفید ہوگئے، اگر میں اسی حالت میں دنیا سے چلا گیا کہ کوئی میرا دینی وارث نہیں ہے، اور ساتھ ہی مجھے اپنے موالی (چچا کے بیٹوں سے خوف ہے) بہت ڈر ہے کہ وہ دینی اقدار کو محفوظ نہیں رکھیں گے، تو دینی علوم اعمال کا بقاء کس طرح رہے گا؟ لہٰذا آپ مجھے ایک بیٹا عنایت فرمایئے جو میرا ولی ہو، وہ میرا بھی وارث ہو اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد کا بھی وارث ہو، اور آپ اس سے راضی ہوں، میرے بڑھاپے کا تو یہ حال ہے جو میں نے بیان کیا، اور میری بیوی بھی بانجھ ہے، تاہم آپ مجھے بیٹا عطا فرمادیں۔ اور ساتھ یوں بھی عرض کیا کہ میں کبھی دعا کر کے محروم نہیں رہا، آپ نے ہمیشہ میری دعا قبول فرمائی ہے، یہ دعا بھی قبول فرمایئے۔

یہاں اپنی میراث سے مراد نبوت کی میراث، علم وحکمت ہی ہے، اور آل یعقوب علیہ السلام کی میراث سے مراد نبوت وسیادت ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے نبی تو تھے ہی، اپنے زمانہ کے احبار کے سردار بھی تھے۔ مطلب یہ تھا کہ یہ علمی اور عملی سرداری جو ہمارے خاندان میں جاری ہے یہ باقی رہے۔

یاد رہے کہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت میں مال نہیں ہوتا، مال کی حقیقت اور اہمیت ان کی نظر میں ہیچ اور کالعدم ہے، اور نہ ہی وہ مال کو کچھ سمجھتے ہیں۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاء [بخاري] قیامت تک آنے والے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث کہلاتے ہیں وہ صرف یہی علم وحکمت اور دینی برکات ومعارف کے وارث ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذِرہ ایک یہودی کے پاس تیس صاع جَو کے عوض رہن رکھی ہوئی تھی، جسے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہودی کے ہاتھ سے مال دے کر چھڑایا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے نزدیک مال کی کوئی بھی اہمیت نہیں ہوتی، اور نہ ہی ان کے پیچھے کوئی مال باقی رہ جاتا ہے۔ فرمایا: ہماری جماعت انبیاء علیہم السلام سے نہ کوئی مال وراثت میں کسی نے پایا، اور نہ ہی ہم کسی مرنے والے کی میراث میں حصہ دار بنتے ہیں۔ [بخاري]

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زکریا علیہ السلام کی دعاء قبول فرمائی، اور بشارت دیدی کہ ہم تمہیں ایک ایسا لڑکا دیں گے جن کا نام یحییٰ ہوگا، اور اس سے پہلے ہم نے اس کا ہم نام کوئی پیدا نہیں کیا؛

﴿لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا﴾ بعض مفسرین کرام نے اس کا ترجمہ کیا: شَبِيهاً وَمَثِيلاً۔ کہ اس سے

پہلے ہم نے اس جیسا لڑکا پیدا نہیں کیا۔ سورۂ آل عمران میں: ﴿وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا﴾ [آل عمران: ٣٩] (پیشوا، نفسانی خواہشات سے رکے ہوئے، اور نبی ہوں گے) سے یہی مراد ہے۔ بہر حال! آپ علیہ السلام اپنی نظیر آپ تھے، پہلے کوئی شخص ایسا نہیں ہوا کہ اس نے گناہ بھی نہ کیا ہو، اور عورتوں کی طرف میلان بھی نہ رکھا ہو۔

بیٹے کی بشارت پر اظہار تعجب:

جب اللہ تعالیٰ نے بیٹے کی بشارت دیدی، اور فرشتے نے ان کو اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا، تو کہنے لگے:

﴿قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا﴾ اے میرے ربّ! میرا لڑکا کہاں سے ہوگا؟ میری تو بیوی بانجھ ہے، اور میں خود بڑھاپے کی انتہا کو پہنچ چکا ہوں۔ اَنّٰى یہ سوال انکاری نہیں، بلکہ مسرت وخوشی کے ساتھ طلب کیفیت کے لئے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بچہ کیسے ہوگا ہم دونوں جوان ہوں گے، یا اسی طرح بڑھاپے کے ساتھ بچہ ہوجائے گا؟ ان کا تعجب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں نہیں تھا، بلکہ اسباب کے فقدان میں تھا۔

﴿قَالَ كَذٰلِكَ﴾ بشارت دینے والے فرشتے نے ترجمانی کرتے ہوئے کہا: بات یونہی ہے، اسباب کے فقدان کے باوجود یہ بچہ ہونے والا ہے، کیونکہ:

﴿قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ﴾ تیرے ربّ نے فرمایا کہ یہ بات میرے لئے آسان ہے، مجھے کسی اسباب کی ہرگز ضرورت نہیں ہے، کیا تم نے اندازہ نہیں لگایا؟ ﴿وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا﴾ اور اس سے پہلے ہم نے تجھے بھی تو پیدا کیا تھا جبکہ تو کچھ بھی نہ تھا۔

﴿قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً﴾ زکریا علیہ السلام نے کہا: اے میرے ربّ! میرے لئے کوئی نشانی مقرر کردے، جس سے میری بیوی کا حاملہ ہونا معلوم ہوجائے، یا مجھے علم الیقین سے عین الیقین کا درجہ حاصل ہوجائے۔

﴿قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا﴾ تیرے لئے حمل کی نشانی یا عین الیقین اس میں ہے کہ تو تین راتیں اور تین دن لوگوں سے کلام نہ کرسکے گا۔ سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا﴾ [آل عمران: ۴۱] (یہ کہ آپ تین دن لوگوں سے بات نہیں کرسکیں گے، مگر اشارہ سے)۔ زبان سے نہیں اشارہ سے بات کرسکو گے۔

سَوِيًّا کے معنی ہیں: صحیح سالم، یعنی کوئی بیماری لاحق نہ ہوگی، اور نہ گونگا پن، نہ فالج ولقوہ۔

﴿فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ﴾ اس کے بعد زکریا علیہ السلام مسجد سے نکل کر قوم کے پاس آئے۔

﴿فَاَوْحٰٓی اِلَیْهِمْ﴾ پس انہیں اشارہ کرتے رہے۔ وحی کے لغوی معانی میں سے ایک بمعنی اشارہ کے ہے۔

﴿اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِیًّا﴾ کہ تم صبح وشام اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرو۔ سورۂ آل عمران میں ہے: ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ﴾ [آل عمران:۴۱] (اور اپنے ربّ کا کثرت سے ذکر کرتے رہو، اور ڈھلے دن کے وقت بھی، اور صبح سویرے بھی اللہ کی تسبیح کیا کرو)۔

امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ لوگ مسجد کے باہر منتظر تھے کہ زکریا علیہ السلام اندر سے دروازہ کھول دیں تو وہ اندر جا کر نماز پڑھیں، اچانک زکریا علیہ السلام دروازہ کھول کر باہر آ گئے، چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا، لوگوں نے کیفیت دریافت کی تو آپ علیہ السلام نے اشارے سے ان کو تسبیح وتنزیہ کا حکم دیا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ تسبیح سے مراد نماز، اور صبح وشام سے مراد اوقات نماز ہے۔ تین دن کے بعد یہ کیفیت ختم ہو گئی، اور بولنا شروع کیا، استقرار حمل بھی ہو چکا۔

مِحْرَاب سے مراد ہمارے زمانے کا معروف محراب نہیں، کیونکہ بنی اسرائیلی عبادت خانوں میں یہ مروج نہیں تھا۔ ابتداء اسلام میں مسلمانوں میں بھی مروج نہ تھا، حجاج بن یوسف ثقفی نے اس کی ایجاد کی، پھر ہر جگہ مسجدوں میں رواج پایا۔ محراب سے مراد حجرہ بھی ہے، اور عبادت کی جگہ بھی ہے، تو مطلب یہ ہے کہ نمازی آدمی عبادت واذکار کے ذریعہ شیطان سے لڑتا رہتا ہے، محراب کا یہی معنی ہے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام کے مناقب وبرکات:

﴿یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ پوری عبارت گویا یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی بیوی حاملہ ہو گئی، پھر بحکم الٰہ العٰلمین لڑکا پیدا ہو گیا، جن کا نام یحییٰ رکھا گیا، جب وہ مخاطب ہونے کے قابل ہو گئے تو اللہ تعالیٰ سبحانہ نے فرمایا: اے یحییٰ! ﴿یٰیَحْیٰی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ﴾ کہ کتاب کو مضبوط پکڑ لے، یعنی تورات شریف کو، اور ہم نے بچپن میں ہی اس کو حکم اور حکمت اور کتاب کی سمجھ عطا کر دی تھی۔ ایک قول یہ ہے کہ حکم سے مراد نبوت ہے، بجائے چالیس سال کے انہیں صغرسنی میں نبوت کا منصب عطا ہوا۔ پھر فرمایا:

﴿وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِیًّا﴾ اور ہم نے اس کو اپنے پاس سے رحمت عطا کی، اس کو رقت قلبی عطا فرمائی کہ وہ اپنے والدین پر رحمت وشفقت کرے، اور تمام انسانوں پر رحمت وشفقت کرے انہیں دوزخی اعمال سے نکال کر جنت کے راستے پر ڈال دے، اور زکوٰۃ دینے پر ڈال دے۔ اس کو طہارت و پاکیزگی عطا کی، اس سے

مراد بُرے اعمال سے براءت، اخلاص اور للّٰہیت پر گامزن ہونا، اور نیک اعمال کی بجا آوری اور اطاعت حق ہے۔ یہ سارے معانی زکوٰۃ کے ہیں۔

﴿وَكَانَ تَقِيًّا﴾ وہ متقی پرہیزگار تھے، یہ زکوٰۃ کی تفسیر ہے۔ ﴿وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ﴾ اپنے والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا ہم نے اس کو بنایا۔ ﴿وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا﴾ اور سرکش متکبر نافرمان نہیں تھا۔

﴿وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا﴾ ان پر اللہ تعالیٰ کا سلام ہے ولادت سے لے کر قبروں سے نکلنے کے وقت تک۔ مطلب یہ ہے کہ اوّل سے آخر تک دنیا اور آخرت دونوں میں جیسا کہ انبیاء علیہم السلام کی شان ہے۔

۞ ۞ ۞

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿١٦﴾ فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ
فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿١٧﴾ قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿١٨﴾
قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿١٩﴾ قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ
وَّلَمْ أَكُ بَغِيًّا ﴿٢٠﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ
أَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ فَأَجَاءَهَا الْمَخَاضُ إِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ
قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ
تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿٢٤﴾ وَهُزِّيْ إِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿٢٥﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ
فَإِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ أَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْ إِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنْسِيًّا ﴿٢٦﴾

ترجمہ: اور کتاب میں مریم کو یاد کیجئے، جبکہ وہ اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر ایک ایسی جگہ چلی گئی جو مشرق کی جانب تھی۔ پھر اس نے ان لوگوں سے ورے ایک پردہ ڈال لیا، سو ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیج دیا جو اس کے سامنے صحیح سالم آدمی بن کر ظاہر ہو گیا۔ مریم نے کہا کہ میں تجھ سے رحمٰن عزّ شانہ کی پناہ مانگتی ہوں، اگر تو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے۔ فرشتے نے کہا: میں تو تیرے ربّ کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دے دوں۔ مریم نے کہا کہ میرا لڑکا کیسے ہوگا؟ حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا بھی نہیں، اور نہ میں بدکار رہوں۔ فرشتہ نے کہا: یوں ہی

ہوگا، تیرے ربّ نے فرمایا ہے کہ یہ مجھ پر آسان ہے، اور تا کہ ہم اسے لوگوں کے لئے نشانی بنادیں، اور اپنی طرف سے رحمت بنادیں، اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ سو اس لڑکے سے وہ حاملہ ہوگئی، لہٰذا وہ اس حمل کو لئے ہوئے علیٰحدہ ہوکر دور چلی گئی۔ سو دردزہ اسے کھجور کے تنے کے پاس لے آیا، وہ کہنے لگی: ہائے کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی، اور بالکل بھولی بسری ہوجاتی۔ سو اسے اس کے نیچے سے آواز دی کہ تو غمگین مت ہو، تیرے ربّ نے تیرے نیچے ایک نہر پیدا فرمادی ہے۔ اور تو کھجور کے تنے کو اپنی جانب حرکت دے جس سے تجھ پر پکی تیار کھجوریں گریں گی۔ سو تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر، سو اگر تو کسی انسان کو دیکھے تو کہہ دینا کہ میں نے رحمٰن کے لئے روزہ رکھنے کی منت مان لی ہے، لہٰذا آج میں کسی بھی انسان سے بات نہیں کروں گی۔

معارف ومنازل

سورۂ اسراء کے شروع سے مسلسل قدرت الٰہی کے کمالات کا بیان ہورہا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا نظارہ پیش فرمارہے ہیں، ابھی گزشتہ رکوع میں حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا عجیب وغریب واقعہ بیان ہوا، اب حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا تذکرہ ہورہا ہے، چونکہ ان دونوں قصوں میں پوری مناسبت ہے اسی لئے یہاں بھی اور سورۂ آل عمران میں بھی اور آئندہ سورۂ انبیاء میں بھی ان دونوں کو متصل بیان فرمایا تا کہ بندے اللہ تعالیٰ کی بے مثال قدرت اور عظیم الشان سلطنت کا معائنہ کرلیں۔ حضرت مریم علیہاالسلام عمران کی صاحبزادی تھیں، حضرت ہارون اور حضرت داؤد علیہما السلام کی نسل میں سے تھیں، بنی اسرائیل میں یہ گھرانا راستبازاور طیب وطاہر تھا، سورۂ آل عمران میں آپ علیہاالسلام کی پیدائش وغیرہ کا مفصل بیان گزر چکا ہے۔

بشارت ولادت حضرت عیسیٰ علیہ السلام:

عابدہ وزاہدہ عفت مآب حضرت مریم علیہاالسلام اپنے خلوت کدہ میں مشغول عبادت رہتیں، اور ضروری حاجات کے علاوہ کبھی اس سے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ ایک مرتبہ مسجد اقصیٰ (ہیکل) کی مشرقی جانب لوگوں کی نگاہوں سے دور کسی ضرورت سے ایک گوشہ میں تنہائی میں بیٹھی ہوئی تھیں کہ اچانک خدا تعالیٰ کا فرشتہ (جبرائیل علیہ السلام) انسانی شکل وصورت میں ظاہر ہوئے، اس وقت ان کی عمر ١٣ یا ١٥ سال تھی، حضرت مریم علیہاالسلام نے ایک اجنبی شخص کو اس طرح بے حجاب سامنے دیکھا تو گھبرا گئیں، اور فرمانے لگیں: اگر تجھ کو کچھ بھی خدا کا خوف ہے تو میں خدائے رحمٰن کا واسطہ

دے کر تجھ سے پناہ چاہتی ہوں۔فرشتے نے کہا: مریم! خوف نہ کھائیں، میں انسان نہیں بلکہ خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں، اور آپ کو ایک پاکیزہ لڑکے کی بشارت دینے آیا ہوں۔حضرت مریم علیہا السلام نے یہ سنا تو ازراہِ تعجب پوچھنے لگیں: میرا لڑکا کیسے ہوسکتا ہے؟ جبکہ مجھ کو آج تک کسی بھی شخص نے ہاتھ نہیں لگایا، اس لئے کہ نہ تو میں نے نکاح کیا ہے، اور نہ میں زانیہ بدکار ہوں۔فرشتے نے جواب دیا کہ میں تو تیرے پروردگار کا رسول (قاصد) ہوں، اس نے مجھ سے اسی طرح کہا ہے، اور یہ بھی فرمایا ہے کہ یہ میں اس لئے کروں گا کہ تجھ کو اور تیرے لڑکے کو کائنات کے لئے اپنی قدرت کاملہ کے اعجاز کا نشان بنادوں گا، اور لڑکا میری جانب سے رحمت ثابت ہوگا، اور میرا یہ فیصلہ اٹل ہے۔

اے مریم! اللہ تعالیٰ آپ کو ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتا ہے جو اس کا کلمہ ہوگا، اس کا لقب ''مسیح'' اور اس کا نام عیسیٰ (یسوع) ہوگا، اور دنیا و آخرت دونوں میں باوجاہت اور صاحب عظمت رہے گا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقربین میں سے ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کے نشان کے طور پر بحالت شیرخوارگی لوگوں سے باتیں کرے گا، اور سن کہولت (بڑھاپے کا ابتدائی دور) بھی پائے گا، تاکہ کائنات کی رُشد و ہدایت کی خدمت کی تکمیل کرے، اور یہ سب کچھ اس لئے ضرور ہوکر رہے گا کہ اللہ تعالیٰ کا قانون قدرت یہ ہے کہ جب وہ کسی شئے کو وجود میں لانا چاہتا ہے تو اس کا محض یہ ارادہ اور حکم کہ ہوجا، اس شئ کو نیست سے ہست کر دیتا ہے، لہٰذا یہ یوں ہی ہوکر رہے گا، اور اللہ تعالیٰ اس کو اپنی کتاب (انجیل) عطا کرے گا، اور اس کو حکمت سکھائے گا، اور اس کو بنی اسرائیل کی رُشد و ہدایت کے لئے اولوالعزم رسول بنائے گا۔

جبرئیل امینؑ نے حضرت مریم علیہا السلام کو یہ بشارت سنا کر ان کے گریبان میں پھونک دیا، اور اس طرح اللہ تعالیٰ کا کلمہ ان تک پہنچ گیا، اور اس طرح پیدائش کی چاروں صورتیں واقع ہوگئیں۔

(۱) آدم علیہ السلام ماں باپ دونوں کے بغیر پیدا ہوئے۔(۲) حضرت حواء علیہا السلام کو صرف مرد کے وجود سے پیدا کیا گیا۔(۳) عام انسان مرد و عورت دونوں کے اختلاط سے پیدا ہوتے ہیں۔(۴) حضرت مسیح علیہ السلام جو مرد کے بغیر صرف عورت کے وجود سے پیدا ہوئے۔

حضرت مریم علیہا السلام نے کچھ عرصے کے بعد خود کو حاملہ محسوس کیا، تو بتقاضائے بشری ان پر ایک اضطرابی کیفیت طاری ہوگئی، اور اس کیفیت نے اس وقت شدید صورت اختیار کر لی جب انہوں نے دیکھا کہ مدّت حمل ختم ہوکر ولادت کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جارہا ہے، اس موقع پر نہایت رنجیدہ اور پریشانی کے ناگفتہ بہ دور سے

دوچار ہوئیں، والدین بقید حیات ہوتے تو کچھ تلافی ہوسکتی تھی، ان دونوں کا سایہ اٹھ چکا تھا، پس انہوں نے سوچا کہ اگر یہ واقعہ قوم کے اندر رہ کر پیش آیا تو چونکہ وہ حقیقت حال سے واقف نہیں ہیں اس لئے نہیں معلوم وہ کس طرح بدنام کریں گے، وہ جانتی تھیں کہ جدھر سے مسئلہ چلا ہے میری براءت کا فیصلہ ضرور وہاں سے آئے گا، مگر فطری طور پر انسان ہزاروں تسلیوں کے باوجود بھی پریشان ضرور ہوتا ہے، تو مناسب یہ سمجھا کہ لوگوں سے دور کہیں کسی ویرانہ کا رخ کروں اور آبادی سے ہٹ کر کسی میدان میں پہنچ کر کسی درخت کے سایہ میں پناہ لے لوں۔

چنانچہ وہ بیت المقدس (یروشلم) سے تقریباً نو میل کو وہ سراۃ (ساعیر) کے ایک ٹیلے پر چلی گئیں، جو اب بیت اللحم کے نام سے مشہور ہے، جسے عیسائیوں نے اپنا قبلہ بنایا ہوا ہے، یہ مقام بیت المقدس سے شمال مشرق میں ہے، یہاں انہیں بچے کی پیدائش کا درد شروع ہوا، ایک تو وہ ناتجربہ کار عفت مآب بھولی بھالی بے سہارا بچی تھیں، اوپر آسمان نیچے زمین ہے، نہ کوئی آدمی ہے اور نہ کوئی سہولت، نہ بولنے والا، نہ کوئی غمگسار، نہ بستر ہ، نہ تکیہ، نہ اور کچھ۔

چون وچرا با کار تو عقل زبون را کے رسد ☆ اے قادر مطلق توئی ہر آنچہ خواہی آن کنی

جب پیدائش کا درد شروع ہوا تو تکلیف واضطراب کی حالت میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے تنے کے سہارے بیٹھ گئیں، اور آئندہ کے پیش آنے والے نازک حالات کا اندازہ کر کے انتہائی قلق اور پریشانی کی حالت میں کہنے لگیں: کاش کہ میں اس سے پہلے مرچکی ہوتی، اور میرا نام ونشان ہی نہ ہوتا۔ تب نخلستان کے نشیب سے خدا کے فرشتے نے پھر پکارا کہ اے مریم! غمگین نہ ہوں، آپ کے پروردگار نے آپ کے نیچے نہر جاری کردی ہے، اور کھجور کا تنہ پکڑ کر اپنی جانب ہلا تو پکی اور تازہ کھجوریں آپ پر گرنے لگیں گی، پس کھالیئے اور پانی پی لیجئے، اور اپنے بچے کا نظارہ کر کے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیجئے، اور رنج وغم کو بھول جایئے، اور ہماری نگہبانی میں رہیے۔ سبحان اللہ وبحمدہ

اور فرشتے نے یہ بھی بتادیا کہ وضع حمل کے بعد یہاں سے روانہ ہوکر جب کوئی سامنے آئے یا گھر پر پہنچنے کے بعد اس بچے کے متعلق دریافت کرلے تو کہہ دیجئے کہ میں نے رحمٰن کے لئے روزہ رکھنے کی منّت (نذر) مان لی ہے، لہٰذا آج میں کسی بھی انسان سے بات نہیں کروں گی، یہ ان کی شریعت میں نہ بولنے کا روزہ مشروع تھا، جبکہ ہماری شریعت میں ایسا نہیں ہوتا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ استقرار حمل کے بعد تھوڑی ہی دیر میں وضع حمل کے آثار شروع ہوگئے، عام بچوں کی طرح نو ماہ کی مدت نہیں گزری، کیونکہ اتنی لمبی مدت تک حمل کا ظہور ہوجاتا، اور بدنامی کا چرچا قبل

از وقت ہوجاتا، اور صفائی کا معاملہ گھاٹے میں پڑ جاتا، قرین قیاس بھی یہی ہے، اور حرف "فا" تعقیب مع الوصل کے لئے ہے، یعنی ﴿فَحَمَلَتْهُ﴾ جمہور علماء نے کہا کہ عام عورتوں کی طرح حمل کی مدت نو ماہ گزرنے پر بچے کی پیدائش ہوئی، انہوں نے قیاس کر کے یہ کہا، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جس طرح استقرار حمل انوکھا اور معجزہ ہے اسی طرح وضع حمل اور معجزانہ طور پر ہے۔ وھو الصحیح۔ واللہ أعلم

علماء کرام نے کہا ہے کہ اس موقع پر عام حالات کے برعکس اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے تازہ اور تر کھجوروں کا انتظام اس لئے فرمایا کہ بچے کی ولادت سے پہلے اور بعد میں زچہ کے لئے یہ خوراک نہایت فائدہ مند ہے۔ اطباء حضرات کی بھی یہی رائے ہے، اور یہ عام معمول بھی ہے۔

....

فَأَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ۖ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿٢٧﴾ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ
اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ﴿٢٨﴾ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۖ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ
فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ﴿٣٠﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا
اَيْنَ مَا كُنْتُ ۠ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿٣١﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ
جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿٣٢﴾ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ﴿٣٣﴾

ترجمہ: سو وہ اس بچے کو اٹھا کر اپنی قوم کے پاس لے آئیں، ان لوگوں نے کہا: اے مریم! یہ تو تو نے غضب کا کام کیا ﴿٢٧﴾ اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارا باپ برا آدمی تھا، اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی ﴿٢٨﴾ سو مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا، وہ لوگ کہنے لگے کہ ہم اس سے کیسے بات کریں جو گہوارے میں ابھی بچہ ہی ہے؟ ﴿٢٩﴾ وہ بچہ بول اٹھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، مجھے اس نے کتاب عطا فرمائی ہے، اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے ﴿٣٠﴾ اور مجھے برکت والا بنایا ہے، میں جہاں کہیں بھی ہوں، اور اس نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے جب تک کہ میں زندہ رہوں ﴿٣١﴾ اور مجھے اپنی والدہ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا بنایا ہے، اور مجھے سرکش بدبخت نہیں بنایا ہے ﴿٣٢﴾ اور مجھ پر سلام ہے جس دن میں پیدا ہوا، اور جس دن مجھے موت آئے گی، اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا ﴿٣٣﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

حضرت مریم علیہا السلام پر انتہائی تکلیف اور نزاکت حال سے جو خوف طاری ہوا تھا اضطراب پیدا ہو گیا تھا فرشتے کی تسلی آمیز پکار اور عیسیٰ علیہ السلام جیسے نورانی و برگزیدہ بچے کے نظارے سے کافور ہو گیا، اور وہ اپنے لخت جگر کو دیکھ دیکھ کر شاد کام ہونے لگیں، تاہم یہ خیال پہلو میں ہر وقت کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا کہ اگرچہ خاندان اور قوم میری عصمت و پاکدامنی سے نا آشنا نہیں ہے، پھر بھی ان کی اس حیرت کو کس طرح مٹایا جاسکے گا کہ بن باپ کے کس طرح ان کے پیٹ سے بچہ پیدا ہو سکتا ہے؟

یہ ایک ایسا مرحلہ ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا گیا ہے، مگر جس خدائے بزرگ برتر نے ان کو یہ بزرگی اور برتری بخشی، وہ کب ان کو اس کرب و بے چینی میں مبتلا رہنے دیتا، اس لئے اس نے فرشتے کے ذریعہ مریم علیہا السلام کے پاس پھر یہ پیغام بھیجا کہ جب تو اپنی قوم میں پہنچے، اور وہ تجھ سے اس معاملہ کے متعلق سوالات کریں تو خود جواب نہ دینا، بلکہ اشارہ سے ان کو بتانا کہ میں روزہ دار ہوں، اور اس لئے آج کسی سے بات نہیں کر سکتی، تم کو جو کچھ دریافت کرنا ہے اس بچے سے دریافت کرلو، تب تیرا پروردگار اپنی قدرت کاملہ کا نشان ظاہر فرما کر ان کی حیرت کو دور اور ان کے قلوب کو مطمئن کر دے گا۔

مریم علیہا السلام وحی الٰہی کے ان پیغامات پر مطمئن ہو کر بچے کو گود میں لے کر بیت المقدس کو روانہ ہوئیں، جب شہر میں پہنچیں اور لوگوں نے اس حالت میں دیکھا تو چاروں طرف سے انہیں گھیر لیا، اور کہنے لگے: مریم! یہ کیا؟ تو نے تو بہت ہی عجیب غضب کی بات کر دکھائی، اور بھاری تہمت سر پر اٹھالی۔ اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا، اور نہ تیری ماں ہی بدچلن تھی، پھر تو یہ کیا کر بیٹھی؟

مریم علیہا السلام نے خدا کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے لڑکے کی جانب اشارہ کر دیا کہ جو کچھ دریافت کرنا ہے اس سے پوچھو اور معلوم کرلو، میں تو آج روزہ سے ہوں۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر انتہائی تعجب کے ساتھ کہا: ہم کس طرح ایسے شیرخوار اور نومولود بچے سے معلوم کر سکتے ہیں جو ابھی گہوارے میں بیٹھنے والا نومولود بچہ ہے؟ مگر بچہ ان کے پوچھنے سے پہلے فوراً بول اٹھا: میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، اللہ تعالیٰ نے (اپنے فیصلہ تقدیر میں) مجھ کو کتاب (انجیل) دی ہے، اور مجھے نبی بنایا ہے، اور مجھے مبارک بنایا ہے، خواہ میں کسی حال اور کسی جگہ ہوں، اور اس نے مجھ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے کہ جب تک میں زندہ رہوں، یہی میرا شعار ہے، اور اس نے مجھ کو اپنی ماں کا خدمت گزار بنایا ہے، اور خود سرو

نافرمان نہیں بنایا، اور اس کی جانب سے مجھ کو سلامتی کا پیغام ہے جس دن کہ میں پیدا ہوا، اور جس دن کہ میں مروں گا، اور جس دن کہ پھر زندہ اٹھایا جاؤں گا۔

یہ تفصیلات سورۂ مریم، سورۂ آل عمران، سورۂ انبیاء اور سورۂ تحریم میں ہیں۔قوم نے ایک شیر خوار نومولود بچے کی زبان حق بیان سے جب یہ حکیمانہ پُراز معارف وحکمت کلام سنا تو حیرت میں رہ گئی، اور اس کو مکمل یقین ہو گیا کہ مریم علیہا السلام کا دامن عفیف اور بلاشبہ ہر قسم کی برائی اور تلویث سے پاک ہے، اور یہ بچہ من جانب اللہ ایک مقدس ''نشان'' ہے۔

پس یہ خبر بڑے طمطراق اور دھوم دھام کے ساتھ قریب وبعید سارے جہاں میں پھیل گئی، جس سے بہت سوں نے ہدایت پائی، اور بہت سوں کے کفر وعناد میں مزید اضافہ ہوا، کیونکہ ہدایت ہر شخص کو راس نہیں آتی۔ تمام کائنات اور اس کی مخلوقات اور ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کی آیات اور نشانیاں موجود ہیں، تو کیا ان کے دیکھنے والے اور مطالعہ کرنے والے سب مسلمان ہیں؟ ہر زمانے میں ہدایت پانے والے اتنے تھوڑے ہوتے ہیں کہ ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، جبکہ غیر ہدایت یافتہ اور منکرین خدا کا شمار نہیں ہو سکتا۔

اسی بنیاد پر صحیح بخاری ومسلم میں حدیث ہے کہ قیامت کے دن ہزار لوگوں میں سے جنت کے لئے صرف ایک آدمی کا انتخاب ہوگا، جبکہ باقی نوسوننانوے کو جہنم بھیج دیا جائے گا۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے گہوارے میں بات کرنے سے چند آدمیوں کو ہدایت نصیب ہوئی، مگر پوری یہودی قوم بجائے ہدایت پانے کے گمراہ ہو کر اس کو ایک چال ہی قرار دیا۔

آج ہمارے معاشرہ کا بھی یہی حال ہے کہ ہر شخص اسلام کا دعویدار ہے، اور اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے نہیں تھکتا، لیکن قرآن پاک کو پیشے کے طور پر پڑھتے اور سیکھتے ہیں، انہیں قرآنی اعمال کے ساتھ کوئی دور کا واسطہ بھی نہیں، لیکن وہ اپنے آپ کو اچھا اور برحق مسلمان سمجھتے ہیں، جب قیامت کے دن بلکہ مرنے کے ساتھ سارا غبار صاف ہو جائے گا، تب ہر شخص کو معلوم ہوگا کہ وہ کتنے پانی میں تھا۔ کہیں دیکھو انبیاء کرام علیہم السلام کی پوجا ہو رہی ہے، کہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کفر کا فتویٰ لگ رہا ہے، کہیں دیکھو سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کی طرح مختار کُل اور عالم الغیب کہتے ہیں، کہیں عیسیٰ علیہ السلام خدا ہے یا خدا کا بیٹا ہے، کہیں عفت مآب حضرت مریم علیہا السلام پر بہتانوں کی بوچھاڑ ہے، کہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ خدا ہے، کہیں سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر بہتانوں کی یلغار ہے، کہیں قبروں پر سجدے اور طواف

ہیں، کہیں بتوں کی عبادت کا چرچا ہے۔ لوگوں نے خدا کی خدائی اور تصرف واختیارات کو مخلوقات پر بانٹ بانٹ کر تقسیم کرلیا ہے۔

اس وقت دنیا کی آبادی تقریباً ساڑھے چھ ارب انسانوں پر مشتمل ہے، جبکہ خالص موحد متبع سنت گنتی کے چند کروڑ ہوں گے، باقی کا خدا حافظ، شاید یہی آخری وقت ہے کہ حسنات ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں، اور سیئات و منکرات کا دور دورہ اور عروج ہوگا۔

ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ مَا كَانَ لِلّٰهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۖ سُبْحٰنَهٗ ۚ إِذَا قَضٰى أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهٗ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾ وَإِنَّ اللّٰهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ ﴿٣٦﴾ فَاخْتَلَفَ الْأَحْزَابُ مِنْ بَيْنِهِمْ ۖ فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيمٍ ﴿٣٧﴾ أَسْمِعْ بِهِمْ وَأَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَأْتُونَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُونَ الْيَوْمَ فِي ضَلٰلٍ مُّبِينٍ ﴿٣٨﴾ وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ ۘ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ﴿٣٩﴾ إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

ترجمہ: یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم، ہم نے سچی بات کہی ہے جس میں وہ لوگ شک کر رہے ہیں ﴿۳۴﴾ یہ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنی اولاد بنائے، وہ اس سے پاک ہے جب وہ کسی کام کا فیصلہ فرماتا ہے تو صرف یوں فرمادیتا ہے: ہوجا، سو وہ ہوجاتا ہے ﴿۳۵﴾ اور بلاشبہ اللہ جلّ شانہ میرا ربّ ہے، اور تمہارا ربّ ہے، سو خالص اس کی عبادت کرو، یہ سیدھا راستہ ہے ﴿۳۶﴾ پھر جماعتوں نے آپس میں اختلاف کیا، سو بڑے دن کی حاضری کے موقع پر ان لوگوں کی بڑی خرابی ہے جنہوں نے کفر کیا ﴿۳۷﴾ وہ کیا ہی سننے والے، اور کیا ہی دیکھنے والے ہوں گے جس دن ہمارے پاس آئیں گے، لیکن ظالم لوگ آج صریح گمراہی میں ہیں ﴿۳۸﴾ اور آپ انہیں حسرت کے دن سے ڈرایئے جبکہ فیصلہ کردیا جائے گا، اور وہ غفلت میں ہیں، اور ایمان نہیں لاتے ﴿۳۹﴾ بلاشبہ زمین اور جو کچھ زمین میں ہے ہم اس کے وارث ہوں گے، اور سب ہماری طرف لوٹائے جائیں گے ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

ابھی ابھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان حق بیان سے حکمت کی باتیں بیان ہوئیں فرمایا: (۱) میں اللہ کا

بندہ اور اس کی مخلوق ہوں۔ (۲) مجھے اللہ تعالیٰ نے کتاب عطا کی ہے۔ (۳) مجھے اللہ تعالیٰ نے نبی بنایا ہے۔ (۴) مجھے اللہ تعالیٰ نے برکت والا بنایا ہے۔ (۵) مجھے بندگی کرنے کا حکم دیا ہے۔ (٦) نماز وزکوٰۃ کا حکم دیا ہے، جب تک کہ زندہ ہوں اس کی عبادت کرتا رہوں (۷) مجھے اپنی والدہ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ملا ہے۔ (۸) مجھے سرکش و نافرمان بدبخت نہیں بنایا ہے۔ (۹) مجھ پر پیدائش کے دن۔ (۱۰) مرنے یعنی وفات پانے کے دن اور قیامت کو (۱۱) زندہ اٹھائے جانے کے وقت سلامتی ہو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے لئے گیارہ صفات بیان کیں، یہ تمام صفات مخلوق کی ہیں، ان میں کوئی ایک صفت ایسی نہیں جو کہ اللہ تعالیٰ کے لئے ثابت ہو، کیونکہ خالق ومخلوق میں افتراق وتضاد ہے، اللہ تعالیٰ کی کوئی ایسی صفت نہیں جو مخلوق میں ہو، اور مخلوق کی کوئی بھی ایسی صفت نہیں جو (العیاذ باللہ) خالق میں موجود ہو، یہ ہے وہ قول حق جسے پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا، جس میں ازلی اور فطری گمراہ لوگوں نے اختلاف کیا، اور حق چھوڑ کر اپنی خواہشات کی بنیاد پر طرح طرح کے عقائد اور بدتر سے بدتر مزعومات کو رواج دے دیا۔

چنانچہ یہود نے آپ علیہ السلام کی نبوت کا انکار کیا، آپ علیہ السلام کی تکذیب کی، اور آپ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ پر تہمت لگائی، اور آپ علیہ السلام کے قتل کے درپے ہوگئے۔ اور ان کے برعکس نصاریٰ نے یہ کہا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ﴾ [المائدۃ: ١٧] (یعنی اللہ تعالیٰ اُنہی کی ذات ہے، وہ خود خدا ہے)۔ اور دوسرے نصاریٰ نے ایک قدم نیچے آکر آپ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا۔ تیسرے گروہ نے تین خداؤں کا رٹ لگا کر آپ علیہ السلام کو تیسرا خدا تسلیم کیا، ﴿ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ﴾ [المائدۃ: ٧٣] (تین میں سے تیسرا)۔ العیاذ باللہ

﴿ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ﴾ یہ ہیں عیسیٰ بن مریم علیہما السلام جنہیں لوگ خدا یا خدا کا بیٹا مانتے ہیں، جبکہ انہوں نے گزشتہ آیات میں خود اپنا تعارف کر دیا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار بندہ اور مریم علیہا السلام کا بیٹا ہوں۔ حضرت اصحمہ نجاشی بادشاہ حبشہ نے ایک تنکہ ہاتھ میں لے کر کہا تھا کہ خدا کی قسم جو کچھ تم نے (جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ) کہا ہے عیسیٰ علیہ السلام کی شان اس تنکے سے زیادہ نہیں جسے تمہارے قرآن نے صحیح بیان کیا، بغیر کسی کمی کے، حالانکہ بادشاہ حبشہ اس وقت اپنی نصرانیت پر قائم تھے۔

﴿قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ﴾ سچی بات یہی ہے، مگر لوگ گمراہی اور جہالت کی بنیاد پر اس میں اختلاف کرتے ہیں جیسا کہ یہودیوں نے حد سے زیادہ ان کی شان میں بیہودہ باتیں کیں، اور نصاریٰ نے انہیں خدا یا

خدا بیٹا یا ثالث ثلثہ کہا، اس طرح یہ دونوں دین سے خارج ہو گئے، کیوں نہیں ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ﴾ [الزخرف: ۵۹] (وہ نہیں ہیں، مگر ہمارا بندہ جس پر ہم نے انعام کیا ہے) جس کی عبدیت مسلم ہو اس کی تکذیب کفر نہیں تو کیا ہے؟

﴿مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ﴾ اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں کہ وہ کسی مخلوق کو اپنا بیٹا بنائے، یا کسی کو اپنا شریک بنائے یا وزیر و مشیر و ہمسر بنائے، اس کی وہی شان ہے جسے مختصر الفاظ میں سورۂ اخلاص میں بیان فرمائی، اس کی شان یہ ہے کہ:

﴿سُبْحٰنَهٗ﴾ وہ ہر قسم کے شریک اور عیوب ونقائص سے پاک ہے، جب بھی کسی تخلیق کا ارادہ فرماتا ہے تو ایک ہی کلمہ ''کن'' سے اسے نیست سے ہست کر دیتا ہے، تو اسے کسی اولاد یا شریک کی ضرورت ہی کیا ہے، یہ چیزیں عاجز و کمزوروں کے لئے ہیں نہ کہ قادر مطلق اللہ عزّ شانہ کے لئے۔

﴿اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ﴾ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو کہتا ہے: ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے، جب وہ سو سالہ بوڑھوں کو اور بانجھ عورتوں کو اور بغیر باپ کے پاکیزہ مریم علیہا السلام کو حق پرست پیغمبر بیٹا عطا کر سکتا ہے، تو اسے اپنے لئے اولاد کی کیا ضرورت؟ وہ ہر چیز پر قادر و توانا ہے، اسی وجہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی اُلوہیت کا صغرسنی اور کہولت دونوں میں اعلان فرمایا:

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ﴾ اے بنی اسرائیل کے لوگو! بیشک میرا اور تمہارا ربّ اللہ تعالیٰ ہی ہے، سو اسی کی عبادت کرو، سیدھا راستہ یہی ہے۔ حجۃ المفسرین صاحب روح المعانی لکھتے ہیں کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب واحد الجبار جلّ جلالہ حضرت مسیح علیہ السلام سے براہ راست قیامت کے دن خطاب فرمائیں گے: ﴿يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ [المائدۃ: ۱۱٦] (کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنا لو اللہ کے سوا؟)۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے پرکپکی طاری ہو جائے گی، دہشت کی وجہ سے آپ علیہ السلام کے بال کھڑے ہو جائیں گے، اور ان کے نیچے سے خون جاری ہو جائے گا، اور یہ حالت پانچ سو سال تک طاری رہے گی، اور وہ زبان سے کچھ نہیں بول سکیں گے، اس کے بعد حق تعالیٰ شانہ ان کے دل میں القاء کریں گے تو وہ سوال کا جواب دیں گے اور اپنی براءت کا اظہار کریں گے۔ [روح المعاني]

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول سورۂ مائدہ میں ہے: ﴿وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ [المائدۃ:۷۲] (اور مسیح نے کہا: اے بنی اسرائیل! اللہ کی عبادت کرو جو میرا بھی پروردگار ہے، اور تمہارا بھی پروردگار ہے۔ یقیناً جو شخص اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے اللہ نے اس کے لیے جنت حرام کردی ہے، اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے)۔ آگے ارشاد ہے:

﴿فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ﴾ پس کئی گروہ اور فرقے بن گئے جنہوں نے آپس میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا۔ دراصل قوموں کا اختلاف اللہ تعالیٰ کا ایک عذاب ہے، یہ کوئی نیک شگون نہیں، جب اللہ تعالیٰ قوموں یا مخصوص طبقوں سے یا گھرانوں سے ناراض ہوتا ہے تو اپنا عذاب ان پر نازل کرتا ہے جس کے نتیجے میں وہ آپس میں دست بگریبان ہوکر ایک دوسرے کی تذلیل پر اتر آتے ہیں، اور خوب آپس میں اختلاف کرنے لگ جاتے ہیں، اس لئے فرمایا:

پس ہلاکت ہے کفر کرنے والوں کے لئے بڑے دن کی حاضری کے وقت، بڑے دن سے مراد قیامت کا دن ہے جبکہ کافروں کا بہت برا حال ہوگا۔

﴿اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا﴾ یہ لوگ (دنیا کے برعکس) خوب سنتے اور خوب دیکھتے ہوں گے جس دن ہمارے پاس آئیں گے قیامت والے دن ان پر ہر چیز واضح ہوجائے گی، کیونکہ وہاں ان کا سارا غرور زیروزبر ہوجائے گا، جبکہ آج وہ نہ حق سننے کے لئے تیار ہیں، اور نہ آیات ربانی کے مشاہدہ پر آمادہ ہیں، آج وہ سماعت وبصارت دونوں سے بیگانہ ہیں، وہاں یہی بہرے اندھے سننے اور دیکھنے والے بن جائیں، مگر یہ انہیں کام نہیں آئیں گے، اسی کو فرمایا:

﴿لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ آج کے دن یہ ظالم ومشرک کھلی گمراہی میں پڑے ہیں، ظالموں سے مراد مشرک اور کافر ہیں۔ ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾[لقمان:۱۳] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔ اسی طرح: ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾[البقرۃ:۲۵۴] (کفر کرنے والے ہی ظالم تو ہیں) اور مشرک سب سے بڑا ظالم ہی ہے۔ یہ لوگ دنیا میں حق سننا بجائے خود بلکہ وہ حق اور اہل حق کا مذاق اڑاتے ہیں، کیونکہ جب شیطان کسی پر مسلّط ہوجاتا ہے تو وہ حق کا دشمن بن جاتا ہے، اور باطل پر خوشی محسوس کرتا ہے، اور اس کی پیروی کرتا ہے۔

﴿وَاَنۡذِرۡهُمۡ يَوۡمَ الۡحَسۡرَةِ اِذۡ قُضِيَ الۡاَمۡرُ﴾ آپ ان کو حسرت کے دن سے ڈرائیں جس دن کہ معاملے کا فیصلہ کیا جائے گا، وہ حسرت کا دن قیامت کا دن ہوگا، جب اہل ایمان جنت میں استقرار پائیں گے، اور اہل شرک واستہزاء کرنے والے جہنم میں ڈالے جائیں گے۔ جہنمی کبھی سوچتے ہوں گے کہ شاید شدّت عذاب جان لیوا ثابت ہو، پس مرکر فنا ہوجائیں گے، اس طرح جان خلاصی ہوجائے گی تو ایسے وقت میں موت کو ایک جانور کی شکل میں لایا جائے گا، اور اسے جنت اور دوزخ کے درمیان نمایاں جگہ پر کھڑا کیا جائے گا، جہاں سے جنتی اور دوزخی سب اسے دیکھ سکیں گے۔

پھر دونوں فریقوں سے پوچھا جائے گا کہ جانتے ہو یہ کیا ہے؟ سب کہیں گے: ہاں! موت ہے، پھر اس کو ذبح کیا جائے گا، اور سب کے سامنے اعلان ہوگا کہ موت کو موت آچکی، اب آئندہ خُلُوْدٌ وَلَا مَوْتَ۔ اب تم سب جہاں کہیں ہو ہمیشہ کے لئے وہیں رہو گے، جنتی جنت میں، اور دوزخی دوزخ میں، آئندہ کسی کو موت نہیں آئے گی، اور ہمیشہ زندہ ہی رہو گے۔ اس اعلان پر جنتیوں کی خوشی میں بے پناہ اضافہ ہوگا، اور جہنمیوں کے غم ورنج میں بے پناہ حسرتوں کا اضافہ ہوگا۔ یہی دن یوم الحسرت کا دن ہے، حسرت کے معنی ہیں افسوس اور بے انتہا پشیمانی۔

﴿وَهُمۡ فِيۡ غَفۡلَةٍ وَّهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ آج یہ لوگ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، اور ایمان قبول نہیں کرتے، ان کو خبردار کریں کہ حسرتوں کا دن آنے والا ہے جہاں تمہارے لئے ہلاکت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے: لَيۡسَتۡ حَسۡرَةٌ عَلٰى اَهۡلِ الۡجَنَّةِ اِلَّا عَلٰى سَاعَةٍ مَرَّتۡ بِهِمۡ وَلَمۡ يَذۡكُرُوا اللّٰهَ فِيۡهَا۔ [طبرانی] اہل جنت کے لئے اس سے زیادہ حسرت کسی بات پر نہیں ہوگی کہ انہوں نے فلاں وقت پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کیوں نہ کیا، اگر فارغ اوقات میں اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے تو آج درجات مزید بلند ہوجاتے، یعنی جنتی تضییع اوقات پر اسی طرح کم نیکیاں کرنے پر حسرت کریں گے، اور بُرے لوگ نیکیاں نہ کرنے پر اور گناہوں کی کثرت پر حسرت کریں گے۔

یہی حال دنیا کا بھی ہے کہ محنتی شخص اور بیکار شخص دونوں حسرت کرتے رہتے ہیں، یہ اور بات ہے کہ یہاں حسرتوں کا تدارک ممکن ہے، جبکہ وہاں حسرتوں کا نہ تدارک ہے نہ علاج۔

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَرِثُ الۡاَرۡضَ وَمَنۡ عَلَيۡهَا﴾ ہم ہی وارث ہیں پوری زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر موجود ہے، یہ دنیا چند روز کا کھیل ہے، ایک دن ایسا آئے گا کہ یہاں سے سب جائیں گے، اور ان کا سب کچھ بطور میراث وپسماندہ ان سے رہ جائے گا، اس وقت سب چیزیں ہماری ملکیت میں ہوں گی، اور ہم ہی وارث بنیں گے، جبکہ ان کی

مجازی ملکیت بھی ان کے لئے نہیں رہے گی۔

﴿وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ﴾ اور سب ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے، اچھے برے سب ہمارے پاس حساب وکتاب کے لئے جمع کئے جائیں گے، اور جزاوسزا کا فیصلہ بھی ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ يٰأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ
وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾ يٰأَبَتِ إِنِّي قَدْ جَاءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِي أَهْدِكَ
صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾ يٰأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۖ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يٰأَبَتِ إِنِّي أَخَافُ
أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ اٰلِهَتِي يٰإِبْرٰهِيمُ ۖ
لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ ۖ وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّي ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي
حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُو رَبِّي عَسَىٰ أَلَّا أَكُونَ بِدُعَاءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾
فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾
وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾

ترجمہ: اور کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجئے، بیشک وہ صدیق تھے نبی تھے ﴿٤١﴾ جبکہ انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ اے میرے باپ! تم ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے ہو جو نہ سنے اور نہ دیکھے اور نہ تمہارے کچھ کام آسکے؟ ﴿٤٢﴾ میرے باپ! میرے پاس ایسا علم آیا ہے جو تمہارے پاس نہیں آیا، سو تم میرا اتباع کرو، میں تمہیں سیدھا راستہ بتاؤں گا ﴿٤٣﴾ اے میرے باپ! تم شیطان کی پرستش نہ کرو، بلاشبہ شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے ﴿٤٤﴾ اے میرے باپ! بلاشبہ میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تمہیں رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب پکڑ لے، پھر تم شیطان کے دوست ہو جاؤ ﴿٤٥﴾ ان کے باپ نے جواب دیا کہ اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے ہٹنے والا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور ضرور سنگسار کردوں گا، اور تو مجھے ہمیشہ کے لئے چھوڑ دے ﴿٤٦﴾ ابراہیم نے کہا کہ میرا اسلام لے لو، میں تمہارے لئے عنقریب اپنے ربّ سے استغفار کروں گا، بلاشبہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے ﴿٤٧﴾ اور میں تم لوگوں سے اور ان چیزوں سے کنارہ کشی کرتا ہوں، جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہو، اور میں اپنے ربّ کو پکارتا ہوں۔ امید ہے کہ میں

اپنے ربّ کے پکارنے سے محروم نہ رہوں گا۴۸ پھر جب ان لوگوں سے اور ان چیزوں سے علیٰحدگی اختیار کرلی جن کی وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے تو ہم نے انہیں اسحٰق اور یعقوب عطا فرمادیئے، اور ہر ایک کو ہم نے نبی بنادیا ۴۹ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت کا حصہ دیدیا، اور ہم نے ان کے لئے سچائی کی زبان کو بلند کیا۵۰

معارف ومنازل

حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے تذکرے کے بعد دیگر انبیاء علیہم السلام کا تذکرہ ہورہا ہے، جس میں سرفہرست جدالانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ ہے۔ سورۂ بقرہ میں آپ علیہ السلام کا تفصیلی تذکرہ بیان ہوا، پھر سورۂ آل عمران اور سورۂ انعام میں بھی یہاں آپ علیہ السلام کا اپنے والد کے ساتھ جو دعوتی مکالمہ ہوا تھا اسی کا بیان ہے۔ سورۂ انعام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو یوں خطاب کیا تھا: ﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ [الأنعام: ۷۴] (اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو؟ بیشک میں تمہیں اور تمہاری قوم کو کھلی گمراہی میں دیکھ رہا ہوں)۔

فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ آپ قرآن حکیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر یعنی ان کا واقعہ بیان کریں، وہ موحدین کے پیشوا، اور اہل حق کے امام تھے، جن کا مرتبہ یہ ہے کہ وہ صدیق یعنی سچے، راستباز اور نبی تھے، اسی وجہ سے وہ خلیل اللہ کے مرتبے پر فائز ہوئے، اور بہت سے امتحانات اور کٹھن آزمائشوں میں کامیاب رہے۔

﴿اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ﴾ اے میرے باپ! عربی محاورہ میں یہ کلمہ محبت کے انداز میں استعمال ہوتا ہے، جیسے يٰبُنَيَّ اے میرے بیٹے جاں! اسی طرح ابو جی! یہ محبت و پیار کے الفاظ ہیں۔

﴿لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا﴾ آپ ان کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو نہ دیکھتے ہیں نہ سنتے ہیں، نہ آپ کے کسی کام آسکتے ہیں، آپ نے ان بتوں کو خود اپنے ہاتھوں سے بنایا، پھر اپنے ہاتھوں سے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھا، نہ ان میں جان ہے نہ حرکت، ان سے تو آپ خود ہزار درجہ بہتر ہیں، چلتے پھرتے ہیں اور دیکھتے سنتے ہیں، یہ آپ کو نہ فائدہ دے سکتے ہیں نہ نقصان، ان کی عبادت سراسر حماقت اور

جہالت وگمراہی ہے، لہٰذا انہیں چھوڑ کر اس قادر مطلق خدا کی عبادت کریں جو پورے جہاں کا خالق و مالک اور کارساز ہے۔

﴿يٰۤاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا﴾ اے میرے باپ! تحقیق میرے پاس ایک ایسا علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا، لہٰذا میں آپ کو علی وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ میری اطاعت کریں، میری بات پر یقین کریں، میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا، اور ہدایت کا راستہ دکھاؤں گا۔ یہ بات مسلّم ہے کہ وحی الٰہی وہ یقینی اور پختہ علم ہے کہ دنیا میں جتنے علوم مروج ہیں وہ سب سے فائق اور اعلیٰ بھی اور یقینی بھی ہے، اور یہ علم انبیاء علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، پھر ان کے توسط سے ان کے نائبین کو منتقل ہوتا ہے، اور یہ علم سراسر اللہ تعالیٰ شانہ کی رحمت ہے، اور خیر کثیر بھی ہے۔ آگے فرمایا:

﴿ يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا﴾ اے میرے باپ! شیطان کی عبادت نہ کریں۔

﴿وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ﴾ شیطان کی عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ اس کے نقش قدم پر مت چلو، اس کی بات نہ مانو، اس کی تابعداری نہ کرو، اس کے کہنے پر شرک نہ کرو، کیونکہ وہ رحمٰن عزّ شانہ کا نافرمان اور راندۂ درگاہ ہے، وہ یہی چاہتا ہے کہ لوگ توحید الٰہی کو چھوڑ کر زیادہ سے زیادہ شرک اختیار کریں، اور جہنم کو بھر دیں، جنت سے کٹ جائیں، اس نے تو روز اوّل سے کہہ دیا تھا: ﴿قَالَ فَبِمَاۤ اَغْوَيْتَنِيْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ [الأعراف:١٦] (چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے اس لیے میں قسم کھاتا ہوں کہ ان کی گھات لگا کر تیرے سیدھے راستے پر بیٹھ رہوں گا)۔

اسی طرح کہا: ﴿قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ﴾ [ص:٨٢] (تیری عزّت کی قسم میں ان سب کو گمراہ کروں گا)۔ تو نے مجھے گمراہ ٹھہرادیا ہے، تو اب میں بھی تیرے سیدھے راستے میں بیٹھ کر ان کو گمراہ کروں گا۔ بقول حضرت یحییٰ منیری رحمۃ اللہ علیہ شیطان نے سات لاکھ سال عبادت کی مگر ایک سجدہ کے انکار سے مردود ورجیم ٹھہرا، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ﴾ [ص:٨٢] (جنت سے نکل جا، تو مردود ہے)۔

پھر فرمایا: ﴿يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا﴾ اے میرے باپ! مجھے ڈر ہے کہ آپ کو رحمٰن جلّ شانہ کی طرف سے عذاب نہ پہنچ جائے، پس آپ شیطان کے دوست

(ساتھی) بن کر رہ جائیں گے، کیونکہ جو شخص شیطان کی بات مانے اور اس کے کہنے پر شرک ومعاصی کا ارتکاب کرے وہ شیطان کا دوست وہمنوا بنے گا، اور رحمٰن عزّ شانہ کے عذاب کا حقدار ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شفقت و محبت آمیز پند ونصیحت کا ان کے باپ آزر نے یہ جواب دیا:

﴿قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ﴾ کہنے لگا: اے ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے اعراض کرنے والا ہے؟ یعنی بیزاری کا اظہار کرنے والا ہے۔ "رَغِبَ" کے بعد فِيْ آجائے تو رغبت وخواہش کے معنی میں ہوگا، اور اگر "رَغِبَ" کے بعد عَنْ آجائے تو اعراض وبیزاری کے معنی میں ہوگا، یہاں یہی مطلب ومعنی ہے۔ پھر باپ نے نہایت ناراضگی کے عالم میں دھمکی آمیز لہجہ میں کہا:

﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ مجھ سے دور ہوجاؤ ایک زمانے تک، یا ہمیشہ کے لئے مجھے چھوڑ دو، میں تمہاری شکل وصورت نہیں دیکھنا چاہتا، مجھ سے دور ہوجا، آزر ویسے بھی تو مشرک جاہل تھا، اور جاہل کا جواب بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ نرمی کے وعظ ونصیحت پر بگڑ کر احمقانہ جواب دیتا ہے۔ اب سنو گالی کا جواب دعاء سے:

﴿قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ﴾ کہنے لگے: اے باپ! آپ پر سلامتی ہو، اس کو سلام متارکت کہتے ہیں، جیسے: ﴿وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ [الفرقان:٦٣] (جب ناداں لوگ ان سے بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: تمہیں سلام ہے)۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کا یہ طریقہ ہے کہ جب جاہل لوگ ان سے غلط بات کہتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر نکل جاتے ہیں، اور جہالت کا جواب جہالت سے نہیں دیتے ہیں۔

﴿سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ﴾ میں اپنے پروردگار سے آپ کے لئے بخشش کی دعا کروں گا۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا﴾ میرا پروردگار میرے ساتھ بڑا مہربان ہے، امید ہے کہ میری دعا قبول ہوجائے گی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ مغفرت کی (ہدایت ومغفرت کی) دعا کرنے کا وعدہ کیا تھا، اس لئے اپنے باپ کے لئے مغفرت کی دعا کی، اور کہا: ﴿وَاغْفِرْ لِاَبِيْٓ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الضَّآلِّيْنَ﴾ [الشعراء:٨٦] (اور میرے باپ کی مغفرت فرما، بیشک وہ گمراہوں میں سے ہے)۔ مگر جب معلوم ہوا کہ ان کے باپ کا خاتمہ کفر پر ہوا تو انہوں نے اس کے لئے استغفار کرنا چھوڑ دیا، سورۂ توبہ میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَهَآ اِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗٓ اَنَّهٗ عَدُوٌّ لِّلّٰهِ تَبَرَّاَ مِنْهُ﴾ [التوبة:١١٤] (اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے مغفرت مانگنا اس وعدے کی وجہ ہی سے تھا جو اس کے ساتھ کیا تھا، اور جب معلوم ہوا کہ وہ اللہ کے دشمنوں میں

سے ہے تو اس سے بیزاری اختیار کی)۔ اس آیت کا مطلب اور پوری تفسیر وہاں سورۂ توبہ میں دیکھی جائے۔

﴿وَاَعۡتَزِلُكُمۡ وَمَا تَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ﴾ اور میں تم لوگوں سے اور ان چیزوں سے کنارہ کش ہوتا ہوں جن کی تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو اور پکارتے ہو۔

﴿وَاَدۡعُوۡا رَبِّیۡ﴾ اور میں اپنے ربّ کو پکارتا ہوں۔ ﴿عَسٰۤی اَلَّاۤ اَكُوۡنَ بِدُعَآءِ رَبِّیۡ شَقِیًّا﴾ امید ہے کہ میں اپنے ربّ کی دعا سے محروم نہ ہوں گا، یعنی تم لوگ جس شقاوت میں مبتلا ہو غیر اللہ کی عبادت اور پکارنے کی وجہ سے میں اس سے کنارہ کش رہ کر ہر قسم کی شقاوتوں سے محفوظ رہوں گا۔

﴿فَلَمَّا اعۡتَزَلَهُمۡ وَمَا یَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَهَبۡنَا لَهٗۤ اِسۡحٰقَ وَیَعۡقُوۡبَ﴾ پھر جب ان لوگوں سے اور ان چیزوں سے کنارہ کش ہو گئے جن کی وہ عبادت کرتے تھے تو ہم نے انہیں اسحٰق اور یعقوب عطا کر دیئے۔ یہاں اختصار سے کام لیا گیا ہے، تفصیل وہی ہے جو سورۂ انعام میں بیان ہوئی۔

﴿وَكُلًّا جَعَلۡنَا نَبِیًّا﴾ ہم نے ان دونوں یعنی اسحٰق اور یعقوب علیہما السلام کو نبوت عطا کی، پوری قوم بنی اسرائیل حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔

﴿وَوَهَبۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِیًّا﴾ اور ہم نے ان کو اپنی رحمت کا بڑا حصّہ دیدیا، اور ہم نے ان کے لئے سچائی کی زبان کو بلند کر دیا، بہت بڑی نعمت اور رحمت نبوّت ہے، نبوّت کے علاوہ ان کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی دینی، دنیاوی، مادی، روحانی، علمی اور عملی نعمتوں سے سرفراز فرمایا، تقریباً چار ہزار پیغمبر اُن کی نسل میں مبعوث ہوئے، اور بعد میں آنے والی امتوں میں خیر و اچھائی اور سچائی کے ساتھ ان کا ذکر خیر جاری رہا، اسی ذکر خیر کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوصی دعا کی تھی: ﴿وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ﴾ [الشعراء: ۸۴] (اور آنے والی نسلوں میں میرے لیے وہ زبانیں پیدا فرمادے جو میری سچائی کی گواہی دیں)۔

اللہ تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرمائی، ان کا اور ان کی آل و اولاد کا ذکر و تذکرہ آنے والی امتوں میں خیر و خوبی کے ساتھ جاری رکھا، خصوصاً امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی شریعت جو ملّت ابراہیمی کی تفسیر و تفصیل ہے، قبلہ، عرفات، مزدلفہ، حجر اسود، آب زمزم، صفا و مروہ اور دیگر مناسک حج تمام کے تمام ملّت ابراہیمی کی یادگار ہیں، اور پورے عالم اسلام میں قربانی اور تمام نمازوں میں سلام سے پہلے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسم گرامی کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر درود بھی ہے، اور آپ کا تذکرہ بھی ہے، سو یہ ذکر خیر قیامت تک باقی رہے گا۔ اس کی باقی کڑیوں کا

ذکر خیر دیگر انبیاء بنی اسرائیل اور دیگر انبیاء کے ساتھ یہ ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾

ترجمہ: اور کتاب میں موسیٰ کو یاد کیجئے، بلاشبہ وہ خاص کئے ہوئے تھے، اور وہ رسول تھے اور نبی تھے﴿۵۱﴾ اور ہم نے انہیں طور کی داہنی جانب سے پکارا، اور انہیں سرگوشی کرنے والا اپنا مقرب بنایا﴿۵۲﴾ اور ہم نے انہیں اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبوت عطا کی﴿۵۳﴾ اور کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے، بلاشبہ وہ وعدہ کے سچے تھے اور رسول تھے اور نبی تھے﴿۵۴﴾ اور وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے، اور اپنے ربّ کے نزدیک پسندیدہ تھے﴿۵۵﴾ اور کتاب میں ادریس کو یاد کیجئے، بلاشبہ وہ صدیق نبی تھے﴿۵۶﴾ اور ہم نے ان کو بلند مرتبہ پر اٹھالیا﴿۵۷﴾

معارف ومنازل

حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کے واقعات کے بعد یہ چوتھا قصہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے، خلیل اللہ علیہ السلام کے بعد کلیم اللہ علیہ السلام کا قصہ ذکر فرمایا، اس قصے میں موسیٰ علیہ السلام کی پانچ صفتوں کا تذکرہ ہے:

(۱) مخلص، یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے منتخب برگزیدہ بندے تھے۔ (۲) رسول اور نبی تھے۔ (۳) ان سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔ (۴) ان کو اپنا مقرب بنایا۔ (۵) ان کی فرمائش سے ان کے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کو نبی بنایا، چنانچہ فرماتے ہیں:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰى اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ آپ کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا قصہ لوگوں کو پڑھ کر سنائیے، بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے منتخب چیدہ اور برگزیدہ بندے تھے اور رسول و نبی تھے۔ رسول کے معنی یہ ہیں کہ وہ فرستادہ خداوندی تھے (اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قاصد تھے) اور نبی کے معنی یہ ہیں کہ مخلوق کو احکام خداوندی سے آگاہ کرنے والے اور خبر دینے والے۔ بعض لوگ جیسے علامہ تفتازانی وغیرہ نبی اور رسول کو ایک مانتے

ہیں، ان میں فرق نہیں کرتے ہیں، یہی رائے معتزلہ کا بھی ہے، اور عرف عام میں یہی معنی رائج ہے۔ اور جمہور اہلسنت کے نزدیک نبی عام ہے اور رسول خاص ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول وہ ہے جس کو مستقل کتاب اور مستقل شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہو، اور صاحب معجزات بھی ہو، اور نبی وہ ہے کہ احکام الٰہی سے لوگوں کو خبر دینے والا ہو، گو اس کے پاس مستقل شریعت اور مستقل کتاب نہ ہو۔

بعضوں کے نزدیک رسول عام ہے جو کہ انسانوں سے بھی ہوتا ہے اور ملائکہ سے بھی، اور نبی انسانوں ساتھ خاص ہے۔ پھر بعضوں کے نزدیک رسول و نبی میں نسبت عموم و خصوص من وجہ کی ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک نسبت عموم و خصوص مطلق کی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ رسول وہ ہے جس کو تبلیغ احکام کے ساتھ جہاد بالسیف کا بھی حکم ہو، جبکہ نبی صرف تبلیغ احکام کے لئے ہے، اسے تلوار کے ساتھ جہاد کا حکم حاصل نہیں۔

﴿وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا﴾ اور ہم نے موسیٰ کو کوہ طور کے دائیں جانب سے آواز دی، جب وہ مدین سے مصر کے سفر پر تھے اور پہاڑ آپ علیہ السلام کے دائیں طرف واقع تھا، اور ہم نے ان کو قریب کرلیا، راز کی باتیں سنانے کے لئے اور بلا واسطہ کلام کرنے کے لئے، تو اس قرب سے قرب مسافت مراد نہیں، بلکہ قرب مقام و منزلت مراد ہے، اور یہ نداء، نداء رسالت تھی۔

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا﴾ اور ہم نے اپنی رحمت اور مہربانی سے ان کے بھائی ہارون کو نبوّت عطا فرمائی، جب موسیٰ علیہ السلام نے درخواست کی: ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ﴾ [طٰہٰ: ٢٩] (اور میرے خاندان سے میرے لیے ایک مددگار مقرر کر دیجئے)۔ تو ہم نے ان کی درخواست قبول کر لی، اور ان کے بھائی ہارون علیہ السلام کو نبوت عطا فرمائی تا کہ وہ اپنے بھائی موسیٰ علیہ السلام کے معاون بنے رہے۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے فرزند ہیں، آپ علیہ السلام حضرت اسحٰق علیہ السلام سے تیرہ سال عمر میں بڑے ہیں، آپ علیہ السلام کی والدہ حضرت ہاجرہؓ ہیں، آپ علیہ السلام عرب حجاز کے جد اعلیٰ ہیں۔

حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور آپ علیہ السلام کے سبب سے ہوا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کی شریعت مستقل تھی، آپ علیہ السلام نبی اور رسول تھے (موسیٰ علیہ السلام کی طرح) اس لئے اللہ تعالیٰ شانہ نے ان کے قصے کو ان کے باپ ابراہیم علیہ السلام کے قصے کے ذیل میں بیان نہیں فرمایا، بلکہ مستقل جداگانہ طریقہ سے ان کا ذکر فرمایا، اور ان کی چار

صفات بیان فرمائیں:

(١) آپ صادق الوعد تھے۔(٢) رسول اور نبی تھے۔(٣) اہل وعیال کو جانی اور مالی عبادات کا حکم دیتے تھے۔(۴) وہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ تھے، جب کسی بندے سے رب تعالیٰ من کل الوجوہ راضی ہو تو وہ "مرضی" کہلائے گا۔

﴿اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ سے ﴿مَرْضِيًّا﴾ تک: تحقیق وہ وعدے کے بڑے سچے اور پابند تھے، جو وعدہ کرتے اسے پورا کرتے۔ایک مرتبہ ایک شخص سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک تو واپس نہ آئے میں یہاں تمہارے انتظار میں رہوں گا، وہ شخص تین دن کے بعد واپس آیا آپ علیہ السلام برابر تین دن اسی جگہ کھڑے رہے۔سنن ابوداؤد میں بعینہ اسی طرح کا واقعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق منقول ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کے ساتھ وعدہ فرمایا، چنانچہ تین روز اپنے وعدے کے مطابق اسی میدان میں کھڑے رہے، چوتھے روز وہ شخص حاضر ہوا اور معذرت کی۔اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے اپنے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ وعدہ کیا کہ میں قربان ہوتے ہوئے صبر ہی کروں گا، جب قربان گاہ پہنچے تو خود بخوشی ومرضی لیٹ گئے اور باپ سے کہا کہ آپ اپنا کام پورا کر لیجئے، اور ربّ تعالیٰ کا حکم بجالایئے۔یہ ہے مَرْضِيًّا کی تفسیر اور ایفاء عہد کی تاریخی پیشکش۔صلی اللہ علیهم وعلی جمیع المرسلین۔

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی ☆ سکھایا جس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی

﴿وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا﴾ آپ علیہ السلام رسول اور نبی تھے۔آپ علیہ السلام قبیلہ جرہم کی طرف مبعوث ہوئے تھے، اور وہ اپنے گھر والوں اور خاندان والوں کو نماز اور زکوٰۃ اور ہر قسم کی طاعات وعبادات بدنی اور مالی کا پابندی کے ساتھ امر کرتے تھے۔

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ اسی کا پیغام ہے کہ اصلاحی کام کی ابتداء اپنے گھر سے شروع کیا جائے تو فرمایا کہ وہ اپنے ربّ کے نزدیک مرضی اور پسندیدہ تھے۔

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا﴾ یہ چھٹا قصہ حضرت ادریس علیہ السلام کا ہے، آپ علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے پوتے ہیں، اور حضرت نوح علیہ السلام کے جدامجد ہیں۔آپ علیہ السلام کا نام آپ علیہ السلام بکثرت کتابوں کو پڑھتے تھے، اور درس دیتے تھے، اس لئے آپ علیہ السلام کا لقب ادریس

مشہور ہوا۔آپ علیہ السلام قلم ،روشنائی ،کاغذ ،کتابت ،کپڑے بنانے اور سینے،حساب کتاب،کیل وزن،تول ترازو،جنگی ہتھیاراور دیگر بہت سی چیزوں کے موجد ہیں۔

یہاں اللہ تعالیٰ سبحانہ نے آپ علیہ السلام کے لئے تین صفات بیان فرمائی ہیں:(۱)صدیقیت (۲)نبوّت (۳)رفعت مکانی۔فرمایا:

﴿وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا﴾ اور اٹھایا ہم نے ان کو بلند مکان پر،یعنی آسمان پر۔حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ ادریس علیہ السلام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح زندہ آسمان پر اٹھائے گئے،اوراب بھی وہ آسمان میں زندہ ہیں۔اور صحیحین کی روایت میں ہے کہ حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج میں ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا۔حضرت ادریس علیہ السلام کے رفع کے بارے میں مختلف روایات واقوال ہیں،مگر وہ سب اسرائیلیات اور خرافات ہیں۔حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ان کورد فرمایا ہے،پس رفعت سے مراد رفعت علمی اور نبوت وصدیقیت ہی مراد ہیں نہ کہ اور کچھ۔اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی بے سند ہے،انہوں نے کعب الاحبار سے روایت کی ہے،اور کعبؓ کی روایت ساقط ہے،پس رفعت سے مراد قرب الٰہی اور مقام ومرتبہ نبوّت ہی ہے۔

اور یہ بھی کہ آپ علیہ السلام پر تیس صحیفوں کا نزول ہوا۔بہر حال آپ علیہ السلام کا رفع الی السّماء مختلف فیہ ہے،امام رازی،ابن جریر اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم ظاہری آیت سے یہی مراد لیتے ہیں کہ آپ علیہ السلام کو جسد عنصری کے ساتھ آسمان پر اٹھالیا گیا ہے۔واللہ اعلم

حضرت ادریس علیہ السلام کا نام قرآن مجید میں دو مقامات پر آیا ہے،ایک یہی سورۂ مریم،دوسرے سورت انبیاء میں،جولوگ حضرت ادریس علیہ السلام اور حضرت الیاس علیہ السلام کو ایک مانتے ہیں،یہ صحیح نہیں،حضرت الیاس علیہ السلام بنی اسرائیل کے انبیاء میں تھے،جبکہ حضرت ادریس علیہ السلام نوح علیہ السلام کے جد امجد تھے،اور وہ نوح علیہ السلام سے ایک ہزار سال پہلے تھے۔

❁ ❁ ❁

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ

بُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾
اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿٦٠﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ
الَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿٦١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ
وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

ترجمہ: یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، یعنی ان میں انبیاء ہیں جو آدم کی نسل سے ہیں، اور ان لوگوں کی نسل سے ہیں جنہیں ہم نے نوح کے ساتھ سوار کیا، اور ابراہیم اور اسرائیل کی نسل سے ہیں، اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کو ہم نے ہدایت دی، اور جنہیں ہم نے چن لیا، جب ان پر رحمٰن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو سجدہ کرتے ہیں، اور روتے ہوئے گر جاتے ہیں ﴿٥٨﴾ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آ گئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا، اور خواہشوں کے پیچھے لگ گئے، سو یہ لوگ عنقریب خرابی دیکھیں گے ﴿٥٩﴾ سوائے اس شخص کے جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک عمل کیا، سو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، اور ان پر ذرا سا بھی ظلم نہ کیا جائے گا ﴿٦٠﴾ یہ جنت ہمیشہ رہنے کے باغوں کو شامل ہوگی، جس کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے، بلاشبہ اس وعدے کا وقت ضرور آنے والا ہے ﴿٦١﴾ وہ اس میں سلام کے علاوہ کوئی لغو بات نہیں سنیں گے۔ اور ان کا رزق انہیں جنت میں صبح و شام ملے گا۔ یہ جنت ہے جس کا ہم اپنے بندوں میں سے اسے وارث بنائیں گے جو ڈرنے والا ہو (متقی ہو) ﴿٦٣﴾

معارف ومنازل

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ﴾ اس سے مراد صرف حضرت ادریس علیہ السلام ہیں ﴿وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ﴾ اس سے مراد صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ﴿وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ﴾ اس سے مراد حضرت اسماعیل واسحٰق اور یعقوب علیہم السلام ہیں۔ ﴿وَاِسْرَآءِيْلَ﴾ اس سے مراد حضرت یوسف وموسیٰ، وہارون وزکریا ویحییٰ وعیسیٰ علیہم السلام ہیں۔

شروع سورت سے یہاں تک خاص انبیاء علیہم السلام کے خاص خاص عمدہ اوصاف بیان کئے گئے، اب تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا وصف عام بیان کرتے ہیں جو تمام انبیاء کرام میں مشترک ہے، اور مقصود یہ ہے کہ جنس انبیاء کرام علیہم السلام کے تمام افراد اور تمام اشخاص خدائے تعالیٰ کے فرمانبردار اور برگزیدہ بندے تھے، جن کو اللہ تعالیٰ

نے اپنی خاص ہدایت اور خاص نعمت اور قرب منزلت اور کرامت سے سرفراز فرمایا، مگر باوجود اس رفعت شان و منزلت کے وہ غایت درجہ کے متواضع تھے، اور عبودیت اور بندگی میں کامل تھے کہ خدا تعالیٰ کی آیات کو سن کر خشوع و خضوع کے ساتھ سجدے میں گر پڑتے تھے، اور زار و قطار روتے تھے، پس تم ان کو معبود کا درجہ مت دو، اور انہیں نہ معبود کہو، اور نہ معبود حقیقی کا بیٹا مانو، تم پر فرض ہے کہ ان کے نقش قدم پر چل کر ان پر ایمان لاؤ، اور ہر قسم کے شرک و غفلت سے اجتناب کرو، اور ناصالح و ناخلف نہ بنو۔

چنانچہ ارشاد ہے کہ جنہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کے اتباع سے انحراف کیا، اور دنیاوی شہوات ولذات کے پیچھے لگ گئے، اور دنیا کی ہوسنا کیوں پر فریفتہ ہو کر ناصالح ہو گئے، انہوں نے نماز جیسی عبادت کو ضائع کیا، تو وہ ہر حال میں تباہ و برباد ہو گئے۔ البتہ جو لوگ اپنی جہالت اور ضلالت سے تائب ہو گئے، اور انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، اور سعادت کے راستے پر چلے، تو وہ کامیاب و کامران ہوئے، ان کو بارگاہ الٰہی سے ابدی سعادت کے ساتھ جنت ملے گی، اور ان کا ذرہ برابر عمل بھی ضائع نہ ہوگا، وہ جنتی باغوں میں احترام و اکرام پائیں گے اور ہمیشہ رہیں گے، اور سلام کے علاوہ کوئی لغوبات نہیں سنیں گے، انہیں صبح و شام جنتی خوراک ملے گی، یہ اللہ تعالیٰ کا غائبانہ وعدہ ہے جو اپنے وقت پر ضرور پورا ہوگا۔

﴿أُولَٰئِكَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ﴾ سے تا ﴿هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا﴾ یہ وہ انبیاء کرام علیہم السلام ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا، آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے اور ان لوگوں کی نسل سے جنہیں ہم نے نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی پر سوار کیا تھا، اور ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے، اور اسرائیل علیہ السلام کی نسل، اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم نے ہدایت بخشی اور برگزیدہ کیا۔

﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا﴾ جب ان کے سامنے رحمٰن عزّ مجدہ کی آیتیں پڑھی جاتی تھیں تو سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کو شرافت نسب، کمالات ذاتی، علو مرتبہ اور قرب خداوندی حاصل تھا پھر بھی خشیت الٰہی کی وجہ سے سجدے میں گر جاتے اور روتے تھے۔ ابن ماجہ، ابن راہویہ، اور بزار نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی روایت سے بیان کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن حکیم پڑھو، اور گریہ کرو، اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت بناؤ، اس سے کئی مسائل حل ہو جاتے ہیں، کیونکہ رونے والوں نے سب کچھ پایا، اور ہنسنے والوں نے کچھ بھی نہیں پایا، بلکہ ہلاک

ہو گئے۔

﴿فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ﴾ تا ﴿غَيًّا﴾ پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا، اور نفسانی خواہشات کے پیچھے لگ گئے، سو یہ لوگ عنقریب خرابی پائیں گے۔ ﴿غَيّ﴾ جہنم کے اندر ایک بہت خطرناک گہری وادی ہے جس میں خون اور پیپ بہتا ہے۔

﴿اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ﴾ تا ﴿شَيْئًا﴾ جس نے توبہ کرلی اور ایمان لے آیا، اور نیک کام کیا تو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے، اور ان کی ذرا بھی حق تلفی نہیں ہوگی، اور ایمان لائے، نیک عمل کر لیے ان میں سب سے مقدم نماز ہے، اور کفر و معاصی سے توبہ کرلی، سو ایسے لوگ جنتی ہوں گے، ایمان اور توبہ سے سارے گناہ معاف ہوں گے۔

﴿جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ تا ﴿وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا﴾ اور ہمیشہ رہنے کے باغوں میں جن کا رحمٰن عزّ مجدہ نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ کیا ہے، بیشک اللہ تعالیٰ کی وعدہ کی ہوئی چیز کو وہ ضرور پائیں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کا وعدہ اپنے وقت پر ضرور پورا ہو کر رہے گا، جیسے ہمارا ایمان غیب پر ہے اسی طرح جنت اور اس کا دخول بھی ابھی غیب کا حصہ ہے۔

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا﴾ اس جنت میں وہ کوئی فضول بات نہیں سنیں گے بجز سلام کے۔ سورۂ واقعہ میں فرمایا: ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّلَا تَاْثِيْمًا ۝ اِلَّا قِيْلًا سَلٰمًا سَلٰمًا ۝﴾ [الواقعة] (وہ اس جنت میں نہ کوئی بے ہودہ بات سنیں گے، اور نہ کوئی گناہ کی بات۔ ہاں جو بات ہوگی، سلامتی ہی سلامتی کی ہوگی)۔ وہاں بار بار اور ہر طرف سے سلام ہی مروج رہے گا۔

﴿وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا﴾ اور ان کو ان کی خوراک صبح و شام کا ملا کرے گی، وہاں نہ دن رات کا وجود ہوگا، اور نہ طلوع و غروب اور صبح و شام کا، وہاں قدرتی چمک اور تجلیوں کے ذریعہ اوقات کا تعین ہوگا۔ جنت کی ہر چیز اور پورا نظام اتنا مربوط و مستحکم ہوگا جس کی حقیقت دنیا والوں سے پوشیدہ ہوگی، جب وہ وہاں پہنچیں گے تب ان پر ہر چیز کی حقیقت کا انکشاف ہو جائے گا۔

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ یہ جنت ایسی ہے کہ ہم اپنے بندوں میں اس کا مالک ایسے لوگوں کو بنائیں گے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے (متقی) ہوں۔ وراثت سے مراد بقاء و دوام ہے کہ اللہ

تعالیٰ جنت کو ان کے تقویٰ کا ثمرہ بنا کر ان کے لئے باقی رکھیں گے جیسے مورث کا مال وارث کے لئے باقی رہتا ہے۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿٦٤﴾
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۭ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

ترجمہ: اور ہم نہیں نازل ہوتے مگر آپ کے ربّ کے حکم سے اسی کے لئے ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے، اور جو ان کے درمیان ہے، اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے﴿٦٤﴾ وہ ربّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، سو آپ اس کی عبادت کیجئے۔ اور اس کی عبادت پر ثابت قدم رہئے۔ کیا آپ اس کا کوئی ہم نام جانتے ہیں؟﴿٦٥﴾

معارف ومنازل

ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام کئی روز تک نہ آئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پریشان ہوئے، اور کفار نے کہنا شروع کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اس کے ربّ نے خفا ہو کر چھوڑ دیا ہے، اس طعن سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور زیادہ دلگیر ہو گئے، آخر حضرت جبریل علیہ السلام تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنے روز تک نہ آنے کا سبب پوچھا۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **مَا يَمْنَعُكَ اَنْ تَزُوْرَنَا اَكْثَرَ مِمَّا تَزُوْرُنَا۔** [بخاري] جتنا تم آتے ہو اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے؟ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو سکھلایا کہ جواب میں یوں کہو:

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ﴾ یہ کلام اللہ تعالیٰ کا جبریل علیہ السلام کی طرف سے جیسا کہ: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ [الفاتحة: ۴] (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں، اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں) میں ہم کو سکھلایا ہے کہ ایسا کہا کرو۔ حاصل جواب یہ ہے کہ ہم خالص عبد مامور ہیں، بدون حکم الٰہی ایک پر نہیں ہلا سکتے، ہمارا چڑھنا اُترنا سب اس کے حکم و اذن کے تابع ہے، وہ جس وقت اپنی حکمت کاملہ سے مناسب جانے ہم کو نیچے اُترنے کا حکم دے، کیونکہ ہر زمانہ (ماضی حال مستقبل) اور ہر مکان (آسمان زمین اور ان کے درمیان) کا علم اسی کو ہے، اور وہی ہر چیز کا مالک وقابض ہے، وہ ہی جانتا ہے کہ فرشتے کو پیغمبر کے پاس کس وقت بھیجنا چاہئے، مقرب ترین فرشتہ اور معظم ترین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہیں کہ جب چاہے کہیں چلا جائے، یا کسی کو اپنے پاس بلا لے، خدا کا ہر کام برمحل اور بروقت

ہے، بھول چوک یا نسیان و غفلت کی اس کی بارگاہ میں رسائی نہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام کا جلد یا بدیر آنا بھی اس کی حکمت و مصلحت کے تابع ہے۔

تنبیہ اوّل:

ہمارے آگے پیچھے کہا آسمان وزمین کو اترتے ہوئے زمین آگے آسمان پیچھے اور چڑھتے ہوئے وہ پیچھے یہ آگے جیسا کہ ظاہر ہے، اور اگر آگے پیچھے سے تقدم و تأخر زمانی مراد ہو تو زمانہ مستقبل آگے آنے والا ہے، اور زمانہ ماضی پیچھے گزر چکا ہے، اور زمانہ حال دونوں کے بیچ میں واقع ہے۔

تنبیہ دوم:

پہلے فرمایا تھا کہ جنت کے وارث اتقیاء و پرہیزگار ہیں، اس آیت میں بتلا دیا کہ ڈرنے کے لائق وہ ہی ذات ہوسکتی ہے جس کے قبضہ میں تمام زمان و مکان، علویات و سفلیات ہیں، اور جس کے حکم و اجازت کے بغیر بڑے سے بڑا فرشتہ بھی پر نہیں ہلا سکتا، انسان کو چاہئے کہ اگر وہ جنت کی میراث لینا چاہتا ہے تو فرشتوں کی طرح حکم الٰہی کا مطیع و فرمانبردار بن جائے، اور یہ بھی بتلا دیا کہ خدا تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کو اگر یہاں نہیں بھولتا تو وہاں بھی نہیں بھولے گا، ضرور جنت میں پہنچا کر چھوڑے گا۔ [عثمانی]

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ تیرا ربّ بھولنے والا نہیں ہے، وحی میں جو تأخیر ہوئی ہے وہ مصلحت و حکمت کی وجہ سے ہے، نہ کہ کسی نسیان اور بھول جانے سے ہے۔

﴿فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهِ﴾ جب وہ آسمان وزمین کا اور ان کے درمیان ہر چیز کا ربّ اور مالک ہے تو اسی کی عبادت کرنا لازم ہے، اور اسی کی عبادت پر ثابت قدم رہنا ضروری ہے، اس بارے میں جو مشقتیں آئیں انہیں صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیجئے، اگر وحی میں کسی مصلحت سے تأخیر ہوئی اور دشمنوں نے طعن کرنا شروع کیا تو دلگیر نہ ہونا چاہئے۔

﴿هَلْ تَعْلَمُ لَهُ سَمِيًّا﴾ کیا آپ ان کا کوئی ہم نام جانتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کا ہمنام کوئی نہیں، اہل ایمان تو اللہ تعالیٰ کے ہم نام کسی کا نام رکھ ہی نہیں سکتے، مشرکین کو بھی یہ جرأت نہیں ہوئی کہ وہ اپنے کسی معبود باطل کو اسم جلالہ سے پکاریں۔ سَمِيًّا ہم نے ہمنام سے کر دیا، مگر بہت سے مفسرین نے فرمایا: یہ لفظ مثل و شبیہ اور برابر کے معنی میں ہے، جیسے حضرت یحییٰ علیہ السلام کے متعلق بیان ہوا تھا۔ یہ

معنی درست بھی ہے کہ اس میں مبالغہ بھی ہے، جیسے: ﴿ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴾ [الإخلاص: ۴] (اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں) میں ہے، یا ﴿ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ﴾ [الشوری: ١١] (اس کی مثل کوئی چیز نہیں) کے مفہوم میں جو مبالغہ ہے، یہ بھی اسی طرح ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾

ترجمہ: اور انسان کہتا ہے کہ جب میں مرجاؤں گا تو کیا یہ ضروری بات ہے کہ میں عنقریب زندہ کر کے نکالا جاؤں گا؟ ﴿٦٦﴾ کیا انسان اس بات کو نہیں سوچتا کہ ہم نے اسے اس سے پہلے پیدا کیا اور وہ کچھ بھی نہ تھا؟ ﴿٦٧﴾ تیرے ربّ کی قسم ہے! ہم ان لوگوں کو ضرور ضرور جمع کریں گے، اور شیاطین کو بھی، پھر ہم ان کو دوزخ کے قریب اس حال میں حاضر کردیں گے کہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے ﴿٦٨﴾ پھر ہم ہر جماعت میں سے ان کو علیحدہ کردیں گے (جنہوں نے آپس میں ایک دوسرے کی مدد کی) جو رحمٰن کے مقابلہ میں بہت سخت سرکشی اختیار کئے ہوئے تھے ﴿٦٩﴾ پھر ہم ہی ان لوگوں کو خوب جاننے والے ہیں جو دوزخ میں داخل ہونے کے زیادہ مستحق ہیں ﴿٧٠﴾

معارف ومنازل

قرآن مجید میں منکرین قیامت کے اس طرح کے شکوک وشبہات بہت سے مقامات پر مذکور ہیں، اور ساتھ ساتھ ان کی تردید بھی ہے، اور اثبات قیامت کے دلائل بھی ہیں، کفار یہی کہتے رہتے ہیں کہ جب آدمی مرجاتا ہے، مٹی میں اس کا بدن سڑ گل کر ختم ہو جاتا ہے، اور اس کی ہڈیاں ریزہ ریزہ ہو کر مٹی میں مل جاتی ہیں، تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اسے دوبارہ پہلے کی صورت میں زندہ کیا جائے؟ کبھی وہ بوسیدہ ہڈیوں کو ہاتھ میں لے کر بیبا کی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر طنز ومذاق کر کے ہڈیاں دکھا کر آسمان سر پر اٹھا کر کہتے کہ یہ ہڈیاں کبھی دوبارہ زندہ نہیں ہوسکتیں، اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

﴿ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴾ کہ اس منکرِ قیامت انسان کو سوچنا

چاہئے کہ وہ پہلی دفعہ کیسے پیدا ہوا؟ اس کو عدم سے کیسے اور کس نے نکال کر وجود بخشا؟ نہ موجود تھا اور نہ مذکور تھا اور نہ اس کے اجزاء تھے، اور نہ ہی اس کا مادہ، تو جس ذات پاک نے اسے پہلی دفعہ پیدا فرمایا اسے قدرت حاصل ہے کہ پھر سے دوبارہ اس کو زندہ فرمادے۔ جو ربّ اتنے بڑے کارخانہ قدرت آسمانوں اور زمینوں کو ایک ہی حکم (کن) سے پیدا فرماسکتا ہے، اس چھوٹے قدوقامت والے انسان کی پیدائش اس کے لئے کوئی مشکل نہیں، وہ ذات پاک ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ﴾ سو قسم ہے آپ کے ربّ کی ہم ان لوگوں کو اور شیاطین کو ضرور ضرور جمع کریں گے، میدان قیامت میں یہ گمراہ ہونے والے اور گمراہ کرنے والے (تابع ومتبوع) سب حساب و کتاب کے میدان میں جمع کئے جائیں گے، بلکہ دونوں فریق زنجیروں میں باندھے ہوئے حاضر کئے جائیں گے۔

﴿ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا﴾ پھر ہم دوزخ کے قریب ان کو اس حال میں جمع کردیں گے کہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے، ان کی یہ حاضری مذکورہ حالت میں نہایت ذلّت آمیز اور رسوا کن ہوگی۔

﴿ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا﴾ پھر ان کفار کے ہر گروہ میں سے ان لوگوں کو (ان کے سرغنے لیڈر، سردار) علیحدہ کریں گے جو ان میں سب سے زیادہ اللہ تعالیٰ سے سرکشی کرتا تھا، کیوں کہ ایسے سرغنوں اور گمراہ کرنے والوں کا عذاب بنسبت عام کفار کے نہایت سخت ہوگا۔ "شِيْعَة" کے معنی ہیں: امت، گروہ، مذہب وغیرہ۔ دنیا میں حق ہمیشہ ایک ہی ہے، اس میں تعدد نہیں، رہا باطل، اس کے تو بیشمار فرقے اور گروہ ہوتے ہیں، پس ہر گروہ کا سربراہ ابلیس کے علاوہ اور کئی لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے اقتدار چمکانے کے لئے عوام کا بیڑا غرق کیا ہوگا۔

❁ ❁ ❁

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾
ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

ترجمہ: اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو اس پر وارد نہ ہو، آپ کے ربّ کا یہ حکم لازمی ہے جس کا فیصلہ کیا جاچکا ہے﴿٧١﴾ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو ڈرتے تھے، اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں چھوڑ دیں گے کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے﴿٧٢﴾

معارف ومنازل

ورود کے دو معنی ہیں: پہلے معنی بمعنی دخول کے، دوسرے معنی بمعنی عبور کے۔ مفسرین حضرات نے دونوں مراد لیئے ہیں۔ بعضوں نے پہلے معنی کو ترجیح دی ہے، اور بعضوں نے دوسرے معنی کو، اور بعضوں نے بغیر ترجیح کے دونوں معنی بیان کیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم کا وجود یقینی ہے، جسے سب مشاہدہ کریں گے، مؤمن و کافر سب کو اس کا معائنہ کرایا جائے گا، گو صورت اور غرض معائنہ کی مختلف ہوگی، کفار کو بطور ابدی دخول و تعذیب ابدی کے، اور مؤمنوں کو بطور عبور پل صراط کے، اور زیادتِ شکر اور فرح و سرور کے واسطے کہ جہنم کو دیکھ کر جب وہ جنت میں پہنچیں گے تو اور زیادہ شکر کریں گے، اور خوشی منائیں گے، اور بعض گناہ گار جرم کے مرتکب مسلمانوں کو سزائے محدود کے لئے جو کہ ان کے لئے باعث تطہیر ہے جہنم میں گرادئے جائیں گے، پھر کچھ مدّت کے بعد اپنے اپنے عمل کے موافق، نیز انبیاء ملائکہ اور اور صالحین کی شفاعت سے اور آخر میں براہ راست ارحم الراحمین کی مہربانی سے وہ سب گناہگار جنہوں نے سچے اعتقاد کے ساتھ کلمہ طیبہ کا اقرار کیا تھا دوزخ سے نکالے جائیں گے، پھر صرف کافر ہی باقی رہیں گے، اور دوزخ کا منہ بند کردیا جائے گا۔ تو آیت کریمہ میں اسی عمومی معائنہ کی خبر دی جارہی ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا﴾ کہ تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر گزر نہ ہو، کسی کا دخولاً، کسی کا عبوراً۔

﴿كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا﴾ یہ وعدہ کے موافق آپ کے ربّ کے اعتبار سے بطور لازم مؤکّد ہے، جو ضرور پورا ہو کر رہے گا، پھر اس ورود سے نہ سمجھا جائے کہ مؤمن و کفار برابر ہیں، بلکہ:

﴿ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا﴾ ہم ان لوگوں کو نجات دیدیں گے جو اللہ تعالیٰ سے ڈر کر ایمان لائے تھے، اور ظالموں کو اس میں ہمیشہ کے لئے ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ رنج وغم کے مارے گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہوئے خوار و ذلیل ہوں گے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ
مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾ قُلْ
مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ

وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضْعَفُ جُنْدًا ۝ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝

ترجمہ: اور جب ان پر ہماری کھلی کھلی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں سے مقام کے اعتبار سے کون بہتر ہے؟ اور مجلس کے اعتبار سے کون اچھا ہے؟ ۝ اور ان سے پہلے ہم نے کتنی جماعتیں ہلاک کر دیں جو ساز و سامان اور نظروں میں بھانے کے اعتبار سے اچھے تھے؟ ۝ آپ فرما دیجئے کہ جو شخص گمراہی میں ہوگا تو رحمٰن اسے مہلت دے گا، یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو یا عذاب ہوگا یا قیامت ہوگی، سو عنقریب جان لیں گے کہ وہ کون ہے جو بُری جگہ والا ہے اور لشکر کے اعتبار سے کمزور تر ہے؟ ۝ اور جن لوگوں نے ہدایت پائی اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت کو اور بڑھا دے گا، اور باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے ربّ کے پاس ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں، اور انجام کے اعتبار سے بہتر ہیں ۝

معارف ومنازل

متاع دنیا جو کہ فانی ہے، اور نہایت حقیر و قلیل بھی ہے، اللہ تعالیٰ شانہ نے دنیا کو پیدا فرمایا، ایک بار بھی نظر محبت سے اس کو نہیں دیکھا، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی کثرت، عیش و عشرت، آرام و راحت کافروں اور بے عقل لوگوں کو حاصل ہے، مسلمانوں اور عقلمندوں کو وافر حصہ نہیں ملا ہے۔ سرور عالم ﷺ نے فرمایا: **الدنیا ملعون وملعون مافیھا الا ذکر اللہ وما والاہ**۔ سورۂ زخرف میں ارشاد ہے: ﴿وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ﴾ [الزخرف: ٣٣] (اور اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تمام انسان ایک ہی طریقے کے ہو جائیں گے تو جو لوگ خدائے رحمٰن کے منکر ہیں، ہم ان کے لیے ان گھروں کی چھتیں بھی چاندی کی بنا دیتے، اور سیڑھیاں بھی)۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں اس چار روزہ فانی مال و دولت، عزّت و اقتدار کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت ابن عمر وغیرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ محسن کائنات ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر ایک مچھر کے پَر کے برابر ہوتی تو کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا۔ [ترمذي، ابن ماجة، حاكم] اس لئے فرمایا کہ مال دولت اللہ تعالیٰ کے قرب و رضا کی نشانی نہیں، اور فقر و مسکنت اللہ تعالیٰ سے دوری کی علامت نہیں، بلکہ

معاملہ برعکس ہے کہ عباد الرحمٰن کو فقر و مسکنت سے نوازا جاتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جس طرح تم اپنے مریض کو نقصان دہ چیزوں سے پرہیز کراتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندگان خاص کو مال و دولت اور دنیاوی عیش و عشرت سے پرہیز کراتا ہے (بچاتا ہے)۔ فرمایا: اگر ایک خاص مصلحت مانع نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کے مکانوں کی چھتیں، زینے، چوکھٹ، دروازے، قفل، تخت، چوکیاں، سب سونے اور چاندی کے بنا دیتا۔ مگر اس صورت میں لوگ یہ دیکھ کر کہ کافروں ہی کو ایسا ساز و سامان ملتا ہے عموماً کفر کا راستہ اختیار کر لیتے (اِلّا ماشاء اللہ) اور یہ چیز مصلحت خداوندی کے خُلاف ہوتی، اس لئے ایسا نہیں کیا گیا۔ [مشکوٰۃ]

فرمایا: ﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ﴾ جب ہماری واضح آیتیں ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا﴾ تو کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ دونوں فریقوں میں مکان کے لحاظ سے کون بہتر ہے؟ اور محفل و مجلس کے اعتبار سے کون اچھا ہے؟ فریق اوّل سے مراد مسلمانوں کی جماعت ہے جو کہ عددی قلّت کے ساتھ مفلوک الحال، مساکین و فقراء تھے دنیاوی سرمایہ، زیب و زینت، عمدہ لباس، عمدہ مکان، عیش و عشرت، عمدہ کھانے پینے سے محروم تھے، جبکہ فریق دوم کفار و مشرکین تھے جو کہ دنیاوی ساز و سامان، مال و دولت، مجلس و محلات اور طرح طرح کی عیش و عشرت کے مالک تھے۔

جب وہ قرآن کریم کی واضح آیات سنتے تھے تو اہل ایمان پر طنز کرتے، اور ان کا مذاق اڑاتے، اور کہتے تھے کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ لوگ ہو تو دنیا میں اتنا پراگندہ اور محتاج و بے سرمایہ کیوں ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم خدا سے دور ہو اس لئے پریشان حال ہو۔ تمہارے برعکس ہم لوگ ہر اعتبار سے خوشحال اور آباد ہیں، اور پریشان حالی سے بہت دور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اصلی بندے ہم ہیں، جو کہ ہمیں ہر چیز اور ہر قسم کی خوشیوں سے نوازا ہے۔ بالفرض اگر قیامت برپا ہو تو وہاں بھی ہم خوشحال و آباد رہیں گے، اور تم غمگین و پریشانیوں میں ہوں گے۔

مطلب یہ ہے کہ کفار و مشرکین نے اپنے زعمِ باطل کے مطابق قرب خداوندی اور کامیابی کے لئے دو چیزوں کو معیار بنایا تھا: ایک اچھا مکان اور خوشحالی، اور دوسری اچھی مجلس اور عمدہ نشستگاہ و بیٹھک اور محفلوں کا انعقاد۔ جب کہ یہ چیزیں مسلمانوں کے پاس نہیں ہوتی تھیں۔

تاریخ اپنے واقعات کو ہر وقت دہراتی رہتی ہے، دنیاوی مال و دولت اور دنیاوی منصب و اقتدار والے سرکش و متکبر لوگوں کا آج بھی وہی وطیرہ ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے کفار کا تھا۔ آج کا سرمایہ دار اور وزیر حتّٰی کہ

معمولی درجے کا کونسلر اور ڈاکٹر وسکول ماسٹر بھی وہی کچھ کہہ رہا ہے جو ابو جہل اور اس کے ساتھی کہتے تھے۔ دینی اقدار، مساجد، مدارس، قرآن کے حافظ، عربی مدارس کے طلبہ ودیگر مذہبی لوگ دنیا داروں کی نظر میں کسی بھی اہمیت کے مالک نہیں ہیں، ان کی اصطلاح میں تعلیم اور علم صرف یورپی تعلیم کا نام ہے۔ اگر کوئی قاری، حافظ قرآن وحدیث ان کی شیطانی محفلوں میں اتفاقی طور پر موجود ہو تو وہ عار محسوس کرتے ہیں، وہ یہاں تک جہالت میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ وہ اسلام اور قرآن کو مولویوں کی طرف منسوب کرتے ہیں: "مولویوں کا اسلام، مولویوں کا قرآن" کہتے رہتے ہیں، وہ ہرگز یہ تسلیم نہیں کرتے ہیں کہ یہ اسلام اور قرآن خدا کا ہے، بلکہ وہ خدا سے اتنے دور ہیں کہ اس کے وجود تک سے بھی بے خبر ہیں۔

اور جب قومی غیرت میں آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اصل مسلمان اور محبوب خدا ہم ہی ہیں کہ خدا نے ہمیں یہ سب کچھ دیا ہوا ہے، حال یہ ہے کہ انہیں کلمہ شریف اور درود شریف کا فرق معلوم نہیں، انہیں باطل خیالات کی تردید فرماتے ہوئے توبیخ وتہدید کے ساتھ ارشاد فرمایا:

﴿وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ﴾ اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی خوشحال قوموں کو ہلاک کر کے صفحہ ہستی سے مٹادیا، وہ ان کی طرح معمولی لوگ نہیں تھے، بلکہ:

﴿هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا﴾ جو ساز وسامان اور خوش منظری میں ان سے کہیں زیادہ اور بہتر تھے، آج بھی ان کے کچھ آثار وعجائبات دنیا والوں کے سامنے ہیں جنہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ ہر اعتبار سے کامل ومکمل تھے، مگر ان کی سرکشی وغرور اور حق کی مخالفت نے انہیں ہمیشہ کے لئے درس عبرت بنا کر خس وخاشاک کی طرح مٹا کر رکھ دیا۔ ﴿فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ﴾ [سبأ: ۱۹] (ہم نے ان کو کہانیاں بنا دیا) یعنی ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، اب وہ افسانوں کا حصہ بن چکے، جبکہ تم ان کے عشر عشیر سے بھی کم ہو۔ سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَكَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَمَا بَلَغُوْا مِعْشَارَ مَآ اٰتَيْنٰهُمْ فَكَذَّبُوْا رُسُلِيْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ﴾ [سبأ: ۴۵] (اور ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا تھا، اور یہ (عرب مشرکین) تو اس ساز سامان کے دسویں حصے کو بھی نہیں پہنچے ہیں جو ہم نے ان کو دے رکھا تھا، پھر بھی انہوں نے میرے پیغمبروں کو جھٹلایا، تو میری دی ہوئی سزا کیسی تھی؟)۔

گزشتہ قوموں کی عمریں لمبی ہوتی تھیں، پھر ڈیل ڈول قد آور، طاقتور، مال ودولت ان کے پاس بے حساب وبے اندازہ ہوتا تھا، آج کے کفار ان کے عُشر عشیر کو بھی نہیں پہنچتے ہیں، لیکن پیغمبروں علیہم السلام کی تکذیب نے انہیں

ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد کیا، اگر فضیلت کا معیار یہی چیزیں ہوتیں تو پرانی قومیں کیوں ہلاک ہوتیں؟ معلوم ہوا کہ پسندیدگی، بہتری اور قبولیت کا معیار صرف ایمان اور عملِ صالح ہے۔ یہاں تک جواب الزامی تھا، اب دوسرا جواب تحقیقی ہے، فرمایا:

﴿قُلۡ مَنۡ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلۡيَمۡدُدۡ لَهُ الرَّحۡمٰنُ مَدًّا﴾ آپ فرمادیجئے: جو شخص گمراہی میں بھٹک رہا ہے تو رحمن اسے مزید ڈھیل دیتا چلا جارہا ہے۔ "فَلۡيَمۡدُدۡ" امر کا صیغہ ہے، خبر کے معنی میں ہے، یعنی اللہ تعالیٰ دراز ولمبا کرے گا، ان کی گمراہی کو مزید مہلت دینے کے ساتھ، وہ ذاتِ پاک دیر گیر سخت گیر ہے، مجرموں کو بہت لمبا عرصہ ڈھیل دینا اس کی حکمت و مصلحت کی شان ہے۔

﴿حَتّٰۤى اِذَا رَاَوۡا مَا يُوۡعَدُوۡنَ﴾ یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے اس چیز کو جس کا ان سے وعدہ کیا گیا ہے، وہ یہ ہے: ﴿اِمَّا الۡعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ﴾ یا تو انہیں دنیاوی عذاب ہوگا کہ تمام عروج و ترقی اور ساز سامان، خوشحالی اور عیش وعشرت تباہ ہوجائیں گے، جیسے قوم سبا پر عذاب آیا، یا تو پھر قیامت آئے گی، یعنی فرض کرو اگر کوئی قوم دنیاوی عذاب سے بچ جاتی ہے تو قیامت والے عذاب سے بچنے کا ہرگز امکان نہیں، وہ تو پختہ اور اٹل ہے، جس سے کوئی نہیں بچ سکتا۔

﴿فَسَيَعۡلَمُوۡنَ مَنۡ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا﴾ پس وہاں یہ لوگ جان لیں گے کہ مکان کے اعتبار سے کون زیادہ بُرا ہے، وہاں انہیں پتہ چلے گا کہ فقراء وبے سہارا مسلمان بہتری میں ہیں، اور دنیا دار و سرمایہ دار کفار تباہی وہلاکت میں ہیں، اور انہیں یہ بھی معلوم ہوجائے گا:

﴿وَّاَضۡعَفُ جُنۡدًا﴾ قوم اور جتھے کے لحاظ سے کون کمزور ہے، دنیا میں جن غرباء کا مذاق اڑایا اور انہیں معاشرہ پر بوجھ سمجھا (جیسے انگریزی خوان علماء کا مذاق اڑاتے ہیں)۔

﴿وَيَزِيۡدُ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ اهۡتَدَوۡا هُدًى﴾ اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ فریق کے لئے ہدایت کو زیادہ کرتا ہے، اس میں اہل ایمان کی ترقی وعروج کی بشارت ہے، جس طرح گمراہوں کی گمراہی میں اضافہ ان کا تنزل اور تباہی ہے، اگر وہ آج دنیا میں کچھ ظاہری ترقی کررہے ہیں جو کہ عارضی ہے، مگر ان کا انجام سوائے ہلاکت کے کچھ بھی نہیں، جبکہ فریق دوئم اگر آج دنیاوی ترقی سے محروم ہے مگر ان کا انجام اور مستقبل نہایت درخشاں اور قابل رشک ہے۔ الحمد للہ

﴿وَالۡبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيۡرٌ عِنۡدَ رَبِّكَ﴾ سورۃ الکہف میں باقیات صالحات پر کلام ہو چکا ہے، فرمایا:

﴿الْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا﴾ [الكهف: ۴۶] (مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی زینت ہیں، اور باقی رہنے والی نیکیاں آپ کے ربّ کے پاس ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں)۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے لطف وکرم سے مسلمان کی ہر نیکی اور عمل صالح پر دس سے لے کر بیس لاکھ گنا اضافہ فرماتے ہیں، اور تقریباً اہل ایمان کی ساری نیکیوں کو باقیات صالحات کی فہرست میں شامل فرماتے ہیں، جب آدھی کھجور کا صدقہ قیامت کے روز پہاڑوں کے برابر ثواب کا ذریعہ بنتا ہے تو بڑے اعمال کا شاید اندازہ نہ ہو۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ: ﴿الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ﴾ سے مراد لڑکیاں بھی ہیں، جنہیں لوگ قدر وشکر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں، خاص کر عرب لوگ جو قبل از اسلام لڑکیوں کو زندہ درگور کر کے ہلاک کیا کرتے تھے، لڑکیوں کو پالنا، ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرنا، ان سے پیار ومحبت کرنے کے متعلق احادیث میں بڑے فضائل بیان ہوئے ہیں۔ سورۂ تکویر کی تفسیر میں دیکھیں۔

﴿خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا﴾ اعمال صالحہ جو باقی رہنے والے ہیں آپ کے ربّ کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے بہتر ہیں، اور انجام کے اعتبار سے بھی۔ "مَرَدّ" سے مراد عاقبت اور انجام ہے، جو قیامت میں ظاہر ہوگا۔

.........❁.........❁.........❁.........

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ۝ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ
عَهْدًا ۝ كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ۝ وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ۝

ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا، اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور مال اور اولاد دیئے جائیں گے؟ (۷۷) کیا اسے غیب کا پتہ چل گیا یا اس نے رحمن سے کوئی عہد لیا ہے؟ ہرگز نہیں، ہم عنقریب اس کی بات لکھ لیں گے، اور اس کے لئے عذاب بڑھاتے رہیں گے (۷۹) اور اس کی کہی ہوئی چیزوں کے ہم مالک رہ جائیں گے، اور وہ ہمارے پاس تنہا آئے گا (۸۰)

معارف ومنازل

بخاری ومسلم کی حدیث میں ہے کہ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ غلامی سے آزاد ہوئے تھے، وہ

لوہاروں کا کام کرتے تھے، اور تلواریں وغیرہ بنا کر فروخت کرتے تھے، انہوں نے قبیلہ سہم کے سردار عاص بن وائل کا کام کیا تھا، ایک روز مزدوری لینے کے ارادے سے اس کے پاس گئے اور مطالبہ کیا کہ میری مزدوری میرے حوالہ کرو، یہ شخص بڑا مالدار اور مغرور تھا، کہنے لگا کہ میں تمہاری مزدوری اس شرط پر دوں گا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار کرو، اور دین اسلام سے انکار کر کے مرتد ہو جاؤ۔

حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنے سچے دین کو ہرگز نہیں چھوڑوں گا، اگر چہ تم مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ۔ عاص بن وائل نے استہزاءً کہا کہ اچھا اگر مرنے کے بعد ہم جب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے تو وہاں قیامت میں تمہاری مزدوری ادا کروں گا، اس پر یہ آیت اتری۔ اس آیت کا نزول اگر چہ خاص ایک شخص کے بارے میں ہے، مگر اس کا حکم قیامت تک سب کے لئے عام ہے۔

آج بھی ایسے گمراہ اور منکرین قیامت کی کوئی کمی نہیں، دولتمند لوگ ہر زمانے میں یہی کہا کرتے ہیں، اور قیامت کا مذاق اڑاتے ہیں: ﴿نَحْنُ اَكْثَرُ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا وَّمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِيْنَ﴾ [السبأ: ۳۵] (ہم مال اور اولاد میں بڑھے ہوئے ہیں، اور ہمیں کوئی عذاب نہیں ہوگا)۔ آیت کریمہ اسی کے جواب میں ہے۔

﴿اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا﴾ کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات کا انکار کیا؟

﴿وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا﴾ اور اس نے کبر غرور کے بل بوتے یوں کہا کہ قیامت کے روز میرے پاس مال بھی ہوگا، اور میرے ساتھ میری اولاد بھی ہوگی، لہٰذا تم اپنا حساب وہاں چکا لینا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَطَّلَعَ الْغَيْبَ﴾ کیا اس شخص نے غیب کو جھانک کر دیکھ لیا ہے کہ دوبارہ اٹھائے جانے پر اس کے پاس اسی طرح مال و دولت ہوگا، جس طرح اس دنیا میں ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے، وہاں کا معاملہ اس کے خلاف نہایت سخت ہوگا۔

﴿اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾ یا اس نے رحمٰن جل شانہ کے ساتھ کوئی عہد کر رکھا ہے کہ وہ آخرت میں بھی مال و اولاد عطا کرے گا؟ ﴿كَلَّا﴾ خبردار! یہ سب غلط ہیں، نہ تو اس کے پاس علم ہے اور نہ وہ غیب کی بات جانتا ہے، نہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی معاہدہ ہے، جیسے کہ اہل ایمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاہدہ ہے۔ ہاں! کفار کے ساتھ جہنم کا وعدہ ہے، مگر کسی مال و اولاد کا نہیں، اور ہرگز نہیں، البتہ:

﴿سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا﴾ ہم ضرور لکھ لیں گے جو کچھ وہ کہتا ہے، اور ہم دراز

کردیں گے اس کے لئے سزا کو۔ دراز کرنا یعنی عذاب میں اضافہ کرتے ہیں، جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿فَذُوْقُوْا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا﴾ [النبأ: ۳۰] (اب چکھتے رہو، ہم تمہارے لیے عذاب ہی بڑھائیں گے)۔ روزِ قیامت اہل ایمان کی نعمتوں اور خوشحالیوں میں آناً فاناً جس طرح اضافہ ہوتا رہے گا اسی طرح کفار کی سزا اور عذاب میں بھی باری باری اضافہ ہوتا رہے گا۔

﴿وَّنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ﴾ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے وارث ہم ہوں گے، اللہ تعالیٰ کا قانون ہی یہ ہے: ﴿وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ [آل عمران: ۱۸۰] (آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے) زمین وآسمان اور درمیانی ساری چیزوں کی وراثت اللہ تعالیٰ ہی کے قبضے میں ہے، لوگ اس جہاں سے خالی ہاتھ جاتے ہیں، ان کا سارا ساز وسامان یہیں رہ جاتا ہے۔ اصل مالک حقیقی ہر چیز کا اللہ تعالیٰ ہی ہے، انسان چند روز کے لئے کچھ چیزوں کا مجازی مالک بن جاتا ہے، مگر مرنے کے ساتھ اس کی مجازی ملکیت بھی ختم ہوجاتی ہے۔

﴿وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا﴾ اور ہمارے پاس یہ تن تنہا خالی ہاتھ آئے گا، وہاں اس کے پاس نہ کوئی مال ہوگا اور نہ کوئی اولاد ہوگی، جب یہ دنیا والا مال اور اولاد بھی ساتھ نہ ہوگا تو وہاں مزید مال ملنے کا دعویٰ کیسے کرتا ہے؟

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ كَلَّا ؕ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾
اَلَمْ تَرَ اَنَّاۤ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾

ترجمہ:۔ اور لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر دوسرے معبود بنالئے تاکہ وہ ان کے لئے عزت کی چیز بن جائے ﴿۸۱﴾ خبردار! ایسا ہرگز نہیں ہے، وہ عنقریب ان کی عبادت کا انکار کریں گے، اور ان کے مخالف بن جائیں گے ﴿۸۲﴾ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیاطین کو کافروں پر چھوڑ رکھا ہے جو انہیں خوب ابھارتے ہیں ﴿۸۳﴾ سو آپ ان کے بارے میں جلدی نہ کیجئے، ہم ان کی باتوں کو خوب شمار کر رہے ہیں ﴿۸۴﴾

معارف ومنازل

دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗۤ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ ﴿۵﴾ وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۶﴾﴾

[الأحقاف] (اس شخص سے بڑا گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ان کو پکارے جو قیامت کے دن تک اس کی پکار کا جواب نہیں دے سکتے، اور جن کو ان کی پکار کی خبر تک نہیں ہے۔ اور جب لوگوں کو محشر میں جمع کیا جائے گا تو وہ ان کے دشمن بن جائیں گے، اور ان کی عبادت ہی سے منکر ہوں گے)۔

یہ مشرکین جہلاء اور کافروں کا سودائے خام ہے جو انہوں نے شیطان کے ورغلانے پر یہ گھڑ لیا ہے کہ یہ معبودانِ باطلہ ہمارے لئے شفاعت کریں گے، اور ہماری عزّت وشرف کا اثبات کریں گے، یا عزّت سے مراد غلبہ ہے کہ یہ معبود ہمیں دشمنوں پر غالب کریں گے، ہمیں غلبہ دلائیں گے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں علیہم السلام نے ہر زمانے میں مشرکوں کو سمجھایا کہ ان معبودوں سے تمہیں سوائے خسارہ اور نقصان کے کچھ نہیں ملے گا، یہ تمہارے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بے جان، بے حرکت، بے ہمت اصنام ہیں، نہ ان میں دیکھنے کی صلاحیت ہے نہ بولنے اور نہ سننے کی قوّت ہے، یہ تمہیں کیا عزّت یا نفع پہنچائیں گے، جبکہ وہ مردہ اور بے جان ہیں، ان سے تم زیادہ طاقتور اور بااختیار ہو، قیامت کے دن وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے، اور تمہارے خلاف گواہی دیں گے، اور تمہاری عبادت سے منکر ہو جائیں گے، اور تم سے اپنی براءت کا اور بیزاری کا اعلان واظہار کریں گے۔

قیامت کے روز جب اللہ تعالیٰ بتوں کو قوّت گویائی عطا کریں گے تو الٹا یہ بت تمہارے کفر وسرکشی پر گواہی دیں گے، اور تمہارا دشمن بنیں گے: ﴿وَتَقَطَّعَتۡ بِهِمُ الۡاَسۡبَابُ﴾ [البقرة ١٦٦] (اور ان کے سارے تعلقات ختم ہو جائیں گے)۔ تمہارے اور ان کے تمام مراسم وتعلقات منقطع ہو جائیں گے، اسی کو فرمایا:

﴿وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوۡنُوۡا لَهُمۡ عِزًّا﴾ اور ان نادانوں نے اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود بنالئے تاکہ وہ معبود اُن کے لئے اللہ تعالیٰ کے یہاں عزّت اور نصرت کا سبب بنیں، یا انہیں غلبہ دیدیں، دشمنوں پر انہیں غالب کردیں۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر ابوسفیان نے کہا تھا: لَنَا الْعُزىٰ وَلَا عُزىٰ لَكُمْ۔ اس کافخر یہ کلام تھا۔ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے جواب دیدو، اور یہ کہو: اَللّٰهُ مَوْلٰنَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ۔ پھر ابوسفیان نے نعرہ لگا کر کہا: اُعْلُ هُبَلْ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو پھر حکم ہوا کہ اس کو جواب دیدو: اَللّٰهُ اَعْلٰى وَاَجَلّ۔

اس وقت ابوسفیان کافر تھے، اور مشرکین کے لشکر کا قائد وسربراہ تھے، اس واقعہ کے پانچ سال بعد فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے (٨ھ رمضان میں) رضی اللہ عنہ۔

﴿كَلَّا سَيَكۡفُرُوۡنَ بِعِبَادَتِهِمۡ وَيَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ ضِدًّا﴾ ہرگز ایسا نہیں ہوگا، یہ معبود اُن کی عبادت

وبندگی سے انکار کر کے بیزاری کا اظہار کریں گے، اوران کا دشمن اور مخالف بنیں گے۔ اب آئندہ آیت میں مشرکین کی گمراہی کے سبب کا بیان ہے:

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا﴾ آپ نے نہیں دیکھا کہ ہم نے بتقاضائے حکمت اور بغرض ابتلاء وامتحان شیطانوں کو کافروں پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ ان کو ہلاتے رہتے ہیں (حرکت دیتے ہیں) خوب ہلانے کے ساتھ۔ اِرسال سے مراد گماشتہ کرنا، جیسے شکاری کتے کو شکار پر چھوڑا جاتا ہے۔ "تَؤُزُّ" کے معنی ہیں: برانگیختہ کرنا، اُچھالنا، ہاتھوں انگلیوں پر اٹھانا۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کسی کو کفر ومعصیت پر مجبور نہیں کرتا، بلکہ برانگیختہ اور آمادہ کرتا ہے، جیسے انبیاء کرام علیہم السلام ہدایت پر برانگیختہ اور آمادہ کرتے ہیں۔

﴿فَلَا تَعْجَلْ عَلَیْهِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا﴾ پس آپ ان کی سزا اور عذاب کے لئے عجلت نہ کریں، ہم ان کے جرائم سے باخبر ہیں، ان کی سزا وعذاب کے لئے ہمارے ہاں ایک وقت مقرر ہے، ہم اس مدت کو شمار کررہے ہیں جب وہ گنتی کے دن پورے ہوجائیں گے، یا دنیاوی اعتبار سے یا اُخروی، یعنی (قیامت) کے آنے پر پھر انہیں وہ سزا بغیر کسی رکاوٹ اور تعطل کے پہنچ جائے گی، یہ فی الحال استدراج میں رہ رہے ہیں، لہٰذا آپ صبر کریں، اور کسی عذاب کے آنے کے لئے جلدی نہ کریں۔

.... ✿ .... ✿ .... ✿ ....

یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَهَنَّمَ
وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

ترجمہ: ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے ﴿۸۵﴾ اور مجرموں کو دوزخ کی طرف اس حال میں چلائیں گے کہ وہ پیاسے ہوں گے ﴿۸۶﴾ کوئی شخص سفارش کا اختیار نہ رکھے گا، مگر جس نے رحمٰن کے پاس سے اجازت لی ﴿۸۷﴾

معارف ومنازل

قیامت کے دن اہل ایمان کو جس عزّت وتکریم سے بارگاہ الٰہی میں حاضری نصیب ہوگی اس کا ذکر ہورہا ہے۔ وفد جمع ہے وافد کی، جیسے صحب صاحب کی۔ اس مقام پر اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے: وَفْدًا اَیْ رُکْبَانًا عَلٰی نَجَائِبَ

طَاعَاتِهِمْ۔ یعنی وہ اپنی طاعتوں کی سواریوں پر سوار ہو کر حاضر ہوں گے۔

ابن ابی حاتمؒ نے عمر بن قیسؒ ملائی کا بیان نقل کیا ہے کہ جب مؤمن قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل ایک حسین خوبرو انسان کی شکل میں اس کا استقبال کرے گا، اور اس کا پاکیزہ جسم سے خوشبو سے مہک رہا ہوگا، وہ اس مؤمن سے پوچھے گا: کیا تم نے مجھے پہچانا؟ وہ کہے گا نہیں، مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تیری شکل خوبصورت دلآویز بنائی ہے، اور تیری مہک نہایت عطر بیز ہے، وہ کہے گا: میں تیرا عمل صالح ہوں، دنیا میں میں تجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ کو کندھوں پر اٹھانے کے لئے آیا ہوں، آج تجھے اٹھا کر بارگاہ الٰہی تک پہنچاؤں گا۔

پھر کہا کہ کافر کا عمل نہایت بدشکل اور انتہائی گندی بدبو کے ساتھ اس کے سامنے آئے گا، اور پوچھے گا: کیا تو نے مجھے پہچانا؟ کافر جواب دے گا: نہیں، مگر اتنا جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے تیری شکل بہت بُری اور بو نہایت گندی بنائی ہے، عمل کہے گا: میں دنیا میں بھی ایسا تھا، میں تیرا بُرا عمل ہوں، دنیا میں تو مجھ پر سوار رہا آج میں تجھ پر سوار رہوں گا، اور تجھے جہنم پہنچاؤں گا۔ [مظهري] ﴿وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ﴾ [الأنعام:٣١] (وہ اپنے بوجھوں اپنی پیٹھوں پر اٹھائیں گے)۔

فرمایا: ﴿وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا﴾ کہ ہم مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسا ہانکیں گے، شدّت پیاس سے ان کی گردنیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔

﴿لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ﴾ یہ کسی قسم کی شفاعت کا حقدار نہیں ہوں گے، اور نہ ہی ان کے لئے کوئی شفاعت کرنے والا ہوگا۔

﴿اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا﴾ ہاں! مؤمن ہر طرح شفاعت یاب رہیں گے، جنہوں نے رحمٰن عزّ شانہ سے وعدہ لے رکھا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت اور مغفرت کی پیشگی بشارت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کے لئے شفاعت کی نفی ہے، اور "اِلَّا" اہل ایمان کے لئے شفاعت کا اثبات ہے، اور عہد سے مراد اقرار توحید اور ایمان ہے۔ علامہ قرطبیؒ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث روایت کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے یہ کہتے سنا کہ کیا تم اس بات سے عاجز ہو کہ ہر صبح وشام اپنے ربّ کے پاس ایک عہد لو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: اے اللہ تعالیٰ کے رسول! وہ کس طرح؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: صبح و شام یہ کہو: اَللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عَالِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اِنِّيْ اَعْهَدُكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ

الدُّنیا بِاَنِّیْ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُکَ وَرَسُوْلُکَ فَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ فَاِنَّکَ اِنْ تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ تُبَاعِدْنِیْ مِنَ الْخَیْرِ وَتُقَرِّبْنِیْ اِلَی الشَّرِّ وَاِنِّیْ لَآ اَثِقُ اِلَّا بِرَحْمَتِکَ فَاجْعَلْ لِّیْ عِنْدَکَ عَهْدًا تُوَفِّیْنِیْهِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِنَّکَ لَا تُخْلِفُ الْمِیْعَادَ۔

جو شخص صبح وشام یہ کہے گا اللہ تعالیٰ اس پر مہر لگا کر عرش کے نیچے رکھ دے گا، اور جب قیامت کا دن ہوگا تو منادی ندا کرے گا: کہاں ہیں وہ لوگ جن کا اللہ تعالیٰ کے پاس عہد ہے؟ پس وہ شخص کھڑا ہوگا، اور اسے جنت میں داخل کیا جائے گا۔

عہد کا ترجمہ: اے اللہ تعالیٰ! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! اے غیب (پوشیدہ) اور شہادت (ظاہر) کو جاننے والے! میں تیرے پاس اس دنیاوی زندگی میں ایک اپنا عہد رکھتا ہوں، وہ یہ کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ نہیں کوئی معبود بغیر تیرے، تو ایک ہے، تیرا کوئی شریک نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ تیرے بندے اور تیرے رسول ہیں، مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر، کیونکہ اگر تو مجھے میرے نفس کے حوالے کر دے گا تو وہ مجھے خیر سے دور اور شر کے قریب کر دے گا، اور میں تیری رحمت کے بغیر کسی چیز پر بھروسہ نہیں کرتا، میرے اس اقرار کو بطور عہد نامہ محفوظ فرما، اور قیامت کے دن مجھے وہ عطا کر بیشک تو وعدہ خلافی نہیں کرتا۔ [قرطبی]

❀ ❀ ❀

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿٨٨﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿٨٩﴾ تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ
مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿٩٠﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿٩١﴾ وَمَا يَنْبَغِيْ
لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿٩٢﴾ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ
عَبْدًا ﴿٩٣﴾ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿٩٤﴾ وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾

ترجمہ: اور ان لوگوں نے کہا کہ رحمٰن نے اولاد اختیار کر لی ہے ﴿٨٨﴾ البتہ تم نے بہت ہی سخت بات کہی ﴿٨٩﴾ قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں، اور زمین شق ہو جائے، اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں ﴿٩٠﴾ اس بات سے کہ انہوں نے رحمٰن کے لئے اولاد تجویز کی ﴿٩١﴾ اور رحمٰن کی شان کے لائق نہیں کہ وہ کسی کو اپنی اولاد بنائے ﴿٩٢﴾ جو بھی آسمان اور زمین میں ہیں وہ سب رحمٰن کے پاس بندگی اختیار کئے ہوئے حاضر ہوں گے ﴿٩٣﴾ اللہ تعالیٰ نے ان سب کو خوب اچھی طرح شمار کیا

ہے، اور ان سب کو اچھی طرح گن رکھا ہے﴿٩٤﴾ اور ان میں سے ہر ایک قیامت کے دن اس کے پاس تنہا آئے گا﴿٩٥﴾

معارف ومنازل

مشرکین عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اور یہودی حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا بتاتے تھے، یہ لوگ اب بھی اپنے مذموم دعویٰ پر قائم ہیں، اور ان کے علاوہ دیگر مشرکین بھی اس طرح کا عقیدہ رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا﴾ انہوں نے کہا کہ رحمٰن جل شانہ نے اپنے لئے اولاد اختیار کر لی ہے۔

﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا﴾ بلاشبہ تم نے بہت سخت بات کہی ہے، یہ اتنی بڑی ناجائز اور نامعقول بات ہے جس کا کوئی اندازہ اور حد نہیں، جیسے فرمایا:

﴿تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا﴾

یعنی یہ ایسی بھاری بات کہی گئی، اور ایسا سخت گستاخانہ کلمہ منہ سے نکالا گیا جسے سن کر اگر آسمان وزمین اور پہاڑ مارے ہول کے پھٹ پڑیں اور ریزہ ریزہ ہوجائیں تو کچھ بعید نہیں، اس گستاخی پر اگر غضب الٰہی بھڑک اٹھے تو سارا عالم تہ وبالا ہوجائے، اور آسمان وزمین کے پرخچے اڑ جائیں، محض اس کا حلم مانع ہے کہ ان بیہودگیوں کو دیکھ کر دنیا کو فوراً لمحوں میں تباہ نہیں کرتا۔ جس خداوند قدوس کی توحید پر آسمان وزمین، دریا، پہاڑ، غرض ہر علوی وسفلی چیز شہادت دے رہی ہے، پس انسان کی یہ جسارت کہ اس کے لئے اولاد کی احتیاج ثابت کرنے لگے۔ العیاذ باللہ

﴿وَمَا يَنْبَغِي لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا﴾ رحمٰن جل شانہ کے شایان شان نہیں، اور یہ بات ہرگز جائز نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے، نہ تو اسے نسب کی ضرورت ہے، اور نہ وہ (نعوذ باللہ) محتاج ہے کہ اسے کسی کی امداد کی حاجت ہو۔

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ جو کچھ بھی آسمان اور زمین میں ہے سب رحمٰن جل شانہ کے سامنے عاجز اور بندے ہوکر آئیں گے، جب ساری خلقت کی گردنوں میں اس کی غلامی کا طوق ڈالا ہوا ہے تو پھر اسے کسی بیٹے کی ضرورت ہی کیا؟

﴿لَقَدْ اَحْصٰهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا﴾ اس نے ساری خلقت کا احاطہ کیا ہوا ہے، وہ اور ہر ایک کو شمار کیا ہوا ہے،

کوئی مخلوق اور اس کا کوئی ذرہ اس کے علم و احاطہ اور شمار سے باہر نہیں۔

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ قیامت کے دن ان میں سے ہر ایک اللہ تعالیٰ کے حضور تنہا پیش ہوگا، اس دن نہ خاندان ساتھ ہوگا، نہ برادری اور نہ کوئی قریب و رشتہ دار، اور نہ ہی کوئی وکیل صفائی، نہ کوئی محافظ و باڈی گارڈ، بلکہ ہر شخص اکیلا ہی پیش ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، رحمٰن عزّ شانہ ان کے لئے محبت پیدا فرمادے گا﴿۹۶﴾ سو ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا تاکہ آپ اس کے ذریعہ متقی لوگوں کو بشارت دیں، اور جھگڑالو قوم کو ڈرائیں﴿۹۷﴾ اور ہم نے اس سے پہلے کتنے ہی گروہوں کو ہلاک کر دیا، کیا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں، یا ان میں سے کسی کی کوئی آہٹ سنتے ہیں؟﴿۹۸﴾

معارف و منازل

ان تینوں آیات کے ساتھ سورۂ مریم اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہے۔ لفظ "رحمٰن" وہ عظیم صفت باری تعالیٰ ہے جس کا اطلاق کسی غیر اللہ پر ممنوع ہے۔ یہ عظیم صفت اس سورت کے ماتھے کا جھومر ہے، جو کہ سورۂ مریم میں سولہ مرتبہ مذکور ہے۔ یہ کلمہ مسلمانوں کے لئے پیغامِ حیات و بقاء ہے، اور کفار کے لئے پیغامِ حسرت و فناء ہے، جو رحمٰن کی رحمتوں کا استحقاق ضائع کر کے ہر قسم کی سعادت کھو بیٹھے، اور مکمل خسارے میں پڑ گئے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، اللہ تعالیٰ ان کے لئے محبت پیدا فرمادے گا، یعنی تمام فرشتے جو آسمانوں میں ہیں، اور تمام مومن بندے جو زمین پر بستے ہیں اللہ تعالیٰ ان سب کے قلوب میں ان ایماندار اور نیک اعمال والوں کی محبت ڈال دے گا۔ پہلے اللہ تعالیٰ خود ان سے محبت فرمائے گا، پھر ان کی محبت تمام لوگوں کے دلوں میں ڈال دے گا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت فرماتا ہے تو جبریل امین علیہ السلام کو بلا کر فرماتا ہے کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، لہٰذا وہ اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر جبریل علیہ السلام آسمانوں میں اعلان کر دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت فرماتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو، لہٰذا آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لئے زمین میں مقبولیت رکھ دی جاتی ہے، یعنی اہل زمین اس سے محبت کرتے ہیں (اس سے صالحین مراد ہیں)۔

(اگر کافر و فاسق صالحین سے محبت نہ کریں تو اہل ایمان ان سے بے نیاز ہیں۔ پھر ارشاد فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے سے بغض رکھتا ہے تو جبریل علیہ السلام کو اطلاع دیتے ہیں، وہ تمام فرشتوں کو اطلاع دیتے ہیں، پھر اہل زمین میں بھی اس کا اعلان ہوتا ہے، تو سب اس سے بغض رکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ [مسلم]

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو بھی بندہ اچھا یا برا کوئی بھی عمل کرے اللہ تعالیٰ اسے اس کے عمل کی چادر ضرور پہنا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصحاب خیر کی خیر کے ساتھ شہرت ہوگی، اور اصحاب شر کا شر کے ساتھ تذکرہ ہوگا۔ خیر کی صورت میں شہرت کے ساتھ مقبولیت بھی لازمی ہوگی، جبکہ شر کی شہرت مقبولیت سے سراسر عاری رہے گی، کیونکہ شر اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردود ہونے کی نشانی ہے، تو مقبولیت اور شہرت کا فرق نہایت بدیہی ہے، لہٰذا مغالطہ نہیں رہنا چاہئے۔

جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے عمل کیا، اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے محنتیں کیں، زحمتیں اٹھائیں، سینکڑوں سال گزر جانے پر بھی آج تک مؤمنین کے دلوں میں ان کی محبت ہے، اور ان کے اچھے کارناموں کا تذکرہ ہے، اور ان کے احترام کا چرچا ہے، ان کے برخلاف جو لوگ دنیا دار صاحب اقتدار تھے، لیکن متقی پرہیزگار نہ تھے، اور جو لوگ مالدار تھے اعمال صالحہ سے خالی تھے ان لوگوں کو شہرت تو حاصل رہی، مگر مقبولیت سے محروم رہے، اور انہیں عموماً برائی سے یاد کیا جاتا ہے۔

پس مؤمنوں کو چاہئے کہ صرف شہرت کا لحاظ رکھ کر عمل نہ کریں، بلکہ رضاء الٰہی کی خاطر حسنِ نیت و اخلاص کے ساتھ عمل کریں، تاکہ شہرت و مقبولیت من جانب اللہ تعالیٰ انہیں حاصل ہو، اور سینکڑوں سال تک ان کا ذکرِ خیر جاری ہو، جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ﴾ [الشعراء: ۸۴] (اور آنے والی نسلوں میں میرے لیے وہ زبانیں پیدا فرمادے جو میری سچائی کی گواہی دیں)۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے

ان کی دعا کو شرف قبولیت عطا فرما کر قیامت تک ان کا ذکر خیر جاری رکھا۔

﴿فَإِنَّمَا يَسَّرْنَٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ ٱلْمُتَّقِينَ وَتُنذِرَ بِهِۦ قَوْمًا لُّدًّا﴾ سو ہم نے قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا تا کہ آپ اس کے ذریعہ متقی لوگوں کو بشارت دیں، اور جھگڑالو قوم کو ڈرائیں۔ قرآن مجید عربی زبان میں ہے جو کہ دنیا کے مروّج و مستعمل ہزاروں زبانوں کی سردار ہے، اور جنت میں جنتیوں کی زبان بھی ہے، یہی زبانِ عربی سید کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مادری زبان ہے، پس اس قرآن عربی کو اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے توسط سے ساری امّت پر آسان فرما دیا، لوگ یعنی مرد عورت، چھوٹے بڑے، عربی عجمی سب اسے پڑھتے ہیں، حفظ کر لیتے ہیں، تفسیر و معنی بآسانی سمجھتے ہیں۔

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا ٱلْقُرْءَانَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ﴾ [القمر: ٣٢] (اور یقیناً ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنا دیا ہے، اب کا کوئی ہے جو نصیحت حاصل کرے؟) ربّ العزّت کی شان اور کرم نوازی ہے کہ لوگ اپنی مادری زبان کی ایک مختصر چھوٹی کتاب کے حفظ پر قدرت نہیں رکھتے، لیکن سات آٹھ سال کے عجمی زبان بولنے والے بچے بچیاں قرآن کریم کے مکمل حافظ ہیں، اور اس کو اس خوبصورتی و خوش الحانی سے پڑھتے ہیں کہ ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔

لُدًّا جمع ہے اَلَدّ کی، جس کے معنی جھگڑا کے ہیں۔ سورۃ البقرۃ میں فرمایا: ﴿وَمِنَ ٱلنَّاسِ مَن يُعْجِبُكَ قَوْلُهُۥ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَيُشْهِدُ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا فِى قَلْبِهِۦ وَهُوَ أَلَدُّ ٱلْخِصَامِ﴾ [البقرۃ: ٢٠٤] (اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ ان کی باتیں دنیا کی زندگی میں آپ کو تعجب میں ڈال دیں، اور اللہ گواہی دیتا ہے اس چیز پر جو ان کے دلوں میں ہے، اور وہ سخت جھگڑالو ہے)۔

صحیح بخاری کی حدیث ہے: اَبغَضُ الرِّجَالِ الْاَلَدُّ الْخَصِمُ۔ بدترین انسان اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ ہے جو جھگڑالو، ہٹ دھرم، ضدی ہو۔ یہاں آیت کریمہ میں مراد قریش کے لوگ ہیں، لیکن آیت کریمہ کے عمومی معنی کے لحاظ سے قیامت تک آنے والے وہ سارے لوگ مراد ہیں جو حق سے منحرف اور ضدی و جھگڑالو ہوں، ایسے لوگوں کی ہر زمانے میں کوئی کمی نہیں۔

﴿وَكَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُم مِّن قَرْنٍ﴾ ہم نے ان سے پہلے کتنے ہی گروہوں کو مختلف زمانوں میں ہلاک کر دیا، کیونکہ وہ سارے حق سے منحرف رہے، اور جھگڑالو رہے، جس کے نتیجے میں وہ صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے

مٹا دیئے گئے۔ ﴿فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ﴾ [سبأ: ١٩] (ہم نے ان کو کہانیاں بنا دیا)۔ آج دنیا میں صرف ان کے افسانے اور قصّے کتابوں میں موجود ہیں، جبکہ پوری دھرتی پر نہ ان کی نسل موجود ہے، نہ ان کے آثار و علامات، اور نہ ہی کوئی آہٹ اور آواز۔

﴿هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا﴾ کیا آپ ان کی نسل میں سے کسی کو دیکھتے ہیں، یا ان میں سے کسی کی آہٹ سنتے ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ تکذیب کرنے والی بہت سی امتیں اور جماعتیں گزر چکی ہیں، جو اپنی نافرمانی کی پاداش میں ہلاک کی گئیں، آج ان کی کوئی بات سننے میں نہیں آتی، وہ کیسے کیسے متمدن تہذیب وثقافت کے لوگ تھے، بڑے ترقی یافتہ لوگ تھے، عاد وثمود، قوم نوح، آشوری اور بابلی خاندان کلدانی اور صابی خاندان، یہ سارے ہلاکت کے گڑھوں میں دفن ہو چکے، جن کا ایک بیگناہ بچہ بھی دھرتی پر زندہ نہیں رہا، یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ ﴿اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٧﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿١٨﴾﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے پہلے والوں کو ہلاک نہیں کیا؟ پھر ان کے پیچھے آنے والوں کو لگا دیا۔ ہم مجرم لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں)۔ پس چاہئے کہ موجودہ اور آئندہ لوگ پیشرو تباہ شدہ اقوام کی تباہی سے عبرت حاصل کریں، اور جھگڑالو بن کر اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت نہ دیں۔

سُورَۃ طٰہٰ

مکیۃٌ آیاتہا ١٣٨ رکوعاتہا ٨

سورۂ طٰہٰ مکی ہے، اس میں ایک سو پینتیس (١٣٥) آیتیں، اور آٹھ (٨) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ طٰہٰ ہے، جو اس سورت کی پہلی آیت کا پہلا لفظ ہے۔ اس سورت کا ایک نام "الکلیم" بھی ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں بیسویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۴۵ ویں نمبر پر ہے۔ اس کا نزول سورۃ الاخلاص کے بعد ہے۔

نزول:

یہ سورت مکیہ ہے، اور اس کا نزول مکی دور کے وسط میں ہے۔ اس سورت میں آٹھ رکوع، اور ١٣٥ آیات ہیں۔ یہ ١٢٥١ کلمات، اور ۵٦٦۴ حروف پر مشتمل ہے۔

ربط و مناسبت:

(١)۔ سورۂ مریم میں عجائبات قدرت، مثلاً حضرت یحییٰ و حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا بیان ہوا، اس سورت میں عجائبات قدرت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ شانہ کا براہ راست کلام، اور آپ علیہ السلام کے عجیب معجزات کا بیان ہے۔

(٢)۔ سورۂ مریم کے آخر اور اس سورت کے شروع میں صداقتِ قرآن کا بیان ہے۔

(٣)-دونوں سورتوں کا شروع حروفِ مقطعات سے ہے۔

(۴)-ایمان کے بنیادی عقائد،توحید،رسالت،قیامت کا بیان دونوں سورتوں کا موضوع ہے۔

(۵)-مؤمنین کے انجامِ خیر اور کفار کے انجامِ بد کا دونوں سورتوں میں بیان ہے۔

مختصر موضوع:

توحید،رسالت اور معاد کا بیان،حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تفصیلی داستان،حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا اور اس کی اجابت،فرعون کو تبلیغ اور جادوگروں کا مقابلہ اور ان کے ایمان کا تذکرہ،نیز فرعون کی سرکشی کا بیان،بنی اسرائیل کا مصر سے خروج اور فرعون کا تعاقب،اور دریائے قلزم میں مع فوج کی غرقابی وتباہی کا بیان،بنی اسرائیل کی میدانِ تیہ میں دربدری اور گوسالہ(بچھڑا) پرستی،نیز سامری کی شرارت اور اس کی تباہی،داستانِ آدم علیہ السلام اور تسلی خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

طٰهٰ ۝١ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ۝٢ اِلَّا تَذۡكِرَةً لِّمَنۡ يَّخۡشٰى ۝٣ تَنۡزِيۡلًا مِّمَّنۡ خَلَقَ الۡاَرۡضَ وَ
السَّمٰوٰتِ الۡعُلٰى ۝٤ اَلرَّحۡمٰنُ عَلَى الۡعَرۡشِ اسۡتَوٰى ۝٥ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَمَا بَيۡنَهُمَا وَمَا
تَحۡتَ الثَّرٰى ۝٦ وَاِنۡ تَجۡهَرۡ بِالۡقَوۡلِ فَاِنَّهٗ يَعۡلَمُ السِّرَّ وَاَخۡفٰى ۝٧ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ‌ؕ لَهُ الۡاَسۡمَآءُ الۡحُسۡنٰى ۝٨

ترجمہ: طٰہٰ ① ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ تکلیف اٹھائیں ② بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لئے جو ڈرتا ہو ③ یہ اس ذات کی طرف سے نازل کیا گیا جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا فرمایا ④ وہ بڑی رحمت والا ہے،عرش پر مستوی ہوا ⑤ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور جو ان کے درمیان ہے اور جو تحت الثریٰ ہے ⑥ اور اگر آپ زور سے بات کریں تو بلاشبہ وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو جانتے ہیں،اور اس بات کو بھی جانتا ہے جو اس سے زیادہ خفی ہو ⑦ اللہ تعالیٰ ایسا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں،اس کے لئے الاسماء الحسنیٰ ہیں ⑧

☆☆☆

معارف ومنازل

طٰہٰ حروف مقطعات میں سے ہے، اس بارے میں پسندیدہ اور بے غبار بات وہی ہے جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور جمہور علماء کرام نے فرمائی کہ تمام سورتوں کے شروع میں آنے والے حروف مقطعات متشابہات یعنی اسرار ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا، لفظ طٰہٰ بھی اسی میں داخل ہے۔ مختلف علماء کرام نے جو طٰہٰ کے بارے میں مختلف معانی بیان کئے ہیں وہ حقیقی نہیں تاویلی اور احتمالی ہیں، جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس کے معنی "یا رجل"، اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے "یا حبیبي"۔ بعضوں سے "یا بدر" اے چودھویں کے چاند! منقول ہے۔ ان تینوں اقوال میں حرف ندا "یا" محذوف ماننا پڑے گا۔

اور بعض روایات حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ طٰہٰ اور یٰس آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء گرامی میں سے ہیں۔ بعض علماء نے طٰہٰ کو اسماء حسنیٰ میں شمار کیا ہے۔ واللہ اعلم!

﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى﴾ لِتَشْقٰى شِقاء سے مشتق ہے، جس کے معنی تھکاوٹ اور تکلیف کے ہیں۔ سورۂ مزمل کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تمام رات قیام کر کے پورے شوق و جذبہ سے نمازیں پڑھتے تھے، اور نماز تہجد میں قرآن کی تلاوت سے محظوظ رہتے تھے، اس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک قدموں (پاؤں) متورم ہوتے تھے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ باری باری کے ساتھ ایک قدم پر دیر تک کھڑے رہتے تھے، اس کے علاوہ دن رات ہر وقت اسی فکر میں رہتے تھے کہ کسی طرح کفار قرآن کریم کی دعوت قبول کر کے ایمان لائیں، جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ [الشعراء:٣] (شاید تم اس غم میں اپنی جان ہلاک کیے جا رہے ہو کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے)۔

یعنی کفار قریش کے غم میں اپنے کو اس قدر گھلانے کی ضرورت نہیں، کیا ان کے پیچھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی جان کو ہلاک کر کے رہیں گے؟ دلسوزی کی بھی آخر ایک حد ہے۔ اس آیت کریمہ میں دونوں قسم کی مشقت سے بچانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرمایا کہ:

﴿مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى﴾ ہم نے آپ پر قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ بدنی اور روحانی تکلیف میں پڑ جائیں، تمام رات نماز میں تلاوت قرآن میں گزاریں، اور شب و روز قوم کی فکر مندی میں پریشان رہیں، آپ آئندہ رات کا ایک حصہ نماز و تلاوت میں لگائیں، اور قوم کو تبلیغ کرتے رہیں، جن کی قسمت اچھی ہو

وہ ایمان لائیں گے، اور بدقسمت بدستور گمراہ رہیں گے، آپ کا فریضہ صرف تبلیغ ہے، ہدایت تیرے ربّ کے ہاتھ میں ہے۔

﴿اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى﴾ بلکہ ایسے شخص کی ہدایت کے لئے اتارا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے متقی لوگوں کے لئے یہ قرآن ہدایت اور نصیحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم سراسر سعادت وبرکت کا پیغام ہے، جو لوگ خدا سے ڈرتے ہیں اور قرآن پڑھتے ہیں، پھر اس پر عمل بھی کرتے ہیں وہ نفع وخیر کماتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے قرآن حکیم تذکرہ ونصیحت ہے، خصوصاً علماء کے لئے جیسا کہ ارشاد ہے: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ۔ [بخاري]

یعنی اللہ تعالیٰ جس شخص کی بھلائی (سعادت) کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کو دین کا علم اور سمجھ عطا فرماتے ہیں۔

حضرت ثعلبہ بن الحکم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا فیصلہ کرنے کے لئے اپنی کرسی پر تشریف فرما ہوں گے تو علماء سے فرمادیں گے کہ میں نے اپنا علم وحکمت تمہارے سینوں میں صرف اسی لئے رکھا تھا کہ میں تمہاری مغفرت کرنا چاہتا ہوں، باوجود ان خطاؤں کے جو تم سے سرزد ہوئیں، اور مجھے کوئی پرواہ نہیں۔ [ابن كثير، طبراني]

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہاں علماء سے مراد وہی علماء ہیں جن میں قرآنی علامت "خشیت الٰہی" موجود ہو۔ یہ لفظ لِمَنْ يَّخْشٰى اسی طرف اشارہ ہے، پس جن میں یہ صفت نہ ہو وہ اس کے مستحق نہیں۔ واللہ اعلم

﴿تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى﴾ یہ اس ذات واحد لاشریک کی طرف سے نازل کردہ ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے، جو عظیم ذات علوی وسفلی بے مثال مخلوقات کی خالق ومالک ہے، وہ اس عظیم قرآن کو ایک عظیم مقصد کے لئے اتارا، پس جس شخص نے اسے اپنے سینے میں جگہ دیدی تو اس کی عظمت وہی ہوگی جس کا بیان ابھی حدیث میں گزرا۔

﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ وہ بڑی رحمت والا جو عرش پر مستوی ہوا۔ یہ مسئلہ استواء علی العرش متشابہات میں سے ہے، سورۂ اعراف میں اس کا مفصل بیان گزر چکا، وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

﴿لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى﴾ اسی کی ملکیت میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے، اور جو کچھ زمین میں ہے، اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان خلا میں ہے، اور جو کچھ ثریٰ کے نیچے

ہے، یعنی نمناک مٹی کے نیچے ساتویں زمین کے نیچے تک۔

ثریٰ نمناک مٹی گیلی مٹی کو کہتے ہیں، جو زمین کھودنے کے وقت نکلتی ہے۔ مخلوقات کا علم تو صرف ثریٰ تک ختم ہو جاتا ہے، آگے اس ثریٰ کے نیچے کیا ہے، اس کا علم سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کو نہیں۔ موجودہ زمانے کی نئی تحقیق اور ریسرچ اور نئے نئے آلات اور سائنس کی انتہائی ترقی کے باوجود اب سے چند سال پہلے زمین کو برما کر کے ایک طرف سے دوسری طرف (اوپر نیچے) نکل جانے کی کوشش مدتوں تک مختلف براعظموں میں یکساں جاری رہی، ان سب تحقیقات اور انتھک کوششوں کا نتیجہ اخبارات میں سب کے سامنے آچکا ہے کہ صرف چھ میل کی گہرائی تک یہ آلات جدیدہ کام کر سکے، آگے (نیچے) ایک ایسا حجری غلاف ثابت ہوا جہاں کھودنے کے سارے آلات اور سائنس جدید کے سب افکار و تدابیر بیکار ہوئے، اور سائنسدان عاجز ہو گئے، یہ صرف چھ میل تک کا علم انسان حاصل کر سکا ہے، جبکہ زمین کا قطر ہزاروں میل کا ہے، اس لئے اس اقرار کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ ماتحت الثریٰ کا علم حق تعالیٰ سبحانہ ہی کی مخصوص صفت ہے۔

﴿وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى﴾ اور اگر تم پکار کر بات کرو تو وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو اور اس سے بھی خفی بات کو جانتا ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ جملہ اصل میں اس طرح تھا: اگر آپ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس سے دعا پکار کر کریں گے تو اللہ تعالیٰ کو اس پکارنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ "سِرّ" کو جانتا ہے، اور بہت زیادہ پوشیدہ کو بھی جانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کا ذکر چلا کر کریں گے، اونچی آواز میں یا چپکے چپکے پست آواز میں اللہ تعالیٰ کے لئے دونوں برابر ہیں، وہ ہر اندازے کو سنتا بھی ہے اور جانتا بھی ہے، اور ہر طرح ثواب عنایت کرتا ہے، جیسا کہ سورۂ اعلیٰ میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى﴾ [الأعلى: ٧] (یقیناً وہ کھلی ہوئی چیزوں کو بھی جانتا ہے، اور ان چیزوں کو بھی جو چھپی ہوئی ہیں)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: سِرّ سے مراد وہ بات ہے جو انسان نے اپنے دل میں چھپائی ہوئی ہے، کسی پر ظاہر نہیں، اور اخفیٰ سے مراد وہ بات ہے جو ابھی تمہارے دل میں بھی نہیں آئی، آئندہ کسی وقت تمہارے دل میں شاید آئے گی۔

مختصر یہ سمجھو کہ موجودہ خیالات اور آئندہ خیالات یہ سب کے سب ابھی سے اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں، وہ آج کے اور آئندہ سو سال بعد کے آنے والے حالات اور خیالات سے باخبر ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ آج کے

انسانوں کے حالات اور ہزاروں سال بعد میں پیدا ہونے والوں کے حالات سے آج ہی باخبر ہے۔ وھو الحق

﴿اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، تمام اچھے نام اور تمام عمدہ و پاکیزہ صفات اور بے مثال کمالات اسی کے لئے ہیں، خالقیت، مالکیت، ربوبیت، رزاقیت اور تمام صفاتِ فاضلہ عالیہ اسی کے لئے مخصوص ہیں، اور کسی میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں، وہ اپنی ذات وصفات دونوں میں یکتا و یگانہ ہے۔

﴿لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ﴾ اسماء حسنیٰ پر مفصل کلام سورۃ الاعراف میں گزر چکا وہاں دیکھا جائے۔

وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝٩ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّيْۤ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْۤ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا
بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۝١٠ فَلَمَّاۤ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۝١١ اِنِّيْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ
بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۝١٢ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ۝١٣ اِنَّنِيْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ
وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝١٤ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝١٥ فَلَا
يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ۝١٦

ترجمہ: اور کیا آپ کے پاس موسیٰ کی خبر آئی ہے؟ ⑨ جب انہوں نے آگ کو دیکھا تو اپنے گھر والوں سے کہا کہ تم ٹھہرے رہو، میں نے آگ دیکھی ہے، ہوسکتا ہے کہ اس میں سے تمہارے لئے ایک شعلہ لے آؤں، یا آگ پر راستہ بتانے والا کوئی شخص مل جائے ⑩ سو جب اس کے پاس آئے تو انہیں ندا دی گئی کہ اے موسیٰ! ⑪ بیشک میں تمہارا رب ہوں، سو اپنی جوتیاں اتار دو، بیشک تم ایک پاک میدان یعنی طویٰ میں ہو ⑫ اور میں نے تمہیں منتخب کرلیا ہے، سو جو کچھ تمہاری طرف وحی کی جارہی ہے اسے سن لو ⑬ بیشک میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو تم میری عبادت کرو، اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو ⑭ بلاشبہ قیامت آنے والی ہے، میں اس کو پوشیدہ رکھوں گا تاکہ ہر جان کو اس کے کئے ہوئے کاموں کا بدلہ دے دیا جائے ⑮ سو جو شخص اس پر ایمان نہ لائے اور اپنی خواہشوں کا اتباع کرے وہ تمہیں اس سے نہ روک دے، ورنہ تم تباہ ہوجاؤ گے ⑯

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام قبطی کے قتل کے بعد جب مصر سے نکل گئے تو مدین پہنچے (تفصیل سورۂ قصص میں

دیکھیں) وہاں ان کی ملاقات خطیب الانبیاء حضرت شعیب علیہ السلام سے ہوئی، پورا واقعہ سنانے کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی بیٹی حضرت صفورا سے ان کا نکاح کیا، اور دس سال انہیں اپنے مال کی خدمت پر اجیر رکھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام دس سال تک ان کے مال مویشی کی خدمت بجالانے کے بعد ان سے اجازت لے کر اپنی والدہ، بہن بھائیوں کی ملاقات کے لئے وہاں سے مصر روانہ ہوئے، ان کی بیوی ساتھ تھیں، اور ایک خادم بھی ہمراہ تھا، اتفاقاً ہوا یہ کہ ان کو اور خاص کر حاملہ بیوی کو وہاں کے موسمِ سرما کے سبب سردی محسوس ہوئی، اور راستہ بھی بھول گئے۔

رات کی تاریکی، ناہموار راستہ، سردی کی شدت، بیوی کی بیماری اور وضع حمل کے آثار نے انہیں کافی پریشان کیا، وہ اسی پریشانی کے عالم میں تھے کہ انہیں قریبی پہاڑی طور پر آگ نظر آئی، اسے دیکھ کر بیوی بچوں سے کہا کہ تم یہیں رہو، مجھے پہاڑی کے ساتھ آگ نظر آرہی ہے، میں وہاں جاکر آگ کا شعلہ لے کر آؤں گا، اور راستے کے متعلق وہاں سے معلومات حاصل کروں گا۔ جب وہ وہاں قریب پہنچے تو وہاں ماجرا ہی دوسرا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو نبوت سے سرفراز فرمانا تھا (گئے تھے دنیا کا راستہ معلوم کرنے، نوازے گئے عقبیٰ کے راستہ نبوت سے)۔

یہ مقدس جگہ طویٰ کی اس جانب کے کنارے سے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے داہنی طرف تھی، یہ آگ ایک بہت بڑے درخت کی بلند شاخوں میں ہر طرف گھومتی ہوئی نظر آرہی ہے، اس درخت سے اچانک آواز آئی، یہ آواز چاروں طرف سے سنائی دے رہی تھی، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام صرف کانوں سے نہیں بلکہ بدن کے تمام اعضاء کے ذریعہ سنتے رہتے تھے۔ فرمایا: اے موسیٰ! میں تمہارا ربّ ہوں، تم جس جگہ پر ہو یہ مقدس پاک میدان ہے، جس کا نام طویٰ ہے، تم اپنی جوتیاں اتاردو۔ حضرت عکرمہؒ اور مجاہدؒ نے فرمایا کہ جوتیاں اتارنے کا حکم اس لئے ہوا کہ مقدس سرزمین کے احترام کے تقاضے کے ساتھ یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ مقدس سرزمین کی مٹی ان کے قدموں کو لگ جائے۔ [معالم التنزیل]

جو لوگ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی جوتیاں گدھے کی غیر مدبوغ کھال سے بنی ہوئی تھیں، اور اسے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کرتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ پہلی وجہ کے ساتھ یہ دوسری وجہ بھی ہو۔ واللہ اعلم

مفسرین حضرات نے کہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا وہ حقیقت میں آگ نہیں تھی، بلکہ وہ ربّ العزّت سبحانہ کا ایک مخصوص نور تھا، چونکہ انہوں نے دور سے اسے آگ محسوس کیا تھا اس لئے انہوں نے اسے نار سے تعبیر فرمایا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور عکرمہؒ کا بھی یہی قول ہے۔ صاحب روح المعانی نے

حضرت وہب بن منبہؒ سے بحوالہ کتاب الزہد حضرت امام احمد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب آگ کے قریب پہنچے تو وہاں ایک عجیب حیرت انگیز منظر دیکھا، ایک بڑی آگ ہے جو ایک سرسبز ہرے بھرے درخت کے اوپر شعلے مار رہی ہے، مگر حیرت یہ ہے کہ درخت کی کوئی شاخ یا پتہ نہیں جلتا، بلکہ آگ کی وجہ سے درخت کی تر و تازگی اور رونق میں نہایت دلکش و دل فریب منظر کا اضافہ ہو رہا ہے، اسی منظر کو دیکھتے دیکھتے وہ براہ راست کلام الٰہی سماعت فرماتے ہوئے نبوت کے عظیم منصب عالی سے سرفراز ہوئے، اور کلیم اللہ کے لقب سے نوازے گئے۔

خدا کے دین کا موسیٰ علیہ السلام سے پوچھئے احوال ☆ کہ آگ لینے کو جائے پیغامبری مل جائے
اگر کوئی شعیب آئے میسر ☆ شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

(علامہ اقبالؒ)

قدرت کی کرشمہ سازیوں کا اندازہ لگائیے! کل کا بکریوں کا چرواہا آج ربّ العزّت کے ساتھ ہم کلامی کا شرف حاصل کر رہا ہے۔ کل بکریوں کا چرواہا رہا آج وہ "اشرف المخلوقات" کا چرواہا بن رہا ہے، جانوروں کی گلہ بانی سے فراغت پا کر مصر جیسے ترقی یافتہ متمدن ملک کے بادشاہ فرعون کی راہنمائی و ہدایت کے لئے منتخب ہو رہا ہے۔

﴿وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى﴾ اور کیا آپ کو موسیٰ کے قصے کی خبر پہنچی؟ استفہام تقیری ہے، یعنی یقیناً موسیٰ علیہ السلام کا قصہ آپ کو پہنچ گیا، جس کو سن کر آپ ان کی طرح صبر اور استقامت کا پہلو اختیار فرمائیں۔

﴿اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا﴾ جب انہوں نے دور سے آگ دیکھی تو بیوی سے کہا: تم یہیں ٹھہرو، میں نے آگ دیکھی ہے، شاید اس میں سے تمہارے پاس کوئی شعلہ لے آؤں، یا راستے کا پتہ معلوم کر کے آجاؤں۔ قَبَسٌ آگ کے شعلے کو کہتے ہیں، جو لکڑی کے سرے کے ساتھ چمٹا ہوا ہو۔

﴿فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ⑪ اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ﴾ سو جب وہ آگ کے پاس پہنچے تو ان کو ندا آئی کہ اے موسیٰ! یہ کوئی آگ نہیں، میں تمہارا ربّ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ دور سے جو آگ معلوم ہوئی وہ نور ہی نور تھا، فرمایا:

﴿فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى﴾ پس تم اپنے جوتے اتار دو، کیونکہ یہ مقام ادب اور عظمت کا ہے تاکہ اس مقدس وادی طوبیٰ کی مٹی تیرے پاؤں کو لگ جائے۔

﴿وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى﴾ میں نے رسالت و نبوت کے لئے تیرا انتخاب کیا ہوا ہے، پس جو کچھ تمہاری طرف وحی کیا جا رہا ہے اسے سنو اور یاد کرو۔

﴿اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكۡرِیۡ﴾ میں ہی اللہ تعالیٰ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں، سوتم میری عبادت کرو، اومیری یادکر کے نماز پڑھو۔ پہلے عمومی عبادت کا ذکر ہوا، پھر تمام عبادتوں کا سرچشمہ نماز کا ذکر ہوا کہ میری یاد کے ساتھ نماز قائم کیا کرو۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں نے دریافت کیا: یارسول اللہ !اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ پیارا کونسا عمل ہے؟ فرمایا: نماز۔[رواه الشیخان في الصحیحین]

﴿اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِیَةٌ اَكَادُ اُخۡفِیۡهَا﴾ بلاشبہ قیامت آنے والی ہے، میں اس کے مقررہ ساعت اور وقت کو پوشیدہ رکھوں گا۔ ﴿لِتُجۡزٰی كُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا تَسۡعٰی﴾ تاکہ ہر شخص کو اس کی کوشش کا بدلہ دے دیا جائے۔

﴿فَلَا یَصُدَّنَّكَ عَنۡهَا مَنۡ لَّا یُؤۡمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرۡدٰی﴾ سو جو شخص قیامت پر ایمان نہ لائے اور اپنی خواہشوں کا اتباع کرے وہ تمہیں ان سے نہ روک دے، ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے آنے کا عقیدہ رکھو، جولوگ قیامت کو نہیں مانتے اور اپنی خواہشات نفس کے پیچھے چلتے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولوں علیہم السلام کو اور آسمانی کتابوں کو نہیں مانتے، آپ ان کی بات نہ ماننا، اگر آپ نے ان منکرین میں سے کسی کی بات مان لی تو آپ ہلاک ہو جائیں گے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے تو یہ بات بعید ہے کہ وہ کسی منکر کافر کی بات مانیں، ان کو خطاب کر کے دوسروں کو تنبیہ فرمادی کہ منکرین قیامت کی بات مان کر تباہ و برباد نہ ہو جانا، اور کبھی کافروں کا ساتھ نہ دینا۔

وَمَا تِلۡكَ بِیَمِیۡنِكَ یٰمُوۡسٰی ﴿١٧﴾ قَالَ هِیَ عَصَایَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَیۡهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰی غَنَمِیۡ وَلِیَ فِیۡهَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰی ﴿١٨﴾ قَالَ اَلۡقِهَا یٰمُوۡسٰی ﴿١٩﴾ فَاَلۡقٰىهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسۡعٰی ﴿٢٠﴾ قَالَ خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ ٜ سَنُعِیۡدُهَا سِیۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰی ﴿٢١﴾ وَاضۡمُمۡ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَةً اُخۡرٰی ﴿٢٢﴾ لِنُرِیَكَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡكُبۡرٰی ﴿٢٣﴾ اِذۡهَبۡ اِلٰی فِرۡعَوۡنَ اِنَّهُ طَغٰی ﴿٢٤﴾

ترجمہ: اور اے موسیٰ! وہ تمہارے دائیں ہاتھ میں کیا ہے؟﴿١٧﴾ عرض کیا: وہ میری لاٹھی ہے، میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، اور اس سے اپنی بکریوں پر پتے جھاڑتا ہوں، اور اس میں میرے اور بھی کام ہیں﴿١٨﴾ فرمایا: اے موسیٰ! اس

کو ڈال دو ⑲ سو انہوں نے اس کو ڈال دیا سو وہ اچانک دوڑتا ہوا سانپ ہے ⑳ فرمایا: اس کو پکڑلو، اور ڈرومت، ہم اسے پہلی حالت پر لوٹا دیں گے ㉑ اور اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں لے لو، وہ بغیر کسی عیب کے روشن ہو کر نکلے گا، یہ دوسری نشانی ہے ㉒ تا کہ ہم تم کو بڑی نشانیوں میں بعض نشانیاں دکھلائیں ㉓ تم فرعون کی طرف چلے جاؤ، بلاشبہ وہ سرکشی اختیار کئے ہوئے ہے ㉔

معارف ومنازل

بارگاہ ربّ العٰلمین کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو براہ راست خطاب وکلام کے شرف سے نوازا جارہا ہے، اور اس سے کہا جارہا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ اس کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام پر لطف وکرم اور خاص مہربانی کا آغاز ہورہا ہے، تاکہ حیرت انگیز مناظر مشاہدہ کرنے اور کلام ربانی کے سننے سے جو ہیبت اور دہشت ان پر طاری تھی وہ دور ہوجائے، یہ ایک محبوبانہ انداز کا خطاب ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ اس کے علاوہ اس سوال میں یہ حکمت بھی ہے کہ آگے اس عصا کو جوان کے ہاتھ میں تھی ایک سانپ اور اژدھا بنانا ہے، اس لئے انہیں ابھی سے خبردار کیا کہ اچھی طرح دیکھ لو تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ جب انہوں نے دیکھ لیا کہ لکڑی کی چھڑی ہے تب اس کو سانپ بنانے کا معجزہ ظاہر کیا گیا، ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ میں رات کے اندھیرے میں شاید لاٹھی کی جگہ سانپ ہی پکڑ لایا ہوں۔

﴿قَالَ هِيَ عَصَايَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے سوال صرف اتنا ہوا تھا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا چیز ہے؟ اس کا اتنا جواب کافی تھا کہ لاٹھی ہے، مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام اس جگہ تین باتیں اصل سوال کے جواب سے زیادہ عرض کرلیں: اول یہ کہ یہ میری عصا ہے، دوسری یہ کہ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں، تیسری یہ کہ اس سے اپنی بکریوں کے لئے درختوں سے پتے جھاڑتا ہوں، اس کے علاوہ اس سے میں بہت کام نکالتا ہوں۔

عشق ومحبت کے بہت سے تقاضوں میں سے ایک یہی ہے کہ محبوب کے ساتھ ہم کلامی میں لطف اندوز ہوکر سلسلہ کلام کو طول دیا جائے، اور طرح طرح کی باتوں سے اپنے دل کو خوش اور آباد رکھا جائے۔ ہاں! ادب کا لحاظ ملحوظ رکھ کر تمام جزئیات کے بیان سے جو طول پیدا ہوسکتا ہے اسے مختصر کر کے اجمال پر اکتفاء کرنا بھی دانشمندی ہے، اس لئے فرمایا:

﴿وَلِیَ فِیۡهَا مَاٰرِبُ اُخۡرٰی﴾ ان کے علاوہ اس عصاء سے اور بہت سے فوائد اور ضروری کام لیتا ہوں۔ اہل بلاغت نے کہا ہے کہ شفقۃً اگر مجیب سائل کے سوال سے زائد چیزوں کا جواب دیدے تو مصلحت وشفقت پر محمول ہوگا، اور فصاحت وبلاغت کے عین مطابق شمار ہوگا۔

﴿قَالَ اَلۡقِهَا یٰمُوۡسٰی ۝١٩ فَاَلۡقٰىهَا فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسۡعٰی ۝٢٠﴾ فرمایا: اسے زمین پر ڈال دو، جب انہوں نے عصاء کو زمین پر ڈال دیا تو اچانک وہ سانپ بن کر دوڑنا شروع کیا۔ اس سانپ کے بارے میں قرآن کریم میں تین قسم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں: اول "حیۃ" جو کہ اس آیت میں ہے، دوئم "جآنّ" جو کہ سورۂ قصص میں ہے: ﴿كَاَنَّهَا جَآنٌّ﴾ [القصص: ٣١] (گویا وہ لاٹھی سانپ ہے)۔

عربی لغت میں "جآنّ" چھوٹے اور پتلے سانپ کو کہتے ہیں۔ سورۃ الشعراء میں ہے: ﴿فَاِذَا هِیَ ثُعۡبَانٌ مُّبِیۡنٌ﴾ [الشعراء: ٣٢] (گویا وہ لاٹھی اژدہا ہے)۔ "ثعبان" کے معنی ہیں: بڑے سانپ اور اژدھا، جبکہ "حیّۃٌ" ہر چھوٹے بڑے موٹے پتلے ہر قسم کے سانپ کا نام ہے۔ شروع میں یہ سانپ بن کر چھوٹا رہا، پھر دوسرے وقفہ پر اژدھا بن گیا، یا یہ کہا جائے کہ شروع میں اژدھا رہا، مگر سرعت رفتار کے اعتبار سے جانّ اور حیۃ رہا۔ یا یہ مقصد ہو کہ حسب ضرورت اس کی جسامت میں تبدیلی آتی رہتی تھی، کبھی جان، کبھی ثعبان اور کبھی حیۃ کی صورت میں۔

﴿قَالَ خُذۡهَا وَلَا تَخَفۡ ٚ سَنُعِیۡدُهَا سِیۡرَتَهَا الۡاُوۡلٰی﴾ فرمایا: اس کو پکڑلو، اور ڈرو مت، ہم اسے پہلی حالت پر لوٹادیں گے۔ سورۂ نمل میں فرمایا: ﴿اِنِّیۡ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الۡمُرۡسَلُوۡنَ﴾ [النمل: ١٠] (میرے سامنے پیغبر ڈرا نہیں کرتے)۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے اس پر ہاتھ رکھا تو وہ لاٹھی ویسی ہی ہوگئی جیسی پہلے تھی۔ یہ ایک نشانی ہو گئی۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ:

﴿وَاضۡمُمۡ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخۡرُجۡ بَیۡضَآءَ مِنۡ غَیۡرِ سُوۡٓءٍ اٰیَةً اُخۡرٰی﴾ تم اپنے ہاتھ کو اپنی بغل میں ڈالو، ملالو، وہ بغیر عیب کے سفید روشن نکلے گا، یہ سفیدی کسی بیماری اور برص کی وجہ سے نہیں ہوگی، بلکہ بلب کی طرح چمکدار روشنی ہوگی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مخصوص معجزہ ہی شمار ہوگا، فرمایا:

﴿لِنُرِیَكَ مِنۡ اٰیٰتِنَا الۡكُبۡرٰی﴾ تاکہ ہم تمہیں اپنی بڑی آیات دکھائیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو بڑے بڑے معجزات دیئے گئے تھے ان میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ کا روشن ہونا سب سے بڑی نشانی تھی، اس کے بعد لاٹھی کا درجہ ہے، جب یہ دونوں نشانیاں دے کر اللہ تعالیٰ شانہ

نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے پاس بھیج دیا تو فرمایا:

﴿اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ فرعون کے پاس چلے جاؤ، بیشک اس نے سرکشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس کے بعد آئندہ دو رکوع تک یہ تمام ماجرا، اور ہر قسم کے پیش آمدہ حالات کا بیان ہوگا۔

فائدہ:

عصائے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق تین مراحل کا قرآن حکیم نے تذکرہ کیا: (۱) اللہ تعالیٰ کے حضور میں عصاء ڈالنے کا بیان، اس موقع پر لفظ حیۃ اور جانّ دونوں کا ذکر ہے، تطبیق گزر چکی، اور ثعبان کا تذکرہ نہیں۔ (۲) جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس آئے اور عصا کو ڈال دیا، اس موقع پر ثعبان کا تذکرہ ہے۔ (۳) جب جادوگروں کے مقابلہ میں عصاء ڈال دیا، وہاں صرف عصا کا نام ہے، حیۃ، جانّ اور ثعبان تینوں میں سے کسی کا نام مذکور نہیں، ان باتوں میں اہل علم کو غور وفکر کی دعوت ہے۔ واللہ اعلم

قَالَ رَبِّ اشۡرَحۡ لِىۡ صَدۡرِىۙ ﴿۲۵﴾ وَيَسِّرۡ لِىۡۤ اَمۡرِىۙ ﴿۲۶﴾ وَاحۡلُلۡ عُقۡدَةً مِّنۡ لِّسَانِىۙ ﴿۲۷﴾ يَفۡقَهُوۡا قَوۡلِىۙ ﴿۲۸﴾ وَاجۡعَلۡ لِّىۡ وَزِيۡرًا مِّنۡ اَهۡلِىۙ ﴿۲۹﴾ هٰرُوۡنَ اَخِىۙ ﴿۳۰﴾ اشۡدُدۡ بِهٖۤ اَزۡرِىۙ ﴿۳۱﴾ وَاَشۡرِكۡهُ فِىۡۤ اَمۡرِىۙ ﴿۳۲﴾ كَىۡ نُسَبِّحَكَ كَثِيۡرًاۙ ﴿۳۳﴾ وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًاؕ ﴿۳۴﴾ اِنَّكَ كُنۡتَ بِنَا بَصِيۡرًا ﴿۳۵﴾

ترجمہ: موسیٰ نے عرض کیا کہ اے میرے ربّ! میرا سینہ کھول دیجئے ﴿۲۵﴾ اور میرے لئے کام کو آسان فرمایئے ﴿۲۶﴾ اور میری زبان کی گرہ کھول دیجئے ﴿۲۷﴾ تاکہ وہ لوگ میری بات کو سمجھیں ﴿۲۸﴾ اور میرے لئے میرے خاندان میں سے ایک وزیر بنادیجئے ﴿۲۹﴾ یعنی میرے بھائی ہارون کو ﴿۳۰﴾ ان کے ذریعہ میری قوت کو مضبوط کردیجئے ﴿۳۱﴾ اور انہیں میرے کام میں شریک کردیجئے ﴿۳۲﴾ تاکہ ہم کثرت سے آپ (عزوجل تعالیٰ) کی پاکی بیان کریں ﴿۳۳﴾ اور کثرت سے آپ (عزوجل تعالیٰ) کا ذکر کریں ﴿۳۴﴾ بلاشبہ آپ (عزوجل تعالیٰ) ہمیں دیکھنے والے ہیں ﴿۳۵﴾

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب کلامِ الٰہی اور نبوت کا شرف حاصل ہوا، اور عظیم مرتبہ رسالت ونبوت سے نوازے گئے، تو ان پر روزِ روشن کی طرح واضح ہوا کہ نبوت کا منصب جتنا بھاری ہے، اسی طرح اس کے حقوق کی

ادائیگی بھی کہیں اس سے بھی زیادہ بھاری اور مشکل ہے، اس لئے انہوں نے اپنی طاقت وہمت سے دست بردار ہوکر حق تعالیٰ سبحانہ سے پانچ سوالات کئے، وہ اچھی طرح جان گئے، کیونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام جیسے عظیم پیغمبر کے صحبت یافتہ اور ہمنشیں رہ چکے تھے، وہ جانتے تھے کہ یہ کام بغیر تائید ونصرت الٰہی کے مکمل نہیں ہوسکتا، اس کے لئے بڑے دل گردوں کی ضرورت ہے، تب انہوں نے حق تعالیٰ سے مطالبات شروع کئے جوکہ پانچ ہیں:

پہلی دعاء:﴿رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ﴾ اے میرے ربّ! میرا سینہ کھول دے، اس میں ایسی وسعت وکشادگی پیدا فرمادے جوعلوم نبوت کا متحمل ہوسکے، اور ممکنہ تکالیف اور لوگوں کی ایذارسانیوں کو برداشت کرنے اور سہنے کی ہمت، قوت اس میں ودیعت رکھ دے۔

اسی شرح صدر کو اللہ تعالیٰ نے بن مانگے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطا فرما کر ارشاد فرمایا: ﴿اَلَمْ نَشْرَحْ لَكَ صَدْرَكَ ① وَوَضَعْنَا عَنْكَ وِزْرَكَ ② الَّذِيْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ ③﴾[ ] (کیا ہم نے تمہاری خاطر تمہارا سینہ کھول نہیں دیا؟ اور ہم نے تم سے تمہارا وہ بوجھ اتا دیا ہے جس نے تمہاری کمر توڑ رکھی تھی)۔ یہ شرح صدر ایک عظیم نعمت ہے، جس کا مختصر ترجمہ یہ ہے: "انوار الٰہی کے ذریعہ دل کا کشادہ ہونا"۔ سورۃ الزمر میں ارشاد ہے: ﴿اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ......﴾ [الزمر:٢٢] (کیا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا ہو، اور وہ اپنے ربّ کی طرف سے نور پر ہو......)۔

دوسری دعا:﴿وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ﴾ میرا کام میرے لئے آسان کردے۔ یہ فہم وفراست بھی نبوت کا ہی حصہ ہے، اور اسی کا ثمرہ ہے کہ کسی کام کا مشکل یا آسان ہونا بھی ظاہری تدبیروں کے تابع نہیں، یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے عطیہ ہوتا ہے، وہ اگر چاہتے ہیں تو کسی کے لئے مشکل سے مشکل بھاری سے بھاری کام آسان کردیتے ہیں، اور جب چاہتے ہیں تو کسی کے لئے آسان سے کام نہایت مشکل بنادیتے ہیں، اسی لئے حدیث میں مسلمانوں کو اس دعا کی تلقین کی گئی ہے کہ اپنے کاموں کے لئے صبح وشام اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کیا کرو، وہ یہ ہے: اَللّٰهُمَّ الْطُف بِنَافِي تَيْسِيْرِ كُلِّ عَسِيْرٍ فَاِنَّ تَيْسِيْرَ كُلِّ عَسِيْرٍ عَلَيْكَ يَسِيْرٌ۔ یا اللہ شانہ! ہم پر مہربانی فرما کر ہمارے ہر مشکل کام کو ہمارے لئے آسان کر، کیونکہ ہر مشکل کام کو آسان کردینا تیرے لئے آسان ہے، اور ہر چیز آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔

تیسری دعا: ﴿وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ㉗ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ㉘﴾ یعنی کھول دے میری زبان کی بندش تاکہ لوگ میری بات سمجھ جائیں۔ زبان کی یہ بندش پیدائشی طور پر ہوئی اور بول چال میں قادر الکلامی اور فصاحت کی

کی محسوس ہوتی تھی، جیسے اکثر لوگوں میں ہوتا ہے کہ سب کچھ جاننے کے باوجود فرفر بولنے پر قدرت نہیں رکھتے، اس دعا کے بعد یہ رکاوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

اس سلسلے میں اکثر مفسرین نے ایک واقعہ کا سہارا لیا ہے کہ طشت میں جواہرات اور انگارے رکھ کر فرعون نے دو یا ڈھائی سالہ عمر میں آپ علیہ السلام کا امتحان لیا، یہ واقعہ کسی حدیث سے ثابت نہیں، منگھرت اسرائیلی روایت میں سے ہے، جسے نظر انداز کیا جاتا ہے، کیونکہ جب بچہ انگارا ہاتھ میں لیتا ہے تو اسے چھوڑ کر پھینک دیتا ہے، منہ تک اٹھانے کی کبھی ہمت نہیں کرتا، اگر کسی کو شک ہو تو تجربہ کر لے، آج ہی معلوم ہو جائے گا۔

چوتھی دعا: ﴿وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾﴾ یعنی میرے ہی خاندان میں سے میرے لئے ایک وزیر بنا دے، یعنی میرے بھائی ہارون کو، چونکہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے تیس سال فرعون کے قرب دجوار میں گزرے، انہیں فرعون اور فرعون کے کبر وغرور اور دعوائے اُلوہیت سب کچھ کا علم تھا، وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ جس گھر میں میری پرورش ہوئی وہ نہایت خطرناک ہے، جب تک میرا کوئی غمگسار ساتھی رفیق کار نہ ہوگا میں اکیلا اظہار مافی الضمیر نہیں کر سکوں گا، پس انہیں سوائے اپنے بڑے بھائی ہارون علیہ السلام کے دوسرا کوئی نظر نہیں آیا۔

بنی اسرائیلی سارے فرعون کے غلام بنے ہوئے تھے، صرف ایک ہی بھائی ہارون اس قید وبند سے آزاد تھے، اس لئے ان کی سفارش کی شاید پورے جہاں میں کسی بھائی نے اپنے بھائی کو اتنا عظیم فائدہ نہیں پہنچایا ہوگا جتنا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی ہارون علیہ السلام کو پہنچایا کہ انہیں نبوت کے منصب عالی تک پہنچایا۔

وزیر، وِزر سے مأخوذ ہے، اور وِزر کے معنی ہیں: بوجھ، چونکہ وزیر اپنے بادشاہ یا اپنے سربراہ کے بوجھ اٹھانے میں معاون ہوتا ہے اس لئے اسے وزیر یعنی بوجھ اٹھانے والے سے تعبیر کرتے ہیں۔

پانچویں دعا: ﴿وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ﴾ اور میرے معاملہ میں اسے میرا شریک بنا دے، جیسے اَزْرِیْ میں کہا تھا کہ اس کے ذریعہ میری کمر مضبوط فرما دے، یہ اَشْرِكْهُ اسی کی تفسیر ہے، کیونکہ مخلص وفادار شریک کے سبب آدمی کی قوت اور کمر مضبوط ہو جاتی ہے، خاص کر جب کہ شریک ومعاون نبی ہو، اور بھائی بھی۔

﴿كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾﴾ تا کہ ہم کثرت سے تیری پاکی بیان کریں، اور کثرت سے تیری یاد کریں۔ ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کا ذکر وتسبیح بنسبت ایک آدمی کے زیادہ ہوتا ہے، پھر اجتماعی عبادت کے فوائد بنسبت انفرادی کے بہت زیادہ ہوتے ہیں، جس طرح تنہا نماز کا ثواب ایک ہے اور یہی ایک نماز کا ثواب

جماعت کے ساتھ پچیس یا ستائیس ہے۔

﴿اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا﴾ بیشک تو ہم سے خوب واقف ہے تو تمام حالات واقعات وغیرہ کو دیکھتا بھی ہے جانتا بھی ہے، اور یہ بھی آپ (عزوجل تعالیٰ) کو معلوم ہے کہ بھائی کی شراکت میرے لئے کتنا مفید اور کتنا ضروری ہے، اگر میں بولوں گا تو وہ میری تصدیق کرے گا۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰىۤ ﴿۳۷﴾ اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا
يُوْحٰىۤ ﴿۳۸﴾ اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ
وَعَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾ اِذْ تَمْشِيْۤ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ
اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ ؕ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰۤى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ؕ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ
مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا ۟ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْۤ اَهْلِ مَدْيَنَ ۙ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿۴۰﴾

ترجمہ: فرمایا: اے موسیٰ! تمہاری درخواست منظور کر لی گئی ﴿۳۶﴾ اور اے موسیٰ! ہم نے تم پر ایک مرتبہ اور بھی احسان کیا ﴿۳۷﴾ جبکہ ہم نے تمہاری والدہ کے دل میں وہ بات ڈالی جو انہیں بتائی جا رہی تھی ﴿۳۸﴾ وہ یہ کہ تم اسے ایک صندوق میں رکھ دو، پھر صندوق سمندر میں ڈال دو، پھر سمندر اسے کنارے پر ڈال دے گا، اس وقت اسے وہ شخص پکڑ لے گا جو میرا بھی دشمن ہے، اور اس کا بھی اور میں نے تم پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی، اور تاکہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ ﴿۳۹﴾ تمہاری بہن چلتی ہوئی آئی، پھر وہ کہنے لگی: کیا میں تمہیں ایسا خاندان نہ بتا دوں جو اس کی پرورش کا ذمہ دار ہو جائے؟ پھر ہم نے تمہیں تمہاری والدہ کی طرف لوٹا دیا تاکہ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اور وہ غمگین نہ ہو، اور تم نے ایک جان کو قتل کر دیا تھا، پھر ہم نے تمہیں غم سے نجات دی، اور ہم نے تمہیں فتنوں میں ڈالا، پھر تم اہل مدین میں کئی سال رہے، پھر تم اے موسیٰ! ایک خاص وقت پر چلے آئے ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ جل شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کی پانچوں درخواستوں کو منظور فرما کر بروقت ان کو مطمئن فرمایا، اور اس کے ساتھ ربّ العزّت سبحانہ نے ان پر جو احسانات کا سلسلہ مختلف اوقات میں جاری فرمایا تھا ان کا بھی ذکر فرمایا۔

﴿وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰى﴾ اور ہم نے آپ پر دوسری مرتبہ بھی احسان فرمایا۔ یہ احسان بچپن میں ہوا، جو یہ ہے:

﴿اِذْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰۤى اُمِّكَ مَا يُوْحٰى﴾ جب ہم نے وحی کی تمہاری والدہ کی طرف جو کچھ بھی وحی کی گئی۔ یہ وحی الہامی بھی ہو سکتی ہے، اور خواب کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے، اور براہ راست فرشتے کے ذریعہ بھی ہو سکتی ہے، جیسا کہ حضرت مریم علیہا السلام کو فرشتہ نے بشکل انسان آکر بشارت سنائی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے موقع پر دوبارہ فرشتہ تشریف لائے اور انہیں تسلی دی۔ بہر حال! یہ وحی شرعی نہیں جو کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ مخصوص ہے، بلکہ یہ وحی لغوی ہے، جیسے سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ﴾ [النحل:٦٨] (اور تمہارے پروردگار نے شہد کی مکھی کے دل میں یہ بات ڈال دی)۔ تکوینی طور اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کی جو راہنمائی فرمائی اسی کو وحی سے تعبیر فرمایا۔

﴿اَنِ اقْذِفِيْهِ فِى التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِى الْيَمِّ﴾ کہ اسے صندوق میں بند کر دو، اور صندوق کو دریا میں ڈال دو۔ ﴿فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ﴾ دریا اسے ساحل پر پھینک دے گا۔ ﴿يَاْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّىْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ﴾ پھر اس تابوت کو میرا اور اس بچے کا دشمن (فرعون) پکڑے گا، اور اس طرح تدبیر سے اس کی جان بچ جائے گی، اور قدرت الٰہی کی کرشمہ سازیوں کا مظاہرہ ہوگا۔

مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ فرعون نے ایک خود ساختہ ظالمانہ اصول یہ بنا رکھا تھا کہ ایک سال پیدا ہونے والے اسرائیلی بچوں کو قتل کرا دیتا، اور دوسرے سال پیدا ہونے والے بچوں کو زندہ رہنے دیتا، تاکہ اس کی قوم کے لئے بیک لخت خدمتگاروں کا خاتمہ نہ ہو، اور اس کی یہ کارگزاری اس بناء پر تھی کہ کاہنوں اور نجومیوں نے اس کو باور کرایا تھا کہ عبرانیوں میں ایک ایسا بچہ پیدا ہونے والا ہے جو تیری سلطنت کے زوال کا باعث بنے گا، چنانچہ اس نے اسرائیلی نوزائیدہ بچوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ پوری تفصیل سورۂ بقرہ اور دیگر کئی جگہوں پر گزر چکی ہے۔

﴿وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّىْ﴾ اور میں نے اپنی طرف سے تم پر محبت ڈال دی، جو بھی دیکھتا اس سے محبت کرتا، لطف یہ کہ دشمن کے گھر میں جب پہنچے تو بڑی شان وشوکت سے اس کی پزیرائی ہوئی، اور فرعون کی بیوی حضرت آسیہؓ نے اس سلسلے میں اتنی دلچسپی اور خوشی کا مظاہرہ کیا جس کی حد نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے ان کے مقدر میں جو ایمان اور برتری لکھی تھی ایک حد تک اس نے ان کا حق ادا کیا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَلِتُصۡنَعَ عَلٰى عَيۡنِىۡ﴾ تا کہ میرے حضور (آنکھوں کے سامنے) تیری پرورش ہو، اس کے لئے ذریعہ یہ بنایا: ﴿اِذۡ تَمۡشِىۡۤ اُخۡتُكَ فَتَقُوۡلُ﴾ جب تمہاری والدہ نے صندوق کو دریا میں ڈال دیا تو تمہاری بہن دریا کے کنارے صندوق کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی تا کہ دیکھ سکے کہ صندوق کہاں پہنچے گا، اور لوگوں کا صندوق کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بہن کا نام کلثوم یا مریم تھا، اور اس وقت ان کی عمر پندرہ برس تھی، وہ بڑی ہوشیاری سے صندوق کے ساتھ جارہی تھیں تا کہ کسی کو کوئی شبہ نہ ہو۔

سورۂ قصص میں اس واقعہ کے ہر پہلو کا تفصیلاً ذکروبیان ہے۔ جب صندوق فرعون کے محل میں پہنچ گیا تو بچے کو دودھ پلانے کے لئے بہت سی عورتوں کی قطار لگ گئی، لیکن انتظام کچھ اس طرح تھا کہ: ﴿وَحَرَّمۡنَا عَلَيۡهِ الۡمَرَاضِعَ﴾ [القصص ١٢] (ہم نے ان پر دائیوں کا دودھ حرام کردیا)۔ عورتوں نے اپنے مفاد کے لئے ہر چند کوشش کی مگر بچے نے کسی کو منہ تک نہ لگایا، یہاں تک کہ عورتوں کا پورا مجمع افسوس اور حسرتوں کے ساتھ مایوس ہوگیا، جب یہ منظر دیکھ کر وہ لڑکی آگے بڑھی تو کہنے لگی:

﴿فَتَقُوۡلُ هَلۡ اَدُلُّكُمۡ عَلٰى مَنۡ يَّكۡفُلُهٗ﴾ کیا میں تمہیں وہ آدمی بتاؤں جو اس بچے کی کفالت کرسکے؟ بعضوں نے کہا کہ لڑکی نے واضح طور کہا کہ میں عبرانیوں میں سے ہوں، کسی عورت کو لاؤں شاید بچہ اس کا دودھ پی لے۔ یہ بات اس نے فرعون کی بیوی حضرت آسیہؓ کو خوش کرنے کی خاطر کہہ دی، کیونکہ حضرت آسیہؓ کا تعلق عبرانی خاندان سے تھا، وہ قبطی خاندان کی عورت نہیں تھیں، فرعون نے ان کے بے مثال حسن و جمال کو دیکھ کر انہیں اپنی منکوحہ بنالی۔ واللہ اعلم

جب فرعون کے خاندان نے رضامندی ظاہر کی تو لڑکی جلدی میں اپنی والدہ لے آئی، انہوں نے آتے ہی بچے کو چھاتی سے لگایا تو بچے نے دودھ پینا شروع کیا، گھروالوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ بچہ نے عبرانی عورت کا دودھ قبول کرلیا ہے، پھر مشورہ یہی طے ہوا کہ بچے کو اپنے گھر لے جاکر وہاں اس کی دیکھ بال اور تربیت کرو، اور کبھی یہاں حضرت آسیہؓ کے پاس لایا کرو تا کہ وہ اس کو دیکھ کر اطمینان حاصل کرے، قدرت کا وعدہ پورا ہوا: ﴿اِنَّا رَآدُّوۡهُ اِلَيۡكِ وَجَاعِلُوۡهُ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ﴾ [القصص ٧] (ہم ان کو تیری طرف لوٹا دیں گے، اور ان کو رسولوں میں سے بنادیں گے)۔ ماں کو بچہ ملا، سکون ملا، شرف وعزّت ملی، مالی امداد تنخواہ کے ساتھ بچے کے اخراجات کے لئے دراہم ودنانیر بھی ملے، اسی کو فرمایا:

﴿فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَیْ تَقَرَّ عَیْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ﴾ ہم نے تجھے تیری والدہ کے پاس لوٹا دیا تا کہ تمہاری والدہ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں، اور وہ تیری جدائی کے غم میں پریشان نہ رہے۔ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم سے ہوا۔

﴿وَقَتَلْتَ نَفْسًا﴾ اور اس بات کو بھی یاد رکھو کہ تم نے فرعونی قبطی کو مکا مار کر قتل کیا۔ یہ اس طرح پیش آیا کہ ایک عبرانی کے ساتھ ایک قبطی جھگڑ رہا تھا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مظلوم عبرانی کو چھڑانے کے لئے قبطی کو ایک مکا مارا جس سے وہ ہلاک ہو گیا، حالانکہ آپ علیہ السلام کا ارادہ قتل کا نہیں تھا۔ دوسرے روز جب یہی عبرانی ایک دوسرے قبطی کے ساتھ جھگڑ رہا تھا تو موسیٰ علیہ السلام اسے تنبیہ کرنے کی خاطر آگے بڑھے تو اس کم بخت نے سمجھا کہ شاید آج مجھے مار ڈالے گا، اس نے چیخ کر کل والا راز فاش کر لیا، جس سے سب لوگوں کو پتہ چلا کہ قبطی کو موسیٰ علیہ السلام نے قتل کیا ہے، تب فرعونیوں نے فیصلہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس کے بدلے قتل کیا جائے گا، اس اثناء میں فرعونیوں میں سے ایک مسلمان جس نے اپنا ایمان چھپائے رکھا تھا موسیٰ علیہ السلام کو اطلاع کر کے وہاں سے نکلنے اور مدین کی طرف جانے کا مشورہ دیا، جس پر عمل کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام مصر سے نکلے، اور کئی دنوں کے بعد مدین پہنچے۔ تفصیل سورۂ قصص میں آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ

﴿فَنَجَّیْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ﴾ ہم نے تمہیں غم سے نجات دی، تم مصر سے چلے گئے اور مدین میں بڑے اعزاز کے ساتھ امن وامان کے ساتھ رہے۔

﴿وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا﴾ اور ہم نے تمہیں مختلف آزمائشوں میں ڈالا، یعنی پیدائش کے وقت قتل ہونے سے بچا لیا، اپنی والدہ کے پاس لوٹا دیا، اسی کا دودھ تمہیں مہیا کیا، پھر قتل خطا کی آزمائش میں ڈالا، پھر مدین کے سفر کی مشقت اور تکلیفات میں ڈالا، ان تمام آزمائشوں میں آپ کی مدد کی، اور آپ کو سرخرو فرمایا، یہ سب اللہ تعالیٰ کے خصوصی انعامات ہیں۔

﴿فَلَبِثْتَ سِنِیْنَ فِیْٓ اَهْلِ مَدْیَنَ﴾ پھر آپ کئی سال اہل مدین کے پاس رہے، حضرت شعیب علیہ السلام کی صحبت میں رہے، پھر دس سال ان کے مال مویشیوں کی گلہ بانی کی، اور ان کی بیٹی سے تمہارا عقد نکاح ہوا، جب وہاں سے چلے تو وادی طُویٰ میں ربّ العزّت سے ہم کلامی کا شرف پایا، منصب نبوت سے نوازے گئے۔

﴿ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ یّٰمُوْسٰى﴾ پھر اے موسیٰ! ایک اندازے کے مطابق آپ واپس آئے۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ
طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾ قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ
يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا
بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾ اِنَّا
قَدْ اُوْحِيَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿٤٨﴾

ترجمہ: اور میں نے تمہیں اپنے لئے منتخب کرلیا﴿٤١﴾ تم اور تمہارا بھائی میری نشانیاں لے کر جاؤ اور دونوں میری یاد میں سستی نہ کرنا﴿٤٢﴾ تم دونوں فرعون کی طرف چلے جاؤ، بیشک اس نے سرکشی اختیار کی ہوئی ہے﴿٤٣﴾ پھر تم دونوں اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا، ہوسکتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے یا ڈر جائے﴿٤٤﴾ دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے ربّ! بلاشبہ ہمیں اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے، یا سرکشی کرنے پر اتر آئے﴿٤٥﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں مت ڈرو، بلاشبہ میں تمہارے ساتھ ہوں، سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں﴿٤٦﴾ سو تم اس کے پاس پہنچ جاؤ، اور اس سے کہو کہ بلاشبہ ہم تیرے ربّ کے فرستادے ہیں، سو تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے، اور تو انہیں تکلیفیں نہ دے، ہم تیرے پاس تیرے ربّ کی طرف سے نشانی لے کر آئے ہیں، اور سلام ہو اس شخص پر جو ہدایت کا اتباع کرے﴿٤٧﴾ بلاشبہ ہماری طرف وحی کی گئی ہے کہ اس پر عذاب ہے جو جھٹلائے اور روگردانی کرے﴿٤٨﴾

معارف ومنازل

پہلے ارشاد ہوا تھا: ﴿وَاَنَا اخْتَرْتُكَ﴾ اے موسیٰ! میں نے تمہیں چن لیا، اب دوبارہ ارشاد ہے:

﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾ کہ میں نے تمہیں اپنے لئے منتخب کرلیا۔ سبحان اللہ! یہ بہت بڑا اعزاز اور شرف ہے کہ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں اس وقت چھ لاکھ سے کچھ زائد لوگ تھے، ان سب میں نبوت ورسالت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا چناؤ عظیم نعمت ہے، تو اسی نعمت کی یاددہانی ہورہی کہ: ﴿وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ﴾۔

واضح ہو کہ اللہ تعالیٰ شانہ کا انتخاب فرمالینا اتنی بڑی نعمت ہے کہ اس کے مقابلہ میں دنیا کی بڑی سے بڑی نعمت جیسے بادشاہت وسلطنت کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتی۔ مزید ارشاد فرمایا کہ تم دونوں بھائی میری نشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ، اور میرے ذکر میں کسی طرح سستی اور کمی نہ کر۔ نافرعون سرکش بنا ہوا ہے، جاؤ اسے سمجھاؤ، اور

میرے عذاب سے اسے ڈراؤ، ہوسکتا ہے نصیحت قبول کرے یا ڈرے۔

اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ فرعون اپنے کفر وغرور سے باز نہیں آئے گا، اور کبھی ہدایت قبول نہیں کرے گا، مگر سنت اللہ یہی ہے کہ ہر کافر ونافرماں پر اتمامِ حجت قائم کرنے کی خاطر انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے نائبین کے ذریعہ حق بات کی تبلیغ ہو، اور اسے ہر ممکن ہر طرح سے دعوت دے کر سمجھایا جائے، تو اسی خاطر فرمایا کہ نہایت نرم لہجہ میں نرم گفتاری اور صبر وعزیمت کے ساتھ اسے سمجھاؤ، شاید تمہاری نرمی اور حکمت عملی سے متاثر ہو۔

دونوں بھائیوں نے عرض کیا کہ ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ اپنے غرور وسرکشی کی وجہ سے ہمارے اوپر زیادتی نہ کرے، اس پر حق تعالیٰ شانہ نے انہیں اپنی معیت کا وعدہ اور اس کے ساتھ تسلی دے کر فرمایا: میں تمہارے ساتھ ہوں، سب کچھ سنتا اور دیکھتا ہوں، وہ ہرگز تم پر غلبہ پانے والا نہیں، اور تمہیں کسی قسم کا نقصان دینا اس کے اختیار میں نہیں، تم انہیں نشانیاں دکھلا کر لاجواب کردو، اور اس سے یہ کہو کہ ہماری قوم بنی اسرائیل پر مزید ظلم وزیادتی نہ کرو، اور انہیں ہمارے حوالہ کر کے آزاد کرلو تاکہ ہم انہیں ان کے آباء واجداد کی سرزمین فلسطین لے کر وہاں بسائیں، اور ہر طرح (دین ودنیا دونوں کے اعتبار) سے انہیں تحفظ دیں۔ اس سلسلے میں ہمارے ربّ کا پیغام ہے کہ جو کوئی ہماری تصدیق کرے گا اور ہدایت وحق کا اتباع کرے گا وہ ہر قسم کی سلامتی کا حقدار بنے گا۔

البتہ جو لوگ تکذیب کر کے سرکشی اختیار کریں گے تو وہ عذاب الیم کا مستحق بنیں گے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی شاہ روم (ہرقل) کے نام جو نامۂ مبارک بھیجا تھا اس میں بھی یہی مضمون لکھا تھا: سَلَامٌ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْھُدٰی اَسْلِمْ تَسْلَمْ فَاِنْ تَوَلَّیْتَ فَاِنَّمَا عَلَیْکَ اِثْمُ الْیَرِیْسِیِّیْنَ۔ جو لوگ ہدایت کا اتباع کریں ان پر سلامتی ہو، تو اسلام قبول کر، اور سلامت رہو، اگر تو نے روگردانی کی تو تمہاری قوم کے کفر کا وبال بھی تمہارے اوپر ہوگا۔

فائدہ:

آیت کریمہ سے صراحۃً واشارۃً معلوم ہوا کہ دین کی تبلیغ فرض ہے، اور مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ ذکر الٰہی سے غفلت نہ کرے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ صبر واستقامت پر کاربند رہے، اور نرم گفتاری اور نہایت حکمت عملی پر عامل رہے، درشتی اور سخت لہجہ میں ہرگز تبلیغ نہ کرے، اور یہ بھی لازمی ہے کہ ترغیب وترہیب دونوں کی پابندی کرے، اور اللہ تعالیٰ کے اعتماد وبھروسہ پر عمل کرے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝۴۹ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝۵۰ قَالَ فَمَا
بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝۵۱ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝۵۲ الَّذِيْ
جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا
بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ۝۵۳ كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ۝۵۴
مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ۝۵۵

ترجمہ: فرعون نے کہا کہ تم دونوں کا ربّ کون ہے؟ اے موسیٰ! موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ہمارا ربّ وہی ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا فرمائی پھر راہ بتائی ۝۴۹ فرعون نے کہا کہ پرانی جماعتوں کا کیا حال ہے؟ ۝۵۰ موسیٰ نے جواب دیا: ان کا علم میرے ربّ کے پاس کتاب میں ہے، میرا ربّ نہ غلطی کرتا ہے، اور نہ بھولتا ہے ۝۵۱ جس نے تمہارے لئے زمین کو فرش بنا دیا، اور اس میں تمہارے لئے راستے بنا لئے، اور اس نے آسمان سے پانی اتارا، پھر ہم نے اس کے ذریعہ مختلف قسم کے نباتات پیدا کئے ۝۵۲ کھاؤ اور مویشیوں کو چراؤ، بلا شبہ اس میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں ۝۵۳ اسی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا، اور اسی میں تمہیں لوٹائیں گے اور اسی سے تمہیں دوسری بار نکالیں گے ۝۵۵

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام ربّ العزّت سبحانہ سے ہدایات لے کر وادی طویٰ سے مصر پہنچے، حضرت ہارون علیہ السلام کو فرشتہ پہلے سے ان کی نبوت کی بشارت دے چکے تھے، چنانچہ دونوں بھائی بغیر کسی تاخیر کے عصا و ید بیضاء کی نشانی کے ساتھ فرعون کے پاس پہنچے، نہایت نرمی کے ساتھ اسے توحید کی دعوت دی اور سمجھانے کی کوشش کی، اور اسے ایمان باللہ کی حقیقت اور عجیب وغریب فوائد سمجھا دیئے، اور یوں کہا کہ ہم دونوں بھائی تیرے پروردگار کی طرف سے نشانیاں لے کر آئے ہیں، تو فرعون نے جواب میں کہا:

﴿قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى﴾ اے موسیٰ! بھلا یہ تو بتلاؤ کہ تم دونوں کا ربّ کون ہے؟ ذرا اس ربّ کا تعارف تو کراؤ جس نے تمہیں رسول بنا کر بھیجا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ فرعون دہریہ منکرِ خدا تھا، اسی لئے پوچھا کہ تمہارا ربّ کون ہے؟ دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ فرعون خدا کو مانتا تھا، بلکہ محض گمراہی اور ہٹ دھرمی کی بنیاد پر موسیٰ علیہ السلام کو پریشان کرنے کی غرض سے اس قسم کے سوال کرتا رہتا تھا، بلکہ وہ خود اُلوہیت کا مدّعی بھی تھا،

چنانچہ کہا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الْمَلَاُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرِیْ﴾ [القصص:٣٨] (اے درباروالو! میں تو اپنے سوا تمہارے کسی اور خدا کونہیں جانتا)۔اسی طرح:﴿فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى﴾ [النازعات:٢٤] (میں تمہارا سب سے بڑا خدا ہوں)۔اور اس نے موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دے کر کہا: ﴿قَالَ لَىِٕنِ اتَّخَذْتَ اِلٰهًا غَیْرِیْ لَاَجْعَلَنَّكَ مِنَ الْمَسْجُوْنِیْنَ﴾ [الشعراء:٢٩] (فرعون نے کہا: اگر تم نے میرے سوا کوئی اور معبود بنالیا تو میں ضرور تمہیں قید کروں گا)۔فرعون چونکہ ربوبیت کا مدّعی تھا، اور اپنے آپ کو بڑا ربّ اور بڑا معبود سمجھتا تھا، اس لئے سوال کیا کہ تمہارا ربّ کون ہے؟ دوسرے مقام پر مذکور ہے: ﴿قَالَ فِرْعَوْنُ وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الشعراء:٢٣] (فرعون نے کہا: ربّ العالمین کون ہے؟)۔

جب حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام نے کہا:﴿اِنَّا رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ [الشعراء:١٦] (ہم ربّ العٰلمین کے رسول ہیں) تو فرعون نے جحود وعناد اور ہٹ دھرمی کی راہ سے بولا کہ (العیاذ باللہ) ربّ العٰلمین کیا چیز ہوتا ہے؟ میری موجودگی میں کسی اور ربّ کا نام لینا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیونکہ وہ اپنے کو بڑا ربّ گمان کرتا تھا، اس کی تفصیل سورۃ الشعراء میں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نرمی کے ساتھ بڑے حکیمانہ انداز میں جواب دے کر فرمایا:

﴿قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْۤ اَعْطٰى كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى﴾ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی حیثیت کے مطابق شکل وصورت، قدوقامت، مزاج وطبیعت عطا فرمائی ہے، یعنی ہمارا ربّ وہ ہے جس کی صفتِ خالقیت ہر چیز میں نظر آتی ہے، پہلے اس نے ہر چیز کو عدم سے نکال کر وجود بخشا، اور اس کے بعد اس کو مناسب شکل وصورت اور طبیعت وخاصیت عطا فرمائی۔

﴿ثُمَّ هَدٰى﴾ پھر اس کی راہنمائی بھی فرمائی، ہر مخلوق کو اس کی معیشت اور زندگی گزارنے کا طریقہ اور رہن وسہن کا راستہ بتلایا، آپ صرف انسان کو دیکھتے ہو جو تعلیم وادب اور زندگی کے طور وطریقے پر اپنے بڑوں سے، ماں باپ سے، استادوں سے سیکھتا ہے، ذرا صحرا اور جنگل کا رخ کر کے دیکھو، ہزاروں کیڑے مکوڑے، حشرات الارض اور جانوروں کو دیکھو، پھر ان کی زندگی، خورد ونوش، بود وباش، رہن سہن اور نسل وافزائش پر غور کرو، تو هَدٰى کا مطلب معلوم ہوجائے گا۔

رہا انسان، وہ تو بہت بڑا کارآمد موجود ومنتظم مخلوق ہے، وہ تو عالم کبیر کا نمونہ وبدل اور عالم صغیر ہے، اس کی

عقل ولیاقت، صنعت وایجاد اور انتظامی امور اتنے زیادہ اور نہایت حیران کن ہیں کہ وہ بسا اوقات نادانی اور حماقت پر اتر کر اُلوہیت کا مدّعی بن جاتا ہے، صرف فرعون نہیں، دیگر بہت سے ناعاقبت اندیش لوگوں نے بھی اسی قسم کی غلطیاں کر کے صفحۂ ہستی سے مٹ چکے ہیں۔

آج کا امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے خیالات فرعون سے کہیں زیادہ گمراہ کن ہیں، آج فرعون جیسے حکمران سے ہزار درجہ کمتر انسانوں، پروفیسروں، ڈاکٹروں اور افسروں کا یہ عالم ہے کہ نہ خدا کے قائل ہیں، اور نہ آخرت کے، وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زیادہ سے زیادہ ایک سیاسی لیڈر کا درجہ دیتے ہیں کہ قرآن کے احکام موجودہ زمانہ کے لوگوں کے لئے (العیاذ باللہ) ہرگز قابل عمل نہیں، پس جو شخص قرآنی تعلیمات پر عمل کرتا ہو تو یہ بدنصیب لوگ اسے "انتہاء پسند" کہتے ہوئے اس سے نفرت کرتے ہیں، یا اسے دہشت گرد کا نام دے کر اپنے غیر اسلامی معاشرہ کا دشمن سمجھتے ہیں، جیسا کہ ان کے پیشرو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دہشت گرد اور فسادی کہا تھا، جسے قرآن کریم نے یوں نقل فرمایا: ﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ﴾ [غافر: ۲۶] (اور فرعون نے کہا کہ مجھے چھوڑو کہ موسیٰ کو قتل کر دوں، اور وہ اپنے ربّ کو پکار لے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ تمہارا دین بدل ڈالے گا، یا زمین میں فساد برپا کر دے گا)۔

فرعون نے اپنی قوم کو بیوقوف بنا کر یہ باور کرایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو زندہ چھوڑنا ہمارے لئے سخت نقصان دہ ہے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اپنے وعظ وتبلیغ سے تمہارے طور وطریقے مٹا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنائے، جس سے یہ جہان تباہ ہو جائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ کی اُلوہیت پر گواہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں وہ وہ عالیشان بیش قیمت اعضاء جوارح پیدا فرمائے ہیں جن کی حقیقت کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

سینکڑوں سالوں سے دنیا کے سائنسدان انسان کے دل اور آنکھوں پر ریسرچ وتحقیقات کر رہے ہیں، مگر ابھی تک خاطر خواہ نتائج تک انہیں رسائی نہیں ہوئی، وہ کہتے ہیں کہ انسان کی آنکھوں میں چوبیس کروڑ بلب (برقی بجلی) کی طاقت موجود ہے، پھر وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایک انسانی آنکھ کی روشنی اور برقی طاقت کا جو نظام ہے وہ حیوانات کی آنکھوں کی روشنی سے بڑھ کر نہیں ہے۔ سبحان اللہ وبحمدہٖ ایک اعلیٰ مخلوق انسان کو جس نعمت سے نوازا وہ نعمت اپنی عام مخلوق (جانوروں) تک کو بھی عطا فرمایا، کبھی اگر آپ چوہے، بلی، کتے، پرندے، چرندے اور سانپ کی آنکھوں کو غور سے دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے جوابات سے فرعون نے لاجواب ہوکر موضوع سخن کو بدلتے ہوئے سوال کیا:

﴿قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى﴾ اے موسیٰ! ذرا بتلاؤ کہ پہلی قومیں جو تمہارے پروردگار پر کوئی یقین نہیں رکھتی تھیں ان کا کیا حال ہوا؟ کیا وہ سارے کے سارے بیوقوف تھے؟ جو تمہارے نظریے پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

﴿قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى﴾ کہا: ان کی خبر میرے ربّ کے پاس لکھی ہوئی ہے، میرا ربّ نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے، ابتداء آفرینش سے آج تک کائنات کا کوئی ذرہ ایسا نہیں جو میرے ربّ کے علم میں نہ ہو، اور لوح محفوظ میں لکھا ہوا نہ ہو، کیونکہ میرا ربّ ہر قسم کے عیب ونقصان سے منزہ اور پاک ہے، وہ نہ غلطی کرتا ہے اور نہ ہی بھولتا ہے۔ رہا میرا معاملہ، میں تو اس کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں، اور نبی کے لئے علم کلّی کا ہونا ضروری نہیں۔ ہاں جزوی طور پر اتنا جانتا ہوں کہ جن گزشتہ اقوام نے میرے پروردگار کا حکم نہیں مانا، وہ تباہ وبرباد ہوگئیں۔

﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا﴾ میرا ربّ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ بنادیا، جس پر تم سکون وآرام سے رہتے ہو، اور طرح طرح کی سہولتیں حاصل کرتے ہو۔

﴿وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا﴾ اور زمین پر سیر وسیاحت اور تمہارے چلنے پھرنے کے لئے مختلف راستے بنالئے، تاکہ تم زمین کے مختلف حصوں تک اپنے رزق وروزی اور معاش کے لئے آمد ورفت جاری رکھ سکو۔

﴿وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ اور اس نے آسمان سے پانی اتارا ہے۔ ﴿فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى﴾ اور ہم نے اس سے مختلف قسم کے پودوں سے طرح طرح کی غذائیں انسانوں اور جانوروں کے لئے نکالیں، یعنی اناج، پھل اور سبزیاں۔

﴿كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ﴾ اس کو خود کھاؤ، اور اپنے مال مویشی کو چراؤ۔ سورۂ عبس میں فرمایا: ﴿مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ﴾ [عبس: ٣٢] (یہ تمہارے فائدے کے لئے ہیں، اور تمہارے جانوروں کے فائدے کے لئے بھی ہیں)۔ زمین کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ایک ایسا مرکز اور پیداوار کا خزانہ بنایا جس سے تمہارے لئے اور تمہارے جانوروں کے لئے لاکھوں منافع پیدا فرمادیئے۔

﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى﴾ بیشک اس میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں، انسانی وجود اس کی شکل وصورت اور کمالات زمین کا گہوارہ ہونا، اور اس میں راستے بنانا، آسمان سے پانی اتارنا، پانی کے ذریعہ لاکھوں

نباتات کا پیدا کرنا، پھر تمام جانداروں کے لئے زندگی اور معاش کی فراہمی، یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ ہی نے پیدا فرمائیں۔

فرعون سے کہا جارہا ہے کہ یہ چیزیں تمہاری پیدائش سے بھی بہت پہلے اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمائیں، ان چیزوں کی تخلیق میں تمہارا ایک ذرہ بھی حصہ نہیں، تم دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہو، تمہارے ہاتھ میں جب کچھ بھی نہیں تو پھر کیسے اُلوہیت کا مدعی ہو؟ معلوم ہوا تمہارا شمار عقلمندوں میں نہیں۔ آخر میں فرمایا:

﴿مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ﴾ اسی زمین سے ہم نے تمہیں بھی پیدا کیا۔ ﴿وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى﴾ اور اسی میں تمہیں واپس لوٹائیں گے، اور پھر اسی میں سے تمہیں دوبارہ زندہ کر کے نکالیں گے، پھر حساب وکتاب کے لئے میدان محشر میں جمع کریں گے۔ سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ كِفَاتًا۝ اَحۡيَآءً وَّاَمۡوَاتًا۝﴾ (کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کے لئے جمع کرنے والی نہیں بنائی؟) پھر جب قیامت قائم ہوجائے گی تو سارے اگلے پچھلے دوبارہ زندہ ہوکر اللہ تعالیٰ کے حضور میں جمع ہوجائیں گے۔

وَلَقَدۡ اَرَيۡنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى۝۵۶ قَالَ اَجِئۡتَنَا لِتُخۡرِجَنَا مِنۡ اَرۡضِنَا بِسِحۡرِكَ يٰمُوۡسٰى۝۵۷
فَلَنَاۡتِيَنَّكَ بِسِحۡرٍ مِّثۡلِهٖ فَاجۡعَلۡ بَيۡنَنَا وَبَيۡنَكَ مَوۡعِدًا لَّا نُخۡلِفُهٗ نَحۡنُ وَلَاۤ اَنۡتَ مَكَانًا سُوًى۝۵۸
قَالَ مَوۡعِدُكُمۡ يَوۡمُ الزِّيۡنَةِ وَاَنۡ يُّحۡشَرَ النَّاسُ ضُحًى۝۵۹ فَتَوَلّٰى فِرۡعَوۡنُ فَجَمَعَ كَيۡدَهٗ ثُمَّ اَتٰى۝۶۰
قَالَ لَهُمۡ مُّوۡسٰى وَيۡلَكُمۡ لَا تَفۡتَرُوۡا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسۡحِتَكُمۡ بِعَذَابٍ ۚ وَقَدۡ خَابَ مَنِ
افۡتَرٰى۝۶۱ فَتَنَازَعُوۡۤا اَمۡرَهُمۡ بَيۡنَهُمۡ وَاَسَرُّوا النَّجۡوٰى۝۶۲ قَالُوۡۤا اِنۡ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيۡدٰنِ اَنۡ
يُّخۡرِجٰكُمۡ مِّنۡ اَرۡضِكُمۡ بِسِحۡرِهِمَا وَيَذۡهَبَا بِطَرِيۡقَتِكُمُ الۡمُثۡلٰى۝۶۳ فَاَجۡمِعُوۡا كَيۡدَكُمۡ ثُمَّ ائۡتُوۡا
صَفًّا ۚ وَقَدۡ اَفۡلَحَ الۡيَوۡمَ مَنِ اسۡتَعۡلٰى۝۶۴

ترجمہ: اور البتہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھائیں، سو اس نے جھٹلایا اور انکار کیا۵۶ وہ کہنے لگا کہ اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادو کے ذریعہ ہماری سرزمین سے نکال دے؟۵۷ سو ہم بھی تیرے مقابلے میں اسی جیسا جادو لے آئیں گے، سو تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت مقرر کردے، نہ ہم اس

کی خلاف ورزی کریں گے، اور نہ تو، اس غرض کے لئے ایک ہموار میدان مقرر کردے۵۸ موسیٰ نے کہا کہ تم سے زینت
کے دن کا وعدہ ہے، اور یہ بات بھی ہے کہ لوگ ایسے وقت میں جمع ہوں جب دن چڑھ جائے۵۹ اس کے بعد فرعون
واپس ہوا، پھر اس نے اپنے مکر کا سامان جمع کیا، پھر وہ آ گیا۶۰ موسیٰ نے ان سے کہا: ہلاکت ہے تمہارے لئے، تم اللہ
پر جھوٹ وافتراء مت کرو، ورنہ وہ تمہیں ایسا عذاب دے گا کہ تمہیں بالکل ہی ختم کردے گا، اور جو جھوٹ باندھتا ہے وہ
ناکام ہی رہتا ہے۶۱ پھر انہوں نے اپنی اپنی رائے میں اختلاف کیا، اور چپکے چپکے مشورہ کرتے رہے۶۲ کہنے لگے کہ
بلاشبہ یہ دونوں جادوگر ہیں، دونوں چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے ذریعہ تم لوگوں کو تمہاری سرزمین سے نکال دیں، اور
تمہارے عمدہ طریقے کو ختم کردیں۶۳ لہٰذا اب تم سب اپنی تدبیر کا انتظام کرو، پھر صف بنا کر آ جاؤ، اور جو غالب ہو آج
وہی کامیاب ہوگا۶۴

معارف ومنازل

دعوتِ توحید کے بعد جب عصاء موسوی اور ید بیضاء کے کرشمے سامنے آ گئے تو ازلی بدبخت واویلا شروع کرکے کہنے لگے کہ یہ صاف جادو ہے، حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام نے جس متانت اور صاف گوئی سے اپنے بھیجنے والے پروردگار کا تعارف کیا، اور پھر اپنی بعثت کا جو حال بیان کیا، اور اللہ تعالیٰ کی عظیم علوی اور سفلی نعمتوں اور قدرتوں کا بیان کیا، پس فرعون جیسے سرکش اور اس کے مشیر جنہوں نے زندگی بھر نہ خدا کا پیغام سنا تھا، اور نہ اس کی نعمتوں کا کوئی تصور کیا تھا، وہ تو سیکڑوں سالوں سے اپنی اُلوہیت کا رٹ لگا کر پوری خلقت کو باور کرایا تھا کہ یہ سب کچھ میری اُلوہیت کا فیض ہے، اب جب بنیادی بات سامنے آ گئی تو اس کا دماغ فیل ہوگیا، اور پیغمبروں کو جادوگر کہا، اور معجزات کو جادو شمار کیا، اور الٹی الٹی باتیں کرنے لگا، اور ان معجزات سے اسے سخت بدحواسی لاحق ہوئی۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ عصاء موسوی جب بڑا سانپ اژدہا بن کر منہ کھولا ایسا لگتا تھا کہ پوری مجلس اور شاہی محلات کو لقمہ بنا کر ہڑپ کرے گا، چنانچہ فرعون کے دونوں پیشاب خطا ہوگئے، اور اس پر کپکپی طاری ہو کر حواس باختہ ہوگیا۔ تفصیلات سورۂ اعراف، سورۂ شعراء اور سورۂ قصص میں دیکھیں۔

اس بدحواسی کا واضح اندازہ اس جملہ سے کیا جا سکتا ہے کہ ''تو اپنے جادو کے زور سے ہم کو ہمارے ملک سے نکال باہر کرنا چاہتا ہے''۔ دنیا کی تاریخ میں نہ پہلے کبھی یہ واقعہ پیش آیا تھا، اور نہ بعد میں کبھی پیش آئے گا کہ کسی

جادوگر نے یا ہزاروں جادوگروں نے اپنے جادو کے زور سے کوئی ملک فتح کرلیا ہو۔ فرعون کے اپنے ملک میں بھی ایک لاکھ سے زائد جادوگر تھے، جو تماشہ دکھا دکھا کر انعام کے لئے ہاتھ پھیلاتے پھرتے تھے، کیا ان کے خیال میں کبھی آیا کہ یہ جادوگر میرے اقتدار پر کبھی قبضہ کرلیں گے، ہرگز نہیں تو پھر موسیٰ علیہ السلام سے اسے کیونکر خطرہ ہوا؟ اس لئے یہ اس کی بدحواسی کا واضح ثبوت ہوا کہ وہ ایسا کہنے لگا۔

دوئم یہ کہ دراصل وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معقول و مدلل حکیمانہ تقریر، اور پھر ان کے معجزے کو دیکھ کر یہ سمجھ گیا تھا کہ نہ صرف اس کے اہل دربار، بلکہ اس کی رعایا کے بھی عوام وخواص اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں گے، اس لئے اس نے جھوٹ اور فریب اور تعصّبات کی انگیخت سے کام نکالنے کی کوشش شروع کردی، اور رائے عامہ کو اپنے حق میں اور موسیٰ علیہ السلام کے خلاف ہموار کرنا چاہا، اور کہا کہ یہ معجزہ نہیں جادو ہے، اور کہا کہ ہماری سلطنت کا ہر جادوگر اسی طرح لاٹھی کو سانپ بنا کر دکھا سکتا ہے، اور یہ دونوں بھائی اقتدار کے بھوکے ہیں، یہ پیغمبر کچھ نہیں ہیں، بلکہ یہ چاہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام کے زمانے کی طرح پھر بنی اسرائیل یہاں حکمران ہوجائیں، اور قبطی قوم سے سلطنت چھین کر انہیں رعایا اور غلام بنایا جائے۔

ان ہتھکنڈوں سے وہ دعوت حق کو نیچا دکھانا چاہتا تھا، اور عوام کو بیوقوف بنا کر انہیں حق کے قبول کرنے سے روکنا چاہتا تھا، اور اپنے اقتدار کو مزید محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ دراصل ہر زمانے میں برسر اقتدار لوگوں نے داعیانِ حق کو یہی الزام دیا ہے کہ وہ اقتدار کے بھوکے ہیں، اور ساری باتیں اسی مقصد کے لئے کررہے ہیں، وہ ہمارے اقتدار پر قبضہ جمانا چاہتے ہیں، وغیرہ۔

﴿وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا﴾ بلاشبہ ہم نے فرعون کو اپنی تمام نشانیاں دکھائیں۔ ﴿فَكَذَّبَ وَاَبٰى﴾ مگر اس نے سب کی تکذیب کی اور انکار کیا، اور آیات بینات کو جادو کہہ کر اپنی بدبختی پختہ کردی۔

﴿قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى﴾ اے موسیٰ! کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ ہمیں اپنے جادو کے زور سے ہماری سرزمین سے نکال باہر کرے؟ دراصل وہ اپنے لوگوں کو اس طرح کہنے سے اشتعال دینا چاہتا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کے خلاف انہیں محاذ بنانے پر آمادہ کرنا چاہتا تھا، اور دعوت حق کو دبانا چاہتا تھا، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو دھمکی دے کر کہا:

﴿فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ﴾ ہم تیرے مقابلہ میں ایسا ہی جادو لائیں گے، ہمارے پاس بڑے ماہر

مانے ہوئے جادوگروں کا پورا لشکر ہے، وہ سب تمہارے مقابلے پر جمع کر کے لائیں گے، اور تمہیں شکست دیں گے، پس انتظار کئے بغیر فیصلہ کرو:

﴿فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا﴾ تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک تاریخ مقرر کر دے تاکہ مقابلہ ہو، اور بقول فرعون حق و باطل میں فیصلہ ہو۔

﴿لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ﴾ یہ وعدہ ایسا پختہ ہو جس کی نہ ہم خلاف ورزی کریں نہ تم، اور یہ بھی طے ہو کہ:

﴿مَكَانًا سُوًى﴾ کھلا میدان ہو، جہاں ہر قسم کے لوگوں کی رسائی ہو، تاکہ سارا جہاں اس تاریخی مقابلے کو دیکھ کر اس سے متاثر اور آگاہ ہوں، جواب میں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ﴾ کہ مقابلہ کے لئے یوم الزینۃ بہتر رہے گا۔ مصری لوگ ہمارے موجودہ زمانے کی طرح سال میں ایک دن جشن مناتے تھے، جس میں بڑے دھوم دھام سے شرکت کرتے تھے۔ بہر حال! یہ ان کا قومی میلہ اور جشن کا دن ہوتا تھا، جسے کھلے میدان میں قومی تہوار کی طرح مناتے تھے۔

﴿وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى﴾ کہ لوگ دن چڑھے روشنی میں خوب اکٹھے کئے جائیں، چنانچہ تاریخ اور وقت نیز میدان عام کے فیصلے کے بعد فرعونیوں نے ہاتھ پاؤں مارنا شروع کیا۔

﴿فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى﴾ فرعون اپنی جگہ سے پلٹا، معاہدہ طے پانے کے بعد وہاں سے واپس ہوا، اور اپنی تدابیر جمع کرنا شروع کیں۔

﴿ فَاَرْسَلَ فِرْعَوْنُ فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ﴾ ملک کے اطراف میں سپاہی روانہ کئے گئے، اور ہر مقام دبستی اور شہروں اور دیہاتوں سے ماہر و پختہ کار جادوگر جمع کئے گئے، تقریباً پورے ملک کے جادوگر بڑے دھوم دھام سے آنا شروع ہو گئے، جب موقع پر پہنچے تو ان کا استقبال ہوتا رہا، ان کے لئے کھلے میدان کے ایک حصہ میں باقاعدہ خیموں کی رنگ برنگ بستی قائم ہو چکی تھی، جس میں تمام ضروریاتِ زندگی کی اشیاء (چیزوں) کی بھرمار تھی، اور فرعون سے انہوں نے انعام کا اچھا خاصا مطالبہ کیا تھا، جبکہ فرعون نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ اگر تم غالب آ گئے تو تمہیں اپنا مقرب خاص بنالوں گا۔

جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے مقابلے میں بے شمار جادوگروں کو دیکھا تو فرمایا:

﴿قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا﴾ تمہارے لئے ہلاکت ہو، تم پر افسوس ہے، تم

اللہ تعالیٰ پر جھوٹ نہ باندھو، یعنی جادو جیسے ناپاک عمل سے باز آجاؤ، باطل سے حق کا مقابلہ نہ کرو، تمہیں عبرت ناک شکست ہوگی، جس کا نتیجہ تمہارے لئے نہایت خطرناک ہوگا۔

﴿فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ﴾ اللہ تعالیٰ تم پر عذاب بھیج کر تمہیں ہلاک کردے گا۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام رعب دار لہجے میں اللہ تعالیٰ سبحانہ کی عطا کردہ قوت کے ساتھ بول رہے تھے۔ آپ علیہ السلام کی باتیں قلوب وصدور کو چیرتے ہوئے اثر انداز ہورہی تھیں، فرمایا: اپنی حرکتوں سے باز آجاؤ، ورنہ یاد رکھو:

﴿وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى﴾ بیشک وہ شخص ناکام ہوا جس نے اللہ تعالیٰ واحد وصمد پر جھوٹ باندھا، چنانچہ میدان میں موجود دوسرے لوگ جو کہ مشرک اور فرعونی تھے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، یہاں تک کہ خود فرعون نے بھی محسوس کیا:

﴿فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ﴾ انہوں نے اس معاملہ میں آپس میں جھگڑا بھی کیا، کچھ لوگ کہنے لگے کہ اگر موسیٰ کی سچائی نکلی تو کیا ہوگا؟ اگر ہمارا جادو ان پر نہ چلا تو پھر کیا نتیجہ نکلے گا؟ کچھ لوگ کہتے تھے مقابلہ ہونا چاہئے، جبکہ کچھ کہتے تھے مقابلہ سے دستبردار ہونا بہتر ہے، کچھ نے کہا کہ ہمارے مقدر میں شکست کے سوا کچھ نہیں، ادھر جادوگر بھی دل برداشتہ شش وپنج میں پڑے رہے، انہیں پختہ یقین ہوا کہ ہم ناکام خائب وخاسر رہیں گے۔ بہرحال! ایسے حالات میں:

﴿وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى﴾ فرعون اور اس کے معاونین وعمائدین نے خفیہ میٹنگ کی تاکہ مقابلہ کے بعد کی صورت حال پر مشورہ اور اقدام کا فیصلہ کیا جاسکے، انہیں سو فیصد یقین تھا کہ جیت موسیٰ وہارون کی ہوگی، مگر فرعون نے اپنی ہٹ دھرمی پر ڈٹ کر یہی فیصلہ کیا جو اس نے شروع میں کیا تھا۔

﴿قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا﴾ کہنے لگے: بلاشبہ یہ دونوں پیغمبر نہیں بلکہ جادوگر ہیں، یہ دونوں اپنے جادو کے زور سے تمہیں تمہاری سرزمین سے نکال باہر کرنا چاہتے ہیں، اگر انہیں اسی طرح چھوڑ دیا گیا تو ہمیں خوار کریں گے، اور ہماری ہر چیز پر ان کا غلبہ ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى﴾ تمہارے تمام عمدہ اور اچھے طریقوں کو ختم کریں گے، نہ تمہارا مذہب، نہ طور وطریق، یہاں تک کہ ہمارے معاشرے پر بھی ان کا قبضہ ہوگا۔

﴿فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا﴾ پس پورے طریقے پر صف بندی کر کے ان کا مقابلہ کرو، اور ساتھ

یہ لالچ بھی دی:

﴿وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى﴾ یعنی جب تم اپنی تدبیر پر متفق ہو جاؤ گے تو کامیاب ہو جاؤ گے، اور آج جو غالب آئے گا وہی کامیاب ہوگا۔ آگے اس کی تشریح ہے۔

قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ۭ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ۭ وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿٧٠﴾

ترجمہ: کہنے لگے کہ اے موسیٰ! یا تم پہلے ڈالو، اور یا ہم پہلے ڈالنے والے بنیں ﴿٦٥﴾ موسیٰ نے کہا: بلکہ تم پہلے ڈالو، پس یکایک ان کی رسیاں اور لاٹھیاں ان کے جادو کی وجہ سے موسیٰ کے خیال میں ایسی معلوم ہو رہی تھیں جیسا کہ وہ دوڑ رہی ہیں ﴿٦٦﴾ سو موسیٰ نے اپنے دل میں تھوڑا سا خوف محسوس کیا ﴿٦٧﴾ ہم نے کہا: تم مت ڈرو، بلا شبہ تم ہی بلند رہو گے ﴿٦٨﴾ اور ڈال دو جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے، وہ اس سب کو چٹ کر دے گا جو کچھ انہوں نے بنایا ہے، انہوں نے صرف جادوگروں والا مکر کیا ہے، اور جادوگر جہاں کہیں سے بھی آئے کامیاب نہیں ہوتا ﴿٦٩﴾ سو جادوگر سجدے میں گرا دیئے گئے، کہنے لگے کہ ہم ہارون اور موسیٰ کے ربّ پر ایمان لائے ﴿٧٠﴾

معارف ومنازل

فرعون نے اپنے ملک کے اطراف واکناف اور حدودِ مملکت سے بہت بڑی تعداد میں جادوگروں کو جمع کیا، جب جادوگر آئے تو فرعون سے کہنے لگے کہ اگر ہم غالب آ گئے تو کیا ہمیں اس پر کوئی خاص بڑا انعام ملے گا؟ فرعون نے کہا: بڑا صلہ بھی ملے گا، اور تم سب میرے مقرب لوگوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر انہوں نے جب موسیٰ علیہ السلام کے دعویٰ اور طور وطریق کو سمجھا تو ان کی سچائی ان کے دل میں بیٹھ گئی، اور چاہتے تھے کہ مقابلہ نہ کریں، لیکن فرعون نے زبردستی ان کو میدان میں اتارا اور مقابلہ کرایا۔

جب وہ میدان میں آئے تو موسیٰ علیہ السلام نے مناسب جانا کہ انہی کو پہلے ڈالنے کے لئے کہا جائے، اس

لئے فرمایا کہ پہلے تم ڈالو، کیا ڈالتے ہو؟ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال دیں، اور فرعون کی عزّت کی قسم کھا کر کہا کہ ہم ضرور غالب ہوں گے۔ انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کیا، جس کی وجہ سے دیکھنے والوں کو یہ محسوس ہو رہا تھا کہ انہوں نے جو لاٹھیاں اور رسیاں ڈالی ہیں وہ سفید سانپ ہیں، جو چاروں طرف دوڑ لگا رہے ہیں، میلوں تک جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ ماجرا دیکھا تو ذرا سا اپنے دل میں خوف محسوس کرنے لگے، وہ اگرچہ مکمل مطمئن رہے، مگر ہزاروں سانپوں کو دوڑتے ہوئے ایک تعجب انگیز کیفیت میں دیکھا تو معمولی خوف محسوس کیا، کیونکہ ایسا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا، تب پروردگار جل شانہ کا حکم ہوا کہ ڈرو مت، تم ہی غالب رہو گے، تم بسم اللہ کر کے اپنی لاٹھی ڈال دو۔

اب انہوں نے اپنی لاٹھی ڈالی تو اس نے سانپ بن کر جادوگروں کے تمام سانپوں رسیوں لاٹھیوں کو نگلنا شروع کر دیا، اور آنکھوں کے اشاروں میں پورے میدان کو صاف کر دیا، پورا مجمع کف افسوس ملتے ہوئے گونگے بہرے بن کر حیرت زدہ ہو گئے، حواس کھو بیٹھے اور رونے لگ گئے۔

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى﴾ جب جادوگر اور موسیٰ علیہ السلام آمنے سامنے ہو گئے تو انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطب ہو کر کہہ دیا: اے موسیٰ! پہلے آپ ڈالیں گے یا ہم ڈالنے والے ہوں؟ مطلب یہ ہے کہ مقابلہ کی ابتداء کس کی طرف سے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

﴿قَالَ بَلْ اَلْقُوْا﴾ بلکہ تم ہی ڈالو، پس انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈال کر مقابلے کی ابتداء کی، جس کی کیفیت یہ رہی:

﴿فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى﴾ جوں ہی جادوگروں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو ان کے زبردست جادو کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خیال میں وہ اس طرح نظر آ رہی تھیں گویا کہ وہ دوڑ رہی ہیں، جادو کسی چیز کی حقیقت کو نہیں بدل سکتا، البتہ نظر بندی اور کرتب کے ذریعہ لوگوں کی نظر بندی کر کے ایک چیز کی کیفیت بدل سکتی ہے۔

﴿فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى﴾ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے جی میں کچھ خوف محسوس کیا۔ یاد رکھیں کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہ خوف اپنی مغلوبیت کے متعلق نہیں تھا، انہیں تو پختہ یقین تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہوں، اور ہر حال میں غالب رہوں گا، انہیں خوف اس بات کا تھا کہ شاید عام لوگ جادو اور معجزے میں امتیاز نہ کر سکیں، جس طرح جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ نظر آنے لگیں اسی طرح اگر میری لاٹھی بھی سانپ بن گئی اور جادوگروں کا جادو

ختم کیا تو لوگ یہ نہیں سمجھیں گے کہ حق اور معجزہ نے باطل کو ہڑپ کر لیا، بلکہ وہ یہ کہیں گے کہ بڑے جادو نے کمتر جادو کو شکست دیدی، اس طرح حق اور معجزہ کا تعارف اور حقانیت خفاء میں رہ جائے گی۔

﴿قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى﴾ ہم نے کہا: اے موسیٰ! ڈرو مت، تم ہی غالب رہو گے، لوگوں کو جلد پتہ چلے گا کہ حق وہ ہے جس کا مدعی آپ ہیں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

﴿وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ﴾ اے موسیٰ! ڈال دو وہ جو تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے۔

﴿تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا﴾ یہ نگل جائے گی وہ سب کچھ جو جادوگروں نے بنایا ہے، حکم الٰہی کی تعمیل میں لاٹھی جب ڈال دی تو پورے میدان کی صفائی کر لی، کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اس اثناء میں پورے مجمع پر دہشت طاری ہوگئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لاٹھی جو اژدہا بن چکی ہے ہمارا تعاقب کر کے سب کو ہڑپ نہ کر دے، چنانچہ افراتفری کے عالم میں فرعون اور اس کے ساتھی سب بھاگ کھڑے ہوئے۔

﴿اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ﴾ انہوں نے ایک جادوگر کا بناوٹی فریب بنایا ہے، اور ترتیب دیا ہے، اس قسم کے ہتھکنڈے حق کے سامنے کہاں ٹھہر سکتے ہیں؟

﴿وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى﴾ یاد رکھو! جادو جہاں سے بھی آئے جادوگر فلاح نہیں پا سکتا، چنانچہ جادوگروں نے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے بغیر کسی مشورہ اور میٹنگ کے بالاتفاق سب نے حق کے سامنے سرتسلیم خم کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو کر اعلان کرتے رہے، فرمایا:

﴿فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى﴾ وہ سب سمجھ گئے کہ موسیٰ علیہ السلام ہماری طرح کا جادوگر نہیں، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ شانہ کے نبی ہیں، اور اس کا یہ عصاء پیغمبرانہ معجزہ ہے، اس لئے انہوں نے بلاتوقف نتائج کی پرواکئے بغیر ہارون و موسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام کے ربّ پر ایمان لایا، اور جرأت کے ساتھ اعلان کیا۔ فرعون بڑا ظالم و جابر اور ایک متکبر بادشاہ تھا، وہ کہاں برداشت کرتا تھا کہ جادوگر ایمان لائیں، اور اس کے سارے منصوبے ناکام ہو جائیں۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۭ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبْقٰى ﴿٧١﴾

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۷۲ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۷۳ اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۷۴ وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۷۵ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۷۶

ترجمہ: فرعون نے کہا کہ اس سے پہلے میں تمہیں اجازت دوں تم موسیٰ پر ایمان لے آئے، بلاشبہ وہ تمہارا بڑا ہے جس نے تمہیں جادو سکھایا ہے، سو میں ضرور بالضرور اس طرح سے تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹ دوں گا کہ ایک طرف کا ہاتھ ہوگا، اور دوسری طرف کا پاؤں ہوگا، اور ضرور بالضرور میں تمہیں کھجور کی ٹہنیوں میں لٹکا دوں گا، جیسے صلیب پر لٹکا دیا جاتا ہے، اور تم ضرور جان لوگے کہ ہم میں کون سب سے زیادہ سخت عذاب والا ہے، اور کس کا عذاب دیرپا ہے ۷۱ جادوگر کہنے لگے کہ ہمارے پاس جو کھلے ہوئے دلائل آئے ہیں ان کے مقابلے میں اور اس ذات کے مقابلے میں جس نے ہمیں پیدا فرمایا ہے ہم تجھے ہرگز ترجیح نہیں دیں گے، سو تو جو کچھ فیصلہ کرنے والا ہے وہ کر ڈال، تو صرف اس دنیا والی زندگی میں فیصلہ کرے گا ۷۲ بلاشبہ ہم اپنے رب پر ایمان لائے تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو بخش دے اور تو نے جو ہم سے زبردستی جادو کرایا اس کو بھی معاف فرمادے، اور اللہ تعالیٰ بہتر ہے اور ہمیشہ ہی باقی ہے ۷۳ بلاشبہ بات یہ ہے کہ جو شخص اپنے رب کے پاس مجرم بن کر آئے گا سو اس کے لئے جہنم ہے، نہ اس میں مرے گا اور نہ جیئے گا ۷۴ اور اس کے پاس جو شخص مؤمن بن کر آئے گا جس نے نیک عمل کئے ہوں گے سو ان لوگوں کے لئے بلند درجات ہیں ۷۵ ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ اس کی جزا ہے جو پاک ہوا ۷۶

معارف ومنازل

جادوگروں کے ایمان نے ایک ایسا انقلاب جنم لیا کہ اگر لوگوں کو فرعون کا خوف خطر نہ ہوتا تو جادوگروں کے نقش قدم پر چل کر پورا مجمع مسلمان ہوجاتا، اسی اندیشہ سے فرعون نے بروقت اعلان کرکے اپنی ذلت ورسوائی چھپاتے ہوئے سارا غصہ جادوگروں پر ڈال دیا، اور کہا:

﴿قَالَ اٰمَنۡتُمۡ لَہٗ قَبۡلَ اَنۡ اٰذَنَ لَکُمۡ﴾ فرعون نے بوکھلاہٹ اور شرمندگی میں جادوگروں کو یہ دھمکی دی کہ بغیر میری اجازت کے تم کیسے موسیٰ پر ایمان لے آئے؟ گویا پورے مجمع کو خبردار کرنا تھا کہ میری اجازت کے بغیر کسی شخص کے لئے ممکن نہ ہوگا کہ وہ موسیٰ کی تصدیق کرے۔ درحقیقت اسے اپنے اقتدار کے لئے خوف پیدا ہوگیا تھا کہ کہیں لوگ جادوگروں کی طرح بیتاب ہوکر ایمان قبول نہ کریں۔

مگر ظاہر ہے کہ اس کھلے ہوئے معجزے کے بعد کسی کی اجازت کی ضرورت کسی عاقل انسان کے نزدیک کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اس لئے اب جادوگروں پر اس سازش کا الزام لگایا کہ تم سب موسیٰ کے شاگرد اور حامی ہو، اسی موسیٰ نے تمہیں جادو سکھایا ہے، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ان لوگوں نے زندگی بھر موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا تک نہیں ہے، تو سراسیمگی میں اس لئے کہا تاکہ لوگوں پر معجزہ کا اثر نہ ہو، اور:

﴿فَاَوۡجَسَ فِیۡ نَفۡسِہٖ خِیۡفَۃً مُّوۡسٰی﴾ میں جس چیز کا موسیٰ علیہ السلام کو خوف رہا وہی بات تھی کہ فرعون نے اسے منہ سے نکالا، اور حق کو دبانے کی کوشش کی، اور کہا:

﴿فَلَاُقَطِّعَنَّ اَیۡدِیَکُمۡ وَ اَرۡجُلَکُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ﴾ اب اس نے جادوگروں کو سخت سزا سے ڈرایا کہ تمہارے ہاتھ پاؤں کاٹے جائیں گے، جس کی صورت یہ ہوگی کہ داہنا ہاتھ کٹے گا تو بایاں پاؤں کاٹا جائے گا، یہ صورت اس لئے تجویز ہوئی کہ فرعونی قانون میں سزا کا یہی طریقہ رائج تھا، اس لئے کہ اس صورت میں انسان ایک عبرت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

﴿وَّلَاُوصَلِّبَنَّکُمۡ فِیۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ﴾ ہاتھ پاؤں کاٹنے کے بعد کھجور کے درختوں پر تمہیں سولی دی جائے گی، اہل حق ہمیشہ ظالموں کے تختہ مشق رہے، آگ میں جلائے گئے، سولیوں پر لٹکائے گئے، اور کئی طرح کے عذابوں میں مبتلا ہوکر مارے گئے، ان سب کے باوجود ثابت قدم رہ کر ابدی راحتوں میں پہنچے۔

﴿قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَکَ عَلٰی مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَیِّنٰتِ﴾ سورۂ شعراء میں فرمایا: ﴿قَالُوۡا لَا ضَیۡرَ ۫ اِنَّاۤ اِلٰی رَبِّنَا مُنۡقَلِبُوۡنَ﴾ [الشعراء: ٥٠] (انہوں نے کہا: کوئی پرواہ نہیں، ہم یقیناً اپنے ربّ کی طرف لوٹنے والے ہیں)۔ جادوگروں کے دلوں میں ایمان پختہ ہوچکا تھا، وہ نظر اور شفقت الٰہی کی بدولت کندن بن چکے تھے، انہیں یہ مقام لمحوں میں عطا ہوا تھا جسے لوگ لمبی عمروں میں زہد و ریاضتوں کے بعد بمشکل حاصل کرتے ہیں، اور کئی بیچارے باوجود ریاضتوں کے محروم رہ جاتے ہیں، ان خوش قسمت لوگوں نے کہا: ہاتھ پاؤں کٹنے اور قتل ہوجانے سے ہمارا

کوئی نقصان نہ ہوگا، اور ہمارا فائدہ ہوگا کہ جلد سے جلد اپنے ربّ کے پاس پہنچ جائیں گے، اور ہمارے پاس جو کھلی کھلی دلیلیں آگئیں ان دلیلوں کے مقابلہ میں اور اس ذات پاک کے مقابلہ میں جس نے ہمیں پیدا فرمایا ہم:

﴿لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ﴾ ہرگز تجھے ترجیح نہیں دیں گے، اگر تو ہمیں سزا دینا چاہتا ہے، اور جو کچھ ہمارے بارے میں فیصلہ کرنا چاہتا ہے کرلو، ہم ہر مصیبت جھیلنے اور تکلیف سہنے کے لئے تیار ہیں۔

﴿فَاقۡضِ مَآ اَنۡتَ قَاضٍ﴾ پس تو جو فیصلہ چاہتا ہے کرگزر، ہم ہرگز خوفزدہ نہیں ہوں گے۔

﴿اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا﴾ تیرا فیصلہ تو اس دنیا کی زندگی تک محدود ہے، جوں ہی زندگی ختم ہوجائے گی تیرے عذاب کے اثرات کا خاتمہ ہوجائے گا۔

﴿اِنَّاۤ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَـغۡفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا﴾ بیشک ہم اپنے پروردگار پر ایمان لائے ہیں، تاکہ وہ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائے۔ ﴿وَمَاۤ اَكۡرَهۡتَنَا عَلَيۡهِ مِنَ السِّحۡرِ﴾ اور جس جادو کے عمل پر جو تو نے ہمیں مجبور کیا ہے اس کی بھی مغفرت فرمادے۔ یعنی تو نے ہمیں مجبور کرکے اللہ تعالیٰ کے نبی کے مقابلے میں لا کھڑا کیا، ہم اس بات کی بھی اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتے ہیں، جہاں تم اپنے عذاب اور سزاؤں کو دیرپا سمجھتے ہو وہاں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تمہاری سزائیں مختصر وقت تک کے لئے ہیں۔ ہاں! البتہ ہمارے ربّ کی سزائیں دائمی اور ابدی ہیں، کیونکہ ہمارا ربّ خود ہی دیرپا اور ہمیشہ کے لئے باقی ہے، اس کے علاوہ کسی کو بقاء و دوام نہیں۔

﴿اِنَّهٗ مَنۡ يَّاۡتِ رَبَّهٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ﴾ بیشک جو شخص اپنے ربّ کے پاس مجرم بن کر آئے پس اس کے لئے جہنم تیار ہے، اور وہ ایسی بری جگہ ہے:

﴿لَا يَمُوۡتُ فِيۡهَا وَلَا يَحۡيٰى﴾ کہ اس میں داخل ہونے والا نہ مرے گا اور نہ زندہ رہے گا، زندگی راحت کا نام ہے جو وہاں بالکل نہیں ہوگی، اور موت آکر ختم کردیتی ہے مگر وہاں یہ بھی نہیں ہے، وہ سراسر بدحالی اور پریشانی کی زندگی ہوگی، جس میں کسی قسم کا سکون نہ ہوگا۔

﴿وَمَنۡ يَّاۡتِهٖ مُؤۡمِنًا قَدۡ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ﴾ جو شخص ایمان کے ساتھ اپنے ربّ کے سامنے پیش ہوگا اور وہ نیک اعمال بھی انجام دیا ہوگا:

﴿فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الۡعُلٰى﴾ پس ان کے لئے بڑے بلند درجات ہوں گے۔

﴿جَنّٰتُ عَدۡنٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ﴾ بڑے باغات، قابل رہائش ابدی رہنے کے نصیب ہوں گے

جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ یہ لوگ ہمیشہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔

﴿وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى﴾ اور یہ بدلہ اس شخص کے لئے ہے جس نے تزکیہ حاصل کیا، یعنی اپنے آپ کو کفر وشرک نفاق وبداعمالی سے بچایا۔ دراصل یہی وہ لوگ تھے جن کی پوری زندگی کفر وشرک اور جادوگری میں گزری، اور جب انہیں ایمان نصیب ہوا تو لمحوں میں تقدیر بدل گئی۔ صدیقین کے مقام پر پہنچ کر شہادت کے مقامات عبور کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئے، عام لوگ عمر بھر کے مجاہدوں اور ریاضتوں کے بعد بمشکل اس مقام کو پہنچتے ہیں، ان خوش قسمتوں نے اس کو چند لمحوں میں پالیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور عبید بن عمیر رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ قدرت حق کا یہ کرشمہ دیکھو کہ یہ لوگ شروع دن سے جادوگر کافر اور جہنمی تھے، آخر دن اولیاء اللہ شہداء جنتی ہو گئے۔ [ابن کثیر]

تفسیر قرطبی میں ہے کہ حق وباطل کے اس تاریخی معرکہ کے وقت فرعون کی بیوی حضرت آسیہؓ برابر خبر رکھتی رہیں کہ انجام کیا ہوا؟ جب ان کو یہ بتلایا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام غالب آگئے، اور سارے جادوگر مسلمان ہوگئے تو فوراً انہوں نے اپنے ایمان کا اعلان کرلیا، جب فرعون کو ان کے ایمان کا پتہ چلا تو حکم دیا کہ ایک پتھر کی چٹان اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دو، آسیہؓ نے جب یہ منظر دیکھا تو آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور ربّ تعالیٰ سے فریاد کی، حق تعالیٰ نے ان کے اوپر پتھر رکھنے سے پہلے ان کی روح قبض فرمائی، پھر پتھر اس بے جان جسم پر گرا۔

جَزَاءُ مَنْ تَزَكّٰى کا مطلب بتاتے ہوئے مفسرین کرام نے دخولِ جنت کے لئے تزکیہ کو لازمی قرار دیا ہے۔ تزکیہ نام ہے کفر وشرک ونفاق اور تمام گناہوں سے بچنے کا، یہی وجہ ہے کہ گناہگار مؤمن پہلے دوزخ میں ڈالا جائے گا، دوزخ کی بھٹی سے جب گناہ معاف ہوجائیں گے اور صفائی حاصل ہوجائے گی تب دخول جنت کا استحقاق حاصل ہوجائے گا، نفس ایمان بغیر تزکیہ کے صرف ابدی دوزخ سے بچائے گا اوّلاً دخول جنت کا ہرگز وسیلہ نہیں بنے گا۔

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي الْبَحْرِ
يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ فَغَشِيَهُمْ
مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿۷۸﴾ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ﴿۷۹﴾

ترجمہ: اور بلاشبہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ راتوں رات میرے بندوں کو لے کر چلے

جاؤ، پھران کے لئے سمندر میں خشک راستہ بنادینا، نہ کسی کے تعاقب کا اندیشہ کروگے، اور نہ تمہیں کسی قسم کا خوف ہوگا
(۷۷) سوفرعون نے ان کے پیچھے اپنے لشکروں کو چلا دیا، پھر دریا سے انہیں اس چیز نے ڈھانپ لیا جس چیز نے بھی ڈھانپا
(۷۸) اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا، اور ہدایت کی راہ انہیں نہ بتائی (۷۹)

معارف ومنازل

فارسی میں کہاوت مشہور ہے: عاقلان باشارہ فہمند، وخران بدریا غرق شوند۔ عقلمند مختصر اشارہ سے سمجھ جاتے ہیں اور گدھے دریا میں ڈوب جاتے ہیں۔ فرعون اچھی طرح جانتا تھا کہ میں کسی طرح موسیٰ وہارون علیہما السلام کا مقابلہ نہیں کرسکتا، وہ ہرحال میں مجھ پر غالب آئیں گے، مگر وہ ناداں اور احمق رہا، مقابلہ پر اتر آیا، پوری قوم کے ساتھ غرق ہوا، اگر وہ تعاقب نہ کرتا تو بچ جاتا، مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا، اللہ تعالیٰ نے اس کی غرقابی کا فیصلہ کر کے اسے بیوقوف بنا کر دریا کے پاس لے آیا۔ "چون قضا آید طبیب ابلہ شود"۔ جب تقدیر کے فیصلہ کا وقت آپہنچتا ہے تو انسانی تدبیریں فیل ہوجاتی ہیں، اور دانشوروں کی عقل ناکارہ ہوجاتی ہے۔

اس متکبر ومغرور اور ناداں کو دیکھیں، جب وہ ستر لاکھ لوگوں کے ساتھ دریائے قلزم پہنچا تو دریا کو بارہ جگہ خشک پایا، ساتھ پانی پہاڑوں کی طرح کھڑا ہے، جوادنیٰ اشارہ کے ساتھ آپس میں مل کر تباہی مچا سکتا ہے، تو اس کو سمجھنا چاہئے تھا کہ یہ راستے موسیٰ وہارون علیہما السلام کے لئے بنے ہوئے ہیں، وہ تو دریا عبور کر کے گزر گئے، اب یہ راستے کہیں ایسا نہ ہو کہ میری تباہی کے لئے بدستور باقی ہیں، لیکن اس نے اپنی بادشاہت کی گھمنڈ میں مست ہوکر کہا کہ دریا نے میرا حکم مان کر میرے لئے راستے بنائے، چنانچہ وہ دریا میں داخل ہوا۔ حضرت جبریل علیہ السلام اس کے گھوڑے سے پہلے ایک گھوڑی پر سوار ہوکر دریا میں داخل ہوا، جبکہ حضرت میکائیل علیہ السلام لشکر کے آخری حصے کو ہانک کر دریا میں ڈال رہا تھا کہ کہیں کوئی پیچھے سے بچ نہ نکلے، اس جگہ دریا کا عرض تقریباً تین میل ہے، فرعون جب نکلنے کے مقام سے قریب پہنچا ادھر آخری لوگ بھی داخل ہوئے تب دریا کی موجیں آپس میں ٹکرا کر مل گئیں۔

یہ عجیب وغریب قدرتی نظارہ بنی اسرائیل کے لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہوا جسے انہوں نے خوب مشاہدہ بھی کیا، لیکن ناشکرہ کر بھول گئے۔ بہرحال! اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ تم کسی مذہبی تقریب کا بہانہ کر کے بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاؤ، اس وقت بنی اسرائیل کی تعداد تقریباً چھ لاکھ سے کچھ متجاوز تھی، اور یہ روانگی

رات کو ہوئی۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اور اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے سمندر کا راستہ اختیار فرمایا، انہیں حکم ہوا تھا کہ سمندر پر پہنچنے کے ساتھ دریا پر عصا مار کر اپنی قوم کے بارہ قبائل کے لئے بارہ راستہ بنائیں، وہاں خشک راستوں سے گزر کر دریا عبور کریں، نہ کسی کے تعاقب سے ڈرنا، اور نہ کسی قسم کا دل میں خوف لانا۔حضرت موسیٰ علیہ السلام معجزانہ طور پر راتوں رات نکلے،فرعون کو دوسرے دن جب پتہ چلا تو وہ بڑے غرور وتکبر سے کہنے لگا: یہ ہمارے مٹھی بھر غلام کہاں چھپ جائیں گے؟ میں انہیں ذلیل کر کے گھسیٹ کر لاؤں گا، اور تباہ کر کے رکھ دوں گا، اور انہیں نشان عبرت بناؤں گا (اسے معلوم نہ تھا کہ وہ خود نشان عبرت بنے گا)۔

لہٰذا وہ اپنے لشکروں کو لے کر ان کا تعاقب کرنے کے لئے روانہ ہو گیا، جب بنی اسرائیلیوں نے فرعونی لشکروں کو دیکھا تو چیخ اٹھے، اور کہنے لگے: اے موسیٰ! ہم تو دھر لئے گئے، پکڑے گئے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ہرگز ایسا نہیں، بلاشبہ میرا ربّ میرے ساتھ ہے، وہ ابھی مجھے راہ بتادے گا، چنانچہ انہیں سمندر پر لاٹھی مارنے کا حکم ہوا، اور لاٹھی مارتے ہی بارہ کشادہ راستے بن گئے، وہ حصے اتنے بڑے چوڑے تھے جیسا کہ پہاڑ ہو۔موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے ساتھ اطمینان سے دریا عبور کیا۔

پیچھے سے فرعون اپنے جرار لشکر کے ساتھ پہنچ گیا، اور دریا میں کود پڑا، جب پورا کا پورا لشکر سمندر میں آچکا تھا تو پانی کی بڑی بڑی موجوں نے پورے لشکر کو اپنی لپیٹ میں لے کر انہیں جہنم رسید کیا، اسی کو فرمایا:

﴿فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ﴾ پھر دریا سے انہیں اس چیز نے ڈھانک دیا جس چیز نے ڈھانپا۔یہ ڈھانپنے والی چیز غضب الٰہی کا تازیانہ عبرت تھا۔

﴿وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى﴾ اپنی قوم کو گمراہ کیا، اور ہدایت کا راستہ نہیں بتایا، وہ خود بھی ڈوبا اور اپنی قوم کو بھی لے ڈوبا، دنیا وآخرت دونوں میں تباہ ہوئے۔مزید تفصیل سورۂ ہود، سورۂ شعراء اور سورۂ قصص میں دیکھیں۔

﴿مَا غَشِيَهُمْ﴾ میں جو ابہام ہے وہ عظمت اور بڑائی کے معنی میں ہے کہ ان کی غرقابی اور ہلاکت کا معاملہ بہت ہی بڑا قابلِ عبرت ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ
الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۞ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ
يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۞ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۞

ترجمہ: اے بنی اسرائیل! ہم نے تمہیں تمہارے دشمن سے نجات دی، اور تم سے ہم نے کوہ طور کی دائیں جانب کا وعدہ کیا، اور ہم نے تم پر من اور سلویٰ نازل کیا۞ جو کچھ ہم نے تمہیں دیا اس میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ، اور اس میں حد سے آگے نہ بڑھو، ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا، اور جن پر میرا غضب نازل ہوا سو وہ گر گیا۞ اور بلاشبہ میں اسے بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی، اور ایمان لایا، اور نیک عمل کئے، پھر ہدایت پر قائم رہا۞

معارف ومنازل

یہاں فرعون کی داستان ختم ہوگئی، اب بنی اسرائیل پر انعامات کا تذکرہ ہو رہا ہے، سینکڑوں سالوں کی غلامی کے بعد تمہارے دشمن فرعون کی ہلاکت اور اس کی گرفت سے تمہاری نجات یہ بہت بڑی نعمت ہے، دیکھیں جس دشمن نے تمہارے نوے ہزار سے زیادہ بچوں کو قتل کرایا، آج وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ستر لاکھ فوجیوں کے ساتھ سمندر میں غرق ہوا، چاہئے کہ تم ان نعمتوں کا شکر بجالاؤ، اس کے علاوہ بہت بڑے عرصے تک اللہ تعالیٰ شانہ نے تمہیں بغیر محنت وخواری کے آسمانی خوراک من سلویٰ کھلاتا رہا، اور تمہاری ہدایت وراہنمائی کے لئے حضرت موسیٰ وحضرت ہارون علیہما السلام کو مبعوث فرمایا، اور تمہاری ہدایت وسعادت کی خاطر توراۃ شریف کو نازل فرمایا، پس تم شکر گزار بندے بنو، حد سے تجاوز کر کے ناشکر وناسپاس نہ ہو۔

ہمارا جو قانون فرعون کے لئے تھا وہی قانون تمہارے لئے بھی ہے کہ ایمان وعمل صالح توبہ اور شکر گزاری، ہماری مغفرت ورحمت اور نگاہ کرم کی نشانی اور سبب ہے، جبکہ کفر ونافرمانی اور اعمالِ سیئہ وناشکری ہماری ناراضی اور غضب وقہر کے اسباب ہیں، جس طرح فرعون اپنے برے اعمال کی پاداش میں ہلاک ہوا اسی طرح تم بھی اگر اس کے نقش قدم پر چلو گے تو مغضوب ومطرود بنو گے، یہ وعید تمہارے لئے بھی ہے۔

یہ سورۂ طٰہٰ مکی ہے، جس میں یہ وعید شدید نازل ہوئی جبکہ سورۃ البقرہ مدنی ہے، وہاں یہود پر غضب الٰہی کے نزول کا بیان ہے، اور ساتھ ساتھ ذلّت ومسکنت کے نزول کا بھی تذکرہ ہے۔ اب یہود کی مغضوبیت وملعونیت پختہ

اور یقینی ہے، جس میں ذرہ برابر کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، دیکھو سورۂ بقرہ ومائدہ۔

﴿يٰبَنِيٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى﴾ اے بنی اسرائیل (دیکھو) ہم نے تم کو تمہارے بڑے دشمن سے نجات دی، اور ہم نے تم سے (تمہارے پیغمبر سے) کوہ طور کے دائیں جانب آنے کا وعدہ کیا، یعنی مناجات کا اور تورات دینے کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا تھا، اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ اپنی قوم میں سے ستر آدمیوں کو منتخب کر کے اپنے ساتھ لے آئیں۔

الْاَيْمَنَ سے مراد پہاڑ کا دائیں جانب، اور یہ معنی بھی ہے کہ ایمن سے مراد برکت ہو، کیونکہ نزول وحی کا مقام برکت والا ہوتا ہے، اور ہم نے میدان تیہ میں تم پر من وسلویٰ نازل کیا۔

﴿كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى﴾ اور تمہیں حکم دیا کہ ہماری دی ہوئی پاکیزہ چیزوں سے کھاؤ، اور حد سے تجاوز نہ کرو، اسراف وتبذیر سے بچو، گناہ ومعاصی پر خرچ نہ کرو، اور ناشکری نہ کرو، اور بے جا خرچ نہ کرو، مستحقین کے حقوق پورا کرو، بخل وکنجوسی سے پرہیز کرو وغیرہ، ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا، اور جس کسی پر میرا غضب نازل ہوا تو وہ ہلاک ہوا تباہ ہوا، آگ میں لڑھک گیا۔

﴿وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى﴾ اور میں ایسے لوگوں کو بڑا بخشنے والا ہوں جو توبہ کرلیں، کفر وشرک نفاق ومعاصی سے تائب ہوکر اور ایمان لے آئیں، اور نیک عمل کریں، پھر انہی چیزوں پر استقامت کے ساتھ قائم رہیں۔

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۸۳﴾ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ﴿۸۴﴾ قَالَ فَاِنَّا
قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ
يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿۸۶﴾ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ
زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ

اِلٰـهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى فَنَسِيَ ۝۸۸ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۝۸۹

ترجمہ: اور اے موسیٰ! آپ کو کس چیز نے جلدی میں ڈالا کہ آپ اپنی قوم سے آگے بڑھ گئے؟ ۝۸۳ انہوں نے عرض کیا: وہ لوگ میرے پیچھے ہی ہیں، اور اے ربّ میں آپ (عزوجل تعالیٰ) کی طرف جلدی آ گیا تا کہ آپ (عزوجل تعالیٰ) راضی ہوں ۝۸۴ فرمایا: سو بلاشبہ ہم نے تمہارے بعد تمہاری قوم کو فتنہ میں ڈال دیا، اور انہیں سامری نے گمراہ کر دیا ۝۸۵ پھر موسیٰ اپنی قوم کی طرف غصہ میں بھرے ہوئے رنجیدہ حالت میں واپس ہوئے، انہوں نے کہا کہ اے میری قوم! کیا تمہارے ربّ نے تم سے اچھا وعدہ نہیں فرمایا؟ کیا تم پر زیادہ زمانہ گزر گیا؟ یا تم نے یہ چاہا کہ تم پر تمہارے ربّ کا غصہ نازل ہو جائے؟ سو تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کی ۝۸۶ وہ کہنے لگے کہ ہم نے جو آپ سے وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی اپنے اختیار سے نہیں کی، لیکن بات یہ ہے کہ ہم پر قوم کے زیوروں کے بوجھ لدے ہوئے تھے، سو ہم نے ان کو ڈال دیا، پھر سامری نے اسی طرح ڈال دیا ۝۸۷ پھر اس نے لوگوں کے لئے ایک بچھڑا نکالا جو ایک جسم تھا، اس میں سے گائے کی آواز آ رہی تھی، سو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تمہارا معبود ہے، اور موسیٰ کا بھی معبود ہے، سو وہ بھول گئے ۝۸۸ کیا وہ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا؟ اور وہ ان کے لئے کسی ضرر اور نفع کی قدرت نہیں رکھتا؟ ۝۸۹

معارف ومنازل

جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات پا کر دریا پار ہو گئے تو اب انہیں اپنے وطن فلسطین جانا تھا، اور ایک بہت بڑے صحرا کو عبور کرنا تھا، اس سفر میں انہیں بہت سے امور پیش آئے، ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جبل طور پر بلا کر توریت شریف عطا فرمائی، جس کا اوپر بیان: ﴿وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ﴾ میں گزر گیا، اور ان کے کھانے کے لئے من وسلویٰ نازل ہوئے، اور پتھر سے پانی کے چشمے نکلے، اور روشنی کے لئے ایک ستون کا انتظام ہوا۔

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم میں لکھا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام توریت شریف لینے کے لئے تشریف لے جا رہے تھے تو انہوں نے ستر آدمی چن لئے تا کہ ان کو اپنے ساتھ کوہ طور تک لے چلیں، موسیٰ علیہ السلام ان کے ساتھ جا رہے تھے تو انہیں پیچھے چھوڑ کر خود اکیلے آگے بڑھ گئے، اور اپنے ساتھیوں سے فرمایا: تم میرے پیچھے پہاڑ پر آ جاؤ،

اللہ تعالیٰ شانہ نے سوال فرمایا کہ تم اپنی قوم کو پیچھے چھوڑ کر آگے کیوں بڑھ گئے؟
﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى﴾ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ وہ لوگ میرے قریب ہی ہیں، میں زیادہ آگے نہیں بڑھا ہوں، آپ (عزوجل تعالیٰ) کی مزید رضامندی کے لئے میں نے ایسا کیا۔
ادھر موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پہنچے، اُدھر قوم نے گوسالہ (بچھڑا) پرستی شروع کر کے تمام دینی اقدار کو پامال کیا۔ واقعہ یوں ہوا کہ بنی اسرائیل جب مصر سے چلنے لگے تو ان کی عورتوں نے قوم فرعون کی عورتوں سے کہا کہ کل کو ہمیں مذہبی عید منانا ہے، اور شہر سے باہر میلے میں جانا ہے، ذرا زیب وزینت نمائش کے لئے ہمیں عاریۃً زیورات دیدیں، ہم میلے سے آکر تمہارے زیورات واپس کردیں گے، انہوں نے ان پر بھروسہ کر کے اپنے استعمال کے زیورات انہیں دیدیئے، جب وہ مصر سے نکلے تو یہ زیورات ان کے پاس تھے، جب وہ دریا کو عبور کر کے فلسطین جانا چاہا تو یہ زیورات بہرصورت ان کے پاس موجود تھے، اس چالیس سالہ عرصے کا دور انہوں نے میدان تیہ میں گزارا، جب موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور کا سفر شروع کیا تو سامری منافق جو کسی موقع کے انتظار میں تھا، اور یہ خبیث سُنار کا کام کرتا تھا، اپنے فن میں ماہر و چالاک تھا، اس نے لوگوں سے کسی طرح یہ زیورات حاصل کر کے اپنے ہاتھ میں لے لیا، بنی اسرائیل کے لوگوں کا ایمان پختہ اور مضبوط نہ تھا، یہ لوگ خدا اور سول کے بڑے نافرماں تھے۔
سامری نے آگ جلائی اور لوگوں سے کہا کہ تم اپنے ہاتھوں سے یہ زیورات آگ میں ڈال دیں، جب یہ سارا ذخیرہ پگھل گیا تو سامری نے ان سے گائے کے بچھڑے کی صورت بنادی، اور اندر سے خالی کرا کر اس میں ہوا پھونک دی، چنانچہ وہ گائے کے بچھڑے کی آواز دینا شروع کیا، اس نے لوگوں کو اس کی پوجا پاٹ کی دعوت دی، اور خود اس کی عبادت شروع کی، یہاں تک کہ چند معدودلوگوں کے علاوہ پوری قوم نے اس کی پرستش اور عبادت شروع کی۔
حضرت ہارون علیہ السلام نے ہر چند لوگوں کو سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ یہ تفصیل آئندہ متصل آنے والی ہے۔ ان شاءاللہ
حضرت موسیٰ علیہ السلام ابھی طور پر ہی تھے کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے انہیں مطلع فرمایا کہ تمہاری قوم کو ہم نے فتنہ میں ڈال دیا، اور سامری نے ان کو گمراہ کردیا۔ موسیٰ علیہ السلام جب واپس ہوئے تو رنج بھرے ہوئے غصے میں تھے، انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے ربّ نے مجھے کتاب دینے کے لئے بلایا تھا، اور اس کتاب میں تمہارے لئے احکام دینے کا وعدہ تھا، یہ تم نے کیا غضب کیا کہ میری غیر حاضری میں بت پرستی میں لگ

گئے؟ تمہیں اللہ تعالیٰ کے وعدے کا اور میرے آنے کا انتظار کرنا لازم تھا، کچھ زیادہ زمانہ بھی نہیں گزرا کہ تم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتاب ملنے سے ناامید ہو گئے، اور اس کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو گئے، کیا یہ بات تو نہیں ہے کہ تم نے اپنے رب کے غصہ نازل ہونے کا قصداً وارادۃً انتظام کرلیا؟ اور مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کی خلاف ورزی کر بیٹھے، تم کتنے نالائق وناشکر ہو کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت، اور میرے معجزات، اور فرعون کی لشکر سمیت تباہی اور اپنی نجات بچشم خود مشاہدہ کر چکے ہو، اتنی نعمتوں کی ناشکری تمہیں زیب نہیں دیتی، اور تمہارے لئے تباہ کن ضرور ہے، تم نے یہ کھیل جو کھیلا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے وعظ ونصیحتوں کا اس ناقدر شناس قوم نے ایک عجیب جواب دیا، جو سراسر احمقانہ ہے، وہ کہنے لگے کہ یہ جو کچھ ہم نے آپ سے وعدہ کر کے خلاف ورزی کی ہے یہ اپنے قصد واختیار سے نہیں کی، بلکہ سامری نے ہم سے کرائی، اگر ہم اپنے حال پر چھوڑ دیئے جاتے اور سامری یہ مکر وخیانت کی تزویر ہمارے سامنے انجام نہ دیتا تو ہم کبھی آپ کے وعدے کے خلاف نہ کرتے، اس کمبخت نے مکر وبے ایمانی کا ایسا جال بچھایا کہ ہم نہ اس کو روک سکے، اور نہ اپنا تحفظ کر سکے، ہم نے شعبدہ دیکھا اور شکار ہو گئے۔

﴿قَالُوۡا مَاۤ اَخۡلَفۡنَا مَوۡعِدَكَ بِمَلۡكِنَا﴾ ہم نے تیرے عہد وپیمان کا اپنے اختیار سے خلاف نہ کیا۔

﴿وَلٰـكِنَّا حُمِّلۡنَاۤ اَوۡزَارًا مِّنۡ زِيۡنَةِ الۡقَوۡمِ فَقَذَفۡنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلۡقَى السَّامِرِىُّ﴾ لیکن بات یہ ہوئی کہ ہم پر قوم فرعون کے زیوروں کے بوجھ لاد دیئے گئے تھے، اور کم عقلی کی وجہ سے ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہم ان کا کیا کریں، پس سامری کے کہنے سے ہم نے ان زیوروں کو آگ کے گڑھے میں ڈال دیا، وہ اس لئے کہ یہ زیورات ہم پر حلال نہ تھے، اور ہم ان کو اپنے اوپر بوجھ اور گناہ سمجھتے تھے، سامری نے ہمیں گناہ سے جان خلاصی کا یہ طریقہ سمجھایا کہ انہیں سپرد آتش کر کے گناہ سے بچ جاؤ، اور بوجھ سے خلاصی حاصل کرو۔ پھر جس طرح ہم نے زیورات کو آگ میں ڈالا تو سامری کے پاس جو تھا اس نے بھی آگ میں ڈالا۔

﴿فَاَخۡرَجَ لَهُمۡ عِجۡلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ﴾ پھر سامری نے ان کے لئے ان زیورات سے ایک دھڑ (مجسمہ) نکالا، یعنی بے روح جسم نکالا، جس میں سے بچھڑے کی سی آواز آتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ سوائے آواز کے اور کوئی صفت اس میں نہ تھی، اسی آواز نے ہمیں گمراہ کیا۔

﴿فَقَالُوۡا هٰذَاۤ اِلٰهُكُمۡ وَاِلٰهُ مُوۡسٰى ۙ فَنَسِىَ﴾ پھر سامری اور اس کے ساتھی یہ کہنے لگے کہ اے بنی

اسرائیل! تمہارا اور موسیٰ کا معبود تو یہ ہے، موسیٰ تو اپنے معبود کو بھول گئے، اور اس کی تلاش میں کوہ طور پر چلے گئے، اصل معبود تو ان کا یہ بچھڑا ہے، جس میں ان کا معبود حقیقی حلول کیا ہوا ہے۔

یہ لوگ کتنے ناداں اور گمراہ تھے کہ ایک جلیل القدر عظیم المرتبت پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کی باتوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات ظاہر کرتے تھے، اور ایک شعبدہ باز منافق سامری کی باتوں پر بغیر کسی حیلہ وحجت کے ساری ایمانی عظمتوں سے ہاتھ دھو کر شرک وکفر کے گڑھے میں گر گئے۔ اس گوسالہ پرستی کی زد سے صرف بارہ ہزار لوگ بچ گئے تھے، آگے ان کی حماقت وگمراہی کا بیان ہے:

﴿اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا﴾ پس کیا وہ لوگ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ مردہ بچھڑا نہ ان کی کسی بات کا جواب دے سکتا ہے؟ اور نہ ان کو وہ کسی نقصان اور نفع پہنچانے پر قادر ہے؟ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ کتنے احمق بیوقوف تھے؟ ایک مجسمہ کی آواز پر ایمان لائے اور اندھے بن کر یہ نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا نہ بول سکتا ہے، نہ کسی سوال کا جواب دے سکتا ہے، نہ دیکھ سکتا ہے، نہ کچھ سمجھ سکتا ہے، اور نہ کسی فائدہ ونفع اور نقصان پر قدرت رکھتا ہے، یہ تو فرعون سے بھی زیادہ عاجز ہے، فرعون جب اُلوہیت کا مدعی رہا تو یہی لوگ اس کی اُلوہیت کے منکر بنے، اور اپنے آپ کو انبیاء کرام علیہم السلام کی اولاد کہتے ہوئے فرعون کو گمراہ کہتے رہے، اور آج وہ اس قدر احمق، اندھے، بہرے اور گونگے بنے کہ ایک شعبدہ باز کے کہنے پر تمام ایمانی اقدار کو قربان کر گئے۔

❁ ❁ ❁

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ یٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِیْ وَاَطِیْعُوْٓا
اَمْرِیْ ۝۹۰ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَیْهِ عٰكِفِیْنَ حَتّٰی یَرْجِعَ اِلَیْنَا مُوْسٰی ۝۹۱ قَالَ یٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ
رَاَیْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۝۹۲ اَلَّا تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَیْتَ اَمْرِیْ ۝۹۳ قَالَ یَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْیَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ ۚ اِنِّیْ
خَشِیْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَیْنَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِیْ ۝۹۴

ترجمہ: اور بلاشبہ اس سے پہلے ہارون نے ان سے کہہ دیا تھا کہ اے میری قوم! اس کی وجہ سے تم فتنے میں ڈالے گئے ہو، بلاشبہ تمہارا رب رحمٰن ہے، سو تم میرا اتباع کرو، اور میرا حکم مانو ۝۹۰ وہ کہنے لگے کہ ہم ضرور ضرور اسی پر جمے رہیں گے جب تک ہمارے پاس موسیٰ واپس نہ آئے ۝۹۱ موسیٰ نے کہا کہ اے ہارون! جب تم نے انہیں دیکھا

کہ وہ گمراہ ہو گئے ۝٩٢ تو کس چیز نے تمہیں اس بات سے روکا کہ تم میرے پاس چلے آئے ہوتے؟ سو کیا تم نے میرے کہنے کے خلاف کیا؟ ۝٩٣ ہارون نے کہا: اے میرے ماں جائے! تم میری داڑھی اور میرا سر نہ پکڑو، بلاشبہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ آپ یوں کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفریق ڈال دی، اور میری بات کا انتظار نہ کیا ۝٩٤

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب طور پر تشریف لے گئے تھے تو حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنے پیچھے بطور خلیفہ چھوڑ گئے تھے، سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: ﴿وَقَالَ مُوسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِيْ فِيْ قَوْمِيْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ﴾ [الأعراف: ١٤٢] (اور موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا کہ: میرے پیچھے تم میری قوم میں میرے قائم مقام بن جانا، تمام معاملات درست رکھنا، اور مفسد لوگوں کے پیچھے نہ چلنا)۔ اور ان کے ذمہ بنی اسرائیل کی نگرانی سپرد فرما گئے تھے، جب ان لوگوں نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی تو ہارون علیہ السلام نے انہیں سختی سے منع کر کے متنبہ فرمایا، اور کہا:

﴿اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ﴾ تم اس کی وجہ سے فتنہ میں ڈالے گئے ہو، فتنہ سے مراد شرک ہے۔

﴿وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ﴾ اور اس میں شک نہیں کہ تمہارا ربّ رحمٰن ہے، اسے چھوڑ کر دوسری چیز کی پرستش میں لگنا فتنہ میں پڑنا ہے، میں جو بات تمہیں کہہ رہا ہوں اس کا اتباع کرو، اور اسے مانو، اور شرک سے فوراً تائب ہو جاؤ۔ لیکن یہ بدقسمت لوگ اپنے شوق ورغبت سے اس بچھڑے کے عاشق ودلدادہ ہو چکے تھے، ہارون علیہ السلام کی نصیحتوں پر نہ کوئی توجہ دی اور نہ کوئی التفات کیا، بلکہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ جواب دیدیا، اور کہنے لگے کہ ہم تو برابر اسی پر جمے بیٹھے رہیں گے یہاں تک کہ موسیٰ علیہ السلام واپس آجائیں۔

جب اللہ تعالیٰ شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو خبر دی کہ تمہاری قوم فتنہ میں پڑ گئی تو آپ علیہ السلام عجلت کے ساتھ واپس تشریف لائے، اور بڑے غضبناک پریشان کن کیفیت کے ساتھ آئے، پہلے قوم سے خطاب فرمایا، اور انہیں سختی سے تنبیہ کرنے کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام پر ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور یہ اظہار خفگی اتنا سخت تھا کہ حضرت ہارون علیہ السلام کی داڑھی اور سر کے بالوں کو پکڑ کر کھینچنے لگے، اور توریت شریف کی جو تختیاں لے کر آئے تھے ان کو بھی ڈال دیا، جس کی وجہ سے وہ ٹوٹ گئیں، اور کہا: اے ہارون! جب تم نے دیکھ لیا کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے تو اس سے کیا چیز

مانع تھی کہ تم مجھے خبر دیتے؟ تم نے میرا اتباع کیوں نہ کیا؟ اور میری نافرمانی کیوں کی؟ جب شرک کا ماجرا دیکھا تم میرے پاس چلے آتے۔

ہارون علیہ السلام نے جواب میں کہا کہ اے میری ماں کے بیٹے! (بھائی) میری داڑھی اور میرے سر کے بال نہ پکڑیں، مجھے اس بات کا ڈر رہا کہ آپ یوں فرمائیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفریق کردی، اور میری بات کا انتظار نہ کیا۔

یہاں سورۂ طٰہٰ میں ہے کہ ہارون علیہ السلام نے انہیں شرک سے منع کیا تو تھا، اور بتا دیا تھا کہ تم فتنہ میں پڑ گئے ہو، لیکن سختی فرمانا مناسب نہ جانا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آمد کا انتظار فرمایا، اور سورۂ اعراف میں یوں ہے: ﴿قَالَ ابْنَ اُمَّ اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِیْ وَ كَادُوْا یَقْتُلُوْنَنِیْ ﳲ فَلَا تُشْمِتْ بِیَ الْاَعْدَآءَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ﴾ [الأعراف: ۱۵۰] (ہارون نے کہا کہ: اے میرے ماں جائے! بات یہ ہے کہ قوم نے مجھے ضعیف سمجھ لیا، اور قریب تھا کہ مجھے قتل کر دیتی، لہٰذا آپ میرے ذریعہ دشمنوں کو خوش ہونے کا موقع نہ دیجئے، اور مجھے ظالموں کے ساتھ نہ کیجئے)۔

جب ہارون علیہ السلام نے یہ بات کہی تو موسیٰ علیہ السلام کو احساس ہوا اور اللہ تعالیٰ سے یوں دعا کی: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِیْ وَ لِاَخِیْ وَ اَدْخِلْنَا فِیْ رَحْمَتِكَ ﳲ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ [الأعراف: ۱۵۱] (اے میرے ربّ! مجھے اور میرے بھائی کو بخش دیجئے، اور ہمیں اپنی رحمت میں داخل فرمائیے، اور آپ (عزوجل تعالیٰ) سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لیس الخبر کالمعاینة**۔ یعنی خبر دیکھنے کی طرح نہیں (علم اور مشاہدہ برابر نہیں ہیں)، پھر آپ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے بطور مثال یوں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو طور پر پہلے خبر دی تھی کہ تمہاری قوم نے بچھڑے کی عبادت شروع کی ہے، لیکن موسیٰ علیہ السلام نے توریت کی تختیوں کو نہیں ڈالا، جب وہ قوم کے پاس آئے اور مشاہدہ کیا تو بے قابو ہو کر توریت شریف کی تختیوں کو ڈال دیا، جس کی وجہ سے وہ ٹوٹ گئیں۔ [مسند أحمد]

جب موسیٰ علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو توریت شریف کی تختیاں اٹھالیں، سورۂ اعراف میں ہے: ﴿وَ لَمَّا سَكَتَ عَنْ مُّوْسَى الْغَضَبُ اَخَذَ الْاَلْوَاحَ﴾ [الأعراف: ۱۵۴] (اور جب موسیٰ کا غصہ تھم گیا تو انہوں نے تختیاں

اٹھالیں)۔

مفسرین کرامؒ نے لکھا ہے کہ جب بنی اسرائیل میں بچھڑے کی پرستش کا فتنہ ظاہر ہوا تو اس وقت ان میں تین فرقے ہوگئے: ایک فرقہ ہارون علیہ السلام کے ساتھ رہا، ان کی اطاعت کی، گوسالہ پرستی سے دور رہا، اس جماعت کی تعداد بارہ ہزار بتائی جاتی ہے۔ دوسرا فرقہ وہ تھا جو زور شور سے گوسالہ پرستی میں غرق ہوگئے تھے، لیکن یہ لوگ یوں بھی کہتے تھے کہ جب موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لاکر منع فرمائیں گے تو ہم چھوڑ دیں گے۔ تیسرا فرقہ وہ تھا جو یوں کہتا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام بھی واپس آکر اسی کو معبود بنالیں گے، یہی ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا معبود ہے۔

جب ان آخری دو فرقوں کا جواب حضرت ہارون علیہ السلام نے سنا تو اپنے ساتھ بارہ ہزار ساتھیوں کو لے کر علیٰحدہ ہوگئے، لیکن وہیں رہتے سہتے رہے۔ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لائے تو انہوں نے اپنا عذر بتادیا کہ میں بارہ ہزار ساتھیوں کو لے کر باقی بنی اسرائیل کو چھوڑ کر کہیں دور چلا جاتا، یا ان سے مقابلہ کرتا، تو اس سے بنی اسرائیل میں تفرقہ پڑ جانے کا اندیشہ تھا، میں نے جتنا مناسب جانا اسی قدر کام کیا، ان کو بتا بھی دیا منع بھی کیا، اور عقیدۃً ان سے علیٰحدہ بھی ہوگیا، اپنے موحد ساتھیوں کو الگ کرلیا، مزید مقابلہ ومقاتلہ کو مصلحت کے خلاف سمجھا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کی رائے کو خطاء اجتہادی سمجھ کر چھوڑ دیا، اور معاف کیا، اور اللہ تعالیٰ شانہ سے اپنے لئے اور اپنے بھائی کے لئے دعاء مغفرت اور رحمت کی دعاء میں مشغول ہوگئے، پھر اصل مجرم ملعون سامری کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا:

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ
فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿٩٦﴾ قَالَ فَاذْهَبْ فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ۔
وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ
لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ﴿٩٧﴾ اِنَّمَآ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿٩٨﴾

ترجمہ: موسیٰ نے کہا: اے سامری! تیرا کیا حال ہے؟ ﴿٩٥﴾ اس نے کہا کہ میں نے وہ چیز دیکھی جو ان لوگوں نے نہیں دیکھی، سو میں نے فرشتہ کے نقش قدم سے ایک مٹھی اٹھالی، میں نے اس مٹھی کو ڈال دیا، اور میرے نفس نے مجھے یہی بات اچھی کرکے دکھائی ﴿٩٦﴾ موسیٰ نے کہا: بس تو چلا جا، سو تیرے لئے زندگی میں یہ سزا ہے کہ تو یوں کہتا پھرے

گا کہ: مجھے کوئی نہ چھوئے (ہاتھ نہ لگائے)، اور بلاشبہ تیرے لئے ایک وعدہ ہے جو ٹلنے والا نہیں ہے، اور تو اپنے معبود کو دیکھ لے جس پر تو جما ہوا تھا، ہم ضرور ضرور اسے جلا دیں گے، پھر اسے دریا میں اچھی طرح بکھیر دیں گے ۹۷ تمہارا معبود برحق اللہ تعالیٰ ہی ہے، جس کے علاوہ کوئی ایسا نہیں جس کی عبادت کی جائے، وہ اپنے علم سے تمام چیزوں کا احاطہ کئے ہوئے ہے ۹۸

معارف ومنازل

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور سے واپسی پر جب دیکھا کہ پوری قوم ایک بے جان بچھڑے کے مجسمہ پر سجدہ ریز ہے، اور بے تحاشا ایک گوسالہ پر ناچ رہی ہے، تو آپ علیہ السلام نے بڑے غصے میں اول اپنے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے عتاب فرمایا، جیسا کہ بیان ہوا، پھر اصل مجرم شرک کے بانی سامری کی طرف متوجہ ہوئے، اور فرمایا:

﴿قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ﴾ اے سامری! تو نے یہ نامعقول وکافرانہ حرکت کیوں کی؟ تمہارے پاس اس کے کیا اسباب تھے؟ اور تمہارا مقصد کیا تھا؟

﴿قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ﴾ سامری نے کہا: میں نے وہ چیز دیکھی جو اوروں نے نہیں دیکھی، سو میں نے فرستادہ خداوندی (جبریل امین علیہ السلام) کی سواری کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر خاک اٹھالی، پھر میں نے اس مشت خاک کو اس بچھڑے کے قالب کے اندر ڈال دی، تو وہ زندہ بچھڑے کی طرح آواز کرنے لگا، اسی طرح میرے نفس نے مجھے یہ بات بتائی، یعنی میرے نفس نے شیطان کے توسط سے مجھے یہ تدبیر سکھائی، چنانچہ میں نے اپنے نفس کے اتباع میں یہ طریقہ ایجاد کیا، اور لوگوں کو اس کی عبادت کی دعوت دی جو انہوں نے بخوشی قبول کر کے میرے بچھڑے کی پرستش شروع کی۔

وہ چیز جو سامری کو نظر آئی اور دوسرے لوگوں نے اسے نہیں دیکھا وہ یہ ہے کہ جب بنی اسرائیل دریا میں گھسے اور پیچھے سے فرعون مع اپنے لشکر کے ان کے تعاقب میں پہنچا، تو ایسے وقت میں جبریل علیہ السلام گھوڑی پر سوار تشریف لائے، ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ فرعون کے گھوڑے کو اپنی گھوڑی کے ذریعہ دریا میں ڈال دے، اس وقت سامری نے کسی دلیل سے، یا وجدان سے، یا کسی علامت سے سمجھ لیا کہ یہ جبریل علیہ السلام ہیں جو فرس حیات پر سوار ہے،

یہ سامری بڑا ہوشیار تھا اور ابتداء سے منافق اور بت پرست مشرک تھا، وہ ہر وقت کسی بڑے عمومی فساد کے منتظر تھا، پس رسول خداوندی علیہ السلام کی سواری کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر خاک اٹھا کر آئندہ کسی مقصد کے لئے اپنے پاس محفوظ رکھ دی، وہ جانتا تھا کہ اس مٹی میں حیات کا مادہ ہے، کیونکہ گھوڑے کا قدم جہاں جہاں زمین پر پڑتا تھا وہاں سبزہ پیدا ہوتا تھا۔

تو اس نے جس روز حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور تشریف لے گئے اپنا کام شروع کیا، اور یہ کام وہ پہلے سے سیکھا ہوا تھا، اور اسی مقصد کے لئے بے تابی سے انتظار کر رہا تھا، زیورات سے بچھڑے کو تیار کر کے یہ مٹی اس میں ڈال دی۔ حضرت شاہ عبدالقادر قدس سرہ فرماتے ہیں کہ سونا تو کافروں سے ملا ہوا مال تھا جو ان سے فریب سے لیا تھا، اس میں مٹی پڑی برکت کی، تو حق اور باطل مل کر ایک کرشمہ بن گیا کہ جاندار کی طرح روح اور آواز اس میں پیدا ہو گئی، ایسی چیزوں سے بہت بچنا چاہئے، اسی سے بت پرستی بڑھتی ہے۔ [موضح القرآن]

جب سامری نے قوم کے سامنے اس قسم کا کرشمہ پیش کیا تو لوگوں نے اس کی پرستش شروع کی، ان لوگوں کی ساری زندگی مصر میں گزری تھی، وہاں ہندوؤں کی طرح گائے کی عبادت کا رواج تھا، جس سے بنی اسرائیلی چونکہ مانوس تھے اس لئے بلا تامل شرک پر اتر آئے۔ اس کے علاوہ یہ لوگ چار پشتوں سے فرعون والوں کی غلامی میں رہے، اور ان پر غلامی ذہنیت کا غلبہ رہا، ابھی ابھی موسیٰ علیہ السلام نے انہیں آزادی دلائی، اور توحید کا سبق پڑھایا، یہ مسلم ہے کہ غلامی ذہنیت کے لوگ ایمان و توحید کے قبول کرنے سے قاصر رہتے ہیں، اور حریت کی تعلیمات سے بے بہرہ اور محروم رہتے ہیں۔

اس کا واضح ثبوت ہمارا برصغیر ہے کہ ستر سال ہوئے کہ ہم اپنے آقاؤں فرنگیون سے آزادی حاصل کرنے کے باوجود ابھی تک ان کے غلام بنے ہوئے ہیں، ایمان کا دعویٰ ہے مکہ و مدینہ پر، مگر دلدادہ اور گیت گاتے ہیں لندن کے، یہ لندن والے کون ہیں؟ یہ وہی بچھڑے پوجا کرنے والوں کی اولاد ہیں۔

اور سامری کون ہے؟ اس کے بارے میں دس بارہ اقوال ہیں، صحیح اور راجح یہی ہے کہ یہ بنی اسرائیلی ہے، مرتد اور منافق تھا، اس کا نام موسیٰ بن ظفر ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب فرعون بنی اسرائیلی بچوں کو قتل کراتا تھا تو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اسے تابوت میں بند کر کے وحی الٰہی (الہام) کے مطابق دریا میں ڈال دیا تھا، اسی طرح سامری کی والدہ نے اپنے بچے سامری کو ایک پہاڑی غار میں ڈال کر آئی کہ قتل سے محفوظ رہے، اللہ

تعالیٰ شانہ نے اپنی حکمت ومصلحت کی بنیاد پر حضرت جبریل علیہ السلام سے اس کی پرورش کرائی، یہاں تک کہ بڑے ہوکر غار سے باہر آیا، اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لاکر پھر مرتد ہوا اور کفر اختیار کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری قوم کو کافر بنایا۔ شاعر نے تجزیہ کرکے کہا:

إذا المرأ لم يُخلق سعيدًا تحيَرتْ ★ عقول مربيه وخاب المؤمِّل

فموسىٰ الذي رباه جبريل كافر ★ وموسىٰ الذي رباه فرعون مُرسَل

ترجمہ: جب کوئی شخص اصل پیدائش میں نیک بخت نہ ہو تو اس کے پرورش کرنے والوں کی عقلیں بھی حیران رہ جاتی ہیں، اور اس سے امید کرنے والا محروم ہوجاتا ہے، دیکھو! جس موسیٰ کو جبریل امین علیہ السلام نے پالا تھا وہ تو کافر ہوگیا، اور جس موسیٰ کو فرعون لعین نے پالا تھا وہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کا رسول بن گیا۔ [روح المعاني]

﴿قَالَ فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ﴾ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اچھا تیری سزا یہ ہے کہ تو دفع ہو، دور ہوجا، اور ہم میں سے نکل جا، کیونکہ دنیاوی زندگی میں تیرے قتل کا حکم نازل نہیں ہوا، البتہ اس دنیاوی زندگی میں تیری سزا یہ ہے کہ تو ہر وقت کہتا پھرے: "لَا مِسَاسَ" مجھے مت چھوؤ، ہاتھ نہ لگاؤ، مجھ سے دور رہو، میرے پاس نہ آؤ۔ یہ کتنی بڑی سزا ہے، اس کے بعد لوگ اس سے دور بھاگتے رہتے، اور وہ لوگوں سے بھاگتا رہتا تھا، وہ صحیح انسانی ہوش میں نہیں رہا، اگر کوئی اس کو چھو کر ہاتھ لگاتا تو دونوں کو سخت بخار چڑھ جاتا، اور تین دن تک بدن جلتا رہتا۔ بعض روایات میں ایک دن کا ذکر ہے۔

اسی طرح وہ بیوی بچوں سے بھی دور رہتا، اور وہ اس کو نزدیک نہیں چھوڑتے، تمام لوگوں میں اس کی حیثیت ختم ہوگئی، اور وہ ہمیشہ کے لئے عذاب میں مبتلا رہا، اور لوگ اس سے ملنا تو کیا بات کرنا بھی چھوڑ چکے۔

﴿وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ﴾ بلا شبہ اس دنیاوی سزا کے علاوہ تیرے لئے جو آخرت کا شدید ترین سزا ہے وہ تجھ سے ہرگز نہیں ٹلنے والی۔

﴿وَانْظُرْ اِلٰٓى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ۭ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي الْيَمِّ نَسْفًا﴾ اب تو اپنے معبود کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ کہ اس کا کیا حشر ہوگا، جس کا تو مجاور اور معتکف بنا ہوا تھا، ہم ضرور اس کو آگ میں جلا دیں گے، پھر اس کی راکھ کو دریا میں اڑا دیں گے، وہ اس طرح ختم ہوگا کہ نہ وہ رہے گا اور نہ اس کے آثار۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑے کو آگ میں ڈالا، وہ بجائے پگھلنے کے لکڑی کی طرح جل کر خاکستر ہوگیا، یہ آپ علیہ السلام کا

معجزہ تھا، پھر اس کی راکھ کو دریا میں بہادیا اور ختم کیا۔ اب فرمایا کہ معبود وہ ذات پاک حی وقیوم ہے جو ہمیشہ قادر توانا ہے، فرمایا:

﴿اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ﴾ تحقیق تمہارا معبود صرف اللہ تعالیٰ ہے، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا علم ہر چیز پر احاطہ کیا ہوا ہے، کائنات کا ہر ذرہ اس کی مخلوق ہے، اور اس کی تسبیح خوان ہے، اور اس کی وحدانیت پر گواہ ہے، اور وہ ہر ہر ذرہ کا خالق و مالک اور محافظ و نگران ہے، اس کا علم تمام ذرات پر محیط ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

دعا:

اے ہمارے مہربان ربّ! اپنی حمد و ثنا و تسبیح کے ساتھ ہمارا خاتمہ فرما۔ آمین

كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿٩٩﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ
فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿١٠٠﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿١٠١﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِى
الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿١٠٢﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿١٠٣﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ
بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿١٠٤﴾

ترجمہ: اسی طرح ہم آپ سے گزشتہ واقعات کی خبریں بیان کرتے ہیں، اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے ﴿٩٩﴾ جس شخص نے اس سے اعراض کیا سو بلا شبہ وہ قیامت کے دن بھاری بوجھ لادے گا (اٹھائے گا) ﴿١٠٠﴾ ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے، اور یہ بوجھ قیامت کے دن ان لوگوں کے لئے برا ہوگا ﴿١٠١﴾ جس روز صور پھونکا جائے گا، اور اس دن ہم مجرمین کو اس حالت میں جمع کریں گے کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی ﴿١٠٢﴾ وہ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہوں گے کہ تم لوگ صرف دس دن رہے ہو ﴿١٠٣﴾ ہم خوب جانتے ہیں جس چیز کے بارے میں وہ بات کریں گے، جبکہ ان میں سب سے زیادہ صحیح رائے رکھنے والا یوں کہے گا کہ تم تو بس ایک ہی دن ٹھہرے ہو ﴿١٠٤﴾

معارف ومنازل

حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا: جس طرح ہم نے موسیٰ علیہ السلام اور فرعون اور بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کا

بیان کیا، اسی طرح قرآن حکیم میں گزشتہ انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں اور دیگر عجائبات قدرت کے واقعات اور اخبارات کا بیان کرتے ہیں، اس لئے کہ ان واقعات کے بیان کرنے کے بہت سے فوائد ہیں: مثلاً آپ کی تسلی کرانا، اسی میں آپ کی نبوت پر دلائل اور رسالت کی صداقت ہے کہ آپ جب غیب کی باتیں بیان فرماتے ہیں تو یہ صرف وحی الٰہی سے معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح کفار و مشرکین مکہ کو بتانا ہوتا ہے کہ منکرین کا انجام برا ہے، یہ قرآن نصیحت نامہ اور ذکر ہے جو آپ پر نازل ہوا۔ اسی طرح یہ آپ کے لئے بھی باعث ذکر وشہرت ہے کہ قیامت تک اللہ تعالیٰ شانہ کے ذکر کے ساتھ آپ کا ذکر جاری رہے گا۔

اس قرآن پر عمل کرنے والے بلند و بالا مقامات پر فائز رہیں گے، اور جو لوگ انکار کریں گے وہ کفر و معاصی کے بوجھ کے نیچے ہمیشہ کے لئے دب جائیں گے، اور جب دوسری بار صور پھونکا جائے گا تو یہ منکرین زندہ ہو کر کفر و شرک کے بوجھ تلے دب جائیں گے، اور مختلف بولیاں بول کر سراسیمگی کے عالم میں جب آنے والی دائمی زندگی کا اور اس کے عذاب کا اندازہ لگائیں گے تو دنیاوی زندگی اور عیش وعشرت کی تمام خرمستیاں بھول جائیں گے، کبھی کہیں گے کہ ہم دنیا میں صرف دس روز رہے، کبھی ایک دن کہیں گے، اور کبھی ایک ساعت ایک گھنٹہ رہنے کی بات کریں گے۔ ﴿وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُقْسِمُ الْمُجْرِمُوْنَ ۙ مَا لَبِثُوْا غَيْرَ سَاعَةٍ﴾ [الروم:۵۵] (جس دن قیامت قائم ہو گی مجرمین اس دن قسم کھائیں گے کہ ہم دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ نہیں ٹھہرے)۔

سورۃ النازعات میں ارشاد ہے: ﴿كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا لَمْ يَلْبَثُوْۤا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا﴾ [النازعات: ۴۶] (جس روز یہ قیامت کو دیکھیں گے تو انہیں ایسا معلوم ہوگا گویا صرف ایک دن کے آخری حصہ میں یا اس کے اول حصہ میں رہے ہیں)۔ اور یہ احساس مختلف کافروں کو حسب مراتب کفر مختلف اوقات میں پیش آئے گا، لہٰذا کوئی تعارض نہیں۔ اور یہ بات معقول ہے کہ انسان پر جب ناقابل برداشت عذاب کا وُرود ہوگا، یا قیامت کے دائمی اوقات کا اندازہ ہوگا، تو دنیوی زندگی اگرچہ لمبی ہوگئی، مگر دائمی زندگی کے مقابلہ میں ایک گھڑی یا اس سے بھی کم معلوم ہوگی۔

ایک تیسری وجہ یہ بھی ہے کہ وہ یہ بات حسرت و افسوس اور ندامت کے طور پر کہیں گے کہ ہم کتنے ناسمجھ و بے عقل رہے جو ابدی زندگی کو ایک ساعت کی زندگی پر قربان کرلیا، آج ہمارا انجام کتنا برا ہوا، اور ہمارا سودا نا کارہ اور خسارہ میں رہا۔ فرمایا: ﴿فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ﴾ [البقرة:۱۶] (تو ان کی تجارت نے کوئی نفع نہیں کیا، اور نہ انہوں نے راہ پائی)۔

﴿كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا﴾ اسی طرح ہم تجھ سے واقعاتِ گزشتہ کی کچھ خبریں بیان کرتے رہتے ہیں، اور ہم نے تم کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے، یہ واقعات کا بیان بہت سے فوائد پر مشتمل ہے تاکہ آپ کی بصیرت اور علم میں اضافہ ہو، معجزات میں اضافہ ہو، اچھے اور برے ہر قسم کے لوگوں کا انجام معلوم ہو، آپ کی نبوت پر دلیل قائم ہو، وغیرہ۔

﴿مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۝١٠٠ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ۭ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۝١٠١﴾ جو لوگ اس سے اعراض کریں گے وہ قیامت کے دن بھاری بوجھ اپنے اوپر لادے ہوں گے، اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ رہیں گے، اور قیامت کے دن یہ بوجھ ان کے لئے بہت برا اور تباہ کن ہوگا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ عَلٰي ظُهُوْرِهِمْ ۭ اَلَا سَاۗءَ مَا يَزِرُوْنَ﴾ [الأنعام: ٣١] (اور وہ اپنے بوجھوں کو اپنی پیٹھوں پر اٹھائیں گے، خبردار! برے بوجھ ہیں جو وہ اٹھا رہے ہوں گے)۔

اور سورۂ طٰہٰ ہی میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ [طٰه: ١٢٤] (اور جس نے میری یاد سے اعراض کیا تو اس کے لیے تنگ زندگی ہوگی، اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے)۔

سورۂ نحل میں ارشاد ہے: ﴿لِيَحْمِلُوْٓا اَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ [النحل: ٢٥] (تاکہ وہ اپنے پورے بوجھوں کو قیامت کے دن اٹھائیں)۔ یہ اوزار اور بوجھ جس طرح کفر و شرک اور نفاق کے ہوسکتے ہیں اسی طرح دوسرے کبیرہ گناہوں کے بھی ہوسکتے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا راوی ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بالشت بھر کسی کی زمین پر قبضہ کیا قیامت کے دن اس کو سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔ [متفق علیہ]

یہ کتنا بڑا بوجھ ہوگا جس کے تصور سے انسان پگھل کر تباہ ہوجاتا ہے، اور لوگ اس معاملے میں اتنے دلیر نظر آتے ہیں کہ بالشت تو کیا وہ تو لوگوں کی میلوں بھر زمینوں پر قبضہ جما کر پرواہ تک نہیں کرتے ہیں۔

﴿يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَىِٕذٍ زُرْقًا﴾ جس دن صور میں پھونک ماری جائے گی اور ہم اس روز مجرموں کو اس حالت میں جمع کریں گے کہ ان کی آنکھیں نیلی ہوں گی، جب یہ لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو ان کے چہرے کالے اور آنکھیں نیلی ہوں گی، نیلی آنکھوں کو عرب لوگ بدنمائی اور بدصورتی و بدشکلی سے تعبیر

کرتے ہیں، دجال کی آنکھ کے بارے میں بھی یہی آیا ہے کہ اس کی آنکھ اندھی اور نیلی ہوگی، کَاَنَّھَا عِنَبَۃٌ طَافِیَۃٌ، انگور کی طرح سبز نیلی اور باہر نکلی ہوئی ہوگی جس سے پانی ٹپک کر بہتا ہوگا۔ [بخاري]

﴿یَتَخَافَتُوْنَ بَیْنَھُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا﴾ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہوں گے کہ تم لوگ صرف دس روز رہے ہوں گے، یعنی دنیاوی زندگی بہت جلدی گزر گئی، اور ظاہر ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی بہت جلدی گزر گئی، اور ظاہر ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیاوی زندگی کچھ بھی نہیں، اب انہیں افسوس ہوگا کہ چند لمحات کی زندگی پر مغرور ہو کر ابدی اور ابدالاباد کی زندگی ضائع کر دی۔

﴿نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُھُمْ طَرِیْقَۃً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا﴾ جس کی مدت کے متعلق وہ اپنے اندازے سے کہیں گے ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کتنی ہوگی، جبکہ ان میں سب سے صاحب الرائے یوں کہتا ہوگا کہ: نہیں، ہم تو ایک روز (قبر میں یا دنیا میں) رہے۔

﴿اَمْثَلُھُمْ طَرِیْقَۃً﴾ زیادہ جاننے والا، سمجھدار، اس قول کے قائل کو اللہ تعالیٰ نے زیادہ عقلمند قرار دیا، کیونکہ آخرت کے طول کے مقابلہ میں دنیوی مدت انتہائی کم ہے، اور اس مدت میں کمترین مدت کا اظہار ہے، پھر اس سے بہتر وہی قول ہوگا جس میں ایک گھڑی کا ذکر ہے، لیکن اگر واقعی اور حقیقی حال کو دیکھا جائے تو دنیوی مدت آخرت کے مقابلہ میں ایک سیکنڈ سے بھی کم ہے۔ واللہ اعلم

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر زمین کو آسمان تک رائی کے دانوں سے بھر دیا جائے، اور اللہ تعالیٰ ایسا پرندہ پیدا فرمائے جو سو سال کے بعد ایک دانہ اٹھائے، تو ہو سکتا ہے کہ یہ سارا ذخیرہ ختم ہو مگر آخرت کے ایام اس سے بھی زیادہ ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوں گے، یہ آخرت کی ابدی ہونے کی ایک مثال ہے، تو ظاہر ہے کہ پوری دنیاوی زندگی آخرت کے مقابلہ میں ایک سیکنڈ سے بھی کم ہے۔

وَیَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ یَنْسِفُھَا رَبِّیْ نَسْفًا ﴿١٠٥﴾ فَیَذَرُھَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰی فِیْھَا عِوَجًا
وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾ یَوْمَئِذٍ یَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِیَ لَا عِوَجَ لَہٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ
اِلَّا ھَمْسًا ﴿١٠٨﴾ یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ لَہٗ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ

أَيۡدِيهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِۦ عِلۡمًا ﴿١١٠﴾ وَعَنَتِ ٱلۡوُجُوهُ لِلۡحَيِّ ٱلۡقَيُّومِۖ وَقَدۡ خَابَ مَنۡ
حَمَلَ ظُلۡمًا ﴿١١١﴾ وَمَن يَعۡمَلۡ مِنَ ٱلصَّٰلِحَٰتِ وَهُوَ مُؤۡمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلۡمًا وَلَا هَضۡمًا ﴿١١٢﴾

ترجمہ: اور وہ لوگ آپ سے پہاڑوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں، سو آپ فرمادیجئے کہ میرا رب ان کو بالکل اڑادے گا﴿١٠۵﴾ پھر زمین کو ایک ہموار میدان بنادے گا﴿١٠٦﴾ اے مخاطب! تو اس میں کوئی ناہمواری اور کوئی بلندی نہیں دیکھے گا﴿١٠٧﴾ جس روز بلانے والے کا اتباع کریں گے اس کے سامنے کوئی ٹیڑھا پن نہیں ہوگا، اور رحمٰن کے لئے آوازیں پست ہوجائیں گی، سوائے مخاطب! تو پاؤں کی آہٹ کے سوا کچھ نہ سنے گا﴿١٠٨﴾ جس دن شفاعت نفع نہ دے گی مگر اسی کو جس کے لئے رحمٰن نے اجازت دی، اور جس کے لئے بولنا پسند فرمایا﴿١٠٩﴾ وہ جانتا ہے جو ان کے پہلے احوال تھے یا پچھلے احوال، اور ان لوگوں کا علم اس کا احاطہ نہیں کرسکتا﴿١١٠﴾ اور تمام چہرے حی وقیوم کے لئے جھک جائیں گے، اور جو شخص ظلم اٹھا کر لے گیا ہو وہ ناکام ہوگا﴿١١١﴾ اور جس شخص نے مؤمن ہونے کی حالت میں اچھے عمل کئے سواسے کسی طرح کے ظلم کا، اور کسی کمی کا اندیشہ نہ ہوگا﴿١١٢﴾

معارف ومنازل

علامہ بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ بنی ثقیف میں سے ایک شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا کہ جب قیامت قائم ہوگی تو پہاڑوں کا کیا ہوگا؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَيَسۡـَٔلُونَكَ عَنِ ٱلۡجِبَالِ﴾ جس میں بتادیا کہ پہاڑوں کی بڑائی اور بلندی اور سختی اور طول وعرض اور پھیلاؤ کی کچھ بھی حیثیت نہیں رہے گی، وہ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، اور روئی کی طرح یا بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے، اور گردوغبار بن کر ختم ہوجائیں گے۔ سورۂ واقعہ میں فرمایا: ﴿وَبُسَّتِ ٱلۡجِبَالُ بَسًّا ﴿٥﴾ فَكَانَتۡ هَبَآءً مُّنۢبَثًّا ﴿٦﴾﴾ [الواقعۃ] (اور پہاڑوں کو پیس کر چورا کردیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ بکھرا ہوا غبار بن کر رہ جائیں گے۔)۔ جبکہ زمین کو سخت زلزلہ آئے گا، اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہوجائیں گے، پھر وہ پراگندہ غبار کی طرح ہوں گے۔

اور سورۃ القارعہ میں فرمایا: ﴿وَتَكُونُ ٱلۡجِبَالُ كَٱلۡعِهۡنِ ٱلۡمَنفُوشِ﴾ [القارعۃ:۵] (اور پہاڑ ایسے ہوجائیں گے جیسے دھنی ہوئی رنگین اون ہو)۔ چونکہ پہاڑ بھی اون کی طرح مختلف رنگ کے ہیں جیسا کہ سورۂ فاطر میں

ہے، اس لئے ان کو رنگین اون کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ اب زمین کے متعلق ارشاد ہے:

﴿فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ﴿١٠٦﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَآ اَمْتًا ﴿١٠٧﴾﴾ اور اللہ تعالیٰ زمین کو اس حال میں کردے گا کہ وہ ہموار میدان ہوگی، اس میں ناہمواری اور پستی اور بلندی نہیں ہوگی۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ زمین روٹی کی طرح ہوگی، نہ اس میں گہرائی اور پستی ہوگی، اور نہ بلندی۔ پہاڑ جب ختم ہوں گے تو بلندی بھی ختم اور ہر قسم کی وادی اور ٹیلے ہموار ہو جائیں گے۔

﴿يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا عِوَجَ لَهٗ﴾ جس دن پہاڑوں کی یہ حالت ہوگی جس کا ذکر اوپر ہوا، اس دن تمام لوگ بلانے والے (حضرت اسرافیل علیہ السلام) کی آواز کے پیچھے چل دیں گے۔ ﴿لَا عِوَجَ لَهٗ﴾ اس کے سامنے کوئی ٹیڑھا پن نہیں رہے گا، یعنی جدھر سے فرشتہ آواز لگائے، یا جہاں بلائے جائیں گے سیدھے تیر کی طرح ادھر دوڑے جائیں گے، نہ بلانے والے کی بات ٹیڑھی ہوگی، اور نہ دوڑنے والوں میں کچھ ٹیڑھا پن رہے گا۔

کاش یہ لوگ اگر دنیا میں اسی طرح سیدھے ہوتے تو کام بن جاتا، اس کی آواز کے خلاف کوئی بھی شخص دوسری راہ اختیار نہ کر سکے گا، پکارنے والے کی آواز کے پیچھے چلنا ہی ہوگا، اور میدان حشر میں جمع ہونا ہی پڑے گا۔ یہ اجتماع کسی کی مرضی کا نہ ہوگا، بلکہ کن فیکون کا حصہ ہوگا۔

﴿وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا﴾ اور ساری آوازیں رحمٰن جل جلالہ کے سامنے (اس کی ہیبت کی وجہ سے) دب جائیں گی، پس اے مخاطب! تجھے پاؤں کی آہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔ داعی حضرت اسرافیل علیہ السلام میدان حشر کی طرف سب کو بلائیں گے، اور صخرۂ بیت المقدس پر کھڑے ہو کر پکاریں گے: اے بوسیدہ ہڈیو! اور اے ریزہ ریزہ کھالو! اور ٹوٹے بالو! تم کو اللہ تعالیٰ جمع ہونے کے لئے حکم دیتا ہے، سب آجاؤ۔ [رواہ ابن عساکر عن زید بن جابر]

همس کے معنی ہیں: خفیف اور پست آواز، پاؤں کی آہٹ۔ میدان محشر بڑا سخت اور نہایت ہولناک منظر ہوگا، مجال نہیں کہ وہاں کوئی بولنے کی جرأت کرے، ساری خلقت پریشانی اور بے انتہا رنج وغموں میں چور چور ہو کر تباہی کے دہانے کھڑی ہوگی، کسی انسان کے منہ سے کوئی لفظ صادر نہ ہوگا، دہشت میں ڈوبے ہوئے ہوں گے۔

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا﴾ اس دن (کسی کو کسی کی) سفارش نفع نہ دے گی، مگر ایسے شخص کے واسطے جس کیلئے رحمٰن سبحانہ نے اجازت دیدی ہو، اور اس شخص کیلئے بولنا پسند

کرلیا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس ہولناک دن میں مصیبت سے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہ ہوگا، اور کسی قسم کی شفاعت کام نہ دے گی، بلکہ شفاعت کرنے والا کوئی نہ ہوگا، ہاں! جس کسی کو کسی کے لئے شفاعت کرنے کی اجازت ہوگی، اور جس کے لئے اللہ تعالیٰ بولنا پسند فرمائے گا، اس کے حق میں شفاعت نافع ہوگی، اور شفاعت کرنے والے کو شفاعت کے لئے اجازت ہوگی۔

آیت الکرسی میں فرمایا: ﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾[البقرۃ:۲۵۵] (وہ کون ہے جو اللہ کے ہاں شفارش کرے، مگر اس کی اجازت سے؟)۔

سورۃ النبأ میں فرمایا: ﴿لَّا یَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾[النبأ:۳۸] (بات نہیں کرسکیں گے، مگر وہ جس کو رحمٰن نے اجازت دی ہو، اور وہ ٹھیک بات کرے گا)۔ اس روز شفاعت کرنے والے بھی مخصوص لوگ ہوں گے، اور جن کے لئے شفاعت کی اجازت ملتی ہے وہ بھی مخصوص لوگ ہوں گے، کفار و مشرکین، منافقین اور ملحدین کے لئے کوئی شفاعت نہیں ہوگی، رہا مؤمنین کا مسئلہ، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کی اجازت پر موقوف ہے۔ اور بعض جرائم اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ سزا کاٹے بغیر نہ ان کی مغفرت ہوگی، اور نہ ہی شفاعت کام آئے گی، اللہ تعالیٰ کی پناہ۔

﴿یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا﴾ وہ ان سب کے اگلے پچھلے احوال کو جانتا ہے، اور اس کو ان کا علم احاطہ نہیں کرسکتا ہے۔ یعنی سفارش کرنے والوں اور جن کی سفارش ہوگی اللہ تعالیٰ ان کے تمام احوال سے باخبر ہے، اور لوگوں کا علم اللہ تعالیٰ کے معلومات کا احاطہ نہیں کرتا، اور نہ کرسکتا ہے۔

﴿وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ﴾ اور اس روز تمام چہرے حی و قیوم کے سامنے جھکے ہوں گے، ساری خلقت پر خوف طاری رہے گا، کوئی شخص پریشانی سے خالی نہ ہوگا، وہ الگ بات ہے کہ کچھ لوگ وہ ہوں گے جن کے متعلق فرمایا: ﴿لَا یَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ هٰذَا یَوْمُكُمُ الَّذِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ [الأنبیاء:۱۰۳] (ان کو سب سے بڑی پریشانی غمگین نہیں کرے گی، اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے کہ یہ تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا)۔

ان کے علاوہ کچھ اور مخصوص لوگ ہوں گے جنہوں نے مخصوص اعمال انجام دیئے ہوں گے، جن کی بدولت وہ ہر رنج و پریشانی سے محفوظ ہوں گے، اور اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں بڑے اطمینان سے بیٹھے ہوئے ہوں گے۔

﴿وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا﴾ اور وہ شخص ہر طرح ناکام رہے گا جو ظلم (شرک) لے کر آئے گا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یہاں ظلم سے مراد شرک ہے، اور مشرک کے لئے کسی قسم کی کامیابی اور نجات ممکن نہیں، اور وہ خسارے میں رہے گا۔

﴿وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا﴾ اور جو لوگ مؤمن ہوتے ہوئے نیک اعمال انجام دیں گے سو ان کو نہ کسی زیادتی کا اندیشہ ہوگا، اور نہ کمی کا، ان کو اپنے اعمال کا پورا اجر وثواب ملے گا، اور وہ ہر طرح کے نقصان سے محفوظ رہیں گے۔ سورۂ نساء میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ [النساء: ٤٠] (تحقیق اللہ تعالیٰ شانہ ذرہ بھر ظلم نہیں فرمائے گا، اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو چند در چند زیادہ کرے گا، اور اپنے پاس سے بڑا ثواب عطا فرمائے گا)۔

اور سورۂ جن میں فرمایا: ﴿فَمَنْ يُّؤْمِنْ بِرَبِّهٖ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَّلَا رَهَقًا﴾ [الجن: ١٣] (سو جو شخص اپنے ربّ پر ایمان لایا سو اسے کسی کمی کا اور کسی فروگزاشت کا اندیشہ نہ ہوگا)۔

﴿وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ کی قید ہر جگہ ملحوظ ہے، کیونکہ سارے اعمال کے لئے ایمان شرط ہے، اور بغیر ایمان کے کوئی عمل قابل قبول نہیں، اسی بنیاد پر کافروں کو ان کے اچھے اعمال کا نہ بدلہ ملے گا، نہ اجر وثواب، البتہ انہیں ان کے نیک اعمال کا ثواب بشکل مال، اولاد، صحت وخوشحالی دنیا ہی میں ملے گا، جبکہ آخرت میں ان کا کوئی نصیب نہ ہوگا۔

وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ
اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿١١٣﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ
مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿١١٤﴾

ترجمہ: اور اسی طرح ہم نے اسے عربی میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے، اور اس میں طرح طرح سے وعید بیان کی ہے، تاکہ وہ لوگ ڈر جائیں، یا یہ قرآن ان کے لئے کسی قدر سمجھ پیدا کردے ﴿١١٣﴾ سو اللہ تعالیٰ برتر ہے، بادشاہ ہے، حق ہے، اور آپ قرآن میں اس سے پہلے جلدی نہ کیجئے کہ اس کی وحی پوری کردی جائے، اور آپ دعا کیجئے کہ اے میرے ربّ میرا علم اور بڑھادے ﴿١١٤﴾

معارف ومنازل

قیامت کا ذکر فرمانے کے بعد اب قرآن مجید کے بارے میں، اسی طرح اخذ وحی کے بارے میں سرور عالم ﷺ کی راہنمائی اور تعلیم کا بیان ہو رہا ہے۔ اول تو یہ فرمایا کہ یہ قرآن ہم نے عربی بنا کر نازل کیا ہے، جب یہ عربی ہے تو اس کے اوّلین مخاطبین کو بھی اعتراض نہیں ہے، اور یہ لوگ اہل لسان ہو کر اس کو سمجھتے بھی ہیں، اور اس کی فصاحت وبلاغت کو جانتے بھی ہیں، تو پھر ایمان لانے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ہم نے اس میں طرح طرح سے وعید بیان کی ہے تاکہ وہ ڈر جائیں، اور ایمان لے آئیں، یا اگر پوری طرح نہ ڈریں تو قرآن کے ذریعہ ان میں کچھ سمجھ اور شعور پیدا ہو جائے، اور رفتہ رفتہ شاید وہ ایمان لانے پر آمادہ ہو جائیں، اور کفر کو چھوڑ دیں۔

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ﴾ سو اللہ تعالیٰ برتر ہے، بادشاہ ہے، حق ہے، اس کے کلام پر ایمان لانا فرض ہے، اگر کوئی شخص ایمان نہ لائے تو یہ اس کی اپنی بدبختی ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، کیونکہ وہ کسی کے ایمان اور نیک اعمال کا محتاج نہیں، وہ حقیقی بادشاہ ہے، وہ حق ہے، اور اس کا کلام بھی حق ہے، اور جس ذات پر کلام کا نزول ہوا ہے وہ بھی حق ہے، اور اس کتاب کے تمام مضامین واحکام اور مسائل سب برحق ہیں۔

تیسری بات یہ ہے کہ سرور عالم ﷺ کو اخذ وحی کے متعلق خطاب اور تعلیم ہے کہ جب آپ پر قرآن تدریجاً نازل ہوا کرے تو آپ پہلے خوب اچھی طرح آخر تک سن لیں، وحی پوری ہونے سے پہلے اس ڈر سے کہ کہیں بھول نہ جائیں جلدی نہ کریں، اور فرشتے کے ساتھ پڑھا نہ کریں، بلکہ کان لگا کر سنا کریں۔

چونکہ آپ ﷺ جبریل امین علیہ السلام کے ساتھ پڑھتے تھے، اور بھولنے کے اندیشہ کی وجہ سے ایسا کرنے میں تعب محسوس کرتے تھے، اس لئے ارشاد فرمایا کہ آپ جلدی نہ کریں، اور بھولنے کا اندیشہ نہ کریں، ہم آپ کو ضرور یاد کرائیں گے، اور معانی ومطالب سمجھائیں گے۔ اسی کو سورۂ قیامہ میں فرمایا: ﴿لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ؀ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ؀ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ؀ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ؀﴾ [القیمۃ] (یعنی اے پیغمبر! آپ نزول قرآن کے ساتھ اپنی زبان نہ ہلایئے تاکہ آپ اس کو جلدی جلدی لیں، ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کر دینا، اور اس کا پڑھوا دینا، اور پورے مطالب سمجھا دینا، تو جب ہم اس کو پڑھا کریں یعنی فرشتہ پڑھ کر آپ کو سنائے گا تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے، پھر آپ کی زبان پر سے بیان کرا دینا ہمارے ذمہ ہے)۔

مطلب یہ ہے کہ جب جبریل علیہ السلام کے واسطے سے ہماری طرف سے وحی آئے تو آپ غور سے سنیں، اور دہرانے میں جلدی نہ کریں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ آپ مشقت نہ اٹھائیں، پوری وحی سن لیں، پھر اس کو دہرائیں۔

اس بات کا تعلق بالکل ابتدا نزول وحی کے ساتھ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ کسی استاذ سے پڑھا، اور نہ کسی سے کچھ سیکھا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ معلوم تک نہ تھا کہ معلم جب پڑھاتا ہو تو متعلم کو غور سے سن کر خاموش رہنا چاہئے، اور ساتھ ساتھ نہیں پڑھنا چاہئے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبریل علیہ السلام کے ساتھ پڑھنا شروع کیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو منع کیا گیا، اور یہ فرمایا کہ آپ اپنے پروردگار سے یہ دعا کیا کریں:

﴿وَقُل رَّبِّ زِدْنِي عِلْمًا﴾ اے میرا رب! میرا علم اور بڑھا دیجئے۔ اس کے عموم میں آگے مزید وحی آنے کا بھی سوال آ گیا، اور قرآن کریم میں جو کچھ علوم و معارف اور اسرار و رموز ہیں ان کا اور ان کے علاوہ دیگر علوم جن سے اللہ تعالیٰ شانہ کی معرفت حاصل ہو ان کا بھی سوال ہو گیا۔ علوم الٰہیہ کی انتہاء نہیں ہے، اس وقت قرآن حکیم کی تین لاکھ سے زائد تفاسیر مختلف زبانوں میں دنیا میں موجود ہیں، مگر قرآنی عجائبات کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہے۔ ان تفاسیر میں ایسی ایسی تفاسیر بھی ہیں جو ہزاروں جلدوں میں ہیں، اور ہر جلد ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ نیز کتب احادیث وفقہ اور دیگر علوم دینیہ کی نہ حد ہے اور نہ ہی انتہاء، مسلمانوں کو چاہئے کہ ہمیشہ زیادہ سے زیادہ علم حاصل ہونے کی دعا کیا کریں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک علم باعمل کا مرتبہ و مقام تمام اعمال اور طاعات سے زیادہ ہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کسی خیر کے سننے سے مؤمن کا پیٹ نہیں بھر سکتا، یہاں تک کہ اس کا منتہیٰ جنت میں ہو گا۔ [مشکوٰۃ]

علم دین علم قرآن وحدیث وہ عظیم قیمتی سرمایہ ہے جس کے انوار و برکات کا جب میدان محشر میں ظہور ہو گا، اور اس کے نورانی حاملین کو عرش عظیم کے سایہ میں مشک و عنبر کستوریوں کے ٹیلوں پر بٹھایا جائے گا، اور جن لوگوں نے دنیا میں ان وارثان انبیاء علیہم السلام کو حقارت کی نظر سے دیکھا ہو گا، اور یہود و نصاریٰ کے علم کو اپنا کر قرآن وحدیث کے علوم پر دنیاوی علوم کو ترجیح دے کر علوم نبوت کو حقیر سمجھا ہو گا، ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، اور انہیں اندھا اور نابینا اٹھایا جائے گا۔ ﴿وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ﴾ [طٰہٰ: ۱۲۴] (اور ہم قیامت کے دن اس کو اندھا اٹھائیں گے)۔

وَلَقَدۡ عَهِدۡنَآ إِلَىٰٓ ءَادَمَ مِن قَبۡلُ فَنَسِيَ وَلَمۡ نَجِدۡ لَهُۥ عَزۡمٗا ﴿١١٥﴾ وَإِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلَٰٓئِكَةِ ٱسۡجُدُواْ
لِأٓدَمَ فَسَجَدُوٓاْ إِلَّآ إِبۡلِيسَ أَبَىٰ ﴿١١٦﴾ فَقُلۡنَا يَٰٓـَٔادَمُ إِنَّ هَٰذَا عَدُوّٞ لَّكَ وَلِزَوۡجِكَ فَلَا يُخۡرِجَنَّكُمَا
مِنَ ٱلۡجَنَّةِ فَتَشۡقَىٰٓ ﴿١١٧﴾ إِنَّ لَكَ أَلَّا تَجُوعَ فِيهَا وَلَا تَعۡرَىٰ ﴿١١٨﴾ وَأَنَّكَ لَا تَظۡمَؤُاْ فِيهَا وَلَا تَضۡحَىٰ ﴿١١٩﴾
فَوَسۡوَسَ إِلَيۡهِ ٱلشَّيۡطَٰنُ قَالَ يَٰٓـَٔادَمُ هَلۡ أَدُلُّكَ عَلَىٰ شَجَرَةِ ٱلۡخُلۡدِ وَمُلۡكٖ لَّا يَبۡلَىٰ ﴿١٢٠﴾ فَأَكَلَا مِنۡهَا
فَبَدَتۡ لَهُمَا سَوۡءَٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخۡصِفَانِ عَلَيۡهِمَا مِن وَرَقِ ٱلۡجَنَّةِۚ وَعَصَىٰٓ ءَادَمُ رَبَّهُۥ فَغَوَىٰ ﴿١٢١﴾
ثُمَّ ٱجۡتَبَٰهُ رَبُّهُۥ فَتَابَ عَلَيۡهِ وَهَدَىٰ ﴿١٢٢﴾ قَالَ ٱهۡبِطَا مِنۡهَا جَمِيعَۢاۖ بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوّٞۖ
فَإِمَّا يَأۡتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدٗى فَمَنِ ٱتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشۡقَىٰ ﴿١٢٣﴾

ترجمہ: اور اس سے پہلے ہم نے آدم کو حکم دیا، سو وہ بھول گئے، اور ہم نے ان میں پختگی نہ پائی ﴿١١٥﴾ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کے لئے سجدہ کرلو تو ان سب نے سجدہ کیا، مگر ابلیس نے انکار کیا ﴿١١٦﴾ سو ہم نے کہا: اے آدم! بلاشبہ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، سو ایسا نہ ہو کہ تم دونوں کو جنت سے نکال دے، سو تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے ﴿١١٧﴾ بلاشبہ تمہارے لئے وہاں یہ بات ہے کہ تم نہ اس میں بھوکے رہو گے اور نہ ننگے رہو گے ﴿١١٨﴾ اور نہ وہاں تم پیاسے رہو گے اور نہ تمہیں دھوپ لگے گی ﴿١١٩﴾ شیطان نے ان کی طرف وسوسہ ڈالا، وہ کہنے لگا کہ اے آدم! کیا میں تمہیں ہمیشگی والا درخت اور ایسی بادشاہی نہ بتادوں جس میں کبھی ضعف نہ آئے؟ ﴿١٢٠﴾ سو ان دونوں نے اس میں سے کھالیا، سو ان کی شرم کی جگہیں ایک دوسرے کے سامنے کھل گئیں، اور وہ دونوں اپنے اوپر جنت کے پتے چپکانے لگے، اور آدم نے اپنے ربّ کی نافرمانی کی، سو وہ غلطی میں پڑ گئے ﴿١٢١﴾ پھر ان کے ربّ نے انہیں چن لیا، سو ان کی توبہ قبول فرمائی، اور انہیں ہدایت پر قائم رکھا ﴿١٢٢﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم دونوں یہاں سے اتر جاؤ، تم میں بعض بعض کے دشمن ہوں گے، سو اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے تو جس نے میری ہدایت کا اتباع کیا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی ہوگا ﴿١٢٣﴾

معارف ومنازل

حضرت آدم اور حضرت حواء علیہما السلام کا قصہ سورۂ بقرہ، سورۂ اعراف، سورۂ حجر اور سورۂ بنی اسرائیل میں گزر چکا ہے۔ اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کو حکم دیا تھا کہ فلاں درخت کے پاس نہ جانا، اور ساتھ یہ بھی فرمایا تھا کہ شیطان تمہارا دشمن ہے، اس کی بات ہرگز نہ ماننا، اور اس خاص درخت کے علاوہ پوری جنت میں آزادی اور فراخی

کے ساتھ کھاؤ پیو، تم آزاد ہو۔ لیکن وہ پابندی اور پختگی کے ساتھ عمل کرنا بھول گئے، اور انہیں غفلت ہوگئی۔ پہلی آیت میں اجمال ہے، اور آئندہ آیات میں واقعہ کی تفصیل ہے۔

فرمایا: ہم نے فرشتوں کو حکم دیا تھا کہ تم حضرت آدم علیہ السلام کا سجدہ کرو، ان سب نے سجدہ کیا، لیکن ابلیس نے سجدہ نہ کیا، اور حکم ماننے سے انکار کرلیا، اور کبر وغرور کے ساتھ کٹ حجتی کر کے کہا کہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں، اور یہ مٹی سے، لہٰذا میں افضل ہوا، اور جو افضل ہے وہ غیر افضل کا سجدہ کیوں کرے؟ اور شیطان کا محض سجدہ سے انکار اس کا جرم نہیں، بلکہ اس نے کبر کے ساتھ حکمِ عدولی بھی کی، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں نہایت گستاخانہ لہجہ میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو خلاف حکمت ومصلحت بھی بتایا، اور اپنی افضلیت کے دعویٰ کے ساتھ مناظرہ شروع کیا، اور پوری انسانیت کو گمراہ کرنے کی قسم بھی کھائی۔

جب شیطان نے کھلم کھلا چیلنج کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو شیطان کی دشمنی اور انتقام سے خبر دار فرمایا کہ یہ تمہارے پیچھے لگ کر تمہیں یہاں سے نکلوا دے گا، تم ہرگز اس کے کہنے میں نہ آنا، اور نہ فَتَشْقٰى تم مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ یہاں جنت میں آرام سے رہو، زندگی کی تمام خوشحالیاں تمہیں حاصل رہیں گی، اور یہاں سے نکل کر کہیں چین وسکون نہیں پاؤ گے۔ چونکہ شیطان کا مصمم ارادہ وعمل یہی تھا کہ آدم علیہ السلام اور ان کی ذریت کو ناکام کرنا ہی ہے، اس کا مشن وہدف یہی تھا، اس لئے ان کے پیچھے لگا، اور کہا کہ دیکھو کہ اس درخت کے کھانے سے جو تمہیں منع کیا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اسے کھائے گا وہ یہاں سے کبھی نہیں نکالا جائے گا، اور اس کے کھانے سے تم دونوں فرشتے ہوجاؤ گے، اور ہمیشہ یہاں آرام وعیش کے ساتھ رہو گے، جیسے سورۂ اعراف میں فرمایا: ﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ۝۲۰ وَقَاسَمَهُمَاۤ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ۝۲۱﴾ [الأعراف] (شیطان دونوں سے کہنے لگا کہ تمہارے ربّ نے تم دونوں کو اس درخت کے کھانے سے اور کسی سبب سے منع نہیں فرمایا مگر محض اس وجہ سے کہ تم دونوں اس کو کھا کر کہیں فرشتے نہ ہوجاؤ، یا کہیں ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ ہوجاؤ، اور شیطان نے دونوں کو قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں)۔

چونکہ واقعی ممانعت کے وقت آپ علیہ السلام کے لئے فرشتہ بننا اور ابدی زندگی مناسب حال نہ تھا، اور اب حالت میں ترقی ہوکر مناسب بن گیا، وہ ممانعت اب باقی نہیں، اور خوب قسم کھا کر اپنی دلی ہمدردی اور مکمل خیر خواہی کا اظہار کر کے انہیں پھسلا دیا۔ ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا﴾ [طٰہٰ: ۱۱۵] (یعنی

البتہ تحقیق ہم نے پہلے ہی آدم سے عہد لے لیا تھا کہ اس درخت سے نہ کھانا، اور یہ کہ شیطان آپ کا ازلی دشمن ہے، پس وہ ہمارے اس عہد کو بھول گئے، اور شیطان کے قسم کھانے سے دھوکہ کھا گئے، اور ہم نے ان میں عزم و پختگی نہ پائی، عہد کی حفاظت نہ کر سکے، اور عہد کو بھول گئے، اور نسیان میں مبتلا ہوئے)۔

قصداً وارادۃً ان سے یہ صورت واقع نہیں ہوئی، بلکہ نسیان اور خطاءً یہ سب کچھ ہوا۔ عزم کے معنی لغت میں مضبوطی اور پختگی کے بھی آتے ہیں، اور قصد وارادہ کے بھی آتے ہیں، اس لئے آیت میں دونوں معنی درست ہیں۔

اصل واقعہ یہ ہے: ﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى﴾ کہ جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ ہم نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے، سو تم اس کے لئے سجدۂ تعظیم وتکریم بجالاؤ، تا کہ اس کی تعظیم وبرتری سب پر ثابت ہو۔ انبیاء سابقین علیہم السلام کی شریعتوں میں سجدۂ تعظیمی غیر اللہ کے لئے جائز تھا، اور سجدۂ تعبدی حرام تھا، جبکہ ہماری شریعت میں سجدۂ عبادت اور سجدۂ تعظیمی دونوں غیر اللہ کے لئے مطلقاً حرام ہیں، پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے جوانہوں نے صاف انکار کیا۔

﴿فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى﴾ پس ہم نے آدم سے کہا: بلاشبہ یہ تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے، کہیں تم دونوں کو جنت سے نہ نکلوادے، یہ تمہارا بدخواہ اور دشمن ہے، یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ تم دونوں یہاں جنت میں خوش وخرم چین سے رہو، بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تم دونوں یہاں سے نکل کر دنیا کی مشقتوں میں پڑ جاؤ، دیکھو:

﴿اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى﴾ جنت میں تیرے لئے راحتیں اور سہولتیں ہیں، یہاں نہ کبھی تو بھوکا رہے گا اور نہ ننگا۔ ﴿وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى﴾ اور یہ کہ نہ تو اس میں پیاسا ہوگا اور نہ دھوپ کی تکلیف اٹھائے گا۔ غرض یہ کہ کھانے اور پینے اور غذا اور قیام وطعام اور لباس ورہائش کے سب آرام تجھ کو یہاں حاصل رہیں گے، اگر یہاں سے نکالے گئے تو پریشانیوں میں مبتلا ہوں گے۔

﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى﴾ پس شیطان نے ان کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا: اے آدم! کیا میں تم کو ہمیشہ رہنے کا درخت نہ بتلادوں؟ کہ جو کوئی اس سے کھاوے تو کبھی نہ مرے، اور یہاں سے کبھی نہ نکلے، اور کیا میں تم کو ایسی بادشاہت اور سلطنت نہ بتلادوں کہ جو کبھی پرانی اور کمزور نہ ہو؟ اور جس پر کبھی زوال نہ ہو۔ یعنی اے آدم! اگر تو اس درخت (شجرۃ الخلد) سے کھائے گا تو ہمیشہ

زندہ رہے گا، اور تیری سلطنت پر کبھی زوال نہیں آئے گا۔

﴿فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۚ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى﴾ پس دونوں نے اس درخت سے کھالیا، چنانچہ کھاتے ہی دونوں کے ستر ایک دوسرے کے سامنے ظاہر ہو گئے، دائمی عیش وعشرت کے شوق نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھلا کر انہیں بے ستر کر کے جنتی لباس ان سے اتروا لئے، اور گھبرا کر اپنے اوپر جنت کے درختوں کے پتے چپکانے لگے، اور بڑے پریشان ہو گئے۔ اس طرح ابلیس کے فریب میں آ کر شجرۂ ممنوعہ کو شجرۃ الخلد سمجھ بیٹھے، اور بھولے سے اپنے پروردگار کی نافرمانی اور حکم کے خلاف کر بیٹھے۔ اس طرح بجائے خلود حاصل کرنے کے ان کو جنت سے ہی اترنا پڑا، اور اپنے خیالی مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مگر ان کی فطرتِ سلیمہ اور تواضع وانکساری اور توبہ نصوح نے انہیں بخشوادیا، اور گناہ معاف ہوا، اور پذیرائی مل گئی، فرمایا:

﴿ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى﴾ پھر گریہ وزاری اور معذرتوں کے بعد ان کے ربّ نے انہیں نوازا، اور قبولیت وپسندگی سے مشرف فرمایا، اور ان پر متوجہ ہو کر کلمات توبہ کی ان کو تلقین فرمائی، فرمایا: ﴿فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ [البقرة:۳۷] (پس آدم نے اپنے ربّ سے چند الفاظ سیکھ لیے، چنانچہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی) اور راہ ہدایت اور صراط مستقیم پر اللہ تعالیٰ انہیں ایسا جمایا کہ پھر مدۃ العمر ابلیس انہیں کوئی دھوکہ وفریب نہ دے سکا، اس طرح وہ پہلے سے زیادہ مقبول ومحبوب ہو گئے، اور ابلیس مردود کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔

﴿قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى﴾ فرمایا: تم دونوں میاں بیوی یہاں سے نیچے اترو۔ اور سورۂ بقرہ اور اعراف میں جمع کے صیغہ کے ساتھ ﴿قَالَ اهْبِطُوْا﴾ مذکور ہے، اور خطاب آدم، وحواء علیہما السلام اور ابلیس لعین تینوں کو ہے، یا اس لئے کہ حضرت آدم وحواء علیہما السلام کی اولاد بھی خطاب میں مندرج ہے، اسی خاطر جمع کا کلمہ مذکور ہوا۔

چنانچہ فرمایا کہ تم میں سے ہر ایک دوسرے کا دشمن ہوگا، یہ عداوت ودشمنی رہتی دنیا تک تمہارے درمیان جاری رہے گی، جس کے مختلف اسباب ہوں گے، مثلاً ابلیس کے ہتھکنڈے اور فریب کاری، اسی طرح نفس وخواہشات کے تقاضے اور حسد وبغض وکینہ، کبر وغرور، مال اور اقتدار وغیرہ۔ الغرض یہ دنیا تمہارے اختلافات کی آماجگاہ ہو کر تمہیں ایک دوسرے کا دشمن بنائے گی، جیسا کہ مشاہدے میں ظاہر ہے کہ اب دوستی اور محبتوں کا فقدان ہے، اور عداوتوں کا سلسلہ بے حد زیادہ ہے۔ فرمایا:

﴿فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ﴾ اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت کا سامان آئے، یعنی کتاب اور رسول اور دلائل عقلیہ ونقلیہ تو پورے ذوق وشوق اور عشق ومحبت کے ساتھ انہیں قبول کرلینا کیونکہ دنیا کے ہزاروں فتنوں سے بچنے کی صرف یہی ایک راہ ہے، سو جس نے میری ہدایت کی پیروی کی تو وہ نہ دنیا میں گمراہ ہوگا، اور نہ آخرت میں پریشان وناکام ہوگا، کیونکہ آخرت کی تمام سعادتوں کی کنجی یہی اتباع ہدایت واطاعت حق ہے۔

فائدہ:

حضرت آدم علیہ السلام کی یہ لغزش نہایت معمولی اور بے انتہاء حقیر تھی، مگر بساط قرب وجوار رحمت میں واقع ہونے کی وجہ سے بڑی ہوگئی، ہم دنیا میں شب وروز مشاہدہ کررہے اور دیکھ رہے ہیں کہ لوگوں کی خطائیں، معاصی اور نافرمانیاں حضرت آدم علیہ السلام کی خطاء کے مقابلے میں پہاڑوں کی مانند ہیں، اور یہ خطاء ان کے مقابلے میں رائی کے برابر ہے، مگر لوگ مؤاخذہ سے محفوظ ہیں، اور ان مقدس ہستیوں کو جو کہ پوری انسانیت کے ماں باپ ہیں ایک معمولی گناہ کی پاداش میں جنت سے نکلنے کا حکم وفرماں جاری رہتا ہے۔

دراصل یہ کوئی عتاب یا سزا نہیں، بلکہ جس مقصد کے لئے ان کی تخلیق ہوئی یہ ہبوط اس کی تکمیل کے لئے ابتدائی قدم ہے، اور ان سے کھربوں انسانوں کی پیدائش کا بہانہ ہے، کیونکہ جنت میں پیدائشوں کا کوئی سلسلہ مروج نہیں، اور نہ ہی جہنمی اعمال ومعاصی کا توان سب کے لئے قدرت نے روز اول سے زمین کو مقرر فرمایا۔

نیز یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کا دخول جنت دوام کے لئے ہرگز نہ تھا، بلکہ یہ ایک عارضی امر تھا کہ جنت کو دیکھ کر اپنی اولاد کو اس کے حصول کی ترغیب دیدیں، اور تیار کردیں، اور اس کی بے شمار نعمتوں کا انہیں سمجھائیں، اور جہنم میں کوئی نعمت مہیا نہیں اس لئے اسے دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج جنت ودوزخ دونوں کا معائنہ فرما کر تمام حجت مکمل کردی۔

اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو خلافت ارضی کے لئے پیدا فرمایا تھا، اور امورِ خلافت سب کے سب کا تعلق زمین کے ساتھ ہے، اور خلافت کی تکمیل جنت میں نہیں ہوسکتی تھی، اس کا مرکز چونکہ کرۂ ارضی تھا اس لئے مصلحت اور حکمت الٰہی کے تحت یہ سب کچھ مکمل ہوا۔ نیز یہ بھی یاد رکھو کہ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیدائش زمین پر زمین کی مٹی کے خمیر سے ہوئی، پس انہیں ہر حال زمین پر آنا ہی تھا، تو ان کے لئے دخول جنت ایک پر حکمت بہانہ بنا، اسی زمین کے بارے میں فرمایا: ﴿مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً

اُخْرٰى﴾ [طٰہٰ: ۵۵] (اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا ہے، اور اسی میں لوٹا دیں گے، اور اسی سے دوبارہ نکالیں گے)۔ یہ نُعِيْدُكُمْ کا وعدہ اسی کے لئے اشارہ ہے، کیونکہ جنت مردوں کے لئے قبرستان نہیں بن سکتی۔ اہل علم حضرات نے اس واقعہ سے سینکڑوں قیمتی علمی و عملی مسائل استنباط کئے ہیں، کتب تفاسیر اور ارباب طریقت کی کتب میں دیکھ سکتے ہیں۔

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ۭ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾

ترجمہ: اور جس شخص نے میری نصیحت سے اعراض کیا سو اس کے لئے تنگی کا جینا ہوگا، اور ہم اسے قیامت کے دن اس حالت میں اٹھالیں گے کہ وہ اندھا ہوگا ﴿۱۲۴﴾ وہ کہے گا: اے میرے ربّ! مجھے آپ (عزوجل تعالیٰ) نے اندھا کر کے کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں تو دیکھنے والا تھا ﴿۱۲۵﴾ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوگا اسی طرح تیرے پاس ہماری آیات پہنچی تھیں سو تو انہیں بھول گیا، اور آج تو بھلا دیا جائے گا ﴿۱۲۶﴾ اور ہم اسی طرح اسے سزا دیں گے جو حد سے گزر جائے اور اپنے ربّ کی آیات پر ایمان نہ لائے، اور یہ واقعی بات ہے کہ آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے، اور بڑا دیر پا ہے ﴿۱۲۷﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیت میں فرمایا تھا کہ جو لوگ آسمانی ہدایات کا اتباع کریں گے، انبیاء ورسل علیہم السلام پر ایمان لائیں گے، اور ان کے نقش قدم پر چلیں گے، تو دنیا و آخرت دونوں کی سعادت پائیں گے، اور ایمان کے نور وانوار کے ساتھ میدانِ محشر میں حاضر ہو جائیں گے۔ اب اندھے اور بے نور شقاوت پانے والوں کا بیان ہے جنہوں نے آسمانی ہدایتوں کا اتباع نہیں کیا، اور ان کی جگہ شیطانی اور نفسانی خواہشات کا اتباع کیا، جو شخص دنیا میں حق سے اندھا رہے گا وہ آخرت میں بھی اندھا ہو کر اٹھے گا، تلک بتلک کا بیان ہوگا، تو فرمایا:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى﴾ اور جس نے میری نصیحت اور ہدایت سے اعراض کیا تو وہ دنیا اور آخرت دونوں میں خوار ہوا، دنیا میں اس طرح کہ اس کی زندگی تنگ

ہوگی، اور قیامت میں وہ نابینا اٹھے گا، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ﴿وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْيًا وَّبُكْمًا وَّصُمًّا﴾ [بنی اسرائیل:۹۷] (قیامت کے دن انہیں چہروں کے بل اوندھا کر کے اٹھایا جائے گا، اندھے، گونگے اور بہرے)۔

﴿عَنْ ذِكْرِيْ﴾ ذکر سے مراد قرآن حکیم ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک سرور عالم ﷺ کی ذات گرامی ہے، لیکن راجح یہی ہے کہ دونوں مراد ہیں، کیونکہ دونوں میں تلازم واتحاد سب کے ہاں مسلم ہے۔

﴿مَعِيْشَةً ضَنْكًا﴾ کا مطلب یہ نہیں کہ یہ لوگ بھوکے، پیاسے، ننگے رہیں گے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اقتدار، سرمایہ، مال وحشم اور تمام ناز ونخروں کے باوجود پریشان، بے چین بے آرام اور خوفزدہ رہیں گے، ان کی زندگی راحت وسکون اور اطمینان سے خالی ہوگی، ان کے قلوب پر حرص طمع ولالچ کا اس قدر غلبہ ہوگا کہ دن رات پیسوں، بینک بیلنس اور ننانوے کے پھیر میں رہیں گے، دولت وعزت اور کرسی کے زوال کے خطرات ہر وقت ان کے دلوں پر سوار رہیں گے، اپنی موت تو درکنار دوسروں کی موت کا سن کر بیہوش ہو جاتے ہیں، رات دن انہیں بغیر گولی کھائے دو گھنٹے کی نیند بھی نصیب نہیں ہوتی۔

لطف یہ کہ ایسے لوگ بیوی بچوں کی مسلسل نافرمانیوں کے نیچے مجبور اور دبے رہتے ہیں، سوال پیدا نہیں ہوتا کہ ان کے بچے اور بیوی ان کے حکموں پر عمل کریں، ان کا معاشرہ ایک خودسری کے ماحول میں جکڑا ہوا معلوم ہوگا، دن رات دفتروں کے چکر میں، عدالتوں کے ہجوم میں، رشوتوں اور خوشامدوں کی مصیبت میں مبتلا رہتے ہیں۔ دیکھو! کسی سے جھوٹ بول رہے ہیں، اور کسی کا جھوٹ سن رہے ہیں، سرمایہ کا حساب بھی نہیں، اسی طرح پریشانیاں بھی بے حساب ہیں، اگر پوچھو کہ کیا حال ہے؟ تو جواب یہی ہوگا کہ بہت پریشان ہوں، اور کامیابی کی منزل سے بہت دور ہوں، یہ ہے: مَعِيْشَةً ضَنْكًا کا ترجمہ۔

اگر دنیا نباشد دردمندیم ☆ وگر باشد بمہرش پائے بندیم

بلائے زین جہاں آشوب ترنیست ☆ کہ رنج خاطرست ار ہست ورنیست

قرآن حکیم نے ان تمام پریشانیوں کا ایک ہی حل نکالا، اور فرمایا: ﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾ [الرعد:۲۸] (خبردار! اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے)۔ قناعت کا زرین نسخہ ہاتھ میں لے کر سارے جہاں سے مستغنی رہو ذرا تجربہ تو کرلو، دیکھو، یہی انبیاء کرام علیہم السلام اور صدیقین اوشہداء وصالحین کا اکسیری نسخہ

ہے، نہ اندھا بنو، نہ گونگا اور نہ بہرہ بنو، بلکہ انوار الٰہی کے ساتھ زندہ رہو، دوسروں کو فیض پہنچاؤ، اور قناعت کا التزام کرو۔
یہ ہوا مَعِيْشَةً ضَنْكًا کے ایک پہلو کا بیان۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ لوگوں کی عمومی زندگی ناگفتہ اور تلخ ہو، مثلاً یہ کہ ہر طرف ظلم ہو، انصاف کا نام ونشان نہ ہو، چوری ڈاکے قتل وغارت کا عروج ہو، امن وامان نہ ہو، مال وجان کا تحفظ نہ ہو، قحط اور ہوشربا گرانی اور مہنگائی ہو، صحت وتندرستی ناپید ہو، طرح طرح کی بیماریوں کی اتنی کثرت ہو کہ علاج ومعالجہ ہی مشکل ہو وغیرہ۔

مفسرین کرام نے مَعِيْشَةً ضَنْكًا کی ایک تفسیر یہ بیان کی ہے کہ ذکر الٰہی سے اعراض کرنے والے معصیت کی زندگی بسر کریں گے، ان کی فکر فاسد اور عقیدہ بگڑا ہوا ہوگا، اخلاق خراب اور اعمال قبیح ہوں گے، اس لئے یہ معصیت کی زندگی گزاریں گے، یہ معیشت کی تنگی ہوگی۔ یہ تمام چیزیں آج ہمارے معاشرے میں اپنے عروج پر ہیں، کیونکہ ہم ﴿أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي﴾ کے صحیح مصداق ہیں۔ قرآن وسنت پر عمل کرنا تو درکنار جبکہ ہمارے اسلامی ملک میں قرآنی نظام کا نام لینا بھی جرم ہے، اور اس کا نام دہشت گردی انتہا پسندی وغیرہ ہے۔ ان شاء اللہ جو لوگ قرآن وسنت سے اعراض کرنے والے ہیں اپنی قبروں سے اندھے بہرے گونگے اٹھیں گے، اور ان کا حشر یورپ کے عیسائیوں کے ساتھ ہوگا۔ اللهم عليك بأعداء الإسلام والمسلمين۔

﴿قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيٓ أَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا﴾ وہ مجرم، یعنی پیغمبر اور قرآن کی تعلیمات سے اعراض کرنے والا بولے گا: اے میرے پروردگار! تو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا؟ حالانکہ میں دنیا میں بینا تھا۔ اور بقول اکابرین کہ میں محض یہ نہیں کہ بینا تھا بلکہ بہت سے بیناؤں کا سردار تھا۔

﴿قَالَ كَذٰلِكَ أَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى﴾ اللہ تعالیٰ جواب میں فرمائیں گے: ہاں! دنیا میں بھی تو نے ایسا کہا تھا، جب تیرے پاس ہماری ہدایت کی نشانیاں پہنچیں جو واضح اور روشن تھیں پس تو نے ان کو بھلا دیا، خود کو دانشور روشن خیال سمجھتے ہوئے میری ہدایات کو فرسودہ ناقابل عمل اور اندھوں کا قانون کہہ کر ان سے بیزاری کا اعلان کیا، اور اپنی آنکھیں بند کرلیں، تو یہ تمہارے غرور کا بدلہ ہے۔

قرض ست فعل ہائے بدت نزد روزگار ☆ بر ہر کدام وقت کہ خواہد ادا کند

قرآن کریم نے فرمایا: ﴿فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا﴾ [الأعراف: ٥١] (آج ہم ان کو بھلائیں گے، جیسا کہ انہوں نے اس دن کی ملاقات کو بھلا دیا تھا)۔ قیامت کے روز ان لوگوں کی کوئی

درخواست قبول نہیں ہوگی جنہوں نے دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ہدایت قبول نہیں کی، اور ان جہنمیوں سے کہا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ہدایت کا انتظام فرمایا تا کہ لوگ ہدایت کے ذریعہ جہنم سے بچ کر جنت اور رضائے الٰہی حاصل کرلیں، مگران لوگوں نے ہدایت کو قبول نہیں کیا، آج ان کا کوئی عذر قبول نہ ہوگا۔

﴿وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ﴾ اور اسی طرح ہم اس شخص کو بدلہ دیتے ہیں جس نے حد سے آگے تجاوز کیا، اور اپنے ربّ کی آیات پر ایمان نہ لایا۔ ﴿وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى﴾ اور البتہ آخرت کا عذاب زیادہ سخت ہے، اور دائمی وابدی ہے۔

اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿١٢٨﴾ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿١٢٩﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿١٣٠﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ؕ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿١٣١﴾

ترجمہ: کیا انہیں اس چیز نے ہدایت نہیں دی کہ ہم نے ان سے پہلے بہت سی جماعتوں کو ہلاک کر دیا؟ یہ لوگ ان کے رہنے کی جگہوں میں چلتے پھرتے ہیں، بلا شبہ اس میں عقل والوں کیلئے نشانیاں ہیں ﴿١٢٨﴾ اور اگر آپ کے ربّ کی طرف سے پہلے سے ایک بات فرمائی ہوئی نہ ہوتی، اور اجل مقرر نہ ہوتی تو لازمی طور پر عذاب آجاتا ﴿١٢٩﴾ سو آپ ان کی باتوں پر صبر کیجئے، اور سورج کے نکلنے اور سورج کے چھپنے سے پہلے اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ تسبیح میں مشغول رہئے، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح پڑھئے، اور دن کے اطراف میں بھی تا کہ آپ خوش ہو جائیں ﴿١٣٠﴾ اور آپ ہرگز ان چیزوں کی طرف اپنی آنکھیں نہ بڑھائیں جن سے ہم نے کفار کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے جو ان کی بیویاں ہیں، اور دنیاوی زندگی کی رونق ہے، اور آپ کے ربّ کا رزق بہتر ہے، اور بہت دیر پا وابدی ہے ﴿١٣١﴾

☆☆☆

معارف ومنازل

پہلے معرضین اور غافلین کا ذکر تھا، اس آیت میں ایسے لوگوں کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ کیا تمہیں گزشتہ ہلاک شدہ اقوام کی تباہی سے عبرت نہیں جنہوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کی اور ہدایت کے راستوں کا مذاق اڑایا، جس کی پاداش میں وہ تباہ ہوئے، اور تم ملک شام جاتے ہوئے خاص کر وادی حجر کے تباہ شدہ مکانات اور کھنڈرات پر گزرتے ہو، تو ان کے مکانات کے آثار سے، ان کی قوت وطاقت کا اندازہ معلوم کر کے ان کی تباہی سے عبرت سیکھو۔

﴿اَفَلَمْ یَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى﴾ پس کیا ان اعراض کرنے والوں کو اب تک اس بات نے ان کی راہنمائی نہیں کی کہ ہم ان سے پہلے کتنی بستیاں اور کتنی امتیں ہلاک کر چکے ہیں؟ جیسے قوم عاد وثمود وقوم لوطؑ وقوم شعیبؑ وغیرہ، جن کے گھروں کے پاس یہ مشرکین چلتے پھرتے ہیں، اوران کے اجڑے ہوئے تباہ شدہ مکانات سے گزر جاتے ہیں، کیا یہ پھر بھی عبرت کے لئے تیار نہیں ہیں؟ بلاشبہ اس میں عقلمندوں کے لئے درس عبرت اور نشانیاں ہیں۔ مزید تنبیہ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى﴾ اگر تیرے پروردگار کی طرف سے ایک بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو عذاب الٰہی آ کر فوراً ان کو چمٹ جاتا۔ کلمہ سابقہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامِ حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیتا، اتمامِ حجت کے بعد عذاب نازل کرتے ہیں، اور علمِ الٰہی میں ہر قوم کے لئے عذاب کا ایک وقت مقرر اور طے شدہ بھی ہے، پس اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو فوراً عذاب آجاتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں عذاب کے آنے سے مانع ہیں۔

﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا یَقُوْلُوْنَ﴾ لہٰذا آپ ان مجرمین پر عذاب نازل نہ ہونے سے غمگین ورنجیدہ نہ ہوں، اپنے صبر واستقامت کا جوہر دکھا کر یہ عمل جاری رکھیں۔

﴿وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى﴾ آپ صبر کیجئے اپنے ربّ کی حمد وثناء کے ساتھ، اس کی تسبیح وتقدیس میں لگے رہئے۔ اس میں پانچوں نمازیں بھی آگئیں، طلوع آفتاب سے پہلے یہ نماز فجر ہوئی، اور غروب آفتاب سے پہلے یہ نماز عصر ہوئی، اور رات کے اوقات میں بھی تسبیح وتحمید کیا کریں اس سے تہجد کی نماز اور مغرب وعشاء مراد ہیں، اور دن کے اطراف وجوانب میں بھی تسبیح وتحمید کیا کریں یہ صلوٰۃ ظہر اور صلوٰۃ عصر ہوئیں۔

﴿لَعَلَّكَ تَرْضٰى﴾ امید ہے کہ آپ روز قیامت ان عظیم الشان تسبیحات وطاعات کا بے مثال ثواب دیکھ کر خوش ہوں گے، اور اپنے رب سے راضی ہوجائیں گے۔

اور بعض علماء یہ کہتے ہیں ﴿وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ﴾ سے مراد نماز عشاء ہے، اور اطراف نہار سے مراد نماز ظہر اور مغرب ہیں، جیسے پہلے بیان ہوا، نماز ظہر دن کے اول حصے کا آخر ہے اور نماز مغرب آخری حصے کا آخر ہے۔ واللہ اعلم

﴿وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى﴾ اے پیغمبر اسلام! آپ صبح وشام رات دن اپنے ربّ کی عبادت تسبیح وتحمید میں لگے رہئے، اور دنیا فانی کی چار روزہ لذتوں سے اسی طرح اعراض فرمایئے جس طرح دنیا کے عاشقوں نے دین سے مکمل اعراض کیا، تو آپ کا إعراض عن الدنيا إقبال على الآخرة ہے، اور عقلمندوں کا شعار یہی ہے، جبکہ دنیا والوں کا إقبال على للذات والدنيا یہ إعراض عن الآخرة کی علامت ہے، اور یہ نادانوں اور بے عقلوں کا شعار ہے، لہٰذا جن چیزوں سے ہم نے کافروں کے مختلف گروہوں کو بہرہ مند کیا ہے، ان خوشحالیوں کی طرف بطریق رغبت واشتیاق اور استحسان ہرگز ہرگز اپنی آنکھوں کو نہ بڑھانا، اور نہ توجہ کرنا، اور نہ دیکھنا۔

اور "مد" کے معنی ہیں: دراز کرنا، کنایہ ہے التفات سے، کیونکہ یہ ظاہری نعمتیں کیا ہیں؟ یہ ہر قسم کی رونق وزیبائش اور ناز وساز اسباب عیش وعشرت اس لئے ہیں کہ ہم انہیں آزماتے ہیں کہ یہ شکر کرتے ہیں یا ناشکری، ان نعمتوں کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں یا اپنے علم وہنر کا نتیجہ سمجھتے ہیں، اور یہ نعمتیں ان کے لئے راحتیں نہیں ہیں بلکہ زحمتیں اور نقمتیں ہیں، جیسے عنقریب مَعِيْشَةً ضَنْكًا کی تفسیر بیان ہوئی۔ سورۂ حجر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝۸۷ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝۸۸﴾ [الحجر] (اور ہم نے تمہیں سات ایسی آیتیں دے رکھی ہیں جو بار بار پڑھی جاتی ہیں، اور عظمت والا قرآن عطا کیا ہے۔ اور تم ان چیزوں کی طرف ہرگز آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو مزے اڑانے کے لیے دے رکھی ہیں، اور نہ ان لوگوں پر اپنا دل کڑھاؤ، اور جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کے لیے اپنی شفقت کا بازو پھیلا دو)۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿١٣٢﴾
وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ أَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولٰى ﴿١٣٣﴾ وَلَوْ أَنَّآ أَهْلَكْنٰهُمْ
بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوا رَبَّنَا لَوْلَآ أَرْسَلْتَ إِلَيْنَا رَسُولًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَّذِلَّ وَ
نَخْزٰى ﴿١٣٤﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوا ۚ فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ أَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾

ترجمہ: اور آپ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے، اور خود بھی اس کی پابندی کیجئے، ہم آپ سے رزق نہیں چاہتے، ہم آپ کو رزق دیں گے، اور بہتر انجام پرہیزگاری کا ہے﴿١٣٢﴾ اور ان لوگوں نے کہا کہ یہ شخص ہمارے پاس اپنے رب کی نشانی کیوں نہیں لاتا؟ کیا ان کے پاس پرانی کتابوں کا مضمون نہیں پہنچا؟﴿١٣٣﴾ اور اگر ہم اس سے پہلے انہیں عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیتے تو وہ کہتے کہ اے ہمارے ربّ! آپؐ عزوجل تعالیٰ) نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا؟ جس کا ہم ذلیل ورسوا ہونے سے پہلے اتباع کر لیتے﴿١٣٤﴾ آپ فرما دیجئے: سب انتظار کرنے والے ہیں، سو تم بھی انتظار کرو، سو عنقریب جان لو گے سیدھے راستے والا اور ہدایت یافتہ کون ہے﴿١٣٥﴾

معارف ومنازل

نماز خزائنِ رحمت کی کلید ہے، ساری عبادتوں کا مغز ہے، اور قربِ الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ اور تحفہ معراج ہے، اسی لئے فرمایا:

﴿وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ۖ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۗ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾

اپنے گھر والوں اور متعلقین کو نماز کا حکم دیجئے، اسی کے ذریعہ انہیں عذاب جہنم سے چھڑائیے، جیسے فرمایا: ﴿يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ [التحریم: ٦] (اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ)۔ اور بذات خود بھی نماز پر قائم ودائم رہئے۔ حدیث میں فرمایا کہ جب بچہ سات برس کا ہو جائے تو اس کو (عادت ڈالنے کے لئے) نماز کا امر کرو، یعنی نماز پڑھواؤ، اور جب دس سال کا ہو تو اس کو سزا دے کر نماز پڑھنے کا پابند بناؤ۔ مطلب یہ ہے کہ خوب اس کی نگرانی کرو۔ [مشکوٰۃ]

یہاں "أهل" سے مراد ساری امت اور تمام متعلقین ہیں۔ یہ حکم سب کو شامل ہے، سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت فاطمۃ الزہرا اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کو نماز صبح کے لئے بڑے اہتمام سے بیدار فرماتے تھے۔ افسوس کہ آج

سادات کرام خانوادہ نبوت کی ایک کثیر تعداد کو نماز کی اہمیت کا احساس تک نہیں، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں، ان پر نماز معاف ہے، گویا نماز ایک بیگار اور سزا تھی جو انہیں معاف کردی گئی۔ کاش اس فریب خوردہ شاہین بچوں کو جنہیں کرگسوں کی صحبت نے اور نا کارہ سوسائٹی نے اپنے مقام سے بیگانہ کردیا ہے، انہیں اگر نماز کی حقیقت کا علم ہوتا تو وہ اس میدان میں سب سے آگے ہوتے، جس طرح ان کے اسلاف نے اس میدان میں سب سے آگے اور سب کے راہ نما ہوتے تھے۔ علامہ اقبال کا شعر ہے: ؎

یہ فریب خوردہ شاہین جو پلا ہو کرگسوں میں ☆ اسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

یہی حال عام مسلمانوں کا ہے، وہ صبح سے لے کر شام تک بازاروں میں ٹوکری اٹھائیں گے، کھیتوں میں مشقت کریں گے، چودہ چودہ گھنٹے سر پر ٹوکری اٹھائیں گے، اور بڑی بڑی گاڑیاں چلائیں گے، الغرض سخت سے سخت کام انجام دیں گے، اور کوئی تھکن محسوس نہ کریں گے، لیکن اگر اسی اثناء میں نماز کا وقت آجائے، اور اللہ تعالیٰ کا منادی حیَّ علی الصلوٰۃ کہہ کر پکارے، تو فوراً اعضاء شکنی شروع ہوجائے گی، اور تھکاوٹ سے چور چور ہوجائیں گے۔

ہم نے چوکیداروں اور پولیس کے جوانوں کو سخت سردی اور پریشان کن گرمی کے موسموں میں رات بھر ڈیوٹی دیتے ہوئے دیکھا ہے، اسی طرح خاکروبوں کو بھی، نہ اس وقت انہیں نیند ستاتی ہے، اور نہ سردی اور گرمی انہیں روک کھڑی کرتی ہے، لیکن یہ توفیق کہ قبولیت کی ان قیمتی گھڑیوں میں وضو کر کے کائنات کے عظیم ربّ جل شانہ کی جناب میں سجدہ کرلیں، توبہ توبہ یہ کام ان سے نہیں ہوسکے گا، یہ زحمت وہ ہرگز گوارا نہیں کرسکیں گے، اِلّا ماشاء اللہ۔

دکانوں میں اور کارخانوں میں سڑک پر ڈیوٹیاں دے رہے ہیں، آٹھ دس گھنٹے کھڑے ہیں، نہ کمر میں درد پیدا ہوتا ہے، نہ سر اور کندھوں میں، جب رمضان کی نماز تراویح کا نام سنتے ہیں تو بلیڈ پریشر کا مریض بن کر گھنٹوں بیہوش ہوجاتے ہیں، اس کی سب سے اصلی اور بڑی وجہ یہی ہے کہ ہم نماز کو ایک بوجھ اور ایک بیگار سمجھتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ یہ ایک سزا ہے، جو ہمیں مسلمان ہونے کے جرم میں دی گئی ہے۔

اگر ہم اس حقیقت کو ذہن نشین کرلیں کہ نماز سے رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں اور تمام پریشانیاں دور ہوجاتی ہیں، ابر کرم آکر برستا ہے، مصیبتوں اور بیماریوں کے سیلاب کے سامنے بند بندھ جاتا ہے، تو یقیناً ہم ایسا نہ کریں جو ہم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں سمجھ عطا فرمائے۔ آمین ؎

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ☆ ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

﴿لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا، نَحْنُ نَرْزُقُكَ﴾ ہم تجھ سے کوئی روزی نہیں چاہتے، بلکہ ہم ہی تجھ کو روزی دیتے ہیں، یعنی جب تو ٹھیک اور پابندی سے نماز ادا کرے گا تو اللہ تعالیٰ تجھ کو ایسی جگہ سے روزی دے گا جہاں سے تجھے وہم و گمان بھی نہ ہوگا۔ سورۂ طلاق میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: ۲] (اور جو اللہ سے ڈرے اللہ اس کے لیے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے، اور اس کو وہاں رزق دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو)۔

حضرت شاہ عبد القادر دہلوی رحمۃ اللہ علیہ موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ دنیا میں مالک اپنے غلاموں سے روزی کمواتے ہیں، رب تعالیٰ مالک برحق بندگی چاہتا ہے، اور غلاموں کو اپنے آپ سے روزی دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز میں اللہ تعالیٰ کا فائدہ نہیں بلکہ بندوں کا فائدہ ہے کہ نماز کی برکت سے بے غل وغش روزی ملتی ہے، اللہ تعالیٰ شانہ مولائے کائنات تمام کائنات کے رزق و روزی کا کفیل اور ذمہ دار ہے۔

سورۃ الذاریات میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۝ مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ۝﴾ [الذاریات] (اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔ اور میں ان سے کسی قسم کا رزق نہیں چاہتا، اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں۔ اللہ تو خود ہی رزّاق ہے، مستحکم قوت والا ہے)۔

﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾ اور نیک انجام اہل تقویٰ کے لئے ہے۔

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا يَأْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ، اَوَلَمْ تَأْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى﴾ اور یہ معاندین یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ رسول ہمارے پاس اپنے پروردگار کی طرف سے ہمارے حسب منشا (فرمائشی) اپنی نبوت کی کوئی نشانی لے کر کیوں نہیں آتا؟ یعنی جو معجزہ ہم چاہتے ہیں وہ معجزہ کیوں ظاہر نہیں کرتا؟ اللہ تعالیٰ جواب میں فرماتے ہیں: کیا ان لوگوں کے پاس پہلی کتابوں میں واضح نشانی اور روشن دلیل نہیں آچکی ہے؟۔

صُحُفِ اُوْلٰی سے تورات انجیل اور زبور اور دیگر کتب منزلہ مراد ہیں، اور ان تمام کتابوں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت عامہ کی بشارت وضاحت کے ساتھ موجود ہے جیسا کہ ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ﴾ [الأعراف: ۱۵۷] (وہ لوگ جو اس رسول یعنی نبی امی کے پیچھے چلیں جس کا ذکر وہ اپنے پاس تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پائیں گے)۔ اسی طرح فرمایا: ﴿ اَوَلَمْ يَكُنْ

لَّهُمْ اٰيَةً اَنْ يَّعْلَمَهٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [الشعراء: ۱۹۷] (یعنی تو کیا یہ بات آپ ﷺ کی نبوت کی حقانیت اور صداقت کے لئے کافی نشانی نہیں کہ بنی اسرائیل کے علماء آپ ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھ کر پہچان لیتے ہیں کہ یہ وہی پیغمبر آخر الزمان ﷺ ہیں جن کی توریت اور انجیل اور زبور میں بشارت موجود ہے)۔ خلاصہ یہ ہے کہ معاندین نے آئے دن روز روز معجزات کی جو فرمائش کرنے کا التزام کیا ہوا ہے، یہ صحیح نہیں، اگلی کتابوں میں آپ ﷺ کے ظہور کی بشارت کافی ہے جس کے بعد کسی اور معجزے کی ضرورت نہیں ہے۔

یا یہ معنی ہیں کہ کیا ان کے پاس قرآن عظیم نہیں پہنچا؟ جو اگلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، اور انبیاء سابقین علیہم السلام اور اگلی امتوں کا حال بیان کرتا ہے، اور علوم ہدایت پر مشتمل ہے، پورے عالم کے لئے رحمت اور نعمت ہے، جس کی آیتوں کی تلاوت صبح وشام جاری ہے، جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے تمام اقوام عالم ایک چھوٹی سورت کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہیں، اس کے ہوتے ہوئے مزید کسی معجزے کی ضرورت ہی نہیں، اور یہ روشن کتاب اثبات نبوت کے لئے کافی ہے۔

﴿وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى﴾ اور اگر ہم معاندین کو اس قرآن کے نازل کرنے سے پہلے، یا اس رسول کے بھیجنے سے پہلے کسی عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ کافر قیامت کے دن یہ کہتے کہ اے ہمارے ربّ! تو نے ہمارے پاس کوئی رسول کیوں نہ بھیجا؟ تو ہم ذلیل اور رسوا ہونے سے پہلے تیری آیتوں کا اتباع کر لیتے۔

﴿قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى﴾ آپ ان سے فرما دیجئے کہ اب حیلہ و بہانے کا وقت ختم ہوا، ہم میں سے ہر ایک انجام اور نتیجہ کا منتظر ہے، پس تم اسی کا انتظار کرو، سو عنقریب تمہیں پتہ چل جائے گا کہ سیدھے راستے پر چلنے والا کون ہے، اور ہدایت یافتہ کون ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی بھیج کر اور آسمانی کتابیں نازل فرما کر اتمامِ حجت کر دی تا کہ کسی کے پاس عذر باقی نہ رہے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا۔

سورۂ نساء میں فرمایا: ہم نے ڈرانے والے اور بشارت سنانے والے بھیجے: ﴿لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ﴾ [النساء: ۱۶۵] (تا کہ ان رسولوں کے آجانے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے سامنے کوئی عذر باقی نہ رہے)۔ لہٰذا کفار کا یہ کہنا کہ کوئی رسول آتا تو ہم ایمان لاتے اور عذاب سے بچ جاتے تو فرمایا کہ ہم نے

رسول تو بھیج دیئے، اتمامِ حجت کردی، اب تمہاری مرضی ایمان وہدایت قبول کرو یا اپنی گمراہی اور شرک وکفر پر ڈٹے رہو، ہم نے اتمامِ حجت کردی۔

اسی کے ساتھ سورۃ طٰہٰ کی تفسیر اپنے اختتام کو پہنچی، الحمدللہ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ اسے قبول فرمائے، اور ہمارے حسن خاتمہ اور ابدی سعادت کا ذریعہ بنائے۔ آمین

سُورَۃُ الْاَنبیَاء

مکیۃ آیاتها ۱۱۲ رکوعاتها ۷

سورۂ انبیاء مکی ہے، اس میں ایک سو بارہ (۱۱۲) آیتیں، اور سات (۷) رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الانبیاء ہے، چونکہ اس میں سترہ انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے، اور اس کے علاوہ ان کے فضائل ومناقب اور دعوت وتبلیغ اور مخالفین کے نتائج کا بھی بیان ہے، اس لئے سورت کا نام سورۂ انبیاء مقرر ہوا۔

نزول:

یہ سورت مکی ہے، اس کا نزول وسطانی دور میں ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۲۱ ویں نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۷۳ ویں نمبر پر ہے، اس کا نزول سورۂ ابراہیم کے بعد ہے۔

تعداد کلمات وحروف:

اس سورت میں ۷ رکوع، اور ۱۱۲ آیات ہیں، اور ۱۱۸۷ کلمات، اور ۵۱۵۴ حروف پر مشتمل ہے۔

ربط ومناسبت:

(۱)۔ گزشتہ سورت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات کا ذکر تھا، اس سورت میں ان کے ساتھ دیگر انبیاء علیہم السلام کا بھی تذکرہ ہے۔

(۲)۔ گزشتہ سورت میں توحید، رسالت معاد کا ذکر تھا، اس سورت میں بھی انہی بنیادی مسائل کا دوبارہ

تذکرہ ہے، ذرا تفصیل کے ساتھ۔

(۳)- گزشتہ سورت کے آخر میں مشرکین کا شکوہ تھا، اس سورت کے شروع میں اسی کا بیان ہے۔ نیز دونوں سورتوں کے آخر میں ایک ہی طریقے پر فرائض نبوت کا تذکرہ ہے۔ نیز قرب قیامت کا دونوں میں بیان ہے۔

مختصر موضوع:

دعوت الی التوحید، فضائل انبیاء وحدت ملّت انبیاء علیہم السلام، امداد اور نصرت الٰہی کا بیان، دعوات اور تضرع وانکساری کا بیان، ایمان کے تمام بنیادی عقائد کا بیان، خلافت الٰہیہ کا بیان، اور مشرکین کے عقائد واعمال کی تردید ومذمت اور برے انجام کا بیان، مسلمانوں کے لئے خوشخبری اور نیک انجام کا تذکرہ وبیان، سید الانبیاء ﷺ کی رسالت عمومی کا تذکرہ، نیز خواب غفلت سے بیداری کے اسباب ومضامین کا عمدہ طور پر بیان ہے۔

﴿الجزء السابع عشر﴾

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِىۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴿۱﴾ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ ذِكۡرٍ مِّنۡ رَّبِّهِمۡ مُّحۡدَثٍ اِلَّا اسۡتَمَعُوۡهُ وَهُمۡ يَلۡعَبُوۡنَ ۙ﴿۲﴾ لَاهِيَةً قُلُوۡبُهُمۡ ؕ وَاَسَرُّوا النَّجۡوَى ۖ الَّذِيۡنَ ظَلَمُوۡا ۖ هَلۡ هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُكُمۡ ۚ اَفَتَاۡتُوۡنَ السِّحۡرَ وَاَنۡتُمۡ تُبۡصِرُوۡنَ ﴿۳﴾ قٰلَ رَبِّىۡ يَعۡلَمُ الۡقَوۡلَ فِى السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ ۡ وَهُوَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ﴿۴﴾ بَلۡ قَالُوۡۤا اَضۡغَاثُ اَحۡلَامٍۭ بَلِ افۡتَرٰٮهُ بَلۡ هُوَ شَاعِرٌ ۖۚ فَلۡيَاۡتِنَا بِاٰيَةٍ كَمَاۤ اُرۡسِلَ الۡاَوَّلُوۡنَ ﴿۵﴾ مَاۤ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا ۚ اَفَهُمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۶﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۷﴾ وَمَا جَعَلۡنٰهُمۡ جَسَدًا لَّا يَاۡكُلُوۡنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوۡا خٰلِدِيۡنَ ﴿۸﴾ ثُمَّ صَدَقۡنٰهُمُ الۡوَعۡدَ فَاَنۡجَيۡنٰهُمۡ وَمَنۡ نَّشَآءُ وَاَهۡلَكۡنَا الۡمُسۡرِفِيۡنَ ﴿۹﴾ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكُمۡ كِتٰبًا فِيۡهِ ذِكۡرُكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴿۱۰﴾

ترجمہ: لوگوں کا حساب قریب آ گیا، اور وہ غفلت میں اعراض کئے ہوئے ہیں ① ان کے پاس ان کے ربّ کی طرف سے جو کوئی نئی نصیحت آتی ہے تو وہ اسے کھیلتے ہوئے سنتے ہیں ② اس حال میں کہ ان کے دل غفلت میں ہیں، اور جن لوگوں نے ظلم کیا انہوں نے چپکے چپکے سرگوشی کی کہ یہ شخص اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارے جیسا انسان

ہے، کیا تم دیکھتے ہوئے جادو کو مانتے ہو؟ ③ اس نے کہا: میرا رب بات کو جانتا ہے آسمان میں اور زمین میں، اور وہ سننے والا جاننے والا ہے ④ بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ یہ تو خوابوں کی گٹھڑیاں ہیں، بلکہ یوں کہا کہ اس شخص نے جھوٹ بنالیا ہے، بلکہ وہ شاعر ہے، سو چاہئے کہ ہمارے پاس نشانی لے کر آئے جیسا کہ اس سے پہلے لوگ نشانیاں دے کر بھیجے گئے ⑤ ان سے پہلے کسی بستی والے ایمان نہیں لائے جسے ہم نے ہلاک کیا، سو کیا یہ لوگ ایمان لے آئیں گے؟ ⑥ اور ہم نے آپ سے پہلے جن کو رسول بنا کر بھیجا وہ مرد ہی تھے، جن کی طرف ہم وحی بھیجتے تھے، سو تم اہل ذکر سے پوچھ لو اگر تم نہیں جانتے ہو ⑦ اور ہم نے ان کو کوئی ایسا جسم نہیں بنایا جو کھانا نہ کھاتے ہوں، اور نہ وہ ہمیشہ رہنے والے تھے ⑧ پھر ہم نے ان سے جو وعدہ کیا تھا اسے سچ کر دکھایا، سو ہم نے انہیں اور جس جس کو چاہا نجات دیدی، اور ہم نے حد سے نکلنے والوں کو ہلاک کر دیا ⑨ یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے، جس میں تمہاری نصیحت ہے، کیا تم نہیں سمجھتے؟ ⑩

معارف ومنازل

اس رکوع میں دس آیات ہیں، ان کا مختصر خلاصہ یہ ہے: فرمایا: لوگوں کا حساب قریب آ گیا، اور وہ آخرت اور قبر و برزخ کے حساب سے مسلسل غفلتوں کی وجہ سے اعراض کرنے والے ہیں، ان کو نہ قیامت کا احساس ہے، اور نہ ہی حساب و کتاب کا، دراصل یہ غفلت اس لئے ہے کہ یہ لوگ وقوع قیامت اور دوبارہ زندگی اور حساب و کتاب کو مانتے ہی نہیں، جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی نئی نصیحت ان کے پاس آجاتی ہے تو اسے کھیلتے ہوئے استہزاء و مذاق جانتے ہوئے سنتے ہیں، یہ اپنی غفلت و گمراہی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی تکذیب کرتے ہیں، اور چپکے چپکے آپس میں یوں کہتے ہیں کہ یہ شخص جو کہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں یہ تو تمہارا جیسا کھاتا پیتا سوتا جاگتا انسان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کو رسول بھیجنا ہوتا تو وہ کسی فرشتہ کو بھیج دیتا، اور یہ شخص تمہیں جو کچھ معجزہ کے نام سے دکھاتا ہے یہ جادو ہے، کیا تم جانتے ہوئے دیکھتے ہوئے جادو کو مان لوگے، اور اس پر ایمان لاؤ گے؟

اسی طرح وہ کہتے رہتے تھے کہ یہ شخص سوتے میں پراگندہ خواب دیکھتا ہے، پھر اسے ترتیب دیتا ہے، اور قرآن اور وحی کے نام سے تمہارے سامنے پیش کرتا ہے، یہ جادوگر ہے، شاعر ہے اور مفتری ہے (العیاذ باللہ)۔

اسی طرح وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اگر یہ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں تو جیسے ان سے پہلے انبیاء علیہم السلام نشانیاں

لے کر آئے، یہ بھی کوئی ایسی بڑی نشانی لے کر آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ حق وصداقت سے سراسر بیگانہ اور محروم تھے، شیطان مردود نے انہیں جو پٹی پڑھائی اور جس طرح ان پر اپنا تسلط قائم کیا وہ اسی کا رٹ لگاتے ہوئے توحید الٰہی اور وقوع قیامت، حیات بعد از موت، رسالت ونبوت اور قرآن کریم ان تمام دینی اقدار سے منحرف ومنکر رہے۔ فرمایا:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ﴾ لوگوں کے حساب کا وقت قریب آرہا ہے۔ "حِسَابُهُمْ" مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد قیامت کے دن کا حساب ہے، سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ۔ یعنی میری بعثت ظہور قیامت کی سب سے پہلی نشانی ہے، میں اور قیامت اس طرح ساتھ بھیجے گئے ہیں جیسے یہ دونوں انگلیاں ہیں، اور آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اشارہ فرمایا۔

قیامت کا حساب اگرچہ صدیوں سال بعد آئے گا مگر آئندہ آنے والی چیز تو گھڑی گھڑی قریب ہوتی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ حساب کا وقت صرف قیامت پر موقوف نہیں بلکہ مرنے کے بعد حساب کی منزل شروع ہو جاتی ہے، اسی برزخی قبر میں اعمال کا نتیجہ سامنے آجاتا ہے، یا راحت یا عذاب، یہی تو حساب ہے۔

﴿وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ﴾ یہ لوگ غفلت کے باعث اصول شریعت سے دور ہیں، اور حساب کے منکر ہیں، اور قیامت کے بارے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔ مؤمن وکافر آج دونوں اسی غفلت کا شکار ہیں، خصوصاً جدید تعلیم یافتہ اور مغرب کی تہذیب وتمدن کا دلدادہ طبقہ۔ یہ لوگ تو آخرت کو ایک فرضی کہانی سمجھتے ہیں، اور یہ غفلت اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ:

﴿مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ کہ ان کے پاس ان کے پروردگار کی طرف سے کوئی جدید اور نئی نصیحت نہیں آتی جو ان کو خواب غفلت سے بیدار کردے مگر وہ اس کو ایسی لاپرواہی کے ساتھ سنتے ہیں گویا کہ کھیل میں لگے ہوئے ہیں۔

﴿لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاَسَرُّوا النَّجْوَى ڰ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا﴾ ان کے دل اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی فکر سے بالکل غافل ہیں، اور یہ ظالم لوگ سرور عالم ﷺ کے بارے میں چپکے چپکے ایسی سرگوشیوں میں لگے ہوئے ہیں، چنانچہ آپس میں کہا کرتے ہیں:

﴿هَلْ هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ﴾ کہ یہ شخص سوائے اس کے کہ تم ہی جیسا عام آدمی ہے اور کچھ نہیں، یہ تمہاری طرح کھاتا پیتا ہے اور چلتا پھرتا اور سوتا جاگتا ہے، بھلا آدمی اور بشر بھی کہیں نبی ورسول ہوسکتا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ کو نبی

بھیجنا ہوتا تو فرشتہ کو نبی بنا کر بھیجتا، اور یہ شخص تمہیں جو کرشمے دکھلاتا ہے وہ سب جادو ہے۔

﴿اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ﴾ کیا تم جادو کے پاس آتے ہو؟ حالانکہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہو کہ یہ جادو ہے، یہ شخص تم جیسا آدمی ہے، کوئی فرشتہ نہیں، لہٰذا نبی بھی نہیں۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ان کی سرگوشی پر مطلع فرمایا، اور پھر اپنے نبی کو ان کے جواب دینے کا حکم دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں یہ جواب دیا:

﴿قٰلَ رَبِّیْ یَعْلَمُ الْقَوْلَ فِی السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۡ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ فرمایا: میرا پروردگار آسمان اور زمین کی ہر بات کو خوب جانتا ہے، خواہ کیسے ہی چھپا کر کی جائے، وہ ہر چیز کا سننے والا جاننے والا ہے، وہ تمہاری سرگوشی اور ہر قسم کے مشوروں سے مجھے مطلع کرتا ہے۔

﴿بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۭ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۚ فَلْیَاْتِنَا بِاٰیَةٍ كَمَآ اُرْسِلَ الْاَوَّلُوْنَ﴾ اور ان ظالموں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فقط جادوگر کہنے پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ قرآن پراگندہ اور پریشان خوابوں کا مجموعہ ہے، یعنی یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہرگز نہیں، بلکہ یہ شخص خواب میں جو خلط ملط باتیں دیکھتا ہے انہیں جمع کر کے پیش کرتا ہے، بلکہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ یہ جھوٹ اور بے بنیاد کلام ہے، یہ اپنی طرف سے بنا کر خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔

پھر جب انہیں یہ خیال آیا کہ اس شخص نے چالیس سالہ زندگی میں کوئی ایک جھوٹ بھی نہیں بولا، تو کہنے لگے کہ یہ شخص جھوٹا تو نہیں بلکہ شاعر ہے، یہ مضامین اس کے شاعرانہ خیالات ہیں۔ الغرض ان ازلی بدبختوں نے ہادی برحق سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق حیرت زدہ ہو کر ہر طرح کا بہتان تراشا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساحر کہا، اور افتراء باندھنے والا بھی کہا، شاعر اور مجنون بھی کہتے رہے، اور قرآن مجید کو جھوٹ اور جادو بھی کہا۔ فرمایا: ﴿اُنْظُرْ كَیْفَ ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَبِیْلًا﴾ [الاسراء:۴۸] (دیکھ لیں کیسے جماتے ہیں تجھ پر مثالیں، اور بھٹکتے پھرتے ہیں، سو راہ نہیں پاسکتے)۔

کبھی شاعر کہتے ہیں، کبھی جادوگر، کبھی مسحور اور کبھی مجنون، کسی ایک بات پر جماؤ نہیں، یہ ان کے بوکھلاہٹ اور بے عقلی کی واضح علامت ہے۔ پھر آخر میں کہنے لگے کہ اچھا اگر ایسا نہیں جو ہم کہتے ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پاس سے رسول ہو کر آیا ہے تو اس شخص کو چاہئے کہ ہمارے پاس اپنی رسالت کی کوئی ایسی نشانی لے آئے، جیسی نشانیوں کے

ساتھ پہلے رسول بھیجے گئے تھے، یعنی یہ شخص اگر گزشتہ پیغمبروں علیہم السلام کی طرح کوئی معجزہ دکھائیں تو ہم ضرور ایمان لائیں گے۔

اس طرح کے فرمائشی معجزات کا طلب کرنا محض ان کا بہانہ اور تعنت کے سوا کچھ نہ تھا، انہوں نے معجزہ شق القمر دیکھ کر بھی یہی کہا تھا کہ یہ جادو ہے، اور ہر قسم کے نئے نئے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے، ان کے اس بے سروپا بہانے کا جواب:

﴿مَآ اٰمَنَتۡ قَبۡلَهُمۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا ۚ اَفَهُمۡ يُؤۡمِنُوۡنَ﴾ فرمایا: کفار قریش سے پہلے کوئی بستی والے اس قسم کے فرمائشی معجزات کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے، اور ایمان نہ لانے کی وجہ سے ہم نے ان کو ہلاک کیا کہ فرمائش کے بعد معجزات کو دیکھ کر ایمان نہ لائے، پس تباہ ہو گئے، کیونکہ وہ محض بہانہ تلاش کرتے تھے، ان کا مقصد ایمان لانا نہیں تھا، تو کیا یہ قریش کے ہٹ دھرم ان معجزات کو دیکھ کر ایمان لائیں گے؟ ہرگز نہیں، یہ لوگ گزشتہ اقوام سے شرارت میں بڑھ کر ہیں۔

اس کے علاوہ ان کا وہ اعتراض بدستور برقرار ہے کہ بشر کا رسول ہونا محال ہے، اگر ان کو ساری نشانیاں دکھلائی جائیں پھر بھی یہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے، آگے ان کے اعتراض کا جواب ہے، فرمایا:

﴿وَمَآ اَرۡسَلۡنَا قَبۡلَكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوۡحِىۡۤ اِلَيۡهِمۡ فَسۡـَٔلُوۡۤا اَهۡلَ الذِّكۡرِ اِنۡ كُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے (ہزاروں انبیاء علیہم السلام مبعوث کئے وہ سب بشر تھے، ان میں کوئی فرشتہ نہیں تھا) کسی کو پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا مگر جنس بشر سے مردوں کو نبی بنا کر بھیجا، جن کی طرف ہم وحی نازل کرتے تھے، کبھی کسی فرشتہ یا عورت کو نبی بنا کر نہیں بھیجا، نبی ہمیشہ انسان اور مرد ہوئے ہیں، اگر تمہیں اس بارے میں شک ہو تو علم والوں سے پوچھو، تورات و انجیل کے علماء تمہارے پاس موجود ہیں، جن سے تمہارے تعلقات ہیں، وہ وقتاً فوقتاً تمہیں سوالات تلقین کرتے ہیں، ان سے پوچھو کہ نبی انسان ہوتے ہیں یا فرشتے؟ اور وہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کبھی کسی فرشتہ کو نبی بنا کر نہیں بھیجا، جب بھی بھیجا تو بشر ہی کو بھیجا، تو اچھی طرح معلوم ہوا کہ بشریت نبوت کے منافی نہیں، بلکہ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے کہ تمہاری جنس میں سے رسول بھیجے تا کہ ہم جنس ہونے کی وجہ سے افادہ اور استفادہ میں سہولت ہو۔

بوئے جنسیت کند جذب صفات

پھر اسی شبہ کا دوسرے عنوان سے جواب دیا جا رہا ہے کہ بشریت اور نبوت میں کوئی منافات نہیں، فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ﴾ اور ہم نے رسولوں علیہم السلام کا ایسا جسم نہیں بنایا کہ وہ نہ کھاتے ہوں، بلکہ وہ کھانے پینے والے انسان تھے، وہ فرشتے نہ تھے جو کھانے پینے سے بے نیاز ہوتے۔ سورۂ فرقان میں ارشاد ہے: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَ يَمْشُوْنَ فِي الْأَسْوَاقِ﴾ [الفرقان: ۲۰] (اور بات یہی ہے کہ آپ سے پہلے جو پیغمبر ہم نے بھیجے وہ کھانا کھاتے تھے، اور بازاروں میں چلتے تھے)۔ اسی طرح:

﴿وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ﴾ وہ دنیا میں ہمیشہ رہنے والے نہیں تھے، یہ بھی انسانی صفت ہے، یعنی موت کا آنا اور مرجانا۔ بخلاف فرشتوں کے کہ ان کے لئے یہ صفت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے بھی رسول بھیجے وہ سب بشر تھے، ظاہری اور جسمانی حیثیت سے وہ عام انسانوں کے مشابہ تھے، مگر باطنی اور روحانی طور پر وہ فرشتوں سے بھی بلند وبالاتر تھے، اور جب وہ بشر تھے تو ان پر بھی موت آئی بہ قاعدۂ: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ [الأنبياء: ۳۵] (ہر جاندار نے موت کا مزہ چکھنا ہے)۔

اور موت کا آنا بھی نبوت کے منافی نہیں ہے، جب انبیاء علیہم السلام کے ماننے والے مسلمانوں کا نہ ماننے والے کافروں کے ساتھ مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے متبعین کے ساتھ نصرت کا وعدہ فرمایا، اور انہیں نصرت کے ساتھ نجات دیدی، اور حد سے بڑھنے والے کفار پر ہلاکت کا عذاب نازل فرمایا، ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ صَدَقْنٰهُمُ الْوَعْدَ فَأَنْجَيْنٰهُمْ وَمَنْ نَّشَاءُ وَأَهْلَكْنَا الْمُسْرِفِيْنَ﴾ پھر ہم نے پیغمبروں علیہم السلام سے فتح ونصرت کا جو وعدہ کیا تھا وہ سچ کر دکھلایا، پس حسب وعدہ ان کو اور ان کے ماننے والوں کو نجات دیدی، اور کفر و معاصی میں جو لوگ حد سے تجاوز کر چکے تھے انہیں ہلاک کر دیا۔

﴿لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴾ ہم نے تمہاری طرف ایک کتاب اتاری ہے جس میں تمہارے لئے نصیحت اور یاد دہانی ہے، وہ کتاب تمہارے لئے ہدایت ورحمت اور سبب دخول جنت ہے۔ یا یہ معنی کہ اس میں تمہارے لئے شرف وبزرگی ہے کہ وہ تمہاری زبان عربی میں ہے، اس کتاب کو سرآنکھوں سے لگاؤ، کیمیائے سعادت سمجھو، اور اسی کی قیادت اور سرپرستی میں جنتوں کی سیر کرو، اور ابدی راحتوں کا مالک بن جاؤ، اسی کتاب سے قوموں کا عروج وزوال مقدر ہے۔

وَ كَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ ⑪ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ
مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ ⑫ لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ ⑬ قَالُوْا
يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ⑭ فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ ⑮

ترجمہ: اور ہم نے کتنی ہی بستیوں کو توڑ دیا جو ظلم کرنے والی تھیں، اور ہم نے ان کے بعد دوسرے لوگوں کو پیدا فرمادیا ⑪ سو جب انہوں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو اس بستی سے بھاگنے لگے ⑫ مت بھاگو، اور ان چیزوں کی طرف جن میں تم عیش میں پڑے ہوئے تھے، اور اپنے گھروں کی طرف واپس آجاؤ تاکہ تم سے سوال کیا جائے ⑬ وہ کہنے لگے: ہائے ہماری خرابی! بیشک ہم ظلم کرنے والے تھے ⑭ سو برابر ان کا یہی کہنا رہا یہاں تک کہ ہم نے انہیں کٹی ہوئی کھیتی کی طرح بجھی ہوئی حالت میں کردیا ⑮

معارف ومنازل

تذکیر بأیام اللہ کے عجیب وغریب احوال کا بیان ہورہا ہے، قوموں پر ان کی سرکشی کی وجہ سے کیا کیا عذاب آئے؟ مگر انہوں نے نہ عبرت سیکھی اور نہ ہی ایمان لایا، آتے گئے اور کٹتے اور مٹتے گئے، مگر عبرت نہ سیکھ سکے۔

ان آیات میں مکہ مکرمہ کے رہنے والے مکذّبین اور منکرین کو عبرت کا سبق دیا جارہا ہے، اور ہلاک شدہ بستیوں کی تباہی کی یاددہانی ہورہی ہے کہ تم سے پہلے کتنی ہی بستیاں تھیں جو ظلم کرتی تھیں، یہ ظلم کفروشرک کی وجہ سے تھا، جب وہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے تو صفحۂ ہستی سے مٹ گئے، ظلم کا انجام تباہی کے سوا کچھ نہیں، اور ظالم کبھی آباد نہیں ہوئے۔

ان ظالموں کی تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوسری قوم پیدا کردی، جب انہیں محسوس ہوا کہ عذاب آرہا ہے تو اپنی بستیوں سے بھاگے، ان سے کہا گیا کہ مت بھاگو، واپس آجاؤ، بھاگنے سے نجات نہیں پاؤ گے، نجات صرف اسی میں مقدر ہے کہ سرکشی اور ظلم چھوڑ کر ایمان لے آؤ، بھاگ کر کہاں جاؤ گے؟ جدھر جاؤ وہاں خدا کی خدائی اور حکومت ہے، واپس آکر ذرا تم سے پوچھا جائے کہ تم جس رفاہیت وعیش اور ساز وسامان اور جن مکانوں پر گھمنڈ کرتے تھے، اور اتراتے غرور کرتے تھے وہ کہاں ہیں، اور ان کا کیا حال ہے؟ اب کہاں ہے تمہاری حفاظت کی جگہ اور کہاں ہیں وہ فلک بوس بنگلے اور محلات؟ آج تمہارے محلات کے کھنڈرات پر کوے اور بھوم (اُلو) پھر رہے ہیں، ناچ رہے ہیں، جہاں

پر چار دن پہلے تم اور تمہارے اہل خاندان بڑی سرکشیوں میں محو خراماں تھے، اب چکھو عذاب، کیونکہ عذاب آنے کے بعد نہ ایمان کارگر ہوگا، اور نہ توبہ "پشیمانی" ۔ جب توبہ کا وقتِ قبولیت کا رہا وہاں تم خرمستی میں رہے، اگر اس وقت ندامت کر کے تائب ہو جاتے تو نفع حاصل کرتے اور بچ جاتے، عذاب آنے کے بعد:

﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ کہنا اور اپنے ظلم کا اقرار کر کے ہائے ہائے ہمارے لئے کارٹ لگانا ہرگز فائدہ مند نہیں، یہ پوری تاریخ انسانیت میں صرف یونس علیہ السلام کی قوم کے لئے فائدہ مند رہی اور بس۔

﴿وَكَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْيَةٍ كَانَتْ ظَالِمَةً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ﴾ ہم نے کتنی بستیاں جو ظالم تھیں ان کے ظلم کی وجہ سے ان کو توڑ پھوڑ کر چورا چورا کر دیا؟ اور ان کے بعد دوسری قوم کو آباد کر دیا، لہٰذا اے اہل! مکہ تم بھی شاید اپنے ظلم وکفر کی وجہ سے تباہ ہو جاؤ گے، اور تمام گزشتہ اقوام میں یہی سنت اللہ جاری رہی ہے، خوب سمجھو۔

﴿فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَرْكُضُوْنَ﴾ پس جب ظالموں نے ہمارے عذاب کو آتے دیکھا تو فوراً جانوروں کی طرح بے تحاشا اس بستی سے دوڑنے بھاگنے لگے تاکہ نجات پائیں، مگر ان سے یہ کہا گیا کہ:

﴿لَا تَرْكُضُوْا وَارْجِعُوْٓا اِلٰى مَآ اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ وَمَسٰكِنِكُمْ لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ﴾ یہاں سے بھاگو نہیں، اور اسی عیش وعشرت کی طرف لوٹو جس میں تم مست تھے، ﴿اُتْرِفْتُمْ فِيْهِ﴾ اور اپنے مکانات اور محلوں قلعوں کی طرف لوٹو، ﴿مَسٰكِنِكُمْ﴾ جن میں تم رہتے تھے اور فخر وغرور کرتے تھے۔

﴿لَعَلَّكُمْ تُسْـَٔلُوْنَ﴾ شاید تم سے تمہارا حال پوچھا جائے، یہ کہنے والے اور پوچھنے والے فرشتے تھے، اور پوچھنا بطور استہزاء اور تمسخر تھا۔ مطلب یہ ہے کہ فرشتوں نے کہا: مت بھاگو، تو ان ظالموں نے یہ کہا:

﴿قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ﴾ ہائے ہماری تباہی اور خرابی اور کم بختی تو کہاں ہے؟ (یہ کلمات نہایت نا امیدی کے ہیں) اس وقت تو حاضر ہو جا، یہی تیری حاضری کا وقت ہے، بیشک ہم لوگ ظالم اور قصوروار تھے کہ ہم نے حق کی تکذیب کی، ایمان سے منکر ہوئے، اب اپنے جرم کا اقرار کرتے ہیں، اور توبہ کرتے ہیں، اور وہ برابر یہی کہتے رہے اور معافی مانگتے رہے، مگر فائدہ نہیں ہوا، کیونکہ توبہ وندامت کا وقت گزر چکا تھا، تو فرمایا:

﴿فَمَا زَالَتْ تِّلْكَ دَعْوٰىهُمْ حَتّٰى جَعَلْنٰهُمْ حَصِيْدًا خٰمِدِيْنَ﴾ پس مسلسل ان کی یہی پکار جاری رہی یہاں تک کہ ہم نے انہیں جڑ سے کٹے ہوئے گھاس کی طرح بجھے ہوئے کر چھوڑا، اور ان کا شعلہ حیات بجھ گیا، اور سب

ٹھنڈے ہو کر مر گئے، اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

وَمَا خَلَقۡنَا السَّمَآءَ وَالۡاَرۡضَ وَمَا بَيۡنَهُمَا لٰعِبِيۡنَ ۝۱۶ لَوۡ اَرَدۡنَاۤ اَنۡ نَّتَّخِذَ لَهۡوًا لَّاتَّخَذۡنٰهُ مِنۡ
لَّدُنَّاۤ ۖ اِنۡ كُنَّا فٰعِلِيۡنَ ۝۱۷ بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَى الۡبَاطِلِ فَيَدۡمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ ؕ وَلَـكُمُ
الۡوَيۡلُ مِمَّا تَصِفُوۡنَ ۝۱۸ وَلَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ وَمَنۡ عِنۡدَهٗ لَا يَسۡتَكۡبِرُوۡنَ عَنۡ
عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسۡتَحۡسِرُوۡنَ ۝۱۹ يُسَبِّحُوۡنَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفۡتُرُوۡنَ ۝۲۰

ترجمہ: اور ہم نے آسمان و زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں ۝۱۶ اگر ہم چاہتے کہ کوئی کھلونا بناتے تو ہم اپنے پاس سے بنا لیتے، اگر ہم کرنے والے ہوتے ۝۱۷ بلکہ ہم حق کو باطل پر پھینک مارتے ہیں، سو وہ اس کا سر پھوڑ دیتا ہے، پھر وہ چلا جاتا ہے، اور جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس کی وجہ سے تمہارے لئے خرابی ہے ۝۱۸ اور اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے، اور جو بندے اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہیں وہ اس کی عبادت سے عار نہیں کرتے، اور نہ وہ تھکتے ہیں ۝۱۹ رات دن اللہ تعالیٰ کی تسبیح میں مشغول رہتے ہیں، ان میں سستی نہیں آتی ۝۲۰

معارف ومنازل

مشہور کہاوت ہے کہ: ''عقلمند کا کام بے مقصد نہیں ہوتا، اور ناداں کا کام بامقصد نہیں ہوتا''۔ اس بے پایاں بڑے جہاں کی تخلیق کے پیچھے اسی طرح کا عظیم مقصد کارفرما ہے، جس طرح یہ جہاں خود بڑا عظیم اور بامقصد ہے، کائنات کا خالق جو کہ ہر عیب سے پاک ہے، اور بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں کا مالک ہے، اس نے پوری کائنات میں کوئی ذرہ برابر چیز کو بے فائدہ اور عبث نہیں بنایا، اس کی ہر تخلیق خواہ بڑی ہو یا چھوٹی ہزاروں مصلحتوں اور حکمتوں پر مبنی ہے۔

ان آیات میں پہلے تو یہ فرمایا کہ ہم نے جو آسمان و زمین پیدا کئے ہیں ان کی پیدائش کوئی عبث و بے مقصد نہیں، بلکہ جتنا یہ جہاں بڑا ہے اتنا ہی اس کی تخلیق کا مقصد بھی بڑا ہے، اور بے انتہا حکمتوں پر مبنی ہے، عقلمند لوگ اس کی ہر چیز کو اس کے خالق و مالک کی وحدانیت کی نشانی اور دلیل سمجھتے ہیں۔

﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ﴾ اور نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے کھیلتے ہوئے (بے مقصد)۔ پوری کائنات اللہ تعالیٰ نے محض کھیل تماشا کے لئے پیدا نہیں فرمائی، یہ تو کافروں کا یا ان کے نقش قدم پر چلنے والے ملحد و زندیقوں کا گمان ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا﴾ [ص:۲۷] (یہ ان لوگوں کو گمان ہے جنہوں نے کفر اختیار کیا)۔ جبکہ اہل ایمان یہ کہتے ہیں: ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: ۱۹۱] (اے ہمارے پروردگار! تو نے اس کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں فرمایا، تو پاک ہے، ہمیں آگ کے عذاب سے بچالے)۔ اس کی کوئی غرض وغایت ہے، وہ یہی ہے کہ انسان ترقی کی منزل طے کر لے، اللہ کا قرب اور اس کی رضا حاصل کر لے، اور اس کی گرفت سے بچ جائے، لہٰذا ہم درخواست کرتے ہیں کہ اے پاک ذات! ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، اور ہم سے راضی ہو جا۔

﴿لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ﴾ اگر ہم اس کائنات کو کھلونا ہی بنانا چاہتے تو یقیناً ہم اسے اپنے پاس بناتے۔ ﴿اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ اگر ہم ایسا کرنے والے ہوتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس کائنات کو کھیل تماشا بنانا ہوتا تو ہم اسے اپنے پاس ہی رکھ لیتے، اسے مخلوق کے سامنے کیوں رکھتے؟ انبیاء ورسل علیہم السلام کو آسمانی قانون دے کر کیوں بھیجتے؟ سعادت وشقاوت کا ضابطہ کیوں مقرر کرتے؟ پھر حق وباطل کا ذکر فرما کر ارشاد ہوا:

﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ زَاهِقٌ﴾ حقیقت یہ ہے کہ ہم حق کو باطل پر پھینکتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حق باطل کے دماغ کو پھاڑ ڈالتا ہے، اور اسے ناکارہ کر دیتا ہے، اور جب باطل پاش پاش ہو جاتا ہے اور مٹ جاتا ہے چنانچہ عام قانون اللہ تعالیٰ نے جو بنایا وہ ہمیشہ زندہ رہے گا، فرمایا: ﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ [الإسراء: ۸۱] (اور کہہ دیں کہ: حق آ گیا، اور باطل مٹ گیا، بیشک باطل مٹنے والا ہی ہے)۔ آگے منکرین کو خطاب اور تنبیہ ہے، فرمایا:

﴿وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ﴾ اے حق کا مقابلہ کرنے والو! قرآن حکیم کو پریشان خواب کہنے والو! اور نبی کو بشر کہتے ہوئے اس کی نبوت کا انکار کرنے والو! سنو، اور خوب سنو، ہلاکت و بربادی تمہارے مقدر میں ہے، ان باتوں کی وجہ سے جو تم کہتے ہو۔

﴿وَلَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۭ وَمَنْ عِنْدَهٗ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَلَا يَسْتَحْسِرُوْنَ﴾

اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے، وہی خالق و مالک اور مدبر و متصرف کائنات ہے، اس کا نہ شریک ہے نہ مثیل اور نہ مشیر و وزیر، جو مخلوق اس کے نزدیک ہے یعنی ملائکہ کرام وہ اس کے فرمانبردار ہیں، وہ اس کی عبادت سے تکبر نہیں کرتے، عبادت کو بوجھ نہیں سمجھتے، عار محسوس نہیں کرتے، اور تھکتے بھی نہیں، ہزاروں سال رکوع و سجدے میں ہوتے ہیں، کبھی بددلی اور تھکاوٹ محسوس نہیں کرتے ہیں۔

﴿يُسَبِّحُوْنَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ﴾ وہ رات دن اپنے پروردگار کی تسبیح وتحمید بیان کرتے ہیں، مگر ذرہ برابر بھی سستی نہیں کرتے ہیں۔ پیدائش جہاں سے لے کر قیام قیامت تک ان کا ایک ہی مشغلہ ہے، وہ یہ کہ تمام کائنات کے نظام اور تدبیر پر مامور ہیں، اور اپنے پروردگار کے ہر طرح حکموں کی انجام دہی میں مصروف ہیں، کبھی بھی کسی طرح بھی نافرمانی نہیں کرتے ہیں، اور ایک لمحہ بغیر عبادت کے نہیں رہتے، تسبیح و ذکر ہی ان کی غذا ہے۔ جس طرح ہم ہر وقت سانس لیتے ہیں، اور دوسرے کام بھی کرتے رہتے ہیں، یہی کیفیت فرشتوں کی تسبیح و ذکر کی سمجھو، وہ کسی کام پر مامور ہوں، کوئی کام انجام دے رہے ہوں، ایک منٹ تسبیح سے غافل نہیں رہتے، اور ساتھ ساتھ اس کام کو بھی احسن طریقے پر انجام دیتے ہیں۔

۞ ۞ ۞

اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ
فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۲۲﴾ لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ ﴿۲۳﴾

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے زمین کی چیزوں میں سے معبود بنا لئے ہیں جو زندہ کرتے ہیں؟ ﴿۲۱﴾ اگر زمین اور آسمان میں اللہ تعالیٰ کے سوا اور معبود ہوتے تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا، سو اللہ تعالیٰ جو عرش والا ہے اس چیز سے پاک ہے جو وہ بیان کرتے ہیں ﴿۲۲﴾ وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال نہیں کیا جاتا اور ان لوگوں سے باز پرس ہوتی ہے ﴿۲۳﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیتوں کی طرح ان آیات میں بھی توحید کا اثبات اور شرک کی تردید کا بیان ہے، اور اللہ تعالیٰ جلّ شانہ کی صفات جلیلہ کا ذکر ہے۔ مشرکین کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَمِ اتَّخَذُوْٓا اٰلِهَةً مِّنَ الْاَرْضِ هُمْ يُنْشِرُوْنَ﴾ کیاان لوگوں نے زمین میں سے کاٹ چھانٹ کر ایسے معبود بنالئے ہیں جو مُردوں کوزندہ کرتے ہیں؟ یعنی مشرکین نے اجزاء زمین سے معبودتو بنالئے جنہیں دھاتوں اور پتھروں سے تراش کر بنالئے (سونے چاندی، پتل، لکڑی وغیرہ سے) لیکن یہ باطل اور نہایت بیکار معبود ہیں، اگر حقیقی معبود ہوتے تو مُردوں کوزندہ کردیتے، جب یہ بات نہیں ہے توان کو معبود بنانا سراسر حماقت ہے، وہ کیازندہ کرتے، وہ توخود ہی بے جان ہیں، کہیں رکھ دو یااوندھا گرادو تو سالوں تک پڑا رہے گا۔

پڑے ہیں پڑے ہیں کھڑے ہیں کھڑے ہیں ☆ جوناپوتو بندے خدا سے بڑے ہیں

عجیب انتخاب ہے، بندہ جاندار، معبود بے جان، بندہ سات فٹ کا، معبود دوفٹ کا۔ سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿اَمْوَاتٌ غَيْرُ اَحْيَآءٍ ۚ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۙ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ﴾[النحل:٢١] (وہ مردے ہیں زندہ نہیں ہیں، انہیں پتہ نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے)۔

﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ﴾ اگرآسمان وزمین میں اللہ تعالیٰ کے سوااور بھی معبود ہوتے تو آسمان وزمین کانظام درہم برہم ہوجاتا، چونکہ ایک کی مشیت کچھ ہوتی دوسرے کاارادہ کچھ اور ہوتا، اس طرح سے ٹکراؤ ہوتا، اور ٹکراؤ سے آسمانی وزمینی نظام درہم برہم ہوجاتا، حالانکہ سارے لوگ گواہ ہیں کہ ہزاروں اور لاکھوں سالوں سے نظام کائنات میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوا، اور نظام کبھی خراب نہیں ہوا۔ آپ تجربہ کیلئے ایک اقلیم میں دو بادشاہ رکھیں، یاایک ملک کے دوصدر یادووزیراعظم بنائیں، اس بڑے انتخاب کو چھوڑ دیں ایک گھر میں دوملکہ (سوکن) رکھیں، پھر تماشا دیکھیں کہ کیا کچھ نہیں ہوگا، جبکہ ہزاروں لاکھوں سالوں کانظام بجائے خود کائنات کے ہر ذرہ کی حقیقت، پیدائش اور روزمرہ کی زندگی اوراونچ نیچ میں غورکرلو، تو واضح طور پر یہی معلوم ہوگا کہ نظام چلانے والاصرف اور صرف ایک ہی معبود ہے، جس کے نظام میں کسی غیر کا نہ تصرف ہے، اور نہ مداخلت ومزاحمت۔

شیخ الاسلام مولانا شبیراحمدعثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے یوں لکھاہے، اور بہت بہتر لکھاہے، فرماتے ہیں کہ عبادت نام ہے کامل درجے کے تذلل اور انتہائی درجے کی عاجزی کا، یہ دونوں چیزیں صرف اسی ذات کے سامنے اختیار کی جاسکتی ہیں جو اپنی ذات اور صفات میں ہر طرح سے کامل ہو، اور اختیار رکھتا ہو، اس ذات کو ہم "اللہ یاخدا" کہتے ہیں، یہ ایسی ذات ہے جو نہ عاجز ہے نہ کمزور اور نہ مغلوب، وہ کسی کام کیلئے کسی دوسری ہستی سے مدد نہیں لیتا، بلکہ سب کچھ اپنی مرضی اور ارادے سے کرتا ہے، اس کے ارادے میں کوئی چیز رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

اگر زمین میں ایک کے بجائے دو خدا ہوتے تو ظاہر ہے کہ دونوں بے عیب اور یکساں شان کے مالک ہوتے، اگر پورے عالم بالا اور زیرین کی تخلیق وتدبیر میں دونوں متفق ہوجاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اکیلے خدا سے کام نہیں چل سکتا، لہٰذا دونوں نے مل کر اس کارخانۂ قدرت کو بنایا اور چلایا، اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دونوں خداؤں میں سے کوئی بھی کامل نہیں، کیونکہ انہیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے، ایسی صورت میں دونوں میں سے کوئی بھی اُلوہیت کے قابل نہیں۔

اور اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ دونوں میں سے کوئی ایک بھی سارے کام انجام دے سکتا ہے، تو پھر دوسرا خدا یقیناً بیکار ہوگا، پھر اس کی کیا ضرورت رہ گئی؟ لہٰذا ایسا بیکار محض خدا نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح اگر دو مساوی خداؤں میں کشمکش شروع ہوجائے تو ایک غالب ہوگا اور دوسرا مغلوب، تو اس حالت میں اُلوہیت کا لائق وہی ہوگا جو غالب آئے گا، اور اس طرح بھی ایک ہی خدا ماننا پڑے گا۔

اگر دو خداؤں کے آپس میں زور آزمائی کی نوبت آجائے تو جنگ وجدال میں ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی، اور ارض وسماء کا نظام قائم نہیں رہ سکے گا، چونکہ نظام کائنات مستحکم طریقے سے چل رہا ہے اس لئے معلوم ہوا کہ اس نظام کو چلانے والا وحدہٗ لاشریک ہے، وہ ہر لحاظ سے کامل اور ہر عیب اور نقص سے پاک ہے، وہ علیم کُل اور قادر مطلق ہے، وہ خالق ومالک مدبر اور متصرف ہے، اس کے ارادے میں کوئی چیز مزاحم نہیں ہوسکتی۔ ﴿وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [المائدة: ۱۲۰] (وہ ہر چیز پر قادر ہے)۔

سورۂ مؤمنون میں اسی مسئلے کو یوں فرمایا: ﴿مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ ۚ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ ۚ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٩١﴾ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٩٢﴾﴾ [المؤمنون] (اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے کوئی اولاد نہیں بنائی، نہ اس کے ساتھ کوئی معبود ہے، اگر ایسا ہوتا تو ہر معبود اپنی اپنی مخلوق کو جدا کرلیتا، اور ایک دوسرے پر چڑھائی کرتا، پاک ہے اللہ ان باتوں سے جو یہ لوگ بناتے ہیں۔ وہ اللہ جسے تمام چھپی اور کھلی باتوں کا مکمل علم ہے، لہٰذا وہ ان کے شرک سے بہت بلند وبالا ہے)۔

جب یہ سب باتیں نہیں ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ معبود صرف ایک ہی ہے۔

﴿فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٢٢﴾ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ﴾ سو اللہ تعالیٰ جو عرش کا مالک ہے ان باتوں سے پاک ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں، وہ قادر مطلق ہے، مختار کُل ہے، احکم الحاکمین،

رب العلمین، ذوالقوۃ المتین ہے، کسی کی کوئی مجال نہیں کہ اس سے باز پرس کرے، اور یوں پوچھے کہ یہ کیوں کیا؟ اور یہ کیوں نہیں کیا؟ اور اس کی مخلوق خواہ کسی بھی حیثیت میں ہو اس سے باز پرس کی جاتی ہے، اور کی جائے گی۔ یعنی دنیا میں بھی ان سے مؤاخذہ ہوگا، اور آخرت میں بھی، جو کوئی اگرچہ بہت بڑا حاکم بادشاہ ہو جب غلط عقیدہ یا غلط عمل اختیار کرے گا تو لازماً اس کا مؤاخذہ ہوگا، اور ہر طرح سے وہ سزا کا مستحق ہوگا۔

اَمِ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ قُلۡ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ ۚ هٰذَا ذِكۡرُ مَنۡ مَّعِىَ وَذِكۡرُ مَنۡ قَبۡلِىۡ ؕ بَلۡ
اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۙ الۡحَـقَّ فَهُمۡ مُّعۡرِضُوۡنَ ﴿۲۴﴾ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِكَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا نُوۡحِىۡۤ
اِلَيۡهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدُوۡنِ ﴿۲۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحۡمٰنُ وَلَدًا سُبۡحٰنَهٗ ؕ بَلۡ عِبَادٌ مُّكۡرَمُوۡنَ ﴿۲۶﴾
لَا يَسۡبِقُوۡنَهٗ بِالۡقَوۡلِ وَهُمۡ بِاَمۡرِهٖ يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۲۷﴾ يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ وَلَا يَشۡفَعُوۡنَ ۙ
اِلَّا لِمَنِ ارۡتَضٰى وَهُمۡ مِّنۡ خَشۡيَتِهٖ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۲۸﴾ وَمَنۡ يَّقُلۡ مِنۡهُمۡ اِنِّىۡۤ اِلٰـهٌ مِّنۡ دُوۡنِهٖ فَذٰلِكَ
نَجۡزِيۡهِ جَهَـنَّمَ ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِى الظّٰلِمِيۡنَ ﴿۲۹﴾

ترجمہ: کیا ان لوگوں نے اس کے سوا معبود بنالئے ہیں؟ آپ فرمادیجئے: اپنی دلیل لاؤ، یہ ذکر ہے ان لوگوں کا جو میرے ساتھ ہیں، اور جو مجھ سے پہلے تھے، بلکہ ان میں سے اکثر لوگ حق کو نہیں جانتے، سو وہ اس سے اعراض کئے ہوئے ہیں ﴿۲۴﴾ اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر یہ کہ ہم نے اس کی طرف یہ وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو تم میری عبادت کرو ﴿۲۵﴾ اور ان لوگوں نے کہا کہ رحمٰن نے بیٹا بنالیا ہے، وہ پاک ہے، بلکہ وہ اس کے معزز بندے ہیں ﴿۲۶﴾ وہ اس سے آگے بڑھ کر بات نہیں کرسکتے، اور وہ اسی کے حکم کے موافق عمل کرتے ہیں ﴿۲۷﴾ وہ جانتا ہے جو ان کے اگلے پچھلے احوال ہیں، اور وہ کسی کیلئے سفارش نہیں کریں گے بجز ایسے شخص کے جس کی سفارش کرنے میں اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو، اور وہ اس کی ہیبت سے ڈرتے ہیں ﴿۲۸﴾ اور ان میں سے جو شخص یوں کہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے سوا معبود ہوں سو ہم اسے دوزخ کی سزا دیں گے، ہم اسی طرح ظالموں کو سزا دیا کرتے ہیں ﴿۲۹﴾

معارف ومنازل

شرک کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حاکم اعلیٰ مان کر اس کے ماتحت چھوٹے خداؤں کو بھی تسلیم

کیاجائے ،اور مشرکین مکہ کی طرح یہ عقیدہ رکھا جائے کہ بڑے خدا نے اپنے ماتحتوں کو بعض اختیارات تفویض کررکھے ہیں، ان آیات میں اسی بات کا رد ہے، فرمایا:

﴿اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اٰلِهَةً ؕ﴾ کیاانہوں نے بنار کھے ہیں اللہ تعالیٰ کے علاوہ (ماتحت) معبود؟

﴿قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ ۚ﴾ آپ ان مشرکین سے کہہ دیجئے کہ تم اپنی دلیل لاؤ کہ خدا تعالیٰ کے سوااور بھی خداہو سکتے ہیں، ہم نے تو توحید کو دلیل عقلی سے ثابت کر دیا﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۚ﴾ کے ذریعہ اور دلیل نقلی سے بھی جو یہ ہے:

﴿هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِيْ ؕ﴾ کہ یہی بات یعنی توحید الٰہی میرے ساتھ والوں کی ہے، اور یہی بات ہے مجھ سے پہلے والوں کی کہ ربّ العرش العظیم کے سوا کوئی معبود نہیں، یعنی قرآن اور توریت اور انجیل اور دیگر صحف انبیاء کرام علیہم السّلام سب اس پر شاہد و ناطق ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے کسی بھی کتاب میں اس کی صفات میں کسی شریک کا نہ ثبوت ہے، نہ گنجائش اور نہ امکان، ہر کتاب میں توحید کا حکم اور شرک کی مذمت اور نفی ہے، پھر فرمایا:

﴿بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ الْحَقَّ فَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ مگر اکثر لوگ خواہ مشرکین مکہ ہوں یا یہود و نصاریٰ ہوں، یا دیگر مشرک اقوام ہوں حق کو نہیں جانتے، اور جانتے ہوئے حق سے اعراض کرتے ہیں، کیونکہ یہود و نصاریٰ کا کفر جہالت پر مبنی نہیں صرف حسد و عناد پر مبنی ہے، جبکہ مشرکین کا شرک و کفر اکثر جہالت پر مبنی ہے۔ بہر حال تمام کتب سماویہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر متفق ہیں کہ معبود برحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس کے بعد انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے:

﴿وَمَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِيْۤ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ﴾ ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس کی طرف یہی وحی کی گئی کہ بیشک میرے سوا کوئی معبود نہیں، لٰہذا عبادت صرف میری ہی کرو۔ سورۂ آل عمران میں اسی کا تذکرہ ہے: ﴿وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ﴾[آل عمران: ٦٢] (اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے)۔ معبود برحق وہی ہو سکتا ہے، جو علیم کل، قادر مطلق، نافع و ضار ہو، خالق و مالک، سمیع و بصیر و خبیر ہو۔

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ﴾ ان ناداں بے عقلوں نے یہ بھی کہا کہ رحمن نے اپنے لئے اولاد بنائی ہے، کوئی کہتا ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، کوئی عزیر علیہ السّلام کو، اور نصاریٰ نے

مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ کہا، یہ سب غلط اور افتراء کے سوا کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ ان باتوں سے پاک اور منزہ ہے، اور جن کے متعلق جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں، وہ سب اللہ تعالیٰ کے معزز اور محترم بندے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں بندگی کے شرف وکرامت سے نوازا ہے، وہ رات دن ہر لحہ اس کی عبادت و بندگی میں مشغول ہیں، اور یہ بات ان کی بندگی و اطاعت کی دلیل وثبوت ہے کہ وہ آداب عبودیت میں اس درجہ مستغرق ہیں کہ:

﴿لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾ وہ کسی بات میں اللہ تعالیٰ پر سبقت نہیں کرتے، یعنی اس کی اجازت کے بغیر کوئی حرف زبان سے نہیں نکالتے، اس کے حکم کے منتظر رہتے ہیں، اور اس کے حکم پر کام کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ مشرکین اپنے دل سے یہ خیال نکال دیں کہ قیامت کے دن ان کیلئے فرشتے یا عیسیٰ وعزیر علیہم السلام شفاعت کریں گے، یہ عبادٌ مکرمون بغیر اذن الٰہی کے شفاعت تو کیا بات بھی نہیں کریں گے، جیسے سورۂ نباء میں فرمایا: ﴿لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَقَالَ صَوَابًا﴾[النبأ:۳۸] (بات نہیں کریں گے، مگر وہ جس کے لیے رحمٰن نے اجازت دی ہو، اور وہ ٹھیک بات کرے گا) اس کی تفصیل گزر چکی، اور مزید یہ ہے:

﴿يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ﴾ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے جو ان کے آگے ہے، اور ان کے پیچھے ہے، یعنی اسے ہر چیز کا علم ہے، اگلے پچھلے اور آنے والے تمام کوائف اور حالات پر اس کا علم محیط ہے، اور یہ "عباد مکرمون" کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے سوائے اس کے کہ جس کو اللہ تعالیٰ پسند کرے، اور اس کی شفاعت کی اجازت دے۔

اہلسنت والجماعت کا مذہب یہی ہے کہ قیامت کے دن کی شفاعت برحق ہے، انبیاء کرام، فرشتے، شہداء، صالحین، علماء، اتقیا، حملۂ قرآن وغیرہ مقربین سوائے کفار ومشرکین اور منافقین کے ہر قسم کے گناہگاروں کیلئے شفاعت کریں گے، پس فرشتے ایسے لوگوں کیلئے شفاعت کرسکیں گے جن کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے۔ سورۂ طٰہٰ میں فرمایا: ﴿اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا﴾[طٰہٰ:۱۰۹] (سوائے وہ شخص جس کے لیے رحمٰن اجازت دے، اور اس کے لیے بات کرنے راضی ہو)۔ آخر میں ارشاد ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں، سورۂ نحل میں فرمایا: ﴿يَخَافُوْنَ﴾[النحل:۵۰] (وہ ڈرتے ہیں) کسی کو حق تعالیٰ سے جتنا قرب ہوگا اسے اتنا ہی خوف دامنگیر ہوگا، کیونکہ خوف کا تعلق قرب ومعرفت کے ساتھ بہت زیادہ ہوتا ہے۔

﴿وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّيْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ﴾ ان میں سے جو یہ کہے کہ میں خدا کے

ورے (ماتحت) خدا ہوں، نبی ہو یا فرشتہ یا اور کوئی مقرب جو بھی الوہیت کا دعویٰ کرے گا تو وہ جہنم رسید ہوگا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہی قانون ہے:

﴿كَذٰلِكَ نَجْزِي الظّٰلِمِيْنَ﴾ ہم ظالموں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں، اور ظالم کون ہیں؟ ﴿وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ [البقرة: ٢۵۴] (اور کافر لوگ ہی ظالم ہیں)۔ سورۂ لقمان میں ارشاد ہے: ﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ [لقمان: ١٣] (بیشک شرک کرنا بڑا ظلم ہے)۔ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ یاد رکھو مسئلہ فرضی ہے جس کی نظائر قرآن مجید میں بکثرت واقع ہیں کہ غیر ممکن چیز کو فرض کیا جاسکتا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاۗءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۭ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٣٠ وَجَعَلْنَا فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ ۠ وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا لَّعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝٣١ وَجَعَلْنَا السَّمَاۗءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا ښ وَّهُمْ عَنْ اٰيٰتِهَا مُعْرِضُوْنَ ۝٣٢ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ۭ كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝٣٣

ترجمہ: کیا کافروں کو یہ معلوم نہیں کہ آسمان اور زمین بند تھے پھر ہم نے ان دونوں کو کھول دیا؟ اور ہم نے پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا، کیا وہ پھر بھی ایمان نہیں لاتے؟ ۝٣٠ اور ہم نے زمین میں جمنے والی چیزیں بنادیں تاکہ وہ ان کو لے کر نہ ہلے، اور ہم نے اس میں کشادہ راستے بنادیئے تاکہ وہ راہ پالیں ۝٣١ اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنادیا اور وہ ہماری نشانیوں سے اعراض کیے ہوئے ہیں ۝٣٢ اور وہ ایسا ہے جس نے رات کو اور دن کو اور چاند کو اور سورج کو بنایا، سب ایک دائرے میں تیر رہے ہیں ۝٣٣

معارف ومنازل

ان آیات میں عجیب وغریب مظاہر قدرت کا بیان ہورہا ہے، خصوصاً اپنی صفت خالقیت کے کرشموں کا بیان فرمارہے ہیں، اور مخلوقات میں جو بڑی بڑی چیزیں ہیں ان کو بطور نشانی اور نمونہ کے پیش فرماکر دنیا کے تمام کفار کو دعوتِ ایمان دی جارہی ہے، فرمایا:

﴿اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ۭ﴾ کیا کافروں کو معلوم

نہیں کہ آسمان وزمین سب بند تھے؟ نہ آسمان سے بارش ہوتی تھی، نہ زمین سے کچھ پیدا ہوتا تھا، پھر ہم نے انہیں اپنی قدرت سے کھول دیا، بارشیں بھی خوب ہونے لگیں، اور زمین سے بھی نباتات نکلنے لگے، یہ چیزیں کفار کے سامنے ہیں، انہیں دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اقرار کرلیں، اور ایمان لے آئیں، وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس پورے نظام کا خالق ومتصرف یعنی چلانے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے، اور کوئی نہیں، لیکن یہ سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے باوجود ایمان نہیں لاتے۔

﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ۖ أَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ﴾ اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا، اس عمومی معنی میں جتنے بھی جاندار مخلوقات ہیں سب داخل ہیں۔ اور مِنَ الْمَآءِ سے بارش کا پانی مراد ہے، جس کا کسی نہ کسی درجہ میں بالواسطہ یا بلاواسطہ جاندار چیزوں کے پیدا ہونے میں یا زندہ رہنے میں دخل ہے۔ یہ بھی بہت بڑی نشانی ہے جو عقلمندوں کیلئے کافی ہے، لیکن کافر پھر بھی منکر ہیں، یہ جانتے ہوئے کہ بارش برسانے والا اور اس پانی کو زندگی کا ذریعہ بنانے والا صرف خالق وحدہ لاشریک لہ ہی ہے، پھر بھی ایمان نہیں لاتے۔ مزید فرمایا:

﴿وَجَعَلْنَا فِي الْأَرْضِ رَوَاسِيَ أَنْ تَمِيْدَ بِهِمْ﴾ ہم نے زمین میں بھاری بوجھل چیزیں بنادیں جو زمین پر مضبوطی کے ساتھ جمی ہوئی ہیں تاکہ وہ لوگوں کو لے کر نہ ہلے، ان بھاری چیزوں سے مراد پہاڑ ہیں، جیسا کہ سورۃ النّازعات میں فرمایا: ﴿وَالْجِبَالَ أَرْسٰهَا﴾ [النازعات: ۳۲] (اور زمین میں پہاڑوں کو کھڑا کردیا، جمادیا)۔

اور سورۃ المرسلات میں فرمایا: ﴿وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ﴾ [المرسلات: ۲۷] (اور ہم نے زمین میں اونچے اونچے پہاڑ بنادیئے، جو اپنی جگہ پر مضبوطی کے ساتھ ٹھہرے ہوئے ہیں)۔ یہ پہاڑ بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی مخلوق ہیں، اور اس میں بے شمار معدنیات اور بکثرت فوائد ہیں، جن کا شمار نہیں ہوسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے زمین کے اضطراب کو ختم کرنے کیلئے بکثرت اونچے اونچے بڑے بڑے پہاڑوں کو پیدا فرمایا، اور انہیں زمین پر گاڑ دیا تاکہ زمین کو سکون حاصل ہو، اور اس کی حرکت واضطراب پر کنٹرول ہو۔

﴿وَجَعَلْنَا فِيْهَا فِجَاجًا سُبُلًا﴾ پھر ان میں کشادہ راستے بھی بنائے، دنیا میں بڑے لمبے اور بڑے اونچے سر بفلک پہاڑ موجود ہیں، کوہ ہمالیہ دنیا کا بلند ترین پہاڑ ہے، اس کی آخری چوٹی دس میل بلند ہے، اور اس کی لمبائی کا یہ عالم ہے کہ کھٹمنڈو (نیپال) سے ایران تک تین ہزار میل لمبا ہے، اگر ایسے دشوار گزار پہاڑوں میں راستے اور درے نہ ہوتے تو ایک علاقہ کے لوگ دوسرے علاقوں میں نہ جاسکتے، اور لوگ مسدود ومحدود ہو کر رہ جاتے، جب

یہ راستے اور درے اللہ تعالیٰ نے بنادیئے تو سارے مسائل حل ہوئے۔فرمایا:

﴿لَعَلَّهُمۡ يَهۡتَدُوۡنَ﴾ تاکہ لوگ انہی راستوں کے ذریعہ راہ پالیں، اور آمد ورفت، حمل ونقل کا سلسلہ جاری رہ سکے، اسی طرح فرمایا:

﴿وَجَعَلۡنَا السَّمَآءَ سَقۡفًا مَّحۡفُوۡظًا﴾ ہم نے آسمان کو ایک محفوظ چھت بنادیا، آسمان کو زمین پر ایک قبے کی شکل میں کھڑا کردیا، جس میں نہ کوئی شگاف ہے نہ کوئی سوراخ، یہ جتنا بڑا اور اونچا ہے اتنا ہی محفوظ و مضبوط ہے۔ سورۂ ق میں فرمایا: ﴿اَفَلَمۡ يَنۡظُرُوۡۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ كَيۡفَ بَنَيۡنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ﴾[ق:٦] (بھلا کیا انہوں نے اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کیسے بنایا ہے؟ اور ہم نے اسے خوبصورتی بخشی ہے، اور اس میں کسی قسم کے رخنے نہیں ہیں)۔ اور سورۂ نوح میں فرمایا: ﴿اَلَمۡ تَرَوۡا كَيۡفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ۙ وَّجَعَلَ الۡقَمَرَ فِيۡهِنَّ نُوۡرًا وَّجَعَلَ الشَّمۡسَ سِرَاجًا﴾[نوح:١٥] (کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان اوپر تلے پیدا فرمائے ہیں؟ اور ان میں چاند کو نور بنا کر اور سورج کو چراغ بنا کر پیدا کیا ہے)۔

بہر حال! آسمان اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے، اور قدرت کے بے پناہ عظیم کمالات کا شاہکار اور نمونہ ہے، شاید اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن حکیم میں تین سو دس مرتبہ مذکور ہے۔ لفظ "السَّمَاء" ایک سو بیس مرتبہ، اور صیغہ جمع "السَّمٰوٰت" ایک سو نوے مرتبہ مذکور ہے، اور ہر جگہ ایک خاص انداز کے ساتھ۔

﴿وَّهُمۡ عَنۡ اٰيٰتِهَا مُعۡرِضُوۡنَ﴾ اور وہ لوگ (اب بھی) اس کی نشانیوں سے اعراض کئے ہوئے ہیں، ان کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی ان عظیم، محیر العقول، عجیب وغریب قدرتی مظاہر میں خوب غور وفکر کریں، اور اس کی معرفت وشناخت حاصل کریں، پھر اس کی اُلوہیت و وحدانیت کا اقرار کر کے بندگی کا حق ادا کریں، اور جہنم کی ابدی تباہ کن عذابوں سے نجات حاصل کریں۔

﴿وَهُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ الَّيۡلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمۡسَ وَالۡقَمَرَ﴾ اور وہی ہے جس نے پیدا فرمایا لیل ونہار کو (رات، دن کو) اور سورج چاند کو (مہر وماہ کو) اللہ تعالیٰ نے زمین کو نیچے اور آسمان کو اوپر پیدا کیا ہے، پھر ان دونوں کے درمیانی فضاء میں چاند اور سورج کو پیدا کر کے رات اور دن کا نظام مرتب فرمایا ہے، زمین کے ایک حصے پر رات ہوتی ہے تو دوسرے حصے پر دن ہوتا ہے، ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ پوری زمین پر بیک وقت رات ہو، یا بیک وقت دن ہو۔ اسی طرح رات اور دن بدل بدل کر ہر حصہ زمین پر آتے رہتے ہیں، یہی حال سورج کا بھی ہے کہ رات دن اسی پر

موقوف ہیں، اور اسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔

زمین کی انتہائی آخری اطراف میں رات اور دن بہت لمبے ہوتے ہیں، یہاں تک کہ شمال کے بعض مقامات پر چھ ماہ کی رات اور چھ ماہ کا دن ہوتا ہے، وہاں سال نام ہے صرف ایک رات ایک دن کا، اور بعض مقامات پر تئیس گھنٹہ رات ہوتی ہے، اور روزانہ صرف ایک گھنٹہ دن ہوتا ہے، اسی طرح قدرت کے عجائبات کا نظام زمین کے مختلف حصوں میں الگ اور جدا ہی ہوتا ہے۔

البتہ عام متمدن دنیا میں رات اور دن چوبیس گھنٹے میں مکمل ہو جاتے ہیں، کبھی دن قدرے بڑے اور راتیں چھوٹی ہوتی ہیں، اور کبھی راتیں بڑی اور دن چھوٹے ہوتے ہیں، اور یہ دن رات کی یہ کمی بیشی اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے، جو سورج اور چاند کی گردش پر مبنی ہوتی ہے، پھر اسی گردش سے موسموں میں تبدیلی اور تغیر پیدا ہوتا ہے، جس کی حکمت کا اندازہ اسی ذات کو معلوم ہے، اور فوائد و برکات ہر عقلمند انسان کو معلوم ہیں جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ اس پر گواہ ہے کہ کبھی گرمی، کبھی سردی، کبھی خزاں اور کبھی بہار، یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کا شاہکار اور اس کی وحدانیت کی واضح دلیل ہیں۔ اگر ہمیشہ رات ہوتی یا ہمیشہ دن کا راج ہوتا تو دنیا کا نظام دگرگوں و منتشر ہو جاتا، اور زندگیاں تلخ ہو جاتیں، کچھ کام انجام پاتے اور کچھ ادھورے نامکمل رہ جاتے، اور نظام درہم برہم ہو جاتا۔ سورۂ قصص میں ان شاء اللہ تعالیٰ تفصیل آنے والی ہے۔

دنیا کا یہ پیارا نظام اور امن و سکون کی زندگی، ترقی و خوشحالی کا وجود و پیغام اس موجودہ نظامِ حیات میں ہے، وہ کسی اور نظام میں نہیں، جہاں کائنات کے واحد لاشریک ربّ نے اس کی صحیح اور ہموار، معتدل و مناسب تخلیق فرمائی وہاں اس کی بقاء و خوشحالی کیلئے جو نظام مرتب فرمایا کہ جس سے بہتر کسی نظام کا تصور بھی ممکن نہ ہو، یہی مطلب ہے آیت کریمہ: ﴿الَّذِيْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ﴾ [السجدة:٧] (وہ ذات جس نے جو چیز بھی پیدا کی اسے خوب بنایا) کا۔

فرمایا: ہم نے سورج اور چاند کو بھی اپنی نشانیوں کے طور پر تخلیق کیا ہے، ان دونوں کی تخلیق بھی کمال قدرت پر مبنی ہے، اور بہت سی حکمتوں پر مشتمل ہے، اور اسی پر رات دن ہفتوں مہینوں، سالوں اور قرنوں کا دار و مدار ہے۔

سورۂ یٰس میں فرمایا: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۝٣٨ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝٣٩ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝٤٠﴾ [یٰس] (اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جا رہا ہے۔ یہ سب اس ذات کا

مقرر کیا ہوا نظام ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کا علم بھی کامل ہے۔ اور ہم نے چاندی کی منزلیں ناپ تول کر مقرر کردی ہیں، یہاں تک کہ وہ جب لوٹ کر آتا ہے تو کھجور کی پرانی ٹہنی کی طرح ہو کر رہ جاتا ہے۔ نہ تو سورج کی یہ مجال ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے، اور نہ رات دن سے آگے نکل سکتی ہے، اور یہ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں)۔

آیت کریمہ ﴿كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ پورے قرآن کریم میں انہی دونوں مقامات پر مذکور ہے، فرمایا: چاند اور سورج ہر ایک اپنے اپنے فلک (دائرے) میں تیر رہے ہیں، جس طرح مچھلی پانی میں تیر رہی ہے، یہ دونوں ستارے اور دیگر تمام کواکب و آسمانی سیارے اپنے اپنے افلاک میں تیر رہے ہیں۔

فلک کیا ہے؟ کیا آسمان اور فلک دونوں ایک چیز ہیں؟ کیا چاند و سورج اور دوسرے سیارے آسمانوں میں اس طرح جڑے ہوئے پیوست ہیں جس طرح چھت میں بلب یا پنکھا وغیرہ؟

جواب قدیم فلاسفہ یونان یہ کہتے ہیں کہ فلک اور آسمان ایک چیز کے دو نام ہیں، اور وہ فلک کی یہ تعریف کرتے ہیں: بِاَنَّهٗ حَیٌّ عَالِمٌ مُتَحَرِّکٌ بِالْاِرَادَةِ حَرْکَةً مُسْتَدِيْرَةً وَلَا يَقْبَلُ الْخَرْقَ وَالْاِلْتِيَامَ۔ یعنی فلک زندہ ہے، عالم ہے، اپنے ارادہ سے گول حرکت کرتا ہے، پھٹنے اور جڑنے کو قبول نہیں کرتا، کیونکہ فلاسفہ سارے منکرین خدا ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور تصرف سے منکر ہیں، وہ عقول عشرہ کے چکر میں گم ہیں، وہ کائنات کو مخلوق کی بجائے قدیم سمجھتے ہیں، وہ قیامت کے اور آسمانوں، زمینوں اور پہاڑوں کے شکست و ریخت کے منکر ہیں، وہ ستاروں اور سورج اور چاند کو آسمانوں کی چھت کے ساتھ اسی طرح جڑے ہوئے مانتے ہیں جیسے لکڑی میں کیل اور چھت میں بلب جڑا ہوا ہوتا ہے، وہ سیاروں کو ساکن مانتے ہیں، اور آسمانوں کو متحرک جب آسمان حرکت طبعی کرتا رہتا ہے، تو جڑے ہوئے ستارے تبعاً متحرک معلوم ہوتے ہیں۔ وہ آسمانوں کو بجائے سات کے نو مانتے ہیں، اور انہیں افلاک کہتے ہیں جو کہ نو ہیں۔

علماء اسلام اور مسلمان سائنسدانوں نے فلاسفہ یونان کے گمراہ کن اور بے بنیاد خیالات کا بطلان ثابت کیا ہے، اور ان کی نظریات کو عقل و نقل کی روشنی میں غلط اور بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ اس کی مختصر تشریح سورۂ ملک کی تفسیر میں دیکھیں۔

علماء اسلام بشمول مفسرین کرام کے نزدیک آسمان اور فلک دونوں ایک نہیں، بلکہ یہ علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، مثلاً (١) آسمان بہت اوپر ہیں اور افلاک نیچے۔ (٢) آسمان اجسام ہیں، جبکہ افلاک فضائی راستے ہیں۔ (٣) آسمان

صرف سات ہیں جبکہ افلاک بے شمار۔ (۴) شمس وقمر اور سیارے آسمانوں سے بہت نیچے افلاک (فضائی دائرے) میں تیر رہے ہیں، ہر ایک کا فلک جدا ہے، اسی طرح ہر ستارہ کا فلک علیحدہ ہے۔ آسان بات یہ ہے کہ جیسے ہمارے زمانے میں ہزاروں ہوائی جہازوں کے فضاء میں "روٹ" ہیں جن میں وہ سفر کرتے ہیں اسی روٹ کو ہم فلک کہہ سکتے ہیں۔

صاحب روح المعانی لکھتے ہیں: قَالَ اَکْثَرُ الْمُفَسِّرِیْنَ ھُوَ (اَلْفَلَکُ) مَوْجٌ مَکْفُوْفٌ تَحْتَ السَّمَاءِ یَجْرِیْ فِیْهِ الشَّمْسُ وَ الْقَمَرُ۔ یعنی فلک ایک موج کا نام ہے، جسے اس کے طبقہ میں روک دیا گیا ہے، وہ آسمان کے نیچے ہے، اور شمس وقمر اسی میں محو حرکت ہیں۔ اور امام ضحاکؒ جو کہ مشہور مفسر ہیں ان کا قول ہے کہ فلک کسی ایسی چیز کا نام نہیں جس کا کوئی جسم ہو، بلکہ جہاں یہ سیارے گردش کرتے ہیں ان کے مدار کا نام ہے۔ (مدار سے مراد وہ مخصوص راستہ اور مقام گردش سیارہ ہے)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا اس باب میں یہی قول مشہور ہے، اور بڑے پایہ کے مفسرین حضرات جیسے امام رازیؒ، ابوحیان اندلسیؒ بھی یہی کہتے ہیں۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں جس کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے کہ کواکب اور سیارے فلک میں چلتے ہیں، اور یہ آسمانوں سے نیچے ہیں، چاند سب سے نچلے فلک میں ہے، اس سے اوپر عطارد، پھر زہرہ، پھر سورج، پھر مریخ، پھر مشتری، پھر زحل۔ آٹھویں کو فلک البروج، نویں کو فلک اعظم کہتے ہیں، ان سب سے اوپر سبع سمٰوات ہیں۔ ابن زید نے فرمایا کہ شمس وقمر اور ستاروں کے مدار کا نام فلک ہے۔ [تفسیر قرطبی]

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ خالق ومالک کائنات کی کتاب ہے، وہ حقائق اشیاء اور کائنات کی چیزوں کے بیان کرنے میں امین ہے، وہ انہیں حقائق کا انکشاف کرتا ہے جن حقائق پر اللہ تعالیٰ نے چیزوں کو پیدا فرمایا، قرآن حکیم من وعن انہی کو بیان کرتا ہے، پس حق وہ ہوگا جس کو قرآن حکیم بیان کرے گا، کیونکہ اس کا بیان علیٰ وجہ البصیرت ہی ہے۔ بخلاف قدیم وجدید سائنسدانوں کے، وہ رجماً بالغیب کسی چیز کے متعلق تحقیق کرنے کے بعد بسا اوقات اسے غلط کہہ کر اس سے رجوع کرتے ہیں، لہٰذا قدیم تحقیقات اور جدید انکشافات کا وہی حصہ درست ہوا جس کی تائید قرآن مجید سے ملتی ہے، اور جو حصہ قرآن کریم کی تصریحات کے خلاف ہوگا وہ غلط ہوگا، اور ناقابل قبول ہوگا، آج نہیں تو کل اس کے علمبردار خود اپنی غلطی کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، موجودہ دنیا میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔

وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ اَفَا۟ئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ ﴿۳۴﴾ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ
وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ وَاِلَيۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ ﴿۳۵﴾ وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ يَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا
هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِىۡ يَذۡكُرُ اٰلِهَتَكُمۡ ۚ وَهُمۡ بِذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ ﴿۳۶﴾ خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ
سَاُورِيۡكُمۡ اٰيٰتِىۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۳۷﴾ وَيَقُوۡلُوۡنَ مَتٰى هٰذَا الۡوَعۡدُ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۸﴾ لَوۡ يَعۡلَمُ
الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا حِيۡنَ لَا يَكُفُّوۡنَ عَنۡ وُّجُوۡهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ وَلَا هُمۡ يُنۡصَرُوۡنَ ﴿۳۹﴾ بَلۡ
تَاۡتِيۡهِمۡ بَغۡتَةً فَتَبۡهَتُهُمۡ فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ رَدَّهَا وَلَا هُمۡ يُنۡظَرُوۡنَ ﴿۴۰﴾ وَلَقَدِ اسۡتُهۡزِئَ بِرُسُلٍ مِّنۡ
قَبۡلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِيۡنَ سَخِرُوۡا مِنۡهُمۡ مَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ سے پہلے کسی بشر کیلئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا ﴿۳۴﴾ اگر آپ کی وفات ہو جائے تو یہ لوگ کیا ہمیشہ رہیں گے؟ ﴿۳۵﴾ ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے، اور ہم تمہیں بری اور بھلی حالتوں کے ذریعہ اچھی طرح آزماتے ہیں، اور تم ہماری ہی طرف واپس کر دیئے جاؤ گے ﴿۳۶﴾ اور جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو بس آپ کو ہنسی کا ذریعہ بنا لیتے ہیں، کیا یہی ہے وہ جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے؟ اور وہ رحمٰن کے ذکر کا انکار کرتے ہیں ﴿۳۷﴾ انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے، میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھادوں گا، سو تم مجھ سے جلدی مت مچاؤ ﴿۳۸﴾ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ ﴿۳۹﴾ اگر کافر لوگ اس وقت کا جان لیتے جب اپنے چہروں سے آگ کو نہ روک سکیں گے، اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی ﴿۴۰﴾ بلکہ وہ آگ اچانک ان کے پاس آجائے گی، سو وہ انہیں بدحواس کر دے گی، سو وہ اسے نہ ہٹا سکیں گے اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی ﴿۴۱﴾ اور یہ واقعی بات ہے کہ آپ سے پہلے رسولوں کے ساتھ تمسخر کیا گیا، سو جن لوگوں نے ان کا تمسخر کیا انہیں وہ چیز پہنچ گئی جس کا وہ استہزاء کیا کرتے تھے ﴿۴۲﴾

معارف ومنازل

اہل مکہ اور دیگر مشرکین آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے رخصت ہونے کا شدت کے ساتھ خواہشمند تھے، اور انتظار کر رہے تھے، اور یہ کہا کرتے تھے کہ ان کی باتیں مختصر چند دن تک رہیں گی جوں ہی وہ دنیا سے رخصت ہوں گے ان کا دین اور پروگرام سب ختم ہو جائے گا، پھر کوئی ان کا نام تک لینے والا نہ ہوگا۔ سورۂ طور میں اسی کو فرمایا:

﴿ اَمۡ یَقُوۡلُوۡنَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیۡبَ الۡمَنُوۡنِ ﴾ [الطور: ۳۰] (بھلا کیا یہ لوگ یوں کہتے ہیں کہ: یہ صاحب شاعر ہیں جن کے بارے میں ہم زمانے کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں؟)۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ خود انہیں دنیا میں کتنے دن رہنا ہے، اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلۡنَا لِبَشَرٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ الۡخُلۡدَ ؕ﴾ کہ ہم نے آپ سے پہلے کسی انسان کیلئے ہمیشہ رہنا تجویز نہیں کیا، دنیا میں جو بھی آیا جانے کیلئے آیا، یہاں رہنے کیلئے نہیں آیا۔

﴿ اَفَا۟ئِنۡ مِّتَّ فَهُمُ الۡخٰلِدُوۡنَ۝۳۴﴾ اگر آپ کی وفات ہوگئی تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے؟ مرنا تو ان کو بھی ہے، مگر وہ مر کر بے نام ونشان ہوں گے، اور آپ کا ذکر خیر و پیغام حق رہتی دنیا تک پورے آفاق میں جگمگائے گا، اور تیرے دشمنوں کے مقدر میں یہ لکھا ہوا ہے: ﴿اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الۡاَبۡتَرُ﴾ [الکوثر: ۳] (بیشک تمہارا دشمن ہی وہ ہے جس کی جڑ کٹی ہوئی ہے)۔ تو آپ کی آمد یہاں رہنے کیلئے ہے، جانے کیلئے نہیں۔ پھر فرمایا:

﴿ كُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ ؕ﴾ ہر جان موت کو چکھنے والی ہے، یہاں جب سب کو مرنا ہے اور قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حضور جمع ہونا ہے تو تمہیں چاہئے کہ اپنی عاقبت وانجام کی فکر کرو، اور قیامت کے ابدی عذاب سے نجات حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی توحید کا اقرار کرو، اور میری موت کے انتظار میں رہنے کی بجائے میری تصدیق کرو، اور ایمان لاؤ، اس طرح تم قیامت کے دن میری شفاعت کا مستحق بنو، اور جنتی بن جاؤ۔

موت اللہ تعالیٰ کا وہ حتمی اور اٹل فیصلہ ہے جس سے کوئی مخلوق مستثنیٰ نہیں، سرور کائنات ﷺ سے پہلے جو انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے تھے وہ سب وفات پاگئے، لہٰذا کفار کا یہ انتظار کرنا کہ جب وہ وفات پائیں گے تو ہم لوگوں کو یہ بتائیں گے کہ اگر یہ نبی برحق ہوتے تو وفات کیوں پاتے؟ یہ ان کی ناسمجھی اور حماقت کی دلیل ہے۔ مزید ارشاد ہے:

﴿وَنَبۡلُوۡكُمۡ بِالشَّرِّ وَالۡخَيۡرِ فِتۡنَةً ؕ﴾ ہم تمہیں بطور آزمائش خیر اور شر کے ساتھ آزمائیں گے، یعنی تمہارا امتحان کریں گے، اس زندگی میں اچھی حالت بھی پیش آئے گی (جیسے تندرستی، مالداری، اہل وعیال کی فراوانی وغیرہ) اور بدحالت بھی پیش آئے گی (جیسے بیماری، تنگدستی مال، اولاد کا مرنا اور نقصان ہونا، وغیرہ)۔ یہ چیزیں انسانی زندگی کے لوازمات ہیں، اور یہ سب چیزیں آزمائش کے طور پر پیش آتی ہیں۔ سورۂ ملک میں فرمایا: ﴿الَّذِیۡ خَلَقَ الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ لِیَبۡلُوَكُمۡ اَیُّكُمۡ اَحۡسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ [الملک: ۲] (جس نے اور موت زندگی کو پیدا کیا ہے تاکہ تمہیں

آزمائے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے)۔ تاکہ معلوم کیا جائے کون ایمان لاتا ہے، اور کون کفر کرتا ہے، اور کون شکر یا صبر کرتا ہے، اور کون ناشکری اور بے صبری کرتا ہے۔

بعض اوقات کافر دنیاوی اعتبار سے آرام اور آسائش میں ہوتے ہیں، اور اہل ایمان مشکل اور تنگدستی میں ہوتے ہیں، ان فقرا و مساکین کو دیکھ کر کفار یہ سمجھتے اور کہتے ہیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کے محبوب بندے ہیں، اور ہمارا مذہب برحق ہے، اس لئے ہم خوشحال اور آسائش میں ہیں، اہل ایمان اگر پسندیدہ اور اچھے ہوتے تو خوار و بدحال نہ ہوتے، اللہ تعالیٰ انہیں سب کچھ دیدیتے۔ آخر میں فرمایا:

﴿وَاِلَیۡنَا تُرۡجَعُوۡنَ۝۳۵﴾ دنیاوی امتحانات سے گزر کر نتیجہ اور انجام خیر یا شر پانے کیلئے ہمارے پاس لوٹائے جاؤ گے، جہاں خیر و شر اور حق و ناحق کے فیصلے کردیئے جائیں گے۔ پھر فرمایا:

﴿وَاِذَا رَاٰكَ الَّذِیۡنَ كَفَرُوۡۤا اِنۡ یَّتَّخِذُوۡنَكَ اِلَّا هُزُوًا ؕ﴾ جب کافر لوگ آپ کو دیکھتے ہیں تو آپ کی ذات کو تمسخر کا ذریعہ بناتے ہیں؛ اور بطور مذاق یہ کہتے ہیں: کیا یہی شخص ہے جو تمہارے معبودوں کا ذکر کرتا ہے، اور ان کا انکار کرتا ہے؟ اور ان کی مذمت کرتا ہے؟ اور ان کی عبادت کو حرام کہتا ہے؟ اور ان کو بے جان اور مردہ کہتا ہے؟ ان کے بارے میں اور بہت سی باتیں کہتا ہے؟ یہ بات وہ آپ کی شان معظم کو گھٹانے کیلئے کہتے تھے، اور ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ یہ شخص دنیاوی جاہ و مرتبہ والا نہیں، اس کے پاس کوئی قبیلہ و قوم بھی نہیں، اور نہ ہی مالدار ہے، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ان کمزوریوں کے ہوتے ہوئے خدا کا رسول ہو، یہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔

﴿وَهُمۡ بِذِكۡرِ الرَّحۡمٰنِ هُمۡ كٰفِرُوۡنَ۝۳۶﴾ اور یہ لوگ رحمٰن کے ذکر کے منکر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سرور عالم ﷺ ان کے بارے میں کہتے ہیں، لیکن کفار کی حماقت و جہالت کا یہ عالم ہے کہ وہ معبود حقیقی رحمن جل شانہ کے ذکر اور اس کی توحید و عبادت سے سراسر منکر ہیں، انہیں چاہئے تھا کہ باطل بتوں کا آستانہ چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی صفات جلیلہ اور کمالات عظیمہ کے آگے سجدہ ریز ہوکر جھک جاتے۔ مزید فرمایا:

﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ﴾ انسان جلدی سے پیدا کیا گیا ہے، وہ ہر معاملے میں عجلت پسند اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے، اس جلد بازی کی وجہ سے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو بھی دعوت دیتا ہے، بلکہ عذاب کے آنے کا مطالبہ بھی کرتا رہتا ہے، اسی کے بارے میں فرمایا:

﴿سَاُورِیۡكُمۡ اٰیٰتِیۡ فَلَا تَسۡتَعۡجِلُوۡنِ۝۳۷﴾ سو میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا تاکہ تم اپنے راج

اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے انکار کرتے رہو، اور تم پر اتمام حجت بھی قائم ہوتا رہے، جس کی وجہ سے ایک جزوی ہی سہی عذاب کا نزول ہو، جس سے تمہارا غرور دب جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، مختصر مدت کے بعد جنگ بدر کے موقع پر ستر کے قریب سردارانِ قریش مارے گئے، اور ایسے مارے گئے کہ نہ مارنے والوں نے سمجھا اور نہ مرنے والوں کے وہم و گمان میں تھا۔ اسی طرح ان کے ستر آدمی قیدی بھی بنائے گئے، کہاوت مشہور ہے کہ اللہ تعالیٰ کی لاٹھی کی آواز نہیں ہوتی۔

﴿وَيَقُولُونَ مَتَىٰ هَٰذَا الْوَعْدُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿٣٨﴾﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب پورا ہوگا اگر تم سچے ہو؟ وہ بار بار تکذیب کرتے تھے، جب انہیں عذاب سے ڈرایا جاتا تو استہزأ کہتے تھے کہ اب ہمیں عذاب سے ڈراتے ہیں، اگر تمہارا والا عذاب برحق اور سچ ہے تو اس کو لے آؤ، تمہارا عذاب آتا کیوں نہیں؟ معلوم ہوتا ہے یہ محض تخویف ہے، جس کی کوئی حقیقت اور وجود نہیں۔ اس طرح کے مطالبے قرآن مجید میں بکثرت موجود ہیں۔ فرمایا:

﴿لَوْ يَعْلَمُ الَّذِينَ كَفَرُوا حِينَ لَا يَكُفُّونَ عَن وُجُوهِهِمُ النَّارَ وَلَا عَن ظُهُورِهِمْ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ﴿٣٩﴾ بَلْ تَأْتِيهِم بَغْتَةً فَتَبْهَتُهُمْ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ رَدَّهَا وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ﴿٤٠﴾﴾ اگر کافروں کو اس وقت کی خبر ہوتی جب وہ نہ اپنے چہروں سے آگ کو ہٹا سکیں گے، اور نہ اپنی پشتوں سے، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی، بلکہ وہ آگ ان کے پاس اچانک آجائے گی، سو وہ انہیں بدحواس بنا دے گی، پھر وہ اسے ہٹا نہ سکیں گے، اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ یعنی دوزخ کی آگ ایسے لوگوں کو چار طرف سے گھیر کر اپنے اندر پھینک دے گی، اور انہیں اپنے لپیٹ میں لے گی۔

﴿لَوْ يَعْلَمُ﴾ کا جواب یہ ہے کہ اگر انہیں اس عذاب کا علم ویقین ہوجاتا تو ایسی باتیں نہ بناتے، اور حق کی تکذیب نہ کرتے، اور نہ ہی عذاب کا مطالبہ کرتے۔

﴿وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّن قَبْلِكَ فَحَاقَ بِالَّذِينَ سَخِرُوا مِنْهُم مَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ ﴿٤١﴾﴾ البتہ تحقیق استہزاء کیا گیا رسولوں کے ساتھ آپ سے پہلے، ان کفار نے ہر زمانہ میں اجتماعی اور انفرادی ہر طور پر اللہ تعالیٰ کے ہر نبی اور ہر رسول کے ساتھ اسی طرح مذاق کیا جس طرح آپ کے ساتھ کیا جارہا ہے، یہ تکذیب واستہزاء کافروں کا پرانا شیوہ اور پرانی رسم ہے، جیسے سورۃ یٰس میں فرمایا: ﴿يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِم مِّن رَّسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ﴾ [یس] (ہائے افسوس بندوں پر، ان کے پاس کوئی رسول نہیں آئے مگر انہوں نے ان کا

مذاق اڑایا)۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب آیا، اور استہزاء کرنے والوں کو گھیر کرانہیں تباہ کیا۔ یعنی جب عذاب کو وہ مانتے نہیں تھے، اور اسے مذاق سمجھتے تھے، وہی عذاب ان پر نازل ہوا، اور ان کو گھیرے میں لے لیا، اور اس سے بچ کر نکلنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے، اس طرح استہزاء کی سزا ان کو مل گئی جو تباہ ہو گئے۔

قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝٤٢ اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا ؕ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ ۝٤٣ بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝٤٤ قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ۖ وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ ۝٤٥ وَلَئِنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ۝٤٦

ترجمہ: آپ فرمادیجئے: وہ کون ہے جو رات میں اور دن میں رحمٰن سے تمہاری حفاظت کرتا ہے؟ بلکہ وہ لوگ اپنے ربّ کی توحید سے اعراض کے ہوئے ہیں ۝٤٢ کیا ہمارے سوا ان کیلئے ایسے معبود ہیں جو ان کی حفاظت کرتے ہوں؟ وہ اپنی جانوں کی حفاظت نہیں کر سکتے، اور نہ ہمارے مقابلہ میں کوئی شخص ان کا ساتھ دے سکتا ہے، بلکہ ہم نے انہیں اور ان کے باپ دادوں کو خوب سامان دیا، یہاں تک کہ ان پر ایک عرصۂ دراز گزر گیا، کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اس کے کناروں سے گھٹا رہے ہیں، کیا وہ غالب آنے والے ہیں؟ ۝٤٤ آپ فرمادیجئے: بات یہی ہے کہ میں تمہیں وحی کے ذریعہ ڈراتا ہوں، اور گونگے لوگ پکار کو نہیں سنتے، جبکہ وہ ڈرائے جاتے ہیں ۝٤٥ اور اگر آپ کے ربّ کی طرف سے انہیں عذاب کا ایک جھونکا لگ جائے تو ضرور یوں کہیں گے کہ ہائے ہماری کمبختی! واقعی ہم ظالم تھے ۝٤٦

معارف ومنازل

سارے جہان کا خالق و مالک بھی رحمٰن جل شانہ ہے، اور محافظ بھی، جس طرح اس کے علاوہ کوئی محافظ نہیں اسی طرح اس کے سوا کوئی معبود بھی نہیں، اور اس کے عذاب سے کوئی بچانے والا بھی نہیں، تو فرمایا:

﴿قُلْ مَنْ يَّكْلَؤُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ مِنَ الرَّحْمٰنِ ؕ﴾ کون ہے جو رات دن تمہاری نگرانی اور حفاظت کرتا ہے خدائے رحمٰن کی گرفت سے؟ کیا تم خود اپنی حفاظت کرتے ہو یا تمہارے معبودان باطلہ تمہاری حفاظت

کرتے ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ تمام کائنات کے ذرہ ذرہ کا محافظ صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ ﴿وَرَبُّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ﴾ [سبأ] (اور تمہارا پروردگار ہر چیز پر نگہباں ہے)۔ ﴿اِنَّ رَبِّیْ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ حَفِیْظٌ﴾ [ھود] (بیشک میرا پروردگار ہر چیز پر نگہباں ہے)۔ ﴿فَاللّٰهُ خَیْرٌ حٰفِظًا ۪ وَّهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ﴾ [یوسف] (پس اللہ بہترین نگہباں ہے، اور وہ سب سے بڑا رحم کرنے والا ہے)۔

ساری مخلوقات کی حفاظت کا انتظام خود اللہ تعالیٰ شانہ نے کر رکھا ہے، خاص طور پر انسان کی حفاظت کیلئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں کو مقرر کر رکھا ہے، بعض فرشتے انسان کے اعمال کی حفاظت کرتے ہیں، اور بعض انہیں جسمانی طور پر حوادثات سے بچانے پر مامور ہیں، فرمایا: ﴿وَاِنَّ عَلَیْكُمْ لَحٰفِظِیْنَ ۝ كِرَامًا كَاتِبِیْنَ﴾ [الانفطار] (اور بیشک تمہارے اوپر نگراں فرشتے ہیں۔ معزز لکھنے والے)۔ اور سورۂ ق میں فرمایا: ﴿مَا یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ﴾ [ق] (انسان کوئی لفظ زبان سے نکال نہیں پاتا مگر اس پر ایک نگراں مقرر ہوتا ہے، ہر وقت تیار)۔ اور سورۂ قمر میں فرمایا: ﴿وَكُلُّ شَیْءٍ فَعَلُوْهُ فِی الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِیْرٍ وَّكَبِیْرٍ مُّسْتَطَرٌ﴾ [القمر] (اور جو جو کام انہوں نے کیے ہیں وہ سب اعمال ناموں میں درج ہیں۔ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے)۔

بہرحال اعمال واقوال کی حفاظت کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے خود انسانوں کی حفاظت کا مکمل انتظام کر رکھا ہے ارشاد ہے: ﴿لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ یَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ﴾ [الرعد: ١١] (اس کے آگے اور پیچھے خدائی محافظ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی حفاظت کرتے ہیں) اور مختلف آفات وبلیات، جنات اور شیاطین سے اس کی حفاظت کرتے ہیں پھر جب اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی ہے اور تقدیر مبرم کا فیصلہ قریب آجاتا ہے تو انسان سے حفاظت اٹھائی جاتی ہے، اور وہ کسی حادثے کا شکار ہو جاتا ہے۔

اور کرم بالائے کرم یہ ہے کہ یہ حفاظت صرف مسلمانوں کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسی طرح کفار ومشرکین بھی رزق وروزی کی طرح اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

﴿بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ﴾ مگر یہ لوگ اپنے پروردگار کے ذکر سے اعراض کرنے والے ہیں۔

﴿اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا﴾ کیا ان کے کوئی معبود ہیں جو ہمارے سوا ان کو بچاتے ہیں؟ یعنی حوادث ومصائب سے ان کی حفاظت کرتے ہیں۔ پھر خود ہی جواب دیا:

﴿لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ۝﴾ وہ بے جان وبے حرکت بے چارے تو خود اپنی مدد نہیں کرسکتے، چہ جائیکہ دوسروں کی مدد کرسکیں۔ بے جان چیزیں تو ویسے ہی ناکارہ ہوتی ہیں، جہاں چاہا پھینک دیا، پڑی رہتی ہیں، ان کے ساتھ جو چاہو سلوک کرلو، وہ تو فریاد کرنے پر بھی اور بولنے یا سننے یا دیکھنے پر قادر نہیں، خواہ انہیں توڑ پھوڑ دیا جائے۔ اور جو جاندار ہیں مثلاً ملائکہ اور جنات یا انسانوں میں سے انبیاء کرام علیہم السلام اور اولیاء تو ان کو بھی اختیار نہیں کہ وہ کسی کی غائبانہ مافوق الاسباب مدد کرسکیں۔ قرآن کریم بار بار بنی اسرائیل قوم کی مذمت کرتا ہے کہ انہوں نے بہت سے انبیاء علیہم السلام کو شہید کیا، سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم خود اعلان فرمارہے ہیں: ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰهُ﴾ [الأعراف:] (آپ کہہ دیں: میں اپنے آپ کے لیے نہ کسی نفع کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی نقصان کا، مگر جو کچھ اللہ چاہے)۔ ﴿قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا۝ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۝﴾ [الجن] (کہہ دیں کہ: نہ تمہارا کوئی نقصان میرے اختیار میں ہے، اور نہ کوئی بھلائی۔ کہہ دیں کہ: مجھے اللہ سے نہ کوئی بچا سکتا ہے، اور نہ میں اسے چھوڑ کر کوئی پناہ کی جگہ پا سکتا ہوں)۔

میں تمہارے حق میں کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں، ہر قسم کے اختیارات اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہیں، میرا کام یہ ہے کہ میں وحی الٰہی کا خود بھی اتباع کروں اور لوگوں تک بھی پہنچادوں، کسی کو منزل مقصود تک پہنچا دینا میرے اختیار میں نہیں، یہ ہدایت صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ فرمایا: تمہارے معبودانِ باطلہ نہ تو خود اپنی مدد کرسکتے ہیں، اور نہ ہماری طرف سے ان کی تائید کی جاتی ہے کہ وہ جس طرح چاہیں کریں، بلکہ حقیقت حال یہ ہے:

﴿بَلْ مَتَّعْنَا هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ﴾ بلکہ ہم نے ان کافروں اور مشرکوں اور ان کے آباء واجداد کو بھی فائدہ پہنچایا، ان کو پیدا فرمایا، اور ان کی حفاظت کی، انہیں مال واولاد عطا کیا، صحت وتندرستی بھی عطا فرمائی، ہر قسم کے سامان زیست فراوانی کے ساتھ عطا کیا، وغیرہ۔

﴿حَتّٰى طَالَ عَلَيْهِمُ الْعُمُرُ ؕ﴾ یہاں تک کہ ان کی عمریں لمبی ہوگئیں، اور پوری زندگی خوشحالی میں گزاری اور ہماری نعمتوں کی ناقدری کی، توحید کو چھوڑ کر شرک کو اپنایا، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی تکذیب کی۔

﴿اَفَلَا يَرَوْنَ اَنَّا نَاْتِي الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا ؕ﴾ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ہم زمین کو اطراف سے گھٹاتے آرہے ہیں، یعنی کفار کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل رہی ہے، اور مسلمانوں کے قبضہ میں آرہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام کی ترویج کے ساتھ ساتھ کافروں کا تنزل شروع ہو چکا ہے، اوران پر زمین تنگ ہو رہی ہے، اور ان کے علاقوں پر مسلمانوں کا تسلط قائم ہو رہا ہے، یہاں تک کہ آنحضرت سرور عالم ﷺ کے وصال تک عرب کا سارا خطہ کفر وشرک سے پاک ہو چکا تھا، اور پورا جزیرہ مسلمانوں کے قبضہ میں آچکا تھا۔

﴿اَفَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ۝۴۴﴾ کیا یہ مشرک اب بھی غلبے کی توقع رکھے ہوئے ہیں؟

﴿قُلْ اِنَّمَآ اُنْذِرُكُمْ بِالْوَحْيِ ڮ﴾ آپ ان سے فرما دیجئے کہ میں تمہیں وحی کے ذریعہ ڈراتا ہوں، مگر بدقسمتی تمہاری یہ ہے کہ:

﴿وَلَا يَسْمَعُ الصُّمُّ الدُّعَآءَ اِذَا مَا يُنْذَرُوْنَ۝۴۵﴾ کہ جتنا بھی ڈرایا جائے بہرے لوگ اس پکار کو سنتے ہی نہیں، اللہ تعالیٰ نے کافروں کو مردوں کے ساتھ تشبیہ دی ہے جو بظاہر زندوں کی بات نہ سنتے ہیں، اور نہ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں، یا بہروں کے ساتھ جو سنتے ہی نہیں، یا حیوانات کے ساتھ جو سمجھتے ہی نہیں، اس لئے وعید فرمائی:

﴿وَلَىِٕنْ مَّسَّتْهُمْ نَفْحَةٌ مِّنْ عَذَابِ رَبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۝۴۶﴾ اگر ان کافروں اور مشرکوں پر عذاب الٰہی کا ایک چھینٹا پڑ جائے یعنی ذرا بھی گرفت الٰہی واقع ہو جائے تو کہیں گے: ہائے افسوس! بیشک ہم ہی زیادتی کرنے والے تھے، یہ ہماری غلطیوں کا نتیجہ ہے، اس وقت ان کا غرور وسرکشی ختم ہو کر وہ اپنے قصور وجرائم کا اقرار کریں گے۔

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيٰمَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْـًٔا ؕ
وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا ؕ وَكَفٰى بِنَا حٰسِبِيْنَ۝۴۷

ترجمہ: اور قیامت والے دن ہم عدل والی میزان قائم کر دیں گے، سو کسی پر ذرا سا ظلم بھی نہ ہوگا، اور اگر کوئی عمل رائی کے دانہ کے برابر بھی ہوگا تو ہم اسے حاضر کر دیں گے، اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۝۴۷

معارف ومنازل

وزنِ اعمال کی حکمت:

اعمال کے تولنے سے اللہ تعالیٰ کی کوئی غرض وابستہ نہیں، وہ عالم الغیب ہونے کے لحاظ سے اعمال کے ایک

ایک ادنیٰ ذرہ سے باخبر ہے، بلکہ وزن اعمال عدالتی کارروائی کی تکمیل کا ذریعہ ہے:

(١) تاکہ نامۂ اعمال کے ذریعہ خود عمل کرنے والوں کو اپنے اعمال کا علم ہوجائے، اور اگر بھول گئے ہوں تو یاد آجائے، جیسے ڈائری میں دیکھنے سے گزشتہ تمام امور یاد آجاتے ہیں، اور نفسیاتی طور پر تسلیم کرلیں کہ یہ سب کچھ درست ہے، خواہ زبان سے اقرار کریں یا نہ کریں۔

(٢) اسی گزشتہ حکمت کی طرف اشارہ ہے: ﴿اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ۝۱۴﴾ [الإسراء: ١٤] (پڑھ لو اپنا اعمال نامہ! آج تم خود اپنا حساب لینے کے لیے کافی ہو)۔ تم اپنے عمل نامہ خود پڑھو، اور اندازہ کرو۔

(٣) وزن اعمال سے اعمال کی مقدار معلوم ہوجائے، اعمال حسنہ سے اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم کا، اور برے اعمال سے اس کے عدل وانصاف کا ظہور ہوگا۔

(٤) شہادت انبیاء علیہم السلام وشہادت علماء، وصلحاء، ملائکہ، وشہادت اعضاء وشہادت قطعات زمین سے یہ ظاہر کیا جائے کہ جو کچھ عدالتی کاروائی ہے وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ (٥) اس سب کاروائی سے یہ بھی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ یہ سب انتظامات کا مقصد یہی نتائج اعمال تھے، اسی کیلئے یہ وسیع انتظامات ہوئے۔

مقام وزن اعمال:

حکیم ترمذیؒ نے نوادر الاصول میں، اور ابو القاسم اللالکائیؒ نے کتاب السنۃ میں نقل کیا ہے کہ میزان نصب کو کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ کے سامنے حسنات کا پلہ عرش سے دائیں طرف اور سیآت کا پلہ عرش سے بائیں طرف ہوگا، حسنات کے بالمقابل جنت کا نظارہ اور سیآت کے بالمقابل جہنم کا نظارہ ہوگا۔ [علوم القرآن]

راجح اور مرجوح کی پہچان:

نیکی اور بدی کے پلڑے کے بھاری اور ہلکے ہونے کی معرفت کی علامت کیا ہوگی؟ اس میں تین قول ہیں:

(١) جمہور کا قول یہ ہے کہ دنیا کے دستور کے مطابق نیچے جھکنے والا پلڑا اس کے بھاری ہونے اور اوپر اٹھنے والا اس کے ہلکے ہونے کی نشانی ہے، جیسے دنیا کے تول ترازو میں یہ قاعدہ ہے۔

(٢) دوسرا قول یہ ہے کہ دنیا کے دستور کے برعکس ہوگا کہ جو پلڑا اوپر اٹھے گا وہ بھاری شمار ہوگا، اور جو نیچے جھکے گا وہ ہلکا شمار ہوگا، کیونکہ حیز اور مرکز آخرت میں تبدیل ہوجاتے ہیں، نیکیوں کا مرکز جنت کی جانب اوپر ہوگا، اور

برائیوں کا مرکز نیچے ہوگا، جہاں دوزخ ہے، یہی قول بدرالدین زرکشیؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ کا ہے۔ [البرهان، فتح العزيز]

(۳) تیسرا قول یہ ہے کہ اگر حسنات کے پلے سے نورانی ستون نکلے تو نیکی کا پلہ بھاری ہے، اور اگر سیآت کے پلے سے ظلمانی اور سیاہ ستون نکلے تو سیات کا پلہ بھاری ہے، اس کو علامہ آلوسیؒ نے تفسیر سورۂ قارعہ میں نقل کیا ہے۔

میزان اور اس کی حقیقت:

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: يُوْضَعُ الْمِيْزَنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَلَوْ وُضِعَ فِيْهِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ لَوَسِعَهٗ۔ یعنی قیامت کے دن ترازو رکھ دی جائے گی اور وہ اتنی بڑی ہوگی کہ اگر تمام آسمان اور زمین اس میں رکھے جائیں تو اس میں سما ہی سکتے ہیں۔ اس حدیث کو حافظ ابن حجرؒ نے بخاری کی آخری حدیث کی شرح میں، حاکمؒ سے بروایت سلمانؓ، اور ابن مردویہؒ سے بروایت عائشہ صدیقہؓ، اور بیہقیؒ سے بروایت انسؓ، اور طبرانی سے بروایت ابوہریرہؓ نقل کی ہے۔ اور سلمانؓ کی روایت ابن المبارکؒ نے کتاب الزہد میں، ابوالقاسم الالسکائیؒ نے کتاب السنۃ، نیز آلوسیؒ نے تفسیر سورۂ اعراف میں نقل کی ہے۔ [علوم القرآن]

موزون لهم کا بیان:

کن اشخاص کے اعمال تولے جائیں گے؟ علامہ قسطلانیؒ نے امام غزالیؒ سے نقل کیا ہے کہ تین گروہ کے اعمال نہیں تولے جائیں گے، باقی سب مکلّفین کے اعمال تولے جائیں گے، وہ تین گروہ: معصومین انبیاء کرام علیہم السلام، اور میرے نزدیک اطفال المسلمین بھی اس میں داخل ہیں، اور مجنونین بھی ہیں۔ دوسرا گروہ جو بلا حساب جنت میں داخل ہوگا وہ چار ارب نوے کروڑ ہیں۔ [البدور السافرة] تیسرا گروہ کفار، کیونکہ اعمال میں باہمی وزن ہوگا، اور اس کیلئے متضاد اعمال کا ہونا ضروری ہے (ایک پلڑے میں نیکی دوسرے میں بدی) جو ان تینوں گروہوں میں نہیں۔

اس طرح سورۂ کہف کی آیت: ﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ [الكهف: ١٠٥] (قیامت کے دن ہم کا کوئی وزن شمار نہیں کریں گے) میں قرآنی تصریح ہے کہ ہم کفار کیلئے وزن قائم نہیں کریں گے۔

لیکن امام بخاریؒ کی رائے میں تعمیم ہے، انہوں نے صحیح بخاری کے آخر میں: "وأن أعمال بني أدم وقولهم يوزن" فرمایا کہ آدم علیہ السلام کی اولاد کا عمل وقول تولا جائے گا۔ یہی قول مختار حافظ ابن حجرؒ اور علامہ آلوسیؒ کا ہے۔

﴿فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴾ [الكهف: ١٠٥] سے مراد وزن سے تول نہیں، بلکہ قدر اور مرتبہ ہے، یعنی

کفار کے اعمال کیلئے اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔

باقی اعمال متضادہ کا جواب امام قرطبیؒ نے یہ دیا ہے کہ ایک پلڑا کفار کا نیکیوں سے خالی ہوگا، کیونکہ کفر کے ساتھ کوئی نیکی نیکی نہیں رہتی، اور دوسرے پلڑے میں کفر اور گناہ ہوں گے تو یہ پلڑا بھاری ہوگا کفار کے صدقات اور خیرات کا تخفیف عذاب میں (یہ بعض علماء کا قول ہے) اثر مانا جائے کیفاً نہ کماً، تو وہ ایک پلڑے میں ہوں گے، اور دوسرے پلڑے میں کفر اور گناہ ہوں گے، تو کفر والا پلڑا بھاری ہوگا۔

تیسرا قول شرح عقائد سبکی میں امام ماتریدیؒ سے منقول ہے کہ کفار کیلئے میزان "تمیز" ہوگا کہ اس کے ذریعہ کفار کے مختلف طبقات میں ان کے اعمال تول کر یہ فیصلہ ہوگا کہ کن کفار کے گناہ زیادہ ہیں، اور کن کے کم، کیونکہ جس طرح مسلمان اعمالِ صالحہ میں ایک جیسے برابر نہیں اسی طرح کفر کے علاوہ دوسرے گناہوں میں سارے کفار بھی ایک جیسے برابر نہیں، پس ابدی عذاب میں شریک ہونے کے باوجود ان کے گناہوں کی کثرت و قلت کے مطابق ان کے مناسب اعمال کے طبقات متعین کئے جائیں گے، اور یہ ظاہر ہے کہ جہنم کے درکات میں اختلاف انہی اعمال کفریہ کے اختلاف کی وجہ سے ہے، تو کیا ایک عام کافر کا عذاب فرعون و نمرود اور ابوجہل کے عذاب جیسا ہوگا؟

حافظ ابن حجرؒ نے بھی قصہ ابی طالب و ابی لہب سے استدلال کر کے کفار کی بعض نیکیوں کو تخفیف عذاب میں مؤثر تسلیم کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء کی رائے میں یہ آنحضرت سرور عالم ﷺ کے ساتھ مخصوص ہے، عام حکم وہی ہے جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے، یعنی: ﴿فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ [البقرة:۸۶] (نہ ان پر سے عذاب کو ہلکا کیا جائے گا، اور نہ ان کی مدد کی جائے گی) جو کہ نص قطعی ہے، اور اپنے عموم پر ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ مؤمنین کی آخری آیت سے کفار کے اعمال کا وزن ثابت ہوتا ہے، وہ یہ ہے: ﴿وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ۝۱۰۳ تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيْهَا كٰلِحُوْنَ۝۱۰۴ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۝۱۰۵﴾ [المؤمنون] () جن کے تول ہلکے ہوں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنے نفسوں کو نقصان میں ڈالے ہوئے ہیں، وہ جہنم میں ہمیشہ رہیں گے۔ دوزخ کی آگ ان کے چہروں کو جلائے گی، اور ان کے منہ اس میں بگڑے ہوئے ہوں گے، ان سے کہا جائے گا: کیا تم کو ہماری آیتیں نہیں سنائی گئیں؟ جن کو تم نے جھٹلایا)۔ اس آیت کریمہ میں جہنم کا خلود اور تکذیب کے فقرہ سے ان کا کافر ہونا ثابت ہوا، اور خفتِ موازین سے ان کے اعمال کا وزن ثابت ہوا۔

بیان الموزون:

میزان میں کیا چیز تولی جائے گی؟ اس میں تین قول ہیں:

(١) ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ اعراض واعمال کو اجسام بنا کر تولا جائے گا، اس کو علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بلفظ: یَقلِبُ اللہ الاَعرَاضَ اَجسَامًا نقل کیا ہے، اور بدور السافرۃ میں شعب الایمان بیہقی سے بلفظ: یُؤتی بِاَحسَنَاتِ بِاَحسَنِ صُورَۃٍ وَیُؤتی بِالسَّیِّاٰتِ بِاَقبَحِ صُورَۃٍ کے ساتھ نقل کیا ہے، یعنی نیکیوں کو اچھی صورت میں اور گناہوں کو بری صورت میں لایا جائے گا، اس قول کو طیبی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مشکوٰۃ میں ترجیح دی ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ نامہائے اعمال تولے جائیں گے، جن کا بوجھل اور ہلکا ہونا اعمال کی نوعیت پر ہوگا، جس کی دلیل حدیث البطاقۃ ہے، جس کو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما سے نقل کر کے اس کی تحسین کی ہے، اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو اپنے صحیح میں لایا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: یُؤتی بِتِسعٍ وَتِسعِینَ سِجِلًّا فَتُوضَعُ فِی کَفَّۃٍ وَیُؤتی بِالبِطَاقَۃِ فَتُوضَعُ فِی اُخرَیٰ فَطَاشَتِ السِّجِلَاتُ وَثَقُلَتُ البِطَاقَۃُ۔ یعنی ننانوے دفتر لا کر ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے، اور پرچی دوسرے پلڑے میں، ننانوے دفتر ہلکے ہوں گے اور پرچی بھاری ہو جائے گی، یہ پرچی کیا ہے؟ صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ آسمانوں اور زمینوں سے بھاری ہے۔ [مشکوٰۃ] اس کو امام الحرمین رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح دی، اور کہا کہ ثقل اجر کے انداز پر ہوگا۔ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کو ترجیح دی، اور یہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ نفس اعمال تولے جائیں گے، جس پر ابوداؤد اور ترمذی کی مرفوع حدیث دال ہے، اور ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی تصحیح کی، وہ یہ ہے: مَا یُوضَعُ فِی المِیزَانِ اَحسَنَ مِن حُسنِ خُلُقٍ۔ میزان میں اخلاقِ حسنہ سے بڑھ کر کوئی عمل نہیں رکھا جائے گا، اور جتنے اعمال رکھے جائیں گے سب سے اعلیٰ وبہتر یہی حسن خُلق ہی ہوگا۔ اس کو حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ترجیح دی ہے۔

فائدہ:

اعمال کا تول پہلے زمانوں میں بعید از عقل سمجھا جاتا تھا، لیکن موجودہ سائنس نے سارے مسائل حل کر دیئے، تھرمامیٹر سے بدن کی گرمی یا موسم کا درجہ حرارت بآسانی معلوم کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ اعراض ہیں، اس لئے اب اس میں شک وشبہ نہیں رہا۔

دراصل ان سارے اقوال میں اختلاف نہیں، یہ ہوسکتا ہے کہ تینوں طریقوں سے وزن اعمال ہو۔ اعمال کو اجسام بنا کر تولنا، یا نامہائے اعمال کو تولنا، یا خود نفس اعمال کو تولنا، تینوں طریقے برتے جائیں گے، تاکہ انسان کی قسمت کے آخری فیصلے صادر ہونے میں شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔ علامہ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے فضل عمل میں عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث لائی ہے کہ علماء کی سیاہی اور شہداء کا خون تولا ئے گا تو علماء کی سیاہی بھاری ہوگی، یہ وہ سیاہی ہے جس سے قرآن وحدیث اور فقہی مسائل لکھے گئے، جن سے مسائل شرعیہ کی احیاء ہوئی، اور ان سیاہیوں کی بدولت علم دین پورے جہاں میں زندہ ہو کر پھیل گیا۔

وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ الۡفُرۡقَانَ وَضِيَآءً وَّذِكۡرًا لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۸﴾ الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ
وَهُمۡ مِّنَ السَّاعَةِ مُشۡفِقُوۡنَ ﴿۴۹﴾ وَهٰذَا ذِكۡرٌ مُّبٰرَكٌ اَنۡزَلۡنٰهُ ؕ اَفَاَنۡتُمۡ لَهٗ مُنۡكِرُوۡنَ ﴿۵۰﴾

ترجمہ: اور یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے موسیٰ اور ہارون کو فیصلہ والی چیز اور روشنی اور نصیحت کی چیز عطا کی، جو متقیوں کیلئے نصیحت تھی ﴿۴۸﴾ جو اپنے ربّ سے بن دیکھے ڈرتے ہیں اور وہ قیامت سے خوفزدہ ہیں ﴿۴۹﴾ اور یہ ایک نصیحت ہے، مبارک ہے، جو ہم نے نازل کی ہے، سو کیا تم پھر بھی اس کے منکر ہو؟ ﴿۵۰﴾

معارف ومنازل

توحید ورسالت، قیامت اور حساب وکتاب کے بیان کے بعد اب انہی مضامین کی تائید واثبات کیلئے انبیاء کرام علیہم السلام کے احوال بیان فرما رہے ہیں، فرمایا:

﴿وَلَقَدۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسٰى وَهٰرُوۡنَ﴾ البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو ایسی چیز عطا کی جو حق اور باطل میں فرق کرنے والی تھی، مراد اس سے توریت شریف ہے، جو کہ ضیاء اور روشنی بھی ہے، جس پر چل کر تمام تاریکیوں سے نجات ملتی ہے، اور پرہیز گاروں کیلئے نصیحت اور تذکرہ ہے، کیونکہ آسمانی کتابوں پر پرہیز گار ہی عمل کرتے ہیں۔ قرآن حکیم کے بارے میں بھی یہی ارشاد ہوا: ﴿هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۲﴾﴾ [البقرة] (پرہیز گاروں کے لیے ہدایت کا ذریعہ ہے)۔ متقین حضرات یہ ہیں:

﴿الَّذِيۡنَ يَخۡشَوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَيۡبِ﴾ وہ جو اپنے پروردگار سے بغیر دیکھے ڈرتے ہیں، اور قیامت سے

لرزاں وترساں اور خوفزدہ رہتے ہیں۔ توریت کے بعد قرآن حکیم کا بیان:

﴿وَهٰذَا ذِكْرٌ مُّبٰرَكٌ اَنْزَلْنٰهُ ؕ اَفَاَنْتُمْ لَهٗ مُنْكِرُوْنَ۝۵۰﴾ یہ بھی عظیم الشان برکت والی نصیحت ہے، جس کو ہم نے مقام عظمت وجلال سے اتارا ہے، سو کیا تم نور وبرکت والی کتاب کے منکر ہو؟ اور اس کی نورانیت وخیر وبرکت سے محروم ہو؟ یہ تمہاری تباہی وہلاکت کی نشانی ہے، پس تباہی سے بچو اور اس پر ایمان لاؤ۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝۵۱ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ
التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْۤ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ۝۵۲ قَالُوْا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ۝۵۳ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ
وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ۝۵۴ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ۝۵۵ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰى ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ۝۵۶

ترجمہ: اور یہ بات واقعی ہے کہ ہم نے ابراہیم کو اس سے پہلے صحیح راہ عطا کی، اور ہم ان کو جانتے تھے ۝۵۱ جبکہ انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم سے کہا کہ یہ مورتیاں کیا ہیں جن پر تم جمے بیٹھے ہو؟ ۝۵۲ انہوں نے کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ان کی عبادت کرتے ہوئے پایا ہے ۝۵۳ ابراہیم نے کہا: بلاشبہ تم اور تمہارے باپ دادے کھلی گمراہی میں ہیں ۝۵۴ وہ لوگ کہنے لگے: کیا تم ہمارے پاس کوئی حق بات لے کر آئے ہو، یا دل لگی کرنے والوں میں سے ہو؟ ۝۵۵ ابراہیم نے کہا: بلکہ تمہارا ربّ وہی ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا ربّ ہے، جس نے انہیں پیدا فرمایا، اور میں اس پر گواہی دینے والوں میں سے ہوں ۝۵۶

معارف ومنازل

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت پاک اور آپ علیہ السلام کی دعوت وتبلیغ کے مختلف پہلو اس سے پہلے سورۂ بقرہ، سورۂ انعام، سورۂ توبہ، سورۂ ہود، سورۂ ابراہیم، سورۂ حجر، سورۂ نحل اور سورۂ مریم میں گزر چکے ہیں، جن پر ایک نگاہ ڈالنا مفید ہوگا، اور آئندہ بھی چند مقامات پر خصوصاً سورۃ الشعراء اور سورۃ الصافات میں واقعات آنے والے ہیں، ان شاء اللہ۔ فرمایا:

﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ۝۵۱﴾ البتہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو سمجھ اور

فراست عطا فرمائی، اس سے پہلے۔

''رُشد'' کے معنی ہیں: ہدایت، نیکی، فراست اور سمجھ۔ اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ انہیں کمال درجے کی دانشمندی اور سمجھ عطا فرمائی تھی۔ ﴿مِنۡ قَبۡلُ﴾ سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت حضرت خاتم الانبیاء ﷺ دونوں سے پہلے ہوسکتا ہے، اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ ہم نے اسے بچپن ہی میں یہ کمال وشرف عطا فرمایا، وہ بچپن ہی سے موحد وحنیف تھے، اور شرک سے بیزار تھے۔ سورۂ انعام میں فرمایا: ﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ مَلَكُوۡتَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلِيَكُوۡنَ مِنَ الۡمُوۡقِنِيۡنَ﴾ [الأنعام] (اس طرح ہم نے ابراہیم کو آسمان اور زمین کی عظیم بادشاہی دکھائی تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہوجائیں)۔

اسی مقام پر ہے کہ اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایسے دلائل توحید سمجھائے جن کے سامنے بڑے سے بڑے مشرک لوگ لاجواب ہوگئے۔ آپ علیہ السلام میں کمال درجے کی علمی اور عملی استعداد تھی، جو آپ علیہ السلام کو بچپن ہی میں اللہ تعالیٰ نے عطا کردی تھی۔

﴿وَ كُنَّا بِهٖ عٰلِمِيۡنَ﴾ اور ہم اس استعداد وصلاحیت کو بخوبی جانتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کے اندر نبوت سے پہلے بچپن میں جن کمالات اور خوبیوں کو وافر مقدار میں پیدا فرمایا تھا وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ان اوصاف کا مستقبل روشن ہوگا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کا حق کامیابی کے ساتھ ادا کریں گے، چنانچہ یہ سب پورے ہوگئے، اور آپ علیہ السلام: ﴿اِنِّيۡ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا﴾ [البقرة: ۱۲۴] (میں آپ کو لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں) کے عظیم عہدے پر فائز ہوگئے، اور مقام خلت سے نوازے گئے۔

بالائے سرش زہوشمندی ☆ میتافت ستارہ بلندی

جب آپ علیہ السلام نے اپنے والد آزر (تارخ) اور اس کی پوری قوم کو ایک ہولناک بت پرستی اور ستارہ پرستی میں ڈوبا ہوا لت پت پایا تو انہیں دعوت توحید دینا شروع کی۔

﴿اِذۡ قَالَ لِاَبِيۡهِ وَقَوۡمِهٖ﴾ جب آپ علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم سے مخاطب ہوکر فرمایا:

﴿مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيۡلُ الَّتِيۡۤ اَنۡتُمۡ لَهَا عٰكِفُوۡنَ﴾ ان مورتیوں کی کیا حیثیت ہے جن پر تم جھکے پڑتے ہو؟ جنہیں تم نے اپنے ہاتھوں سے تراشا اور بنایا، پھر انہیں سنوار کر رکھا، اور ان کی عبادت شروع کی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمہارے ہاتھوں کی بنی ہوئی مخلوق تمہارا خالق بنے؟ اور تمہاری حاجت برآری کرے؟ یہ بے جان وبے حرکت،

اندھے، گونگے، بہرے بت تمہیں نہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں نہ کسی مصیبت کا دفاع کر سکتے ہیں، افسوس ہو تمہاری عقل پر، تم کتنے بیوقوف بے سمجھ ہو۔ ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں کہنے لگے:

﴿قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ﴾ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ان کی پوجا کرتے ہوئے دیکھا ہے، لہٰذا ہم بھی ان کی عبادت کرتے ہیں، گویا ہم اپنے باپ دادوں کے مذہب پر ہیں، ہمارا دین وہی ہے جو ان کا دین تھا، جس طرح وہ کرتے آئے ہیں ہم بھی اسی طرح کرتے ہیں۔ اسی بات کا نام ہے: اندھی تقلید۔

کفار مکہ بھی اسی گمراہی میں غرق تھے، اندھی تقلید نے بہت سی قوموں اور بہت سی تنظیموں اور لوگوں کا بیڑا غرق کر دیا، کسی بات کا جواب دلیل کے ساتھ دینے کی بجائے صرف یہ کہہ دیا جائے کہ ہمارے باپ دادے ایسا ہی کرتے آئے ہیں۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے مشرک بھی اسی ڈگر پر چل رہے تھے، ان کے بارے میں سورۃ البقرہ میں ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾ [البقرۃ:١٧٠] (اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ بلکہ ہم تو اس چیز کی پیروی کرتے ہیں جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے)۔

وہ فخریہ طور پر اپنے آباء و اجداد کا نام لے کر ان کے اتباع کو اپنے لئے سعادت سمجھتے تھے، قرآن حکیم نے ایسے لکیر کے فقیر اندھوں کو جواب دے کر ارشاد فرمایا: ﴿اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ﴾ [البقرۃ:١٧٠] (اگرچہ ان کے باپ دادے نہ کچھ سمجھتے ہوں، اور راہ پا سکتے ہوں؟)۔ یہ اسی لکیر کے فقیر رہیں گے، خواہ ان کے آباء و اجداد عقل و ہدایت اور نور بصیرت سے یکسر خالی ہوں۔

ہاں! یہ الگ بات ہے کہ اگر آباء و اجداد صحیح راستے پر ہوں، اور دنیا میں ان کی سیرت و کردار مسلم ہوں، اور ان کا مقام و رتبہ بھی واضح ہو، تو پھر ایسے اچھے باکمال آباء و اجداد کا راستہ ضرور اختیار کرنا چاہئے، جیسے کہ سیدنا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا تھا: ﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ﴾ [یوسف:٣٨] (میں تو اپنے آباء و اجداد حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کے دین کی پیروی کرتا ہوں) وہ سارے نیکوکار، خدا پرست اور پیغمبر تھے، میں ان کے راستے پر چلنے والا ہوں، جس طرح وہ کفر و شرک سے پاک و منزہ تھے میں بھی ان کا تابع دار و فرمانبردار ہوں۔

﴿قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے واضح اور دوٹوک

الفاظ میں انہیں جواب دے کر فرمایا: تحقیق تم اور تمہارے آباء واجداد کھلی گمراہی میں ہو، جس طرح تم بے راہ ہو اسی طرح تمہارے باپ دادے بھی بے راہ اور گمراہ تھے، تم سب کا دین وطریقہ سراسر غلط ہے۔

﴿قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ مِنَ اللّٰعِبِيْنَ﴾ کیا تو یہ سب کچھ سچ کہہ رہا ہے کہ ہم اور ہمارے باپ دادے گمراہی میں مبتلا ہیں؟ یا تو ہمارے ساتھ دل لگی کا کھیل کھیل رہا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ تمہاری باتیں واقع برحقیقت ہیں، یا محض استہزاء اور مذاق کرتے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا کہ میں آپ کے ساتھ ہنسی مذاق نہیں کر رہا ہوں، بلکہ پورے وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ یہ مٹی، پتھر، پیتل کی بنائی ہوئی مورتیاں جن کو خود تم نے اپنے ہاتھوں سے گھڑا ہے یہ تمہارے معبود ہرگز نہیں بن سکتے۔

﴿قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ ۖ﴾ بلکہ تمہارا پروردگار وہ ہے جو آسمانوں اور زمینوں کا پروردگار ہے، اور وہ وہی ہے جس نے ارض وسماء کو پیدا کیا ہے، معبود تو وہی ہوتا ہے جو خالق، علیم کل قادر مطلق، مربی اور ہر چیز میں براہ راست متصرف ہو، یہ تمہارے پتھروں سے بنے ہوئے بت کسی بھی کام کے نہیں، پروردگار ارض وسماء بلکہ سارے جہاں کا خالق ومالک وہی ذات پاک ہے جو واحد لاشریک ہے۔

﴿وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ اور میں اس معاملے میں پورے طریقے پر تمہارے سامنے بطور گواہ موجود ہوں، لہٰذا میری بات مانو اور ان بتوں کی پرستش چھوڑ کر خدائے واحد لاشریک کے سامنے اپنا سر نیاز خم کر دو، اور صرف اس کی عبادت کرو، ہر قسم کے نفع ونقصان پر جو ذات پاک قادر ہے اس کو اپنا ربّ بنا کر اس کی بندگی کرو، ورنہ تو سنو اور دیکھو۔

وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝٥٧ فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ
لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝٥٨ قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٥٩ قَالُوْا سَمِعْنَا
فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۝٦٠ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ ۝٦١
قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝٦٢ قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ
كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝٦٣ فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓي اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝٦٤ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰي

رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ ۝٦٥ قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكُمْ
شَيْـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمْ ۝٦٦ اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝٦٧

ترجمہ: اور اللہ کی قسم! میں اس کے بعد ضرور ضرور تمہارے بتوں کے بارے میں کوئی تدبیر کروں گا، جب تم پشت پھیر کر چلے جاؤ گے ۝٥٧ سوانہوں نے ان بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا، سوائے ان کے ایک بڑے بت کے، شاید وہ اس کی طرف رجوع کریں ۝٥٨ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟ بیشک ایسا کرنے والا ظالموں میں سے ہے ۝٥٩ کہنے لگے کہ ہم نے ایک نوجوان کو سنا تھا جوان کا ذکر کررہا تھا، اس نوجوان کو ابراہیم کہا جاتا ہے ۝٦٠ کہنے لگے: اس نوجوان کو لوگوں کے سامنے لاؤ، تاکہ وہ گواہ ہوجائیں ۝٦١ کہنے لگے: اے ابراہیم! کیا تم نے ہمارے معبودوں کے ساتھ ایسا کیا ہے؟ ۝٦٢ ابراہیم نے کہا: بلکہ یہ حرکت ان کے اس بڑے نے کی ہے، سوتم ان سے پوچھ لو اگر وہ بولتے ہیں ۝٦٣ پھر وہ اپنے نفسوں کی طرف رجوع ہوئے، پھر کہنے لگے کہ بلاشبہ تم ہی ظلم کرنے والے ہو ۝٦٤ پھر انہوں نے اپنے سروں کو جھکایا، بے شک اے ابراہیم! تم کو معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں ۝٦٥ ابراہیم نے کہا: کیا تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس چیز کی عبادت کرتے ہو جو تمہیں نہ کچھ نفع دے سکے نہ نقصان پہنچا سکے ۝٦٦ تف ہے تم پر اور ان پر جنہیں تم اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر پوجتے ہو، کیا تم سمجھ نہیں رکھتے ہو؟ ۝٦٧

معارف ومنازل

﴿وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ﴾ ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم کو دیکھا کہ وہ اپنے ایک سیاسی اور مذہبی میلے میں جانے کی تیاری کررہے ہیں، اور میدان جب خالی ہوگا تو مجھے زبانی تبلیغ کے بعد عملی تبلیغ کا بھی موقع ہاتھ آئے گا، اس طرح میں ان کے بڑے مرکزی بت خانے میں جاکر تمام بتوں کو توڑ کر ریزہ ریزہ کردوں گا، چنانچہ اس کے والد نے اس سے کہا کہ ابراہیم! تم بھی ہمارے ساتھ چلو، اور وہ ان کے ہمراہ روانہ ہونے کے تھوڑی دیر بعد بیماری کا بہانہ بنا کر واپس لوٹے اور کہنے لگے: ﴿وَتَاللّٰهِ﴾ خدا کی قسم! آج میں تمہارے ان بتوں کا ستیاناس کرکے ان کی گت بناؤں گا، جب تم ان کے پاس سے پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے اور مجھے بآسانی ان تک پہنچنے کا موقع ملے گا۔

علامہ بغوی نے مجاہد اور قتادہ رحمۃ اللہ علیہم کا قول نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بات چپکے سے کہی تھی، سوائے ایک شخص کے اور کسی نے نہیں سنی، پھر اسی شخص نے یہ بات پھیلادی، اور اسی نے کہا تھا کہ ایک نوجوان

جس کا نام ابراہیم ہے ان بتوں کا ذکر کر رہا تھا، جس کو میں نے خود سنا، چونکہ ابراہیم علیہ السلام نے اسی کام کی خاطر قسم کھائی تو سیدھے ان کے بڑے بت خانے پہنچے، اور:

﴿فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا لَّهُمْ﴾ اور بتوں کو جو قطار در قطار رکھے ہوئے تھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے، سوائے ان کے بڑے سرغنہ بت کے، اور پھر یہ کیا کہ جس کلہاڑے کے ساتھ بتوں کو توڑا تھا وہ کلہاڑا بڑے بت کے گلے میں لٹکا دیا۔

﴿لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ﴾ تا کہ جب وہ لوگ واپس آئیں تو اسی بڑے بت کی طرف رجوع کریں۔ اس ضمیر کے مرجع میں دو رائے ہیں: پہلی رائے یہ ہے کہ مشرک لوگ بتوں کی تباہی دیکھ کر بڑے بت کی طرف رجوع کریں گے، جو کہ صحیح سلامت ہے، تا کہ اس سے پوچھیں کہ ان باقیوں کو کیا ہوا؟ ویسے بھی تو یہ لوگ بتوں کے پجاری تھے، تو انہیں اپنے معبود کی طرف رجوع کرنا چاہئے تھا۔ اور دوسری رائے یہ ہے کہ بتوں کی یہ حالت دیکھ کر وہ سمجھیں گے کہ اس طرز و نوعیت کا کام ابراہیم (علیہ السلام) کا ہو سکتا ہے، نہ اور کسی کا، تو وہ ابراہیم علیہ السلام کی طرف رجوع کریں گے، اور اس سے باز پرس کریں گے۔

بہر حال! جب لوگ تہوار کے میلے سے واپس آئے اور یہ اندوہناک واردات دیکھے تو بہت ہی پریشان ہوئے، اور کہنے لگے:

﴿قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ بدسلوکی کس نے کی ہے؟ بیشک ایسا شخص بے انصافوں میں سے ہے۔

﴿قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ﴾ ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو ان بتوں کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے، جس کو ابراہیم کہا جاتا ہے، اسی نے کہا تھا کہ میں ان بتوں کی مرمت کروں گا، پس یقین ہے کہ اسی نے یہ کام کیا ہوگا۔

﴿قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ عَلٰٓى اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُوْنَ﴾ چنانچہ انہوں نے کہا کہ اس نوجوان کو لوگوں کے سامنے لاؤ تا کہ وہ خود ایسے شخص کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں، اس نے ہمارے معبودوں کی توہین کی ہے، لہٰذا اسے سخت سزا ملنی چاہئے، تو:

﴿قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ﴾ وہ کہنے لگے: اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کے

ساتھ تو نے یہ سلوک کیا ہے؟

﴿قَالَ بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا: بلکہ یہ کام ان کے اس بڑے نے کیا ہوگا۔

﴿فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ﴾ انہی سے پوچھ لو، اگر یہ بولتے ہیں۔ یہ بڑا بت صحیح سلامت موجود ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی بڑے نے ناراض ہو کر یہ ساری کارروائی کی ہوگی، یہ کلہاڑا ابھی اسی کے پاس ہے، لہٰذا مجھ سے پوچھنے کے بجائے اسی سے اس واردات کے متعلق پوچھو، اور دریافت کرو۔ دنیا میں اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں، اور طاقتور لوگ کمزور لوگوں پر کمند ڈالتے ہیں، ہوسکتا ہے یہاں بھی ایسا معاملہ ہو، تمہارے بڑے معبود نے چھوٹے معبودوں پر وار کیا ہو۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو ان کے عقیدے کی بنیاد پر یہ الزام دیا اور طنزیہ طور پر انہیں لاجواب کرنا چاہا۔ حدیث شریف میں ابراہیم علیہ السلام کے قول: ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ کو کذب کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، وہاں یہ الفاظ ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے کذب بیانی نہیں کی، مگر تین باتوں میں، ان تینوں باتوں میں انہیں اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب تھی: ایک بات تو یہی تھی جو بیان ہوئی۔ دوسری بات یہ تھی کہ آپ علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم کے ساتھ تہوار کے میلے میں نہ جانے کیلئے یہ بہانہ بنایا: ﴿فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ ۝ فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ ۝﴾ [الصافات] (پس انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نگاہ ڈال کر دیکھا۔ اور کہا کہ: میری طبیعت خراب ہے)۔ یعنی میں تمہارے ساتھ اس لئے نہیں چل سکتا کہ میں بیمار ہوں، حالانکہ فی الواقع آپ علیہ السلام بیمار نہیں تھے۔

تیسرا واقعہ بابل سے ہجرت کرنے کے بعد آپ علیہ السلام کو مصر میں داخل ہوتے وقت پیش آیا، آپ علیہ السلام کے ساتھ آپ علیہ السلام کی بیوی حضرت سارہؓ تھیں، وہاں کے جابر بادشاہ کا یہ طریقہ تھا کہ اگر کوئی باہر سے آنے والے میاں بیوی داخل ہوتے تو خاوند کو قتل کر کے عورت پر قبضہ کر لیتا، اگر وہ بہن بھائی ہوتے تو انہیں کچھ نہ کہتا، اس فتنے سے بچنے کیلئے انہوں نے حضرت سارہؓ کو سمجھا دیا کہ اگر بادشاہ کے لوگ تم سے پوچھیں تو کہہ دینا کہ ہم بہن بھائی ہیں۔

بعض لوگوں نے اس حدیث کا محض اس بنا پر انکار کیا ہے کہ اس حدیث سے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر کذب بیانی صادق آتی ہے، جو اللہ تعالیٰ کے خلیل جیسے جلیل القدر نبی کی شان کے سراسر خلاف ہے، مگر فی الواقع بات ایسی نہیں، اگرچہ ان کے ظاہری الفاظ اور ان کی شکل وصورت کذب کی نظر آتی ہے، مگر یہ کذب نہیں، "توریہ" ہی ہے۔

توریہ کے معنی ہیں: ذو معنیٰ کلام، ایک عام معنی قریب الفہم جسے ہر شخص بلا تکلف سمجھتا ہو، دوسرا معنی بعید اور گہرا جسے ہر شخص نہیں سمجھتا، جب متکلم ایسا لفظ استعمال کرے اور مراد معنی بعید لے تو توریہ کہلائے گا، یہاں تینوں باتیں اسی زمرہ میں آتی ہیں۔

جہاں تک ﴿بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا﴾ کا تعلق ہے، تو ابراہیم علیہ السلام کا اس سے مطلب یہ نہیں تھا کہ یہ کام ضرور اس بڑے بت نے کیا ہے، بلکہ یہ بات آپ علیہ السلام نے استفہامیہ انداز میں کی، کہ ذرا ان سے پوچھو تو سہی کہ کیا یہ کام اس بڑے نے کیا ہے؟

دوسری بات اپنی بیماری کے متعلق تھی کہ میں بیمار ہوں، اس سے مراد آپ علیہ السلام کی جسمانی بیماری نہیں تھی، بلکہ آپ علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ تمہاری خباثت وشرک کو دیکھ کر مجھے روحانی بیماری اور تکلیف پہنچ رہی ہے۔

تیسری بات بیوی کو بہن کہنے والی ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ شانہ کی زمین پر مسلمان یہ دونوں میاں بیوی ہی تھے جو دین حق پر تھے، اور ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ﴾ [الحجرات:۱۰] (بیشک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں) کے مطابق یہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے علاوہ دینی بہن بھائی بھی تھے، لہٰذا بادشاہ کے شر سے بچنے کی خاطر انہوں نے ذو معنیٰ والا کلام کیا تا کہ ان کی عزت اور ان کی بیوی کی عصمت بچ جائے، چنانچہ ایسا ہوا۔ الحمد للہ

﴿فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ﴾ پس وہ لوٹے اپنے نفسوں کی طرف، اور ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ واقعی تم ہی بڑے بے انصاف ہو، اس بے انصافی کا ثبوت یہ ہے کہ تم ایسی چیزوں کو معبود بناتے ہو جو کہ سراسر عاجز ہیں، وہ تمہیں کیا بچائیں گے جب وہ اپنے دفاع پر قدرت نہیں رکھتے، نہ دیکھ سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں، اور نہ بول سکتے ہیں، ابراہیم (علیہ السلام) تمہیں جو کچھ کہہ رہے ہیں بالکل درست کہہ رہے ہیں۔

بعض علماء نے یوں ترجمہ کیا کہ تم کتنے بے انصاف وناعاقبت اندیش ہو، تم نے اپنے معبودوں کا تحفظ نہ کیا، تم سب تہوار پر چلے گئے، انہیں بے یارومددگار چھوڑ گئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم (علیہ السلام) نے سب کو توڑ کر رکھ دیا، اور کلہاڑا بڑے بت کے گلے میں ڈال کر اپنا تحفظ کیا، اور الٹا مذاقاً کہا کہ بڑے بت سے پوچھو، حالانکہ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ یہ بت بولنے سے معذور ہیں۔ مگر پہلا معنی راجح ہے۔

﴿ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ﴾ پھر وہ اپنے سروں اور چہروں کو نیچے کر کے جھکائے شرمندگی سے اور کہنے لگے: ﴿لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَآءِ يَنْطِقُوْنَ﴾ یہ تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ بت بولنے سے قاصر ہیں، پھر

بھلا ہم ان سے کیا دریافت کریں؟

ان کے اس اقرار پر ابراہیم علیہ السلام کو اظہار حق کا موقع مل گیا، اور شرک کی تردید واثبات توحید کا اچھا خاصہ موقع دستیاب ہوا، چنانچہ فرمایا:

﴿قَالَ اَفَتَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنۡفَعُكُمۡ شَيۡـًٔا وَّلَا يَضُرُّكُمۡ﴾ فرمایا: کیا تم اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی پوجا کرتے ہو جو نہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان؟ فرمایا

﴿اُفٍّ لَّـكُمۡ وَلِمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ‌ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ﴾ افسوس ہے تم پر اور ان پر بھی جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے ہو، کیا تم میں عقل کا مادہ بھی نہیں؟ اگر تم عقلمند و باشعور ہوتے تو اپنے سے کمتر عاجز و ناتواں بتوں کی پرستش نہ کرتے، اور اپنے ہاتھوں سے بنائے ہوئے پتھروں پر سجدہ ریز نہ ہوتے، اور انہیں خدا کا درجہ نہ دیتے، اور آج جمع ہو کر اپنے معبودوں کی مدد و حمایت پر کمر بستہ نہ ہوتے، اور ان کو نصرت و مدد دینے کی پیشکش کا اظہار نہ کرتے۔

قَالُوۡا حَرِّقُوۡهُ وَانۡصُرُوۡۤا اٰلِهَتَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَ ۝٦٨ قُلۡنَا يٰنَارُ كُوۡنِىۡ بَرۡدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبۡرٰهِيۡمَ ۝٦٩ وَاَرَادُوۡا بِهٖ كَيۡدًا فَجَعَلۡنٰهُمُ الۡاَخۡسَرِيۡنَ‌ ۝٧٠

ترجمہ: کہنے لگے: اس کو جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تمہیں کچھ کرنا ہے ۝٦٨ ہم نے حکم دیا کہ اے آگ! ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جا ۝٦٩ اور ان لوگوں نے ابراہیم کے ساتھ برا برتاؤ کرنا چاہا، سو ہم نے انہیں ان میں سے کر دیا جو بہت ہی زیادہ ناکام ہوتے ہیں ۝٧٠

معارف ومنازل

جس کو اللہ تعالیٰ رکھے اس کو کون چکھے۔ نمرود کوئی معمولی بادشاہ نہ تھا، پوری دنیا پر حکمرانی کرنے والے چاروں بادشاہوں میں سے ایک تھا۔ اگرچہ فرعون کی شہرت اور اس کا تذکرہ قرآن مجید میں بکثرت ہے، مگر نمرود بن کنعان کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں، فرعون صرف مصر کا بادشاہ رہا، نہ کہ پورے جہان کا۔ نمرود اس واقعہ سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کر چکا تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حد سے زیادہ دشمن اور مخالف تھا، اگر

وہ چاہتا تو ابراہیم علیہ السلام کو گمنامی میں راتوں رات ہمیشہ کیلئے خاموش کر سکتا تھا، اس سے پوچھنے والا کوئی نہ ہوتا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ شانہ کا تحفظ ہر طرح سے حاصل رہا، اس لئے مضبوط دشمن بھی آپ علیہ السلام کو گزند پہنچانے سے بے بس اور عاجز رہا۔

جب بتکدۂ بابل کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تباہ کیا، پھر قوم سے آپ علیہ السلام کا مکالمہ بھی ہوتا رہا، اس پر بادشاہ اور عوام و آزر سارے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دلائل سے لاجواب تھے، اور دلوں میں قائل، بلکہ اس مرتبہ بتوں کے معاملہ میں انہیں زبان سے بھی اقرار کرنا پڑا کہ ابراہیم علیہ السلام جو کچھ کہتا ہے وہی حق ہے اور صحیح و درست۔ تاہم ان میں سے کسی نے راہ مستقیم کو اختیار نہ کیا، اور قبول حق سے منحرف رہے، اور اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے برعکس اپنی ندامت و ذلت سے متاثر ہو کر بہت زیادہ غیظ و غضب میں آگئے، اور بادشاہ سے رعایا تک سب نے متفقہ فیصلہ کر لیا کہ بتوں اور دیوتاؤں کی توہین اور باپ دادوں کے دین کی مخالفت میں ابراہیم علیہ السلام کو دہکتی ایک عظیم تاریخی آگ میں جلا دینا چاہیئے، تاکہ پورے عالم میں ہمارے اس بھیانک کردار کی شہرت ہو، اور جتنا اس کا جرم نہایت بڑا ہے اسی طرح اس کی سزا بھی بڑی ہو۔

چنانچہ انہوں نے بڑی تاریخی آگ کی تیاری کا سلسلہ پورے زور و شور سے شروع کیا، اور کئی ہفتے اس آگ کی تیاری میں صرف ہوئے، لاکھوں من لکڑیاں جمع کر لیں، آگ اتنی بڑی جلائی کہ چاروں طرف میلوں دور کیڑے مکوڑے اور چرند پرند بھسم ہو کر مر گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو وہاں ایک مکان میں قید و بند میں رکھا تھا، اب انہیں یہ پریشانی ہوئی کہ اس آگ میں ابراہیم علیہ السلام کو ڈالیں کیسے؟ اس آگ کے پاس تو پھٹکنا ہی مشکل ہے چہ جائیکہ اس میں باقاعدہ ڈالنے کیلئے ایک دو منٹ ٹھہریں۔

ابلیس چونکہ انبیاء علیہم السلام کی دشمنی میں آگے آگے رہتا ہے، اور دشمنان حق کو عجیب و غریب سبق پڑھانا اس کا مشغلہ ہے، اس لئے وہ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے حاضر ہوا، اور لوگوں کو سمجھایا کہ ایک لمبی چوڑی منجنیق بنالو، چنانچہ منجنیق تیار ہوگئی، پس حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ پاؤں کو باندھ کر منجنیق کے ذریعہ آگ میں ڈال دیا گیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ قید خانہ سے جب ابراہیم علیہ السلام کو لا کر منجنیق میں رکھا جانے لگا تو وہ نہایت مسرور و خوش تھے، ان کے چہرے پر انوار و برکات نمایاں تھے، اس موقع پر عالم بالا میں قیامت کا منظر دکھائی دے رہا تھا کہ یا ارحم الراحمین! اس بھری دنیا میں صرف ایک ابراہیم علیہ السلام ہیں جو تیرا نام لیتے ہیں، انہیں بے رحمی کے ساتھ ہاتھ پاؤں

باندھ کر آتشکدہ میں پھینکا جارہا ہے، اس دلخراش منظر نے فرشتوں کو بھی تڑپایا، چنانچہ ہواؤں، بادلوں، اور پانی، اور زلزلوں کے انچارج فرشتے حاضر ہوئے اور اپنی اپنی خدمات پیش کیں، تو آپ علیہ السلام نے بڑے اطمینان واستغنا سے فرمادیا: مجھے ان خدمات کی ضرورت نہیں، مجھے میرا ربّ کافی ہے، آپ علیہ السلام نے ﴿حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ پڑھا، اور سب کو رد کردیا۔

حضرت جبریل علیہ السلام سے فرمایا کہ بھیجے گئے ہو یا خود سے آئے ہو؟ انہوں نے کہا: خود سے آیا ہوں، فرمایا: اَمَّا مِنْکَ فَلَا۔ مجھے آپ کی مدد نہیں چاہئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا: اے ابراہیم! اپنے ربّ سے استغاثہ تو کرو، اس پیکر تسلیم ورضا نے جواب دیا: حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُہٗ بِحَالِیْ۔ جب وہ سب کچھ دیکھتا اور جانتا ہے تو مجھے عرض کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ انہوں نے تفویض سے کام لیا، اور دعاء نہ کی۔

دراصل یہ بہت ہی اونچا مقام ہے، جس کی بنیاد حق الیقین اور تعلق مع اللہ تعالیٰ ہے، پھر آگ کو اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ ٹھنڈی ہوجا، اور برد کے ساتھ سلامتی کا مظاہرہ کر، تاکہ ابراہیم علیہ السلام ہر طرح کی سلامتی میں رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام آگ میں تھے کہ سایہ ڈالنے والا فرشتہ ان کے پاس آپہنچا جو انہی کی صورت میں تھا، وہ انہیں مانوس کرتا رہا۔ حضرت جبریل علیہ السلام جنت سے ایک کرتہ اور ایک قالین لے کر آئے (حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کپڑے اتار کر آگ میں ڈالا گیا تھا)۔ حضرت جبریل علیہ السلام نے انہیں کرتہ پہنایا، اور ان کے نیچے قالین بچھایا، اور ان کے ساتھ بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

نمرود اپنے محل میں سے بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا، اس نے دیکھا کہ ابراہیم علیہ السلام باغیچہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، اور ان کے ساتھ ایک شخص بیٹھا ہوا باتیں کررہا ہے، آس پاس جو لکڑیاں ہیں انہیں آگ جلارہی ہے لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام درمیان میں صحیح سالم ہشاش بشاش باغیچہ میں بیٹھے ہوئے ہیں، اور اس شخص کے ساتھ باتوں میں مشغول ہیں۔ نمرود نے آواز دے کر کہا: اے ابراہیم! تم اس آگ سے نکل سکتے ہو؟ فرمایا: ہاں! نکل سکتا ہوں، یہ فرمایا، اور اپنی جگہ سے روانہ ہوگئے حتیٰ کہ آگ سے باہر نکل آئے۔

یہ دیکھ کر نمرود نے کہا: اے ابراہیم! تمہارا معبود تو بڑی قدرت والا ہے جس کے حکم کی آگ بھی پابند ہے، میں تمہارے معبود کیلئے چار ہزار گائیں نذر کے طور پر ذبح کروں گا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: جب تک تو اپنے دین باطل پر رہے گا اللہ تعالیٰ تجھ سے کچھ قبول نہیں فرمائے گا، تو اپنا باطل دین چھوڑ دے اور میرا برحق دین قبول کرلے،

نمرود نے کہا: میں اپنے دین کو اور ملک کو نہیں چھوڑ سکتا، ہاں! بطور نذر کے جانور ذبح کر دوں گا۔ اس کے بعد نمرود نے جانور ذبح کر دیئے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تکلیف پہنچانے سے باز آ گیا۔ [معالم التنزيل، مظهري]

فائدہ:

بعض جہلاء، فلاسفہ، مستشرقین جو اس خارق عادت معجزہ کو خلاف عقل سمجھتے اور اس کا انکار کرتے ہیں کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آگ کی ذاتی صفت (حرارت اور جلانا) سلب ہو جائے اور وہ بجائے جلانے اور بھسم کرنے کے گلزار بن جائے؟ دراصل یہ لوگ دہریہ مزاج کے لوگ ہیں، یہ صبح و شام حقائق و صفات کی تبدیلی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کے کمالات کے منکر اور شریعت مقدسہ اور تعلیمات و اخبارات قرآنیہ کے منکر ہیں، وہ صبح و شام تحقیق کر چکے اور کر رہے ہیں، انقلاب حقائق ان کے سامنے واضح طور پر موجود ہیں، مگر وہ اندھے بنے ہوئے ہیں۔

انسان اور تمام حیوانات کی پیدائش چند ناپاک قطروں سے مقرر ہے، جب اللہ تعالیٰ پانی کے قطروں سے گوشت، پوست، پٹھے، رگیں، بال، ہڈیاں، خون اور دیگر بہت سے چیزوں کے بنانے پر قادر ہے، تو آگ میں باغیچہ کی خصوصیت و صفات بنانے پر بطریق اولیٰ قادر ہے، پس جو لوگ شکوک و شبہات کے چرخاب میں گرے ہوئے ہیں، وہ مؤمن نہیں، انہوں نے جہاں اس معجزہ کا انکار کیا وہاں انہوں نے ساری خدائی کا بھی انکار کر کے کفر اختیار کیا، جب کوئی خدا کی ذات کا منکر ہو تو اس سے نہ گلہ نہ شکوہ، ایسی باتوں سے اہل اسلام کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔

وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ﴿٧١﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ ؕ وَ يَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ﴿٧٢﴾ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَاۤ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ﴿٧٣﴾

ترجمہ: اور ہم نے ابراہیم کو اور لوط کو اس سرزمین کی طرف نجات دیدی جس میں ہم نے دنیا جہاں والوں کیلئے برکت رکھ دی ہے ﴿٧١﴾ اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب پوتا عطا کیا، اور ہم نے ان سب کو صالحین بنا دیا ﴿٧٢﴾ اور ہم نے انہیں پیشوا بنا دیا جو ہمارے حکم سے ہدایت دیتے تھے، اور ہم نے ان کی طرف نیک کاموں کے کرنے اور

نماز کی پابندی کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم بھیجا، اور وہ ہماری عبادت کرنے والے تھے ﴿۷۳﴾

معارف ومنازل

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی قوم کی ہدایت قبول کرنے اور ایمان لانے سے مایوس ہوگئے، چاہیے تھا کہ اس تاریخی آگ کے معجزے کے بعد پوری قوم تسلیم وانقیاد کے ساتھ ایمان لے آتی، مگر ایسا نہ ہوا، قوم بدستور اپنے کفر پر جمی رہی، چونکہ اللہ تعالیٰ عزّ قدرتہٗ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے دین کیلئے کام لینا تھا، اور ان کی نسل سے ایک بڑے جہاں کو آباد کرنا تھا، تو انہیں بابل سے ارض فلسطین وشام کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دیا گیا۔

حضرت لوط علیہ السلام ان پر ایمان لا چکے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور لوط علیہ السلام (اس وقت نبی نہ تھے) اور حضرت سارہؓ (وغیرہ) بابل سے ہجرت کر کے شام کے علاقہ فلسطین چلے گئے، فرمایا:

﴿وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا﴾ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اور لوط علیہ السلام کو نجات دیدی۔

﴿اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ﴾ اس سرزمین کی طرف جس میں ہم نے جہاں والوں کیلئے برکتیں رکھی ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے حران پہنچے، پھر وہاں سے مصر گئے، مصر سے واپسی پر مستقل شام کی سرزمین کو اپنا وطن بنایا، اور ساری زندگی وہاں رہے۔ نابلس کے قریب ایک سرسبز خوبصورت پہاڑی پر آپ علیہ السلام کا مزار ہے، اس بستی کا نام ''الخلیل'' ہے۔

﴿وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ ؕ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ﴾ اور آپ علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام جیسا عظیم بیٹا بھی عطا فرمایا۔ آپ علیہ السلام نے تو صرف بیٹے کیلئے دعا کی تھی، مگر اللہ تعالیٰ نے یہ انعام بھی کیا کہ بن مانگے پوتا یعقوب علیہ السلام بھی عطا فرمایا۔ نافلہ زائد چیز کو کہتے ہیں، جو کہ اصل سوال سے زائد ہے، اور ہم نے سب کو نیکوکار بنایا۔

﴿وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ﴾ اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا، جو ہمارے حکموں کے مطابق لوگوں کو ہدایت کرتے تھے، اور ہم نے ان کی طرف وحی بھیجی نیکیوں کے کرنے کی، اور نماز قائم کرنے کی، اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی، اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔

وَلُوۡطًا اٰتَيۡنٰهُ حُكۡمًا وَّعِلۡمًا وَّنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ‌ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِيۡنَۙ ﴿۷۴﴾ وَاَدۡخَلۡنٰهُ فِىۡ رَحۡمَتِنَا‌ ؕ اِنَّهٗ مِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۷۵﴾

ترجمہ: اور ہم نے لوط کو حکم اور علم عطا کیا، اور ہم نے انہیں اس بستی سے نجات دی، جس کے رہنے والے برے کام کیا کرتے تھے، بلاشبہ وہ لوگ بدذات تھے، بدکار تھے ﴿۷۴﴾ اور ہم نے لوط کو اپنی رحمت میں داخل کر دیا، بلاشبہ وہ صالحین میں سے تھے ﴿۷۵﴾

معارف ومنازل

فرمایا: لوط علیہ السلام کو ہم نے حکم اور علم عطا فرمایا، اللہ تعالیٰ شانہ جو بھی پیغمبر مبعوث فرماتے ہیں انہیں رشد و ہدایت، اعلیٰ درجے کی عقل وسمجھ اور فہم فراست عطا فرماتے ہیں، جن کی بدولت وہ اللہ تعالیٰ کے احکام لوگوں تک بڑی سنجیدگی اور تدبیر وسیاست سے پہنچاتے ہیں۔

حضرت لوط علیہ السلام جس علاقے کے لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے وہ شرق اردن کا علاقہ ہے، جہاں بارہ بستیوں کی آبادی تھی، سب سے بڑی مرکزی بستی کا نام ''سدوم'' تھا، یہ سب تباہ ہوگئیں۔ تفصیل سورۂ اعراف اور سورۂ ہود میں گزر چکی، آئندہ سورۂ شعراء اور سورۂ عنکبوت میں آنے والی ہے۔ اِن شاءاللہ تعالیٰ

﴿وَنَجَّيۡنٰهُ مِنَ الۡقَرۡيَةِ الَّتِىۡ كَانَتۡ تَّعۡمَلُ الۡخَبٰٓئِثَ‌ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فٰسِقِيۡنَ﴾ ہم نے ان کو ان بستی والوں سے نجات دلائی جن کے رہنے والے خبیث کام کرتے تھے۔ صاحب روح المعانی فرماتے ہیں کہ قوم لوط (علیہ السلام) کے دس برے افعال جو نہایت خبیث تھے وہ یہ ہیں: سرعام لواطت بازی۔ رہزنی اور لوٹ مار۔ کبوتر بازی۔ گانا بجانا۔ شراب نوشی۔ داڑھی کٹوانا۔ اور مونچھیں بڑھانا۔ بلاوجہ بار بار سیٹی بجانا۔ تالیاں بجانا اور ناچنا۔ ریشمی کپڑے پہننا، وغیرہ۔

یہ برے لوگ تھے، حد سے زیادہ نافرماں تھے۔ بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فخریہ طور پر محفلوں میں زور زور سے گوز مارتے تھے، اللہ تعالیٰ نے لوط علیہ السلام کی بددعا اور قوم کی بداعمالیوں کی وجہ سے انہیں زیروزبر کر کے ان کی بستیاں الٹ دیں، صرف پیغمبر علیہ السلام اور ان کے اہل وعیال محفوظ رہے بچ گئے، جبکہ ان کی بیوی ہلاک ہوگئی۔

وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ فَاسۡتَجَبۡنَا لَهٗ فَنَجَّيۡنٰهُ وَاَهۡلَهٗ مِنَ الۡكَرۡبِ الۡعَظِيۡمِ ۝٧٦ وَنَصَرۡنٰهُ
مِنَ الۡقَوۡمِ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمۡ كَانُوۡا قَوۡمَ سَوۡءٍ فَاَغۡرَقۡنٰهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۝٧٧

ترجمہ: اورنوح کو یاد کیجئے، جب اس نے اس سے پہلے پکارا، سوہم نے ان کی دعا قبول کی، پھر ہم نے انہیں اوران کے گھروالوں کواس بڑی بے چینی سے نجات دی ۝٧٦ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کوجھٹلایاان سے نجات دینے کیلئے ہم نے نوح کی مدد کی، بلاشبہ وہ برے لوگ تھے،سوہم نے ان سب کوڈبودیا(غرق کردیا) ۝٧٧

معارف ومنازل

﴿وَنُوۡحًا اِذۡ نَادٰی مِنۡ قَبۡلُ﴾ مِنۡ قَبۡلُ سے مراد ابراہیم اورلوط علیہما السلام سے پہلے ہوتا ہے،جن کا ذکر گزشتہ آیات میں ہوا، اورنوح علیہ السلام کی نداء کا ذکر یہاں مجمل ہے، سورۂ نوح میں یہ ہے: ﴿رَبِّ لَا تَذَرۡ عَلَی الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا﴾[نوح:٢٦] (اے پروردگار! روئے زمین پر کافروں میں سے کسی رہنے والے کو نہ چھوڑ)۔اوردوسرے مقام پراس طرح ہے کہ جب وہ قوم کے ایمان سے مایوس ہوگئے اورقوم نے انہیں بہت ایذاء پہنچائی تو بددعا کی: ﴿اَنِّیۡ مَغۡلُوۡبٌ فَانۡتَصِرۡ﴾[القمر:١٠] (اے پروردگار! میں مغلوب وعاجز ہوچکا ہوں، آپ ہی میری نصرت فرمایئے،اورظاموں سے انتقام لیجئے) کیونکہ آپ کو بتادیا گیا تھا: ﴿لَنۡ يُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِكَ اِلَّا مَنۡ قَدۡ اٰمَنَ﴾ [ھود:٣٦] (تیری قوم میں سے کوئی بھی ایمان نہیں لائے گا، مگر وہ جوایمان لاچکے) تب ہی تو آپ علیہ السلام مایوس ہوگئے،اوربددعا کی، ورنہ آپ علیہ السلام بددعا نہ کرتے۔

وَدَاوٗدَ وَسُلَيۡمٰنَ اِذۡ يَحۡكُمٰنِ فِی الۡحَرۡثِ اِذۡ نَفَشَتۡ فِيۡهِ غَنَمُ الۡقَوۡمِ ۚ وَكُنَّا لِحُكۡمِهِمۡ شٰهِدِيۡنَ ۝٧٨
فَفَهَّمۡنٰهَا سُلَيۡمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيۡنَا حُكۡمًا وَّعِلۡمًا ۫ وَّسَخَّرۡنَا مَعَ دَاوٗدَ الۡجِبَالَ يُسَبِّحۡنَ وَالطَّيۡرَ ؕ وَكُنَّا
فٰعِلِيۡنَ ۝٧٩ وَعَلَّمۡنٰهُ صَنۡعَةَ لَبُوۡسٍ لَّكُمۡ لِتُحۡصِنَكُمۡ مِّنۡۢ بَاۡسِكُمۡ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ شٰكِرُوۡنَ ۝٨٠ وَ
لِسُلَيۡمٰنَ الرِّيۡحَ عَاصِفَةً تَجۡرِیۡ بِاَمۡرِهٖۤ اِلَی الۡاَرۡضِ الَّتِیۡ بٰرَكۡنَا فِيۡهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَیۡءٍ عٰلِمِيۡنَ ۝٨١
وَمِنَ الشَّيٰطِيۡنِ مَنۡ يَّغُوۡصُوۡنَ لَهٗ وَيَعۡمَلُوۡنَ عَمَلًا دُوۡنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمۡ حٰفِظِيۡنَ ۝٨٢

ترجمہ: اور داؤد اور سلیمان کو یاد کرو، جبکہ وہ کھیتی کے بارے میں فیصلہ دے رہے تھے، جبکہ اس میں قوم کی بکریاں روندگئی تھیں اور ہم ان کے فیصلہ کو دیکھ رہے تھے ﴿۷۸﴾ سو ہم نے یہ فیصلہ سلیمان کو سمجھا دیا، اور ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا فرمایا، اور ہم نے داود کے ساتھ پہاڑوں کو مسخر کردیا، اور پرندوں کو جو تسبیح میں مشغول رہتے تھے، اور ہم کرنے والے تھے ﴿۷۹﴾ اور ہم نے داؤد کو زرہ بنانے کی صنعت سکھائی تا کہ وہ تمہیں جنگ میں محفوظ رکھے، سو کیا تم شکر کرنے والے ہو؟ ﴿۸۰﴾ اور سلیمان کے لئے تیزی سے چلنے والی ہوا مسخر کردی، جو ان کے حکم سے اس زمین کی طرف لے جاتی تھی، جس میں ہم نے برکت رکھی ہے، اور ہم ہر چیز کو جاننے والے ہیں ﴿۸۱﴾ اور بعض شیاطین ایسے تھے جو ان کیلئے غوطہ لگاتے تھے، اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے، اور ہم حفاظت کرنے والے تھے ﴿۸۲﴾

معارف ومنازل

﴿نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ﴾ لفظ نَفَش کے معنی عربی لغت کے اعتبار سے یہ ہیں کہ رات کے وقت کوئی جانور کسی کے کھیت کو نقصان پہنچائے۔ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابن عباس، قتادہ اور زہری رضی اللہ عنہم سے اس واقعہ کی روایت اس طرح کی ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں دو شخص حاضر ہوئے، ان میں سے ایک شخص بکریوں والا، دوسرا کھیتی والا تھا، کھیتی والے نے بکریوں والے پر یہ دعویٰ کیا کہ اس کی بکریاں رات کو چھوٹ کر میرے کھیت میں گھس گئیں، اور کھیت کو بالکل صاف کردیا، کچھ نہیں چھوڑا (غالباً مدعیٰ علیہ نے اس کا اقرار کرلیا ہوگا، اور بکریوں کی پوری قیمت اس کے ضائع شدہ کھیت کی قیمت کے برابر ہوگی اس لئے) حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ بکری والا اپنی ساری بکریاں کھیت والے کو دیدے، کیونکہ جو چیزیں قیمت ہی کے ذریعہ لی اور دی جاتی ہیں جن کو عرف فقہاء میں ذوات القیم کہا جاتا ہے، وہ اگر کسی نے ضائع کردیں تو اس کا ضمان قیمت ہی کے حساب سے دیا جاتا ہے، بکریوں کی قیمت چونکہ ضائع شدہ کھیتی کی قیمت کے مساوی تھی اس لئے یہ ضابطہ کا فیصلہ فرمایا گیا۔

یہ دونوں مدعی اور مدعیٰ علیہ حضرت داؤد علیہ السلام کی عدالت سے واپس ہوئے تو دروازے پر ان کے صاحبزادے حضرت سلیمان علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، انہوں نے دریافت کیا کہ تمہارے مقدمہ کا کیا فیصلہ ہوا؟ ان لوگوں نے بیان کردیا، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: اگر اس مقدمہ کا فیصلہ میں کرتا تو اس کا فیصلہ کچھ اور ہوتا جو فریقین کیلئے مفید اور نافع ہوتا، پھر خود والد ماجد حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر یہی بات عرض

کی۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے تاکید کے ساتھ دریافت کیا کہ وہ کیا فیصلہ ہے جو اس فیصلہ سے دونوں کیلئے بہتر اور مفید ہے؟ تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا: آپ بکریاں تو سب کھیت والے کو دیدیں کہ وہ ان کے دودھ اور اُون وغیرہ سے فائدہ اٹھاتا رہے، اور کھیت کی زمین بکریوں والے کے سپرد کردیں کہ وہ اس میں محنت کر کے کاشت کر کے کھیت اُگائے، جب یہ کھیت اس حالت آجائے جس کو بکریوں نے کھایا تھا تو کھیت کھیت والے کو دلوادیں، اور بکریاں بکریوں والے کو۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے اس فیصلہ کو پسند فرما کر کہا کہ بس اب فیصلہ یہی رہنا چاہئے، اور فریقین کو بلا کر یہی فیصلہ نافذ کر دیا۔ [مظهري وقرطبي وغيره]

﴿وَدَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ اِذْ يَحْكُمٰنِ فِي الْحَرْثِ اِذْ نَفَشَتْ فِيْهِ غَنَمُ الْقَوْمِ ۚ﴾ جس طرح ہم نے لوط علیہ السلام کو علم وحکمت عطا فرمائی، اسی طرح ہم نے حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کو علم وحکمت سے نوازا۔

جبکہ وہ دونوں (باپ بیٹے) کھیتی کے بارے میں فیصلہ کرتے تھے، اور وجہ تنازعہ یہ تھی کہ رات کے وقت بعض لوگوں کی بکریاں اس کھیت کو چر گئی تھیں، یعنی روند کر پامال کر کے نقصان پہنچائی تھیں۔

﴿وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ﴾ اور ہم ان کے فیصلے کے وقت حاضر تھے، گویا یہ فیصلہ ہماری موجودگی میں ہوا۔

﴿فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۚ وَكُلًّا اٰتَيْنَا حُكْمًا وَّعِلْمًا﴾ ہم نے ہر ایک کو علم وحکمت عطا فرمائی۔ سلیمان علیہ السلام کی عمر اس وقت گیارہ سال کی تھی، اور وہ تیرہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد کے جانشین بنے۔ داؤد علیہ السلام کے مزید اٹھارہ بیٹے بھی تھے، مگر جو فہم وادراک اللہ تعالیٰ نے سلیمان علیہ السلام کو بخشا تھا وہ کسی دوسرے بیٹے میں نہیں تھا۔ یہ دونوں باپ بیٹے اللہ تعالیٰ کے "صاحب کتاب نبی" تھے، اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو زبور شریف اور سلیمان علیہ السلام کو بعض صحیفے عطا کئے۔

سلیمان علیہ السلام نے کم سنی میں ایسا عمدہ فیصلہ کیا جو فریقین کے حق میں مفید تھا، اگرچہ داؤد علیہ السلام کا فیصلہ بھی شریعت کے مطابق برحق صحیح تھا کہ جتنا کسی کا نقصان ہوا اتنا ہرجانہ دیا جائے، اور ہماری شریعت کا بھی یہی قانون ہے کہ نقصان والے کا نقصان پورا ہو۔ مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ پہلا فیصلہ صحیح اور حسن تھا، جبکہ دوسرا اصح اور احسن تھا۔

اسی طرح کا ایک دوسرا فیصلہ بھی ہے جس میں باپ بیٹے کے فیصلے میں ایک عجیب انکشاف حقیقت بھی جلوہ افروز ہے، وہ یہ کہ دو عورتیں کہیں پانی پر موجود تھیں، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اپنا اپنا شیر خوار بچہ تھا، انہوں نے

بچوں کو کسی درخت کے سایہ میں رکھا، وہاں جنگل سے بھیڑیا آ کر ایک کے لڑکے کو لے کر چلا گیا۔ ان میں سے ہر ایک دوسری سے یہ کہنے لگی کہ بھیڑیا تیرے بیٹے کو لے گیا، اور یہ بچہ جو موجود ہے یہ میرا بیٹا ہے، اس مقدمہ کا فیصلہ کرنے کیلئے حضرت داؤد علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئیں (انہوں نے اپنے طور پر غور وخوض اور اجتہاد کر کے) بڑی عورت کے حق میں فیصلہ کر دیا (کیونکہ اس نے جزع فزع زیادہ کی ہوگی)۔ وہاں سے واپس ہو کر حضرت سلیمان علیہ السلام پر گزریں، اور انہیں پورے واقعہ کی خبر دی، انہوں نے فرمایا: چھری لے آؤ میں اس لڑکے کو کاٹ کر تم دونوں کو آدھا آدھا دیتا ہوں، دونوں خوش ہو جاؤ، یہ سن کر چھوٹی عمر والی عورت کہنے لگی: اللہ تعالیٰ آپ پر رحم کرے، ایسا نہ کیجئے، میں بچہ نہیں مانگتی، اور میں تسلیم کرتی ہوں کہ لڑکا اسی کا ہے، اس پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے فیصلہ دیدیا کہ لڑکا چھوٹی کا ہے (جسے وہ کٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتی)۔ [بخاري]

فائدہ:

یہ کھیتی اور بکریوں کا فیصلہ اور ان دو عورتوں کا فیصلہ جو حضرت داؤد علیہ السلام نے دیا تھا، یہ دونوں وحی سے نہیں تھے، اجتہاد کے طور پر تھے، اس لئے حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اجتہاد سے دوسرا فیصلہ دیدیا جسے داؤد علیہ السلام نے بھی تسلیم فرمالیا، اس آخری قصہ میں حضرت سلیمان علیہ السلام نے بچہ کو چھری سے کاٹنے والی بات جو کی، یہ ایک تدبیر تھی جس سے انہوں نے حقیقت حال تک پہنچنے کا راستہ نکال لیا، جب یہ فرمایا کہ چھری لاؤ میں اسے کاٹ کر آدھا آدھا کر دیتا ہوں تو بڑی عورت خاموش رہ گئی، اور چھوٹی گھبرا گئی، اور کہا کہ یہ اسی کا لڑکا ہے، مجھے نہیں چاہئے، اس کے تڑپنے سے سلیمان علیہ السلام نے سمجھ لیا کہ یہ اسی کا بچہ ہے، اگر بڑی عورت کا بچہ ہوتا تو وہ تڑپ اٹھتی، لیکن وہ خاموش کھڑی رہی، جس سے معلوم ہوا کہ یہ بچہ چھوٹی کا ہے، لہٰذا حضرت سلیمان علیہ السلام نے چھوٹی کے حق میں فیصلہ دیا۔

﴿وَّسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ ؕ وَكُنَّا فٰعِلِيْنَ﴾ حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ شانہ نے ظاہری کمالات میں سے ایک کمال خوش آوازی کا بھی عطا فرمایا تھا، جب وہ زبور پڑھتے تھے تو پرندے ہوا میں ٹھہرنے لگتے تھے، اور ان کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے، اسی طرح پہاڑ، شجر وحجر ومدر بھی تسبیح پڑھنے لگتے تھے۔ سورۂ نمل میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ عِلْمًا ۚ وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ فَضَّلَنَا عَلٰى كَثِيْرٍ مِّنْ عِبَادِهِ الْمُؤْمِنِيْنَ ⑮ وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ وَقَالَ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ عُلِّمْنَا مَنْطِقَ الطَّيْرِ وَاُوْتِيْنَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ ؕ اِنَّ

هٰذَا لَهُوَ الْفَضْلُ الْمُبِيْنُ ﴿١٦﴾ ﴾ [النمل] (اور ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا، اور انہوں نے کہا: تمام تعریفیں اللہ کی ہیں، جس نے ہمیں اپنے بہت سے مؤمن بندوں پر فضیلت عطا فرمائی ہے۔ اور سلیمان کو داؤد کی وراثت ملی، اور اور انہوں نے کہا: اے لوگو! ہمیں پرندوں کی بولی سکھائی گئی ہے، اور ہمیں ہر چیز عطا کی گئی ہے۔ یقیناً یہ کھلا ہوا فضل ہے)۔

اسی طرح سورۂ سبا میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ اٰتَيْنَا دَاوٗدَ مِنَّا فَضْلًا ۭ يٰجِبَالُ اَوِّبِيْ مَعَهٗ وَالطَّيْرَ ۚ وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾ ﴾ [سبأ] (یقیناً ہم نے داؤد کو خاص اپنے پاس سے فضل عطا کیا تھا۔ اے پہاڑو! تم بھی تسبیح میں ان کے ساتھ ہم آواز بن جاؤ، اور اے پرندو! تم بھی، اور ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا تھا)۔

اسی طرح صٓ میں فرمایا: ﴿اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿١٨﴾ وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿١٩﴾ ﴾ [ص] (ہم نے پہاڑوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ وہ شام کے وقت اور سورج کے نکلتے وقت ان کے ساتھ تسبیح کیا کریں۔ اور پرندوں کو بھی، جنہیں اکٹھا کر لیا جاتا تھا۔ یہ سب ان کے ساتھ مل کر اللہ کا خوب ذکر کرتے تھے)۔

خوش آوازی کا کمال تو ظاہری کمالات میں سے تھا، اور پرندوں اور درختوں اور پہاڑوں کا تسبیح میں شریک ہو جانا بطور معجزہ کے تھا، جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتا تھا، اور معجزہ کیلئے یہ ضروری نہیں کہ تسبیح وتہلیل ذکر وثناء پڑھنے والا حیات وشعور رکھنے والا ہو، اللہ تعالیٰ ہر غیر جاندار بے شعور چیزوں میں حیات اور شعور پیدا کرنے پر قادر ہے، فرمایا: ﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ ﴾ [الإسراء: ۴۴] (اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح نہ پڑھتی ہو، مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو)۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

خاک وباد وآب وآتش بندہ اند ☆ بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

﴿وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ﴾ اور ہم نے انہیں زرہ کی صنعت سکھا دی، جو تمہارے لئے نفع مند ہے، تاکہ وہ تمہیں ایک دوسرے کی زد سے بچائے۔ سورۂ سبأ میں فرمایا: ﴿وَاَلَنَّا لَهُ الْحَدِيْدَ ﴿١٠﴾ اَنِ اعْمَلْ سٰبِغٰتٍ وَّقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۭ اِنِّيْ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿١١﴾ ﴾ [سبأ] (اور ہم نے ان کیلئے لوہے کو موم کی طرح نرم کر دیا کہ تم پوری زرہیں بناؤ، اور جوڑنے میں اندازہ رکھو، اور تم سب نیک کام کیا کرو، بلاشبہ میں تمہارے سب اعمال کو دیکھنے والا ہوں)۔

اللہ تعالیٰ شانہ نے حضرت داؤد علیہ السلام کیلئے لوہے کو موم کی طرح نرم فرمایا، وہ اپنی انگلیوں سے لوہے کے تار بنالیتے تھے، اور پھران کے حلقے بنالیتے تھے، اوران حلقوں کو جوڑ کر زرہ بنالیتے تھے۔ تفسیر ابن کثیر میں لکھا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام روزانہ ایک زرہ بنالیتے تھے، اوراسے چھ ہزار درہم میں فروخت کرتے تھے، جن میں دو ہزار اپنے اوراہل وعیال کی ضرورت کیلئے خرچ کرتے تھے، اور چار ہزار درہم بنی اسرائیل کو خبز الجواري یعنی میدہ کی روٹی کھلانے پرخرچ فرماتے تھے۔ [ابن کثیر]

فائدہ:

یہ بات واضح ہو کہ جب داؤد علیہ السلام حمد وثنا وتسبیح اور تلاوت زبور شروع کرتے تو پہاڑ، پرندے درخت وغیرہ ہم زبان ہو کر تسبیح کرنے لگتے، باقاعدہ ان کی آواز وترانہ ہر قسم کے لوگ سنتے، لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ یہ تسبیحات زبان حال سے ہوتی تھیں، زبان حال کی تسبیح تو ہروقت جاری رہتی ہے، اوراب بھی ہے، مگر ہمیں اس کا ادراک نہیں ہوسکتا۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ یہ تکوینی تسبیح ہروقت تمام مخلوقات کی زبان حال سے جاری رہتی ہے، جوں کوئی جاندار اسے چھوڑ دے گا فوراً مرجائے گا، اوراگر کسی درخت یا کھیتی سے چھوٹ جائے وہ فوراً خشک ہوجائے گا۔ تمام مخلوقات کی بقاء اورزندگی اسی تسبیح وتہلیل کی مرہون منت ہے، اوراسی سے ان کی زندگی وابستہ ہے، مجال نہیں کہ دیگر مخلوقات اس سے غافل ہوں یا اسے ترک کریں۔ ہاں! ایک ہی انسان ہے اور جنات کہ جن کیلئے دوزخ اور جنت کا فیصلہ ہونے والا ہے، یہ دونوں حمد باری تعالیٰ اور توحید الٰہی کے فرمانبردار بھی ہیں اور نافرماں بھی، یہ وہ مکلف ہیں کہ ذکر الٰہی سے انحراف کرنے والے ہیں، اِلّا ماشاء اللہ۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ ذکر الٰہی سے ہروقت اپنے دلوں کو روشن رکھیں، اوراپنی ارواح کو تروتازہ خوشحال رکھیں، رات دن بلاناغہ زبان ودل دونوں سے ربّ العزّت کی تسبیح وتکبیر اور حمد وثناء کا نغمہ گاتے رہیں، کتنا خوش قسمت ہوگا وہ شخص جو ہمیشہ ذکر الٰہی مشغلہ جاری رکھا، اور ہر سانس کے بعد الحمد للہ کہا۔

یہ نغمہ فصل گل ولالہ کا نہیں محتاج ☆ بہار ہو کہ خزاں لاالٰہ الا اللہ

(اقبال)

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم ہروقت ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: كان النبي صلى الله عليه وسلم يذكر الله تعالىٰ على كل أحيانه۔ [متفق علیہ]

قرآن مجید میں ذکر الٰہی کے صلہ میں ایک ایسی عظیم نعمت کا وعدہ کیا گیا ہے، جس سے بڑی نعمت مؤمن کیلئے اور کوئی نہیں ہوسکتی، فرمایا: ﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ﴾ [البقرۃ: ۱۵۲] (تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا) زہے سعادت کہ اللہ تعالیٰ اپنے ذکر کے صلہ وبدلہ میں ہمیں یاد فرمائے، یہی تو جنت کی بشارت ہے، اور یہ ﴿اَذْكُرْكُمْ﴾ کا وعدہ صرف ذکر الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے، پس جسے حق تعالیٰ شانہ یاد کرے اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہوسکتا ہے؟ اسی خاطر ارشاد فرمایا: ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ﴾ [العنکبوت: ۴۵] (البتہ ذکر الٰہی بہت بڑی چیز اور بہت بڑا عمل ہے)۔ وفقنا اللہ لذکرہ۔ آمین

﴿وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖٓ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا﴾ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے تند وتیز ہوا کو مسخر کردیا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس ارض مقدس کی طرف چلتی تھی، جس میں ہم نے برکتیں رکھی ہیں۔ سورۂ ص میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی تھی کہ اے مولائے کریم! مجھے ایسی حکومت عطا فرما: ﴿رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ﴾ [ص: ۳۵] (میرے پروردگار! میری بخشش فرمادے، اور مجھے ایسی سلطنت بخش دے جو میرے بعد کسی اور کے لیے مناسب نہ ہو) جو میرے بعد کسی کو نصیب نہ ہو۔

اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی، اور آپ علیہ السلام کو نہ صرف زمین پر خلافت عطا فرمائی بلکہ آپ علیہ السلام کے لئے ہواؤں، جنات، حیوانات، پرندوں اور شیاطین کو بھی مسخر کردیا۔ اور واقعی یہ آپ علیہ السلام کی منفرد مخصوص بے مثال حکومت تھی جو آپ علیہ السلام کے بعد کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ سلیمان علیہ السلام کے لئے جنات نے سونے اور ریشم کے تاروں سے ایک فرش بنا تھا، جس کی لمبائی چوڑائی ایک ایک فرسخ تھی، اس فرش کے وسط میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے لئے سنہرا ممبر رکھا جاتا تھا جس پر آپ علیہ السلام تشریف فرما ہوتے تھے، اور ممبر کے اردگرد سونے چاندی کی کرسیاں رکھی جاتی تھیں۔ انبیاء علیہم السلام سونے کی کرسیوں پر اور علماء چاندی کی کرسیوں پر فروکش ہوتے تھے، اوپر سے پرندے اپنے پر پھیلائے سایہ کرتے تھے، تاکہ سورج کی تپش سے حفاظت ہوجائے، کرسیوں کے گرداگرد دوسرے لوگ ہوتے تھے، اور لوگوں کے پیچھے جنات بیٹھتے تھے، ہوا اس فرش کو اوپر اٹھاتی تھی، اور صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک ایک ایک ماہ کی مسافت تک لے جاتی تھی۔ [مظهري]

سعید بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے دربار میں (جو آپ علیہ السلام کا تخت تھا) چھ لاکھ کرسیاں رکھی جاتی تھیں، اگلی قطاروں میں آدمی اور ان کے پیچھے جنات بیٹھتے تھے، اوپر سے پرندے سایہ فگن ہوتے تھے، اور ہوا ان سب کو اٹھا کر فضاء میں چلتی اور ایک ملک سے دوسر ملک تک پہنچا دیتی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔ [البحر المحیط]

ایک روایت میں ہے کہ آپ علیہ السلام صبح کو عراق سے چلے دوپہر مرو پہنچے، وہاں ظہر تک رہے، پھر وہاں سے روانہ ہو کر عصر کی نماز بلخ میں ادا کی، پھر بلخ سے ترکستان پہنچے، ترکستان سے سرزمین چین تک پہنچے، یہ سارا سفر ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر کیا، اور پرندے سایہ فگن رہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان دیکھیں! جس آبادی کے اوپر سے اس بڑے تخت کا فضاء میں گزر ہوتا تھا تو آبادی والے یہی محسوس کرتے تھے کہ ہمارے اوپر تین فرسخ کا ایک پہاڑ گزر رہا ہے۔ اس عرصے میں لوگ آپس میں جو تبصرہ کرتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام ہوا کے ذریعہ لوگوں کی پوری گفتگو سماعت فرماتے تھے۔

ایک دفعہ تخت اڑ رہا تھا، نیچے ایک عبادت گزار راہب کی جھونپڑی تھی، راہب کو تعجب کے ساتھ یہ کہنا پڑا: سُبحانَ اللهِ اللطِيفِ الْخَبِيرِ وَهُوَ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ہوا کو حکم دیا کہ تخت کو یہاں اتار دو، مگر خیال رکھو کہ نیچے والا راہب تخت کے نیچے دب نہ جائے، جب تخت اترا تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے راہب سے دریافت فرمایا کہ تم نے یہ دعا کیسے پڑھی اور کیا مقصد تھا؟ راہب نے جواب میں کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عظمت و قدرت اور اس کی بخشش پر تعجب و حیرانی ہوئی، حضرت علیہ السلام نے فرمایا کہ تمہارا سبحان اللہ اس تخت سے زیادہ قیمتی ہے۔

پس از صد سال این معنی محقق شد بخاقانی ☆ کہ یکدم با خدا بودن بہ از ملک سلیمانی

ظاہر ہے کہ سبحان اللہ اور الحمد للہ کے ثواب کے متعلق حدیث میں وارد ہے کہ ان کے ثواب آسمان و زمین کی بھرائی کے برابر ہے، اور باقی بھی ہے، جبکہ اس عظیم الشان پیغمبر علیہ السلام کے عظیم الشان تخت کا آج دنیا میں نام و نشان تک نہیں، ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰۤاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ [الحشر: ٢] (عبرت حاصل کروائے بصیرت والو!)۔

﴿وَ كُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ﴾ اور ہم ہر چیز سے واقف تھے، ہمیں ہر چیز کا علم حاصل ہے، مجال نہیں کوئی کام ہمارے حکم کے خلاف ہو۔

﴿وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ﴾ اور کچھ شیاطین ایسے تھے جو سلیمان

علیہ السلام کے لئے (جواہرات نکالنے کے لئے) سمندر میں غوطے لگاتے تھے، اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے، یعنی اونچی اونچی عمارتیں، بڑے بڑے تالاب اور ایک جگہ قائم رہنے والی بڑی بڑی دیگیں، عجیب وغریب مصنوعات، راستے، پل، سڑکیں وغیرہ۔ فرمایا:

﴿وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ﴾ ہم ان سب کی نگہداشت اور نگرانی کرتے تھے، تاکہ شریر وخطرناک شیاطین کوئی غلط اور نامناسب کام نہ کربیٹھیں۔ روایات میں ہے کہ جنات وشیاطین پر فرشتے مامور ونگراں تھے، اور ان سے سخت سخت کام لیتے تھے۔ سورۂ صٓ میں ارشاد ہے: ﴿وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ﴾ [ص:۳۷] (اور شریر جنات بھی ان کے قابو میں دے دیئے تھے، جن میں ہر طرح کے معمار اور غوطہ خور شامل تھے)۔

اور سورۂ سبا میں ارشاد ہوا: ﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ﴾ [سبأ:۱۳] (وہ جنات ان کے لئے وہ وہ چیزیں بناتے جو ان کو منظور ہوتا، بڑی بڑی عمارتیں، اور مورتیں، اور لگن جیسے حوض، اور دیگیں جو پہاڑوں کی طرح ایک ہی جگہ جمی رہیں)۔

سانپوں کا دم:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں سانپوں کا زہر اتارنے کے الفاظ کا تذکرہ کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر وہ الفاظ پیش کرو، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کئے گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میرے نزدیک ان کے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں، یہ اس معاہدہ کے الفاظ ہیں جو حضرت سلیمان علیہ السلام نے زہریلے جانوروں سے لیا تھا، الفاظ یہ ہیں: شجة قرينة أملحة بحر قفطا۔ [درمنثور ج ۴]

وَاَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۸۳﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَكَشَفْنَا مَا بِهٖ مِنْ ضُرٍّ وَّاٰتَيْنٰهُ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَذِكْرٰى لِلْعٰبِدِيْنَ ﴿۸۴﴾

ترجمہ: اور ایوب کو یاد کیجئے، جب انہوں نے اپنے ربّ کو پکارا کہ مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، آپ ارحم الرحمین ہیں ﴿۸۳﴾ سو ہم نے ان کی دعا قبول کی، اور ان کی جو تکلیف تھی وہ دور کردی، ہم نے ان کا کنبہ عطا فرمادیا، اور ان کے ساتھ ان کے برابر اور بھی دیا، اپنی رحمت خاصہ کی وجہ سے، عبادت کرنے والوں کے لئے یادگار رہنے کے سبب سے ﴿۸۴﴾

معارف ومنازل

ان دونوں آیتوں میں حضرت ایوب علیہ السلام کی بیماری کا، پھر ان کے دعاء کرنے کا، اور دعاء قبول ہونے کا، اور آل واولاد کے جدا ہونے کے بعد دگنا ہوکر مل جانے کا اجمالی تذکرہ ہے۔ سورۂ صٓ میں ان کی تکلیف اور دعا اور شفایاب ہونا نسبتاً تفصیل کے ساتھ ہے۔ قرآن کریم نے ان کی تکلیف کی نوعیت آل واولاد اور مال ومنال کے نقصانات کا کوئی تذکرہ نہیں کیا، اسی طرح ان کی بیماری کی مدت بھی نہیں بتائی، اور کسی صحیح حدیث مرفوع میں بھی کوئی تفصیل نہیں ملتی، ان کے مرض کی جو نوعیت یا اٹھارہ سالہ مدت اور بدن میں کیڑوں کا پیدا ہونا اور جذام جیسے مہلک مرض کی نشاندہی، اسی طرح آل وعیال کی تباہی جن پر اعتماد نہیں کرنا چاہئے، اس سلسلے میں قصص القرآن کا مطالعہ نہایت مفید ہوگا۔

قرآن کریم کی تصریح سے معلوم ہوا کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے دعا کرنے پر اللہ تعالیٰ شانہ نے انہیں صحت وعافیت عطا فرمائی، اور یہ محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے تھا، جیسے فرمایا: ﴿رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا﴾۔ اور اس میں آئندہ آنے والے عبادت گزاروں کے لئے بھی ایک مفید یادگار ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کا ابتلا یا کسی کی کتنی ہی بڑی مصیبت ہو، اللہ تعالیٰ دعا قبول فرماتا ہے، اور مصیبت کو دور فرما دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی مرض لاعلاج نہیں، اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کا کنبہ واپس کردیا، اور ان جیسے اور بھی دے دیئے، اس کے بارے میں مفسرین حضرات نے دونوں احتمال لکھے ہیں کہ صحت وعافیت کے بعد یا تو ان کو اتنی گمشدہ اولاد دوواپس کردی گئی جو ان سے جدا ہوگئی تھی، اور اگر وہ وفات پا گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اتنے ہی ان کی جگہ اور پیدا فرما کر دیدیئے، اور:

﴿مِثْلَهُمْ مَّعَهُمْ﴾ بھی ساتھ فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ جتنی سابق اولاد تھی اتنی ہی مزید اولاد ان کی اپنی صلب سے، یا ان کی اولاد کی صلب سے عطا فرمادی۔ یہاں پر ہم اسی پر اکتفاء کرتے ہیں، مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۂ صٓ میں لکھیں گے۔

البتہ یہاں اتنی بات اور بھی سمجھ لینا چاہئے کہ اسرائیلی روایات میں جو یہ مذکور ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم پر کیڑے پڑ گئے تھے، یا یہ کہ وہ اٹھارہ برس کوڑی (فٹ پاتھ) پر پڑے رہے، یہ بات انبیاء کرام علیہم السلام کی شان سے بہت بعید ہے، کیونکہ یہ مرض ایک گندہ اور منحوس مرض ہے، اس کے ساتھ طبیعت میں ایک قسم کی ناپاکی اور

تعفن پیدا ہوجاتی ہے، جس سے طہارت اور نظافت یکسر ختم ہوجاتی ہے، اور یہ انبیاء علیہم السلام سے بہت بعید ہے، انبیاء کرام علیہم السلام کا بلا اور مصیبت میں مبتلا ہونا معقول ہے، مگر برے امراض میں مبتلا ہونا غیر معقول اور ان کی شان کے خلاف ہے۔

وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ وَاَدْخَلْنٰهُمْ فِيْ رَحْمَتِنَا ؕ اِنَّهُمْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۸۶﴾

ترجمہ: اور اسماعیل کو اور ادریس اور ذوالکفل کو یاد کرو، یہ سب صبر کرنے والوں میں سے تھے﴿۸۵﴾ اور ہم نے انہیں اپنی رحمت میں داخل کرلیا، بلاشبہ وہ صالحین میں سے تھے﴿۸۶﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں حضرت اسماعیل، حضرت ادریس، اور حضرت ذوالکفل علیہم السلام کا تذکرہ فرمایا، اور یہ فرمایا کہ سب صابرین اور صالحین میں سے تھے۔ حضرت اسماعیل اور حضرت ادریس علیہما السلام کا تذکرہ سورۂ مریم میں گزر چکا ہے۔ اور حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا نام یہاں قرآن حکیم میں پہلی جگہ آیا، اور سورۂ ص میں بھی حضرت ذوالکفل علیہ السلام کا تذکرہ ہے، وہاں فرمایا: ﴿وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ﴾ [ص:۴۸] (اور اسماعیل، الیسع اور ذوالکفل کو یاد کیجئے، اور یہ سب پسندیدہ لوگوں میں سے ہیں)۔ حضرت الیسع علیہ السلام کا ذکر سورۂ انعام میں گزر چکا ہے، یہاں ذوالکفل علیہ السلام کے بارے میں لکھا جاتا ہے۔

ذوالکفل علیہ السلام کے متعلق قرآن کریم نے نام کے سوا کچھ نہیں بتایا، اسی طرح حضرت معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی کچھ منقول نہیں ہے، لہٰذا قرآن وحدیث کی روشنی میں اس سے زیادہ نہیں کہا جاسکتا کہ ذوالکفل علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ نبی اور پیغمبر تھے، اور کسی قوم کی ہدایت کے لئے مبعوث ہوئے تھے، اس سے زائد سے سکوت ہے۔ بعض علماء ان کو حزقیل کہتے ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت ذوالکفل علیہ السلام نبی تھے، جن لوگوں نے کہا ہے کہ وہ نبی نہیں تھے ایک نیک اور صالح انسان تھے یہ صحیح نہیں۔ دراصل انہیں اشتباہ ہوا، انہوں نے بنی اسرائیل کے ایک نیک شخص جس کا نام "الکفل" تھا اس کو "ذوالکفل علیہ السلام" سمجھا، اور نیک شخص کا قول کیا، خوب فرق سمجھو۔

وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغَاضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِي الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ

اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ۭ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

ترجمہ: اور مچھلی والے کو یاد کرو، جبکہ وہ غصہ ہو کر چل دیئے، سو انہوں نے گمان کیا کہ ہم ان کے ساتھ تنگی والا معاملہ نہیں کریں گے، سو انہوں نے اندھیروں میں یوں پکارا ﴿لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ ۝ سو ہم نے ان کی دعا قبول کی، اور انہیں غم سے نجات دیدی، اور ہم اسی طرح ایمان والوں کو نجات دیتے ہیں ۝

معارف ومنازل

ذاالنون (مچھلی والا) سورۂ قلم میں "صاحب الحوت" فرمایا، مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں۔ سورۂ قلم میں تفصیل آنے والی ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ یہاں مختصر قصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شہر نینویٰ کی طرف جو کہ موصل کے مضافات میں سے ہے (عراق) مبعوث فرمایا تھا، یونس علیہ السلام نے ان کو بت پرستی سے روکا اور توحید کی طرف بلایا، وہ ماننے والے کہاں تھے؟ روز بروز ان کا عناد و سرکشی اور تمرد ترقی کرتا رہا، آخر انہوں نے بددعا کی، اور قوم کی حرکات سے خفا ہو کر غصہ میں بھرے ہوئے شہر سے نکل گئے، حکم الٰہی کا انتظار نہ کیا، اور وعدہ کر گئے کہ تین دن کے بعد تم پر عذاب آئے گا۔

ان کے نکل جانے کے بعد قوم کو یقین آ گیا کہ نبی کی بددعا خالی نہیں جائے گی، کچھ آثار عذاب کے بھی دیکھنے لگے، گھبرا کر سب لوگ بچوں اور جانوروں سمیت باہر جنگل میں چلے گئے، اور ماؤں کو بچوں سے جدا کر دیا، میدان میں پہنچ کر سب نے رونا چلانا گریبان چاک کر کے رونا چلانا شروع کیا، بچے اور مائیں آدمی اور جانور سب شور مچا رہے تھے، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، تمام بستی والوں نے سچے دل سے توبہ کی اور بت توڑ ڈالے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا عہد باندھا، اور حضرت یونس علیہ السلام کو تلاش کرنے لگے کہ کہیں ملیں تو ان کے ارشاد پر کاربند ہوں، حق تعالیٰ سبحانہ نے آنے والا عذاب ان پر سے اٹھالیا، فرمایا: ﴿فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۭ لَمَّآ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ﴾ [یونس:۹۸] (بھلا کوئی بستی ایسی کیوں نہ ہوئی کہ ایسے وقت ایمان لے آتی کہ اس کا ایمان اسے فائدہ پہنچا سکتا؟ البتہ صرف یونس کی قوم کے لوگ ایسے تھے جب وہ ایمان

لے آئے تو ہم نے رسوائی کا عذاب ان سے اٹھالیا)۔

ادھر یونس علیہ السلام بستی سے نکل کر ایک جماعت کے ساتھ کشتی پر سوار ہوئے، وہ کشتی غرق ہونے لگی، کشتی والوں نے بوجھ ہلکا کرنے کے لئے ارادہ کیا کہ ایک آدمی کو نیچے پھینک دیا جائے، یا وہ اپنے مفروضات کے مطابق یہ سمجھے کہ کشتی میں کوئی غلام مولا سے بھاگا ہوا ہے۔ بہر حال! اس آدمی کی تعیین کے لئے قرعہ ڈالا، وہ یونس علیہ السلام کے نام پر نکلتا رہا، یہ دیکھ کر یونس علیہ السلام دریا میں کود پڑے، فوراً ایک بڑی مچھلی آ کر نگل گئی، اللہ تعالیٰ نے مچھلی کو حکم دیا کہ یونس علیہ السلام کو اپنے پیٹ میں رکھ، ان کا ایک بال بیکا نہ ہو، یہ تیری روزی نہیں بلکہ تیرا پیٹ ہم نے اس کا قید خانہ بنایا ہے، اس کو اپنے اندر حفاظت سے رکھنا۔ اس وقت یونس علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کو پکارا:

﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ اپنی خطا کا اعتراف کیا کہ بیشک میں نے عجلت کی کہ تیرے حکم کا انتظار کئے بغیر بستی والوں کو چھوڑ کر نکل کھڑا ہوا۔ گو یونس علیہ السلام کی یہ غلطی اجتہادی تھی جو امت کے حق میں معاف ہے، مگر انبیاء علیہم السلام کی تربیت و تعلیم اور تہذیب دوسرے لوگوں سے ممتاز ہوتی ہے، جس معاملہ میں وحی کے آنے کی امید ہو بدون انتظار کئے قوم کو چھوڑ کر چلا جانا ایک نبی کی شان کے لائق نہ تھا، مگر:

﴿فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ﴾ پس اس کو یہ گمان ہو گیا کہ اس معاملہ میں مجھ پر کوئی گرفت اور مؤاخذہ نہ ہوگا، یہ ان کا اجتہاد تھا جو صحیح ثابت نہیں ہوا۔

پس اسی نامناسب بات پر دارو گیر شروع ہوگئی، آخر توبہ کے بعد نجات ملی، مچھلی نے کنارہ پر آ کر اگل دیا، اور اس بستی کی طرف صحیح سالم واپس کئے گئے۔ مزید تفصیل سورۂ صافات میں آنے والی ہے۔

— حضرت سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مچھلی والے کی جو دعا مچھلی کے پیٹ میں تھی: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ جو مسلمان بھی اس کے ذریعہ سے دعا کرے گا اللہ تعالیٰ ضرور اس کی دعا قبول فرمائے گا۔ تفسیر درمنثور میں بحوالہ مستدرک حاکم سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کیا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کا وہ اسم نہ بتادوں؟ وہ یہ ہے: ﴿لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ﴾ جو بھی کوئی مسلمان چالیس مرتبہ اس کے ذریعہ اپنے ربّ سے دعا کرے گا پھر اس مرض میں مرجائے جس میں یہ دعا کی تو اسے شہید کا ثواب دیا جائے گا، اور اگر اچھا ہو گیا تو اس حالت میں اچھا ہو جائے گا کہ اس کے گناہ بخشے جا چکے ہوں گے۔

بہر حال! یہ عظیم بابرکت دعا یہ ہے، ہر مسلمان کو چاہئے کہ پریشانیوں میں خصوصاً اس کے پڑھنے کا التزام کرلے، ان شاء اللہ تعالیٰ یہ اکسیرِ اعظم ہے باذن اللہ۔

وَزَكَرِيَّآ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ رَبِّ لَا تَذَرْنِىْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَيْرُ الْوٰرِثِيْنَ ﴿۸۹﴾ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۡ وَوَهَبْنَا لَهٗ يَحْيٰى وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا يُسٰرِعُوْنَ فِى الْخَيْرٰتِ وَيَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا ؕ وَكَانُوْا لَنَا خٰشِعِيْنَ ﴿۹۰﴾ وَالَّتِىْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۱﴾

ترجمہ: اور زکریا کا تذکرہ کیجئے جب کہ انہوں نے اپنے ربّ کو پکارا کہ اے میرے ربّ! مجھے تنہا نہ چھوڑیئے، اور آپ سب وارثوں سے بہتر وارث ہیں ﴿۸۹﴾ سو ہم نے ان کی دعا قبول کی، اور انہیں یحییٰ عطا کیا، اور ان کی بیوی کو اولاد کے قابل بنا دیا، بلاشبہ یہ لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے تھے، اور ہمیں رغبت کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے پکارا کرتے تھے، اور ہمارے سامنے خشوع سے رہتے تھے ﴿۹۰﴾ اور اس عورت کو یاد کیجئے جس نے اپنے ناموس کو محفوظ رکھا، سو ہم نے اس میں اپنی روح پھونک دی، اور اسے اور اس کے بیٹے کو جہاں والوں کے لئے نشانی بنا دیا ﴿۹۱﴾

معارف ومنازل

سورۂ طٰہٰ کے شروع میں حضرت زکریا علیہ السلام اور حضرت یحییٰ علیہ السلام کا واقعہ تفصیلاً بیان ہوا، پھر حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے تفصیلی حالات بھی بیان ہوئے، موجودہ آیات میں ان کی دعا قبول ہونے کے جو اسباب بیان ہوئے ہیں یہ نہایت اہم اور ضروری ہیں، چاہئے کہ ہر مسلمان ان اسبابِ اربعہ کو اپنی زندگی کا شعار بنائے، جن کی بدولت ان کے اعمال اور دعوات کو قبولیت کا شرف حاصل ہوگا، وہ یہ ہیں:

❶ اول یہ کہ نیک کاموں میں مسارعت اور مسابقت کریں، اور نیکیوں میں دلچسپی دکھائیں۔

❷ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ کو رغبت اور شوق ومحبت کے ساتھ پکارے۔

❸ تیسری بات یہ کہ خوف اور ڈرتے ہوئے اللہ تعالیٰ شانہ کے حضور پیش ہو۔ ان دونوں صفات کا خلاصہ یہ ہے کہ امید اور خوف دونوں کو اپنائے، جیسے فرمایا: **الإیمان بین الرجأو الخوف۔**

❹ چوتھی صفت یہ کہ خشوع، خضوع اور انکساری کے ساتھ رہے۔ یہ صفت بہت اونچی اور بابرکت ہے، اللہ

تعالیٰ کے نزدیک اس کا بڑا مقام ہے، اور انبیاء کرام علیہم السلام کی مخصوص صفت ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کے ساتھ ان صفات کا تذکرہ صرف اسی مقصد کے لئے ہے کہ قرب خداوندی کے حصول اور قبولیت دعاء کے لئے یہ چاروں صفات بمنزلہ اکسیر کے ہیں۔

اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ ۞ وَتَقَطَّعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ؕ
كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ ۞ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ
وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ۞ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَاۤ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ۞

ترجمہ: بلاشبہ یہ تمہارا دین ہے جو ایک ہی طریقہ ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو تم میری عبادت کرو۞ اور اپنے دین میں اختلاف کر کے لوگ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے سب کو ہماری طرف لوٹنا ہے۞ اور جو شخص نیک عمل کرے اس حال میں کہ وہ مؤمن ہو سو اس کی محنت کی ذرا بھی ناقدری نہیں ہوگی اور بلاشبہ ہم اسے لکھ لیتے ہیں۞ اور یہ بات ضروری ہے کہ ہم نے جس بستی کو ہلاک کیا وہ رجوع نہیں کریں گے۞

معارف ومنازل

انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات اور توحید ورسالت اور معاد کی حقانیت واثبات کے بعد فرمایا:

﴿اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً﴾ یہ تمہاری امت یعنی دین اور ملّت ایک ہی دین اور ایک ہی ملّت ہے، جس کا نام اسلام ہے، گویا کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا تعلق ایک ہی ملّت اسلام سے ہے، اور یہ واضح ہے کہ اصول دین اور ملّت سارے انبیاء کرام علیہم السلام میں ایک ہی مشترک ہے، البتہ ان کے شرائع اور احکام وفروع مختلف ہیں۔ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: نَحْنُ مَعْشَرَ الْاَنْبِیَاءِ اَوْلَادُ عَلَاتٍ دِیْنُنَا وَاحِدٌ وَاُمَّهَاتُنَا شَتّٰی۔ [ابن کثیر]

ہم سارے انبیاء علیہم السلام علاتی بھائیوں کی طرح ہیں، جن کا باپ ایک اور مائیں مختلف ہوتی ہیں۔ ہم سب کا دین وملّت ایک ہے، تمام بڑے بڑے اصول یکساں ہیں، مگر شرائع، جزئیات اور احکام مختلف ہیں، جیسے سورۂ شوریٰ میں ارشاد ہے: ﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْۤ اَوْحَيْنَاۤ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰۤى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾ [الشوریٰ: ١٣] (اللہ نے تمہارے لیے دین کا وہی

طریقہ طے کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا، اور جو ہم نے تمہارے پاس وحی کے ذریعہ بھیجا ہے، اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم دین کو قائم کرو، اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا)۔

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے بھی وہی دین مقرر کیا ہے جو نوح علیہ السلام اور آپ سے بعد والے نبیوں علیہم السلام کے لئے مقرر کیا گیا، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو تسلیم کرنا، قیامت پر یقین، تقدیر پر یقین، انبیاء علیہم السلام پر یقین اور آسمانی کتب پر یقین، فرشتوں علیہم السلام پر ایمان اور روز قیامت پر یقین، نیز حلال وحرام کی تصدیق اور اس پر عمل اور پابندی، اور عمل ہی دین ہے، جو سب میں مشترک ہے۔

﴿وَاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ﴾ اور میں تمہارا پروردگار ہوں، خاص میری ہی عبادت کرو، عبادات قولیہ، عملیہ، مالیہ سب کا مستحق میں ہی ہوں، میرے سوا کوئی مخلوق کسی بھی عبادت کا لائق نہیں، اللہ تعالیٰ نے سب کا ایک ہی دین مقرر کیا تھا، مگر اس پر متفق نہ رہے۔

﴿وَتَقَطَّعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ﴾ پھر ان لوگوں اپنے دینی معاملے کو پارہ پارہ کر دیا، اور اپنے نفس اور ابلیس کے بہکانے پر انبیاء کرام علیہم السلام کی تو تکذیب کی مگر نفسانی خواہشات پر جمے رہے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بنی اسرائیل بہتر (۷۲) فرقوں میں تقسیم ہو گئے تھے، تو میری امت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی، فرمایا: سب جہنمی ہوں گے، صرف ایک فرقہ ناجیہ ہوگا، لوگوں نے پوچھا: اس کی علامت کیا ہوگی؟ فرمایا: مَا اَنَا وَعَلَيْهِ وَ اَصْحَابِىْ۔ یعنی جو میرے اور میرے صحابہ (رضی اللہ عنہم) کے طریقہ پر ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ اتباع سنت ان کا شعار ہوگا، شرک اور بدعات سے، نیز قبر پرستی وغیرہ مشرکانہ عقائد واعمال سے پاک رہیں گے، بے شک ہر باطل فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا اور کہتا ہو، لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔

﴿كُلٌّ اِلَيْنَا رٰجِعُوْنَ﴾ سب کے سب ہماری طرف لوٹ کر آنے والے ہیں، ہم سب کو پورا پورا بدلہ دیں گے۔ جب سب کا رجوع اللہ تعالیٰ کی طرف ہوگا تو وہاں قانون یہ ہوگا:

﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ﴾ جو شخص نیک اعمال انجام دیتا ہے، فرائض واجبات کی ادائیگی کے ساتھ دیگر نیکیوں پر بھی عامل رہتا ہے بشرطیکہ وہ مؤمن ہو، کیونکہ تمام اور ہر قسم کی نیکیوں کے لئے ایمان لازمی شرط ہے، اور بغیر ایمان کے کسی بھی نیکی کی پزیرائی اور قبولیت نہیں ہوگی، اگر کسی کا عقیدہ صحیح نہ ہو تو پہاڑوں جتنے اعمال کی حیثیت ایک ذرہ برابر بھی نہیں ہوگی، وہ: ﴿عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ۝٣ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ۝٤﴾ [الغاشیۃ] (مصیبت جھیلتے

ہوئے تھکن سے چور۔ وہ دہکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے) کا مصداق ہوگا۔

﴿فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ﴾ جب اعمال کے ساتھ عقیدہ درست ہو تو سونے پر سہاگہ، ایسے اعمال کی قدرو منزلت مثالی ہوگی، اور کسی قسم کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔

﴿وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ﴾ اور ہم ہر نیکی کے کام کو لکھنے والے ہیں، کسی کا کوئی ذرہ بھر عمل بھی ضائع نہ ہوگا، سورۂ قمر میں فرمایا: ﴿وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ۝ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ۝﴾ [القمر] (اور جو جو کام انہوں نے کیے ہیں وہ سب اعمال ناموں میں درج ہیں۔ اور ہر چھوٹی اور بڑی بات لکھی ہوئی ہے)۔ سورۂ ق میں فرمایا: ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ [ق:۱۸] (کوئی شخص کوئی بھی لفظ زبان سے ادا کرتا ہے ہمارے فرشتے اسے نوٹ کر لیتے ہیں) بلکہ پوری زندگی ریکارڈ ہو جاتی ہے، پھر قیامت کے دن جب نامۂ اعمال ہاتھ میں آئے گا تو ظالم و کافر حیرانی کے عالم میں حسرتوں کے ساتھ کہے گا: ﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا﴾ [الکہف:۴۹] (یہ کیسی کتاب ہے جس نے نہ کوئی چھوٹی چیز کو چھوڑی ہے نہ بڑی مگر اسے محفوظ کر رکھا ہے)۔ آگے نافرمانوں کی ہلاکت کا قانون بیان ہو رہا ہے:

﴿وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَآ اَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ﴾ حرام ہے ان بستی والوں پر کہ جن کو ہم نے ہلاک کیا کہ وہ لوٹ کر نہیں آئیں گے۔ مفسرین حضرات یہاں پر حرام کے معنی دو طریقے پر کرتے ہیں: پہلا معنی ضروری کے معنی میں ہے، پس مطلب یہ ہوگا کہ جن بستی والوں کو ہم نے ان کے جرائم کی وجہ سے ہلاک کیا ہے ان پر ضروری ہے کہ وہ واپس دنیا میں نہیں آئیں گے۔ دوسرا معنی ممنوع ہے، یہ معنی عام فہم ہے، تو معنی یہ ہوگا کہ ہلاک شدہ بستی والوں پر دوبارہ واپس دنیا میں آنا ممنوع ہے، تاکہ وہ یہاں آکر اپنے کفر و شرک کی تلافی کر سکیں ایسا ممکن نہیں ہے۔

بعض حضرات کے نزدیک یہ معنی ہے کہ ہلاک ہونے والی بستی کے لوگ دوبارہ ہدایت کی طرف نہیں آتے، اور یہ ممکن نہیں، سنت اللہ ہمیشہ یہی رہی کہ نافرماں اقوام خواہ ہلاک شدہ ہوں یا غیر ہلاک شدہ جب وہ یہاں سے ابدی عذاب کے مقام میں پہنچے تو پلٹ کر ہدایت حاصل کرنے کے لئے دوبارہ دنیا میں نہیں آئے، وہ ضرور یہ کہیں گے: ﴿رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّيْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ كَلَّا﴾ [المومنون:۱۰۰] (اے میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دیجئے۔ تاکہ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں جا کر نیک عمل کروں)۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تشریحی مطلب اس طرح بیان فرمایا کہ جس بستی کو ہم نے تباہ کر دیا اس کا

دنیا میں واپس لوٹنا ممکن نہیں، اس مطلب پر ﴿لَا یَرْجِعُوْنَ﴾ میں "لَا" زائد ہوگا۔

حَتّٰۤی اِذَا فُتِحَتْ یَاْجُوْجُ وَمَاْجُوْجُ وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ یَّنْسِلُوْنَ ﴿٩٦﴾ وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿٩٧﴾

ترجمہ: یہاں تک کہ جب یاجوج وماجوج کھول دیئے جائیں گے، اور وہ ہر بلندی (اونچی جگہ) سے جلدی جلدی چلے آئیں گے ﴿٩٦﴾ اور سچا وعدہ قریب آجائے گا، تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کی آنکھیں اوپر کو اٹھی ہوئی رہ جائیں گی، اور وہ کہیں گے: ہائے ہماری کم بختی! ہم اس کی طرف سے غافل تھے، بلکہ ہم ظلم کرنے والے تھے ﴿٩٧﴾

معارف ومنازل

یاجوج ماجوج کا خروج علامات قیامت میں سے ہے، پہلے مسیح علیہ السلام کا آسمانوں سے نزول ہوگا، وہ دجال کو باب لُد کے پاس ختم کردیں گے، اس کے بعد یاجوج ماجوج کا خروج ہوگا، وہ نہایت کثرت کے ساتھ ٹڈی دل کی طرح پھیل جائیں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو پیغام بھیجیں گے کہ میں نے ایسی مخلوق کو نکالا ہے جن کے ساتھ مقابلے کی کسی کو تاب نہیں، لہٰذا تم چیدہ چیدہ بندوں کو ہمراہ لے کر کوہ طور پر چلے جائیں، بعد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے سارے تباہ ہوجائیں گے، ان کے متعلق تفصیلات سورۂ کہف میں دیکھیں۔

﴿وَاقْتَرَبَ الْوَعْدُ الْحَقُّ﴾ یاجوج ماجوج کے خروج پر سچا وعدہ قریب آجائے گا، وہ سچا وعدہ وقوع قیامت کا ہے، قیامت جب برپا ہوگی تو عجیب وغریب حالات نظر آئیں گے، فرمایا:

﴿فَاِذَا هِیَ شَاخِصَةٌ اَبْصَارُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ اس وقت اچانک کافروں کی آنکھیں اوپر لگی ہوئی ہوں گی، وہ ٹکٹکی باندھے دیکھتے ہوں گے، اور حیرانی کے عالم میں کہیں گے:

﴿یٰوَیْلَنَا قَدْ كُنَّا فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا﴾ ہائے افسوس کہ ہم تو واقعہ سے غفلت میں پڑے ہوئے تھے، پیغمبروں علیہم السلام نے ہر چند وقوع قیامت کے متعلق ہمیں سمجھایا، مگر ہم لوگ غفلت اور لاپرواہی میں رہے

﴿بَلْ كُنَّا ظٰلِمِیْنَ﴾ بلکہ یقیناً ہم ہی زیادتی کرنے والے تھے، آج قیامت کے دن سارے حقائق کھل جائیں گے، انکار کی کسی کو گنجائش نہیں ہوگی، سارے منکرین اپنے اپنے قصور وجرائم کا اقرار کریں گے، لیکن بعد

از وقت کا یہ اقرار فائدہ مند نہ ہوگا۔

اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ﴿٩٨﴾ لَوْ كَانَ هٰۤؤُلَآءِ
اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٩٩﴾ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ ﴿١٠٠﴾ اِنَّ
الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ ﴿١٠١﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا ۚ
وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿١٠٢﴾ لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ وَتَتَلَقّٰىهُمُ
الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿١٠٣﴾

ترجمہ: بلاشبہ تم اور جن کی اللہ تعالیٰ کے سوا تم عبادت کرتے تھے سب دوزخ کا ایندھن ہو، تم اس میں داخل ہوں گے ﴿٩٨﴾ اگر یہ واقعی معبود ہوتے تو اس میں کیوں داخل ہوتے؟ اور سب کو اس میں ہمیشہ رہنا ہوگا ﴿٩٩﴾ دوزخ میں ان کی چیخ و پکار ہوگی، اور وہ اس میں نہ سنیں گے ﴿١٠٠﴾ بلاشبہ جن کے لئے پہلے ہی ہماری طرف سے بھلائی کا فیصلہ مقرر ہو چکا ہے وہ جہنم سے دور رکھے جائیں گے ﴿١٠١﴾ وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے، اور اپنی جی چاہی چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے ﴿١٠٢﴾ ان کو بڑی گھبراہٹ رنجیدہ نہ کرے گی، اور فرشتے ان کا استقبال کریں گے، یہ تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا ﴿١٠٣﴾

معارف ومنازل

جب کفار اپنے ظالم ہونے کا اقرار کریں گے تو انہیں ان کے مستقبل اور برے انجام کی بشارت دے کر فرمائیں گے:

﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ تم اور تمہارے معبود جن کی تم اللہ تعالیٰ کے سوا عبادت کرتے تھے جہنم کا ایندھن ہو۔ حَصَبُ بمعنی ایدھن، جس سے آگ جلائی جاتی ہے، اور لکڑی کو بھی حطب اور حَصَب کہتے ہیں، دونوں معنی قریب قریب ہیں۔

﴿اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ﴾ اور تم اس میں پہنچنے والے ہو، اس وقت تم کف افسوس ملتے ہوئے کہو گے، یا فرشتے تمہیں ملامت کرتے ہوئے زجر و توبیخ کے طور پر کہیں گے: آؤ دیکھو، اپنے معبودوں کا انجام بد۔

﴿لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا﴾ یہ اگر سچے معبود ہوتے جن کی ہم عبادت کرتے رہے ہیں تو آج ہم جہنم میں نہ پھینکے جاتے، یا فرشتے انہیں کہیں گے کہ اگر یہ سچے معبود ہوتے تو تمہارے ساتھ جہنم میں نہ پھینکے جاتے، بلکہ اس عذاب سے بچ جاتے۔

﴿وَكُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ آج وہ سارے ہمیشہ کے لئے جہنم میں رہیں گے جن کا حال یہ ہوگا۔

﴿لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّهُمْ فِيْهَا لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ وہاں انہیں چیخنا چلانا ہوگا۔ سورۃ ھود میں فرمایا: ﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ شَقُوْا فَفِى النَّارِ لَهُمْ فِيْهَا زَفِيْرٌ وَّشَهِيْقٌ﴾ [ھود:١٠٦] (سو جو لوگ بد بخت ہیں وہ تو آگ میں ہیں، ان کو وہاں چیخنا ہے اور دھاڑنا ہے)۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فراتے ہیں: زَفِيْر زور کی آواز کو، اور شَهِيْق پست آواز کو کہتے ہیں۔

حضرت ضحاک اور مقاتل رحمۃ اللہ علیہما کا بیان ہے کہ زَفِيْر گدھے کی پہلی آواز ہے، اور شَهِيْق اس کی آخری جبکہ وہ اس کو سینہ کی طرف لوٹاتا ہے۔ جہنمی جہنم میں اسی طرح گدھے کی طرح چیخیں اور چلائیں گے، کیونکہ انہوں نے دنیا میں اپنے پروردگار کا حکم کبھی نہیں مانا، اور حق کی تبلیغ کرنے والوں کو گدھوں سے بھی بدتر سمجھا، اور ان کی توہین کی، اور ان کی بات نہیں سنی، آج ان کا یہ حال ہوگا کہ:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ﴾ ان کی کوئی بات نہیں سنی جائے گی، وہاں گدھوں کی آواز سنائی نہیں دے گی، اور ان کا چیخنا چلانا بالکل رائے گاں جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت میں آتا ہے جس کی تفصیل سورۃ ہمزہ کی آیت: ﴿اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ ⑧ فِىْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ ⑨﴾ [الھمزۃ] (یقیناً وہ ان پر بند کردی جائے گی۔ جبکہ وہ لمبے چوڑے ستونوں میں ہوں گے) کے میں آئے گا (اِن شاء اللہ تعالیٰ) کہ کافروں کو بڑے بڑے ستونوں کے ساتھ باندھ کر اوپر سے پوش ڈال دیئے جائیں گے، وہ ان میں بند ہو کر رہ جائیں گے، اور ان کی کوئی آواز سنائی نہیں دے گی۔

دیگر کفار و مشرکین کی طرح مکے کا ایک شاعر عبداللہ بن زلعبرہ بھی سخت مخالفین میں سے تھا، مگر بعد میں ایمان لایا، ابتدائی دور میں اس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بہت بڑا پروپیگنڈہ کیا۔ ایک مرتبہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر یوں کہا کہ مسیح اور عزیر کون ہیں؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نہیں؟ پھر کہا: فرشتے کون ہیں؟ کیا یہ اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ مخلوق نہیں؟ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے دونوں سوالوں کا جواب اثبات میں دیا تو عبداللہ

بن زلعبرہ کہنے لگا کہ ہم تو انہی پاک ہستیوں کی پوجا کرتے ہیں، اور انہی کو معبود مانتے ہیں، اب اگر تمہارے کہنے کے مطابق: ﴿اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ عابد اور معبود سب جہنم میں جائیں گے تو یہ تو اچھی بات ہے کہ ہم ان پاکیزہ لوگوں کے ساتھ ہی رہیں گے، آنے والی آیت میں اسی اعتراض کا جواب ہے، فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ بیشک وہ لوگ جن کے لئے ہماری طرف سے پہلے ہی بھلائی کا فیصلہ ہو چکا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے علم میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندے اور علمبر دارانِ توحید ہیں:

﴿اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ﴾ وہ اس جہنم سے دور رہیں گے، اور "وَمَا" کے عموم سے مستثنیٰ رہیں گے، کیونکہ معبودانِ باطلہ میں نہ مسیح علیہ السلام داخل ہیں، نہ عزیر علیہ السلام اور نہ ہی فرشتے، کیونکہ وہ اپنی پوری زندگی توحید کی دعوت دیتے رہے، اور تمہارے کافروں کے شرک سے بیزاری کا اظہار کرتے رہے، اور میدان محشر میں بھی تم سے براءت کا اعلان کریں گے، ہم نے تو انہیں اپنی پوجا کے لئے نہیں کہا، بلکہ یہ تو اصل میں شیطان کی اتباع کرتے رہے، لہٰذا وہ اس وعید سے مستثنیٰ رہیں گے۔ اس کی تفصیل سورۂ مائدہ کے آخر میں گزر چکی، اور مزید سورۃ الزخرف کی آیت (٥٧) کے ذیل میں ان شاء اللہ آنے والی ہے۔

فرمایا: ان حضرات کے لئے حسنیٰ جنت اور کامیابی کا وعدہ ہو چکا ہے، وہ جہنم سے دور رہیں گے، بلکہ اتنا دور ہوں گے کہ:

﴿لَا يَسْمَعُوْنَ حَسِيْسَهَا﴾ وہ تو دوزخ کی آہٹ بھی نہیں سنیں گے۔

﴿وَهُمْ فِيْ مَا اشْتَهَتْ اَنْفُسُهُمْ خٰلِدُوْنَ﴾ وہ اپنی من پسند جگہ میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، اس طرح اللہ تعالیٰ نے سارے مشرکین اور خاص کر عبداللہ بن زلعبرہ کا زعم باطل کی تردید فرما دی کہ ان پاک ہستیوں کو کبھی اپنے باطل معبودوں کے زمرہ میں شامل نہ کرو۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اتنے مقرب ہیں کہ:

﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْاَكْبَرُ﴾ کہ بڑے دن (قیامت) کی گھبراہٹ انہیں غم میں نہیں ڈالے گی، بلکہ:

﴿وَتَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ﴾ فرشتے ان سے ملیں گے، اور انہیں خوشخبری دیں گے:

﴿هٰذَا يَوْمُكُمُ الَّذِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ﴾ یہی تمہارا وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا کہ اس دن تمہیں بڑا اکرام وانعام حاصل رہے گا، اور تم اللہ تعالیٰ کی رحمت میں داخل ہو جاؤ گے۔ آگے قیامت کے حالات کا

بیان ہو رہا ہے، اور سرزمین جنت کا بھی۔

يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ ؕ كَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ ؕ
وَعْدًا عَلَيْنَا ؕ اِنَّا كُنَّا فٰعِلِيْنَ ﴿١٠٤﴾ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْۢ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ
الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ ﴿١٠٥﴾ اِنَّ فِيْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ ﴿١٠٦﴾

ترجمہ: وہ دن یاد رکھنے کے قابل ہے جس روز ہم آسمانوں کو اس طرح لپیٹ دیں گے، جس طرح لکھے ہوئے مضمونوں کا کاغذ لپیٹ دیا جاتا ہے، ہم نے جس طرح پہلی بار مخلوق کی پیدائش کی ابتدا کی تھی اسی طرح ہم اسے لوٹا دیں گے، ہمارے ذمہ وعدہ ہے، بلاشبہ ہم کرنے والے ہیں ﴿١٠٤﴾ اور یہ واقعی بات ہے کہ ہم نے ذکر کے بعد لکھ دیا ہے کہ بلاشبہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہوں گے ﴿١٠٥﴾ بلاشبہ اس میں عبادت گزاروں کے لئے کافی مضمون ہے ﴿١٠٦﴾

معارف ومنازل

سورۃ الزمر میں ارشاد فرمایا: ﴿وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ﴾ [الزمر: ٦٧] (یعنی جس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ قیامت کے دن کُل زمین اس کی ایک مٹھی میں، اور سارے آسمان کاغذ کی طرح لپیٹے ہوئے ایک ہاتھ میں ہوں گے۔ یہاں اسی کا تذکرہ ہو رہا ہے:

﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَآءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ لِلْكُتُبِ﴾ وہ دن بھی یاد کرنے کے قابل ہے جس روز (نفخہ اولی کے وقت) ہم آسمان کو اس طرح لپیٹ دیں گے جس طرح لکھے ہوئے مضمون کا کاغذ (طومار) لپیٹ لیا جاتا ہے۔ طيّ نشر کی ضد ہے، بمعنی لپیٹنا۔ تہ کرنا۔

﴿بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ﴾ جس طرح ہم نے شروع میں ابتداءِ تخلیق کی تھی اسی طرح آسانی سے ہم اس کو دوبارہ پیدا کر دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ دوبارہ پیدا کیا ہوا انسان بعینہٖ وہی انسان ہوگا جس کو پہلی مرتبہ پیدا کیا گیا تھا، مشابہت صرف تخلیق یا احوال واوصاف میں ہوگی، ذات اور شخصیت ایک ہوگی۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خطبہ دینے کھڑے ہوئے اور فرمایا: اے لوگو! تم برہنہ بدن، غیر مختون، برہنہ پاؤں

قبروں سے اٹھا کر اللہ تعالیٰ کی طرف پیدل لے جائے جاؤ گے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت: ﴿كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ﴾ تلاوت فرمائی، اور فرمایا: سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ [صحيحين، ترمذي]

﴿وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ﴾ ہم نے پختہ وعدہ کرلیا ہے، اس کو پورا کرنا لازم اور ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کے حق میں وعدہ خلافی محال ہے، ہم ضرور دوبارہ تخلیق کرنے والے ہیں، یہ جملہ مزید تاکید کے لئے ہے:

﴿وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ﴾ ہم نے لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد سب آسمانی کتابوں میں لکھ دیا ہے۔ سعید بن جبیر اور مجاہد رحمۃ اللہ علیہما نے کہا: زبور سے مراد تمام کتب الٰہیہ ہیں، اور ذکر سے مراد لوح محفوظ ہے، یعنی لوح محفوظ میں لکھنے کے بعد ہم نے اپنی تمام نازل کردہ کتابوں میں لکھ دیا ہے۔

شعبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: زبور سے مراد زبور داود ہے، جو داود علیہ السلام پر اتاری گئی تھی، اور ذکر سے مراد تورات ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اور ضحاک رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ زبور سے مراد توریت ہے، اور ذکر سے مراد ہیں وہ تمام آسمانی کتابیں جو تورات کے بعد اتاری گئیں۔ بعض حضرات نے کہا: زبور سے مراد زبور داود علیہ السلام ہے، اور ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔ آخری دونوں قولوں پر بعد الذکر میں لفظ بعد بمعنی قبل ہوگا، یعنی قرآن سے پہلے۔ [مظهري]

﴿أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ﴾ جنت کی زمین کے مالک میرے نیک بندے ہوں گے۔ الْأَرْض سے مراد جنت کی زمین ہے، اسی مضمون کو آیت: ﴿وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ﴾ [الأعراف:١٢٨] (اور انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے) میں بیان کیا گیا ہے۔

صالحین میں وہ گنہگار مؤمن بھی داخل ہیں جو سزا پانے کے بعد، یا معاف ہونے کے بعد جنت میں داخل ہوجائیں گے، کیونکہ پاک ہونے کے بعد وہ صالحین شمار ہوں گے۔ امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: صالحین سے مراد امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ہے، ان کے متعلق کہا گیا ہے: ﴿وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ وَأَوْرَثَنَا الْأَرْضَ نَتَبَوَّأُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَاءُ ۖ فَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ [الزمر:٧٤] (اور جنتی کہیں گے کہ تمام تر شکر اللہ کا ہے جس نے ہم نے اپنے وعدے کو سچا کر دکھایا، اور ہمیں اس سرزمین کا ایسا وارث بنادیا کہ ہم جنت میں جہاں چاہیں اپنا ٹھکانا بنالیں، پس بہترین انعام عمل کرنے والوں کا ہے)۔

الْأَرْض یہ کونسی زمین ہے کہ صالحین اس کے وارث ہوں گے؟ اس بارے میں حضرت ابن عباس،

حضرت مجاہد، حضرت شعبی، اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم نے فرمایا ہے کہ اس سے جنت کی سرزمین مراد ہے (کیونکہ وراثت کا اطلاق دوام پر ہوتا ہے، اور قرین قیاس بھی یہی ہے)۔ تو مطلب واضح ہے کہ صالحین جنت کے وارث ہوں گے، جیسے سورۃ الزمر کی آیت میں وارث جنت کا بیان ہوا، لہٰذا یہ اشکال واقع ہی نہیں کہ دنیا کی سرزمین پر مؤمنین صالحین کا اقتدار محدود اور مختصر رہا، جبکہ فساق وفجار اور کافروں کا اقتدار عمومی اور دائمی بکثرت رہا، جیسا کہ آج ہمارے زمانے میں مسلمان ممالک کی تعداد ساٹھ کے قریب ہے، جبکہ کفار ومشرکین دنیا کی اکثریت پر غالب ہیں، اور ڈھائی سو سے زائد ممالک پر ان کا اقتدار وغلبہ ہے۔

اور ہونا بھی یہی چاہئے، کیونکہ دنیا اللہ تعالیٰ کے ہاں مبغوض ہے، اور کافروں کی جنت ہے، اور صالحین کے لئے قید خانہ سے کم نہیں ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لیکن اگر دنیا والی زمین مراد لی جائے تب بھی ایک حد تک آیت کریمہ کا معنی جزوی طور پر صحیح ہوگا کہ خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے لے کر چھٹی صدی تک دنیا کے ایک بڑے حصے پر مسلمانوں کا اقتدار رہا، مگر وہ مختصر اور محدود رہا، یہاں تک کہ تاتاریوں کے حملے کے بعد اس کا شیرازہ بکھر گیا، پھر اس کے بعد مسلمان حکمرانوں کی عیاشیوں نے اندلس کی سرزمین پر اپنی نحوست کا راج قائم کر کے عیسائیوں کا استقبال کر کے پورا ملک ان کا حوالہ کیا۔ إنا للہ وإنا إلیہ راجعون

اور اب جہاں مسلمانوں کی حکومتیں ہیں وہاں فاسق اور مغرب کے دلدادہ مداح چھائے ہوئے ہیں، وہ نہ خود صالحین ہیں نہ صالحین کو پسند کرتے ہیں، انہیں قرآن وسنت کے نام سے چڑ اور نفرت ہے، وہ صالحین کو اقتدار میں دیکھنا درکنار بلکہ انہیں معاشرہ میں زندہ دیکھنا بھی نہیں چاہتے ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ صالحین کے ہوتے ہوئے ان کے شراب وکباب کی محفلوں پر پابندی عائد ہوگی، اور ان کی خرمستیوں پر زوال آئے گا۔ علامہ اقبالؒ نے کہا:

وضع میں ہو تم نصاریٰ اور تمدن میں ہنود ☆ یہ مسلمان ہیں جنہیں دیکھ کر شرمائے یہود

﴿اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ﴾ بلاشبہ اس میں عابدین کے بلاغ اور نصیحت ہے جسے سمجھ کر اور جان کر اعمال صالحہ کی طرف متوجہ اور آخرت کی طرف متفکر ہو سکتے ہیں۔ حضرت کعب الاحبار رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ قوم عابدین سے مراد امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔ اور حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ عابدین سے وہ لوگ مراد ہیں جو پانچوں وقت پابندی سے نماز ادا کرتے ہیں۔ حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ عابدین سے عاملین مراد

ہیں، لہٰذا یہ لفظ تمام اعمال صالحہ کو اور اعمال صالحہ والوں کو شامل ہے۔ [الدر المنثور]

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ﴿۱۰۷﴾

ترجمہ: اور ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر ﴿۱۰۷﴾

معارف ومنازل

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے ☆ غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا

نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر ☆ وہی قرآن وہی فرقان وہی یٰسین وہی طٰہٰ

تیرے آنے سے رونق آ گئی گلزار ہستی میں ☆ شریک حال قسمت ہو گیا پھر فضل ربانی

صاحب روح المعانی رقمطراز ہیں: **وكونه صلى الله عليه وسلم رحمة للجميع باعتبار انه عليه الصلوٰة والسلام واسطة الفيض الالهي على الممكنات على حسب القوابل ولذا كان نوره صلى الله عليه وسلم اول المخلوقات وفي الخبر اول ما خلق الله تعالىٰ نور نبيك يا جابر وجاء في الحديث الله تعالىٰ المعطي وانا القاسم وللصوفية قدست اسرارهم في هذا الفصل كلام فوق ذالك۔** [روح المعاني]

ترجمہ: یعنی سید کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تمام کائنات کے لئے رحمت ہونا اس اعتبار سے ہے کہ عالم امکان کی ہر چیز کو حسب استعداد جو فیض الٰہی ملتا ہے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واسطہ سے ہی ملتا ہے، اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نور تمام مخلوقات سے پہلے پیدا فرمایا گیا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اے جابر! سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تیرے نبی کے نور کو پیدا فرمایا۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ دینے والا ہے، اور میں (اس کی رحمت کے خزانوں کو بانٹنے والا ہوں)۔ [بخاري]

آپ خود غور فرمائیں کہ جن قوموں یا جن افراد یا جماعتوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن رحمت کو تھاما، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کو صدق دل سے قبول کیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیش کردہ نظام حیات کو اپنی عملی زندگی میں اپنایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت مطہرہ جو کہ قرآنی تعلیمات کا نمونہ ہے، اس کو مشعل راہ بنایا تو وہ لوگ کہاں سے کہاں پہنچ گئے؟

زمینی تاریکیوں کو پیچھے چھوڑ کر رشد وہدایت کے ثریا تک پہنچ گئے، وہ گمراہ تھے، لیکن اس نور مبین سے اکتساب فیض ونور کرنے کے بعد ظلمت کدہ عالم میں ہدایت کے چراغ روشن کر گئے، وہ جاہل محض تھے، لیکن اس چشمۂ علم وعرفان سے سیراب ہونے کے بعد دنیا کے جس جس گوشہ میں گئے تہذیب واخلاق کے نقوش رقم کئے، اور علم وحکمت کے موتی بکھیر دیئے، وہ لوگ گنوار اور اجڈ تھے، لیکن پاکیزہ تہذیب وتمدن کے بانی بن گئے، جہانگیری وجہانبانی کا ایک اچھوتا محیر العقول تصور دنیا کے سامنے پیش کیا، جس کی بدولت انہوں نے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی، لوگ تو کیا انہوں نے جنگلی جانوروں پر حکمرانی کی، اور انہیں ہدایات دیں، کسی نے کیا اچھا کہا: ؎

تیری فیاضی نے ذروں کو بنایا آفتاب ☆ بن گئے اونٹوں کے چرواہے زمانے کے امام

جو نہ تھے خود راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے ☆ کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

لیکن جو لوگ اپنی بدبختی یا کج فہمی کے باعث یا نفسانی ابلیسی بیجا تعصبات میں مبتلا ہو کر اس چشمۂ آب حیات سے بالواسطہ یا بلا واسطہ سیراب نہ ہوئے، وہ بھی ایک اعتبار سے دانستہ یا نادانستہ فیضیاب ہوئے، کیونکہ کائنات کا کوئی ذرہ نہیں جس پر "رحمۃ للعٰلمین" کا سایۂ کرم نہ ہو گزشتہ اقوام عالم کی تاریخ ہمارے سامنے ہے، خاص کر تباہ شدہ اقوام کے، جنہیں قدرت نے ان کے بھیانک اور نہایت برے جرائم کی پاداش میں بذریعہ آسمانی استیصالی عذابوں کے صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے مٹا دیا، جن کے جرائم بڑے ہی سہی، مگر محدود ومعدود درہے۔

لیکن آج کی دنیا کا ہر خطہ، ہر بستی، ہر علاقہ جن معاصی جرائم اور گناہوں میں ملوث ہے تباہ شدہ اقوام کے جرائم ان کے عشر عشیر کو بھی نہیں پہنچتے، مگر "رحمۃ للعٰلمین" کا سایۂ رحمت اور قبول شدہ دعوات مستجابات کے طفیل لاکھوں معاصی کے باوجود آسمانی استیصالی عذاب قوم مسلم تو درکنار یہود ونصاریٰ، ہندو، بدھ مت، سکھ مت اور کسی بھی قوم پر نازل نہ ہوگا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سارے جہانوں کے پیغمبر ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب کے لئے مبعوث ہوئے، اور سب کے لئے رحمت ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امت دعوت وامت اجابت سب کے لئے رحمت خداوندی ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے حضرات انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امتیں جب اسلام قبول نہیں کرتی تھیں تو ان پر عذاب آجاتا تھا، اور نبی کی موجودگی میں ہلاک کر دی جاتی تھیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحمۃ للعٰلمین ہونے کا اس بات میں بھی مظاہرہ ہے کہ عمومی طور پر سب ہی منکرین اور کافرین ہلاک ہو جائیں، ایسا نہیں ہوگا، حالانکہ موجودہ زمانے میں لوگ ایک گھنٹے میں وہ گناہ اور شرک کرتے ہیں جنہیں تباہ شدہ اقوام نے نصف صدی میں بھی نہ کیا، اور آج

موجودہ دنیا کا چپہ چپہ ان بھیانک تباہ کن گناہوں اور جرائم میں لت پت وملوث ہے جنہیں تباہ شدہ اقوام نے کبھی نہیں سوچا، اور نہیں جانا، مگر اس کے باوجود آسمانی عذاب (نازل) مسلط نہیں ہوتا۔

قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۰۸﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَقُلۡ اٰذَنۡتُكُمۡ عَلٰی سَوَآءٍ ؕ وَاِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۱۰۹﴾ اِنَّهٗ یَعۡلَمُ الۡجَهۡرَ مِنَ الۡقَوۡلِ وَیَعۡلَمُ مَا تَكۡتُمُوۡنَ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنۡ اَدۡرِیۡ لَعَلَّهٗ فِتۡنَةٌ لَّكُمۡ وَمَتَاعٌ اِلٰی حِیۡنٍ ﴿۱۱۱﴾ قٰلَ رَبِّ احۡكُمۡ بِالۡحَقِّ ؕ وَرَبُّنَا الرَّحۡمٰنُ الۡمُسۡتَعَانُ عَلٰی مَا تَصِفُوۡنَ ﴿۱۱۲﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ میری طرف یہی وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو کیا تم بات ماننے والے ہو؟ ﴿۱۰۸﴾ سو اگر وہ روگردانی کریں تو آپ فرمادیجئے کہ میں تمہیں خوب صاف طریقہ پر اطلاع دے چکا ہوں، اور میں نہیں جانتا کہ جس کام کا تم سے وعدہ ہوا ہے وہ قریب ہے یا دور ہے ﴿۱۰۹﴾ بلاشبہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ زور کی کہی ہوئی بات کو جانتا ہے، اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اسے بھی جانتا ہے ﴿۱۱۰﴾ اور میں نہیں جانتا کہ شاید وہ تمہارے لئے امتحان ہو، اور ایک وقت تک فائدہ پہنچانا ہو ﴿۱۱۱﴾ رسول نے کہا کہ اے میرے ربّ! حق کے ساتھ فیصلہ فرمادیجئے، اور ہمارا ربّ رحمٰن ہے، جس سے ان باتوں کے مقابلہ میں مدد مانگی جاتی ہے جو تم بیان کرتے ہو ﴿۱۱۲﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیت میں رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصب عالی کا بیان ہوا، اب سورت کی آخری آیات میں پھر توحید ورسالت اور معاد کا بیان بطور تاکید شروع فرمایا۔

﴿قُلۡ اِنَّمَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـهُكُمۡ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾ آپ فرمادیجئے کہ میری طرف اس بات کی وحی کی گئی ہے کہ تمہارا معبود برحق صرف ایک ہی معبود ہے، صرف اسی کی عبادت کرو، اور اسی کو حاجت روا مشکل کشا یقین کرو۔ رحمۃ للعلمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی پیغام ہے، جو تمہارے لئے سراسر رحمت اور باعث نجات ہے۔

﴿فَهَلۡ اَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ﴾ کیا تم فرمانبردار بننے اور ہر قسم کے خسارے سے سلامتی حاصل کرنے کے لئے تیار ہو؟ لہٰذا تم توحید ورسالت کو تسلیم کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اپنا حصہ وصول کرلو۔

﴿فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اٰذَنْتُكُمْ عَلٰى سَوَآءٍ﴾ اگر یہ لوگ روگردانی کریں، دین حق کو اختیار نہ کریں، پس فرمادیجئے کہ میں نے تم کو برابر سرابر خبردار کردیا ہے، نفع ونقصان اور نیک وبد سے تمہیں آگاہ کیا ہے، اب جونسا راستہ چاہو اپنی مرضی سے اختیار کرلو، ہم نے تم پر اتمام حجت کردی، اب جزاء وسزا کا جو معاملہ ہے وہ اٹل اور پختہ ہے۔ البتہ اس کا وقت میرے ربّ کو معلوم ہے۔

﴿وَإِنْ اَدْرِيْٓ اَقَرِيْبٌ اَمْ بَعِيْدٌ مَّا تُوْعَدُوْنَ﴾ میں نہیں جانتا کہ جس چیز (قیامت) کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ نزدیک ہے یا دور، اس کا علم صرف اللہ تعالیٰ کے پاس ہے، کیونکہ:

﴿اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ مِنَ الْقَوْلِ وَيَعْلَمُ مَا تَكْتُمُوْنَ﴾ بیشک وہ تمہاری زور سے کہی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے، اور اس کو بھی جانتا ہے جسے تم چھپاتے ہو، دوسرے مقام پر فرمایا۔ اسی طرح وہ اپنی حکمت ومصلحت کے تحت قیامت کا اور جزاء وسزا کے وقت کا تعین فرمائے گا۔

﴿وَإِنْ اَدْرِيْ لَعَلَّهٗ فِتْنَةٌ لَّكُمْ وَمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ﴾ اور میں نہیں جانتا شاید کہ یہ تمہارے لئے آزمائش کا سامان ہو، اور شاید یہ ایک مقررہ وقت تک فائدہ اٹھانے کا سامان ہو، مگر بالآخر قیامت برپا ہوکر رہے گی، اور سب کو اپنے اعمال کا حساب پیش کرنا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تم کفار دنیا کو اپنا مستقر اور آخری منزل سمجھتے ہو، اور قیامت سے منکر ہو، یہ تمہاری خام خیالی اور حماقت ہے، بلکہ یہ دنیا چند روزہ فائدہ اٹھانے اور آزمائش کا ٹھکانہ ہے، اصل چیز آخرت ہے، جس کا علم اس ذات پاک کو ہے جو ظاہر وباطن کی چیزوں کو جاننے والی ہے۔

اب آخر میں پیغمبر عظیم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ربّ کے عظیم بارگاہ میں اپنی درخواست پیش کی:

﴿قٰلَ رَبِّ احْكُمْ بِالْحَقِّ﴾ اے ہمارے ربّ! تو ہی اپنا فیصلہ صادر فرما۔ دیگر انبیاء علیہم السلام نے بھی یہی کہا، سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: ﴿رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ﴾ [الأعراف: ٨٩] (اے ہمارے ربّ! اب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ کردے، تو ہی بہتر فیصلہ کرنے والا ہے) ہم نے فریضۂ تبلیغ مکمل ادا کردیا ہے، اتمامِ حجت کرچکے ہیں، لوگ ہماری بات نہیں مانتے، دیدہ دوانستہ سرکشی پر اتر آئے، اب آپ ہی فیصلہ صادر فرمائیں، ہم آپ کی رحمت سے مایوس نہیں۔

﴿وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ ہمارا پروردگار رحمٰن بے حد مہربانی کرنے والا ہے، ان بیہودہ باتوں کے خلاف جو تم کرتے ہو تم لوگ حق وصداقت اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کے نبی کے خلاف ہرزہ سرائی

کرر ہے ہو، ہم اس کے خلاف اللہ تعالیٰ کی مدد کے طلبگار ہیں، ہم اسی کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں، اور وہی تم سے انتقام لے گا۔

مطلب یہ ہے کہ تم جو ناجائز بیان کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ صاحب اولاد ہے اور قرآن مجید جادو ہے، اس کا لانے والا ساحر ہے، تمہارے اس قسم کے تمام خرافات کے خلاف ہمارا ربّ رحمٰن ہے، ہمارا مددگار ہے، ہم اسی سے مدد کے خواستگار ہیں۔

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا

سُورَةُ الحَجّ

مدنيةٌ آياتها ۷۸ رکوعاتها ۱۰

سورۂ حج مدنی ہے، اس میں اٹھتر (۷۸) آیتیں، اور دس (۱۰) رکوع ہیں

بِسمِ اللہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

نام:

اس سورت کا نام سورۃ الحج ہے، جو اس سورت کی آیت ۲۷ میں موجود ہے، یہ نام اسی سے ماخوذ ہے۔ یہ سورت ترتیب تلاوت میں ۲۲ نمبر پر ہے، اور ترتیب نزول میں ۱۰۳ نمبر پر ہے۔

نزول:

چونکہ اس سورت میں حج کے احکام بیان ہوئے ہیں اس لئے یہ سورۃ الحج کے نام سے مشہور ہے۔ علامہ قرطبیؒ اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ جمہور علماء کے نزدیک یہ سورت مختلط ہے، بعض آیتیں اس کی مکی دور میں اور بعض مدنی دور میں نازل ہوئی ہیں، اور یہی قول صحیح اور راجح ہے، اس کا نزول سورۃ النور کے بعد ہے۔

تعداد حروف وکلمات:

اس سورت میں دس رکوع، اٹھتر ۷۸ آیات، ۱۲۶۳ کلمات، اور ۵۴۳۲ پانچ ہزار چار بتیس حروف ہیں۔

ربط ومناسبت:

(۱)- گزشتہ سورت کے آخر اور اس سورت کے شروع میں قیامت کا ذکر ہے۔

(۲)- دونوں سورتوں کے آخر میں باری تعالیٰ کے علم کی وسعت کا بیان ہے۔

(٣)-توحید، رسالت، قیامت اور تذکیر بآلاء اللہ دونوں سورتوں میں بڑے پیمانے پر احسن طریقہ سے بیان ہوئے ہیں، وغیرہ۔

مختصر موضوع:

احوال قیامت، تذکیراتِ ثلاثہ، مجازاتِ اعمال، تعمیر کعبۃ اللہ، طواف وحج اور قربانی ومناسکِ حج کا بیان، جہاد اور مجاہدین کا تذکرہ، تکذیب انبیاء علیہم السلام کا نتیجہ، مہاجرین ومجاہدین کی مدح، اصول ایمان کا ذکر، الغرض پوری سورت میں جگہ جگہ مناسب مواقع پر تذکیر ونصیحت بھی ہے، اور شرک کی مذمت بھی ہے۔ مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ یہ عجیب سورت ہے، اس کا ایک حصہ رات میں اور کچھ دن میں، کچھ سفر میں، کچھ حضر میں نازل ہوا ہے، کچھ مکی، کچھ مدنی، کوئی آیت جنگ کے متعلق، کوئی صلح کے متعلق، کوئی ناسخ اور کوئی منسوخ، وغیرہ۔ [قرطبی]

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوۡا رَبَّكُمۡ‌ۚ اِنَّ زَلۡزَلَةَ السَّاعَةِ شَىۡءٌ عَظِيۡمٌ ① يَوۡمَ تَرَوۡنَهَا تَذۡهَلُ كُلُّ مُرۡضِعَةٍ عَمَّاۤ اَرۡضَعَتۡ وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمۡلٍ حَمۡلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمۡ بِسُكٰرٰى وَلٰـكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيۡدٌ ②

ترجمہ: اے لوگو! اپنے ربّ سے ڈرو، بلاشبہ قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہے ① جس دن تم اسے دیکھو گے ہر دودھ پلانے والی اسے بھول جائے گی جسے دودھ پلایا، اور ہر حمل والی اپنا حمل ڈال دے گی، اور اے مخاطب! تو لوگوں کو دیکھے گا کہ وہ نشہ کی حالت میں ہیں، حالانکہ وہ نشہ میں نہیں ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت چیز ہے ②

معارف ومنازل

جمہور علماء کا مذہب ہے کہ قیامت کے نفخے دو ہیں: (١) نفخہ اولیٰ، یعنی نفخہ صعق جس سے پورا عالم درہم برہم ہوجائے گا، اور سب مرجائیں گے، اور فنا ہوجائیں گے۔ (٢) نفخہ ثانیہ، یعنی نفخہ بعث جس سے سب مردے دوبارے زندہ ہوجائیں گے۔ دوسرے مذہب حضرت شیخ ابن عربیؒ اور دیگر بعض محققین اور صوفیا کا ہے کہ نفخات تین ہیں: (١) پہلا نفخہ فزع اکبر کہلائے گا، یہ علامات قیامت کا حصہ ہوگا، اور قیامت سے بہت پہلے ہوگا، جس کے ساتھ سورج کا

طلوع مغرب سے ہوگا، جس کا بیان سورۃ الانبیاء آیت ۱۰۳ میں گزر گیا ہے۔
دوسرا نفخہ صعق کا ہوگا، اور تیسرا نفخہ بعث کا ہوگا۔ جمہور کے مذہب میں نفخہ اولی کو فزع اکبر قرار دیا گیا ہے، جبکہ حضرت ابن عربیؒ نے اسے مستقل نفخہ قرار دیا ہے، اور اس کی شہادت میں مسند ابویعلی، عبد بن حمید، بیہقی، ابوالشیخ اور ابن جریر وغیرہ رحمہم اللہ سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث نقل کی گئی ہے۔ [معارف، مظهري وغيره]

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۚ اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ﴾ اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو، اور اس کی نافرمانی سے بچو، بیشک قیامت کا زلزلہ (بھونچال) بڑی بھاری سخت چیز ہے جس سے پورے جہاں میں تہلکہ اور کہرام مچ جائے گا، اور یہ عجیب وغریب منظم ومحکم نظام تہہ وبالا ہو کر تباہ ہو جائے گا۔ معنی زلزلہ کے شدید اور ہولناک حرکت کے ہیں۔

﴿يَوْمَ تَرَوْنَهَا تَذْهَلُ كُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ﴾ جس روز تم اس شدید زلزلہ کو دیکھو گے تو اس روز یہ حال ہوگا کہ ہول ودہشت کے مارے ہر دودھ پلانے والی مہربان ماں اپنے لخت جگر (پیارے بچے) سے یکسر غافل ہو جائے گی، جس کو وہ دودھ پلا رہی ہے اور شدت ہول کی وجہ سے:

﴿وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا﴾ ہر حمل والی عورت حمل کی مدت پوری ہونے سے پہلے ہی اپنے حمل کو ڈال دے گی، خوف کی وجہ سے حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا۔

﴿وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى﴾ اور دیکھے گا تو عام لوگوں کو حواس باختہ نشہ میں مست و بے خود۔

﴿وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ﴾ حالانکہ حقیقت میں وہ نشہ والے نہ ہوں گے، لیکن اللہ تعالیٰ کا عذاب سخت ہے، اس کی ہول اور دہشت کی وجہ سے لوگ مست اور مدہوش نظر آئیں گے۔ آپ نے دنیا کے جزوی اور معمولی زلزلوں کو دیکھا ہوگا جہاں تنگدل انسان ہوش وحواس کھو بیٹھتے ہیں، جبکہ قیامت کا زلزلہ پورے عالم کے نظام کو اپنے لپیٹ میں لے کر تباہی مچائے گا۔ مفسرین حضرات کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ عظیم تباہ کن زلزلہ کب اور کس وقت ہوگا؟ اس عظیم زلزلہ کے بارے میں مختلف اقوال ہیں، جو یہ ہیں:

قول اول:

یہ زلزلہ دنیا میں ہوگا (قیامت سے پہلے) یہ زلزلہ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے، آخر زمانہ میں قیامت کے قریب اس کا ظہور ہوگا، اور اس کے بعد آفتاب مغرب سے طلوع کرے گا، یعنی قیامت قائم ہونے سے پہلے

زمین زلزلہ سے ہلائی جائے گی، جیسے ارشاد ہے: ﴿اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝﴾ [الزلزال] (جب زمین اپنے بھونچال سے جھنجھوڑ دی جائے گی۔ اور زمین اپنے بوجھ باہر نکال دیگی)۔

اور اسی طرح: ﴿وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ۝ فَيَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۝﴾ [الحاقة] (اور زمین اور پہاڑوں کو اٹھا کر ایک ہی ضرب میں ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا۔ تو اس دن وہ واقعہ پیش آجائے گا جسے پیش آنا ہے)۔

اور فرمایا: ﴿اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۝ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۝ فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا ۝﴾ [الواقعة] (جب زمین ایک بھونچال سے جھنجھوڑ دی جائے گی۔ اور پہاڑوں کو پیس کر چورا کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ وہ بکھرا ہوا غبار بن کر رہ جائیں گے)۔ اور اس قول کے قائلین کی دلیل یہ ہے کہ قیامت کے دن نہ کوئی مرضعہ ہوگی، اور نہ کوئی حاملہ ہوگی (حقیقۃ)۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ دنیا سے متعلق ہے، اور یہ زلزلہ دنیا کی آخری عمر میں قیامت سے پہلے ہوگا (جسے شیخ ابن عربیؒ نے فزع اکبر کہا تھا)۔ اور یہاں زلزلة کی اضافت جو الساعة یعنی قیامت کی طرف ہوئی، یہ قرب کی وجہ سے، جسے أشراط الساعة کہتے ہیں۔

قول دوم:

یہ زلزلہ قیامت کے دن نفخہ اولیٰ کے ساتھ ہوگا، جس دن صور پھونکا جائے گا، اس دن زمین کانپ اٹھے گی، لرز کر اور جیسے کشتی دریا کی موجوں میں ہلنے لگتی ہے اس طرح زمین ارتعاش کے ساتھ کانپنے لگے گی، جیسے ارشاد ہے: ﴿يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ۝ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ ۝﴾ [النازعات] (کہ جس دن بھونچال ہلا ڈال دے گا، پھر اس کے بعد ایک اور جھٹکا آئے گا)۔

قول سوم:

یہ زلزلہ اس وقت ہوگا جب لوگ نفخہ ثانیہ کے بعد اپنی قبروں سے اٹھ کر میدانِ حشر کی طرف روانہ ہوں گے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو اختیار کیا ہے، اور اس بارے میں چند احادیث ذکر کی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زلزلہ قیام قیامت اور قبروں سے اٹھنے کے بعد ہوگا۔

حضرت امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت قرآنی میں اس زلزلہ کے وقت کی کوئی تصریح نہیں، نظمِ قرآنی میں سب باتوں کی گنجائش ہے، ان اقوال میں کوئی تعارض نہیں۔ [کبیر]

قول چہارم:

یہ ہے کہ آیت میں زلزلہ سے روزِ قیامت کے سخت اہوال اور دہشتناک احوال مراد ہیں، جن کو باعتبار شدت وہولناکی کے زلزلہ سے تعبیر کیا گیا ہے، جیسے ارشاد ہے: ﴿مَسَّتۡهُمُ الۡبَاۡسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلۡزِلُوۡا﴾ [البقرة: ۲۱۴] ()۔ اسی طرح: ﴿هُنَالِكَ ابۡتُلِىَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ وَزُلۡزِلُوۡا زِلۡزَالًا شَدِيۡدًا﴾ [الأحزاب:۱۱] (اس موقع پر ایمان ولوں کی بڑی آزمائش ہوئی، اور انہی ایک سخت بھونچال میں ڈال کر ہلا ڈالا گیا)۔ اور حدیث میں ہے: اَللّٰهُمَّ اهۡزِمۡهُمۡ وَزَلۡزِلۡهُمۡ۔ [بخاري، قرطبي]

تو ظاہر ہے کہ ان نصوص میں زلزلہ سے مراد شدت اور گھبراہٹ کے ساتھ خوف مراد ہے، نہ کہ زمین کی حرکت واضطراب۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آیت کریمہ میں قیامِ قیامت سے پہلے دنیا میں زمین کا زلزلہ مراد ہو جیسا کہ قولِ اول کا مطلب تھا، تو آیت اپنے حقیقی معنی پر محمول ہوگی کہ جس وقت یہ زلزلہ آئے گا تو اس وقت حقیقۃً ایسا ہوگا کہ مرضعہ اپنی اولاد سے غافل ہو جائے گی، اور حاملہ کا حمل ساقط ہو جائے گا، کیونکہ ایسی عورتیں بکثرت موجود ہوں گی۔

اور اگر زلزلہ سے مراد عین قیامِ قیامت کا زلزلہ ہو، یا نفخہ ثانیہ کے وقت کا زلزہ ہو جیسا کہ قولِ دوم وسوم کا مطلب ہے پس یہ معنی مجازی پر اور فرضی تمثیل پر محمول ہوگا کہ فرض کرو، اگر حاملہ اور مرضعہ عورت اس وقت موجود ہوں تو بچوں کو بھول جائیں گی، اور حمل ساقط ہو جائیں گے، اس پر دلیل اور قرینہ سورۃ المزمل کی آیت ہے: ﴿فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ اِنۡ كَفَرۡتُمۡ يَوۡمًا يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ شِيۡبًا﴾ [المزمل:۱۷] (اگر تم بھی نہ مانے تو پھر اس دن سے کیسے بچو گے جو بچوں کو بوڑھا بنا دے گا؟) یہاں بالاتفاق معنی مجازی ہی مراد ہے، جس سے مقصد سختی قیامت کی تصویر مراد ہے، نہ کہ معنی حقیقی کہ بچے بوڑھے ہوں۔ واللہ اعلم

وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّيَتَّبِعُ كُلَّ شَيۡطٰنٍ مَّرِيۡدٍ ﴿۳﴾
كُتِبَ عَلَيۡهِ اَنَّهٗ مَنۡ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ يُضِلُّهٗ وَيَهۡدِيۡهِ اِلٰى عَذَابِ السَّعِيۡرِ ﴿۴﴾

ترجمہ: اور بعض لوگ ایسے ہیں جو بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، اور ہر سرکش شیطان کا اتباع کرتے ہیں ③ جس کے بارے میں یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ جو بھی کوئی شخص اس سے دوستی کرے گا تو وہ اسے گمراہ کر دے گا، اور اسے دہکتی ہوئی آگ کے راستہ پر ڈال دے گا ④

معارف ومنازل

آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ مشرکین مکہ میں سے ایک شخص نے سرور عالم ﷺ سے کہا کہ ہمیں بتاؤ کہ آپ کا رب سونے کا ہے، یا چاندی کا، یا پیتل کا، یا تانبے کا؟ اس پر آسمان سے ایک گرج پیدا ہوئی، اور اس شخص کی کھوپڑی گر کر سامنے آگئی۔ اور حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے نقل ہے کہ ایک یہودی نے اس طرح کا سوال کیا جس پر آسمان سے بجلی آئی اور اسے ہلاک کر دیا۔ [ابن کثیر رحمہ اللہ]

اس قسم کے سوال کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے بارے میں سرکشی وعناد کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں، اور سرکش شیطان کے کہنے اور اتباع کی بنیاد پر اس طرح کی باتیں کرتے ہیں، اور حق تعالیٰ سبحانہ کو اپنے تانبے سونے چاندی کے بتوں پر قیاس کر کے سوالات کرتے ہیں، ایسے لوگ گمراہ اور جہنمی ہیں، سرکش شیطان کا اتباع کر کے ان سے دوستی کرتے ہیں، جن لوگوں نے شیطان سے دوستی کی تو شیطان نے انہیں گمراہ کر کے جہنم کا راستہ بتا دیا، اور جس جہنم میں شیطان نے جانا ہے اسی میں ان کو بھی ڈال کر۔ المرأ مع من أحب کے بموجب انہیں دوزخ میں اپنا رفیق بنا دیا۔

۞ ۞ ۞

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ
ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ
نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْۤا اَشُدَّكُمْ ۚ وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰۤى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا
يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا ؕ وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَ
اَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۞ ٥ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ ٦ وَّ
اَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ ۞ ٧

ترجمہ: اے لوگو! اگر تم اٹھائے جانے کی طرف سے شک میں ہو، تو بلاشبہ ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر خون کے لوتھڑے سے، پھر بوٹی بنی ہوئی صورت سے، اور جو صورت ابھی نہ بنی ہو اس سے تمہیں پیدا کیا تاکہ ہم تمہیں بتائیں، اور ہم اپنی مشیت کے موافق مقررہ مدت تک رحموں میں ٹھہراتے ہیں، پھر تمہیں اس حال

میں نکالتے ہیں کہ تم بچے کی صورت میں ہوتے ہو، تا کہ تم اپنی قوتوں کو پہنچ جاؤ، اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو اٹھا لئے جاتے ہیں، اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو نکمی عمر کو پہنچ جاتے ہیں، تا کہ علم کے بعد کچھ بھی نہ جانیں، اور اے مخاطب! تو زمین کو بھی سوکھی پڑی ہوئی دیکھتا ہے، پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں تو وہ لہلہانے لگتی ہے، اور وہ بڑھ جاتی ہے، اور ہر طرح کے خوشنما جوڑے اگا دیتی ہے۞ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ حق ہے، اور وہ مردوں کو زندہ فرماتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۞ اور یہ کہ قیامت آنے والی ہے، اس میں کوئی شک نہیں، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کو اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۞

معارف ومنازل

جو لوگ قیامت کا اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا انکار کرتے تھے ایسے لوگ اب بھی بکثرت موجود ہیں، دنیا کی نصف آبادی والے یہی کہتے ہیں کہ جب دنیا میں بہت سے مذاہب کے لوگ بستے ہیں کوئی بھی مذہب ایسا نہیں ہے جو خالق کائنات کا منکر ہو۔ ماضی بعید میں دہریہ مذہب والوں اور بہت سے فلاسفروں کا کہنا تھا کہ العیاذ باللہ خدا کا کوئی تصور نہیں، ماضی قریب میں رشیا والے بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، مولائے کائنات نے ان کے سرخ انقلاب کو کالے انقلاب میں تبدیل کر کے ان کے سپر پاور ملک کو توڑ کر ان کا عقیدہ بھی توڑ دیا، لہٰذا عقیدہ رکھنے والے اب دنیا میں بڑی قلت میں ہیں۔

نصف آبادی کہنا شاید ایک حد تک درست ہو، منکرین قیامت یہ کہتے ہیں کہ ہم مر کر فنا ہوں گے، جسم ریزہ ریزہ ہوگا تو دوبارہ زندہ ہونا، جسموں میں جان پڑنا پہلے کی طرح آدمی بن کر کھڑا ہونا سمجھ سے بالاتر ہے، اور نہایت مشکل ہے۔ قرآن کریم نے منکرین قیامت کے انہیں شکوک وشبہات کو بکثرت نقل فرما کر پوری وضاحت اور عقلی ونقلی دلائل سے ان کی تردید فرمائی ہے، چنانچہ انہیں خطاب فرما کر سمجھایا کہ اے لوگو! اگر تمہیں موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے میں شک ہے، تو تمہارا شک بے معنی اور غلط ہے، تم دوبارہ اٹھائے جانے کو پہلی پیدائش پر قیاس کر لو، اور دیکھو کہ پہلے تمہارا وجود ہی نہیں تھا، اول تو ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، یعنی تمہارے باپ آدم علیہ السلام کا مٹی سے مجسمہ بنایا، پھر اس مجسمہ میں روح پھونک دی، اس کے بعد آدم علیہ السلام کی اولاد کی پیدائش میں ہم نے ایک ترتیب قائم کی، اور اسی ترتیب سے بنی آدم کی نسلیں چل رہی ہیں کہ آسمان سے پانی برسا کر مردہ زمین کو زندہ کیا، جس سے طرح طرح

کے سامان اور غذائی اشیاء پیدا کیں، جنہیں کھا کر انسانوں میں مادۂ تولید پیدا فرمایا، جس سے ہم نے یہ طور وطریقہ وضع کیا کہ اول مرد کا نطفہ عورت کے رحم میں جاتا ہے، چالیس روز کے عرصے میں یہ نطفہ جمے ہوئے خون کا ایک جما ہوا لوتھڑا بن جاتا ہے (یعنی علقہ)، پھر اسی میں وہ ایک (مضغہ) بوٹی بن جاتا ہے، وہ اس لائق ہو جاتا ہے کہ اسے چبایا جاسکے (یہ مضغہ کا ترجمہ ہے)۔

اور اس بوٹی کی دو حالتیں ہوتی ہیں: پہلے وہ گوشت کا ٹکڑا ہوتا ہے، اس میں کوئی عضو بنا ہوا نہیں ہوتا، اسی کو غیر مخلقہ سے تعبیر فرمایا، پھر اس میں اعضاء بن جاتے ہیں، اور انسانی شکل وصورت کی ترکیب بن جاتی ہے، اس کو مخلقہ سے تعبیر فرمایا، اور اعضاء بننے کے ساتھ ہی پیدائش نہیں ہوتی بلکہ رحم میں پرورش ہوتی رہتی ہے، اور جسم بڑھتا رہتا ہے، رحم میں رہنے کی بھی مدت مقرر ہے، اللہ تعالیٰ جس کو جتنے دن چاہتا ہے رحم میں رکھتا ہے، ارشاد ہے:

﴿وَنُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (اور ہم (تمہیں) ماؤں کے پیٹ میں جب تک چاہتے ہیں ایک متعین مدت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں)۔

دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿٢٠﴾ فَجَعَلْنٰهُ فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿٢١﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿٢٢﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿٢٣﴾﴾ [المرسلات] (کیا ہم نے تمہیں ایک حقیر پانی سے پیدا نہیں کیا؟ پھر ہم نے اسے ایک مضبوط قرار کی جگہ میں رکھا۔ مقررہ وقت تک۔ پھر ہم نے توازن پیدا کیا، چنانچہ اچھا توازن پیدا کرنے والے ہم ہیں)۔

پس رحم میں مقررہ مدت پورا کرنے کے بعد ہم تمہیں زندہ بچہ کی صورت میں اپنی تکوینی قدرت سے باہر نکال دیتے ہیں، رحم سے باہر آنے کے بعد آگے مزید احوال سے گزرنا ہوتا ہے، بچپن کا زمانہ گزرتا ہے، حتیٰ کہ جوانی آجاتی ہے، پھر شوخی اور جوانی کی قوت اور ادراک وپختگی کا مرحلہ اٹھارہ سال کی عمر سے شروع ہو کر تیس تک چلتا ہے، پھر اشد کا زمانہ یعنی مکمل قوت عقل وسوچ کا زمانہ چالیس سال تک رہتا ہے، اس کے بعد شیخوخت یعنی بڑھاپا کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ سورۂ غافر میں فرمایا: ﴿ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا﴾ [غافر: ٦٧] (تا کہ تم بوڑھے ہو جاتے ہو)۔

باپ کے نطفے سے لے کر بوڑھے ہونے تک ان کے احوال سے تدریجاً گزرتے ہیں، جن کو علماء عربیت نے یوں بیان کیا ہے:

جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہے تو اس کا نام جنین ہے، جب پیدا ہو تو ولید ہے، پھر سات دن تک

صدیغ ہے، پھر دو سال تک رضیع ہے، پھر فطیم ہے، تین سال پر حجوش ہے، پھر چھ سال پر دارج ہے، جب وہ پانچ بالشت کے قد پر ہو تو خماسي ہے، سات سال پر جب اس کے دانت گرتے ہیں تو مثغور ہے، نو سال پر وہ مشغور ہے، دس سے بارہ سال تک مترعرع ہے، تیرہ چودہ سال پر مراهق ہے، پندرہ سال پر بالغ اور حزور ہے، یہاں تک وہ غلام کہلائے گا، جسے ہماری اصطلاح میں جوان لڑکا کہتے ہیں۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں فتی اور شارخ ہے، اٹھارہ سال سے تیس سال تک شاب اور مجتمع ہے، تیس سے چالیس تک شاب اور شدید ہے، چالیس سال پر کھل ہے، پچاس پر شیخ ہے، ساٹھ کے بعد هرم ہے۔

یہ ہے زبان عربی کی جامعیت جسے اللہ تعالیٰ نے جنتیوں کی زبان بنایا، اور اپنی کتاب حکیم کو اسی زبان میں اتارا، اور کائنات کے سردار بلکہ دونوں جہانوں کے قائد و پیشوا خاتم الانبیاء محمد مصطفے ﷺ کو بھی عرب میں مبعوث فرمایا، پھر سارے جہانوں کی قیادت انہیں سپرد فرمائی، اور ہمیں ان کی امت مرحومہ میں شامل فرما کر بڑے اعزاز و اکرام اور عظیم شرافت سے نوازا۔ الحمد للہ

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِنَ الْبَعْثِ﴾ اے لوگو! اگر تمہیں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے میں کوئی تردد ہے کہ جب ہمارے اجسام مٹی میں گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے، پھر دوبارہ کیسے ہم زندہ ہو کر اٹھیں گے؟ فرمایا: اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو اپنی پہلی پیدائش پر غور کرو، تم کہاں سے کہاں پہنچے ہو، اور کن کن مراحل سے گزر کر یہاں تک آئے ہو۔

﴿فَإِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُطْفَةٍ﴾ ہم نے تمہیں مٹی جیسی حقیر چیز سے پیدا کیا، تمہارے باپ آدم علیہ السلام کو براہ راست ہم نے مٹی سے پیدا کیا، پھر تمہیں (اس کی نسل کو) بالواسطہ مٹی سے پیدا کیا، یعنی حقیر نطفہ سے جو کہ زمین کی پیداوار کا نتیجہ وثمرہ ہے۔

﴿ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُضْغَةٍ﴾ پھر خون کے لوتھڑے سے، اس کے بعد خون کا لوتھڑا گوشت کا ٹکڑا بن گیا۔ ﴿مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ﴾ ان دونوں الفاظ کا ایک مطلب بیان ہو چکا، دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر مضغہ پر بحکم الٰہی شکل وصورت انسانی کا نقش بن گیا تو وہ مخلقہ ہو کر مدت حمل کے بعد پیدا ہوگا، اور اگر بحکم الٰہی اس پر نقش نہیں بنا تو قبل از وقت ضائع ہو جائے گا۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ مخلّقہ سے وہ بچہ جو تندرست اور سلامت و بے عیب مراد ہے، اور غیر مخلّقہ وہ ہزاروں بچے ہیں جو صحیح سالم نہیں، عیب دار اور ناقص الخلقت ہیں، جن کے بے شمار اقسام

ومراتب ہیں۔

﴿لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ یہ ساری باتیں اور تفصیلات تمہیں اس لئے بتادیں تاکہ تم غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچو کہ جو واحد لاشریک ابتداء میں ان مختلف مدارج ومراحل پر ہمیں پیدا فرمایا وہ بآسانی ہمیں دوبارہ زندہ کر کے اپنے حضور پیش کرنے پر قادر ہے۔

﴿وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ پھر ماؤں کے رحموں میں ہم جو چاہتے ہیں ایک مقررہ مدت تک نشوونما وغیرہ کے لئے ٹھہراتے ہیں، کبھی چھ ماہ، کبھی نو یا دس ماہ، کبھی دو یا چار سال تک۔ البتہ نو ماہ عام طور پر متعین ہے۔ ﴿ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا﴾ پھر بچپن کی حالت میں تمہیں نکالتے ہیں، جس کے بعد کئی مراحل سے گزار کر:

﴿ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ﴾ تاکہ تم طاقت اور جوانی کی عمر کو پہنچ جاؤ۔ ہاں! اس دوران یہ بھی ہوسکتا ہے:

﴿وَمِنكُم مَّن يُتَوَفَّىٰ﴾ تم میں سے بعض فوت ہوجاتے ہیں۔ ﴿وَمِنكُم مَّن يُرَدُّ إِلَىٰ أَرْذَلِ الْعُمُرِ﴾ اور تم میں سے بعض کو نکمی عمر، یعنی انتہائی بڑھاپے کی عمر تک لوٹا دیا جاتا ہے۔

﴿لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِن بَعْدِ عِلْمٍ شَيْئًا﴾ تاکہ علم اور جاننے کے بعد بھی وہ کچھ نہ جانے، دوبارہ بچپن کی نادانی کا شکار ہو کر نہ کچھ سمجھے، اور نہ جانے۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمر سے پناہ مانگی ہے: اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ اَرْذَلِ الْعُمُرِ۔ اے اللہ تعالیٰ! میں رذیل عمر سے تیری پناہ پکڑتا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: جو شخص قرآن مجید پڑھتا ہو، یعنی حامل قرآن ہو اس کی یہ حالت نہیں ہوتی، یہ قرآن کی برکت ہے۔

﴿وَتَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً﴾ اور تو دیکھتا ہے زمین کو بجھی ہوئی بنجر غیر آباد۔ هَامِدَةً مردہ، خشک۔

﴿فَإِذَا أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ﴾ پھر جب ہم اس پر پانی اتارتے ہیں، باران رحمت برستی ہے تو وہ مردہ زمین زندہ ہو کر حرکت کرتی ہے، اور ابھرتی ہے، اس میں نشوونما کی قوت آجاتی ہے۔

﴿وَأَنبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ﴾ اور وہ ہر قسم کی بارونق چیز اگاتی ہے، کیونکہ پانی میں اللہ تعالیٰ نے حیات کا مادہ رکھا ہے، جس طرح منی کے حقیر قطرہ سے خوبصورت اور حسن وجمال والے انسان پیدا ہوئے، اسی طرح بارش کے پانی سے مردہ زمین زندہ ہو کر طرح طرح کے لہلہاتے پھول، ہر قسم کی ترکاریاں اور خوبصورت سبزیاں وغیرہ پیدا ہوئیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ شانہ انسانوں کو ان کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کردے گا۔

﴿ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ یہ اس لئے کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کا ہے، اور وہ حق ہے جس کا کوئی شریک

نہیں۔ ﴿وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَاَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ اور وہی مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، جس طرح وہ مردہ زمین کو اور فنا شدہ سبزہ پھول ترکاریوں کو دوبارہ زندہ کرتا ہے، اسی طرح وہ تمہیں زندہ کر کے حساب کے لئے اپنے پاس حاضر کر لے گا۔ فرمایا:

﴿وَاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا﴾ قیامت بہر حال برپا ہونے والی ہے، جس میں کوئی شک وشبہ نہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کا مظاہرہ ہو، نیکیوں پر جزا اور برائیوں پر سزا کا ترتب ہو، مظلوموں کی دادرسی ہو، کیونکہ اگر قانون جزا وسزا کا نہ ہو تو مؤمن وکافر اور فرمانبردار ومجرم یکساں مساوی ہو جائیں گے، اور عدل کا تصور ختم ہو جائے گا، اور یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ﴿اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۝٣٥ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۝٣٦﴾ [القلم] (کیا ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح قرار دیں گے؟ تمہیں کیا ہوا؟ تم کیسے فیصلہ کرتے ہو؟)۔

﴿وَاَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ﴾ اور یہ واقعی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ قبر والوں کو دوبارہ زندہ کر کے حساب وکتاب کے لئے اٹھائے گا۔

❀ ❀ ❀

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ ۝٨ ثَانِيَ
عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝٩ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝١٠

ترجمہ: اور بعض لوگ ایسے ہیں جو بغیر علم کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کسی ایسی کتاب کے جو روشنی دکھانے والی ہو اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں ۝٨ یہ ایسا شخص ہے جو گردن کو موڑ کر چلا جاتا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کے راستے سے ہٹا کر لوگوں کو گمراہ کرے، اس کے لئے دنیا میں ذلت ہے، اور ہم اسے قیامت کے دن جلنے کا عذاب چکھائیں گے ۝٩ یہ اس کی وجہ سے ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجا، اور بلاشبہ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ۝١٠

معارف ومنازل

تفسیر روح المعانی وغیرہ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ یہ آیت ابوجہل بن ہشام کے بارے

میں اتری۔ بعض حضرات نے کہا کہ نضر بن حارث کے بارے میں اتری۔ سبب نزول جو بھی ہو آیت کا عموم ہر متکبر منکرِ توحید کو شامل ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ﴾ اور لوگوں میں بعض کفار و مشرک وہ ہیں جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی توحید وصفات کے بارے میں، نہ تو ان کے پاس علمی، عقلی ونقلی کوئی دلیل ہے، نہ ہدایت کی بات، نہ روشن کتاب، ان کا جھگڑا صرف انکارِ حق اور جہالت واتباعِ شیطان پر مبنی ہے، اور جب انہیں اتباعِ حق قبول کرنے کا کہا جائے تو:

﴿ثَانِيَ عِطْفِهٖ﴾ تو اپنا منہ موڑ کر اعراض کرتے ہیں، تکبر کے ساتھ رخ بدل دیتے ہیں، جہاں وہ خود گمراہ ہیں وہاں دوسروں کے ایمان میں رکاوٹ بنتے ہیں، اور لوگوں کو قبولِ حق سے روکتے ہیں۔

﴿لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّنُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ کہ اس کے لئے دنیا میں رسوائی ہے، ذلّت وخواری کے ساتھ اور قیامت کے دن ہم اسے جلاڈالنے والا عذاب چکھائیں گے، اور اسے کہیں گے:

﴿ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ﴾ یہ وہ چیز ہے جو تیرے ہاتھوں نے آگے بھیجی ہے، دنیا میں جس گمراہی کو تم نے کمایا اور پھر اس پر فخر وناز کر کے حق کے ساتھ ٹکرایا، آج کا یہ عذاب تمہارے شرک وغرور کا پھل ہے، اسے خوب چکھو، اور یاد رکھو: ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ بندوں پر تو کبھی ظلم نہیں کرتا، اور بلا وجہ کسی کو عذاب بھی نہیں دیتا، یہ تیرے اعمال کا خمیازہ ہے، خوب چکھو بھگتو۔ ابو جہل اور نضر بن حارث ذلیل ہو کر جنگ بدر میں دونوں مارے گئے، پھر قلیب میں انہیں گرا کر ابدی جہنم کے ایندھن بنے، اب قیامت تک ان کے نقش قدم پر چلنے والے دوسرے سارے ابوجہلوں کا یہی حال ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ ۚ فَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرُ ۨ اطْمَاَنَّ بِهٖ ۚ وَاِنْ اَصَابَتْهُ
فِتْنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهٖ ۚ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۱﴾
يَدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ ﴿۱۲﴾ يَدْعُوْا
لَمَنْ ضَرُّهٗۤ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ ؕ لَبِئْسَ الْمَوْلٰى وَلَبِئْسَ الْعَشِيْرُ ﴿۱۳﴾

ترجمہ: اور بعض لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرتے ہیں جیسے کوئی شخص کنارہ پر ہو، پھر اگر اس کو کوئی بھلائی پہنچ گئی تو اس کی وجہ سے مطمئن ہوگیا، اور اگر کچھ آزمائش آگئی تو اپنے چہرے کے بل پلٹ گیا، وہ دنیا اور آخرت کے اعتبار سے تباہ ہوگیا، یہ کھلی ہوئی تباہی ہے ⑪ یہ شخص اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کی عبادت کرتا ہے، جو اسے نہ ضرر دے اور نہ نفع دے، یہ دور والی گمراہی ہے ⑫ اور اسے پکارتا ہے جس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے، واقعی وہ برا دوست ہے، اور برا رفیق (ساتھی) ہے ⑬

معارف ومنازل

پہلے خالص مشرکوں کا تذکرہ رہا، اب مفاد پرست منافقین کا بیان ہورہا ہے، جنہیں اپنا ذاتی مفاد ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، اور ان کا ایک قدم اسلام میں ہے دوسرا باہر کفر وگمراہی میں۔ صاحب تفسیر روح المعانی نے بحوالہ تفسیر ابن مردویہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ ایک یہودی نے اسلام قبول کرلیا، اس کے بعد اس کی بینائی جاتی رہی، اور مال بھی چلا گیا، نیز اولاد بھی ختم ہوگئی، اس نے اسے اسلام کی نحوست سمجھا، وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر کہنے لگا کہ میری بیعت توڑ دیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا: بیعت اسلام نہیں توڑی جاتی، وہ کہنے لگا کہ اس دین میں مجھے خیر نہیں ملی، میں اندھا ہوگیا، میرا مال بھی گیا، اور اولاد بھی مرگئی۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اے یہودی! لوگوں کو اسلام (بطور امتحان) پگھلا دیتا ہے، جیسا کہ لوہے اور سونے اور چاندی کو آگ پگھلا کر کھوٹ اور میل دور کردیتی ہے۔ اس پر آیت بالا نازل ہوئی۔

اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ منافقین کے بارے میں آیت کریمہ کا نزول ہوا، ہم کہتے ہیں سبب نزول جو کچھ بھی ہو آیت کریمہ کا مضمون عام ہے، جو لوگ (منافقین جیسے) اسلام کو ظاہری طور پر دنیا کے منافع مالی اور اپنے تحفظ کے لئے قبول کرلیتے ہیں، اور جن منافع کی امید تھی وہ منافع حاصل نہیں ہوتے، تو اسلام سے پھر جاتے ہیں، یہ لوگ حقیقت میں اسلام اور احکامِ اسلام پر ایمان نہیں رکھتے، اور حق کے طالب بھی نہیں ہوتے، یہی لوگ ہی تو خود غرض منافقین ہوتے ہیں، جن کا ایک ظاہری قدم دائرۂ اسلام میں ہوتا ہے، اور دوسرا باطنی قدم اور خیالات دائرۂ کفر میں ہوتا ہے، یہ لوگ تذبذب اور تردد کا شکار رہتے ہیں، ایسے لوگوں کی دنیا وآخرت دونوں تباہ ہوتی ہیں، فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ﴾ اور لوگوں میں سے بعض ایسے ہیں جو خیمۂ اسلام میں پورا

پورا داخل نہیں ہیں، بلکہ ایک کنارے پر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اُن کا ایک قدم اسلام میں دوسرا قدم کفر میں۔ ﴿ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً﴾ [البقرة:٢٠٨] (اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ) کے مصداق نہیں ہیں، تذبذب وتردد کی حالت میں بددلی کے ساتھ اپنے مفادات کے پیش نظر اسلام کے مدعی ہیں۔

﴿فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ﴾ اگر اسے کوئی بھلائی مال وغیرہ حاصل ہو، یا اس کی بیوی لڑکا جنم لے اور گائے اونٹ مادہ بچہ پیدا کرے تو بڑا ہی خوش ہوگا، اور کہے گا: اسلام اچھا دین ہے۔

﴿وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةٌ انْقَلَبَ عَلَىٰ وَجْهِهِ﴾ اور اگر اس پر کوئی آزمائش آجائے یعنی مال غنیمت دستیاب نہ ہو، یا بیوی نے لڑکی جنم لی، مال مویشی ہلاک ہو گئے، بیماری میں مبتلا ہوا، تو کہنے لگا: یہ اسلام اچھا دین نہیں ہے، ہم نے کوئی فائدہ اور منافع نہیں حاصل کئے، وغیرہ۔ [بخاري]

ایسے وقت میں یہ لوگ شکستہ دل ہو کر اسلام سے پھر جاتے ہیں، اپنے چہرے کے بل پلٹ جاتے ہیں، واپس کفر میں داخل ہو کر مرتد ہو جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوگا:

﴿خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ﴾ کہ وہ دنیا میں بھی نقصان اٹھانے والے ہیں، اور آخرت میں بھی، یہی تو کھلا نقصان ہے جس میں یہ لوگ مبتلا ہیں۔

﴿يَدْعُو مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَضُرُّهُ وَمَا لَا يَنْفَعُهُ﴾ اللہ تعالیٰ کے سوا وہ ایسی ہستیوں کو پکارتا ہے جو نہ تو اسے نقصان پہنچا سکتی ہیں، اور نہ نفع دے سکتی ہیں۔ اُلوہیت تو دور کی بات ہے ان کے یہ باطل معبود اپنے نفع ونقصان کے مالک نہیں، وہ ایک مکھی تک بنا نہیں سکتے، اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے اسے پکڑ کر اپنی چیز واپس نہیں کر سکتے۔

﴿ذَٰلِكَ هُوَ الضَّلَالُ الْبَعِيدُ﴾ یہ تو دور کی گمراہی میں پڑنے والا معاملہ ہے، اور یہ لوگ حق وصداقت سے نہایت دور ہیں، فرمایا: ﴿يَدْعُو لَمَنْ ضَرُّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ﴾ یہ لوگ ایسے بے جان معبودوں کو پکارتے ہیں کہ جن کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ قریب ہے، نفع کی بات تو محض ان کا گمان ہے، جس کا کوئی وجود ہی نہیں، البتہ نقصان یقینی اور لازمی ہے کہ ایسے لوگوں کا ابدی ٹھکانہ جہنم ہوگا، جس میں ابد الآباد عذاب کے شکنجے میں محبوس رہیں گے۔

﴿لَبِئْسَ الْمَوْلَىٰ وَلَبِئْسَ الْعَشِيرُ﴾ یہ بہت ہی برا دوست اور برا ساتھی ہے، روز قیامت یہ عابد ومعبود

ایک دوسرے سے بیزار ہوں گے، اور ایک دوسرے پر لعنت کریں گے، ان کے سارے تعلقات کٹ جائیں گے، ایک دوسرے کے دشمن بنیں گے، اور سب جہنم میں گریں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۱۴﴾ مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ كَيْدُهٗ مَا يَغِيْظُ ﴿۱۵﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ ﴿۱۶﴾

ترجمہ: بلا شبہ جو لوگ ایمان لائے، اور نیک عمل کئے، اللہ تعالیٰ انہیں ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، بلا شبہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے﴿۱۴﴾ جو شخص یہ خیال کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں اور آخرت میں اپنے رسول کی مدد نہیں کرے گا تو اسے چاہئے کہ آسمان تک ایک رسی تان لے، پھر کاٹ دے، پھر دیکھ لے آیا اس کی تدبیر اس کے غیظ کی چیز کو ختم کر سکتی ہے؟﴿۱۵﴾ اور ہم نے اسی طرح کھلی ہوئی آیات نازل کیں، اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے﴿۱۶﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ شانہ نے ان معاندین اور دشمنانِ اسلام کا تذکرہ فرمایا جو دین اسلام کے کاٹ میں اور سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی دشمنی میں لگے رہتے تھے، اور یوں سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ دعوت چند دن کی ہے، یہ جو وحی کا دعویٰ کرتے ہیں یہ وحی بھی عنقریب ختم ہو جائے گی، خود ایک فرد واحد ہے چند غرباء مفلوک الحال اس کے دین قبول کر چکے ہیں، بہت جلد یہ منتشر ہو جائیں گے، یہ سلسلہ آگے نہیں بڑھے گا، لہٰذا کسی کو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔ اور وہ یہ بھی بڑے زور شور سے کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ (العیاذ باللہ) اس کو چھوڑ دے گا، اور اس کی مدد نہیں کرے گا۔

آیات کریمہ میں ان تمام باتوں کا ترکی بہ ترکی جوابات ہیں۔ رب العزت سبحانہ وتعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہ فرمائے گا، اور یہ گمان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا کام رک جائے گا، اور وحی آنا بھی بند ہو جائے گا، یہ ایک افتراء ہے، اور دشمنان اسلام کی جھوٹی آرزو ہے،

جس کی کوئی بنیاد نہیں، محض تو ہم وحماقت ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ پختہ اعلان کیا ہوا ہے: ﴿اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ﴾ [غافر:٥١] (یقیناً ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان لانے والوں کی دنیوی زندگی میں بھی مدد کرتے ہیں، اور اس دن بھی کریں گے جب گواہی دینے والے کھڑے ہوں گے)۔

روزِ اول سے لے کر آج تک، اور آج سے لے کر قیامِ قیامت تک اہل حق کے لئے خوشخبری ہے کہ ہر محاذ پر ان کی نصرت ہوتی رہے گی، اور اللہ تعالیٰ کی معیت وقرب ان کو حاصل رہے گا، اور اللہ تعالیٰ ان کا مولیٰ وحامی اور ناصر رہے گا۔ مطلب یہ ہے کہ معاندین ومخالفین کی مخالفت اور عناد سے نہ وحی کا سلسلہ بند ہوگا، اور نہ نصرتِ الٰہی میں کمی آئے گی، اور نہ اسلام کمزور ہوگا، اور نہ مسلمان بددل ومنتشر ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ کی تائید ونصرت سے پورے عالم میں اسلام پھیل جائے گا، اور چاردانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہوگا، اور تمہارا کفر قصۂ پارینہ بن کر پورے جزیرۂ عرب سے ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔

شیخ الاسلام علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ:

﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ فَلْيَمْدُدْ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ﴾ لَّنْ يَّنْصُرَهُ میں ضمیر مفعول نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف راجع ہے، جن کا تصور قرآن پڑھنے والے کے ذہن میں گویا ہمہ وقت موجود رہتا ہے، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی قرآن کے اولین مخاطب ہیں، گویا مؤمنین کے انجام ذکر کرنے کے بعد یہ ان کے پیغمبر کے مستقبل کا بیان ہوا۔ حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے دنیوی اور اخروی فتح ونصرت کے جو وعدے کر چکا ہے، وہ ضرور پورے ہو کر رہیں گے، خواہ کفار وحاسدین کتنا ہی غیظ کھائیں، اور نصرت ربانی کے روکنے کی کیسی ہی تدبیریں کرلیں، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وکامیابی کسی طرح رک نہیں سکتی۔

یقیناً آکر رہے گی، اگر ان کفار وحاسدین کو اس پر زیادہ غصہ ہے، اور سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کوشش سے خدا کی مشیت کو روک سکیں گے تو اپنی انتہائی کوشش صرف کرکے دیکھ لیں، حتیٰ کہ ایک رسی اوپر چھت میں لٹکا کر گلے میں ڈال لیں، اور خود پھانسی لے کر غیظ سے مرجائیں، جس طرح سورۂ آل عمران میں فرمایا: ﴿قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ﴾ [آل عمران:١١٩] (آپ فرمادیجئے: اے کافرو! تم اپنے غیظ وجلن میں مرجاؤ) تباہ وبرباد ہوجاؤ، ہوسکتا ہو تو آسمان میں رسی تان کر اوپر چڑھ جاؤ، اور وہاں سے آسمانی امداد کو منقطع کرآؤ، پھر دیکھو کہ ان تدبیروں سے اس کا آنا بند ہوجاتا ہے یا نہیں جس پر انہیں اس قدر غصہ اور پیچ وتاب ہے۔ اکثر مفسرین نے آیت کی تفسیر اسی طرح کی ہے۔ [تفسير عثماني]

خلاصہ یہ ہے کہ وحی کی وجہ سے جس کسی کو غیظ وغضب ہے اپنے غیظ اور دل کی جلن کی کوئی تدبیر کر سکتا ہے تو کر لے، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت اور ارادہ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت ومدد کے مقابلہ میں کوئی کچھ نہیں کر سکتا، دشمن جلتے رہیں گے، وحی آتی رہے گی، نصرت الٰہی جاری رہے گی، دین روز بروز بڑھتا رہے گا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـِٕيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا ۖ اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ⑰ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ ⑱

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے، اور جو لوگ یہودی ہیں، اور جو فرقہ صائبین ہے، اور نصاریٰ ہیں، اور جو مجوس ہیں، اور وہ لوگ جنہوں نے شرک کیا، یہ یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کے درمیان فیصلہ فرمادے گا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے⑰ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں، اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چوپائے اور بہت سے انسان اللہ تعالیٰ کے لئے سجدہ کرتے ہیں، اور بہت سے لوگ ایسے ہیں جن پر عذاب کا استحقاق ہو چکا ہے، اور اللہ تعالیٰ جسے ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، بلاشبہ اللہ تعالیٰ کرتا ہے جو چاہتا ہے⑱

معارف ومنازل

دنیا میں سارے انسان دو قسم کے ہیں: مومن اور غیر مؤمن۔ پھر غیر مؤمن جو کہ اہل باطل کہلاتے ہیں اپنے عقائد اور نظریات کے اعتبار سے بہت ہی زیادہ ہیں، آیت کریمہ بالا میں ان میں سے صرف پانچ سرغنوں کا بیان ہے۔ پس مسلمانوں کے علاوہ جتنی دوسری باطل جماعتیں ہیں وہ آپس میں اپنے عقائد اور اعمال کے اعتبار سے مختلف ہیں، لیکن چونکہ کفر ایک ہی ملت ہے اس لئے ایک فریق اہل ایمان کا اور دوسرا فریق مجموعی حیثیت سے تمام کافروں کا ہے، یہ سارے کفار گو آپس میں مختلف ہیں لیکن کافر ہونے میں سب شریک ہیں، یہ آپس میں ٹکراتے بھی نہیں، ان کا ٹکراؤ اور اختلاف صرف اسلام کے ساتھ ہے، اس لئے مؤمنین اور کافرین کو آئندہ آیات میں: ﴿هٰذٰنِ خَصْمٰنِ﴾

[الحج:١٩] (یہ دوفریق ہیں) دوگروہ بتادیئے جواہل ایمان ہیں وہ تو ہیں ہی دین حق پر، فرمایا: ﴿اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ [آل عمران:١٩] (دین برحق اللہ تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے)۔

لیکن جو دوسری جماعتیں ہیں وہ بھی اپنے بارے میں یہ گمان رکھتی ہیں کہ قیامت کے دن اپنے اس دین کی وجہ سے جو ہم نے اختیار کررکھا ہے بخش دیئے جائیں گے، یعنی اپنے منگھڑت دین کو وہ برحق سمجھتے ہیں، اور نجات کی امید رکھتے ہیں، حالانکہ واقع میں ایسا نہیں ہے، کیونکہ دین الٰہی صرف ایک ہی اسلام ہے، اسی کے متعلق فرمایا:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ﴾ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سب کے درمیان فیصلہ فرمادے گا کہ اہل ایمان کا ٹھکانا جنت ہوگا، اور سارے اہل کفر جہنم کا ایندھن بنیں گے، وہاں خیر البریۃ اور شر البریۃ کا فیصلہ ہوگا، قرآن حکیم نے اس طرح کا فیصلہ بہت سے مقامات پر ذکر فرمایا تاکہ مؤمن خوش ہوں اور کفار اپنے آئندہ انجام پر سوچنے کے فکرمند ہوں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ﴾ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری طرح واقف ہے، ہر ایماندار کے ایمان کو اور ہر کافر کے کفر کو وہ خوب اچھی طرح جانتا ہے، اسی بنیاد پر وہ عالم الغیب والشہادۃ قیامت کے دن تمام جزاء وسزا کا فیصلہ فرمائے گا۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ﴾ اے مخاطب! کیا تجھے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات جو آسمانوں میں ہیں، اور جو زمین میں ہیں، اور چاند سورج ستارے پہاڑ درخت اور چوپائے سب اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں؟ (اور نہایت فرمانبردار حکم ماننے والے ہیں)۔ سورۂ رحمٰن میں فرمایا: ﴿وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ﴾ [الرحمن:٦] (جھاڑ اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں)۔ ہر ایک مخلوق کا سجدہ اس کی اپنی حالت میں اور کیفیت کے اعتبار سے ہے۔

اور بعض حضرات نے يَسْجُدُ کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرتی ہیں، اور فرمانبردار ہیں۔ جو حضرات آسمانوں میں ہیں اور جو مخلوق زمین میں ہے سبھی اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں، اور اس کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ البتہ روئے زمین پر جو انسان ہیں ان میں سے بہت سے لوگ مسلم ہیں فرمانبردار ہیں، اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں، اور بہت سے لوگ (اکثریت) غیر مسلم ہیں نافرماں ہیں، سجدے سے منکر ہیں، کافر ومشرک بت پرست وکواکب پرست ہیں، ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب کا حتمی فیصلہ ہو چکا

ہے۔

﴿وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ﴾ اور اللہ تعالیٰ جسے ذلیل کردے تو کوئی اسے عزّت دینے والا نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عزّت وذلت اللہ تعالیٰ کے اختیار اور اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ﴿قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ [ال عمران: ٢٦] (کہو کہ: اے اللہ! اے اقتدار کے مالک! تو جس کو چاہتا ہے اقتدار بخشتا ہے، اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین لیتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے عزّت بخشتا ہے، اور جس کو چاہتا ہے رسوا کردیتا ہے، تمام تر بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے، یقیناً تو ہر چیز پر قادر ہے)۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان واعمالِ صالحہ اور تقویٰ کو عزّت وحرمت کا معیار قرار دیا ہے، اور کفر ومعاصی، فسق اور فجور، ذلت ورسوائی کے اسباب مقرر ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ایماندار مؤمن بھی اگر معاصی کا ارتکاب کرے گا تو وہ بھی دنیا وآخرت میں ذلیل ہوگا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

فائدہ:

مخلوقات علویات ہوں یا سفلیات، پھر ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول، حیوانات، جمادات، نباتات خواہ کسی بھی قسم کی ہوں سوائے انسان وجنات کے، سب اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور مسخر وتابع سجدہ کرنے والے ہیں، مجال نہیں کہ کوئی مخلوق خدائی تسخیر کو توڑ کر نافرمانی پر اتر آئے، اس لئے آیت کریمہ نے ان کو صرف ایک قسم بتایا۔

بخلاف انسانوں کے کہ انہیں دو حصوں پر تقسیم فرمایا: ایک مؤمن سجدہ کرنے والا مستحق رحمت، اور دوم کافر سجدہ سے انکار کرنے والا مستحق عذاب۔ آیت کریمہ میں سجدہ اور فرمانبرداری سے مراد صرف تکوینی وتقدیری اطاعت نہیں، بلکہ اختیاری اور ارادی اطاعت ہے، اس میں یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اختیاری اور ارادی اطاعت تو صرف ذوی العقول انسان اور جنات میں ہوسکتی ہے، حیوانات، نباتات اور جمادات میں عقل وشعور ہی نہیں، تو پھر قصد وارادہ کہاں اور اختیاری اطاعت کیسی؟

کیونکہ قرآن کریم کی بے شمار نصوص اور تصریحات سے یہ بات ثابت ہے کہ عقل وشعور اور قصد وارادہ سے کوئی بھی مخلوق خالی نہیں۔ ہاں! کمی بیشی کا فرق ضرور ہے، انسان اور جنات کو عقل وشعور کامل عطا کیا گیا ہے، انسان کے بعد سب سے زیادہ عقل وشعور حیوانات میں ہے، پھر دوسرے نمبر نباتات، اور تیسرے نمبر جمادات ہیں۔ ح

یوانات کا عقل وشعور تو عام طور پر محسوس کیا جاتا ہے (کیڑے مکوڑوں تک)، نباتات کا عقل وشعور بھی ذرا سا تحقیق و غور کرنے والا پہچان لیتا ہے۔ لیکن جمادات کا عقل وشعور اتنا کم اور مخفی ہے کہ عام انسان اس کو نہیں پہچان سکتے، مگر ان کے خالق ومالک نے خبر دی ہے کہ وہ بھی عقل وشعور اور قصد وارادے کے مالک ہیں۔

قرآن کریم نے آسمان وزمین کے بارے میں فرمایا ہے: ﴿قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ﴾ [فصلت:١١] (دونوں نے کہا کہ ہم فرمانبردار ہو کر آئے ہیں)۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے جب آسمان وزمین کو حکم دیا کہ تم کو ہمارے فرماں کا تابع رہنا ہے تو اپنی خوشی سے فرمانبرداری اختیار کرو، ورنہ جبراً وحکماً تابع رہنا ہی ہے، تو آسمان وزمین نے عرض کیا کہ ہم اپنے ارادے اور خوشی سے اطاعت وفرمانبرداری قبول کرتے ہیں۔

اور سورۂ احزاب میں فرمایا: ﴿اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ [الأحزاب:٧٢] (ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی، تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا، اور اس سے ڈر گئے)۔ اسی طرح پتھروں کے متعلق ارشاد ہے: ﴿وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ﴾ [البقرة:٧٤] (بیشک پتھروں میں سے کچھ وہ ہوتے جو اللہ کے خوف سے لڑھک جاتے ہیں)۔

اسی طرح احادیث کثیرہ میں پہاڑوں کی آپس میں گفتگو، اور دوسری مخلوقات میں عقل وشعور کی بکثرت شہادتیں ملتی ہیں۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن جب سورج چھپ گیا تو سرور عالم ﷺ نے مجھ سے سوال فرمایا کہ جانتے ہو یہ سورج کہاں جاتا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول (ﷺ) ہی زیادہ جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ چلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ عرش کے نیچے سجدہ کرتا ہے، پھر طلوع ہونے کی اجازت مانگتا ہے، اسے اجازت دے دی جاتی ہے۔ اور وہ وقت قریب ہے کہ وہ سجدہ کرے گا اس کا سجدہ قبول نہ ہوگا، اور طلوع کی اجازت طلب کرے گا، تو اسے اجازت نہ دی جائے گی، اور اس سے کہا جائے گا کہ جہاں سے تو آیا ہے وہیں واپس چلا جا، لہٰذا وہ مغرب کی طرف سے طلوع کرے گا۔ یہ فرما کر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا﴾ [یس:٣٨] (اور سورج اپنے ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے)۔ اس کا مستقر، یعنی ٹھہرنے کی جگہ عرش کے نیچے ہے۔ [بخاري]

جس طرح سورج سجدہ کرتا ہے اسی طرح تمام مخلوقات سجدہ کرتی ہیں۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند☆ با من و تو مردہ باحق زندہ اند

اس لئے اس آیت میں جس اطاعت وفرمانبرداری کو سجدہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، اس سے اطاعت اختیاری وارادی مراد ہے، اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ نوع انسان کے علاوہ (اس ضمن میں جنات بھی داخل ہیں کہ وہ بھی انسان کی طرح ہیں) باقی تمام مخلوقات اپنے قصد واختیار سے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تابع وفرمانبردار اور سجدہ ریز ہیں، صرف انسان اور جن ایسے ہیں جن میں دو حصے ہو گئے: ایک مطیع وفرمانبردار سجدہ گزار مؤمن، دوسرے کافر و نافرماں اور سجدے سے منحرف ومنکر، جن کو اللہ تعالیٰ شانہ ذلیل وخوار کر دیا ہے کہ ان کو سجدے کی توفیق نہیں بخشی، جس کی وجہ سے وہ مردود ومطرود اور ابدی دوزخی ہوئے۔

هٰذٰنِ خَصْمٰنِ اخْتَصَمُوْا فِيْ رَبِّهِمْ ؗ فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ ؕ يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ ﴿١٩﴾ يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ ﴿٢٠﴾ وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ ﴿٢١﴾ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا ۗ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿٢٢﴾

ترجمہ: یہ دو فریق ہیں جنہوں نے اپنے ربّ کے بارے میں جھگڑا کیا، سو جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ان کے لئے آگ کے کپڑے قطع کئے جائیں گے، ان کے سروں پر گرم پانی ڈالا جائے گا ﴿١٩﴾ جس کی وجہ سے وہ سب گل جائے گا جو ان کے پیٹوں میں ہوگا، اور کھالیں بھی گل جائیں گی ﴿٢٠﴾ ان کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے ﴿٢١﴾ جب بھی غم و گھٹن کی وجہ سے دوزخ سے نکلنے کا ارادہ کریں گے اس میں وہ واپس کر دیئے جائیں گے، اور ان سے کہا جائے گا کہ جلنے کا عذاب چکھ لو ﴿٢٢﴾

معارف ومنازل

سابقہ آیات سے واضح ہوا کہ دنیا میں انسانوں کے دو گروہ ہیں: ایک مؤمن دوسرا کافر۔ اگر ایک باپ کے دو بیٹے ہوں: ایک مومن دوسرا کافر، تو سمجھو کہ ایک باپ کی اولاد دو حصوں میں تقسیم ہوگئی، اور ان کے درمیان جھگڑا اور اختلاف کی بنیاد پر جنگ چھڑ گئی، یہ جنگ کسی قومیت علاقائیت لسانیت اور جائیداد کی بنیاد پر نہیں لڑی جاتی، بلکہ خالص مذہب ودین اور للّٰہیت کی بنیاد پر لڑی جاتی ہے۔ فریق اول (مؤمن) کے لئے اس میں بہت بڑا اعزاز ومرتبہ ہے،

قرآن کریم نے دوسرے مقام پر فرمایا: ﴿اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ ۚ وَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُقَاتِلُوۡنَ فِیۡ سَبِیۡلِ الطَّاغُوۡتِ﴾ [النساء: ۷۶] (جنہوں ے ایمان لایا ہے وہ اللہ کے راستے میں لڑتے ہیں، اور جنہوں نے کفر کیا ہے وہ شیطان کے راستے میں لڑتے ہیں)۔ مؤمنین تو اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتے ہیں، اور مشرکین و کفار شیطان کے لئے لڑتے ہیں۔

مؤمن چونکہ اللہ تعالیٰ کے لئے لڑتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت تمام جہاں کی محبتوں پر غالب ہے، اس لئے کبھی ایسا بھی دیکھا گیا کہ مسلمان بھائی نے اپنے سگے کافر بھائی کا سر قلم کیا، بلکہ مزید برآں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر میں اپنے باپ جراح کو جو کافروں کی فوج میں شامل تھا تلوار سے قتل کیا، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو بلا کر ملامت کی کہ تو نے اپنے باپ کو کیوں قتل کیا؟ وہ کہنے لگے: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی اور آپ کی محبت باپ کے رشتے پر غالب رہی، اور نسب کا رشتہ مغلوب ہو گیا۔

آیت کریمہ ﴿هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّهِمۡ﴾ اہل مکہ اپنے قافلے کی مدد کے لئے جب بدر کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے یہ دعا کی تھی کہ اے اللہ تعالیٰ! ہم دونوں جماعتوں میں سے جو حق پر ہو اس کو فتح نصیب فرما، اللہ تعالیٰ نے ان کے جرار مسلح لشکر کے مقابلہ میں بے سروسامان نہتے مسلمانوں کو فتح دی، اور کافر مغلوب ہوئے، ان کے ستر کے قریب سردار اور نامور لوگ جہنم رسید ہو گئے۔ غزوۂ بدر کے شروع میں مبارزہ یعنی زور آزمائی اور پہلوانی کا یہ واقعہ پیش آیا کہ قریش مکہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جو تین انصاری حضرات میدان مبارزہ میں آگے بڑھے تو قریشی پہلوانوں نے کہا کہ ہم تم سے مقابلہ نہیں چاہتے، ہم تو اپنے چچازاد بھائیوں سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، اس پر مسلمانوں کی طرف سے حضرت علی، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہم میدان میں نکلے۔

اور مشرکین مکہ کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ اور ولید بن عتبہ سامنے آئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے شیبہ کو، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ولید بن عتبہ کو قتل کر دیا۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا عتبہ سے مقابلہ ہوا، اور ہر ایک دوسرے کی تلوار سے نیم جان ہو گیا۔ پھر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عتبہ پر حملہ کر کے اسے جہنم رسید کیا، اور حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کو زخمی حالت میں اٹھا کر لے آئے، ان کی ٹانگ کٹ چکی تھی، جب غزوہ کے بعد مدینہ منورہ واپس ہو رہے تھے تو مقام صفراء میں حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی، اور وہاں ان کی تدفین ہوئی۔ رضی اللہ عنہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آیت هٰذٰنِ خَصۡمٰنِ ہماری ان دونوں جماعتوں کے بارے میں

نازل ہوئی۔ [بخاري]

سبب نزول خواہ کوئی بھی ہو آیت کے عموم میں قیامت تک آنے والے سب شامل ہیں کہ اہل ایمان واہل کفر کے معرکے قیامت تک جاری رہیں گے (معرکہ حق و باطل)، پھر فرمایا:

﴿فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا قُطِّعَتْ لَهُمْ ثِيَابٌ مِّنْ نَّارٍ﴾ کہ کفار کے لئے آگ کے کپڑے کاٹے جائیں گے، یہ کپڑے ایسے خام مال سے تیار شدہ ہوں گے جو فوراً آگ پکڑ لے گا، یا انہیں آگ کے کپڑے پہنائیں گے۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿سَرَابِيْلُهُمْ مِّنْ قَطِرَانٍ﴾ [ابراهيم:٥٠] (ان کے کپڑے گندھک اور تارکول کے ہوں گے) جو اشاروں کے ساتھ آگ پکڑیں گے۔ حدیث میں نوحہ کرنے والے مرد وزن کے بارے میں ہے کہ ان کے کپڑے قطران کے ہوں گے۔

﴿يُصَبُّ مِنْ فَوْقِ رُءُوْسِهِمُ الْحَمِيْمُ﴾ ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی بہایا جائے گا، اور اگر وہ بامر مجبوری اس کا ایک گھونٹ پی لیں گے، تو: ﴿يُصْهَرُ بِهٖ مَا فِيْ بُطُوْنِهِمْ وَالْجُلُوْدُ﴾ تو جو کچھ ان کے پیٹ میں ہے اسے پگھلا کر باہر پھینک دے گا، اور ان کی کھالوں کو بھی جلا ڈالے گا۔ سورۂ نساء میں ہے: ﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا﴾ [النساء:٥٦] (جب ایک کھال جل جائے گی تو اس کی جگہ دوسری پہنا دی جائے گی) اس طرح کفار کی کھالیں ہمیشہ جلتی رہیں گی اور بنتی رہیں گی۔

﴿وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ﴾ اور ان کے مارنے کے لئے لوہے کے ہتھوڑے ہوں گے۔ بعض احادیث میں آتا ہے کہ اس ہتھوڑے کی ضرب اتنی شدید ہوگی کہ ساری کائنات بھی مل کر ایک ضرب کو قطعاً برداشت نہ کر سکے۔

﴿كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا﴾ جب بھی کفار ومشرکین اس دوزخ کے غم و پریشانی کی وجہ سے نکلنے کی کوشش کریں گے تو وہ اسی میں واپس لوٹا دیئے جائیں گے، ہتھوڑے مار مار کر انہیں دوزخ میں دھکیل دیا جائے گا۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے: ﴿وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ﴾ [البقرة:١٦٧] (اور وہ آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے)، پھر ان سے کہا جائے گا:

﴿وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ﴾ اب جلانے والے عذاب کا مزہ چکھو، تم دنیا میں اگر وحی الٰہی کے مزے چکھنے والے ہوتے آج تمہارا یہ حال نہ ہوتا، تم دنیا میں توحید الٰہی پر مذاق کرتے رہے، مسلمانوں پر ہنستے رہے، اپنے شرک وکفر پر اکڑ کے ساتھ جمے رہے، آج تمہارے عقیدے اور اعمال کا یہی بدلہ ہے، اسے چکھو اور اس سے نمٹو۔

إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ وَلُؤْلُؤًا ۖ وَلِبَاسُهُمْ فِيهَا
حَرِيرٌ ﴿٢٣﴾ وَهُدُوا إِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ وَهُدُوا إِلَىٰ صِرَاطِ الْحَمِيدِ ﴿٢٤﴾

ترجمہ: بلاشبہ جولوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے انہیں اللہ تعالیٰ ایسے باغوں میں داخل فرمائے گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، انہیں اس میں ایسے کنگنوں کا زیور پہنایا جائے گا جو سونے اور موتیوں کے ہوں گے، اور اس میں ان کا لباس ریشم کا ہوگا﴿۲۳﴾ اور ان کو کلمہ طیبہ کی ہدایت دی گئی، اور ان کو اس ذات کے راستے کی ہدایت دی گئی جو لائق حمد ہے﴿۲۴﴾

معارف ومنازل

گزشتہ آیات میں جہنم اور جہنمیوں کے لباس کا بیان ہوا، اب یہاں سے جنت اور جنتیوں کی خوشحالی اور لباس کا بیان ہورہا ہے، فرمایا:

﴿إِنَّ اللَّهَ يُدْخِلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ﴾ اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور نیک اعمال کئے ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، یعنی وہ لوگ جو زیور ایمان اور زیور اعمالِ صالحہ سے آراستہ ہیں وہ لوگ اپنے ایمان واعمال کی بدولت قرب ورضائے الٰہی کا استحقاق پاکر جنتوں میں داخل ہوں گے، اور ہمیشہ راحت پائیں گے، کیونکہ انہوں نے دنیا میں باطنی طہارت اور باطنی حسن وجمال جو کہ اعمالِ صالحہ کے ذریعہ حاصل ہوا تھا کو اپنا کر جنت کی زیب وزینت حاصل کرلی۔

﴿يُحَلَّوْنَ فِيهَا مِنْ أَسَاوِرَ مِن ذَهَبٍ﴾ وہاں پر ان کو سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے۔

﴿وَلُؤْلُؤًا﴾ اور انہیں وہاں موتیوں کے کنگن اور ہار پہنائے جائیں گے۔ سورۃ الدہر میں چاندی کے کنگن کا تذکرہ ہے، فرمایا: ﴿وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ﴾ [الدھر: ۲۱] (اوران کو چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے)۔ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جنت میں مؤمنوں کو تین قسم کے کنگن پہنائے جائیں گے: ایک کنگن سونے کا، ایک کنگن موتیوں کا، اور ایک کنگن چاندی کا۔

یہاں یہ شبہ ہوتا ہے کہ کنگن ہاتھوں میں پہننا عورتوں کا کام ہے، اور انہی کا زیور ہے، مردوں کے لئے

معیوب سمجھا جاتا ہے۔ پہلا جواب یہ ہے کہ جنت اور جنتی لباس کو دنیاوی لباس اور عرف پر قیاس نہیں کیا جاتا، اور جنت میں مردوں کے لئے کنگن معیوب نہ ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا کے بادشاہوں کی یہ امتیازی اور قابلِ فخر شان رہی ہے کہ سر پر تاج اور ہاتھوں میں قیمتی کنگن پہنتے تھے، اسی کو تو بہانہ بنا کر فرعون مصر نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کہا تھا کہ اگر وہ واقعی خدا کا رسول ہوتا تو اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن ہوتے، اور فرشتوں کی جماعت بھی: ﴿فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ﴾ [الزخرف:۵۳] (بھلا اس پر سونے کے کنگن کیوں نہیں ڈالے گئے؟ یا پھر اس کے ساتھ فرشتے پر باندھے ہوئے کیوں نہ آئے؟)۔

چونکہ فرعون خود جواہرات کا کنگن پہنتا تھا، اور جس امیر وزیر پر مہربان ہوتا اس کو سونے کا کنگن پہناتا تھا، اور اس کے سامنے فوج پرا باندھ کر کھڑی ہو جاتی تھی، تو کہتا تھا کہ ہم کسی کو عزت دیکر کنگن پہناتے ہیں، تو کیا خدا کسی کو اپنا نائب ورسول بنا کر بھیجے تو اس کے ہاتھ میں سونے کے کنگن اور جلو میں فرشتوں کی فوج نہ ہو۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ آج کے ہمارے عرف میں گھڑی پہننے کا عام رواج ہے جو کہ معیوب نہیں، بلکہ مقبول اور محمود ہے، اسی طرح جنتی کنگن بھی وہاں کے ماحول کے مطابق مستحسن اور پسندیدہ ہوگا، ورنہ قرآن حکیم مدح کے طور پر اسے بیان نہ کرتا۔

فائدہ:

سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے موقع پر سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ سے وعدہ فرمایا تھا کہ کسریٰ شاہ فارس کے کنگن مال غنیمت کے ساتھ مسلمانوں کے پاس آئیں گے، تو وہ تمہارے ہاتھوں میں ڈالیں گے، چنانچہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وعدہ کا ایفاء کر کے فتح مدائن کے بعد شاہ فارس کے کنگن سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہ کو پہنائے جو کہ خالص قیمتی جواہرات سے بنے ہوئے تھے، اور بہت بڑا سرمایہ تھے۔

مردوں کے لئے سونے اور ریشم کی دنیا میں حرمت:

آیت مذکورہ میں جنتی لباس اور سونے کے کنگن کا جو بیان ہے وہ آخرت اور جنت کے متعلق ہے، یہ دونوں چیزیں دنیا میں مردوں کے لئے حرام ہیں۔ امام نسائی، بزار اور بیہقی رحمۃ اللہ علیہم نے جید سند کے ساتھ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت نقل کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہل جنت کا ریشمی لباس جنت کے پھلوں سے نکلے گا (جنت کے درختوں سے پیدا ہوگا)۔ اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں ہے کہ جنت میں ایک درخت ایسا ہوگا

جس سے ریشم پیدا ہوگا، اہل جنت کا لباس اس سے تیار ہوگا۔ [مظهري]

امام نسائی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص ریشمی کپڑا دنیا میں پہنے گا وہ آخرت میں نہ پہنے گا، اور جو شخص دنیا میں شراب پیئے گا وہ آخرت کی شراب سے محروم رہے گا، اور جو شخص دنیا میں سونے چاندی کے برتنوں میں کھائے پیئے گا وہ آخرت میں سونے چاندی کے برتنوں میں نہ کھائے گا، سرور دارین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ تینوں چیزیں اہل جنت کے لئے مخصوص ہیں۔ [قرطبي]

مراد یہ ہے کہ مؤمن پر یہ لازم ہے کہ دنیا کو اپنی آخری منزل سمجھ کر سب کچھ یہاں کر نہ گزرے، بلکہ دنیا کو راہ گزر سمجھ کر یہاں اعمالِ صالحہ اور تقویٰ کے ساتھ اعتدال پر عمل کرے، اور اپنے اعمال کے پھل اور ثواب کا آنے والے جہاں میں تمنا رکھے ہر وہ چیز جو باعث بے حیائی ہو جیسے شراب یا جس میں غرور و تکبر اور بد اعتدالی ہو جیسے سونے اور ریشم ایسی چیزوں سے دور رہے۔ نیز امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ مرفوع حدیث بھی نقل کی ہے کہ جس شخص نے دنیا میں ریشم پہنا وہ آخرت میں نہ پہنے گا، اگرچہ وہ جنت میں داخل بھی ہو جائے، دوسرے اہل جنت ریشم کے لباس پہنیں گے یہ نہیں پہن سکے گا۔ [قرطبي بروایة طيالیسي، معارف]

یہاں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ جب ایک شخص جنت میں داخل کر لیا گیا، پھر وہ اگر کسی چیز سے محروم کیا گیا تو اس کو حسرت و افسوس رہے گا، اور جنت اس کی جگہ نہیں، وہاں کسی شخص کو کسی بھی طرح کا نہ غم ہوگا نہ افسوس۔ اور اگر جنتی ماحول کے اعتبار سے جنتی شخص کو افسوس و غم نہ ہوا تو پھر اس محرومی کا کوئی فائدہ تو نہ ہوا، اس کا علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اچھا جواب دیا ہے کہ اہل جنت کے جس طرح مقامات اور درجات مختلف اور متفاوت اعلیٰ وادنیٰ ہوں گے ان کے تفاوت کا احساس بھی سب کو ہوگا، مگر اس کے ساتھ ہی حق تعالیٰ شانہ اہل جنت کے قلوب ایسے بنا دے گا کہ نچلے والوں کو اوپر والوں پر کوئی حسد بھی نہ ہوگا، اور حسرت و افسوس بھی کسی چیز پر نہیں ہوگا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

﴿وَهُدُوٓا اِلَى الطَّيِّبِ مِنَ الْقَوْلِ ۖ وَهُدُوٓا اِلٰى صِرَاطِ الْحَمِيْدِ﴾ اور جنت میں یہ نعمتیں اس لئے ملیں گی کہ دنیا میں ان کو کلمہ طیبہ پر ایمان کی ہدایت ہو گئی تھی، اور اس ذات پاک کے راستے پر چلنے کی توفیق مل گئی تھی جو مستحق حمد ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ قول طیب سے مراد لا إله إلا الله و الحمد لله کی شہادت ہے۔ حضرت سدی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ اس سے مراد قرآن کریم ہے۔ صحیح یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس میں داخل ہیں، یعنی پاکیزہ اقوال اور اعمال۔

فائدہ:

آیت بالا میں جنتیوں کا زیور بیان کرتے ہوئے، صرف کنگنوں کا ذکر فرمایا ہے، حدیث شریف میں تاج پہنائے جانے کا بھی ذکر ہے، وہ تاج اس طرح کے ہوں گے کہ جن کے ادنیٰ موتی کی چمک مشرق سے مغرب تک پوری فضا کو روشن کردے، خاص کر وہ تاج جو حاملین قرآن کے سروں پر ہوگا، اسی طرح ان کے والدین کے سروں پر۔ [مشكوٰة عن أبي سعيد الخدري]

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ الَّذِي جَعَلْنَاهُ لِلنَّاسِ سَوَاءً الْعَاكِفُ فِيهِ وَالْبَادِ ۚ وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٢٥﴾

ترجمہ: بلاشبہ جو لوگ کافر ہوئے، اور اللہ تعالیٰ کے راستہ سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں، جسے ہم نے سب لوگوں کے لئے مقرر کیا ہے، اس میں رہنے والا اور باہر سے آنے والا سب برابر ہیں، اور جو کوئی شخص اس میں ظلم کے ساتھ کوئی بے دینی کا کام کرنے کا ارادہ کرے گا تو ہم اسے دردناک عذاب چکھادیں گے ﴿٢٥﴾

معارف ومنازل

پچھلی آیات ﴿هَٰذَانِ خَصْمَانِ﴾ میں مؤمن اور کفار کی دائمی اور ابدی خصومت کا بیان ہوا، اسی مخاصمت کی ایک خاص صورت کا اس آیت میں بیان ہے کہ اکثر کفار خود کفر پر جمے رہنے کے ساتھ ساتھ دوسرں کو اللہ تعالیٰ کے راستہ پر چلنے سے بھی روکتے ہیں، ایسے ہی لوگوں نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جو مدینہ منورہ سے خاص عمرہ کے لئے احرام باندھ کر چلے تھے مکہ مکرمہ سے نو دس میل دور حدیبیہ کے مقام پر روک دیا، حالانکہ مسجد حرام اور حرم شریف کا وہ حصہ جس سے لوگوں کی عبادت حج وعمرہ کا تعلق ہے وہ ان کی ملکیت میں نہیں تھا کہ جس کی بناء پر ان کو مداخلت کا کوئی حق پہنچتا، بلکہ حرم شریف سارے لوگوں کے لئے یکساں برابر ہے، وہ وہاں کے مقیم لوگوں اور تمام باہر کے لوگوں اور پوری دنیا سے آنے والوں کے لئے مساوی ہے، جس پر کسی کی ملکیت واستحقاق نہیں ہے۔ پھر ارشاد ہے:

﴿وَمَن يُرِدْ فِيهِ بِإِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ﴾ جو شخص مسجد حرام (پورے حرم شریف)

میں کوئی بے دینی کا کام کرے گا، جیسے لوگوں کوحرم میں داخل ہونے سے روکنا، یا اور کوئی خلاف دین کام کرنا، ظلم و زیادتی کا ارتکاب کرنا، لوگوں کو تنگ کرنا، لوگوں کو پریشان کرنا، وغیرہ تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو دردناک عذاب چکھائے گا، خصوصاً جبکہ اس بے دینی کے کاموں میں شرک وظلم بھی شامل ہو اور ملا ہوا ہو، جیسا کہ مشرکین مکہ کا حال تھا۔

مشرکین مکہ نے ہجرت سے پہلے یہ طریقہ اپنایا تھا کہ باہر سے آنے والے قبائل کے لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے، انہوں نے چاروں طرف مکہ شریف کے راستوں پر اپنے آدمی بٹھائے تھے، باہر سے آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر سمجھاتے تھے کہ شہر مکہ میں ایک جادوگر ہے، خبردار! اس کے پاس نہ جانا، ورنہ وہ تمہارا دین تبدیل کرلے گا۔

اگر باہر سے آنے والا آدمی کسی قوم کا نامور سردار ہوتا اسے بہت رشوت دے کر آنحضرت ﷺ تک پہنچنے سے روک دیتے۔ یمن سے ایک بہت بڑا نامور شاعر آنحضرت ﷺ سے ملنے کے لئے آیا، قریش نے اس کو ایک سو اونٹ دے کر واپس کیا، اور آپ ﷺ سے ملنے نہ دیا، اسی کو ﴿وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ﴾ سے تعبیر کیا۔

اَلْمَسْجِدُ الْحَرَامُ مسجد حرام کا ذکر قرآن حکیم میں پندرہ مقامات پر ہے:

(۱) ﴿فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۱۴۴] (پس اپنا رخ مسجد حرام کی طرف کرلو)۔

(۲) ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۱۴۹] (اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا منہ مسجد حرام کی رف کرو)۔

(۳) ﴿وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۱۵۰] (اور تم جہاں سے بھی نکلو اپنا منہ مسجد حرام کی رف کرو)۔

(۴) ﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ﴾ [البقرة: ۱۹۱] (اور تم ان سے مسجد حرام کے پاس اس وقت تک لڑائی نہ کرو جب تک وہ خود اس میں تم سے لڑائی شروع نہ کریں)۔

(۵) ﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۱۹۶] (یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کے گھر والے مسجد حرام کے پاس نہ رہتے ہوں)۔

(۶) ﴿وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [البقرة: ۲۱۷] (لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اس کے خلاف کفر کی روش اختیار کرنا، مسجد حرام پر بندش لگانا)۔

(۷) ﴿وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [المائدة: ۲] (اور کسی

قوم کے ساتھ تمہاری یہ دشمنی کہ انہوں نے تمہیں مسجد حرام سے روکا تھا تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم زیادتی کرنے لگو)۔

(۸) ﴿وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [الأنفال: ۳۴] (اور بھلا ان میں کیا خوبی ہے کہ اللہ ان کو عذاب نہ دے، جبکہ وہ لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں)۔

(۹) ﴿اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [التوبة: ۷] (سوائے وہ لوگ جن تم نے مسجد حرام کے قریب معاہدہ کیا ہے)۔

(۱۰) ﴿اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ......﴾ [التوبة: ۱۹] (کیا تم لوگوں نے حاجیوں کو پانی پلانے اور مسجد حرام کے آباد رکھنے کو......)۔

(۱۱) ﴿فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾ [التوبة: ۲۸] (اس سال کے بعد وہ مسجد حرام کے قریب بھی نہ آنے پائیں)۔

(۱۲) ﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [الإسراء: ۱] (پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی)۔

(۱۳) ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [الحج: ۲۵] (بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر اپنا لیا ہے، اور جو دوسرں کو اللہ کے راستے سے اور مسجد حرام سے روکتے ہیں)۔

(۱۴) ﴿هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ [الفتح: ۲۵] (یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے، اور تمہیں مسجد حرام سے روک دیا ہے)۔

(۱۵) ﴿لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللهُ اٰمِنِيْنَ﴾ [الفتح: ۲۷] (تم لوگ ان شاء اللہ ضرور مسجد حرام میں امن وامان کے ساتھ داخل ہوں گے)۔

مفسرین حضرات فرماتے ہیں کہ ان پندرہ مقامات پر مسجد حرام سے کبھی وہ خاص مسجد کا حصہ مراد ہوتا ہے، جو خانہ کعبہ کے گرد ہے، یعنی وہ چاردیواری جو خانہ کعبہ پر محیط ہے، اور بعض مرتبہ مسجد حرام سے مراد پورا شہر مکہ اور حدود حرم مراد ہوتا ہے۔ یہ حدود حرم مدینہ منورہ کی طرف سے ساڑھے تین میل ہے، باقی جہات میں زیادہ اور بعض جگہ دس میل سے بھی زیادہ ہے۔ یہ تمام خطہ قابل احترام ہے، اس میں جہاں نیکیوں کا ثواب بہت زیادہ ہے، اسی طرح یہاں کے

گناہ بھی کئی مرتبہ دوسرے مقامات کے گناہوں سے زیادہ ہے، یہاں شکار ممنوع، درخت اور گھاس کاٹنا بھی منع ہے۔

قرب قیامت کی علامات میں سے ایک بہت بڑی تباہ کن نشانی یہی ہے کہ لوگ ان مقدس مقامات کے احترام سے محروم ہوجائیں گے، جو حج وعمرہ محض رضائے الٰہی کے لئے ہوتے تھے، اور مکہ مکرمہ کے رہنے والے لوگ باہر سے آنے والوں کے لئے ہر قسم کی خدمات بجالاتے تھے، اور انہیں نہایت عزّت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اسی طرح باہر سے آنے والے نہایت ادب واحترام اور عشق ومحبت کے جذبات سے سرشار ہو کر آتے تھے، تو ایک خوبصورت اجتماع کی شکل بن جاتی، اور ہر طرح کے اعمال وحسنات کا دور دورہ ہو جاتا تھا۔

بدقسمتی سے آج پورے سال مسلسل لاکھوں کا اجتماع ہوتا رہتا ہے، مگر اسلامی اقدار کا فقدان ہے، سوائے دولت ومال جمع کرنے اور تجارت وسیاحت کے کچھ نہیں (اِلّا ماشاء اللہ، شاید مٹھی بھر چند لوگ ہوں)۔ زمانہ ماضی میں حج سے واپسی پر زندگی میں جو انقلاب آیا کرتا تھا آج اس کا نام ونشان تک بھی نہیں، اللہ تعالیٰ ہی ہماری حالت پر شاید رحم فرمائے، اور ہمیں سمجھ نصیب فرمائے، یہ سارے احوال: ﴿وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍۢ بِظُلْمٍ﴾ کے حصے ہیں، جن کی نحوست سے پورا عالم اسلام مصیبتوں کا شکار ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ
الْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿٢٦﴾ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ
يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ﴿٢٧﴾ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ
عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ﴿٢٨﴾ ثُمَّ
لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴿٢٩﴾

ترجمہ: اور جب ہم نے ابراہیم کو بیت کی جگہ بتادی کہ تم میرے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہ بناؤ، اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور قیام کرنے والوں اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھنا ﴿٢٦﴾ اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو، وہ تمہارے پاس پیدل چل کر اور دبلی اونٹنیوں پر آئیں گے، یہ اونٹنیاں دور دراز راستوں سے آئیں گی ﴿٢٧﴾ تاکہ لوگ اپنے منافع کے لئے حاضر ہوں، اور ایامِ مقررہ میں ان چوپایوں پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کریں، جو

اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہو، تم ان میں سے کھاؤ، اور مصیبت زدہ محتاج کو کھلاؤ۲۸ پھر اپنے میل کچیل کو دور کریں، اور اپنی نذروں کو پورا کریں، اور بیت العتیق کا طواف کریں۲۹

معارف ومنازل

اس سے پہلی آیت میں مسجد حرام اور حرم شریف سے روکنے والوں پر عذاب شدید کی وعید آئی ہے، آگے اس کی مناسبت سے بیت اللہ کے خاص فضائل وعظمت کا بیان ہے، نیز حج وقربانی اور دوسرے اہم مناسک کا تذکرہ ہے، فرمایا:

﴿وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ﴾ بوء کا لفظ لغت میں کسی کو ٹھکانا اور رہنے کا مکان دینے کے معنی میں آتا ہے، سورۂ اعراف میں ارشاد ہے: ﴿وَبَوَّاَكُمْ فِي الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا﴾ [الأعراف: ۷۴] (اور تمہیں زمین پر اس طرح بسایا کہ تم اس کے ہموار علاقوں میں محل بناتے ہو)۔ اور سورۂ یونس میں فرمایا: ﴿وَلَقَدْ بَوَّاْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ مُبَوَّاَ صِدْقٍ﴾ [یونس: ۹۳] (اور ہم نے بنو اسرائیل کو ایسی جگہ بسایا جو صحیح معنی میں بسنے کے لائق جگہ تھی)۔ تو یہ تینوں مقامات کے الفاظ ایک ہی معنی میں ہیں۔

تو آیت کریمہ کا معنی یہ ہے کہ یہ بات قابل ذکر اور یاد رکھنے کی ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بیت اللہ کی جگہ بتادی کہ وہ اسے ازسرنو تعمیر کرے طوفان نوح علیہ السلام کے وقت بیت اللہ شریف کی تعمیر اٹھالی گئی تھی، البتہ وہ جگہ اور بنیادی ڈھانچہ موجود تھا، مگر مرور زمانہ اور سیلابی بارشوں کی وجہ سے اس پر مٹی جم گئی، جس کی صحیح شناخت نہیں ہوسکتی تھی، چنانچہ حضرت جبریل علیہ السلام نے جگہ بتادی، پھر تیز ہوا نے وہاں سے اوپر کی مٹی آڑا کر نیچے سے بنیادوں کی نشاندہی کی، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے تعاون سے خانہ کعبہ کی تعمیر شروع کی۔ پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ پارہ الٓم کے آخری حصے میں لکھ چکے ہیں، وہاں ملاحظہ ہو۔

جب بنیادیں نظر آگئیں تو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے مل کر اسی مقام پر بیت اللہ شریف کی عمارت ازسرنو تعمیر شروع کی، اور مختصر مدت میں اس کی تکمیل کی، اور یہ سب کچھ ۱۲ ذوالقعدہ سے ۲۵ ذوالقعدہ تک مکمل کرلیا۔

﴿اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـــًٔا﴾ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانا، یہ پہلا حکم ہے، یہ گھر تمام روئے زمین پر

مقدس ترین خطہ اور پورے جہاں والوں کا محترم ومکرم قبلہ ہے، اس کی بنیاد توحید الٰہی پر رکھی گئی ہے، اور تمام دنیا کے لئے ہدایت ہے، یہاں تک رات دن مسلسل رحمتوں کا نزول ہوتا ہے، اور نیکیوں کا ثواب لاکھوں تک بڑھ جاتا ہے، یہ امن وامان کا مرکزی گہوارہ ہے۔

﴿وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ﴾ میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں کے لئے پاک وصاف ستھرا رکھو، یعنی ظاہری وباطنی ہر قسم کی نجاستوں سے، باطنی نجاستوں جیسے شرک وکفر بدعقیدگی بداعمالی بدعات اور دیگر ہر قسم کے معاصی وبے دینی سے اس کو پاک وصاف رکھنا ضروری ہے، اسی طرح مشرکین وکفار ومنافقین کا یہاں داخلہ بھی ممنوع ہو، اور ظاہری نجاستوں سے پاک رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہاں پورا سال رات دن دنیا کے کونے کونے سے ہر قسم کے لوگ سوار پیدل اور اونٹوں پر اور گدھے گھوڑوں پر وارد ہوتے ہیں، اور ہر قسم کے گند کوڑے کرکٹ جانوروں کے بول وبراز پھیلنے کا اندیشہ ہوتا ہے، جس سے مبارک فضاء کے مکدّر ہونے کا ہروقت خطرہ رہتا ہے، پس ضروری ہے کہ طہارت ونظافت کا ضروری ہمہ گیر اہتمام ہو، تاکہ تمام میدان صاف ستھرا گلشن نظیر پاکیزہ ہو، اور کسی قسم کی بدبوئی و نجاست نہ ہو۔

﴿وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ اور قیام کرنے والوں کے لئے بھی طہارت ونظافت ہو، قیام سے مراد نماز بھی ہے اور اعتکاف بھی، سورۂ بقرہ میں اَلْقَآئِمِيْنَ کی جگہ اَلْعَاكِفِيْنَ کا کلمہ مذکور ہے، جس سے اعتکاف وقیام دونوں مراد ہوسکتے ہیں، جس طرح یہاں اَلْقَآئِمِيْنَ دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں۔

الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ سے مراد رکوع وسجدہ کرنے والے نمازی مراد ہیں، چنانچہ طہارت ونظافت کا پورا پورا اہتمام ان سب حضرات کے لئے ضروری ہے۔ بعض علماء کرام کہتے ہیں کہ چونکہ حج وعمرہ ایک عالمی عبادت ہے، جہاں مردوں کے ساتھ ان کی عورتیں اور بکثرت بچوں کی آمد کا مسئلہ بھی درپیش رہتا ہے، پس پورے حرم اور مسجد حرام کے آس پاس لوگوں قیام کرنے کا معاملہ درپیش رہتا ہے، جس سے صفائی ونظافت کا مرحلہ متأثر ہوتا ہے۔ اور یہ بات حقیقی اور واقعی نفس الامری ہے، اس لئے طہارت ونظافت کا حکم دیا گیا۔ اس کے بعد تیسرا حکم جو دیا وہ یہ ہے:

﴿وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ﴾ اور آپ لوگوں میں حج کا اعلان کردو کہ اے لوگو! اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر ہو چکا ہے، تم آؤ اس کا حج کرو، تم پر حج فرض ہو چکا۔ حضرت ابن ابی حاتمؒ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فرضیتِ حج کے اعلان کا حکم ہوا تو انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! یہاں

میدان ہے، نہ کوئی انسان ہے نہ آبادی، نہ کوئی سننے والا نہ کوئی جواب دینے والا، تو میری آواز دور کی آبادیوں تک کیسے پہنچے گی؟ اللہ تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ آپ کی آواز کو قیامت تک آنے والوں کو پہنچانا ہمارا ذمہ ہے، تم صرف اعلان کر دو۔ مقام ابراہیم پر یا جبل ابوقبیس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مؤذن کی طرح کانوں میں انگلیاں ڈال کر مشرق و مغرب، جنوب شمال چاروں طرف اعلان کیا کہ اے لوگو! تمہارے ربّ کا گھر بن گیا ہے، اس کا حج تم پر فرض ہو چکا ہے، تم سب اپنے ربّ کے حکم کی تعمیل کرلو، آؤ۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان تمام لوگوں کو ساری دنیا میں پہنچادی، یہ آپ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ قیامت تک آنے والے سب لوگوں نے آپ علیہ السلام کی آواز سنی اور لبیک کہہ کر فرماں قبول کرلیا۔ جتنی مرتبہ کسی نے لبیک کہا اتنی مرتبہ اس کو حج نصیب ہوگا۔ اور جن کی ارواح نے سرے سے لبیک ہی نہیں کہا وہ حج سے محروم رہیں گے، اگرچہ وہ مکہ مکرمہ کی شہری کیوں نہ ہوں۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ لبیک کہنے والے وہ لوگ ہوں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کا انتخاب حاصل رہا ہو۔

﴿يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ﴾ لوگ تیرے پاس حج کے لئے پاپیادہ بھی آئیں گے، اور دبلی پتلی لاغر و کمزور اونٹنیوں پر سوار ہو کر بھی آئیں گے، یعنی تمہارے اعلان کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اپنے بیت کی بے پناہ محبت پیدا کریں گے، جس کے نتیجے میں لوگ نہایت بے قراری کے ساتھ بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کبھی پیدل، کبھی دبلی پتلی کمزور اونٹنیوں یا گدھے گھوڑے خچروں پر لبیک لبیک کہتے ہوئے آئیں گے۔ فَجّ راستہ، عَمِيْق گہرا، دور دراز اور ناہموار راستہ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا بھی کی: ﴿أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ [ابراھیم:۳۷] (آپ (عزوجل تعالیٰ) اپنے فضل سے کچھ لوگوں کے دل ادھر متوجہ کردے کہ وہ یہاں آئیں، نیز غیب سے ان کی روزی کا ایک ایسا سامان فرمادے تاکہ وہ شکر کریں)۔

حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام دعاؤں کو شرف قبولیت سے نوازا۔ اگرچہ بنی اسرائیلی قوم نے ان کی دعاؤں پر لبیک نہیں کہا، اور ان کی ملّت و تعلیمات سے انحراف کیا، جس کے نتیجے میں سرور خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت تک کعبہ شریف اور حرم پاک حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل و برکات اور تعلیمات توحید سے سرا سر بیگانہ اور خالی رہا۔ اسی طرح کفار قریش بلکہ پورا جزیرۂ عرب ابراہیمی تعلیمات سے محروم رہا، مگر جس عظیم ہستی کی

بعثت کے لئے حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما السلام نے دعا کی تھی اس کی آمد کے ساتھ پورے جہاں کے چاروں افق کا رخ تبدیل ہوگیا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امنگوں اور امیدوں کا سورج طلوع کیا، جس کے نتیجے میں مکہ ومدینہ کو روئے زمین پر وہ مقام وشرف حاصل ہوا جس کی نظیر نہ ہو۔ سارا سال کشاں کشاں دنیا کے مختلف مقامات سے اور دور دراز علاقوں سے لاکھوں کی تعداد میں لوگ یہاں پہنچ رہے ہیں، یہ سلسلہ شب وروز ہر موسم میں اس کثرت کے ساتھ جاری رہتا ہے کہ اس کا احاطہ مشکل ہو جاتا ہے۔

اس سال جب ہم یہ حروف رقم کر رہے ہیں قومی اخبارات نے لکھا ہے کہ اس سال باہر سے جو لوگ حج وعمرہ کے لئے یہاں آئے ہیں ایک محتاط اندازے کے مطابق ان کی تعداد چھ کروڑ تیس لاکھ ہے۔ یہ ایک سال کی اعداد وشمار ہے۔ پورے عالم میں پورا سال جن مختلف اجتماعات کا انعقاد منظم طریقہ سے ہوتا ہے الحمد للہ یہ اجتماع تمام بین الاقوامی اجتماعات سے سب سے زیادہ بڑا بھی ہے، اور منظم وخالص روحانی وپر امن بھی، اس میں بہت سے دینی ودنیاوی منافع ہیں۔ یہاں کے باشندوں کے لئے باہر سے آنے والوں کی وجہ سے اتنے مالی دینی اخلاقی منافع ہیں جو کہ شمار سے باہر ہیں۔ اسی طرح باہر سے آنے والوں کو روحانی مالی اخلاقی طرح طرح کے منافع حاصل ہوتے ہیں، اسی کو فرمایا:

﴿لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾ اور تاکہ مقررہ ایام میں اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا نام لیں جو اللہ تعالیٰ نے انہیں دی ہے، یعنی چوپائے۔ یہاں چار باتوں کا تذکرہ ہوا جو کہ محتاج تشریح وبیان ہیں: اول یہ کہ ایام معلومات سے کیا مراد ہے؟ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرنے سے کیا مراد ہے؟ تیسری یہ کہ ﴿بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ﴾ کیا ہیں؟ چوتھی یہ کہ وجوباً جانور کس موقع پر، اور استحباباً کس موقع پر ذبح کئے جائیں؟ اب اختصار کے ساتھ ہر ایک کا بیان ہوگا:

﴿اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ﴾: مقررہ ایام سے کون سے دن مراد ہیں؟ اس کے بارے میں بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ عشرہ ذوالحجہ (یعنی ذوالحجہ کے اولین دس روز) مراد ہیں، ان دنوں میں اللہ تعالیٰ کا خوب ذکر کریں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بقرعید کے دس دن میں جس قدر نیک عمل اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اس سے بڑھ کر کسی زمانے میں اس قدر محبوب نہیں، یعنی یہ دن فضیلت میں دوسرے دنوں سے بڑے ہوئے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی ان دنوں کی عبادت سے

افضل نہیں ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ بھی ان ایام کے اعمال سے افضل نہیں، اِلّا یہ کہ کوئی شخص اپنی جان و مال لے کر نکلے، اور ان میں سے کچھ بھی واپس لے کر نہ لوٹے، یعنی خود بھی شہید ہو، اور مال پر بھی دشمن کا قبضہ ہو۔[مشکوٰۃ]

اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تو بہت بے شمار ہیں، ان سب کا شکریہ ادا کرنا چاہئے، لیکن چونکہ ﴿بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾ (چوپائے قربانی کے جانور) دسویں ذوالحجہ عید الاضحیٰ کے دن سے ذبح ہونا شروع ہو جاتے ہیں، اور اس سے پہلے ان جانوروں کی تلاش ہوتی ہے، خریداری ہوتی ہے، ان کو خوراک گھاس چارے کھلایا جاتا ہے، ان کو فربہ کر کے صحیح سالم اور ہر عیب سے پاک رکھ کر سنت ابراہیمی کے طریقے پر ذبح کیا جاتا ہے، قیامت کے دن یہ تمہاری پل صراط کی سواری ہے، اس کی خوارک دانہ پانی گوبر لید پیشاب اعمال کے وزن میں دینی و دنیوی دونوں فوائد کا انبار ہے، دنیوی فوائد ان کے گوشت، چرم، دودھ اور سواری کے فوائد ہیں، جبکہ اخروی فوائد بے شمار ہوں گے۔

بعض حضرات نے ایام معلومات سے ایام النحر (قربانی کے تین دن) مراد لئے ہیں، یعنی دس گیارہ بارہ ذوالحجہ، ان تینوں دنوں میں پورے عالم اسلام میں قربانی کی جاتی ہے، جو صاحب نصاب لوگوں پر واجب ہے، اور حجاج کرام منیٰ شریف میں قربانی کرتے ہیں۔ اسی طرح حج قران اور حج تمتع کے لئے جانور ذبح کرتے ہیں، ایام منیٰ میں یوں بھی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہئے کہ اس نے آپ کو یہاں کی حاضری کا موقع عطا فرمایا۔ سورۂ بقرہ میں فرمایا: ﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ﴾[البقرۃ:۲۰۳] (گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرتے رہو)۔ اس سے دس گیارہ بارہ ذوالحجہ کے ایام مراد ہیں، انہی ایام میں جمرات ثلاثہ کو کنکروں سے رمی کرتے ہیں، اور طواف زیارت جو کہ حج کا رکن ہے انہی ایام میں اس کو ادا کرتے ہیں۔

حج سراپا ذکر ہے، تلبیہ ذکر ہے، طواف بھی ذکر ہے، سعی ذکر ہے، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں، قربانی میں، رمی میں ذکر ہی ذکر ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے سرور عالم ﷺ نے ارشاد فرمایا: لَاتَصُوْمُوْا فِیْ هٰذِهِ الْاَیَّامِ فَاِنَّهَا اَیَّامُ اَكْلٍ وَ شُرْبٍ وَ ذِكْرِ اللهِ. ان دنوں میں روزہ نہ رکھو، کیونکہ یہ کھانے پینے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے دن ہیں، اکثر لوگ ان دنوں میں تکبیرات تشریق بکثرت پڑھتے ہیں۔

﴿بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ﴾: (چار پاؤں پر چلنے والے جانور) ان سے مراد وہ جانور ہیں جو کہ حج کے دنوں منیٰ اور پورے عالم اسلام میں "أضحیہ" قربانی واجبہ کے لئے ذبح کئے جاتے ہیں۔ چونکہ ہر جانور اور ہر چوپائے کی قربانی

نہیں ہوتی اس کے لئے اونٹ ،اونٹنی، گائے ،بیل، بکرا، بکری، دنبہ، دنبی اور بھیڑ ہی متعین ہیں، جو ثمانية أزواج کے ذیل میں بیان ہوئے۔ بھینس گائے کی ایک قسم ہے، اس لئے اس کی قربانی بھی درست ہے۔ پھران جانوروں کی عمریں بھی مقرر ہیں، اور یہ بات بھی لازم ہے کہ جانور کے جسم میں عیب نہ ہو، ہاتھ، پاؤں، آنکھ، ناک، کان، سینگ سالم اور درست ہوں۔ معمولی عیب کی رعایت ممکن ہے، زیادہ کی نہیں (کتب فقہ میں تفصیلات دیکھیں)۔

اونٹ کی عمر پانچ سال، گائے ، بیل اور بھینس دوسال، بکرا، بکری اور دنبہ دنبی میں ایک سال کا ہونا لازم ہے۔گائے ،بیل اور اونٹ میں سات آدمی شریک ہو سکتے ہیں، باقی میں صرف ایک۔قربانی کے علاوہ ہَدی، دم تمتع، دم قران، دم جنایت وغیرہ کے احکام کتب فقہ میں تفصیلاً درج ہیں، وہاں رجوع کیا جائے۔

﴿فَكُلُوا مِنۡهَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآٮِٕسَ الۡفَقِيۡرَ﴾ سوان میں سے کھاؤ، اور مصیبت زدہ محتاجوں کو کھلاؤ۔قربانی کے گوشت کو اپنے گھر میں استعمال کرنا بغیر کسی کراہت کے جائز ہے، اور محتاجوں کو دینے میں بہت فضیلت ہے، جبکہ نذر کا گوشت اور حج وعمرہ کے دوران جنایت کے دم کا گوشت قربانی دینے والا خود نہیں کھا سکتا۔ دسویں ذوالحجہ کو جمرہ عقبہ کے رمی کے بعد قربانی کرتے ہیں، اوراس کے بعد بال کٹواتے ہیں، صفائی کر کے احرام کھول دیتے ہیں، اسی کے متعلق ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ لۡيَقۡضُوۡا تَفَثَهُمۡ﴾ پھر چاہئے کہ وہ اپنی میل کچیل دور کرلیں۔ ایام احرام میں صابن وغیرہ استعمال نہ کرنے کی وجہ سے پورا بدن میلا ہو جاتا ہے، میل کچیل جم جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ قربانی کے بعد تم حلال ہو چکے ہو، اب خوب صفائی کرو، اور خوشبو لگا سکتے ہو، ابھی طواف زیارت باقی ہے جس کے بعد پھر بیوی بھی حلال ہو جائے گی۔

﴿وَلۡيُوۡفُوۡا نُذُوۡرَهُمۡ﴾ چاہئے کہ اپنی نذریں پوری کریں۔ اکثر لوگ تکمیل حج کی خوشی میں بدنی اور مالی نذر بھی مانتے ہیں، اب اللہ تعالیٰ کا شکر بجالا کر اپنی نذروں کو پوری کریں۔ ﴿وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ﴾ اور چاہئے کہ وہ پرانے (قدیمی) گھر کا طواف کریں۔ کعبہ شریف ﴿اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ﴾ [آل عمران:٩٦] (پہلا گھر ہے جو لوگوں کے لیے رکھا ہے) ہونے کے سبب پرانا اور قدیمی گھر کہلاتا ہے۔

اس طواف سے مراد طواف زیارت ہے، جو دس تاریخ کو کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی مجبوری ہو تو گیارہ اور بارہ تاریخ تک مؤخر کیا جا سکتا ہے، بغیر کراہت کے، لیکن اگر بارہویں تاریخ تک بھی طواف زیارت نہ کر سکا تو مردوں پر تاوان لازم آئے گا، ایک بکرا دینا پڑے گا، البتہ عورت اگر ایام ماہواری کی وجہ سے تاخیر کرلے تو گنجائش ہے کہ پاک

ہونے تک انتظار کرلے۔

حج کے ارکان تین ہیں: احرام، وقوفِ عرفات اور طواف زیارت، ان کے بغیر حج نہیں ہوتا۔ وقوف عرفات کا وقت مقرر ہے، نویں ذوالحجہ سے شروع ہوتا ہے یوم النحر کے طلوع فجر تک، جبکہ طواف زیارت پوارا سال اس کا وقت ہے، تاخیر پر صرف ایک دم دینا پڑے گا۔ تفصیلات کتب فقہ میں دیکھ لیں۔

ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۭ وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا
يُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ۝ حُنَفَاۗءَ لِلّٰهِ غَيْرَ
مُشْرِكِيْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاۗءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ
فِيْ مَكَانٍ سَحِيْقٍ ۝ ذٰلِكَ ۤ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَاۗىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝ لَكُمْ فِيْهَا
مَنَافِعُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ مَحِلُّهَآ اِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝

ترجمہ: یہ بات ہو چکی، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کی حرمات کی تعظیم کرے گا تو یہ اس کے ربّ کے نزدیک اس کیلئے بہتر ہے، اور تمہارے لئے چوپائے حلال کئے گئے، سوائے ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں، سو تم گندگی سے یعنی بتوں سے بچو، اور جھوٹی بات سے بچو ۳۰ اس طرح سے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف جھکے ہوئے ہو، اس کے ساتھ شرک کرنے والے نہ ہو، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرائے اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے گر پڑا، پھر پرندوں نے اس کی بوٹیاں نوچ لیں، یا اسے ہوا نے اڑا کر کسی دور جگہ جا کر پھینک دے ۳۱ یہ بات ہو چکی، اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم کرے سو یہ دلوں کے تقویٰ کی بات ہے ۳۲ تمہارے لئے ان میں ایک مقررہ وقت تک منافع ہیں، پھر ان کا پہنچنا ہے بیت عتیق تک ۳۳

معارف ومنازل

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے توحید کی فضیلت اور شرک کی مذمت اور شعائر اللہ کی تعظیم کا حکم بیان فرمایا۔

ذٰلِكَ یہ بات تو تم نے سن لی، یعنی بیت اللہ شریف کی تعمیر اور حج کی فرضیت، اسی کے ساتھ طواف اور قربانی اور دیگر

مناسک حج معلوم ہونے کے ساتھ ایک بنیادی اصول کا بیان:

﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ﴾ اور جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی حرمتوں کی تعظیم کی تو یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ حُرُمٰتِ حُرْمَۃٌ کی جمع ہے، حرمت سے ہر وہ چیز مراد ہے جس کا شرعاً احترام کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تمام احکام شرعیہ جن کا بندوں کو حکم دیا گیا ہے جیسے بیت اللہ شریف، صفا، مروہ، منیٰ، مزدلفہ، عرفات، طواف، سعی قربانی وغیرہ قابل احترام ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اسی طرح ان کے متعلق اوامر پر عمل کرنا، اور نواہی سے پرہیز کرنا لازم ہے، اسی پابندی پر پورا پورا عمل کرنے کا نام احترام ہے۔

﴿وَاُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ نے تم پر چوپائے (مویشی) حلال کئے ہیں، ماسوائے ان کے جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ اشارہ ہے اس حکم کی طرف جو سورۂ مائدہ، سورۃ الانعام اور سورۃ النحل میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہ یہ ہیں: مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ جانور جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا جائے، وغیرہ۔

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ﴾ پس بت پرستی کی گندگی سے بچو۔ لفظ اَوْثَان وثن کی جمع ہے، بمعنی بت۔ اگر کسی انسان یا کسی جاندار کی شکل وصورت کا ہو تو اسے صنم کہتے ہیں، اگر کسی درخت یا مکان یا پتھر کا ہو تو اس کو وثن کہا جاتا ہے۔ بہر حال! یہ سب افعالِ شرکیہ اور نجس وناپاک ہیں۔

﴿وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾ اور جھوٹی بات سے اجتناب کرو، اس سے مراد شرک بھی ہے، اور عام جھوٹی بات بھی، اور جھوٹی گواہی بھی جو کہ سب حرام ہیں۔

﴿حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ کے لئے حنیف بن جاؤ، ہر طرف سے کٹ کر ہر چیز سے ہٹ کر صرف اللہ تعالیٰ کی طرف لگ جاؤ۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی قدس سرہٗ فرماتے ہیں: جو شخص مکمل موحد اور ہر قسم کے شرک سے بچا ہوا ہو، حج کرتا ہو، قبلہ کا احترام کرتا ہو، شعائر اللہ کی تعظیم کرتا ہو وہ حنیف ہے۔ دنیا کے تمام حنیفوں کے سردار حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں، اسی پر تنبیہ کرتے ہوئے غیر مشرکین سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی قسم کا شرک نہ کرے، نہ عقیدہ، نہ عمل میں، نہ مشابہت وغیرہ میں۔

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَاَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ﴾ یہ شرک کی مثال بیان فرمائی۔ خلاصہ یہ ہے کہ توحید آسمانوں کی طرح نہایت اعلیٰ اور بلند مقام ہے، دوسرے درجے میں جس اسلامی فطرت پر انسانی تخلیق

ہوئی ہے وہ بھی نہایت اعلیٰ و بلند ہے، تیسرے درجے میں انبیاء ورسل علیہم السلام کی بعثت اور آسمانی کتابوں کا نزول انسان کی ہدایت کے لئے ہیں، یہ بھی نہایت اونچے اور بلند مقاصد کے حامل ہیں، ان سب کو چھوڑ کر نظر انداز کر کے جب آدمی کسی مخلوق کے سامنے جھکتا ہے تو خود اپنے کو ذلیل کرتا، اور ان تمام بلندیوں سے ذلت وپستی کے گڑھوں میں گرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قدر اونچائیوں سے گر کر ہرگز زندہ نہیں بچ سکتا، اب یا تو اہواء وافکارِ ردیہ اور خواہشاتِ خبیثہ کے مردار خور جانور چاروں طرف سے اس کی بوٹیاں نوچ کر کھائیں گے، یا شیطان لعین ایک تیز وتند ہوا کے جھکڑ کی طرح اس کو اڑا کے لے جائے گا، اور ایک ایسے گہرے کھڈے میں پھینکے گا جہاں کوئی ہڈی پسلی نظر نہ آئے، یا یوں کہو کہ مثال میں دوقسم کے مشرکوں کا الگ الگ حال بیان ہوا ہے: جو مشرک اپنے شرک میں پوری طرح پکا نہیں مذبذب ہے، کبھی ایک طرف جھک جاتا ہے کبھی دوسری طرف، وہ ﴿فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ﴾ کا، اور جو مشرک اپنے شرک میں پختہ مضبوط اور اٹل ہو، وہ ﴿تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ فِىۡ مَكَانٍ سَحِيۡقٍ﴾ کا مصداق ہے۔

یا ﴿فَتَخۡطَفُهُ الطَّيۡرُ﴾ سے مراد لوگوں کے ہاتھوں سے مارا جانا (میدان جہاد میں)، اور ﴿تَهۡوِىۡ بِهِ الرِّيۡحُ﴾ سے طبعی موت مرنا مراد ہو۔ اکثر مفسرین نے وجہ تشبیہ میں اسی طرح کے احتمالات ذکر کئے ہیں۔

﴿وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنۡ تَقۡوَى الۡقُلُوۡبِ﴾ جو شخص شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا تو یہ دلوں کے تقویٰ کی بات ہے، یعنی جن لوگوں کے قلوب میں تقویٰ ہے وہی اللہ تعالیٰ کے شعائر کی تعظیم کرتے ہیں، پہلے حرمت کی تعظیم کا بیان ہوا، حالانکہ شعائر اللہ حرمات میں داخل ہیں، مگر ان کی اہمیت کے پیش نظر علیحدہ طور پر انہیں مستقل ذکر فرمایا۔ شَعَآئِر جمع شعیرۃ یا شعارۃ کی ہے، جو چیزیں عبادات ہوں یا عبادات کے ذریعہ بنی ہوں انہیں شَعَآئِر کہا جاتا ہے، پس شعائرِ اسلام ان تمام احکامِ شرعیہ کا نام ہے جو عرف میں مسلمان ہونے کی علامت سمجھے جاتے ہیں۔

اور شعائر کی فہرست بہت طویل ہے، مثلاً سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، قرآن حکیم، وحی الٰہی، کعبۃ اللہ، صلوات خمسہ، زکوٰۃ، روزہ، حج، اذان، تمام مقاماتِ مقدسہ وعباداتِ بدنیہ ومالیہ وغیرہ۔ البتہ اس مقام پر سیاق وسباق کی رُو سے جو شعائر اللہ مراد ہیں وہ یہ ہیں: کعبۃ اللہ، یعنی مسجد حرام، صفا مروہ، قربانی، رمی، جمار، عرفات، مزدلفہ، منیٰ، حجر اسود، مقامِ ابراہیم، زمزم، سعی، طواف وغیرہ۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ حج کے تمام مواقع شعائر

ہیں، اور ان سب کے احترام کا ذریعہ اصلی دلوں کا تقویٰ و طہارت ہے۔

﴿لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُسَمًّى﴾ تمہارے لئے قربانی کے جانوروں میں ایک مقررہ مدت تک فائدے ہیں، یعنی کبھی بوقت ضرورت ہدی اور قربانی کے جانوروں پر سواری کرتے ہو، اور اپنا ضروری سامان اونٹوں پر رکھتے ہو، ان کا دودھ پیتے ہو۔ البتہ جب یہ جانور قربانی کے لئے نامزد ہوں تو پھر ان کے دودھ وغیرہ کی قیمت صدقہ کرکے محتاجوں میں تقسیم کرلیں۔ تفصیل کتب فقہ میں دیکھیں۔

﴿ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ﴾ پھر ان کے پہنچنے کی جگہ بیت عتیق ہے، بیت عتیق سے پورا حرم مراد ہے، حرم کے کسی حصے میں حج وعمرہ کا جانور ذبح کرنا درست ہے۔ خارج حرم درست نہیں ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۗ فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا ۗ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴿٣٥﴾

ترجمہ: اور ہر امت کے لئے ہم نے قربانی کرنا مقرر کردیا ہے، تاکہ وہ ان جانوروں پر جو اللہ تعالیٰ نے انہیں عطا فرمائے ہیں اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کریں، سو تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو اسی کے فرمانبردار بنو، اور جو لوگ عاجزی کرنے والے ہیں ان کو خوشخبری سنادو ﴿٣٤﴾ جن کا یہ حال ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں، اور وہ مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں، اور نمازیں قائم کرنے والے ہیں، اور ہم نے جو کچھ انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ﴿٣٥﴾

معارف ومنازل

لفظ مَنسَك مَفعَل کے وزن پر ہے، جس کی ماضی نَسَکَ ہے۔ یہ مادہ مطلق عبادت کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے، اور جانور ذبح کرنے کے لئے بھی، اور حج کے احکام ادا کرنے کے لئے بھی، جیسا کہ سورۂ بقرہ میں ہے: ﴿وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا﴾ [البقرۃ:١٢٨] (اور ہم کو ہماری عبادتوں کے طریقے سکھادے) فرمایا ہے۔ یہاں پر تینوں معنیٰ مراد ہوسکتے ہیں۔

یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کے طریقے مقرر کئے ہیں، اور قربانی کے معنی میں ہوسکتا ہے، اور قربانی کی جگہ کے معنی میں بھی، اور افعال حج کے معنی میں بھی، لیکن آیت کے سیاق اور ماقبل سے ارتباط پر نظر کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جانوروں کی قربانی مراد ہے، کیونکہ: ﴿وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا﴾ کے ساتھ ہی ﴿لِيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ﴾ فرمایا ہے، یہ اس کا قرینہ ہے کہ یہاں جانوروں کی قربانی مراد ہے، اور یہ بہت اہم عبادت ہے۔

﴿فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَلَهُ أَسْلِمُوا﴾ سو تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، سو اس کی فرمانبرداری کرو، عباداتِ اعتقادیہ ہوں یا بدنیہ اور مالیہ سب کے سب اسی کی ذات کے لئے مخصوص ہیں، اس سے پہلے عبادات کے جتنے طریقے تم لوگوں اپنے باطل معبودوں کے لئے ایجاد کر چکے ہو وہ سب باطل اور حرام ہیں، انہیں چھوڑ کر اپنے معبود حقیقی کی فرمانبرداری میں لگ جاؤ، اور یہ چاروں صفات اپنے اندر پیدا کرو:

﴿وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَىٰ مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ﴾ پہلا وصف یہ ہے کہ جب ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس کی عظمت اور ذات وصفات اور وعدو وعید سے ان کے دلوں میں خوف وڈر پیدا ہوتا ہے۔ دوسرا وصف یہ بیان فرمایا کہ ان پر جو مصیبتیں آتی ہیں ان پر صبر کرتے ہیں، بلکہ صبر کے تینوں مقامات پر فائز رہتے ہیں۔ تیسری صفت یہ کہ وہ نمازوں کو پابندی کے ساتھ ارکان وشرائط سنن وآداب کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ چوتھا وصف یہ ہے کہ وہ مالی طاعات پر قائم رہتے ہوئے، جو کچھ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال عطا کیا ہوا ہے ان میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

یہ انفاق فی سبیل اللہ بنسبت دوسرے اعمال کے سخت ہے، لوگ سو رکعت نماز پڑھنے میں دقت محسوس نہیں کرتے مگر چند ہزار روپے دینے سے گھبراتے ہیں۔ فیصلہ یہ ہے کہ جو فقراء ہیں وہ کثرت ذکر وکثرت صلوٰۃ پر پابندی کریں، بس جان خلاصی ہوجاتی ہے، جبکہ مالداروں کی جان خلاصی کے لئے ان دونوں کے علاوہ تیسری شرط بھی لازمی ہے، یعنی انفاق فی سبیل اللہ، اگر یہ صفت ان میں نہیں تو ہزاروں مرتبہ نمازیں ادا کریں اور لاکھوں مرتبہ ذکر واذکار بجالائیں مُخْبِتِين میں شمار نہیں ہوں گے۔ جو لوگ مالی عبادتوں کی جگہ بدنی عبادتوں پر زور لگاتے ہیں، یہ ان کی غلط فہمی ہے، اور کنجوس لوگ اکثر ایسا کرتے ہیں۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ
فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ﴿٣٦﴾ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۚ كَذٰلِكَ
سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۚ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٣٧﴾

ترجمہ: اور قربانی کے اونٹ اور گائیں جن کو ہم نے تمہارے لئے اللہ تعالیٰ کے شعائر میں سے بنادیا ہے تمہارے لئے ان میں خیر ہے، سوتم ان پر اللہ تعالیٰ کا نام لو جب کہ وہ قطار میں کھڑے ہوں، سو وہ جب اپنی کروٹوں پر گرپڑیں تو ان میں سے کھاؤ، اور جو صبر کئے ہوئے ہوا سے، اور جو سوالی بن کر آجائے اس کو کھلاؤ، اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کیا ہے تاکہ تم شکر کرو ﴿٣٦﴾ اللہ تعالیٰ کو ہرگز نہیں پہنچتے انکے گوشت اور ان کے خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، اسی طرح اس نے ان کو تمہارے لئے مسخر کیا تاکہ تم اس پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، اور اچھے کام کرنے والوں کو خوشخبری سنادیجئے ﴿٣٧﴾

معارف ومنازل

﴿وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ قربانی میں بدنہ کو ہم نے تمہارے لئے شعائر اللہ میں سے بنایا ہے، چونکہ قرب الٰہی کے حصول کا قریب ترین ذریعہ ایام حج میں جانوروں کی قربانی ہے، اس لئے ایک اہم قربانی کا خصوصی ذکر فرمایا۔ "اَلْبُدْنَ" جمع ہے "بدنة" کی، بڑے جسیم جانوروں کو بدنہ کہا جاتا ہے۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک لفظ "بدنة" اونٹ اور گائے دونوں کو شامل ہے۔ فرمایا کہ ہم نے ان کو اللہ کے شعائر یعنی یادگاروں اور بڑی نشانیوں میں سے بنایا ہے۔

﴿لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ﴾ ان میں تمہارے لئے خیر ہے، خواہ دنیوی ہو یا اخروی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی قربانی پر ثواب عظیم کا وعدہ فرمایا ہے، لہٰذا ﴿فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ﴾ پس قربانی کے اونٹوں پر اللہ تعالیٰ کا نام ذکر کرو جب وہ قطار باندھے کھڑے ہوں۔ اس لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اونٹوں کو بٹھا کر یا لٹا کر ذبح کرنا درست نہیں، بلکہ انہیں کھڑے کھڑے ہی نحر کردینا چاہیے۔ اونٹ کا ایک گھٹنا باندھ دیا جائے اور پھر اسے تین پاؤں پر کھڑا رکھ کر اس کی گردن میں برچھا لگا کر بسم اللہ اللہ أکبر کے ساتھ حلال کرلیا جائے، اسے نحر کہتے ہیں۔

اونٹ میں نحر کرنا، اور بکری وغیرہ میں ذبح کرنا سنت ہے۔ نحر میں فائدہ یہ ہے کہ جانور کی جان آسانی سے نکل جاتی ہے۔ اگر کوئی اونٹ کو بٹھا کر یا لٹا کر ذبح کرلے تو حلال ہو جاتا ہے مگر یہ خلاف سنت ہے اور خلاف اولیٰ بھی۔

﴿فَإِذَا وَجَبَتْ جُنُوبُهَا﴾ پھر جب وہ نحر شدہ اونٹ پہلو کے بل گر جائے۔

﴿فَكُلُوا مِنْهَا﴾ پس اس کے گوشت میں سے خود کھاؤ، اور: ﴿وَأَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ﴾ اور قناعت کرنے والے اور بے قرار کو بھی کھلاؤ۔ "قَانِعَ" اسے کہتے ہیں جو صبر کئے بیٹھا ہے، سوال نہیں کرتا ہے، کچھ ملے یا نہ ملے بے صبری نہیں کرتا۔ "مُعْتَرّ" وہ ہے جو بے قرار ہو کر سوال کرتا ہے، ہاتھ پھیلاتا ہے۔ یہ دونوں محتاجی میں ایک جیسے برابر ہیں، لہٰذا دونوں حقدار ہیں۔

﴿كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ﴾ اسی طرح ہم نے تمہارے لئے جانوروں کو مسخر کر دیا ہے، مجال نہیں کوئی جانور تمہارے حکم اور مرضی سے انحراف کرے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص کئی اونٹوں کو نحر کر لیتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی تسخیر نہ ہوتی تو تمہارے کئی لوگ شاید ایک اونٹ کے نحر کرنے پر قادر نہ ہوتے، پس اس تسخیر الٰہی سے تمہیں عبرت سیکھنا لازمی ہے کہ جب سارے جانور تمہارے حکم ماننے پر مجبور ہیں تو تمہیں کیا ہوا کہ تم ہر قدم پر اپنے پروردگار کے نافرماں ہو؟ اور اس کا حکم نہیں مانتے ہو، حالانکہ ان عظیم الجثہ حیوانات کے پاس اتنا شعور نہیں جتنا کہ تمہارے پاس، کیا تمہاری عقل تمہیں محسن حقیقی کی نافرمانی پر ملامت نہیں کرتی؟ فرمایا: اس تسخیر کا مقصد یہ ہے:

﴿لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ تاکہ تم لوگ اللہ تعالیٰ کے شکر گزار بندے بن جاؤ، اور دل کی آنکھوں سے نظارہ کرو کہ یہ بڑا عظیم الجثہ اونٹ تمہارے ہاتھوں میں مسخر ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں کمال درجے کی انکساری رکھی ہے، بڑا خدمت گزار و فادار ہے، تمہارا ایک چھوٹا سا بچہ بھی اس کی مہار پکڑ کر سو اونٹوں کی قطار کو جدھر چاہے لے جا سکتا ہے، پس محض اونٹوں کو مت دیکھو، ہاتھی جیسے بھاری بھرکم جانور بھی تمہارے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوا ہے۔ پھر یہ پہاڑوں کے برابر دریائی جہازوں کو غور سے دیکھو، اسی طرح ہوائی جہازوں پر غور کرو، اس کے علاوہ کائنات کے نشیب وفراز میں بے شمار مخلوقات کو دیکھو، تقریباً سب کچھ تمہارے لئے اور تمہاری تسخیر میں رواں دواں کارگزاری میں لگے ہوئے چل رہے ہیں، کاش تم ان سے عبرت سیکھتے۔

﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا﴾ اللہ تعالیٰ کو قربانی کا گوشت یا خون نہیں پہنچتا۔

﴿وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ﴾ بلکہ اسے تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے، اللہ تعالیٰ تمہاری نیت، ارادہ اور

اخلاص کو دیکھتا ہے، اور اسی پر فیصلہ فرماتا ہے، یہ مادی گوشت اور خون اللہ تعالیٰ کو ضرورت نہیں، وہ تمہارے اعمال اور قلوب کے تقویٰ کو دیکھتا ہے۔

مشرکین میں رواج تھا کہ بتوں کے نام پر قربانی کرتے، پھر اس کے گوشت بتوں کے سامنے رکھتے، اور خون بتوں کے چہروں پر ملتے، اور کبھی اس خون کو کعبۃ اللہ کے غلاف پر ڈالتے، جب مسلمان پہلی مرتبہ حج کے ارادے سے مکہ مکرمہ پہنچے تو انہوں نے بھی ایسا کرنا چاہا، تو یہ آیت نازل ہوئی، اور انہیں تنبیہ کی گئی کہ خبر دار! اس عمل سے اجتناب کرو، اور اپنے اندر اخلاص اور تقویٰ پیدا کر کے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرو، پہاڑوں برابر اعمال اگر تقویٰ اور اخلاص کے بغیر ہوں تو ذرہ برابر ثواب نہیں ملے گا، اور اگر اخلاص کے ساتھ ذرہ برابر عمل ہو تو ثواب پہاڑوں کے برابر ملے گا۔

﴿كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ اسی طرح ہم نے ان کو تمہارا تابع کر دیا ہے، تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تمہیں ہدایت دی، توحید کا راستہ بتادیا، حلال وحرام کی تعلیم دی، جبکہ تم اللہ تعالیٰ کا نام لے کر اللہ اکبر کہتے ہوئے، جانور ذبح کرتے ہو، یہ بہت بڑی سعادت ہے، اس طرح تمہارا شمار محسنین میں ہوگا، تو فرمایا: ﴿وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ آپ احسان پر چلنے والوں کو خوشخبری سناؤ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقرب اور سعادت مند وکامیاب رہیں گے۔

❁ ❁ ❁

اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ ۳۸

ترجمہ: بلا شبہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں سے دفع فرمائے گا، بلا شبہ اللہ تعالیٰ کسی بھی خیانت کرنے والے ناشکرے کو پسند نہیں فرماتا ۳۸

معارف ومنازل

متصل گزر چکا: ﴿وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ اس آیت میں اسی کے ایک فرد کا ذکر ہے، اور پہلے بھی گزر چکا، یہ دونوں دشمنوں کا جھگڑا ہر وقت جاری رہے گا، اور یہ بھی گزرا: ﴿مَنْ كَانَ يَظُنُّ اَنْ لَّنْ يَّنْصُرَهُ اللّٰهُ﴾ [الحج:١٥] (جو یہ گمان کرتا ہے کہ اللہ ان کی مدد نہیں کرے گا)۔ اس آیت میں ان سب موہومات کا جواب ہے، اور نصرت الٰہی

کی بشارت ہے، اور کفار کے لئے وعید شدید ہے۔ حدیبیہ کے سال جب آنحضرت ﷺ پندرہ سو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ عمرہ کے لئے حدیبیہ پہنچے تو مشرکین مکہ نے مزاحمت کی، اور آپ ﷺ کو آگے مکہ مکرمہ تک جانے نہیں دیا، اس آیت میں آئندہ کے لئے بشارت ہے، بلکہ فتح مکہ کے لئے پیشین گوئی ہے کہ آپ خوش ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حمایت وحفاظت کا فیصلہ کر چکا ہے، بہت جلد خیانت کاروں، ظالموں اور ناشکروں کے اقتدار کا خاتمہ ہوگا، اور آپ کا غلبہ ہوگا، چنانچہ ایسا ہی ہوا، فتح مکہ کی صورت میں یہ وعدہ پورا ہو گیا، مسلمانوں کا اقتدار مضبوط ہوا۔

اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ﴿۳۹﴾ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّاۤ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ؕ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا ؕ وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۴۰﴾

ترجمہ: ان لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے لڑائی کی جاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا گیا، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد کرنے پر ضرور قادر ہے ﴿۳۹﴾ یہ لوگ اپنے گھروں سے ناحق صرف یہ کہنے کی وجہ سے نکالے گئے کہ ہمارا ربّ اللہ تعالیٰ ہے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے ذریعہ دفع فرماتا ہے تو نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا جاتا ہے گرا دیئے جاتے، اور یہ بات ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی مدد کرے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ قوی ہے، غلبہ والا ہے ﴿۴۰﴾

معارف ومنازل

اللہ تعالیٰ جل شانہ مظلوموں کے لئے ہمیشہ ہر موقع اپنی حمایت ونصرت کا اعلان فرما چکے ہیں، ابتدائی دور میں مکہ مکرمہ کے مشرکین نے مسلمانوں پر جو ظلم وزیادتیاں کیں، وہ نہایت دلخراش پریشان کن مظالم تھے، اس موقع پر مسلمانوں پر مشرکین قریش کے مظالم کا یہ انداز رہا کہ کوئی دن خالی نہ جاتا تھا کہ کوئی مسلمان ان کے دست ستم و بربریت سے زخمی اور چوٹ کھایا ہوا نہ آتا ہو، قیام مکہ کے آخری دور میں مسلمانوں کی تعداد بھی خاصی ہو چکی تھی، وہ مشرکین کے ظلم وجور کی شکایت اور ان کے مقابلے میں قتل وقتال کی اجازت مانگ تھے، مگر سید عالم ﷺ جواب

میں فرماتے کہ صبر کرو، مجھے ابھی تک اللہ تعالیٰ نے قتال کی اجازت نہیں دی ہے، یہ سلسلہ مکی زندگی میں دس سال تک اسی طرح جاری رہا۔ [قرطبي وغيره]

پھر جب سرور عالم ﷺ نے سخت پریشانی اور نہایت ناگفتہ بہ حالات میں اللہ تعالیٰ شانہ کی اجازت وحکم کے ساتھ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا فیصلہ کیا، اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مکہ سے نکلے غار ثور میں تین دن کے قیام کے بعد وہاں سے مدینہ طیبہ روانہ ہوئے، بارہ دن کے سفر کے بعد مدینہ طیبہ پہنچے، اس اثناء میں جب آپ ﷺ مکہ سے روانہ ہو رہے تھے تو آپ ﷺ کی زبان حق بیان سے یہ الفاظ نکلے: "أَخرَجُوا نَبِيَّهُمْ لَيَهْلِكُنَّ"۔ ان مشرکین نے اپنے نبی کو نکالا، اب ان کی ہلاکت کا وقت آگیا ہے۔

جب آپ ﷺ مدینہ طیبہ پہنچے جہاں انصار مدینہ نے والہانہ عشق ومحبت اور شرعی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے آپ ﷺ کا گرم جوشی سے استقبال کیا، اس طرح سرزمین مدینہ آپ ﷺ کی تشریف آوری سے روشن وتابان ہوا، اور یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ﴾ جس میں مسلمانوں کو کفار کے ساتھ جہاد وقتال کی اجازت دیدی گئی۔ [ترمذي، قرطبي، نسائي]

اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن حبان اور حاکم وغیرہ نے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ یہ قرآن حکیم کی پہلی آیت ہے جو قتال کفار کے معاملہ میں نازل ہوئی، جبکہ اس سے پہلے ستر (۷۰) سے زیادہ آیتوں میں قتال مع الکفار کو ممنوع قرار دیا گیا تھا، اور صبر کرنے کا حکم ہوتا رہتا تھا۔

﴿أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقٰتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ﴾ جن اہل ایمان کے ساتھ کافر لوگ لڑائی کرتے ہیں اب ان کو بھی جنگ کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر ظلم کیا جاتا تھا، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنی نصرت کے ساتھ مظلوموں کو ہتھیار اٹھانے اور کفار کے غرور کو خاک میں ملانے کی اجازت دے دی، بیشک اللہ تعالیٰ ان مظلوموں کی مدد کرنے پر قادر ہے۔

﴿الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ﴾ مظلوم یہ لوگ تھے جن کو بلاوجہ ان کے گھروں سے نکالا گیا، ان کا کوئی قصور نہ تھا سوائے اس ایک بات کے: ﴿إِلَّا أَنْ يَقُولُوا رَبُّنَا اللّٰهُ﴾ کہ وہ حق پر تھے، وہ کہتے تھے: ہمارا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے، اللہ تعالیٰ کو ربّ تسلیم کرنا تو بڑی سعادت کی بات تھی، مگر شیطان کے چیلے کفار کے نزدیک یہ

بہت بڑا عیب تھا، جو لوگ نفس وشیطان کے غلام ہیں وہ ہر زمانہ اور ہر خطہ میں یہی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دین کے ساتھ اور دیندار طبقے کے ساتھ عداوت رکھتے ہیں، ان کے خیال میں تمام بڑے بڑے جرائم کفر وشرک، ڈاکہ، چوری، قتل وغارتگری، شراب، زنا، حرام وغیرہ سب قابلِ عفو ہیں، لیکن توحید وتعلق باللہ نا قابل معافی جرم ہیں۔

کفار ومشرکین تو ویسے بھی ہمارے مذہب کے دشمن ہیں، آج ان کے کاسہ لیس نام نہاد مسلمان بھی مذہب اور مذہبی راہنماؤں سے نہایت دور اور ان کے بدخواہ ہیں، کبھی انہیں انتہا پسند کہتے ہیں، اور کبھی دہشت گرد اور مساجد مدارس وتعلیم قرآن وحدیث کو اپنی ترقی میں رکاوٹ سمجھتے ہیں، وہ بے چارہ خدا کے قرآن اور نبی کی حدیث کی تعلیم کو تضیعِ اوقات سمجھتا ہے، اور اپنی ترقی وخوشحالی (آخرت کی تباہی) انگریزوں، یہود ونصاریٰ کی تعلیم میں سمجھتا اور یقین کرتا ہے، حالانکہ وہ رسمی طور پر اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے۔

ستم ظریفی یہ کہ بعض مسلمان ممالک میں قرآنی تعلیمات پر اور تبلیغ دین پر باقاعدہ پابندی ہے، جبکہ کچھ غیر مسلم ممالک میں تبلیغ پر پابندی نہیں۔ ہمارے موجودہ زمانہ میں ننانوے فیصد دجال اکبر کے لئے کام ہو رہا ہے، یہ تعداد مسلم ممالک کے اعتبار سے ہے، اور ایک فیصد کام اپنے معاشرے اور اسلام کے لئے ہو رہا ہے۔

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ﴾ اس میں جہاد وقتال کی حکمت کا بیان ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ جہاد وقتال کوئی نئی چیز نہیں، پچھلے انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی امتوں کو بھی جہاد وقتال کا حکم دیا گیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو کسی مذہب اور کسی دین کی بقاء مشکل ہو جاتی، کیوں نہیں ہر طاقتور بادشاہ کمزوروں کو ہڑپ کر کے ختم کرتا، جس سے دنیا کا نظام درہم برہم ہو جاتا، اور اہل حق خصوصاً ختم ہو جاتے، اور تمام مذاہب کے عبادت خانے مسمار ہو جاتے۔

﴿لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ﴾ جتنے دین ومذہب دنیا میں ایسے ہوئے ہیں کہ کسی زمانے میں ان کی اصل بنیاد اللہ کی طرف سے اور وحی کے ذریعہ قائم ہوئی تھی پھر وہ منسوخ ہو گئے، اور ان میں تحریف ہو کر کفر وشرک میں تبدیل ہو گئے، مگر اپنے اپنے وقت میں وہی برحق تھے، ان سب کی عبادت گاہوں کا اس آیت میں ذکر فرمایا ہے، کیونکہ اپنے اپنے وقت میں ان کی عبادت گاہوں کا احترام اور حفاظت فرض تھی، ان مذاہب کے عبادت خانوں کا ذکر نہیں فرمایا جن کی بنیاد کسی وقت بھی نبوت اور وحی الٰہی پر نہیں تھی، جیسے آتش پرست، مجوس، صابی، ہندو، بت پرست وغیرہ، کیونکہ ان کے عبادت خانے کسی وقت بھی قابل احترام نہ تھے۔

صوامع صومعہ کی جمع ہے، نصاریٰ کے راہبوں کی عبادت گاہ مراد ہے۔ بِيَعٌ بیعۃ کی جمع ہے، نصاریٰ کی عام عبادت گاہ، چرچ وغیرہ۔ صَلَوٰتٌ یہودیوں کی عبادت گاہوں کو کہتے ہیں۔ مَسٰجِدُ مسلمانوں کی عبادت گاہوں کا نام ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کفار سے جہاد و قتال کے احکام نہ آتے تو کسی زمانے میں کسی مذہب وملت کے لئے امن وسلامتی کی جگہ نہ ہوتی۔ "رَبُّنَا اللہُ" کی بنیاد پر ہر زمانہ کے کفار اللہ تعالیٰ کے ماننے والوں کو قتل کرتے یا ہجرت پر مجبور کرتے، اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار کر کے ڈھا دیتے، چونکہ اللہ تعالیٰ نے جہاد و قتال کو مشروع کر کے مسلمانوں کو اپنے مذہب اور عبادت خانوں کے تحفظ ودفاع کا حق بخشا، جس سے وہ محفوظ ومنصور رہے، اور کفر وشرک پر غلبہ پا کر دنیا میں سرخ رو اور کامیاب رہے۔

❀ ❀ ❀

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ
وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾

ترجمہ: یہ ایسے لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار دیں تو نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں، اور بھلائی کا حکم کریں، اور برائی سے روکیں، اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے ﴿۴۱﴾

معارف ومنازل

جو لوگ بغیر کسی قصور وجرم کے مکہ مکرمہ سے نکالے گئے دشمن نے انہیں خالی ہاتھ ان کے گھروں سے بے دخل کر کے نکالا، اور وہ اپنے ایمان کے تحفظ کی خاطر سب کچھ قربان کر کے نکلے، ایک وقت وہ بھی قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اقتدار عطا کیا تو انہوں نے دین کی خوب خدمت کی، خود بھی نمازیں قائم کیں، اور زکوٰۃ ادا کی، اور دوسروں سے بھی دین پر عمل کرایا، عمل کرانے کے لئے امر بالمعروف نہی عن المنکر کی ضرورت ہوتی ہے، ان حضرات نے ان دونوں اہم اور بنیادی کاموں کا بھی بڑا اہتمام فرمایا، اور دھرتی کو رشک جنان بنا کر رہتی دنیا تک وہ نقوش رقم کر چھوڑے جن کی مثال نہ ہو۔

یہ کون لوگ تھے؟ مؤرخین ومفسرین نے کہا ہے کہ یہ مسند خلافت پر جلوہ افروز خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم

تھے، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت فاروق اعظم، حضرت عمر بن الخطاب، حضرت عثمان غنی، حضرت علی حیدر کرار رضوان اللہ تعالیٰ علیہم، جن کے بعد خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ تھے۔ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سارے کے سارے اس آیت کریمہ کے مصداق تھے، جنہیں دنیا نے ہر چند اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ مکمل ناکام رہی۔ ان حضرات نے دنیا کو مغلظہ طلاق دے کر اس کی طرف میلان تو بجائے خود نظر تک بھی اٹھا کر نہیں دیکھا، اور دنیا میں وہ وہ کام کئے جو انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ دوسرا کوئی نہ کر سکا۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی ہجری تک ان کے درخشاں کارنامے جگمگاتے رہے۔ پھر زوالِ بغداد کے بعد دنیا کا رنگ بدل گیا، دینی اقدار کمزور پڑ گئے، فسق وفجور عام ہوا، اور الحاد و زندقہ کو عروج حاصل ہوا، جو کہ اب بھی ہے۔

گربہ میر سگ وزیر و موش را دربان کنند ☆ این چنین ارکان دولت ملک را ویران کنند

﴿وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ﴾ تمام کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے، وہی اول ہے، وہی آخر اور وہی ظاہر، وہی باطن، اس نے صدیوں سے قائم طاقتور کفر وجہالت کو اپنے صادق الامین پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اس کے نہتے بے سروسامان جری وبہادر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاتھوں وہ شکست فاش دی، جسے دنیا نے سراہا، اور ان جان نثاروں کے ہاتھوں قیصر وکسریٰ کے پرخچے اڑائے، اور فارس روم کے عظیم بادشاہوں کے تاج کو پاؤں میں روند ڈالا۔ رضي الله عنهم أجمعين

۞ ۞ ۞

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ﴿٤٢﴾ وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ﴿٤٣﴾ وَ
اَصْحٰبُ مَدْيَنَ ۚ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَاَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ ۚ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ﴿٤٤﴾ فَكَاَيِّنْ
مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ﴿٤٥﴾

ترجمہ: اور اگر آپ کو جھٹلائیں تو ان سے پہلے نوح کی قوم اور عاد اور ثمود ﴿٤٢﴾ اور ابراہیم کی قوم اور لوط کی قوم ﴿٤٣﴾ اور مدین والے جھٹلا چکے ہیں، اور موسیٰ کو جھٹلایا گیا، سو میں نے کافروں کو مہلت دی، پھر میں نے انہیں پکڑ لیا، سو کیسا تھا میرا عذاب؟ ﴿٤٤﴾ سو کتنی ہی بستیاں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کیا جو ظلم کرنے والی تھیں، سو وہ اپنی چھتوں پر گری پڑی ہیں، اور کتنے ہی کنویں ہیں جو بیکار ہیں، اور کتنے ہی محل ہیں جو مضبوط بنائے ہوئے ہیں ﴿٤٥﴾

معارف ومنازل

سورۂ ہود میں ارشاد فرمایا: ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ﴾ [ہود: ۱۲۰] (اور گزشتہ پیغمبروں کے واقعات میں سے وہ سارے واقعات ہم تمہیں سنا رہے ہیں جن سے ہم تمہارے دل کو تقویت پہنچائیں)۔ گزشتہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے قصے اور واقعات آپ کو بار بار سنانے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تسلی ہی تسلی دینا مقصود ہے کہ اگر آپ کے مخالفین آپ کو جھٹلا رہے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ سے پہلے بھی حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کو ان کی امتوں نے جھٹلایا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اور عاد جو حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی، اور قوم ثمود جو حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم اور حضرت لوط علیہ السلام اور حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم، مدین والے، ان سب نے اپنے اپنے نبیوں علیہم السلام کی تکذیب کی ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب کی گئی، ان سارے انبیاء کرام علیہم السلام نے صبر کیا، اور دعوت کا کام جاری رکھا، لہٰذا ان کے اتباع میں آپ بھی صبر کیجئے، اور دعوت کا کام جاری رکھئے۔

یہ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے متعلق ہے، اب رہا "مکذبین" کا معاملہ، تو انہیں سابقہ امتوں سے سبق لینا چاہئے، ان امتوں میں جو کافر تھے انہیں اللہ تعالیٰ نے مہلت دی، پھر انہیں پکڑ لیا، یہ پکڑ سخت عذاب کی صورت میں تھی، ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب کیسا ہے؟ ان لوگوں کو تباہ شدہ اقوام کے حالات معلوم ہوئے تو انہیں ان کی تباہی سے عبرت حاصل کرنا چاہئے کہ وہ کتنی ہی بستیاں تھیں جو ظالم ومشرک نافرماں تھیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک کیا، آج دنیا میں ان کے نشانات موجود ہیں، ان کے گھروں کی دیواریں ان کی چھتوں پر گری ہوئی تھیں، کیونکہ پہلے چھتیں گریں پھر ان پر دیواریں گر گئیں۔ یہ ہے: ﴿فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾۔

اور ان لوگوں نے کتنی بکثرت سے آب پاشی اور اپنے جانوروں کے لئے کنویں تیار کئے تھے، جیسے قوم عاد وثمود، آج وہ تمام کنویں بیکار پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہے: ﴿بِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ﴾۔ اور اس کے ساتھ امراء وسلاطین، وزراء اور سرمایہ داروں نے کیا سے کیا عمدہ مضبوط رنگدار بلند وبالا محلات بنائے تھے، آج وہ خستہ حالت میں تباہ شدہ کھنڈرات کی صورت میں نشان عبرت بنے ہوئے ہیں، ان کے بنانے والے اور ان میں ناز ونخرے اور غرور سے رہنے والوں کا نام ونشان تک نہیں، کسی نے کیا اچھا کہا: ؎

وَكَمْ بَنَتِ الْمُلُوكُ لَهَا قُصُوْرًا ★ فَلَمْ يَبْقَ الْمُلُوكُ وَلَا الْقُصُوْرُ

بادشاہوں نے کتنے اچھے خوبصورت محلات بنائے، پھر نہ وہ رہے نہ محلات۔ ہم نے آخری پارہ سورۃ الفجر کی تفسیر میں شداد بن ارم کی جنت کا واقعہ اور اس کا عجیب وغریب پس منظر لکھا ہے، عبرت کی خاطر ضرور اس کا مطالعہ کرلیں۔ ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ﴾ [الرحمٰن: ٢٦] (اس زمین میں جو کوئی ہے فنا ہونے والا ہے)۔

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۖ
فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ ﴿٤٦﴾ وَيَسْتَعْجِلُونَكَ
بِالْعَذَابِ وَلَن يُخْلِفَ اللَّهُ وَعْدَهُ ۚ وَإِنَّ يَوْمًا عِندَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ ﴿٤٧﴾
وَكَأَيِّن مِّن قَرْيَةٍ أَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ أَخَذْتُهَا وَإِلَيَّ الْمَصِيرُ ﴿٤٨﴾

ترجمہ: کیا یہ لوگ زمین میں نہیں چلے پھرے تاکہ ان کے ایسے دل ہوتے جن کے ذریعہ سمجھتے، اور ایسے کان ہوتے جن کے ذریعہ سنتے؟ سو بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتی ہیں، لیکن دل اندھے ہوجاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں ﴿٤٦﴾ اور وہ آپ سے جلد عذاب لانے کا تقاضا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے وعدہ کے خلاف نہ فرمائے گا، اور بلاشبہ آپ کے ربّ کے نزدیک ایک ایسا دن ہے جو تم لوگوں کے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہوگا ﴿٤٧﴾ اور کتنی ہی بستیاں تھیں جن کو میں نے مہلت دی، اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والے تھے، پھر میں نے انہیں پکڑلیا، اور میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے ﴿٤٨﴾

معارف ومنازل

زمانۂ رسالت کے لوگوں کو دعوت ایمان کے ساتھ دعوت سیاحت برائے عبرت دیا جارہا ہے کہ کیا یہ لوگ زمین میں نہیں گھومے پھرے؟ انہوں نے یمن اور شام کا سفر کرکے ہلاک شدہ بستیوں سے گزرے ہیں، اور قصر مشید اور کنویں تباہ شدہ آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں، لیکن سرسری نگاہ سے اگر بصیرت وعبرت اور دل کی آنکھوں سے دیکھتے تو نتیجہ کچھ اور ہوتا۔ اسی طرح سماع ظاہری اور غیر اختیاری بھی ہوتا ہے جو کہ نتیجہ خیز نہیں ہوتا۔ ہاں! جو نتیجہ خیز ہوتا ہے وہ "استماع" کہلاتا ہے۔ جب دل اندھے ہوں تو آنکھوں پر اور کانوں پر اس کے پردہ کا اثر غالب رہتا ہے، تو

ظاہری دیکھنے اور سننے سے فائدہ نہیں ہوتا، کیونکہ یہ دیکھنا اور سننا غور وفکر سے خالی ہو کر فائدہ مند نہیں ہوتا۔

البتہ جب دل زندہ و بیدار ہوگا تو اس کا اثر آنکھوں اور کانوں پر آئے گا، پس ان دونوں میں دل والا غور وفکر پیدا ہوگا، جس سے نتیجہ صحیح پیدا ہوگا، یہی وجہ ہے کافروں کے بارے میں ارشاد ہے: ﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ﴾ [الأعراف: ١٧٩] (ان کے پاس دل ہیں) حیوان کی طرح۔ ﴿لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْيُنٌ﴾ [الأعراف: ١٧٩] (جس سے وہ سمجھتے نہیں، ان کے پاس آنکھیں ہیں) پتھر کے مورتیوں کی طرح۔ ﴿لَا يُبْصِرُوْنَ بِهَا﴾ [الأعراف: ١٧٩] (ان سے دیکھتے نہیں) اور ﴿وَلَهُمْ اٰذَانٌ﴾ [الأعراف: ١٧٩] (اوران کے پاس کان ہیں) بتوں کی طرح، ﴿لَا يَسْمَعُوْنَ بِهَا﴾ [الأعراف: ١٧٩] (ان سے سنتے نہیں)۔

یعنی دل ان کے ہیں مگر سوچ سے خالی، آنکھیں ہیں مگر نگاہ عبرت سے محروم، اور کان بھی ہیں مگر سماع قبولیت سے خالی، پس ان میں اور ایک بے شعور حیوان میں کوئی فرق نہیں۔ سارے جہاں پر بالعموم اور اہل علم پر بالخصوص علامہ شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا احسان ہے جنہوں نے علم تجوید وقراءآت عشرہ کی وہ بے مثال ونادر خدمت کی ہے جن کی نظیر نہیں، اور اس خدمت میں وہ منفرد ہیں، جن کا ہم پلہ کوئی نہیں، اور وہ ظاہری آنکھوں سے نابینا تھے مگر باطنی بصیرت اللہ تعالیٰ نے وہ عطا فرمائی تھی جو ضرب المثل تھی۔

﴿وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ وہ آپ سے جلدی عذاب آجانے کا مطالبہ کرتے ہیں، اور اس جلدی بلانے کے تقاضے میں عذاب کا انکار کرنا مقصود ہے۔ مطلب ان کا یہ ہے کہ اگر عذاب کا ظہور نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایسی ہی باتیں ہیں، دھمکی شمکی ہے، نہ کوئی عذاب آیا ہے نہ آئے گا، اس کے جواب میں فرمایا:

﴿وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ﴾ کہ اللہ تعالیٰ اپنا وعدہ خلاف نہ کرے گا، عذاب ضرور آئے گا، مگر اس کے آنے کے لئے جو اجل مقرر و متعین فرمادی ہے، اس کے مطابق آئے گا، عذاب آنے میں دیر ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسے آنا ہی نہیں ہے۔

﴿وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ﴾ اور بلاشبہ آپ کے ربّ کے نزدیک ایک ایسا دن ہے جو تم لوگوں کے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہوگا، اس میں یہ بتایا کہ کفر کی سزا اگر کسی قوم کو دنیا میں نہ دی گئی تو قیامت سامنے ہے ہی، وہ دن بہت سخت ہوگا اور لمبا ہوگا، دوزخ کا عذاب اور مصیبت میں جو مبتلا ہوں گے اس

کو سوچ لیں اور غور کر لیں، وہ قیامت کا دن ایک ہزار سال کا ہوگا، اور اتنے لمبے دن میں جو تکلیف ہوگی اس کا اندازہ اسی سے کر لیں کہ سرور دو جہاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس دن سورج ایک میل کے فاصلہ پر ہوگا، اور اس کی گرمی سے آدمی اس قدر پسینہ میں ہوگا کہ بعض کا پسینہ ٹخنوں تک، اور بعض کا کمر تک، اور بعض کا منہ تک ہوگا، یعنی گرم پسینہ میں ایسے کھڑے ہوں گے جیسے کوئی گرم نہر میں کھڑا ہو، یہ پسینہ لگام کی طرح منہ میں گھس رہا ہوگا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے فقراء مالداروں سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے، اور یہ پانچ سو سال قیامت کے دن کا آدھا ہوگا۔ [ترمذي] آیت کریمہ اور حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ قیامت کا دن ایک ہزار سال کا ہوگا، اور سورۂ معارج میں فرمایا: ﴿فِيْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ اَلْفَ سَنَةٍ﴾ [معارج: ۴] (اس دن میں جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی)۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوگا، بظاہر دونوں آیتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے۔

لیکن حقیقت میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ میدان محشر میں حاضرین کی حالت جدا جدا ہوگی، کسی کو ایسا معلوم ہوگا جیسے آدھ گھنٹہ یا اس سے بھی کم، کسی کو ایک ہزار سال، کسی کو پچاس ہزار سال، حساب کی شدت وخفت کے اعتبار سے ایک ہزار سال اور پچاس ہزار سال فرمایا۔

اور امام بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب البعث والنشور میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا گیا: یا رسول اللہ! وہ دن تو بہت ہی لمبا ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہوگی؟ (مقصد یہ تھا کہ وہ دن کیسے کٹے گا؟) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ دن مؤمن پر ایسا ہلکا کر دیا جائے گا جیسے ایک فرض نماز میں جو وقت خرچ ہوتا ہے، اس سے بھی ہلکا معلوم ہوگا۔ آخر میں مضمون بالا کو پھر دہرایا:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا﴾ اور کتنی بستیوں کو ہم نے مہلت دی اس حال میں کہ وہ ظلم کرنے والی تھیں؟ پھر میں نے انہیں پکڑ لیا، اور میری ہی طرف سب کو لوٹ کر آنا ہے، اور حساب دینا ہے، پھر ہر ایک کو اس کے عمل کی جزاء اور سزا دینا ہوگی۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٤٩﴾ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ
مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ ﴿٥٠﴾ وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ﴿٥١﴾

ترجمہ: آپ فرمادیجئے کہ اے لوگو! میں تمہارے لئے واضح طور پر ڈرانے والا ہوں ﴿٤٩﴾ سو جن لوگوں نے نیک عمل کئے ان کے لئے مغفرت ہے، اور عزّت والا رزق ہے ﴿٥٠﴾ اور جن لوگوں نے عاجز کرنے کے لئے ہماری آیات کے بارے میں کوشش کی یہ لوگ دوزخ والے ہیں ﴿٥١﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں فرائضِ نبوت کا بیان ہے، اور جو چیز فرائضِ نبوت میں شامل نہیں اس کی نفی ہے، فرمایا: اے لوگو! بلاشبہ میں اپنے ربّ کی طرف سے کھلم کھلا واضح طور پر تمہیں ڈرانے والا ہوں، میرا کام صرف یہ ہے کہ تمہیں تبلیغ کر کے حق بات سنا کر آخرت کے عذاب وخطرات سے ڈراؤں۔ رہا یہ کہ تمہارے مطالبات کہ جلدی عذاب لاؤ، قیامت قائم کرو، فرشتوں کو لاؤ، یہ میرے فرائض میں نہیں، یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں، میں ان باتوں سے فارغ ہوں، یہاں تک کہ کسی کی ہدایت بھی میرے بس میں نہیں، پس جو ایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے اس کے لئے مغفرت بھی ہے اور عزّت کی روزی، جس میں حیاتِ طیبہ اور سکون بھی شامل ہے، اور جو ایمان نہیں لائے گا وہ اپنا انجام خود سوچ لے میں، اس کا ذمہ دار نہیں بنتا۔

اور جو لوگ اللہ تعالیٰ کی آیات کو عاجز اور کمزور کرنا چاہتے ہیں، اور پیغمبر علیہ السلام اور اس کی وحی کی عظمت و شرف کو گرانا چاہتے ہیں، کبھی نبی کو ساحر، کبھی شاعر اور کبھی مجنون کہتے ہیں، پھر قرآن کو جادو یا پرانے لوگوں کے قصے کہانی کہتے ہیں، ان باتوں سے وہ اہل ایمان کو عاجز کرنا چاہتے ہیں، ایسے لوگ دوزخ والے ہیں، کیونکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود انہوں نے کفر کو ایمان پر ترجیح دیدی۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا
يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٥٢﴾ لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ
فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۢ بَعِيْدٍ ﴿٥٣﴾ وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا

الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ
مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٤﴾ وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ
يَوْمٍ عَقِيْمٍ ﴿٥٥﴾ اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ ؕ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ
النَّعِيْمِ ﴿٥٦﴾ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿٥٧﴾

ترجمہ: اور آپ سے پہلے ہم نے کوئی رسول اور کوئی نبی ایسا نہیں بھیجا جس کو یہ قصہ پیش نہ آیا ہو جب اس نے پڑھا تو شیطان نے اس کے پڑھنے میں شبہ ڈال دیا، پھر اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو ختم کر دیتا ہے، پھر اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے، اور اللہ تعالیٰ علیم ہے، حکیم ہے ﴿۵۲﴾ تاکہ اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو ان لوگوں کے لئے آزمائش بنا دے جن کے دلوں میں مرض ہے، اور جن کے دل سخت ہیں، اور بلاشبہ ظلم کرنے والے دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۵۳﴾ اور تاکہ وہ لوگ زیادہ یقین کرلیں جنہیں علم دیا گیا ہے کہ بیشک وہ آپ کے ربّ کی طرف سے حق ہے، پھر ایمان پر زیادہ قائم ہو جائیں، پھر ان کے دل اس کی طرف اور بھی جھک جائیں، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو صراط مستقیم کی ہدایت فرماتا ہے ﴿۵۴﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ برابر اس کی طرف سے شک میں رہیں گے، یہاں تک کہ ان کے پاس اچانک قیامت آجائے، یا ان کے پاس کسی ایسے دن کا عذاب آجائے جس میں کوئی خیر نہ ہو ﴿۵۵﴾ اس روز بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ شانہ کی ہوگی، وہ ان کے درمیان فیصلہ فرمائے گا، سو جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کئے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے ﴿۵۶﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا سو ان کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ﴿۵۷﴾

معارف ومنازل

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ کسی بھی زمانے میں ایسا نہیں ہوا کہ لوگوں نے بغیر کسی اختلاف کے بخوشی حق کو قبول کیا ہو یا انبیاء کرام علیہم السلام کا ساتھ دیا ہو، پس آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی جارہی ہے، اور آگاہ فرمارہے ہیں کہ آپ دشمنانِ توحید اور شیطانی گماشتوں سے نہ گھبرائیں، دشمنانِ دین نہ سابقہ ادوار میں کامیاب ہوئے اور نہ اب یا آئندہ ہوں گے، بلکہ ذلیل وخوار ہو کر مٹ جائیں گے، فتح وکامرانی حق کی ہوگی۔ ان شاء اللہ

آیت کریمہ میں نبی اور رسول کے دو الفاظ بیک وقت استعمال ہوئے ہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ ان کے

درمیان فرق کوواضح کر دیا جائے:

(۱) ایک لحاظ سے نبی عام ہے اور رسول خاص ہے، نبی ورسول دونوں اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہیں، وحی دونوں پر نازل ہوتی ہے، مگر رسول اس لحاظ سے خاص ہے کہ اس کو مستقل کتاب یا شریعت عطا کی جاتی ہے، اور نبی باوجود صاحب وحی ہونے کے سابقہ کتاب یا شریعت پر عمل پیرا ہوتا ہے، پس اس اعتبار سے ہر نبی رسول نہیں ہوتا، اور ہر رسول نبی ضرور ہے۔

(۲) دوسرے لحاظ سے رسول عام ہے (فرشتہ اور انسان بھی) اور نبی خاص ہے صرف انسانوں کے ساتھ، پس ہر رسول نبی نہیں ہوتا، اور ہر نبی رسول ہوسکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رسول وہ ہے جس کو کفار و مشرکین کے ساتھ جہاد کا حکم ہوتا ہے، تلوار کے ساتھ، اور نبی کے ذمہ صرف تبلیغ احکام کا فریضہ ہے، اس کو جہاد بالسیف کے ساتھ واسطہ نہیں ہوتا۔

لفظ "تَمَنّٰی" مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے: ایک معنی تو عام فہم ہے، اور یہ لفظ اردو میں بھی مستعمل ہے، یعنی کسی چیز کی محبت کے ساتھ آرزو کرنا، پھر اس جملے کے معنی یہ ہوں گے کہ جب بھی کسی رسول یا نبی نے کسی چیز کی محبت کے ساتھ خواہش ظاہر کی تو شیطان نے وسوسہ اندازی اور رخنہ اندازی کر کے رکاوٹیں پیدا کیں۔ نبی کی تمنا اور آرزو تو یہی ہوسکتی ہے کہ لوگ ایمان قبول کرلیں، اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر کے نجات حاصل کرلیں، اور کفر و شرک اور ہر قسم کے معاصی سے توبہ کرلیں، وغیرہ۔

بعض مفسرین کرام تمنا سے مراد تلاوت لیتے ہیں کہ عربی زبان میں یہ معنی بھی مستعمل ہے اس طرح جملے کا مطلب یہ ہوگا کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کے رسول یا نبی نے لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا کلام یا اس کے احکام تلاوت کئے تو شیطان نے اس تلاوت شدہ کلام کے معانی اور مطالب میں رخنہ ڈال کر لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا کئے۔ تمنا کے یہ معنی عربی ادب میں بھی ملتے ہیں جیسا کہ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی مدح میں کہتے ہیں:

تَمَنّٰی کتابَ اللهِ اَوَّلَ لَیْلَةٍ ★ تَمَنِّیَ داوٗدَ الزَّبُورَ علٰی رِسلٍ

تَمَنّٰی کتابَ اللهِ اَوَّلَ لَیْلَةٍ ★ واٰخِرَهَا لَاقٰی حِمَاَ المقادِرِ

کہ آپ رضی اللہ عنہ رات کے پہلے حصے میں کتاب اللہ کی تلاوت کرتے تھے، جیسا کہ حضرت داؤد علیہ السلام

زبور ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے، آپؑ کا انداز تلاوت نہایت اعلیٰ اور پر سوز ہوتا تھا، حتیٰ کہ آپؑ کے ساتھ پرندے پہاڑ اور درخت بھی تلاوت میں شامل ہو جاتے۔ پھر کہتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رات کے اول حصہ میں کتاب اللہ کی تلاوت فرماتے تھے، اور رات کے دوسرے حصے میں تقدیروں کی موت سے جا ملے، یعنی شہید کر دیئے گئے۔ حما موت کو کہتے ہیں۔

﴿فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ﴾ پھر اللہ تعالیٰ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جس کے ذریعہ شیطان رخنہ اندازی کرتا ہے۔ ﴿ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ﴾ پھر اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ ﴿وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ﴾ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا، حکمت والا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا نبی لوگوں کے سامنے کوئی چیز پڑھ لیتا ہے، تو شیطان اس میں وسوسہ ڈال کر لوگوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور رخنہ اندازی کرتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيۡكُمُ الۡمَيۡتَةَ﴾ [البقرۃ:۱۷۳] (اللہ تعالیٰ نے تمہارے اوپر مردار کو حرام قرار دیا ہے)۔

اس آیت کے متعلق شیطان نے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ جس جانور کو اللہ تعالیٰ نے موت دی وہ تو حرام ہو گیا، اور جسے خود ذبح کر کے مروایا وہ حلال ہو گیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح واضح فرمایا کہ: ﴿وَلَا تَاۡكُلُوۡا مِمَّا لَمۡ يُذۡكَرِ اسۡمُ اللّٰهِ عَلَيۡهِ﴾ [الأنعام: ۱۲۱] (جس چیز پر بوقت ذبح اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا گیا ہو اس کو مت کھاؤ) کیونکہ اس میں روحانی خرابی پیدا ہو گئی ہے، لہٰذا یہ تمہارے لئے حلال نہیں۔ ظاہر ہے جو جانور اپنی موت مر گیا ہے اس کو نہ تو ذبح کیا اور نہ اس پر اللہ تعالیٰ کا نام لیا گیا، لہٰذا وہ کھانے کے قابل نہیں رہا۔

وسوسہ اندازی کی دوسری مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِنَّكُمۡ وَمَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ﴾ [الأنبياء:۹۸] (تم اور تمہارے وہ معبود جن کی تم عبادت کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہوں گے) اس پر شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا کہ غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں کے جہنم میں جانے کی بات تو سمجھ میں آتی ہے، جبکہ معبودوں میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت عزیر علیہ السلام اور فرشتے بھی شامل ہیں، جن کی لوگ پوجا کرتے تھے، تو پھر یہ پاک ہستیاں دوزخ میں کیسے جا سکتی ہیں؟

اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں اپنی برگزیدہ ہستیوں کے متعلق فرمایا: ﴿اُولٰٓئِكَ عَنۡهَا مُبۡعَدُوۡنَ ۝۱۰۱ لَا يَسۡمَعُوۡنَ حَسِيۡسَهَا﴾ [الأنبياء:۱۰۲] (وہ برگزیدہ لوگ جہنم سے دور رہیں گے وہ تو دوزخ کی آہٹ بھی نہیں سن

پائیں گے) ان ہستیوں نے اپنی پوری زندگی توحید باری تعالیٰ کی تبلیغ میں صرف کی ہے۔ البتہ جہنم میں وہ لوگ جائیں گے جو خود اپنی پرستش کراتے رہے، اور لوگوں کو غلط راستوں پر ڈالتے رہے، یا وہ شجر، حجر، وثن، صنم اور بت جہنم میں جائیں گے جن کی مشرکین نے عبادت کی تاکہ عابد و معبود دونوں جہنم کا ایندھن بنیں۔

شیطان کی وسوسہ اندازی کی تیسری مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا: ﴿اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللهِ وَكَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَاۤ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ﴾ [النساء:۱۷۱] (یعنی عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا رسول اور اس کا کلمہ ہے، جسے مریم کی طرف ڈالا گیا، اور اس کی طرف سے روح ہیں)۔ نصاریٰ کہنے لگے کہ جب خود اللہ تعالیٰ نے آپ علیہ السلام کو "روح اللہ" کہا تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے بیٹے ٹھہرے، مگر اللہ تعالیٰ نے مسیح علیہ السلام کی شخصیت کی وضاحت یوں فرمادی: ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ﴾ [الزخرف:۵۹] (وہ تو اللہ تعالیٰ کے بندے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنا انعام کیا، اور ان کو اپنی نشانی بنایا اور قوم بنی اسرائیل کے لئے ہدایت بنایا)۔ آگے شیطان کی شرارت کا بیان ہے:

﴿لِّيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ کہ شیطان جو وسوسہ ڈالتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو آزمائش بنادے گا ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے۔

﴿وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ﴾ اور ان لوگوں کے لئے بھی جن کے دل سخت ہو چکے ہیں۔ یہاں پر دو قسم کے لوگوں کا ذکر کیا گیا: پہلے وہ جو دل کے مریض ہیں، ان سے مراد منافقین ہیں۔ دوسرے وہ جن کے دل سخت ہیں، ان سے مراد مشرکین ہیں، اور یہود و نصاریٰ بھی، یہ ساری قومیں جو پہلے سے گمراہ ہیں، لیکن شیطانی وسوسوں سے ان کی گمراہی مزید زیادہ ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے وہ انبیاء و رسل علیہم السلام سے دور بھاگتے ہیں۔

﴿وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍ م بَعِيْدٍ﴾ اور بلاشبہ کہ اس قسم کے ظالم لوگ دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے، یعنی ان کی گمراہی اور کفر پختہ اور مضبوط ہے، اسی لئے صراط مستقیم سے محروم ہیں۔

﴿وَّلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ﴾ اور تاکہ اہل علم جان لیں کہ یہ تیرے ربّ کی طرف سے برحق ہے۔ ﴿فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ﴾ لہٰذا وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اور یہ کلام علم والوں کے لئے فتنہ کا موجب نہیں بنتا، چونکہ وہ کلام الٰہی پر ایمان رکھتے ہیں تو: ﴿فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ﴾ ان کے دلوں میں اخبات، عاجزی، انکساری اور تواضع پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل اخبات والوں کے چار اوصاف بیان ہوئے۔ حضرت شاہ ولی اللہ

دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ مزید چار صفات اہل سعادت کی امتیازی صفات ہیں: (۱) طہارت ظاہر و باطن (۲) اخبات، انکساری اور تواضع (۳) عدالت وحکمت (۴) سماحت یعنی ہر خسیس چیز وعمل سے پرہیز۔ اگر کسی میں یہ چار خصلتیں نہ ہوں وہ شقی وبد بخت شمار ہوگا۔

بہر حال! یہ سرور عالم خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے لئے تسلی کا مضمون ہے کہ جو لوگ اسلام کے پروگرام اور اس کی تعلیمات و برکات کو شیطانی حربوں اور ابلیسی ہتھکنڈوں کے ذریعہ مٹانا یا کمزور کرنا چاہتے ہیں آپ گھبرائیں نہیں۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن ☆ پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

یہ حق و باطل کا معرکہ آج کا نہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء کرام علیہم السلام کی قوموں نے تکذیب کی ہے، اور انہیں دلخراش ایذائیں دی ہیں، اور سیکڑوں کی تعداد میں انہیں شہید بھی کیا گیا ہے۔

بعض مفسرین نے "تمنّی" کے یہ معنی لئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی چیز پڑھتے ہیں تو شیطان آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں آواز ملا کر لوگوں کے سامنے ایسی باتیں پیش کرتا ہے جو شانِ نبوت کے خلاف ہوتی ہیں، اور پھر اللہ تعالیٰ شیطان کی باتوں کو مٹا دیتا ہے، اور اپنی آیات کو مظبوط رکھتا ہے۔ اس بارے میں لوگ ایک بے بنیاد موضوع روایت کا سہارا لے کر بیان کرتے ہیں کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبل از ہجرت مکہ مکرمہ میں سورۃ النجم کی یہ آیات تلاوت فرمائیں: ﴿اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ﴿١٩﴾ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿٢٠﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿٢١﴾﴾ [النجم] (بھلا کیا تم نے لات اور عزّیٰ پر بھی غور کیا ہے؟ اور اس تیسرے پر جس کا نام منات ہے؟ کیا تمہارے لیے تو بیٹے ہوں، اور اللہ کے لیے بیٹیاں؟)۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیات تلاوت فرمائیں تو شیطان نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز میں اپنی آواز ملا کر کہا:

تِلْكَ الْغَرَانِيْقُ الْعُلٰى ★ وَاِنَّ شَفَاعَتَهُنَّ لَتُرْتَجٰى

یہ بہت بڑی بڑی ہستیاں ہیں، اور ان کی شفاعت کی امید رکھی جاتی ہے، ایسی بات مشرکین کے لئے مزید باعث فتنہ بن گئی، اور انہوں نے لات، عزّیٰ اور منات کو اپنا سفارش کنندہ بنالیا۔ پھر سورت کے آخر میں آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کی آیت تلاوت کی، اس وقت مسجد حرام میں بہت سے کفار موجود بیٹھے ہوئے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوت کے فوراً بعد سجدہ کیا تو وہاں موجود سارے لوگوں نے سجدہ کیا، البتہ امیہ بن خلف مشرک نے

سجدہ کرنے کی بجائے تھوڑی سی مٹی لے کر اپنی پیشانی پر مل لی اور کہا کہ یہ کافی ہے۔ [بخاري]

فائدہ:

یہ تفسیر صحیح نہیں، اور اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ اور وحی الٰہی تینوں کی شان کے خلاف ہے۔ صحیح تفسیر وہی ہے جو شروع میں بیان ہوئی کہ جب اللہ تعالیٰ کے نبی ﷺ کوئی آرزو یا تمنا کرتا ہے تو شیطان اس میں رخنہ اندازی کرتا ہے۔ اور دوسری تفسیر یہ کہ جب رسول خدا ﷺ کسی آیت کی تلاوت کرتا ہے تو شیطان لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال کر رخنہ اندازی کرتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس وسوسے کو دور کر کے مٹا دیتا ہے، جس سے ایمان والے سلامت رہتے ہیں، اور کفار و منافقین فتنے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ دوسری آیات نازل فرما کر مؤمنوں کا وسوسہ دور کر دیتا ہے۔

واضح ہو کہ اس طرح کے وساوس قیامت تک جاری رہیں گے، اور مسلسل چل رہے ہیں، جب تک شیاطین زندہ ہیں یہ منقطع نہیں ہوں گے۔ پھر آخر میں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی سیدھے راستے کی طرف راہنمائی کرتا ہے، اور وہ صراط مستقیم کو پا لیتے ہیں، اور شیطانی اغواء سے محفوظ رہتے ہیں۔ الحمد للہ

﴿وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ﴾ اور کافر لوگ ہمیشہ شک و تردد میں پڑے رہیں گے۔

﴿حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً﴾ یہاں تک کہ اچانک قیامت واقع ہو جائے۔ ﴿اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ﴾ یا ان پر سخت دن کا عذاب نازل ہو جائے۔ عَقِيْمٍ بانجھ کو کہتے ہیں، یعنی وہ جس میں خیر نہ ہو، اسی طرح رِيْحٌ عَقِيْمٌ یعنی خیر سے خالی ہوا اور منحوس ہوا۔ یہی حال بانجھ عورت کا ہے جو کہ بے خیر اور بے فائدہ ہے۔

﴿اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ﴾ آج کے دن بادشاہی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے، دنیا میں مجازی بادشاہت ابتلاء کے طور پر انسانوں کو سونپی گئی، لیکن حقیقی بادشاہت اللہ تعالیٰ کی رہی، آج قیامت کو یہ مجاز بھی چھین لیا جائے گا، اور ہر طرح کا اقتدار اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہوگا، وہی: ﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ﴾ [الفاتحة:۳] (جو روز جزاء کا مالک ہے) رہے گا۔

﴿يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ﴾ اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ فرمائے گا۔ ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ﴾ پس وہ لوگ جو دنیا میں ایمان لائے اور اعمال انجام دیئے وہ نعمت کے باغوں میں ہوں گے، وہ جنتوں اور

راحتوں اور خوشیوں میں ہوں گے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ﴾ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا قیامت اور حساب وکتاب کا منکر رہا سو یہی لوگ ذلت ناک عذاب میں مبتلا رہیں گے، وہاں عزت کا نام تک نہیں ہوگا، ہمیشہ ذلیل رہیں گے۔

وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ
لَهُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۵۸ لَيُدْخِلَنَّهُمْ مُّدْخَلًا يَّرْضَوْنَهٗ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَلِيْمٌ حَلِيْمٌ ۵۹ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ
عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ ۶۰

ترجمہ: اور جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کی، پھر وہ قتل کیے گئے یا طبعی موت سے وفات پا گئے، اللہ تعالیٰ انہیں ضرور ضرور اچھا رزق عطا فرمائے گا، اور یہ بات یقینی ہے کہ اللہ تعالیٰ خیر الرازقین ہے ۵۸ وہ انہیں ضرور ضرور ایسی جگہ میں داخل فرمائے گا جس سے وہ خوش ہوں گے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا ہے، بہت حلم والا ہے ۵۹ یہ بات یوں ہی ہوگی، اور جو شخص اس قدر بدلہ لے جس قدر اسے تکلیف پہنچائی گئی، پھر اس پر زیادتی کی جائے، اللہ تعالیٰ ضرور ضرور اس کی مدد فرمائے گا، بیشک اللہ تعالیٰ معاف فرمانے والے اور بخشنے والا ہے ۶۰

معارف ومنازل

محض اللہ تعالیٰ کے لئے اور اپنے ایمان کی حفاظت کے پیش نظر گھر بار بیوی بچے مال و سرمایہ اور عزیز و رشتہ داروں کو چھوڑ کر خالی ہاتھ وطن سے نکلنا بہت ہی بڑا امتحان اور آزمائش ہے، اسی کا نام ہجرت ہے، اور اس کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس ہجرت کو اپنا کر حبشہ ہجرت کر گئے، پھر وہاں سے مدینہ منورہ آگئے، یہ اصحاب الہجرتین کہلائے۔ دوسرا گروہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ آیا، یہ ایک ہجرت والے کہلائے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ جن لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کی، پھر مقتول ہو کر شہید ہو گئے، یا اپنی طبعی موت مر گئے اللہ تعالیٰ شانہ انہیں ضرور ضرور عمدہ رزق عطا فرمائے گا، اس سے مراد جنت کی عمدہ و بے مثال نعمتیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ سب دینے والوں سے خیر الرازقین، بہتر عمدہ بے حساب دینے والا ہے۔

﴿لَيُدۡخِلَنَّهُمۡ مُّدۡخَلًا يَّرۡضَوۡنَهٗ﴾ اللہ تعالیٰ شانہ ایسے لوگوں کو ایسی جگہ میں داخل فرمائے گا جس سے وہ خوش ہوں گے، وہ جگہ جنت ہے، جس کی ایک ادنیٰ نعمت کی قیمت ساری دنیا ادا نہیں کر سکتی، دنیا اور اس کی ساری نعمتیں جنت کی ایک بالشت جتنی جگہ سے بھی حقیر ہیں، بیشک اللہ تعالیٰ علیم ہے، حلیم ہے، وہ اپنے علم اور حلم وحکمت کے مطابق شہداء اور مہاجرین اور دیگر جنتیوں کو ان کے اعمال واخلاص کے مطابق رزق حسن عطا فرمائے گا، کیونکہ سارے جنتی ایک جیسے نہیں ہوتے، اسی طرح سارے شہداء بھی۔

﴿ذٰلِكَ ۚ وَمَنۡ عَاقَبَ بِمِثۡلِ مَا عُوۡقِبَ بِهٖ﴾ یہ بات اسی طرح اٹل اور پختہ ہے، اور جو شخص اس قدر بدلہ لے جس قدر اسے تکلیف پہنچائی گئی پھر اس پر زیادتی کی جائے تو اللہ تعالیٰ ضرور ضرور اس کی مدد فرمائے گا۔

اس آیت کا ربط ماقبل آیت کے ساتھ یہ ہے کہ ہجرت والوں کو خوشخبری دی جارہی ہے کہ مشرکین مکہ نے تم پر زیادتی کر کے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا، پھر تم نے ان سے میدان بدر میں اپنا بدلہ لے لیا، اب یہ دونوں برابر سرابر ہوگئے، اب مزید انہوں نے تمہارے خلاف بغاوت اور سرکشی کی تو اللہ تعالیٰ ضرور ضرور تمہاری مدد فرمائے گا، چنانچہ غزوۂ احد اور غزوۂ احزاب میں کافروں نے مسلمانوں کو نیست ونابود کرنے کی کوشش کی، مگر اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال رہی، اور دونوں مواقع پر مشرکین اور کافر ناکام لوٹ گئے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت معاف کرنے والا، اور بہت بخش کرنے والا ہے۔

......۞......۞......۞......

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوۡلِجُ الَّيۡلَ فِى النَّهَارِ وَيُوۡلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيۡلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ ﴿٦١﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ
هُوَ الۡحَـقُّ وَاَنَّ مَا يَدۡعُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِهٖ هُوَ الۡبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الۡعَلِىُّ الۡكَبِيۡرُ ﴿٦٢﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ
مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصۡبِحُ الۡاَرۡضُ مُخۡضَرَّةً ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَطِيۡفٌ خَبِيۡرٌ ﴿٦٣﴾ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى
الۡاَرۡضِ ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الۡغَنِىُّ الۡحَمِيۡدُ ﴿٦٤﴾ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَـكُمۡ مَّا فِى الۡاَرۡضِ وَالۡفُلۡكَ تَجۡرِىۡ
فِى الۡبَحۡرِ بِاَمۡرِهٖ ؕ وَيُمۡسِكُ السَّمَآءَ اَنۡ تَقَعَ عَلَى الۡاَرۡضِ اِلَّا بِاِذۡنِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوۡفٌ
رَّحِيۡمٌ ﴿٦٥﴾ وَهُوَ الَّذِىۡۤ اَحۡيَاكُمۡ ثُمَّ يُمِيۡتُكُمۡ ثُمَّ يُحۡيِيۡكُمۡ ؕ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَـكَفُوۡرٌ ﴿٦٦﴾

ترجمہ: یہ اس وجہ سے ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں، اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے، اور

بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا اور دیکھنے والا ہے ۶۱ یہ اس وجہ سے ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ حق ہے، اور اس کے علاوہ جو دوسروں کو پکارتے ہیں وہ باطل ہیں، اور اللہ تعالیٰ برتر ہے، بڑا ہے ۶۲ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے پانی اتارا، پھر زمین ہری بھری ہوگئی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت مہربان ہے، خبر رکھنے والا ہے ۶۳ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے سب اسی کا ہے، اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ غنی ہے، تعریف کا مستحق ہے ۶۴ اے مخاطب! کیا تو نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہ سب کچھ مسخر فرمادیا جو زمین میں ہے، اور کشتی کو مسخر فرمادیا، وہ سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہے، اور وہ آسمان کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے، مگر یہ کہ اسی کا حکم ہوجائے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر بہت مہربان ہے، نہایت رحم فرمانے والا ہے ۶۵ اور اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہیں زندہ کیا، پھر تمہیں موت دے گا، پھر تمہیں زندہ فرمائے گا، بلاشبہ انسان بڑا ناشکرا ہے ۶۶

معارف ومنازل

ان آیات میں دلائل توحید اور مظاہر قدرت کا بیان ہے، جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کو وضاحت کے ساتھ بیان فرما کر ناشکرا انسانوں کو شکر کی دعوت دے رہا ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِى النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِى الَّيْلِ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ﴾ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے، اور یہ متضاد تبدیلی اس کی وحدانیت اور کمال قدرت کی دلیل ہے، جسے دیکھ کر تمہیں ایمان لانا چاہئے، اس لئے کہ وہ تمہاری باتوں اور اعمال سے باخبر، سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ﴾ یہ اس لئے کہ بیشک اللہ تعالیٰ ہی برحق ہے، حق کا معنی قائم، ثابت، صحیح اور واقعی ہے۔ ﴿وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ﴾ اور جس کو یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں وہ باطل ہے، یعنی بے حقیقت بے بنیاد اور غلط ہے۔ ﴿وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِىُّ الْكَبِيْرُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ ہی بلند مرتبت اور بڑائی والا ہے، تمام کبریائی اور عظمت اسی کو سزاوار ہے، تمام چیزوں کا مافوق الاسباب کنٹرول اور تصرف اسی کے ہاتھ میں ہے، مجال نہیں اس کے حکم کے بغیر درخت کا کوئی پتہ حرکت کرے، لہٰذا تمام تر بندگی اور عبادت اسی کے لئے ہے، اور وہی مالک الملک ہے۔

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً﴾ کیا تم نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اوپر آسمان سے پانی نازل فرمایا؟ ﴿فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً﴾ اور اس کے ذریعہ مردہ خشک زمین کو سرسبز وشاداب بنا دیا، پھل، پھول، درخت، اناج، سبزی، ترکاری اور ہر چیز وافر مقدار میں پیدا فرمائی، یہاں تک کہ جانوروں کے لئے عمدہ گھاس کا بھی انتظام ہوا، بعینہٖ وحی کی یہی مثال ہے، جس سے دلوں میں ایمانی حیات کے ساتھ تقویٰ، دیانت، عفت، طہارت، صداقت، شرافت اور حکمت پیدا ہوکر جنت کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ بہت باریک بین اور ہر چیز سے خبر رکھنے والا ہے۔

﴿لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ﴾ اسی کے لئے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے وہی ہر چیز کا خالق ومالک اور مدبر ومنتظم بھی ہے۔ ﴿وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ وہی بے نیاز اور تعریفوں والا ہے، سارا جہاں اس کا محتاج ہے، اس کو کسی چیز کا احتیاج نہیں، اور وہ ہر حمد وثنا کا حقدار وسزاوار ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ﴾ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ زمین ہے تمہارے لئے مسخر فرمایا ہے، اور تمام چیزوں کو تمہارا تابع بنایا ہے، سارا جہاں تمہاری خدمت پر مامور ہے۔ سورۂ بقرہ میں ارشاد ہے: ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ [البقرۃ:۲۹] (اللہ تعالیٰ زمین کی تمام چیزیں تمہارے فائدے کے لئے پیدا کی ہیں)۔ مفسرین کرام نے فرمایا کہ زمین میں کوئی ایسی چیز نہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ انسان کے مفاد وفائدے کے لئے نہ ہو، کیونکہ کوئی مخلوق بے مقصد وبے حکمت نہیں، حتیٰ کہ زہریلے کیڑے مکوڑے، سانپ اور بچھو بھی۔

﴿وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ﴾ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے حکم وامر سے سمندر میں چلنے والی کشتیوں کو بھی تمہارے تابع کردیا ہے۔ سورۂ رحمٰن میں ارشاد ہے: ﴿وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِی الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ﴾ [الرحمن: ۲۴] (اور اسی کے قبضے میں وہ جہاز ہیں جو سمندر میں پہاڑوں کی طرح اونچے کھڑے کئے گئے ہیں)۔ یہ کشتیاں اور بحری جہاز گو بظاہر تمہارے بنائے ہوئے ہیں، مگر تم کو تو اللہ تعالیٰ نے بنایا، اسی نے وہ تمام قوتیں عطا کیں جن سے تم یہ سب کچھ تیار کرتے ہو، اور یہ جہاز دریا میں کھڑے ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے پہاڑ، یہ سب اس کی تسخیر ہے جس سے تم لوگوں نے خشکی اور سمندر پر کنٹرول رکھتے ہو۔

﴿وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ﴾ اللہ تعالیٰ کی ذات وہ ہے جو آسمان کو زمین پر گرنے سے روکتا ہے، اس نے آسمانوں کو بغیر ستونوں کے کھڑا کیا ہے، اور پھر ایسا نظام بھی کر دیا ہے کہ نیچے نہ گرنے پائے، مگر اس کے حکم واذن سے جب قیامت برپا ہونے کا مرحلہ آئے گا اس وقت اس کے حکم واذن سے آسمان زمین پر گر پڑے گا، اور ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جائے گا، اور زمین بھی ہر چیز کے ساتھ فنا ہو جائے گی، اور ایک دوسرا نظام قائم ہو جائے گا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ﴾ بلاشبہ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑی شفقت والا، نہایت رحم والا ہے، یہ اس کی شفقت ومہربانی کا نتیجہ ہے کہ اس نے کائنات کے پورے نظام کو انسانوں کے فائدے کے لئے اپنے اپنے کام پر لگا رکھا ہے۔ ﴿وَهُوَ الَّذِيْٓ اَحْيَاكُمْ ۡ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ اللہ تعالیٰ وہ ذات پاک ہے جو تمہیں زندگی بخشی ہے، پھر وہ تم پر موت طاری کرتا ہے۔ ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ پھر وہ تمہیں دوبارہ زندہ کر کے قبروں سے اٹھائے گا۔

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ﴾ بیشک البتہ انسان ناشکر گزار ہے۔

خوب غور کرو، تم کچھ نہیں تھے، معدوم تھے، تمہیں وجود بخشا، پیدا فرمایا، تم سے عہد لیا (روز اول) پھر تمہیں نیست فرمایا، پھر باری باری سے پیدا فرماتے رہے، اور موت دیتے رہے، پھر قیامت میں دوبارہ اجتماعی زندگی کے ساتھ تمہیں اٹھائیں گے۔

❁ ❁ ❁

لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ
اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٦٧﴾ وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٨﴾ اَللّٰهُ
يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿٦٩﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ
مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ﴿٧٠﴾

ترجمہ: ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کے طریقے مقرر کئے ہیں، جن کے مطابق وہ عبادت کرتے تھے، سو اس امر میں وہ آپ سے جھگڑا نہ کریں، اور آپ ان کو اپنے ربّ کی طرف بلاتے رہیں، بلاشبہ آپ ہدایت پر ہیں جو سیدھا راستہ ہے ﴿٦٧﴾ اور اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرما دیجئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے کاموں کو

خوب جانتا ہے ﴿۶۸﴾ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان ان چیزوں میں فیصلے فرمادے گا جن میں تم اختلافات کیا کرتے تھے ﴿۶۹﴾ اے مخاطب! کیا تجھے معلوم نہیں جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے؟ بلاشبہ اللہ تعالیٰ ان سب کو جانتا ہے، سب کچھ کتاب میں لکھا ہے، بلاشبہ یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے ﴿۷۰﴾

معارف ومنازل

یہ آیات کریمہ علم المخاصمہ سے متعلق ہیں، مشرکین اور یہود ونصاریٰ مل کر اسلام اور اسلامی تعلیمات اور شرعی احکام پر ہٹ دھرمی سے اعتراض کرتے رہتے تھے، یہ لوگ یوں کہتے تھے خاص کر قربانی کے مسائل میں کہ تمہارے یہ اعمال اور احکام ہم نے پہلے کسی سے نہیں سنے، تمہاری بتائی ہوئی ایسی چیزیں بھی ہیں جن کا پرانی امتوں میں نہ تذکرہ ہے نہ عمل، اس طرح معاندین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جھگڑے کرتے رہتے تھے، اس پر اللہ تعالیٰ جل شانہ نے انہیں جواب دے دیا:

﴿لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا﴾ ہم نے ہر امت کے لئے عبادت کے الگ الگ طریقے مقرر کئے ہیں، جن کے مطابق وہ عمل کرتے تھے، اللہ تعالیٰ احکم الحاکمین ہے، مالک الملک ذوالجلال والاکرام ہے، آمر مطلق ہے، اسے اختیار ہے کہ جس امت کو جو چاہے حکم فرمادے، انبیاء سابقین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی امتوں کو جو احکام عطا فرمائے ان کے ذمہ ان پر عمل کرنا تھا اور آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو جو احکام دیئے ان پر عمل کرنے کی ذمہ داری ان پر ڈال دی گئی ہے، کسی مخلوق کو کوئی حق نہیں کہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کرے اور یوں کہے کہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) جو آئے ہیں ان کی شریعت میں بہت سے وہ چیزیں ہیں جو گزشتہ شریعتوں میں نہیں ہیں۔ معاندین کا جواب دینے کے بعد فرمایا:

﴿فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ﴾ پس وہ اس امر میں آپ سے جھگڑہ نہ کریں، خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم مستقل جامع اور ابدی شریعت لے کر آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے پر تمام احکام شرعیہ فرعیہ سابقہ منسوخ ہو گئے، جو شخص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فرمودہ احکام پر اعتراض کرتا ہے اور جھگڑا کرتا ہے اس کا اعتراض کرنا اللہ تعالیٰ پر اعتراض ہے، جو کفر در کفر ہے، یہ لوگ جھگڑے بازی سے دور رہیں، فرمایا:

﴿وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ ۭ اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ﴾ اور آپ ان کو اپنے رب کی طرف بلاتے رہئے، بلاشبہ آپ ہدایت پر ہیں، جو سیدھا راستہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے کام میں لگے رہیں، حق کی دعوت دیتے

رہیں، کسی کے اعتراض سے نہ متاثر ہوں نہ پریشان، آپ کا مستقبل درخشاں روشن ہے، اور اعتراض کرنے والوں کا تاریک، حق ترقی کناں عروج پائے گا، اور باطل مٹ جائے گا۔

﴿وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۝ اَللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ۝﴾ اگر یہ لوگ آپ سے جھگڑا کریں تو آپ فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں کو بہتر جانتا ہے، اور اللہ تعالیٰ قیامت کے دن تمہارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ فرمادے گا جن میں تم اختلاف کیا کرتے تھے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ جب فیصلہ فرمائے گا تو دودھ کا دودھ پانی کا پانی سب کچھ ظاہر ہو جائے گا، جس کا انجام تمہاری تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا، جب فرشتے تمہیں جانوروں کی طرح ہانکتے ہوئے جہنم کی طرف لے جائیں گے تب تم یہ کہتے ہوئے افسوس کرنے لگو گے: ﴿يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾ [الفرقان:۲۷] (ہائے میرے افسوس! کاش میں رسول کے ساتھ راستہ بنالیتا)۔

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ﴾ کیا تجھے معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے ان سب کو جانتا ہے؟ ﴿اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ﴾ بلاشبہ یہ کتاب میں لکھا ہوا ہے، یہ سب کچھ لوح محفوظ میں درج ہے، اور کرام کاتبین کی کتاب میں بھی لکھا ہوا ہے۔

﴿اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ﴾ بیشک یہ اللہ تعالیٰ پر آسان ہے، تمہارے سارے اچھے برے لوح محفوظ میں مرقوم ہیں، نامہ اعمال میں مکتوب ہیں، انبیاء علیہم السلام کی گواہی، تمہارے اعضاء کی گواہی، زمین کی گواہی، دوسرے گواہوں کی گواہی ان سب سے مقدم اور یقینی اللہ تعالیٰ کا علم محیط جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ معلوم و مشاہدہ ہوگا کسی معاند و متکبر کے لئے انکار کی گنجائش نہ ہوگی، فرمایا: ﴿وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا﴾ [الکہف:۴۹] (جو کچھ انہوں نے کیا اسے سامنے پائے گا، اور تمہارا رب کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا) لوگ اپنی زندگی کا ریکارڈ سامنے دیکھتے مشاہدہ کریں گے، اور تیرے ربّ کی طرف سے ذرہ بھر کسی پر ظلم نہ ہوگا۔

وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ۝ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ

كَفَرُوا الْمُنْكَرَ ۭ يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ بِالَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ عَلَيْهِمْ اٰيٰتِنَا ۭ قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ ۭ وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٢﴾

ترجمہ: اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی، اور نہ ان کے پاس ان کی کوئی دلیل ہے، اور ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ﴿٧١﴾ اور جب ان پر ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں جو خوب واضح ہیں تو کافروں کے چہروں میں تو ناگواری کو پہچان لے گا، قریب ہے کہ ان لوگوں پر حملہ کر بیٹھیں جو ان کے سامنے ہماری آیات پڑھتے ہیں، آپ فرما دیجئے: کیا میں اس سے زیادہ ناگوار چیز تمہیں نہ بتادوں؟ وہ دوزخ ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے کافروں سے وعدہ فرمایا ہے اور وہ برا (بدتر) ٹھکانا ہے ﴿٧٢﴾

معارف ومنازل

ان آیات میں مشرکین کے خودساختہ دین اور آباء واجداد کی کورانہ تقلید کے بطلان پر رد ہے، فرمایا:

﴿وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا﴾ یہ لوگ ایسی چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی سند اور دلیل نہیں نازل فرمائی، غیر اللہ کی عبادت کے بطلان پر عقلی ونقلی ہر قسم کے دلائل واضح طور پر موجود ہیں، جبکہ غیر اللہ کی عبادت پر کوئی عقلی ونقلی دلیل نہیں سوائے گمراہی کے، اور جہال نے آباء واجداد کی ناجائز تقلید کی، جبکہ ان کے باپ دادے ناعاقبت اندیش، بے عقل اور غیر ہدایت یافتہ گمراہ تھے۔

﴿وَّمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ﴾ اور نہ ہی ان کے پاس اس چیز کا کوئی علم ہے، یہ کتنے ظالم اور ناداں لوگ ہیں جو قادر مطلق، خالق و مالک کُل کی ہستی کے خلاف مچھر مکھی سے کمتر اور عاجز، گونگے، بہرے اور نابینا بتوں کی پوجا کرتے ہیں، اور وہ جانتے بھی ہیں کہ کائنات کی تخلیق میں ان کے الٰہ اور مصنوعی معبودوں کا کوئی کردار نہیں۔

﴿وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ﴾ اس قسم کے مشرکوں اور ظالموں کا نہ دنیا میں اور نہ ہی آخرت میں کوئی مددگار ہوگا، اور جن معبودوں سے وہ کسی شفاعت وسفارش کی امید رکھے ہوئے ہیں سو قیامت قائم ہوتے ہی یہ تمام امیدیں ختم ہوجائیں گی، اور عابد ومعبود ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے۔

﴿وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ﴾ جب ان ظالموں اور مشرکوں کے سامنے ہماری روشن اور واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو: ﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمُنْكَرَ﴾ تم کافروں کے چہروں پر ناگواری اور

نفرت کے اثرات نمایاں محسوس کروگے، اوران کو سخت غصے کی حالت میں ایسا پاؤ گے:

﴿یَكَادُوْنَ یَسْطُوْنَ بِالَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ عَلَیْهِمْ اٰیٰتِنَا﴾ قریب ہے کہ یہ لوگ حملہ آور ہو جائیں، ان لوگوں پر جو ہماری آیتیں پڑھتے ہیں (جیسے سرور عالم ﷺ پر کوہ صفا کے موقع پر ابولہب پتھر سے حملہ آور ہوا، جس کے بعد سورت لہب کا نزول ہوا) آپ گزشتہ اقوام کی تاریخ پڑھیں، آپ کو معلوم ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہر زمانہ میں ایسا ہوتا رہا، اور اب بھی مشرک واہل بدعت کا اہل حق موحدوں کے ساتھ آئے دن یہی سلوک ہو رہا ہے، اور ہمارے بہت سے علماء حق انہی حملوں میں شہید بھی ہو چکے ہیں، اور یہ سلسلہ جاری ہے، آگے ایسے معاندین کا جواب ہے:

﴿قُلْ اَفَاُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۭ اَلنَّارُ﴾ آپ فرما دیجئے: کیا میں بتلاؤں تم کو اس سے بھی بری بات، یعنی قرآن پاک اور توحید الٰہی کا بیان سن کر تمہارے شکستہ چہروں سے بھی زیادہ ناگوار اور بری چیز دوزخ کی آگ ہے، جو تمہارے لئے منتظر ہے، اس لئے کہ:

﴿وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا﴾ جس کا اللہ تعالیٰ نے کافروں کے ساتھ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ان کافروں کو ضرور اس آگ میں ڈالے گا۔ حضرت ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: مسلمانوں نے قرآن سن کر خوشی اور انبساط محسوس کیا، انہیں بدلہ میں جنت اور انبساط نصیب ہوا، جبکہ کفار نے قرآن سننے سے ناگواری اور ترشروئی محسوس کی تو انہیں بدلہ میں جہنم اور ترشروئی نصیب ہوئی، کَمَا تَدِیْنُ تُدَانُ، جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔ ﴿وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ﴾ اور جہنم لوٹ کر جانے کی بہت بری جگہ ہے جو قہر وغضب الٰہی کا مقام ہے۔

❁ ❁ ❁

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ
اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ﴿۷۳﴾
مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۷۴﴾ اَللّٰهُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۷۵﴾ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۷۶﴾

ترجمہ: اے لوگو! بیان کی گئی ہے ایک مثال، پس اس کو غور سے سنو، بیشک وہ لوگ کہ پکارتے ہو تم ان کو

اللہ تعالیٰ کے سوا وہ ہرگز مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگرچہ اس کے لئے وہ سب اکٹھے ہو جائیں، اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے تو اسے چھڑا نہیں سکتے، طالب بھی کمزور مطلوب بھی کمزور ﴿٧٣﴾ لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی ویسی تعظیم نہیں کی جیسا کہ اس کی تعظیم کا حق ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ جل جلالہ بڑی قوت والا ہے، زبردست ہے ﴿٧٤﴾ اللہ تعالیٰ شانہ فرشتوں میں سے پیغام پہنچانے والوں کو چن لیتا ہے، اور آدمیوں میں سے بھی، بلاشبہ اللہ تعالیٰ سننے والا، دیکھنے والا ہے ﴿٧٥﴾ وہ جانتا ہے کہ جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی کی طرف تمام امور لوٹتے ہیں ﴿٧٦﴾

معارف ومنازل

غیر اللہ کی عبادت کرنے والوں اور ان کے بے جان و بے حرکت معبودوں کے بارے میں عجیب مثال بیان فرمائی، مثال اور کہاوت سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ آدمی ایک معقول بات کو بآسانی سمجھ سکے، گویا وہ چیز سامنے اور مشاہدہ میں ہے، تو ارشاد فرمایا کہ تم لوگ کتنے احمق اور ناداں ہو جن کی تم پرستش کرتے ہو وہ اتنے عاجز وناتواں ہیں کہ ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے، اگر وہ سب مل کر ایک مکھی پیدا کرنا چاہیں تو سارے عاجز ہو کر رہ جائیں گے، یہ مکھی پیدا تو کیا کرتے اگر مکھی ان کی پیشانی پر بیٹھ کر یا ان سے کوئی چیز چھین کر اڑان کر لے یہ اس چیز کو اس سے چھڑا نہ سکیں گے۔

صاحب روح المعانی نے لکھا ہے کہ مشرکین بتوں کے جسموں پر زعفران لگا دیتے تھے، اور ان کے سروں پر شہد ملتے تھے، پھر دروازہ بند کرتے یہ چلے جاتے ادھر روشندانوں سے مکھیاں آجاتی تھیں اور شہد کو کھا جاتیں، اور ختم کر دیتی تھیں۔ ہندوستان کے ہندوؤں میں اب بھی یہی رواج ہے، اور ہندو اس کے ساتھ یہ بھی کرتے ہیں کہ مٹھائیاں لاکر بتوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں، مکھی تو کیا جب اور دوارہ کا دروازہ کھلا رہ گیا کتا اندر آیا مٹھائیاں کھا کر ٹانگ اٹھا کر بت پر پیشاب کر گیا۔

زمانہ رسالت میں ایک شخص کے بت کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا تھا، پھر اس نے بت کو توڑ کر خدمت اقدس میں آکر اپنے بت کی عاجزی بیان کرتے ہوئے کہا تھا: أَرَبٌ يَبُولُ الثُّعْلُبَانُ بِرَأْسِهِ۔ مجھے ایسے معبود کی ضرورت نہیں جس کے سر پر کتے پیشاب کریں اور وہ اپنے دفاع سے عاجز ہو۔

﴿يَاأَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوا لَهُ﴾ اے لوگو! ایک مثال بیان کی گئی ہے، پس اسے غور سے سنو اور سوچو۔ ﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ کے سوا تم جن کی پرستش کرتے ہو ان کا حال تو

یہ ہے کہ: ﴿لَنۡ يَّخۡلُقُوۡا ذُبَابًا وَّلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ﴾ وہ ہرگز پیدا نہیں کر سکتے ایک مکھی بھی اگر چہ وہ سب کے سب اس کام کے لئے اکٹھے ہو جائیں، پھر فرمایا: مکھی کو تخلیق کرنا، اس کا ڈھانچہ بنانا، پھر اس میں روح ڈالنا یہ پورا نظام تو کیا لطف کی بات یہ ہے:

﴿وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡـئًا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ﴾ اگر مکھی ان سب سے کوئی چیز اچک کر بھاگ جائے تو وہ سارے اس سے چھڑانے پر قادر نہیں ہیں۔ سورۂ عنکبوت میں ان کے عقائد شرکیہ کی کمزوری کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی، جب یہ پوری ٹیم مکڑی کے جالے سے کمزور ہو یا مکھی سے چھڑانے پر قادر نہ ہوں تو ان کو پوجنا اور معبود بنانا سراسر حماقت اور نادانی ہے۔

﴿ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ﴾ عابد اور معبود دونوں کمزور، یا یوں کہو کہ مکھی اور تمہارے معبود یکساں کمزور ہیں۔ ﴿مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدۡرِهٖ﴾ ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی وہ عظمت نہیں کی جو اس کی عظمت کا حق تھا، اور اللہ تعالیٰ کو اس طرح نہیں پہچانا جس طرح اسے پہچاننے کا حق تھا، کیونکہ ان کا یہ طرز عمل کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر بے جان بتوں کا بندہ بننا اور ان کی عبادت کرنا اسی کا ثبوت اور دلیل ہے کہ انہوں نے اپنے پروردگار کو نہیں پہچانا، ورنہ وہ ہرگز اس طرح کی حماقت نہ کرتے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِىٌّ عَزِيۡزٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والا، اور ہر چیز پر غالب ہے۔

﴿اَللّٰهُ يَصۡطَفِىۡ مِنَ الۡمَلٰۤـئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ﴾ اللہ تعالیٰ ہی ہے جو فرشتوں میں سے رسولوں کا انتخاب کرتا ہے، اور آدمیوں میں سے بھی، ساری مخلوق اللہ تعالیٰ ہی کی مخلوق ہے، اس نے اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہا جو مرتبہ دیدیا، اور جسے چاہا نبوت و رسالت کے لئے چن لیا۔ مطلب یہ ہے کہ پیغام پہنچانے کے لئے انتخاب کرنا اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنا پیغام دے کر ملائکہ کو انبیاء علیہم السلام کی طرف بھیجتا ہے، اور انبیاء علیہم السلام کو لوگوں کی طرف بھیجتا ہے۔ مشرکین جو کہتے رہتے ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام ہماری طرح کے بشر ہیں، ہم ان کو تسلیم نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ کا پیغام لانے والا فرشتہ ہونا چاہئے، فرمایا: یہ اختیار اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے کہ اپنا پیغام فرشتہ کے ذریعہ بھیجے یا بشر کے ذریعہ، کسی کی کیا مجال کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں مداخلت اور من مانی کرے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيۡعٌۢ بَصِيۡرٌ﴾ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے، اور وہ سمیع و بصیر خوب جانتا ہے۔

﴿يَعۡلَمُ مَا بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ﴾ وہ اچھی طرح جانتا ہے جو ان کے روبرو اور سامنے ہے، اور جو

ان کے پس پشت اور پیچھے ہے، یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں، پیغمبروں علیہم السلام اور انسانوں کے تمام احوال وافعال سے اور ان کے ماضی اور حال واستقبال سے پورا پورا باخبر ہے، اس کو اختیار ہے کہ جس کو چاہے اپنی رسالت کے لئے منتخب کرے، فرمایا: ﴿اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ﴾ [الأنعام: ۱۲۴] (اللہ خوب جانتا ہے کہ کہاں اپنی رسالت رکھے)۔ اور: ﴿وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ﴾ تمام امور کا مرجع اسی کی ذات پاک ہے، ہر چیز کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے، فقط۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۷۷
وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ؕ مِلَّةَ
اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا
عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۖۚ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ؕ
هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝۷۸

ترجمہ: اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی عبادت کرو، اور خیر کے کام کرو تا کہ تم کامیاب ہو جاؤ۝۷۷ اور اللہ تعالیٰ کے بارے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے، اس نے تمہیں چن لیا اور اس نے تم پر دین میں تنگی نہیں رکھی، اپنے باپ ابراہیم کی ملّت کا اتباع کرو، اس نے تمہارا نام مسلمین رکھا، اس سے پہلے اور اس قرآن میں تا کہ رسول تمہارے بارے میں گواہ بن جائے، اور تم لوگوں کے مقابلہ میں گواہ بن جاؤ، سو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ تعالیٰ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، وہ تمہارا مولیٰ ہے، وہ خوب مولیٰ ہے، خوب مددگار ہے۝۷۸

معارف ومنازل

سورۃ الحج کے مضامین بڑے جامع انداز میں بیان ہوئے، اب سورت کی آخری آیتوں میں اجمالاً پوری

سورت کا خلاصہ بیان فرمارہے ہیں جو کہ بارہ بنیادی اور اہم مسائل پر مشتمل ہے جو یہ ہیں:

(١) عقیدۂ توحید (٢) عقیدۂ آخرت (٣) عقیدۂ رسالت (۴) عبادت جمیع انواعہ (۵) نماز (٦) زکوٰۃ (٧) اتباعِ ملت ابراہیمی (٨) جہاد اور اس کی انواع (٩) افعالِ واعمالِ خیر (١٠) اس آخری امت کے فضائل و خصوصیات (١١) اللہ تعالیٰ پر اعتماد اور بھروسہ (١٢) مؤمنین کے لئے عظیم بشارت اور نصرت الٰہی کا وعدہ وغیرہ۔ فرمایا:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ﴾ اے ایمان والو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے ربّ کی عبادت کرو اور خیر کے کام کرو۔ یہاں رکوع وسجدہ اپنے مفہوم میں خاص ہیں، جبکہ عبادت اور فعل خیرات اپنے عمومی مفہوم کے اعتبار سے تقریباً تمام عبادات طاعات حسنات فرائض واجبات سنن و مستحبات مالیہ بدنیہ قولیہ فعلیہ سب پر حاوی ہیں۔ اسی طرح اس عموم میں مکارمِ اخلاق، محاسن آداب انفرادی یا اجتماعی سب شامل ہیں، اسی وجہ سے ان پر فلاح کا وعدہ ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ فلاح کا حصول کسی ایک عمل کے ساتھ وابستہ نہیں، جب تک تمام مامورات پر عمل نہ ہو۔ حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس آیت میں مذکور سجدہ سے مراد نماز کا سجدہ ہے جو کہ رکوع کے ساتھ مذکور ہے، لہٰذا اس کو پڑھنے یا سننے سے سجدۂ تلاوت واجب نہیں، جبکہ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہاں پر سجدہ لازم ہے، پھر فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جہاد کرو جیسا کہ جہاد کرنے کا حق ہے۔ جہاد صرف قتال مع الکفار والمنافقین کا نام نہیں، بلکہ نفس وشیطان اور ہر باطل کے خلاف جانی مالی زبانی قلمی تحریری طور پر جدو جہد کرنے کا نام ہے۔ حدیث شریف میں ارشاد ہے کہ حقیقی مہاجر وہ ہے جو گناہوں اور معاصی کو ترک کرے، اور حقیقی مجاہد وہ ہے جس نے اپنے نفس کے ساتھ جہاد کیا۔ [ترمذي]

کیونکہ اصلاح نفس اور باطنی طہارت کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا، اسی طرح ظالم حکمرانوں کے سامنے کلمہ حق کا اظہار بھی جہاد ہے۔ [ترمذي] بلکہ افضل جہاد ہے۔

دراصل مسلمان کی زندگی جہاد سے تعبیر ہے، اور ہر دینی جدو جہد کسی نہ کسی درجے میں جہاد میں شامل ہے، اور جہاد کا حصہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ مراتب ودرجات مختلف ہوں گے، مگر حقیقت سب میں مشترک ہے۔ مسلمان قوم نے صرف اور صرف جہاد کے واسطے اور برکت سے پورے جہاں میں اپنا لوہا منوایا، اور اقوام عالم پر برتری

حاصل کرلی، پھر جب تن آسانی اور عیش وعشرت کا شکار ہوا تو اپنے مقام سے نیچے گر کر اقوام عالم کے لئے تر نوالہ بن گیا، اور آج تک غیروں کا حاشیہ بردار اور غلام بن گیا، اور عزّت وشرف اور برتری جو حاصل کی تھی اس کو کھو بیٹھا۔

﴿هُوَ اجۡتَبٰىكُمۡ﴾ اللہ تعالیٰ نے تمہیں برگزیدہ پسندیدہ بنایا ہے، تمہارا پیشوا صلی اللہ علیہ وسلم ساری کائنات سے افضل ہیں، اور تم ان کی امت ساری امتوں سے افضل اور پسندیدہ ہو، اس کا سب سے بڑا سبب آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔ پھر دوسرے درجے میں تمہارے وہ مزایا ومحاسن ہیں جن سے ساری امتیں واقف تک نہیں،، جن کی تفصیل آئندہ ان شاء اللہ تعالیٰ کسی موقع پر بیان کریں گے۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيۡكُمۡ فِى الدِّيۡنِ مِنۡ حَرَجٍ﴾ اس نے تمہارے اوپر دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی، تمہیں مشکل مالا یطاق یا عام پریشان کن کوئی حکم نہیں دیا گیا، بنی اسرائیل کے احکام اتنے سخت اور مشکل تھے کہ بسا اوقات ان کے نام سننے سے گھبراہٹ پیدا ہوجاتی ہے، جیسے توبہ میں قتل نفس، مال کا چہارم حصہ بغیر نصاب و حولانِ حول کے زکوٰۃ میں دیدینا، پانی کے بغیر تیمم نہ کرنا، مسجد کے بغیر نماز نہ پڑھنا، کپڑوں کو نجاست لگنے پر کاٹ کردینا، مال غنیمت اور دیگر بہت سی پاکیزہ چیزوں کا ان پر حرام ہونا، جب کوئی رات کو گناہ کرتا تھا تو صبح در و دیوار پر لکھا ہوا ہوتا تھا کہ فلاں شخص نے یہ گناہ کیا ہے، حالت سفر میں انہیں رخصت پر عمل کرنا حرام تھا، علیٰ ہٰذا القیاس۔ سو اس امت پر تو اتنا کرم ذرہ نوازی اور سہولتیں ہیں کہ جن کا شمار نہیں۔ سورۂ بقرہ کے آخر میں قدرت نے دعا تلقین فرمائی کہ تم یہ پڑھا کرو: ﴿رَبَّنَا وَلَا تَحۡمِلۡ عَلَيۡنَاۤ اِصۡرًا كَمَا حَمَلۡتَهٗ عَلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِنَا﴾ [البقرة:٢٨٦] (اے ہمارے ربّ! ہمارے اوپر نہ رکھ بھاری بوجھ جیسا کہ آپ نے رکھا تھا ہم سے پہلے لوگوں پر)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اَلدِّيۡنُ يُسۡرٌ۔ ہمارا دین آسان ہے۔ [بخاري]

﴿مِلَّةَ اَبِيۡكُمۡ اِبۡرٰهِيۡمَ﴾ اپنے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملّت کو مضبوط پکڑو، یہ ملتِ ابراہیمیہ کی خاصیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر احکام شرعیہ میں بے پناہ آسانی کردی اور اسی کی بدولت تمہیں چن لیا اور پسندیدہ بنایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے پیشوا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے باپ ہیں، تو اسی مناسبت سے ہمارے بھی باپ ہیں (یعنی روحانی باپ)۔

﴿هُوَ سَمّٰىكُمُ الۡمُسۡلِمِيۡنَ﴾ انہوں نے تمہارا نام مسلمان رکھا ہے، جبکہ وہ یوں دعا کر کے کہا تھا: ﴿رَبَّنَا وَاجۡعَلۡنَا مُسۡلِمَيۡنِ لَكَ وَمِنۡ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ﴾ [البقرة:١٢٨] (اے ہمارے پروردگار! ہم دونوں

کو اپنا مکمل فرمانبردار بنالے، اور ہماری نسل سے بھی ایسی امت پیدا کر جو تیری پوری تابع دار ہو)۔

﴿مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا اس سے ہزاروں سال پہلے، اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلمان ہے، بمعنی مطیع وفرمانبردار، یہ نام اگر چہ گزشتہ امتوں کے سارے مسلمان لوگوں پر اطلاق ہوا، مگر خصوصیت کے ساتھ تمہارا لقب ہی مقرر ہو گیا۔

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ﴾ تا کہ اللہ تعالیٰ کا رسول تم پر گواہ بن جائے۔

﴿وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ﴾ اور تم لوگوں پر گواہ ہو جاؤ۔ شہادت کا ایک معنی تو گواہی ہے، اور دوسرا معنی ہے: اظہار حق وصداقت، تو پہلے معنی کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ گواہی جیسے کہ سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور مائدہ میں بیان ہوا قیامت کے دن ہوگی کہ آنحضرت سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کی صفائی کی شہادت دیں گے، اور پھر اس امت کے لوگ پہلی امتوں اور ان کے نبیوں کے بارے میں گواہی دیں گے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی امتوں کو حق اور وحی الٰہی مکمل پہنچایا، اور حق تبلیغ ادا کیا، اور حق وتبلیغ میں کوئی فروگزاشت نہیں کی۔

دوسرے معنی کے متعلق حضرت شاہ عبد القادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تا کہ رسول تمہارے سامنے حق و صداقت کو ظاہر کرنے والا بن جائے، اور تم حق وصداقت کی گواہی دینے اور اس کو ظاہر کرنے والے بن جاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا رسول تمہارا معلّم بن جائے، اور تم باقی لوگوں کے معلّم بن جاؤ، اور ان تک دین پہنچاؤ، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اولین مخاطبین صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے دین آگے چلایا، اور باقی دنیا والوں کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کرایا، اس پر تاریخ گواہ ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ سورۃ الحج کو قیامت کے زلزلے سے شروع کی، پھر توحید رسالت حج احکام ومناسک اور جہاد نیز دیگر مسائل بیان کئے جو اہم بنیادی مسائل تھے، اب اختتام سورت پر انہی باتوں کا اجمالاً تذکرہ فرمایا:

﴿فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ نماز پڑھتے رہو، اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو۔ نماز میں تمام عبادات بدنیہ اور زکوٰۃ عبادات مالیہ اور مرکب عبادات سب کی طرف اشارہ ہے جن کے ذریعہ تعلق مع اللہ محکم و مستحکم ہوتا ہے۔

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ﴾ اور اللہ تعالیٰ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑلو، اور اسی پر اعتماد کلی اور بھروسہ رکھو کہ یہی ملت ابراہیمی کا سب سے بڑی علامت وطغرہ امتیاز ہے، جن کا ابھی ذکر ہو چکا، اور جنہوں نے نمرود کی آگ میں گرتے ہوئے: حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾ پڑھا، تب آگ بجھ گئی، اور جنت کا نظارہ پیش کرنے لگی، یہ اعتصام مع اللہ سارے

دین کا خلاصہ ہے۔

آج اگر ہو ہم میں ایمان ابراہیم پیدا☆ آگ کر سکتی ہے انداز گلستان پیدا

(اقبالؒ)

﴿هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾ وہی تمہارا کارساز ہے، پس بہتر مولیٰ ہے، بہترین مددگار اور فریادرس ہے، اسی پر بھروسہ کرو۔

